

پیشکش

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

حصہ
اول

WWW.PAKSOCIETY.COM



”تلاش“ میرا ایک ایسا ناول ہے جسے میں نے قلم سے نہیں، دل سے لکھا ہے۔ اس کہانی کی تخلیق میں میرے بیسیوں رت جگے شامل ہیں۔ مقام شکر ہے کہ میری بیشتر تحریریں آج تک پسند ہی کی گئی ہیں۔ لیکن مجھے خود اپنی بہت کم کہانیوں پر فخر ہے۔

”تلاش“ انہی کم کہانیوں میں سے ایک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کو بھی پسند آئے گی۔ بہت سے انسان ایسے ہوتے ہیں جنہیں زندگی میں عزت، ذلت، دولت، محبت، وفا اور جفا، دشمن و دلدار، پستی و بلندی سبھی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے، مگر ایک تشنگی ہمیشہ ساتھ چلتی ہے اور روز آخر تک ساتھ رہتی ہے۔ یہ تشنگی شاید روزِ اول سے انسان کا مقدر ہے اور ابد تک ساتھ رہے گی۔ مگر بہت کم انسانوں کو اس کا احساس ہو پاتا ہے۔ کچھ پر بے حسی غالب آ جاتی ہے اور کچھ اسے دوسری مصروفیات اور تفکرات کے انبار تلے دبا لیتے ہیں۔

”تلاش“ درحقیقت اس تشنگی کی کہانی ہے مگر اس میں زندگی کے سارے ہی رنگ موجود ہیں۔

آپ کا

پڑھیے اور دعاؤں میں یاد رکھیے!

محمود احمد مودی

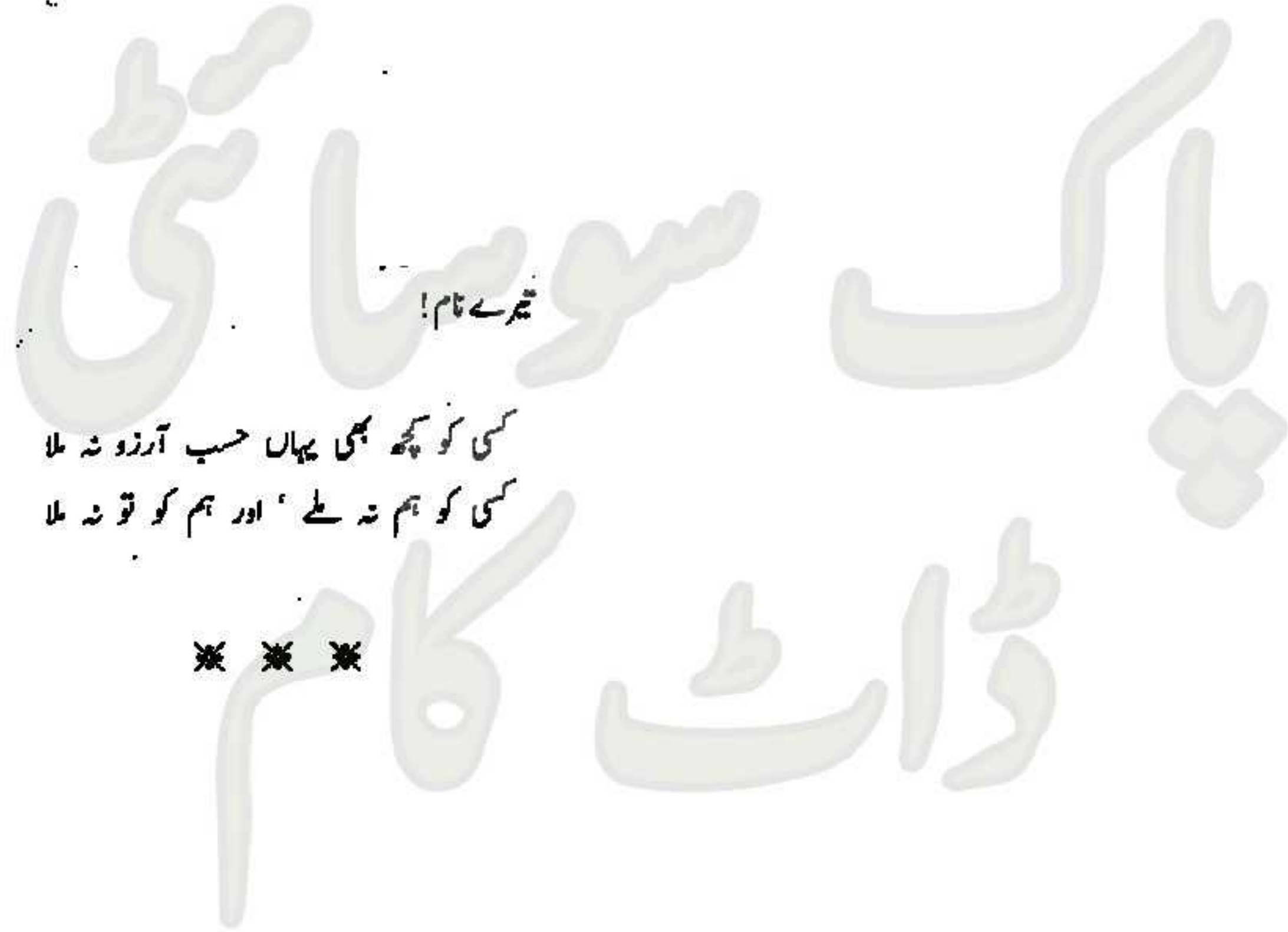
ISBN 969-38-0393-0

پاک سوسائٹی

1

محمود احمد نمودی

مکتبہ القریش، سرکلر روڈ، اردو بازار لاہور



خیرے نام!

کسی کو کچھ بھی یہاں حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے ، اور ہم کو تو نہ ملا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ مابانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر کم کو الٹی بارڈل کو الٹی بک ریڈر کو الٹی
- ☆ عمران میریٹ از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریڈ
- ☆ ایڈ قری لکس، لکس کو ایسے کماٹے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیننگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تھمبیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک قریڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

آپ نے کہیں 'دوست' نہیں اور آپ بقیہ تو بڑا دل ہی پڑی ہوں گی۔ کچھ بھئی کچھ ہی اور کچھ نیم ہی۔ ان میں سے کچھ آپ کے ذہن میں نقش ہوں گی۔ کچھ محو ہو چکی ہوں گی اور کچھ کبھی کبھی یوں ذہن میں ابھر آتی ہوں گی جیسے کوئی بھولا بسرا خواب یاد آجائے یا تصور کی پریاں اڑتے اڑتے کسی دور دہس میں جا سکیں۔

ایک نانا چنا جب میں بھی کہتیاں پڑھتا تھا اور میری بھی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ میں خود ایک طویل کہانی کا کردار بن گیا۔ مجھ پر جو کچھ بتی اس نے مجھے کہا کہ کو میرے ذہن سے محو کر دے۔

آج میں کتاب زندگی کا درجہ درجہ بٹھا ہوں تو آنکھیں دھندلا گئی ہیں۔ مجھ میں نہیں آتا واقعات کی لور کو کہیں سے قاسم اور یہ مجھے کہاں لے جائے گی۔ چنے پر جو بہت ہمت کیا ہے۔ سوچتا ہوں زندگی نے تجربات و حلوٹ کی شکل میں جو کچھ مجھے دیا ہے نہانے کو لونا دل۔ گو کہ یہ لذت نہیں 'محل میرے شب و روز کا حساب ہے جس میں محبت کی جہوں فحشاں بھی ہیں اور مظہریت کی سسکیاں بھی۔ جہدہر کا ہدہ بھی ہے اور انتقام کی برکت بھی۔ جذلوں کی زم آٹیں بھی ہیں اور پتے لو کی حرار بھی۔ وقواری کی حر کاماں بھی ہیں اور غداروں کے شامنے بھی۔ دوستی کا درد بھی ہے اور دشمنی کی ہولناکی بھی۔

میں یہ سب کچھ اس لئے بھی کسی کو سنا جاتا ہوں کہ شاید جسے میں شکش جیت کی آخر کچھ کر قدرے ملشن ہو بیٹھا ہوں 'دواصل یہ آخر نہ ہو محض سستائے کی صلت ہو۔ موت کا ہاتھ آج بھی میری کمرج میں ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ ہاں 'اند میرے کی موت سے ڈرتا ہوں 'زندگی سے تو میں نے اپنا خراج وصول کر لیا ہے۔ اب ایک ہی خواہش ہے کہ موت آئے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر 'سے۔ ساتپ کی طرح چھپ کر کسی اند میرے گوشے سے حملہ آور نہ ہو۔

زندگی کی کمائی کا آغاز عام طور پر بچپن سے کیا جاتا ہے مگر مجھے اپنا بچپن بھی اچھا دھن محسوس نہیں ہوا کہ اسے یاد رکھتا ہوں یا نہیں ہوں ان گرد آلود کھیلوں کی طرح ذہن کے منم خاتون میں کھری پڑی ہیں۔ جنہیں "پ گھر کی آوازیں کرتے وقت بچکنے کے لئے اٹھاتے ہیں" مگر پھر بچپن کی یاد گاہیں مجھ کو کھٹے کھٹے سے انداز میں ذرا مسکرا کر دہیں چھوڑ دیتے ہیں۔

مجھے یاد ہے جب میں نے ہوش سنبھلتا تو میں ایک چھوٹے سے صاف ستھرے مکان میں ایک لوجیز عمر عورت کے ساتھ رہتا تھا جو روزانہ مجھے ایک مخصوص وقت پر بنگالی "نڈائی" کپڑے پہنتی، مخصوص چیزیں کھانے میں دیتی۔ شام کو مجھے چھائی اور پھر مخصوص وقت پر ہی سلا دیتی۔ گو کہ میں نے باہر کی دنیا نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے مجھے نہیں معلوم تھا کہ دوسرے لوگ کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔ مگر یہی اپنی تمام تر کمسنی کے باوجود نہ جاننے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں ایک مٹھن ہوں جس کے مختلف مٹھن مختلف لوگوں میں دو عورت دبا دیتی ہے۔ تاکہ میں اپنا کام انجام دے سکوں۔

اسی عورت نے مجھے باتیں کرنا سکھائی تھیں اور اسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ میری گورنس تھی۔ تقریباً ہر پہلے ایک دروازہ کھلتا اور انتہائی خوبصورت عورت شام کا اندھیرا پہننے کے بعد ہمارے ہاں آتی اور آتے ہی ہاں بے قراری سے مجھے پہنے کے ساتھ چٹا لیتی جیسے میں اس کا کوئی گھڑا کھانا تھا جو مدت کے بعد اسے ملا تھا۔

وہ مجھے بتاتا کہ "کر پھارلی" بے تحاشا ہے حتیٰ اور کبھی کبھی تو مجھے چوتھے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ میں جب بہت چھوٹا تھا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ بٹا کسے کہتے ہیں۔ لیکن جب گورنس کی تعلیم و تربیت اور عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ مجھے دنیا کی بہت سی باتیں کا علم ہونے لگا تو میرے دل میں اس عورت کی محبت جاگ اٹھی۔ اب وہ مجھے پہنے سے بچلتی تو جیسے مجھے بے پناہ سکون مل جاتا۔

میں بے قراری سے اس کا انتظار کیا کرتا اور پہلے کے دن تو صبح ہی سے میری آنکھیں گیٹ پر لگی رہتیں۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ دن میں کبھی نہیں آئی۔ گورنس کی تربیت کے علاوہ میری ذہانت نے بھی مجھے بتا دیا تھا کہ ماں کیا ہوتی ہے۔ ورنہ پہلے تو میں اسے صرف دور دیکھنے والی کوئی بھڑی ہی سمجھتا تھا جس کی کہانیاں..... کبھی کبھار مجھے گورنس سناتا کرتی تھی۔

اب مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ ماں کسے کہتے ہیں تو میرا دل بھی اس سے ملنے کو پھلے لگ گیا۔ یاد نہیں کہ اس وقت میری عمر کیا تھی، جب میں نے پہلی مرتبہ اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر کہا تھا "مائی! آپ مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں۔ کیا میں تب کو اچھا نہیں لگتا جو آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھتیں؟"

اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری بات سن کر میری ماں کے حلق سے جو آواز نکلی تھی اسے سسکی کہتے ہیں۔ اس نے معمول سے کہیں زیادہ خوشی کے ساتھ مجھے پہنے سے چٹا لیا۔ آنسو اس کی نیلی نیلی بالوریں آنکھوں سے یوں اتر پڑے تھے جیسے عورتوں سے ذہن نشین چٹا ہوا کوئی چشمہ کبھی گھرے کو کنویر پا کر پھوٹ پڑا ہو۔ میں نے مئی کو اس بری طرح روٹے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں ڈر گیا کہ شاید میں نے کوئی ایسا نامناسب بات کہہ دی ہے جس سے مائی کو صدمہ ہوا ہے۔

"نئی ایم سوئی مائی!" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ مائی ہر بچی کی سفید ربڑی چادر پرے جسم پر لپیٹ کر آگیا کرتی تھیں۔ اس کے پاؤں سے آنسو لے اپنے آنسو خشک کئے اور مجھے پہنے سے چٹا کر لیں۔ "ابھی وقت نہیں آیا ہے۔" ہمیں کیا پتا کہ تمہاری مائی تم سے دور رہ کر کس طرح زندگی گزار رہی ہے۔ لیکن ابھی وقت نہیں آیا..... وقت نہیں آیا....."

آخر میں ان کا لہجہ خود کھائی کا سا ہو گیا تھا اور آواز گویا ان کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ ان کی نظریں میرے چہرے پر نہیں تھیں اور ان کی لمبی لمبی پلکیں یوں ساکت ہو گئی تھیں گویا وہ کوئی دہشت ناک خواب دیکھ رہی ہوں۔

پھر انہوں نے چونک کر گھڑی دیکھی، چاند اپنے جسم پر اس طرح احتیاط سے لپٹی کہ ان کے لیے "مٹھیرے" سیاہ ہاں اور گودھا چہرہ بھی اس میں چھپ گیا اور وہ جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔

ان کے جاتے وقت گورنس شٹلا مجھے کمرے ہی میں روک لیتی تھی، لیکن اس روز وہ شٹلا بکن میں تھی۔ چنانچہ جب مائی مجھے چار کر کے باہر چلی گئیں تو میں بھی چپکے چپکے ان کے پیچھے چل دیا۔ یہ تو بڑے سے اتر کر میں گیٹ کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا وہ سرسری رنگ کی ایک بچی سی مار میں بیٹھ رہی تھیں جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی ٹوپی والا آدمی بیٹھا تھا۔

"چلو ڈرائیور!" میں نے مائی کی آواز سنی۔ میرا جی چاہا کہ وہ ذکر میں بھی مائی کے ساتھ بیٹھ جائیں، اگر وہ مجھے نہ ڈھکیں تو میں کڑی میں لگ جاؤں، پھر تو آخر ترس کھا کر وہ مجھے اپنے ساتھ شٹلا لیں گی۔ لیکن میں اس وقت ہانا چندن کی نظر مجھ پر پڑ گئی جو مائی کے جانے کے بعد گیٹ بند کر رہا تھا۔

وہ یوں جسم کر میری طرف لپکا جیسے میں کسی گڑھے کے دہانے پر پہنچا تھا۔ اور اب میں کمرے ہی والا تھا۔ اس نے مجھے گود میں اٹھایا اور اندر کو بوڑھا۔ اندر سے گورنس شٹلا میری تلاش ہی میں لپکی لوہر آ رہی تھی۔ ہانا چندن نے مجھے اس کے حوالے کیا اور اسے ڈال دیا تاکہ وہ میرا خیال نہیں رکھتی۔

یہ ہا چندن کوئی یوزخا آدمی نہیں تھا۔ اس کے سر میں چند ہی سفید ہل تھے۔ لیکن اسے شہر جانے کیلئے ہلا کر مارا گیا تھا۔ حالانکہ وہ اتنا نوچھا لہا ڈنکا اور طاقتور آدمی تھا کہ کسی بار میں نے اسے ہار میں کام کرتے وقت درختوں کی کئی موٹی موٹی غیر ضروری شاخوں کو ایک ہاتھ سے پوں توڑ مولا کر درخت سے جدا کرتے دیکھا تھا جیسے وہ گھس جھانڈ کے کھٹے ہوں۔

مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ہا چندن کون تھا اور اس گھر میں کس لئے رہا تھا۔ اور اس کا حقیقی نام کیا تھا؟ کبھی وہ ہار کو سہانا سلوارا تھر آتا تھا۔ کبھی مکان میں مرمت وغیرہ کی ضرورت پیش آتی تو وہ بھی اس کے ہاتھوں ہوتی۔ بازار سے سودا سلف بھی وہی آتا اور ایک بار تو میں نے اسے ہار کے وسط میں گڑھا کھود کر ایک پتھر تلاب بھی بناتے دیکھا۔

ایسا معلوم ہوا تھا کہ اسے دنیا کا ہر کام آتا تھا۔ لہذا وقت میں وہ گیٹ کے قریب دیوار کی آڑ میں ایک گدے دار کرسی پر بیٹھا رہتا تھا۔ عام طور پر وہ صرف دھوئی اور واسکٹ پینے رہتا تھا۔ واسکٹ کے ٹین آکر کھلے ہی رچتے تھے اور ہاوں سے بھرا اس کا چوڑا چکلا سیاہ سینہ دیکھ کر مجھے اس دیکھ کا خیال آتا تھا جس کی تصویر میں نے اپنی ایک انگریزی کی کتاب میں دیکھی تھی۔

ہا چندن کا سب سے بڑا فریضہ شاید مجھے گھر سے باہر جانے سے روکنا تھا۔ میں باہر جانے کے لئے بہت ہی خود کرتا تو کبھی کبھی وہ مجھے اپنے ساتھ شام کے اندھیرے میں فٹ پاتھ پر چل قہری کرانے لے جاتا یا پھر اس پارک میں گھماتے لے جاتا اور گھر سے کچھ ہی لمبے پر واقع تھا۔

اس طرح میں اپنے گرد و پیش سے کسی حد تک آشنا ہونے میں کامیاب ہو سکا۔ میں نے دیکھا کہ اندرے اور گرد بھی مکالموں کی قلمیں تھیں جو ویسے تو ہمارے ہی مکان کی طرح نظر آتے لیکن تقریباً سب ہی مکالموں میں طویل و عریض لان یا پارخ تھے۔ ان گھروں میں رہنے والوں کو اپنے گرد و پیش سے آشنا دیکھی نہیں تھی۔ میں نے کبھی وہاں لڑکا چل پھل نہیں دیکھی۔

اس انداز پرورش کا نتیجہ تھا کہ جب پانچ سال کی عمر میں مجھے سکول میں داخل کرانے کے لئے لے جایا گیا تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم کونسے شہر میں رہتے ہیں۔ البتہ پرنسپل کی ہدایت پر ایک ٹیچر نے میرا نمائی یا تحریری ہر اظہان لیا اس میں میں نے فرار جواب دینے یا چند سطروں کے اندر اندر لکھ دیئے۔ کیونکہ یہ سب کچھ گورنس شپا مجھے بڑی اچھی طرح پڑھا چکی تھی۔ پرنسپل نے یہ خوشی مجھے داخل کر لیا اور میری زندگی کو ایک انقلاب سے روشناس ہو گئی۔

مجھے دوسرے بچوں کے ساتھ بولنے، کھیلنے، کوسنے اور پڑھنے کا موقع ملا تو میں بڑا خوش رہنے لگا۔ لیکن گورنس شپا کی مجھے سختی سے ہدایت تھی کہ میں کلاس میں کسی لڑکی یا لڑکے سے زیادہ دوستی نہ پہنچاؤں۔ اور گھر پر تو کسی کو ہرگز مدعو نہ کروں اور نہ ہی کسی کی دعوت پر اس کے گھر جاؤں۔ ہا چندن ایک چھوٹی سی کار میں مجھے سکول چھوڑ کر جاتا اور چھٹی کے وقت اپنے آگے تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ کار چلانا بھی جانتا تھا اور یہ کار اب گھر پر ہی رہتی تھی۔ می نے سکول میں میرے داخلے سے چند دن پہلے یہ بھوائی تھی۔

اب می جب بھی اپنے معمول کے مطابق مجھ سے ملنے آئی تو گورنس شپا سے یہ رپورٹ ضرور لیتیں کہ سکول میں میری تعلیمی کیفیت کیسی جا رہی ہے۔ اور یہ سن کر بڑی خوش ہوتیں کہ میں ہر ٹیسٹ میں اول آ رہا ہوں۔ دراصل گورنس شپا مجھے اتنی اچھی طرح پڑھاتی تھی کہ سکول میں تو مجھے پڑھائی پر توجہ دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

انہی معمولات کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے میں عمر کے اچھوٹے برس میں پہچانو مجھ پر کچھ اور مشقتوں کا بوجھ آن پڑا۔ ہا چندن نے ہار کے ایک ایسے گوشے میں جو اہلی کے درختوں سے گھرا ہوا تھا ایک اکھاڑ کھود رکھا تھا جس میں وہ صبح شام ٹیپ و فہب دراز میں کھڑا چھل کھود کر رہتا تھا۔

مجھے علم ملا کہ دونوں وقت میں بھی فکٹ کس کر اکھاڑے میں اس کے سامنے ضروری دیا کر لیں۔ شروع شروع میں مجھے بڑی کوفت ہوئی اور ایک مہرہ میں نے می سے شکایت بھی کی کہ مجھے صبح شام سلی میں لوٹ لگانا اور ہاتھ پائی کرنا بالکل پندہ نہیں۔ مگر می نے مجھے چوتھے ہوئے پائے پیاد سے کھلیا۔ مہربا! وہ ہمارے بھلے کے لئے سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ ہمیں پہلوانی یوگا اور گنگا سکھائے گا۔ تم خوب لمبے ترنگے اور طاقتور بن جاؤ گے۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں زندگی میں بہت کچھ سیکھنا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم چنانکہ اس دنیا میں کھوڑی اور عزت ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ کھوڑا توئی کا عزت کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ یہ اصول تو اطرت ہی نے بنا دیا ہے کہ بڑی چھلی چھوٹی چھلی کو نگل جاتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم طاقتور ہو۔ بڑی چھلی ہو تاکہ ہمیں کوئی نہ لگے۔

می کا ٹیچر تو میری کچھ میں نہیں آیا تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ ٹھوڑے عرصے بعد مجھے خود اس تربیت میں بڑا لطف آنے لگا تھا۔ اکھاڑے کی سلی سوسمی سوسمی خوشبو کے ساتھ جب میرے پیسے کی بڑ سے ہم آہنگ ہوتی تو مجھ پر ایک سرور طاری ہو جاتا۔ ہا چندن سے روزنت ملنے کرتے سیکھے میں مجھے اتنا ہی خوف آتا جتنا سکول میں ہر روز اس اوشا کا ٹیچر سننے میں آتا تھا۔ ہا چندن صبح سویرے مجھے یوگا کی مشقیں کراتا شام کو درختوں تا اور واؤ تپ سکھاتا۔ میری خوراک بھی اسی کی ہدایت کے مطابق تیار کی جاتی تھی۔

روبوٹ۔ "ٹھیک ہے۔ تم کلاس روم میں جاؤ۔"

کیلاش اس واقعے کے تین دن بعد سکول آیا اور پہلے ہی دن اس نے میرے ساتھ ایک لڑکے کے ساتھ کوئی شرارت کرنے کی کوشش کی تو وہ جلدی سے بولے۔ "یہاں میں حضور سے درخواست کروں کہ وہ ایک بار پھر تمہیں اسی طرح اٹھ کر پٹے؟" کیلاش نے کھیالی نظروں سے میری طرف دیکھا اور وہاں سے ٹھیک گیا۔ اس کے بعد میں نے کبھی اسے شرارت کرتے نہیں دیکھا۔ کہ از کم اپنے ساتھ۔

گھر پر ہوا چندن کی زیر تربیت میری پہلوانی اور یوگا کی مشقیں جاری تھیں۔ میں کیا دوسری سال میں پہنچا تو ہوا چندن نے مجھے گنگا نہیں سکھانا شروع کر دیا۔ ہمارے سکول میں بھی اسپورٹس کے بڑے عمدہ مقابلے منعقد ہوا کرتے تھے۔ لیکن وہ کچھ مجھے ہوا چندن سکھا رہا تھا اس کی مناجات سے وہ مجھے آگے بھٹی سے زیادہ مشکل نہیں لگتے تھے۔ اور چندی جماعت تک گھر سواری، سوئمنگ اور جمنائک کے تمام اخراجات میں جیت چکا تھا۔ ایک سنگ گلاب میں تو میں نے سولہ قسم کی حیران کن مٹھا ہوا کیا تھا۔ السوں کے تمام بچوں کے والدین یہ مقابلے دیکھتے آتے تھے لیکن میری جی کبھی نہیں آئیں، تبہم وہ جب بھی گھر پر مجھ سے ملے آتے تو میرے کمرے میں ٹرائیڈ اور کپڑوں کی تعداد میں اضافہ دیکھ کر خوشی سے پھل نہ ساتی تھیں۔ اور میں ان کی یہ خوشی دیکھ کر ہی مطمئن ہو جاتا تھا۔

اب مجھ پر پابندیاں کسی حد تک نرم ہو چکی تھیں۔ ہوا چندن کبھی کبھار مجھے کھیلنے پھرانے لے جاتا تھا۔ ایک بار وہ مجھے بچوں کی ایک قسم بھی دکھا کر لایا تھا۔ تاہم ان کا یہ ختم اب بھی برقرار تھا کہ میں انہیں کبھی نہیں نہ جوتوں اور نہ کسی انجینی سے کبھی کھیلنے ملے گی کوشش کروں۔ اور نہ ہی کسی کو اپنے حلقہ بچہ بتاؤں۔ لیکن مجھے معلوم ہی کیا تھا جو میں بنا۔

دو دن "گیت کی طرف سے ہمارے سٹائی دیو۔ ہوا چندن مجھے سکول سے کمرہ کر چھوڑنے کے بعد دوسری سے کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ وہ لوٹ آیا تھا اور آج کچھ زیادہ ہی جلدی میں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے گاڑی گیت سے تقریباً گرا دی تھی۔ میں کڑکی سے دیکھ رہا تھا کہ گاڑی کی ٹیسٹ گیت کے نچلے حصے میں لگی ہوئی سلاخوں سے آگلی تھی اور ایڈ لائٹس کے درمیان سیاہ بجٹ پر سلیڈ بند سے یوں معلوم ہو رہے تھے گویا کوئی سیاہ مد انسان لچکس پھپکا نے پلیر سلاخوں کے درمیان سے جھانک رہا ہو۔

دوسرے کمرے سے ٹیلا کی کواڑ سنائی دی۔ "میسور! میں ہاتھ روم میں ہوں۔ دریا جا کر گیت کھول دو۔"

اس دوران دھوا، ہازن بجل۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ہوا چندن بہت بے تاب اور مزید تاخیر ہونے پر گیت توڑ کر اندر آ جائے گا۔ یہ انداز ہوا چندن کی لطرت کے خلاف تھا۔ وہ

اکثر کہا کرتا تھا۔ "جلد ہازنوں کو موت بھی جلد آ جاتی ہے۔" میں نے اسے بھی ہڑتائی اضطراب یا جلت میں نہیں دیکھا تھا۔

میں ٹیل میز پر رکھ کر اٹھا اور باہر آیا جیسے ہی میں نے گیت کھولا اور ایک طرف کو ہٹا چھوٹی سی سلیڈ بریڈ اس ٹھکے ہارے ٹوگولز کی طرح جس کے پیچھے ٹھاری کتے تھے ہوں لڑائی ہوئی کپاؤٹ میں داخل ہوئی۔ اور ایک ٹھکے کے ساتھ اس عالم میں رکی کہ اس کے وہ پتے پتہ روش سے لان پر اترے ہوئے تھے۔ میں نے جب گیت بند کر کے مڑ کے دیکھا تو ہوا چندن گاڑی سے اتر چکا تھا۔ مگر اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ ہیلیوں پر رکھے جیب سے انداز میں برآمدے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قدم دیکھا کبھی تھا چڑا کبھی تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے ہاتھ میری طرف پھیلائے۔ "مجھے سارا وہ

پٹ۔" ہر آدمے کے بلب کی زردی روشنی میں میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ خون میں لکھڑا ہوا تھا۔ میں نے ٹھیک کر اس کی طرف دیکھا۔ ہیلیوں سے لے کر پیچھے تک اس کا کمرہ پاجامہ اور واسٹ خون میں تر تھی اور ایک ہاتھ اس نے غالباً لب بھی ہیلیوں پر اسی رقم پر رکھا ہوا تھا جس سے یہ خون بہہ رہا تھا۔

"ارو نہیں دنا۔" وہ معمول سے انداز میں مسکرایا۔

"یہ انسانی خون ہے اور دنیا میں بہت ارزاں ہے۔" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر برآمدے کی طرف گھٹنے لگا۔

"مہر کیا ہے ہا۔" میں نے اسے سارا دے کر برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھنے ہوئے پوچھا۔

"تقریباً ایک لٹ کی ایک چھری میرے پلو میں اتر گئی تھی۔" اس نے ایک اکڑی اکڑی سانس لے کر کہا۔

"کس نے اتاری تھی؟ کبھی اتاری تھی؟" میں نے اسے اس کے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے پوچھا۔

"میرے ماضی نے یہ چھری میرے پلو میں اتاری تھی دنا! اور اس لئے اتاری تھی کہ ماضی ان لوگوں کو کبھی صاف نہیں کرا رہا اس سے ڈانا توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ ماضی ان کے مقابل میں رہتا ہے اور ایک نہ ایک دن انہیں زحمت لانا ہے۔ اور انعام کی بجائے چھری ان کے پیٹے میں گھونپ دیتا ہے۔"

"ہا تم اکثر ایسی باتیں کرتے ہو جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" میں نے انہیں لہجے میں کہا۔ "یہ ماضی کلن ہے۔ اس سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

"بہت گہری دشمنی تھی دنا میں نے اسے ٹھوکریں مار مار کر اپنی زندگی سے لالہ دیا

قتل کیونکہ وہ بہت کمزور تھا۔ قتل اس نے اپنی دولت کا انتقام لے لیا۔ "بستر پر لیٹ کر اس دوران شیشا ہاتھ روم سے نکل گئی تھی اور نظری آواز پر سن کر ہلا چندن ہی کے کمرے میں آگئی تھی۔ اسے خون میں لخت ہت دیکھ کر شیشا کا چہرہ سفید پڑ گیا اور اس کے ہاتھ سے وہ تکیہ گر گیا جس سے وہ اپنے توجہ سے سفید نور آدھے سیاہ ہواں کیونٹنگ کر رہی تھی۔

"یہ کیا...؟" بمشکل اس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔

"کئی سوال کر کے وقت ضائع نہ کر شیشا! فوراً کوئی جگہ پکڑ اور غلام کو بلا لاؤ۔" ہلا چندن نے اس کی ہات کٹ کر کہا۔ اس کی آنکھیں بار بار یوں بند ہونے لگی تھیں جیسے اسے نیند آ رہی ہو۔ مگر اس طرح بعد کو شش اٹھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے کوئی بہت ضروری کام ہو۔

"لیکن غلام تو شاید آج بھی..." شیشا نے کہا چاہا۔

"نہیں۔" ہلا چندن نے بے تابی سے اس کی ہات کٹ کر کہا۔

"مجھے وہ نہیں پڑے۔"

شیشا مزید ایک لفظ کے بغیر مڑی اور دوڑی ہوئی باہر چلی گئی۔ "یہ تکیہ الٹا لاؤ۔" ہلا چندن نے فحاشت سے لہجے میں کہا اور میں فرش پر پڑا وہ تکیہ اٹھا لایا جو شیشا کے ہاتھ سے گرا تھا۔ "میری اماری کھلو۔" ہلا نے مزید کہا۔ "اس نے ایک بڑی شیشی رکھی ہو گی جس میں سفید پائڈر سا بھرا ہوا ہے وہ شیشی نکل لاؤ اور پائڈر میزے زخم پر اچھی طرح چھڑک دو اور یہ تکیہ کسی چیز سے میرے پیچھے پر خوب اچھی طرح کس کر باندھ دو۔"

میں خاصی مستعدی سے اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگا اور اس دوران میں نے پوچھا۔ "تم یہاں آنے کے بجائے پہلے میڈم سے ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں چلے گئے؟" وہی معمولی سا سکرابٹ دوبارہ اس کے ہونٹوں پر رنگ آئی۔ "اس نے علاج بعد میں اور تفتیش پہلے کرنی تھی۔ پھر اسے پولیس کہیں قرار دیتے ہوئے پہلے مجھے پولیس سرجن کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا اور پولیس سرجن کی رپورٹ تیار ہونے تک تو میری موت واقع ہو ہی جاتی تھی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ جب موت ہی ہے تو کیوں نہ اپنی عمدہ سے چند ضروری باتیں کر کے مر جاؤں۔"

میں اس کے کہنے کے ساتھ پر وہ سفید سا سفوف چھڑک کر تکیہ اس کے پیچھے پر باندھ چکا تو اس نے پہلے سے کہیں زیادہ نحیف آواز میں کہا۔ "میتا میں جو کچھ تمہیں سکھانا چاہتا تھا وہ سکھا چکا ہوں، اب اس کی مشق اور ورزشیں تمام عمر تک نہ کرنا۔ تم بھی پوڑھے نہیں ہو گئے کم از کم اس طرح پوڑھے نہیں ہو گے جس طرح عام لوگ ہوتے ہیں۔ اگر

تم نے میری ہدایت پر عمل نہ کیا تو غلام... تمہاری جی تم سے ناراض ہو جائیں گی۔" وہ تمہیں اس کے علاوہ بھی بہت سے چھوٹے فون سکھانا چاہتی تھی۔ جس کے انہوں نے انتظامات کر رکھے تھے۔ تم بھی ان کے حکم کے خلاف کوئی کام نہ کرنا۔ انہوں نے تمہارے لئے بہت دیکھ افلائے ہیں۔ وہ تمہیں پڑھائی کے ساتھ ساتھ جو کچھ بھی سکھانا چاہیں پوری دلچسپی سے سکھانا۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ وہ تمہیں میرا بتا دیں گی۔ میرا! جو لیٹ بھی پڑی ہوتا ہے اور کبھی ٹوٹا بھی نہیں۔"

میں بہت ہنسنا کی باتیں سن رہا تھا اس کی آواز کا پیچہ میرے ذہن کی طرح ہر ایک ایک لفظ کندہ کرنا چاہتا تھا۔ "اس نے پیچھے پر ہاتھ رکھ کر سسکی سی کہ۔ مگر میں داخل ہونے کے بعد سے اب تک وہ پہلی بار کراہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ "میری باتوں پر عمل کر کے" اس نے سرگوشی سی کی۔ اس کی آواز غلیظ جا رہی تھی۔

"تپ کے اور میں کے حکم کے خلاف تو میں کچھ کرنے کا سوچ ہی نہیں سکتا۔" میں نے ہلا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ وہ لوگوں کے سوا دنیا میں مجھے نظر ہی کون آتا ہے... میں کس کا ہاتھ تمام کر چکا ہوں۔"

"میرا ہاتھ تو سمجھو تمہارے ہاتھ سے پھوٹ گیا بیٹا! لیکن اپنی جی کا ہاتھ کبھی نہ پھوڑنا..." اس کی کوار بالکل ہی بند تھی اور اس بار وہ کوشش کے باوجود آنکھیں نہ کھول سکا۔ سانس کی مدد میں فرغابٹ کے سوا اس کے وجود میں زندگی کی کوئی علامت نہیں تھی۔

میں تھو سال کا ایک نامیہ لڑکا سانس سانس کرتے اس مکان میں خون میں لخت بہا ایک جاں بلب انسان کے سہانے بیٹا۔ اپنی ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ ماں جو چھاننے کہاں رہتی تھی۔

میرا انتظار زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ کچھ گھنٹے بعد میں شیشا نور ان کے پیچھے پیچھے وہ آئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سیاہ رنگ تھا۔ میں نے میرا ہاتھ چما اور مجھے ایک طرف ہٹے کو کہا۔ سیاہ رنگ والا کوئی جھٹک کر ہلا چندن کا ساتھ کرنے لگا۔ ہلا چندن لب بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کی سانس کی مدد میں فرغابٹ بھی کچھ دیر پہلے معدوم ہو چکی تھی۔ سیاہ رنگ والا کوئی جس کے گلے میں اسیتو سکیپ میں تھا مگر جو ٹالہ ڈاکٹری تھا کئی منٹ تک ہلا چندن کا ساتھ کرنے کے بعد سیدھا کھڑا ہوا اور اس نے جی کی طرف دیکھ کر لٹی میں سر ہلایا۔ میں نے پھلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ انہوں نے ایک گرمی سانس لیا۔ ایک لمحہ کے لئے ان کے چہرے پر غلام کے آثار

گاڑی اشارت ہوئی۔ میں نے دودانہ بنے کیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ گاڑی گیٹ سے نکل
 گئی تو میں دیر تک گیٹ پر کھڑا اسی طرف دیکھتا رہا کہ عروہ ملے گی۔ حالانکہ اس کی سرخ
 چٹیاں موڑ پر کب کی بھی نظر آئی ہیں اور بھل ہو چکی تھیں۔ ایک گہری سانس لے کر میں

تکبر اہٹ کیسی مگر؟ ہوا چہاں کہا کرتے تھے کہ انسان کو اگر چاہوں طرف سے گوم
خود شیر تکبر لیں تب بھی تکبر اٹھیں چاہئے۔ کہ "سوچنا چاہئے کہ ان کا تکبر کیسے توڑا جا
سکتا ہے۔" میں نے ہوا چہاں کی نصیحتوں میں سے ایک نصیحت دہرائی۔ "تھریری آواز میں

"ارے ہا! تم یہ سب کس لئے کرتا ہے؟" وہ تشریح نہ لے سکی کہ اس نے کیا کرنا چاہی۔
پھولی مر میں تم اتنا مشقت کرتے اپنی جان کو اتنا تکلیف دیتے اتنا مضبوط بنانا لیکن جب تم
مر جانے کا تو مٹی میں اتنا شامدار جسم کو کیڑا نکوڑا کھا جائیں گے۔ میں ٹھیک ہوتا ہوں؟
تم کوئی خامدانی پہلوں تو نہیں ہو؟ تم ایک دم لرست کلاس سکول میں پڑھتا ہے۔ چہ
لکہ کر ہر شے کا انجینئر بنے گا؟ ڈاکٹر بنے گا مگر پہلوں تو نہیں بنے گا؟ پھر یہ پہلوں
کسے کو کرتا ہے؟ ابھی زیادہ عمر تک ایسے کرے گا تو تمہارا دماغ ایک دم موٹا ہو جائے گا
باریک باریک بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

"مجھے سمجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے مسٹر جوزف؟" میں جواب دیتے۔ "میں صرف یہ
چاہتا ہوں کہ یہ میری ہی کا حکم ہے اور آپ تو مجھے اپنی طبیعت ہو گئی ہے کہ ایک طنز
دور زں پوری نہ کہوں اور ایک آدھ حق چھوڑ دوں تو جسم ٹوٹنے لگا ہے اور حرارت سی
ہوئے لگتی ہے۔ بالکل ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے جیسی تمہاری اس طنز ہوتی ہے جب
تمہیں ہائیٹ پارس دینے نہ ملے اور جہاں تک دماغ موٹا ہونے کا تعلق ہے تو معاملہ
ابھی تک ٹھیک جا رہا ہے۔ جیسا شاید علم نہیں کہ میں سکول میں ہر ٹیسٹ میں فرسٹ آ
ہوں۔"

معلوم نہیں میری بات جوزف نے سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن بول کا ذکر سن کر وہ
ایک فطری سانس ضرور لیتا۔ پھر وہ اپنے کونٹ کی جیب سے ہائیٹ پارس کا ایک چٹا ادھا
ڈال اور ایک گھونٹ پھر کے بول کو پر خیال نظروں سے گھورتا ہوا کہ "میں کبھت نے
ہمارا فیملی چٹا کر دیا۔ ہم گھر میں بیٹا تھا۔ ہم کو دیکھ کر ہمارا سب بیٹا بھی پنے لگا۔" ہم
بہتر مثالی لوگ میں میری طبیعت یہ ہے کہ ہم اگر بیٹا ہے تو پھر آہستہ آہستہ اپنی پنے لگ جاتا
ہے کہ مستعد کا مستعد خالی کر جاتا ہے۔ ہم ایم فوٹو!"

پھر وہ انگریزی میں اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو مٹی مٹی گالیوں دینے لگا۔
جون جون گالیاں سنگین ہوتی جاتیں توں توں اسی کے پنے کی رفتار بھی تیز ہو جاتی۔ کبھی
کبھی بول خالی کر کے وہ لمبے میں دشمن پر بیخ دیتا اور سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے
ہوئے کہتا۔

"ہائی پارس! تم کبھی مت چنا ورت ہم تمہارے وانت توڑ دے گا۔"
وہ میرے وانت توڑنے کی بات کرتا تو اس کے استخوانی ہاتھ دیکھ کر مجھے ہنسی آ جاتی
تھے ہنسل جیڈ کرتے ہوئے میں کہتا "میرے استخوانی ہاتھ نے مجھے قسم دے رکھی ہے
کہ میں کوئی ایسی چیز نہ کھاؤں گا جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔"
"ہا! چہن کان قتل کوئی رشتہ مر قتل؟" اس نے کئی مرتبہ میرے منہ سے ہاتھ چہن کا

لے اپنے دونوں ہاتھ چہن پر رکھ کر صاف کے اور گیت بن کر کے واپس آگیا۔ گورنس
ٹپلا ہر آمدے میں کھڑی تھی۔ اس کے ہل اب بھی کھرے ہوئے تھے۔ جنہیں کھنکھن کر کے
کا اسے موقع نہیں ملا تھا۔ اس کا چوالب بھی لود تھا۔
"تمہیں ڈر نہیں لگ رہا محبوب؟" اس نے سر تاپا میرا ہاتھ لیتے ہوئے جیب سے

لے میں پوچھا۔
"کس بات کا ڈر؟" میں نے قد سے حیرت سے پوچھا کیونکہ مجھے ترج تک ہلا ہی
نہیں کیا تھا کہ ایسے موقعوں پر غل نہ ہوا جاتا ہے۔ ہاتھ چہن کا کرتے تھے۔ ڈرنا صرف
حوروں کی عادت ہوتی ہے۔ آج ہاتھ چہن مر چکے تھے تو مجھے ان کی ایک ایک بات وہ کہ
یاد آ رہی تھی۔

"ہاتھ چہن...! گورنس ٹپلا نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ اور وہ خدا کی
آمرکی میں نہ جانے کس غیر ملکی چیز کو گھورتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "وہ ایک
بے محل انسان تھے۔ ایک احسان کا بدلہ چکانے میں اس نے جس طرح عمر گزار دی ہے
انہی کا کام تھا۔"

"وہ احسان کیا تھا؟" اور کس نے کیا تھا؟ میں نے پوچھا۔
"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ جو کبھی تمہاری ہی نہیں سنائیں گی۔ اب تم کیڑے ہاتھ
اور سو ہاتھ۔" اس نے گہری دیکھتے ہوئے کہا۔ "کنج تمہیں بیڈ پر جانے میں ایک گھنٹہ کی
تاخیر ہو گئی ہے۔"

میں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا اور کیڑے بول کر سو گیا۔ دوسرے دن میں
فیکسی میں سکول ٹیبل تیسرے دن ایک ڈرائیور آگیا اور زندگی ایک بار پھر اسی یکسانیت اور
سکون سے گزرنے لگی۔ ہاتھ چہن کی ناگہانی موت کا واقعہ اب بوجھ ہی یاد نہ گیا تھا گویا کسی
بے سکون جہلی میں ایک ٹکڑا گرا تھا۔ چہن لوہوں کے دائرے نمودار ہوئے تھے اور معدوم ہو
گئے تھے۔

نیا ڈرائیور بس فرا ڈرائیور ہی تھا۔ یہ ایک بوڑھا سا جیسا ہی تھا۔ ہم تو اس کا جوزف
تھا لیکن جب تک اسے ہاتھ مسٹر جوزف کہہ کر نہ پکارا جاتا تب تک بات کا جواب نہیں
دیتا تھا۔ بتل اس کے لئے اس کے لوگوں کی آوارگی نے تھک کر دیا تھا۔ وہ نہ ایک
صاحب جائیداد اور جموں کوئی تھا اور کسی زمانے میں بستی کے لوہے طبعوں کی پارٹیاں اس
کے بغیر مکمل نہ ہوتی تھیں۔ جوزف میں ہاتھ چہن بھی کوئی بات نہ تھی۔ وہ نہ تو ہاتھ
چہن کی طرح سلا نہیں سوڑ سکتا تھا اور نہ ہی ان کی طرح گدھر گھما سکتا تھا بلکہ ہر مدد سچ
و شام لگے اکھاڑے میں ورزش کرتے دیکھ کر وہ بے حد پریشان ہوا کرتا تھا۔

”پھر کہ سرگیا“ آفریں جوف نے پہلا

”ایک رات وہ.....“ میں بدلتی میں ملنے لگا تھا۔

کہ ایک رات وہ کس طرح نکل کر چلا گیا تھا جین بدلت مجھے مٹی کی ہدایت دے آگئی اور میں نے جلدی سے گناہ ایک رات وہ ہم سے ناراض ہو کر چلا گیا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔“

شب و روز برفی گزرتے رہے۔ مئی حسب معمول ہر جہاز کی شام کو آتی تھیں اور چند گھنٹے بعد ہی اس گزار کر چلی جاتی تھیں۔ اب میں اتنا سمجھتا ہوں کہ وہ چکا تھا کہ مئی سے اصرار کر کے پچھ سکوں کہ آخر وہ مجھے اسٹو ساتھ کھینچیں گے یا نہیں۔ جبکہ وہ مجھے اتنا یاد بھی کرتی ہیں اور میرا بھی ہر وقت ان کے قریب رہنے کو جی چاہتا ہے۔ انہوں نے سمجھایا کہ وہ ایک قصبہ نما شہر میں ملازمت کرتی ہیں اور چونکہ وہاں کوئی اچھا سکول نہ ملتا تھا تو انہیں یہاں رہنا پڑا تھا۔ ان کی خواہش ہے کہ میں کالج نہیں ہے اس لئے وہ مجھے وہاں رکھنا نہیں چاہتیں کیونکہ ان کی خواہش ہے کہ میں نہایت شاندار درس گاہوں میں تعلیم حاصل کروں اور بہت بڑا آدمی بنوں۔

ملاست وہ اس لئے چھوٹا نہیں جاہتی تھیں کہ وہ کوئی معمولی ملاست نہیں تھیں اور انہیں بہت بھاری محکومہ ملتی تھی۔ جس سے وہ اپنا کور میرا ہٹلی مضارہ زمری کاغذ رکھ سکتی تھیں۔ کور پھر وہ کہ میرے والد کا میرے ہوش منہ لےنے سے پہلے ہی انقلاب ہو چکا تھا اس لئے ہمارا کوئی اور ارجہ گزر اوقات بھی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ ملاست کرنے پر مجبور تھیں۔

”جب تم ہاں کہہ کر پڑے کوئی بن جاؤ گے ٹال۔“ میں نے گویا چشم تصور سے
سجھیں میں جھانکتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ ”اور مجھ سے بھی زیادہ کھانے
کو گئے تو میں ملازمت ہی نہیں دیا کی ہر مصروفیت ترک کر دوں گی۔ بس پھر مرنے دم
تک اپنے بیٹے کے پاس رہوں گی۔ ایک لمحے کے لئے بھی تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔“
لن کی مختلف نیکیوں آنکھوں پر ایسی چکوں کی جھلکیں ساکت تھیں۔ نور ۱۱ ہوا میں
نہ جانے کس غیر مٹی چڑ کو محور رہی تھیں۔ سفید ہانڈے سے ملتے میں گمرا ہوا ان کا ملکوتی
چہرہ آخر شب کے چاند کی طرح روشن مگر کچھ زرد سا تھا۔ کبھی کبھی ۱۱ پونسی چھکی چھکی سی
نظر آئے لگتی تھیں۔ نور اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ لن کی یہ چھکن یہ چھوٹکی ہے سبب
میں ہوتی تھی۔ ملازمت میں انہیں نہ جانے کتنی محنت کرنی پڑتی تھی اور پھر ہر چلتے ۱۱
خاصا طویل سڑک کے مجھ سے ملنے آتی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ۱۱ لصب پٹا نے تقریباً ۱۱

میل لار تھا جہاں وہ رہتی تھیں اور کار میں وہاں سے بجے آتی تھیں۔
 یہاں چہان کے قل کو تقریباً "ڈیڑھ گھنٹہ" گزر چکا تھا جب ایک شام ہورل نے ہلاکہ
 مجھے اس کے ساتھ ایک جگہ چلا ہے۔ اسے می سے کچھ دوا لیا لی تھیں۔ میں بتا رہی کہ
 اپنے کمرے سے نکلا تو وہ ایک بریل کیس اٹھائے برآمدے میں کھڑا تھا۔ بریل کیس اس
 نے کار میں کھلی سیٹ پر رکھا اور ہم ایک انجیل چلنے کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں پوچھے
 "ہیرنہ رہا۔" "ہم کہاں جا رہے ہیں مسٹر ہورل؟"

”ماٹریٹھان کے پاس۔“ اس نے جواب دیا۔ ”نکل سے تم پر ایک اور بوجھ چڑے گا۔“
 ”جیسے جو لو کی کلاس اینڈ کرنے جانا ہوا کرے گا اور پھر کرائے لیکھنا ہو گا۔“
 ”جی ہاں ہے کہ تمہارا مٹی تم کو کیا جانتا تھا ہے؟“

”مجھ کو بھی چھل ملنا مانگ۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس شخصان سے روزف کی مراد دراصل ماسٹر شہنازی تھی ہے، جس کا میں نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔
”ہر..... ہر.....“ روزف نے ایک ہند نہنگ قہقہہ لگایا۔ ”تمہارا میں تم کو اتنی سے فٹ ملنا مانگ۔“

آخری شکل دینے کے بعد شائی تن نے شانہ رام کاظمیہ کرانے پر لے کر مقابلہ کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔

میں مقابلے کے لئے تیار تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے دل کے ایک گوشے میں ابھی شائی تن کی رحمت اور ہمدردی پر قرار تھا۔ ہاشمہ اس نے اپنا دل کھل کر دیا تھا میں سمجھتا تھا اور اسے میری راحت پر ہے پھر غرض تھا لیکن اس کی تمام تر مہارتوں کے باوجود مجھے اندیشہ تھا کہ ملی کی طرح تمام داؤد شیر کو کھانے کے بعد بھی اس نے ایک کچھ دوا محفوظ نہ رکھا ہو۔ دوسرے یہ کہ اسے چوک کے سامنے اپنے فتنے کے مظاہرے کا طویل تجربہ تھا جبکہ میں پہلی مرتبہ اس قسم کے مرحلے سے گزرنے والا تھا۔

اب سب باتوں سے دلچسپی ختم کر دینی نہیں چاہیے صرف یہی میں شائی تن سے مرعوب تھا۔ اس قدر عجیب و غریب صلاحیتوں کا مالک تھا کہ کبھی کبھی تو مجھے اس پر کسی باطنی اضطراب لگتی تھی کہ وہ بولے گا کہ کھانے کے جس وار سے میں مارا جاؤں گا اس کے بعد وہ فوراً دیکھتا تھا۔ انہیں شائی تن اس طرح ہواشت کر جاتا تھا کہ اس کے من سے ابھی سی کر رہا نہیں تھا۔ قہقہے اور نہ ہی اس کی کوئی ہڈی اپنی جگہ سے ہلکتی تھی۔ قوت ہواشت اور وار کو رائل کرنے کی صلاحیت تو مجھ میں بھی ابھی تھی لیکن میں وار کرنے کے معاملے میں اپنے آپ کو شائی تن سے کسی قدر کمتر محسوس کرتا تھا جبکہ شائی تن کا کہنا تھا کہ یہ میرا دھم ہے۔ شائی تن جب ہواشت کرتا تھا تو شائیں کی سی کواں پیدا ہوتی تھی جسے یہ ہواشت میں کھلیا گیا ہو۔ سب سے نون 03036360959

وہ جب پہلی طرح انکسٹن میں ہوتا تھا تو اس کے ہاتھ پیروں پر نظر نہیں پڑتی تھی کرانے کا اس سے بڑا حیرت انگیز مظاہرہ تھا جس میں اس نے تقریباً دس بارہ فٹ لمبے اور ایک فٹ کی گولڈی کے اندر سے ایک وار سے دے کر کھڑے کر دیا تھا۔ یہ مظاہرہ ایک ماہ عمل میں بھی کر چکا تھا۔ گویا اب ہر لحاظ سے میں اپنے استاد کا مقابلہ تھا اس کے باوجود نہ جلتے کھڑا بل پر ابھی سی مرحمت طاری تھی۔ بہر حال اس کا فیصلہ بھی اب آخری مقابلے میں ہو جاتا تھا کہ یہ مرحمت میرے دل پر عین مسلط رہے گی یا ختم ہو جائے گی۔

مقررہ تاریخ پر ہم کچھ ہی شانہ رام کاظمیہ پہنچ گئے تھے اور خلل بل۔ کہ سامنے پہنچے اپنے مظاہروں کی دوسرے کر رہے تھے۔ مقابلہ دیکھنے کے لئے شام کو بھی بھی آنے والی تھیں۔ دھیرے دھیرے شائی تن اور اس کے دیگر شاگردوں کے ساتھ بٹا پھٹا کھانا کھایا اور ہم ریاضت گاہ میں سستانے لگے۔ شائی تن ایک کاؤچ پر نیم دوا کر چوبیس سی گھنٹوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”منصور! چھ ماہی عمر صرف 16 سال ہے۔“ چہ لئے بعد اس نے کہا۔ مگر مقابلے

”تو کچھ مسلح جوتہ“ میں نے سہجائی سے کہا۔ ”اب میرے استاد ہو چکے ہیں۔ اب تم ان کا ہم گج طریقے سے لیا کرو۔“

جوتہ نے اپنے مخصوص انداز میں سبہ بھم تھم لگایا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ آگے بڑھ میں ٹھیک آدھے شائی تن کی کوئی پہچان نہ میرا خطرہ تھا۔ پہلے دن اس نے مجھے ایک ڈھکی ڈھکی سلیب شریٹ اور ایسا ہی اسیلا ڈھلا پاجامہ دیا اور بڑے اہتمام کے ساتھ مجھ سے چند خاص خاص باتوں کا وعدہ لیا تھا۔ یہ کہ اگر میں نے دیکھی کے ساتھ جوتہ اور کرانے کے لیے یہ وعدہ حاصل کر لیا تو اسے خیر خواہی کے لئے استعمال نہیں کرونگا۔ اپنے سے کہو یہ بات نہیں انکسٹن کا اپنی طاقت کو کسی لالچ کے تحت استعمال نہیں کرونگا۔ کسی کا کڑا کر نہیں ہوں گا وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد شائی تن نے مجھے ایک طویل پتھر دیا جس کا مقصد مجھے جوتہ اور کرانے کی تعریف سمجھانا تھا۔ اس کا مقصد معلوم یہ تھا کہ یہ دراصل کوئی لٹن حرب یا وائی بڑائی کا ہر نہیں بلکہ بالکل ایک علم ہے جس کا تعلق جسم کے ساتھ ساتھ مدد لیکن اور قوت ارادی سے بھی ہے اس کے بعد اس نے مجھے استاد اور شاگرد کی باہمی تعلیم اور اکھاڑے کے قواعد سکھائے جو اس فتنے میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

یہ سب کچھ دیکھ کر انکسٹن کرانے کے بعد اس نے مجھ سے سوال جواب کر کے ایک طرح سے میرا ٹیسٹ لیا اور مطمئن ہو کر مجھے چھٹی دے دی۔ آگے دن سے میری باقاعدہ تربیت شروع ہوئی یہ ایک دلچسپ فتنہ تھا اور اسے دیکھتے ہوئے میری دلچسپی روز بروز بڑھتی گئی۔

انسان باطنی پر نظر دینے تو ہر بات پر واقعہ ہر یاد خواب و خیال گنتی ہے۔ ماہ و سال لکھوں سے بھی گزر گئے ہیں۔ پتا میں مجھے اپنی تعلیم و تربیت کا دور اس وقت بہت سستا رہتا تھا اور طویل محسوس ہوتا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے گویا میں پچھلے میں عمر کے سو اسی سال میں پہنچ گیا تھا اور یہ وہ وقت تھا جب شائی تن نے مجھے ایک جلیٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تک اس کا کام خاصا سبیل چکا تھا اور اس کے پہاڑ 27 شاگرد تربیت کے آخری مراحل میں تھے جن میں ایک اگرچہ لڑکی بھی شامل تھی۔ انہاں میں متانوں میں میں ان سب کو شکست دے چکا تھا۔

ایک جلیٹ حاصل کرنے کے لئے مجھے ماسٹر شائی تن سے مقابلہ کرنا تھا۔ جس فائنل یا آرائش مقابلہ میں بلکہ بحریر اور فیصلہ کن حقیقی مقابلہ۔۔۔ شائی تن نے فیصلہ دے دیا تھا کہ یہ مقابلہ ضرور منعقد ہو گا اور فیصلہ ضرور اس کی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مقابلہ ایک بالکل شرعی طرح منعقد کیا جائے اور ہر کی چھو چھو ہستیوں اور اطہاری نمائندوں دیکھ کو بھی مدعو کیا جائے۔ اس مقابلے کی تیاریوں کے

سے گل مٹی لیکن ساتھ ہی میں نے اس کی کلائی پر کراٹے کا داؤ ٹکڑی مگر بس "آندیا اور چھری اس کے ہاتھ سے بھی گل مٹی۔ شانی تن ایڑی کے بل گھبرا اور اٹے مرغ اس کی ٹانگ ہوا میں بلند ہوئی۔ میں پیچھے ہٹ چکا تھا وہ نہ یہ وار جسے "چاکی" کہا جاتا ہے میرے زرخیز کو مٹی کے کھلنے کی طرح بچا کر رکھ دیتا۔

اس سے پہلے کہ شانی تن کا چہرہ میری طرف ہوتا میں نے صوبہ چار "کو آندیا۔ یہ ایک سائیکلنگ گلی جس نے شانی تن کو فضا میں اچھل دیا۔ وہ ہاتھوں کے بل چھلی فرش پر آتا اور اس سے پہلے کہ میں کوئی وار کر سکتا وہ اسپرنگ والے گڈے کی طرح سیدھا ہوا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر میری طرف بوجھ کراٹے کا وار کرنے سے پہلے اس نے میری ٹھوڑی پر ٹھوکر دیکر کرنے کی کوشش کی جو میں نے ٹھکرا دی۔ لیکن ہاتھیں کھڑے پر پڑنے والے کراٹے کے ہاتھ سے میں اپنے آپ کو نہ بچا سکا۔ ایک ٹانھے کے لئے مجھے قسوس ہوا کہ میری قہقہہ کی ہڈی اتر گئی ہے۔ لیکن اپنے آپ کو دوسرے وار سے بچاتے ہوئے میں نے جسم کو ہٹا دیا اور دائیں ہاتھ سے "چان شانی کوت" نامی داؤ مارا۔

تکلیف کے باعث شانی تن کے پٹے پٹے ہونٹ کھینچ گئے اور آنکھیں گھبرا گئیں۔ پھر ملنے سے ایک قسوس آواز نکلا کہ وہ ہوا میں اچھلا۔ اس کی ایک ٹانگ نے مجھے گھمسا دیا اور دوسری ایڑی پشت پر پڑی۔ یہ وار اچھلتا ہوا چڑھا پھر میری ریڑھ کی ہڈی کو کڑا کر رہ گیا۔ میں نے ایک بار سٹاپ کی طرح جسم کو لہرا دے کر ڈانٹا قائم رکھے کے ایک طریقے "موت" کہنے کی عادت سے اپنے آپ کو بچایا۔

اب میں نے لیٹ کر وار کرنے کی فطرت "اٹ" کی ایک زوردار جھج کے ساتھ میں فضا میں بلند ہوا اور میرے چاندل ہاتھوں کیوں نے ایک وقت حرکت کی۔ لیکن میرا یہ وار عمل نہ ہو سکا۔ شانی تن کی ایڑی میری ناف سے گزری اور میں چٹ کرتے کرتے چھا اپنے جسم کو کھان کی طرح موڑ کر میں ہاتھ کیوں کے بل گرا اور سیدھا ہونے ہونے لات گھمائی اور میری ایڑی کی ضرب شانی تن کے سینے پر پڑی۔ میرے لئے یہ انداز کرنا مشکل نہ تھا کہ اس کی کالی پٹلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ مگر بلاشبہ وہ غضب کا آبی قند سینے پر ہاتھ رکھ کر صرف ایک لمحے کے لئے جھکا پھر فوراً ہی سیدھا ہو کر اس نے میرے کھڑے پر کراٹے کا ہاتھ مارا۔ اس کے وار میں اب طاقت نہیں تھی۔ میری مہمندانہ کوشش کی وجہ سے یہ ہاتھ اچھلتا ہوا میری پیشانی سے رگڑ کھاتا گزرا اور وہیں سے میری کھال پھٹ گئی۔ طون کی مرغ نہ نے ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ اگر شانی تن کی پٹلیاں نہ ٹوٹ چکی ہوتیں تو اس لمحے وہ میرا کام تمام کر چکا ہوتا۔

میں نے ہاتھیں ہاتھ سے طون پر لچھا اور شانی تن کی گردن پر کراٹے کا ہاتھ دیکر کھل کر کراٹے کے کسی معمولی کھلاڑی کی گردن اس وار سے ٹوٹ جاتی لیکن میرا مقابلہ اپنے ہی

میں تم نے مجھے گھٹ دے دی تو اس کسی میں تمہیں بیک بٹ مل جائے گا اور جلد کراٹے کی تاریخ میں ہاتھ یہ ایک دیکھا ہو گا لیکن یہ مت بھولنا کہ اس مقابلے میں "میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا اور اس کو آبی پر ہم دونوں میں سے کسی کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے جس کے لئے ہم ایک اقرار نامے پر بھی دستخط کر چکے ہیں۔"

"مجھے سب یاد ہے ماسٹر شانی تن نے اس وقت سے کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو گھومنے لگا۔ میری آنکھوں میں مٹی کا چہرہ ابھرا آیا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ ان کی نظروں میں سرخ ہونے کی فکر تھی۔ اپنی جان کی مجھے کوئی خاص پورا نہیں تھی۔ دنیا میں صرف ایک ہی ہستی تھی جس کی توقعات پر پورا اترنے اور جس کی ٹھوڑی حاصل کرنے کی مجھے گھن تھی اور وہ ہستی میری ماں تھی۔ اس کے علاوہ دنیا کے کسی فرد کی میری نظر میں اتنی اہمیت نہ تھی کہ میں اپنے ہارے میں اس کی رائے کی فکر کرتا۔

تھک۔ مگر تیز روشنیوں کے سیلاب میں وسیع اسٹیج کا یہاں اٹھال ہال میں حاضرین کی تعداد زیادہ نہیں تھی کیونکہ عام لوگوں کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اسٹیج کھڑکی کی طرف تمام قدامت پسند کے بعد آید۔ کھلے تک شانی تن کے 18 شاگردوں نے جلد کراٹے کے نمائندگی مطالبے کی۔ کئے اور آخر میں شانی تن اور میں اسٹیج کے پچھے چھلی فرش پر بیٹے ہوئے۔ رتبہ میں اترے۔ ہال میں دو قسمی ست دم تھی۔ اس لئے میں حاضرین میں مٹی کا چہرہ تو نہ دیکھ سکا۔ البتہ ان کی رہنمائی سفید چادر کی بھنگ میں نے اگلی قطار میں دیکھ لی تھی اور میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔

حاضرین کو سلام کرنے کے بعد میں اور شانی تن ایک دوسرے کے مقابل آگے ہم نے تقریباً "دھڑک" کی سی حالت میں جھک کر ایک دوسرے کو تعظیم دی اور پھر پیچھے ہٹ کر اسٹیج کے عقب سے داخلی داخلی فٹ لپی دو قسوس چھٹاؤں ہماری طرف اچھلی گئیں۔ یہ چھٹاؤں ہم دونوں نے اس طرح کچھ کیں کہ ہمارے ہاتھوں میں کتے ہی یہ پٹے کے پہلوں کی طرح جھڑی سے گردش کرتے گئیں۔ اس دوران ہم ایک دوسرے کے سامنے چکر کاٹ کر نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو تولتے رہے۔ دھڑک "ہوا میں شانی تن کی سی گواہ پیدا ہوئی اور میں اچھل کر ایک طرف کو ہٹ گیا نہ جانے کب شانی تن کی چھری کی گردش رکی تھی اور کب اس نے وار کیا تھا۔ لیکن ہر حال مجھے اتنا اندازہ ہے کہ اگر چھری کی یہ ضرب میری کھوپڑی پر پڑی ہوتی تو اس طرح سر کے پرچے اڑ جاتے جس طرح کسی من ورنی گرز سے وار کیا گیا ہو اور یوں مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا کیونکہ چھری کے یہ کرب تو در حقیقت صرف خون گرنے کے لئے ابتدائے میں دیکھائے جاتے ہیں۔ میں نے ہاتھیں طرف نکلتے ہی اپنی چھری سے شانی تن کی پٹلیوں پر وار کیا۔ شانی تن نے نہ صرف میرا وار خالی کر دیا بلکہ اس نے چھری پر ہاتھ بھی لال دیا اور وہ میرے ہاتھ

پہا کی سڑکیں ہن دونوں کا چہرے ہی سسٹان ہو چلایا کرتی تھیں اور جس وقت میں ہسپتال سے نکلا اس وقت تو ہاتھل ہو گا عالم طاوی تھا جب میں آزاد ہوڈ ہے پانچا تو چاند ہڑوں کے عقب سے اگل آیا قلم آزاد ہوا کے دونوں طرف لائل جھون پھیلا ہوا قلم ہے

نے کہا۔
 "مقام اطمینان سے سب کام کرو۔" انہوں نے میرا کدھا چھپتے ہوئے کہا۔ "میں تو
 اب واپس جا رہی ہوں۔ صرف اس مقابلے کے لئے وقت نکال کر آئی تھی۔ کچ کا دن
 بلاشبہ میرے لئے ایک ناقص فرہوش خوشی کا دن ہے۔ ایک طویل مدت کے بعد ایسی طوفانی

پہا کے حصول ترین لوگوں کی عظیم الشان کوششیں اور جنگوں پر مشتمل ہستی تھی۔ ان بڑے بڑے سینکڑوں اور ساہو کاروں میں سے کسی کے کاروبار دیکھو جیتی یا نکلتے چہے بڑے بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ یہاں رہتے بھی نہیں تھے۔ سال میں سینے یا دو سینے کے لئے آتے تھے اور آرام و عیاشی کر کے چلے جاتے تھے۔ ان کی کوششیں عموماً غلط چلی رہتی تھیں۔

میں اپنے خیالات میں مگن ورمیانی رہتا رہتا تھا۔ ایک کار خیز و تباری سے میرے قریب سے نکلی اور کچھ آگے جا کر یوں ترچھی ہو کر رک گئی کہ میرے لئے گاڑی ٹکالنے کا راستہ نہ رہا۔ سڑک کے دونوں طرف سلیڈے کے درختوں کی قطاریں تھیں جنہوں نے خاص جگہ گیر رکھی تھی۔ میں نے اس کار سے کالی فاسلے پر ہی اپنی گاڑی روک لی۔

وہ گہرے رنگ کی ایک بلی سی اوٹھا تھی جس کے ایک دودھالے پر پنے رنگ کا بڑا سا دائرہ بنا ہوا تھا جو خاصا گھیب نگ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے کار کے دودھالے کھلتے دیکھے۔ چار الزمو کار سے کود کر نکلے۔ وہ تیزی سے میری طرف لپکے تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک دروازہ گھومتی تھی جس کے تراشیدہ ہل ایک لمحے کے لئے اس کے کندھوں پر اترتے تھے۔ وہ چست، سلیڈے رنگی بلاڈر اور سیاہ بریس پنے ہوئے تھی۔ وہیں میں قفل پوٹ تھے۔ عام طور پر بڑے سینکڑوں کی بیٹیاں اس محلے میں شکار پر نکلتی تھیں۔ چاندنی میں اس کا رنگی بلاڈر چمک رہا تھا۔ تینوں کوئی دھیلی اسلحہ سی پٹوئوں اور ان سے مختلف رنگوں کے کولہوں میں لپوس تھے۔

میں اس وقت بھی اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا جب وہ میری گاڑی کے قریب پہنچ گئی اور ایک موڈرائٹنگ سیٹ دلی کڑی کی طرف تھے اور وہ موڈروسی کڑی پر تھے۔ لڑکی میرے قریب کڑی پر تنک نکلی اور تب میں نے دیکھا کہ وہ کم عمر گھرے چہرے حسین تھی۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، لمبی سٹاٹوں ناک اور بھرے بھرے ہونٹ۔ اسے دیکھ کر کسی ایسے رستے پھل کا خیال آتا تھا جو وقت سے پہلے پک گیا ہو۔ سر سے پاؤں تک وہ کسی باہر نگاروں کا ہمسر تھی۔

لڑکی کی قومیت کا اندازہ لگنا مشکل تھا ظاہرہ پریشین معلوم ہوئی تھی۔ لیکن جب وہ بولی تو اس کا لب و لہجہ خاصیتاً بعد ستانی تھا۔

”سٹر مشور“۔ اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔ ”ہم آپ کو ایک چھوٹی سی رحمت دینا چاہتے ہیں۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ایک کوٹھی ہے۔ آپ کو یہاں تک چلنا ہو گا صرف دس منٹ لگیں گے۔“

”مگر تم لوگ مجھے لوتنے کا ارادہ رکھتے ہو۔“ میں نے لڑکی کے ساتھیوں کے چہرے پر

نظر ڈال کر سرسری سے لہجے میں کہا۔ ”میرا اندیشہ دواندہ اورانہ اور دوستانہ معلوم ہے کہ کوئی اور آسانی تلاش کر لوں۔ میرے پاس اس وقت کوئی خاص رقم موجود نہیں ہے اور نہ ہی میں کوئی امیر راہ ہوں۔“

لڑکی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”ہم اسے معمولی قسم کے ایچے نہیں کہ چند سو یا چند ہزار کی رقموں کے لئے یوں لوگوں کو راستے میں روکتے پھریں یا ان کے تعاقب میں چار چار ہفتے تک صاف کرتے پھریں۔“

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہے؟“ میں نے سیٹ پر پہلو ہل کر اس کی بات کھینچنے پر چمکا۔

”آج شام شامتا رام اکھٹرم میں تمہارا مقابلہ دیکھنے کے لئے ہم بھی موجود تھے۔“ لڑکی کا لہجہ اب قطعی دوستانہ سا ہو گیا تھا۔

”جب میں جانا چاہوں گا کہ تم لوگوں کو مجھ سے کیا کام ہے اور کیا اس کے لئے میرا تمہارے ساتھ اس کوٹھی میں جانا ضروری ہے جس کا تم نے ذکر کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”ہم ہمیں نہیں تمہارے بیٹھ کو ہے جو بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔ تمہارا مقابلہ دیکھنے کے لئے ہم اس کے ساتھ گئے تھے اور مقابلہ ختم ہونے ہی اس نے ہمیں پرامیت کی قسم کہ ہم تمہیں اس سے لے کر رحمت دیں لیکن اس وقت تم بہت زیادہ ہانگ ہو رہے تھے۔ میرا خیال ہے اب ہمیں یوں سڑک پر کھڑے ہو کر باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔“ لڑکی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی ادھر آگلا تو راستہ بدھ دیکھ کر خواہ مخواہ تجس میں مبتلا ہو گا۔“

”تجس میں تو میں بھی مبتلا ہو گیا ہوں۔“ میں نے اپنے سبب ترتیب پاؤں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”مگر آخر تمہارے بیٹھ کو مجھ سے کیا کام ہے؟“

”کوئی خاص کام نہیں۔۔۔۔۔۔“ لڑکی اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر مٹی پڑھتا ہوا میں مستکرائی۔ ”مواصل ہمارا بیٹھ بہت لطیف و ناز آوری ہے نا۔۔۔۔۔۔ شاید اسی لئے اسے ہر طاقتور اور خطرناک آدمی سے ملنے کا بڑا اشتیاق رہتا ہے۔“

”ہوں۔“ میں نے غیر ارادی طور پر ٹوٹتی کھائی۔ ”مقررہ کردہ میں یہ کہوں کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور اس وقت صرف لپچ گھر جانا چاہتا ہوں کسی اور کے نہیں تو پھر کیا ہو گا۔“

”پھر یہ ہو گا سٹر مشور۔۔۔۔۔۔“ دوسری کڑی کی طرف سے لڑکی کے ایک ساتھی کی آواز آئی اور میں نے گھٹن گھما کر اس کی طرف دیکھا اس نے ایک بھرے سے رینگ اور کی لمبی ٹال کھلی کڑی پر ٹکا دی تھی۔

”میں دودھ کھول کر تمہارے برابر بیٹھوں گا اور پھر تم اطمینان سے چلو گے کیونکہ

چیک بھی اٹھا دو اور سکول کر میوے برابر آ بیٹھا اور اس نے فرش سے اپنا رخاورد
اٹھا کر میری پسلیوں سے لگا دیا۔ کھجلی سیٹ پر موجود لڑکے کے ساتھی نے اپنی بات ہماری
رکھی۔ دور یہ بھی یاد رکھنا کہ میوے برابر میں جو ڈال بیٹھی ہے۔ یہ صرف نظروں کے حیر
چلاتی نہیں جانتی، دھرم میں بجا ہوا تخیر بھی بڑی عمدگی سے چلائی ہے اور وہ تخیر اٹال سے
اس وقت تمہاری گردن سے صرف ایک سوت کے واسطے پر ہے اور یہ واسطہ اس لئے رکھا

گیٹ کے سامنے پہنچ کر دونوں کاریں آگے پیچھے رکیں تو میں نے دیکھا کہ کوٹھی کی دور تک پہنچی ہوئی چار دیواری کنگریٹ کی تھی۔ آٹھ فوٹ بلند اس دیوار پر سبز چاندی پانچ فٹ کی بلندی تک عمودوار تمروں کا جیل بچھا ہوا تھا اور یہ خار دار نار عام لوہے کے نہیں تھے چائنی میں المونیم کی طرح چمک رہے تھے۔ اگلی کار والے نے ہارن پر شاید ہلکا سا ہاتھ مارا تھا۔ سائلے میں "سپ" کی نظری آواز ابھری۔ دوسرے ہی لمحے گیٹ یوں ہموار ہو رہے گواہ طریقے سے کھلا چلا گیا گیا کسی عرصہ معینی نظام کے تحت کام کرتا ہوا پھر

دروالے کو ہکا سا دکھا دیا اور وہ ٹکک کی معمولی سی آواز کے ساتھ بد ہو گیا۔ لازم نے دروالے کے کمرے سے لمبی سی خرہ سورت لڑائی چلائی ٹال کر جیب میں ڈالی اور مڑ کر محسوساً "میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ شکستہ لہجے میں اپنا تجربہ سناتے ہوئے کسی خفیہ پیام میں رکھ لیا تھا۔ جیکب اور دوسرے آدمی نے ریلوے جیب میں رکھ لئے تھے شاید اس لئے کہ باہر چالنے کا دروازہ منقل ہو چکا تھا۔

جیکب نے باوردی ملازم کو کوئی اشارہ کیا اور وہ ایک دروازہ کھول کر کسی حقل کمرے میں چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس دروازے کے عقب سے دو شخص نمودار ہوئے۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے مجھے گھبراہٹ محسوس ہوئی کہ شاید وہ کسی سرکس کا مسخو ہے۔ اس وقت سوٹ پہن کر سامنے آگیا۔ اس کا لہجہ بالکل پانچ فٹ مہا ہو گیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ امیون کے جنگلات میں رہنے والے بعض قدیم قبائل اپنے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے بعد ان کی کھوپڑیوں کو کسی کیڑائی قمل سے چھوڑ کر کے اپنی ریح کی ٹرائیوں کے طور پر مخلوط کر لیتے تھے۔

اس شخص کا چہرہ ایسی ہی کسی کھوپڑی کی مانند نظر تھا۔ نہایت خطرناک چہرہ اور سر پہ بھونٹے چھوٹے ہلے ہوئے گھری کی دم کے بالوں کی طرح سیدھے کھڑے تھے۔ اس کی آنکھیں چہرے کی مناسبت سے بھولی بھولی اور لود خفیں لیکن ان میں ایک حیرت انگیز چمک تھی اور ان آنکھوں پر شاید بالکیں تھیں ہی نہیں، اس کے جسم پر سگ کا سیاہ سوٹ تھا جو کئی دن سے پہنا ہوا تھا۔ گھبراہٹ میں اس پر ابھی طرح استری نہیں کی گئی تھی۔ سفید قبضے کے بھونٹے چھوٹے کار لوہے کو اٹھے ہوئے تھے اور ان کے درمیان ایک چوڑی سی ٹالی بھول رہی تھی۔ اس کا چوٹی ہونٹ کسی اصلاتی مریض کی طرح ایک لمحے کے بعد پھر اٹھتا تھا اور اس کی نہایت باریک زبانی ہولی سو نہیں یوں دکھائی دیتے گئی تھیں گویا کسی بچے نے ہلکی دھمکی سے ٹیڑھی میڑھی گھیر لیا ہو۔

اس شخص کو دیکھ کر مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی تھی جتنی وہ دیکھ کر ہوئی کہ شکستہ اور اس کے بچیوں سا چہرہ اس کے احرام میں تقریباً "رکوع کی سی حالت میں جھک گئے تھے۔ کئی لمحوں بعد انہوں نے سر اٹھایا اور مجھ سے کالی پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

"اسان مراد جنہیں اپنے گھر میں ٹوٹ کر رہتا ہے تو وہ انہی ہیں۔" اس شخص کی آواز نے مجھے ایک لمحے کے لئے حیران کر دیا۔ کچھ جگہ اس کے حضور وجود کی مناسبت سے مجھے توقع تھی کہ اس کے حلق سے نہایت باریک اور منہائی ہوئی سی آواز برآمد ہوگی لیکن اس کے برعکس اس کی آواز نہایت پٹ دار، گونجی تھی۔ "چوٹا دھبہ والی اور مرعوب کر دینے والی آواز۔"

"سکھو۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "لیکن میں اس بلا سے کا متھد جاتا ہوں۔"

خانے اور نیم گرمی میں ڈھکی ہوئی اس پر فکری عمارت میں بھرا رکھے والی کچھ مدھول نے انہیں کھانے کا اشارہ دیا۔

اگلی کمر پختہ روش پر چند مگر آگے جا کر رکت گئی۔ مجھے بھی گاڑی روکنا پڑی میں نے دائیں یا نہیں نظر ڈالی۔ پھوٹوں سے لٹی کیا رہی اور سرسبز گھاس کے ہموار ٹکڑوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پختہ روش کے دونوں طرف ہالوں کے درخت الیٹا تھے جن کی بلندی میں کسی ایک ترتیب تھی۔ پختہ گیٹ کے قریب درخت چھوٹے تھے اور اصل عمارت کے برآمدے کی طرف بتدریج بلند ہوتے چلے گئے تھے۔ گیٹ کے قریب ہی اندر کی طرف دیوار کے ساتھ ہٹ لیا ایک چھوٹا سا گیٹ ہاؤس بھی تھا جیسا کہ عام طور پر ہولی ہولی اہم سرکاری عمارتوں میں ہوتا ہے۔ جنوں آگے والوں کو حفاظت کے لئے روکا جاتا ہے۔

گاہوں کے رکتے ہی دونوں طرف سے دو باوردی محافظ لیے ان کے ہاتھوں میں رائفلیں اور بارکھن تھیں۔ میری کار کی کڑکیوں پر جھک کر انہوں نے غاروں سے ہم سب کے چولہا پر دو فنی ڈالی، "میں خیر انداز میں مسکرائے اور پیچھے ہٹ گئے۔ وہ دونوں ہی مرہٹے معلوم ہوتے تھے اور اسٹین لوشے ٹھلوں کے ساتھ ان کے قریب فٹ سے بھی لگتے دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں کی ٹھکیں تو مختلف تھیں لیکن ایک ہی جیسی موٹی موٹی غریبہ لوشی موٹوں کی وجہ سے ان میں ہولی ہولی مشابہت نظر آتی تھی وہ دونوں پلٹ کر دھماکہ گیٹ کے قریب جا کھڑے ہوئے جو اب بد ہو چکا تھا۔

اگلی کار کے حلقہ میں چلے ہوئے ہم پورے میں پہنچ گئے۔ جنوں کم از کم میں گاہوں کڑی کرنے کی کھالیں تھیں۔ انجن بد کر کے میں شکستہ اور اس کے دونوں ساتھیوں کے گھیرے میں کار سے اتر آیا۔ اب میرا دھیان ان لوگوں کی طرف کم اور کوٹھی کی طرف زیادہ تھا۔ یہ جگہ واقعی کسی محفل پرست کے غراہوں کا ممکن معلوم ہوتی تھی۔ سگ مرمر کی چند میز مہیاں عبور کر کے ہم برآمدے میں پہنچے۔ شکستہ کا وہ ساتھی جسے جیکب کہہ کر طلب کیا گیا تھا سب سے آگے تھا۔ ساکوان کے اسٹین منقل اور گرانی دروازے کے قریب ہی ایک سرخ رنگی دوری ہوا میں بھول رہی تھی جیکب نے اس کا خوبصورت چہرہ بچہ کر اسے ہکا سا بھٹکا دیا اور اچھڑکیں لگی سی حیرت منقل گونج اٹھی۔

چند سیکنڈ بعد ایک باوردی ملازم نے دروازہ کھولا اور تھ میں نے دیکھا کہ ساکوان کے اس بھاری بھر کم دروازے کی موٹائی کسی قلعے کے دروازے سے کم نہ تھی۔ جیکب کو دیکھ کر ملازم نے جھک کر تعظیم دی اور ایک طرف ہٹ گیا۔

ہم جس کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ ایک طویل و مریض نشست گاہ تھی۔ فرش پر بچے، قلائین میں پاؤں دھوئے جا رہے تھے۔ اور چھت میں آویڑیں بھاری مٹی قالینوں کی جھکاہٹ سے آنکھیں خیم ہو رہی تھیں۔ ہمارے عقب میں باوردی ملازم نے بھاری بھر کم

”ابھی لوگ اپنے کلمات کی بنا پر اہمل ہوتے ہیں۔“ اس نے حیرت کما کر دیا تھا۔
 ”یہ بڑے سول کی توازی نکال گیا ہے ہاں رکام ہو۔“ مورد تم بھی انہی میں سے ایک ہو اس
 گھنٹی میں تمہارے بھی شہ لہری میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ ملا کر مجھے اکثر و بیشتر ایسی
 چیزیں دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے جنہیں عام لوگ کم ہی دیکھ پاتے ہیں۔ ہاں تو میں
 کہہ رہا تھا کہ اپنے کمال فن کی بناء پر تم بھی ایک اہمل انسان ہو اور میں اس دنیا میں
 اہمل انسانوں کا سب سے بڑا قدر دان ہوں۔“

”میں کم عمر اور دنیاوی مصلحت میں خلاصا نا فحیہ کار ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن
 جہاں تک میرا خیال ہے ہر انسان اہمل ہوتا ہے۔“

”کیا نہیں ہے۔“ اس نے ایک بار پھر تاک سے سول کی توازی نکال۔ ”میں دنیا میں
 کثرت ایسے انسانوں کی ہے جن کا قہل لہری آسانی سے ل جاتا ہے۔ یہ مر جاتے تو کر
 اس کی جگہ سنبھال لیتا ہے اور نہ کہیں چلا جاتے تو کوئی اور اس کا کام انجام دے سکتا
 ہے۔ اہمل وہ ہوتا ہے جس کا فانی یا تو موجود ہی نہ ہو اور اگر ہو تو پتی مشکل سے
 ملے۔“

مجھے اس کی باتوں سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی اور پھر اس کی سول سول بھی مجھے
 اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ ”لو“ اس نے کوٹ کی جیب سے ایک حمایت سستا سا مدال
 نکالا اور اس سے تاک رگڑنے لگا۔ کمرے میں ٹیلی کی بو بھل خوشبو گھل گئی۔ ”ابا“
 مدال پر خاصی مقدار میں ٹیلی کا صرٹا ہوا تھا۔ اب تک میں نے اس گھریں جو بھی چیز
 دیکھی تھی وہ حمایت اعلیٰ اور نہیں لذت کی طہر تھی لیکن ستر احسان مرزا کے لباس ”پیر“
 مدال اور اس سے پھوٹتی ہوئی خوشبو کے بو بھل نے مجھے بڑا مایوس کیا تھا۔ ٹیلی کی
 خوشبو استعمال کرنے کا اگر کسی کو آگے حق ہی ہو تو اسے کم از کم لگا تو معلوم ہوتا ہی چاہیے
 کہ یہ خوشبو بھی بھی ہو اسی ہی بھلی گئی ہے۔ شاید احسان مرزا کے دکام کی وجہ بھی اس
 خوشبو کی کثرت تھی۔

”کیسی بھی مجھے لگتا ہے کہ دنیا کی صرف وہی چیزیں ایسی ہیں جن پر ابھی تک میرا
 اختیار نہیں۔“ اس نے مدال گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ مختصر بھی معلوم ہو جائے گا۔“ اس نے اپنی بے چگ آنکھیں ہچکائے بغیر سر تاپا
 میرا چہرہ لیتے ہوئے کہا۔ میں ابھی تک اس وسیلے احوالے سلیر لہارے میں تھا جو میں نے
 مطالبے کے وقت پنا تھا۔ ”بیچو تو سس۔“ اس نے دکتورین اسٹائل کے ایک شاہکار
 صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اپنے گروں سے طلب ہوں۔ ”تم لوگ لب جاؤ۔“

وہ چاروں باہر جانے کے بجائے وہی دروازہ کھول کر اس کے عقب میں غائب ہو
 گئے۔ ہر سے احسان مرزا کیا تھا۔ احسان مرزا کے دواہ کینے پر میں صوفے پر بیٹھ گیا تاکہ
 یوں کہے کہ دھن گما اور وہ بھی محض غلام ”نہیں جی“۔ احسان مرزا میرے
 مقابل بیٹھا تھا ہارے درمیان بیٹھے کی ایک بیوی تھکی تھی جس پر کرشل کی ایک بیوی سی
 اہل نہ رہی تھی جس کے پیڑے پر سولے سولے طرف میں ”فرانس“ لکھا تھا۔
 فائرس کی جھللائی روشنی میں یہ اہل نہ ایک بیٹے سے میرے کی طرح جھک رہی تھی۔
 قہقہہ ہی ایک متعش نگار بکس پڑا تھا۔ احسان مرزا نے اس بکس میں سے ایک سوا
 سا سگر اور تیل کی پٹیلی چھری نکالی۔ سگر کا ایک سوا تراشا اور اسے سگ کر ایک کش
 لیتے ہوئے کہا۔

”تہت یہ ہے مہورا۔“ اس کا لہجہ ایسا ہی تھا جیسے وہ میرا بڑا پرانا شہساز ہو۔ ”مگر مجھے
 اہمل چیزیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے جن میں زعمہ اہمل چیزیں بھی شامل ہیں۔ میرا
 مطلب ہے انسان۔“ وہ سگر کا ایک اور گھرا کش لے کر مسکرایا۔ میں ہونٹ کھینچنے
 خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا اس کے چہرے کے ساتھ بڑا سا سگر حمایت
 جیب لگ رہا تھا۔

"ایک تو میری دوستی ہوئی مگر اور دوسرے میرا دکا۔ میری زندگی کے ستر برس سمندر میں گزرے ہیں لیکن اس دوران مجھے ایک مرتبہ بھی زکام نہیں ہوا۔ گیانا سٹی کی عمر میں میں ٹی بی روپے میں سے ایک لاکھ پر ملازم ہوا تھا اور اس کے بعد ستر سال تک میری زندگی کے شب و روز سمندر میں گزرے۔ خیر بھولو ان باتوں کو۔۔۔ یہ یاد رکھو کہ مجھے پتہ ہے؟ اس گھر میں دنیا کا تقریباً ہر مشروب مل سکتا ہے۔"

"میں یہاں مشروب پینے نہیں گیا۔" میں نے پہلے سے زیادہ اکثرے اکثرے لہجے میں کہا۔ "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں کیوں بلا دیا گیا ہے اور جس انداز سے مجھے یہاں لایا گیا ہے اس میں تمہارے کسی آدمی کی جان بھی یا کتنی قسمی۔ اگر میں نہ آتا چاہتا تو۔۔۔"

"مجھے یقین ہے۔" اس نے مزید میں سر ہلایا۔ "لیکن اس میں میرے آدمیوں کا کوئی قصور نہیں میں نے انہیں حکم دیا تھا کہ میں ہر حال میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کب کسی کھانا پھرنا اور قہقہے کے بغیر اگر اصل بات ہو جائے تو بھر ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے کافی دیر پہلے گھر چل جانا چاہیے تھا۔"

"مہربان اور سیدھی بات یہ ہے کہ میں تم کو ایک پیش کش کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنا چھوٹا سا سر صوفے کے پٹے پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "اسے تم ایک طرح سے ملازمت کہہ سکتے ہو لیکن تمہیں اپنی عزت اور انکسار ملے گا بتانا ملازموں کو تو کیا بعض انگوں کو بھی نہیں ملتا۔۔۔ میں ہزار روپے ملاندا۔"

"میں ہزار روپے فی ماہ ملاندا اپنی مشکل رقم ہے کہ اس کے بعد کام کے سلیبل میں سوالات کی گنجائش نہیں رہتی چاہئے۔" اس نے پڑھ پڑھاتے ہوئوں سے نگاہ ٹک کر کہا۔ "لیکن تمہاری قہقہے کے لئے ہمارا کسی بھی کام کے لئے تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ہم تمہارا بنیادی کام میری حفاظت کرنا۔"

"کیا ان ہاتھ و پاؤں مضبوط دیواروں اور مسلح محافظوں کے درمیان رہ کر بھی تمہیں خوف اور جان کا غلو محسوس ہوتا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"دیواریں بھی بلند ہوتی جائیں، خوف و خطرات اسٹیل ہی ہو جتے جاتے ہیں۔ تم نے ہمیں کسی بھی چیز کے دواڑے پر دوڑنا نہیں دیکھا ہوں گے۔" اس نے اپنے سنی ہاتھ سے اپنا چہرہ پر سے کوئی غیر سنی کردہ جھاڑی۔ جھپیلوں اور بچہ انسان میری

حفاظت کرتے ہیں۔ بڑے بڑے سرکاری افسر مجھے گنے والے خطرات سے نکل اڑ وقت آگے کرتے ہیں۔ اس قسم کے ہی نہیں اور بھی بڑے بڑے شہروں کے ٹائی گراہی بد محاشوں اور خطرناک ترین گویوں کا میرے ہاتھ سے دھیلہ بندھا ہوا ہے اور ضرورت پڑنے پر ان میں سے کوئی بھی میرے ایک اشارے پر دوڑا چلا آتا ہے۔ بڑے بڑے سیاست دان رات کے اندھیرے میں میری چوکھٹ پر بیٹھنا دگڑنے آتے ہیں۔ اور اپنی لیڈری چکانے کے لئے انہوں نے جو ہمیں شہر کر رکھی ہوئی ہیں۔ ان کے سلیبل میں مجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ ان گنت لوگ مجھ سے کہتے ہیں 'میرا نام سن کر کانپتے ہیں۔' پھر بھی مجھے نہ جانے کس بات کا خوف رہتا ہے۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں اندھیرے میں نہیں سو سکتا۔ تجر مدہنی میں سوتا ہوں۔ کھانا کھانے لگتا ہوں تو پہلے ہرچہ کا ایک ایک ٹولہ کسی خادمہ کو کھانا کر دیتا ہوں۔ مجھے اب بھی اپنی حفاظت کرنے والوں کی تعداد کم لگتی ہے۔ مجھے ان کی قسم کی طاقتیں رکھنے والے جرات مندوں کی تلاش رہتی ہے۔ آج میں نے تمہارا مقابلہ دیکھا۔۔۔ اور یہ اتفاق ہی تھا کہ میں اس مقابلے میں چلا گیا ہر حال میں تمہاری طاقت اور پھرتی کا مظاہرہ دیکھ کر مجھے ایک عجیب سی طرحی محسوس ہوئی اور تم پر نہ جانے کیوں کچھ پیار سا کیا جیسے تم میرے چہرے ہوئے بیٹے ہو جلا کہ میں نے کبھی شادی ہی نہیں کی اور مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں نے شادی کی تو میری اولاد بھی میری طرح فکرمند و غور اور مضحکہ خیز نہ ہو۔" "فکرمند" بات اتنی ہے کہ میں تمہیں اپنے خاص الخاص آدمیوں میں سرگرم دیکھتا چاہتا ہوں۔ تمہاری نگاہ اور مزاج میرے تمام آدمیوں سے بلند ہو گا۔ یہ لوگ کیا کہتے ہو؟"

"مگر اس عمل نما گھر کے بجائے وہ مجھے کہیں اور ملا ہوتا تو شاید اس کی باتیں مجھے دوانے کی بد معلوم ہوتیں اس کے لیے کی صداقت سے زیادہ یہ ماحول کا اثر تھا کہ وہ مجھے کمالک رہا تھا لیکن میرے لئے ان باتوں میں کوئی خاص کشش نہ تھی۔ اگر میں عمل زندگی میں آچکا ہوتا اپنی ضروریات کی ذمہ داری مجھ پر ہوتی تو شاید یہ ترغیب اور مدد پے پیسے کی کشش میرے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتی۔"

"مسٹر احسان مراد۔" میں نے بے تحاشہ میں کہا۔ "میری عجیب سی بات ہے کہ انہوں نے درمیان اتنی باتیں ہی ہیں مگر مجھے ابھی کچھ عجیب طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ تم کون ہو اور کیا کرتے ہو؟"

"کیا۔۔۔" وہ ہندو کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا تم احسان مراد کو نہیں جانتے تھے پورا ہندوستان جانتا ہے؟ کوئی کہہ خلتے میں زندگی گزارا ہے تم نے؟" وہ بے چینی سے کونہ کونہ سے لگے۔ اس کے استخوانی ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پکڑتیں تھیں۔

میں برکتوں میں نکل گیا اور اس پر اسرار کائنات کا دھواں صبح میں ملک کی ہلکی سی گواہ کے ساتھ بند ہو گیا۔ پورے میں آکر میں اپنی کار کی طرف جا رہا تھا تو میں نے چاروں طرف کے پہلی طرف المومنین کے رنگ کی ایک دھڑ رانیں کھڑی دیکھی۔ انہوں نے دھڑ رانیں آج بھی شاید چند ہی لوگوں کے پاس ہیں۔ اس وقت تو وہ شاید غور ہی نظر آتی تھی۔ دھڑ رانیں کی ساخت بھی عام گاڑیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی تھی لیکن اس کا ساتھ کچھ بڑا ہوتا تھا اور نہ جانے کیوں سب سے آگے تھلک ہی نظر آتی تھی۔

اسے دیکھ کر ایک عجیب سے دوسرے کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے غور میں ایسی دو تین گاڑیاں دیکھی تھیں۔ مجھے اور کسی بھی چیز کا کوئی خاص حقیقی نہیں رہا تھا لیکن نہانے کیوں دھڑ رانیں دیکھ کر میں ہوسٹ ہو جاتا اور اکثر سوچا کرتا تھا کہ جب بھی مجھے پاس آتا سب سے پہلے ایک دھڑ رانیں غریبوں تک اس وقت مدد دینی میں بھٹلائی اس گاڑی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے میرا دل چاہا کہ دھواں اندر چاؤں اور احسان مرزا سے پہنچوں کہ یہ ملک مجھے اس کی مستقل ملازمت دلی کش تھل نہیں لیکن کیا وہ کسی پھولے ہوئے کام کے عوض ایک حد دھڑ رانیں میری خدمت میں پیش کر سکتا؟

اسپے اس خیال پر میں خود ہی ہولے سے ہل رہا تھا اور اپنی سروس کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی میں نے انہی اشارات نہیں کیا تھا کہ کچھ سیٹ سے ایک شکا توڑا چلی دی۔

میں چمک کر مڑا تو کچھ سیٹ پر شکلا ایک ہاتھ سر کے نیچے اور ہاتھ پر ٹانگ رکھے لیٹ کر تکی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور وہ پھرتی سے اٹھ اٹھی۔ میرے کندھے کے قریب سیٹ کے پچھے پر دونوں ہاتھ رکھ کر اور ہاتھ پر ٹھوڑی تھا کہ اس نے سرگوشی سی کی۔ "کچھ بات بتائی؟"

"کیسی بات؟" میں نے گھٹن ترچھی کر کے اسے ٹھوڑا۔
"میں نے تمہیں ملازمت کی پیش کش کی تھی۔ کتنی تنخواہ کی تھی اس نے؟ اور تم نے کیا جواب دیا؟" اس نے ایک ہی سانس میں کہا۔ اب وہ انگریزی میں باتیں کر رہی تھی۔

"میں ہزار دسپہ ماہانہ۔" میں نے بتایا۔ "مگر میں نے انکار کر دیا۔"
"میں ہزار دسپہ ماہانہ؟" اس کی گویا اور کی سانسیں اور نیچے کی سانسیں نیچے رہ گئیں۔ "تم نے اس نے میری صلاحیتوں کی بھی نہیں لکھی تم نے انکار کیوں کر دیا؟"
"میں نے انکار مجھے ملازمت کی ضرورت نہیں۔" میں نے ٹھہرا۔ "کہا۔"

"آہ۔۔۔" اس نے سر اٹھا کر ایک گہری سانس لی اور اسپے ترچہ بڑھائی۔ "میں ہاتھوں میں اٹھایاں بھرتی۔" یہ ضرورت اور عدم ضرورت بھی کیا چیز ہے۔ ضرورت بعض اوقات

"اور اصل مجھے کبھی غیر ضروری باتوں پر توجہ دینے کی سلیقہ نہیں مل سکتی۔" میں نے سکون سے کہا۔ "میں نے چھٹی گور چھ ایک ٹھکان کی تربیت حاصل کرنے کے علاوہ میرا دھیان کسی طرف نہیں رہا۔"

"مگر اس نے میری طرف دیکھ کر گہری سانس لی اور دھم سے مجھے منتقل دوسرے سوئے پر چننے گیا اور چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔ "میں تو پھر بھی پیش کش کے سلسلے میں تمہارا کیا جواب ہے؟" یہ بھی یاد رکھنا کہ ٹھکان کے علاوہ دنیا کی ہر آسائش بھی جیسے مجھے ہی میری ہو گی۔"

"مجھے افسوس ہے کہ فی الحال میں یہ پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "میں کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مجھے آگے بڑھنا ہے۔ دوسرے میرا خیال ہے کہ میری کسی بھی مجھے اس عجیب و غریب قسم کی نوکری کی اجازت نہیں دیں گی۔ ان کا حکم ہے کہ فی الحال میں اپنی پڑھائی اور ہسپتالی تربیت میں مکمل حاصل کرنے کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں نہ سوچوں۔"

"میرا حکم ملے ہو میں اس نے عجیب سے لمحے میں کہا۔ "میرا اہواں ہے کہ میں میرا حکم ملنے میں کسی ایک عجیب سی سہرت نہیں ہوں گی گو کہ میں اس سہرت سے فائدہ ہوں کیونکہ میری ماں دسمبر کی ایک بڑی رات کو بھیجی کے فٹ پاتھ پر مجھے ہم دسپہ ہوئے مرگئی تھی۔" دوسرے توقف کے بعد اس نے چمک کر پوچھا۔ "کس قسم کی ہے تمہاری ماں؟ کہیں طبیعت پائی ہے اس نے؟"

"فرشتوں جیسی۔" میں نے جواب دیا۔
"مگر اس سے اجازت مت مانگنا کیونکہ فرشتے احسان مرزا کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔ سوائے سوت کے فرشتے کہ۔" اس نے دھول سے ٹانگ رگڑی اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ "اس بات کو یقیناً ختم سمجھو اور کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ جب تم خود مختار ہو جاؤ تو میں اس وقت دھم رہوں تو ایک بار مجھ سے ضرور ملنا یا اس سے پہلے کبھی تمہیں میری ضرورت پڑے تو مجھے ضرور یاد کر لینا۔ میرے گھر کے دھواں تمہارے لئے بہت کچھ رکھیں گے۔"

"مگر گویا بات ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کے ساتھ اٹھ کر دھواں کی طرف بڑھ گیا۔ اس لمحے وہی پوری ملازمت کر رہے میں آگیا ہم سے پہلے آگے بڑھ کر اس نے فزنی سلی سے دھواں کا ٹلا کھولا اور ایک ہتھ داکر کے سہاراں انداز میں ایک طرف کو ہٹ گیا۔ دھواں سے پہنچ کر احسان مرزا نے مجھ سے ہاتھ ملائے۔ میری چوڑی ہتھیلی اور مٹی مٹی انگلیوں کے درمیان اس کا ہاتھ کسی مٹی کی چٹا کی طرح نرم و نازک ہرگز نہیں تھا۔ کبھی کا کوئی تراشیدہ گویا مسطور ہوتا تھا۔"

انہوں کو بد وقت کی مدد کی عرض کی گئی ہے اور عدم ضرورت بھی بھی نہیں
 ہزار روپے ماہانہ کو بھی خاطر میں نہیں لائی۔۔۔ خیر یہ بات کہ اس نے تمہارا اٹار میرا
 سکون سے سن لیا اور تمہیں یوں کہانی سے جانے دیا۔

مردودہ کیا کر سکتا تھا؟ میں نے پہلو بدل کر اسے حوروں
 "مردہ بھی تم اچھے کم سن لود کم طم ہو کہ جس میں یہ بھی معلوم کہ احسان مرزا
 کم سن کے لئے سے لکڑی بننے کے بعد کیا کر سکتا ہے۔"

”مہر تم چلی کیوں نہیں جانتیں؟“ میں نے سلوکی سے کہا۔۔۔ لیکن اس سلوکی میں

بھل چلیں میں قدم نہیں رکھا۔ تم کو یہ بھی معلوم ہے۔
 ”مجھے بتاؤ تو کسی آخر = چکر کیا ہے؟ احسان مرزا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے؟ تم کس
 طرح یہاں آئی تھیں اور اتنی بزدلی کے باوجود یہاں سے کیوں نہیں جاگتی؟“ میں نے
 جیسا کہ میں نے اپنے دوست کو دیکھی تھی اسی طرح اس میں الزام دیا۔

چھ کھل گئی۔
میں نے اپنے چہرے کے دوسرے حصے کا طرف جانے دیکھا پھر ایک ایک دانہ جانے
کھل قنب ہو گئی۔ گاڑی میں ابھی بھی اس کے وجود کی مدد سے ہی طرہ بہ چھلی ہوئی تھی۔
ایک لمحے کے لئے میں نے اس کے نظروں پر غور کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور شخص نے چوک کر
اگلے ہی لمحے میری ہی اوجھڑی میں نظر ڈالا۔ اس نے اس سے جھک کر گاڑی اشارت کر کے گیت
کی طرف چلے گیا۔

میں نے کہا۔
میں دعا کی بجائے اپنے میں لعلہ کرپکا تھا کہ احسان مرزا سے میری ملاقات، مصلیٰ

انہوں کو بد وقت کی مدد کی عرض کی گئی ہے اور عدم ضرورت بھی بھی نہیں
 ہزار روپے ماہانہ کو بھی خاطر میں نہیں لائی۔۔۔ خیر یہ بات کہ اس نے تمہارا اٹار میرا
 سکون سے سن لیا اور تمہیں یوں کہانی سے جانے دیا۔

مردودہ کیا کر سکتا تھا؟ میں نے پہلو بدل کر اسے حوروں
 "مردہ بھی تم اچھے کم سن لود کم طم ہو کہ جس میں یہ بھی معلوم کہ احسان مرزا
 کم سن کے لئے سے لکڑی بننے کے بعد کیا کر سکتا ہے۔"

”مہر تم چلی کیوں نہیں جانتیں؟“ میں نے سلوکی سے کہا۔۔۔ لیکن اس سلوکی میں

بھل چلیں میں قدم نہیں رکھا۔ تم کو یہ بھی معلوم ہے۔
 ”مجھے بتاؤ تو کسی آخر = چکر کیا ہے؟ احسان مرزا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے؟ تم کس
 طرح یہاں آئی تھیں اور اتنی بزدلی کے باوجود یہاں سے کیوں نہیں جاگتی؟“ میں نے
 جیسا کہ میں نے اپنے دوست کو دیکھی تھی اسی طرح اس میں الزام دیا۔

چھ کھل گئی۔
میں نے اپنے چہرے کے دوسرے حصے کا طرف جانے دیکھا پھر ایک ایک دانہ جانے
کھل قنب ہو گئی۔ گاڑی میں ابھی بھی اس کے وجود کی مدد سے ہی طرہ بہ چھلی ہوئی تھی۔
ایک لمحے کے لئے میں نے اس کے نظروں پر غور کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور شخص نے چوک کر
اگلے ہی لمحے میری ہی اوجھڑی میں نظر ڈالا۔ اس نے اس سے جھک کر گاڑی اشارت کر کے گیت
کی طرف چلے گیا۔

میں نے کہا۔
میں دعا کی بجائے اپنے میں لعلہ کرپکا تھا کہ احسان مرزا سے میری ملاقات، مصلیٰ

کہ کوئی شکوں میں پناہ نہیں تھا۔
کوئی لوگ مجھے بے وقت ہے بھم اور تاجہ کی بیٹی تھی اور کوئی پسند نہ تھا
پہل ہوئی شانہ تھی تھی کوئی محفل السامی مدائن کی حلقہ تھی تھی۔ کوئی وال الہیہ
اگر والی محفل تھی تھی اور کوئی اپنی ہی دانت کے غل میں بد سہی ہوئی تھی۔ کسی
کی صورت تان کو نہیں جھن تھی اور کسی کی عادت میں کو حش بھی کرنا تو کسی سے محفل
ل نہ ہاگ۔ چند دن کسی سے منگو رہتی اور پھر یک لخت وہ ط سے اتر جاتی۔ کبھی بھی مجھے
خود ہ قصہ آتا کہ میں بھی دوسروں کی طرح تعلیم کے ساتھ ساتھ ماحول کی دلکشی سے
مستفید نہیں ہوتا۔

میرے خیالات کی اپنی ہی ایک ایک دنیا تھی جس میں ایک بے عنوان سا ستارہ چھایا
تھا کبھی کبھی سوچوں کی گھڑی پر دھندلا سا ب لواتا اور کوئی دن دیکھی سی ڈسکل چمکا کر
چاہت ہو جاتا۔ کبھی اس کی ہانوں کی چاندی کبھی اس کے ہانوں کے ساتھ کبھی اس کی
آنکھوں کی جھلکات کبھی اس کے روضوں کی کھج کبھی اس کے سانسوں کی خوشبو اور
کبھی اس کے لیے کی کنگ میرے حواس پر دنگ سی رہتی تھی۔ لیکن اس کی صورت کبھی
کمل نہ ہونے پاتی۔ نہ جلتے نہ کھن تھی کبھی تھی کبھی تھی لیکن مجھے اتنا احساس تھا کہ
کوئی ایسی ہستی ہے ضرور جس کا مجھے انتظار ہے اور کبھی نہ کبھی آئے گی۔

اسی روز میں نے کلاس روم میں لوگوں والی سائیل پر ایک ایک سے چہرے
کا اضافہ دیکھا اور میرے ذہن میں چمکا سا ہول کلاس ابھی شروع ہوئی تھی اور انگلیں کے
پروفیسر منور لیل کرے میں داخل ہوتے ہی تھے انہوں نے مسکرا کر لوارد لڑکی کی طرف
دیکھا اور مسکراتے گویا اسے پہلے سے جانتے ہوں۔

"وہ آزاد ہے۔ یہ کمر۔" انہوں نے پچھر شروع کرنے کے بجائے کہا۔ "مس
ماہتاب۔" انہوں نے اپنے استخوان ہاتھ سے لوارد لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "رسم کے
مطابق مس ماہتاب روضہ پر آکر اپنا تعارف خود کرائیں گی۔"

لوگے لوگوں نے تالیاں ہانسیں جب وہ پر سکون انداز میں اپنا لیک سے اٹھی اور
روضہ کی طرف بڑھی تو گویا سب کے دلوں کی دھڑکنیں رک گئیں۔ اس کا قد کم از
کم پانچ فٹ دس انچ تھا اور اس کی چال میں ایک ایسا لڑکھا پن تھا گویا وہ کسی جمیل میں
کھلے ہوئے کھل کے پھول پر قدم رکھتی آگے بڑھ رہی ہو اور اس کا دھن مدھن کے ایک
پہلے سے بھی کم ہو۔

اس نے پوچھا کہ آپ ایک لہا سا ریٹھی گلون ہیں رکھا تھا اور ہانوں پر دیا اسکول
پانچ رکھا تھا۔ ہم اس کے لیے شہری ہاں اسکول کے لیے تک بھول رہے تھے اور
اس کی ہر جھل قدم کے ساتھ یوں ہلکے لے رہے تھے گویا پھلے ہوئے سونے کے کسے

آہستہ میں ہوا کی جھڑی سے لہجے پڑ رہے ہوں۔

روضہ پر پہنچ کر جب اس نے کلاس کی طرف رخ کیا تو میں نے صحیح طور پر اس کا
چہرہ دیکھا۔ وہ واقعی ماہتاب تھی۔ اس کی غزالی آنکھوں میں مصری عورتوں کی طرح قدرتی
طور پر کھل لگا ہوا تھا۔ عام طور پر ایشیائی لڑکیوں میں سے جن کے ہل مصری ہوں ان کی
آنکھیں نیلی یا بھوری ہوتی ہیں مگر اس کی آنکھیں گہری سیاہ تھیں اور یہ ایک عجیب اخراج
تھا۔ اس کی بیٹھنی عربی ناک ستروں اور ہونٹ ایسے ہی تھے جیسے لوس میں بیٹھی
کھپ کی کسی کلی نے کج دم سورج کی پیل کرن کے ساتھ کھانا شروع کیا ہو۔

وہ قدرتی انداز میں تھی۔ اس نے پوری کلاس پر طائرانہ نظر دوڑائی۔ کنبیاں
روضہ پر کھائیں اور دھم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ہونٹوں نے جھنک کی۔ "ہم تو
میرا کپ کو معلوم ہو ہی گیا ہے۔" میرے خوابوں کے دیوانہ مصریوں میں گھنٹوں سی کج
انہیں۔ اس کے لیے کی کنگ تو میرے لیے ہاوس تھی۔ "میری عمر انیس سال ہے۔ میں
کچھ نہیں پڑھتی تھی لیکن حال ہی میں طاری تھلی میں داخل ہو گئی ہے اس لیے میں نے
اس کالج میں داخلہ لے لیا ہے اور تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کو اپنے
محقق کیا جاتاں۔ آپ پوچھنا چاہیں تو پوچھ لیجئے۔" وہ ایک بار پھر مسکرائی اور کلاس
روم میں ابھار سا کھل گیا۔

"مس ماہتاب! آپ آگاہ صاحب نام کس نے رکھا تھا؟" دن موہن نے پوچھا۔ یہ
ایک صحت مند اور خوش شکل لڑکا تھا۔

"میرے والد نے۔" وہ ایک بڑھری ہیں اور انہیں بھولنا کی بڑی پرکھ۔
ایک لڑکا تھا۔ کچھ گویا جس میں میرے علاوہ سب کی آواز شامل تھی۔

"ماہتاب! آپ نے یہ لہا سا گلون کیسا پن رکھا ہے؟"

یہ سوال پھانے کیا تھا ہر ایک ہال بعد موہن کی بیٹی تھی وہ طالبہ کم ایکٹو ہیں
زیادہ گتی تھی۔

"محفل انسانوں کی آنکھوں میں بھیرے چھپے ہوئے ہیں ان سے نہتے کے لئے۔"
ماہتاب نے جواب دیا۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔

"آپ کا قد کتنا ہے؟" یہ سوال رکھیں نے کڑے ہو کر کیا تھا جو لڑکا پتہ نہ تھا کہ
کڑا ہوتا تو بھی گنا تھا کہ کوئی بیٹھا ہوا ہے۔

"آپ کے قد سے دو گنا۔ پانچ فٹ دس انچ۔"

ماہتاب نے جواب دیا۔ اور کلاس میں ایک بار پھر تھکے گریج اٹھا۔ رکھیں خود
بھی اس قسم میں شریک تھا۔

"آپ پتہ کر کیا نہیں گی؟" یہ سوال جوار نے کیا تھا جو لڑکا ترقی پسند بنا تھا۔

کُترے میں چلی گئی۔ چالی چار سالہ وہاں پر عظیم کتاب خانے، مکتبہ محلے کی میز کے قریب کئی..... میرے سامنے کرسی چلی گئی۔ اس پر آ بیٹھی۔ میں نے اخبار سے غور کیا کہ اس کی طرف دیکھا لیکن اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ کتاب کے نورال الٹ پلٹ کے چند لمحوں پر دیکھی رہی پھر اس نے اپنا کالج فائل کھولی اور سر جھکا کر کتاب سے کچھ نقل کرنے میں مشغول ہو گئی۔

چند منٹ بعد نیا ہیڈ شروع ہونے کی منتظر بنی اور آہستہ آہستہ میرے اور ہاتھ کے مٹلے سب اٹھ کر چلے گئے۔ اگلا یہ ہیڈ بھی خالی تھا۔ اس لئے ہم دونوں میں سے کوئی نہ اٹھا۔ طارے سر پہ لیے پہلو والا جھکا سٹ ریلواری سے گھوم رہا تھا اس کی مدد سے سربراہ کے مٹلے ہاتھ میں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر چپکے کی سربراہ کے ساتھ گیا میرے غصے کی گردش کی آواز ابھی شامل ہو گئی۔ یہ آواز رفتہ رفتہ اتنی بڑھی کہ میری کینوں میں دھماکے سے ہونے لگے اور مجھے کچھ احساس نہ ملا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں۔

مجھے اپنے سامنے صرف اجنبی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک پردے سے سیاہ کپڑے پر سہل سونے سے کوئی تصویر بنی ہو۔ نیلے سکارف کی حرکت سے فلی ہوئی بالوں کی ایک لٹ "جھکی ہوئی ٹیکس" نیم راہوں جن میں گویا دنیا بھر کے گلابوں کا دس سوٹ آیا ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کا

شہر چتر صدیوں تک۔۔۔

میرے خیال میں آج پہلے کا لمحہ کن پہنچا تھا!

تیسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ ہسپتال نے بھی قلعہ پورہ کا مدلل کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ خبر سن کر ایک لمحے کے لئے مجھے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ کیا اس نے یہ سچے کے بعد انکار کیا ہے کہ میں اس ڈرامے میں شریک نہیں؟ یا پہلے اس نے یہ سن کر حامی بھری تھی کہ پولیس سیزر کا کردار میرے سپرد کیا جا رہا ہے؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا..... پھر فوراً ہی میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ قلعہ "شہزادی نہیں" اور مجھے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

میرے اصحاب پر کچھ لب بھی برقرار تھا اور یہ دیکھ کر اس جگہ میں اور اضافہ ہو جاتا تھا کہ دن موہن بہتاپ سے خاصا بے تکلف ہو چکا تھا۔ غالباً وہ اس کے کچھ کے لئے لائے گئے تھا میں اگلے پچھلے پاسے ہاتھ میں دور دور سے انہیں دیکھتا اور مجھے اصحاب کا سگتا ہوا لہجہ کہہ اور فخر ہو جاتا۔ آگ دن ہونے واروں کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔

پھر ایک دوا سب کچھ میرے بس سے باہر ہو گیا۔ میں لاہوری میں بیٹھا تھا لیکن
نیر کے گرد۔۔۔ لڑکے لڑکیاں چلتی مطالعہ میں مصروف تھیں لاہوری ایک طویل ہال میں
تھی۔ مطالعہ کی میز کے تین اطراف میں دیواروں کے ساتھ کتابوں سے بھری ہوئی چھتے کے
درد اعلیٰ والی لوہی لوہی لٹاریاں رکھی تھیں۔ میز سے کافی دور ہال کے ایک گوشے میں
گلابی کا ایک لوہا سا کھڑا تھا جس میں ایک ڈانس کے کچھ لاہوریوں، مسز کوہ، چلتی تھیں
جو ایک لوہی عمرادی خاتون تھیں۔ مطالعہ کی میز سے کمرے کی طرف دیکھتے پر بہشتی
ان کا سر نظر آ رہا تھا۔ جو عرصہ ساکت رہتا تھا کہ اکثر دیکھتے رہتے ہی مطالعہ میں
مصروف رہتی تھیں۔

الباد کو دیکھتے دیکھتے میں اچانک چونک چلا..... ایک ہنس کی خوشی نے مجھے چھوٹا
 سا..... میں نے غیر محسوس طور پر گردن اٹھا کر کمرے کی طرف دیکھا..... مہتاب ہل کی
 طرف پشت کیے ہوئے کمرے کے قریب کھڑی تھی۔ گویا میری حساس قوت شام نے مجھے
 دھوکہ نہیں دیا تھا۔ مہتاب کی موجودگی کا احساس مجھے اس کی طرف دیکھ بھری ہو جاتا تھا
 اس کی خوشی سے۔

عالم! وہ کئی طوطیوں میں لگائی تھی بلکہ اس کے دھبے سے ہی ایک الونکی خوشبو پھوٹی تھی یہ شاید مجھے ہی محسوس ہوئی تھی بعض لمحات میں کسی جگہ پہنچتا تو اسی طوطی کی وجہ سے مجھے معلوم ہو جاتا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک ماہتاب وہاں موجود تھی یا نہیں ہے۔
گنبد کی تھی۔

چند لمحے بعد میں نے مسز کوپر کو کنبے کا دوا لہ کھول کر نکلنے دیکھا۔ انہوں نے ایک الداری کا تھکا کھول کر انساٹیلو پڑھا پڑھانے کی ایک جلد نکال کر باہتاب کو دی اور واپس



Scanned By:

Azam & Ali

پھر میں اس کی طرف جھکا۔ حسد میں نے سرگوشی کی۔
اس کا سر بدستور جھکا رہا لیکن نگاہوں کی بجائیں یوں اٹھ گئیں گویا کسی جوہری نے
وہ اصول اٹھالیا ہے سے نکلیں خلاف بتا دیا ہو۔

"تم من سے مت مل کر۔" میری آواز سرگوشی سے تیار ہونے نہیں تھی بلکہ مجھے
خود پوں لگ رہی تھی جیسے ہوا کی دھڑکنوں کو چیرتا کلن سے نکلا ہوا کوئی تیرا پتہ پرف کی
طرف جا رہا ہو۔ میرے اچانک غلبہ سے اس کے چہرے پر حیرت کی کوئی لہر نہ ابھری اور
وہ ہی اس نے یہ پوچھا "تم مجھے یہ حکم دینے والے کن ہوتے ہو" اس نے صرف ایک لمحے
کے لئے مجھے دیکھا پھر دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔

"مگر میں یہ حکم ماننے سے انکار کر رہی ہوں؟" اس کی سرگوشی ابھری۔
"تو میں صحت کو قتل کر رہا ہوں گا۔" میں نے بلا تامل کہا۔
"اور اگر اس کے بعد میں کسی اور سے ملے جلتے گی؟" اس نے پوچھا۔
"تو میں اسے بھی قتل کر رہا ہوں گا۔" میرے الفاظ دھڑکنوں کے سے نور لہر ہوئی
منہاں کا ساتھ۔

اس کا ہنسا ہوا سراپا "قلم اس نے قاتل کے درمیان رکھ دیا۔ دونوں ہاتھوں کی
انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر اس نے گہری سانس لی۔ "تو تم میرے لئے اس حد تک
جا سکتے ہو؟" اس کی آواز گویا اب میرے ہی دھڑکنوں سے پھوٹ رہی تھی۔
"اس سے بھی زیادہ۔" میں نے کہا۔

اوپر چھپنے کی کوشش سے ٹک لگا کر وہ ایک بار پھر مسکرائی۔
"یہ قاتل؟" دینا کا سب سے اچھا اعتماد عبت ہے۔" اس نے ہونٹ قرقرائے۔
"یہ اعتماد عبت نہیں، اعتماد کلیتہً ہے۔" میں نے کہا۔ "تم میرے ہی وجود کا ایک
حصہ ہو جو شاید سیالوں کی گردش کے ساتھ کبھی مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔"

وہ ایک بار پھر مسکرائی اور ایک لمحے کے وقفے کے بعد پہلے سے بھی تیار ہوا۔
آواز میں ہونے۔ "محسوس میں بھی یہی کر رہی تھی لیکن میں شکر تھی کہ میرے دھڑکنوں کا پھیلاؤ
ہوا جسے خود ہی مجھ سے تن لے۔"

میں خاموش رہا۔ اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے
مکلی ہوئی دھند جس کے درمیان مجھے ہاتھ کا صرف چھو صاف نظر آ رہا تھا دھیرے
دھیرے چھٹنے لگی۔ طعن کی گردش کے ساتھ کپیلیوں میں گونجنے والے دھڑکنے محسوس ہو
گئے۔ میں نے کرسی کے پٹے سے ٹک لگا کر ہاتھوں میں انگلیاں پکڑیں۔ گویا اب تم من
سے نکل اٹھ نہیں رہو گی؟

"کیا اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت باقی ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔
تب مجھے احساس ہوا کہ میرا سوال کتنا غیر ضروری تھا۔ اس کے بعد ہم کافی دیر تک خاموش
بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

اگلے صبح کا گھنٹا بجا تو ہاتھ نے اٹھ کر انسا پیلو پیڑیا مسز کوہر کے حوالے کیا اور
ہم لاہوری سے نکل کر اگلے کلاس روم میں آئے۔ سب نے حیرت سے ہماری طرف
دیکھا۔ ہم اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے من سوہن تو لیگر کے درمیان بھی مسز کوہر کی طرف
دیکھتا رہا لیکن فی الحال اس کی آنکھوں میں تمام چیزوں میں صرف حیرت غالب تھی۔

اس صبح کے بعد اٹھل ہوا تو من اور اس کے دو قریبی دوست نرمل اور پرشاد
سب سے پہلے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ میں اور ہاتھ اگلے کلاس روم سے نکلے تو وہ تینوں
کسیں دکھائی نہ دیے۔ ہم کپیلے لیمو کی طرف چلے گئے۔ وہاں وہ تینوں ایک میز پر بیٹھے تھے
نور ہونے روش و گردش سے کسی بحث میں مصروف تھے۔ ہمیں دیکھ کر تینوں یک لخت
خاموش ہو گئے۔ من، ہاتھ کی طرف دیکھ کر مسکرایا مگر اس کے چہرے پر مسرور ہی دیکھ کر
کھینچا ہوا تھا۔

ہم ایک میز پر بیٹھ چکے تو دوسرے سے پہلے من اٹھ کر ہماری طرف آیا۔ "سب لیمو
بھی کیا ہے رٹی ہاتھ؟" اس نے خاصی بے تکلفی سے کہا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
"مہیا لگتا ہے جیسے منظور نے چند لمحے کے اندر اندر تم پر کوئی ہلکا کر دیا ہے۔"
"مسٹر من؟" ہاتھ نے گہری سانس لی سے کہا۔ "تج سے پہلے تو کپ مجھے آپ کہ
کر چاہتے تھے۔ یہ تج اتنی بے تکلفی کس سلسلے میں؟"

"حیرت ہے۔" من سوہن نے قد سے کھینچوٹ کے ساتھ کہا۔ "کپ ہی تو کہا کرتی
تھیں کہ پڑھے لکھے اور فی نسل کے لوگوں کے درمیان بے جا نفخات نہیں ہونے
چاہئیں۔"

"لیکن صرف اس وقت جب وہ سرا فریق اس کی اجازت دے۔ میں نے یہ بھی کہا
تھا۔" ہاتھ نے کہا۔ "میں جب پندرہ کلوں کی تو ایک کلاس لیمو کی حیثیت سے کپ کے
ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ تب کی باتیں سنیں گی؟" ہنسنے لگی۔ لیکن اس وقت میں منظور
سے چند ضروری معاملات پر ڈسکشن کر رہی ہوں۔"

دعا ہے سے اندر قدم رکھنے سے پہلے انہوں نے سڑ کر کہا۔ "آپ لوگ خاطر جمع رہیں۔ کسی قسم کا دھکا لہو نہ کریں ورنہ پولیس کیس بن جائے گا۔ کلچ کی رو سے یہ نہیں چاہئے کہ میں ابھی جھگڑا کرنے والے لوگوں سے بات کر کے آپ کو بتانا ہوں۔ یہ معمولی جھگڑا ہے اس میں بعد مسلم لہو کھڑا کرنے کی کوئی بات نہیں۔"

کلچ میں مسلمان لڑکے اقلیت میں تھے لیکن ایسا لگتا تھا کہ باہر کھینچے والی چنگاری کو ہوا مل چکی ہے اور کسی بھی لمحے شعلے پھوٹ سکتی ہے۔ کیسے لیوا سے باہر قلم؟ بعد اور مسلمان لڑکوں کے گرد پھیل چکے تھے اور پر نہیں اٹھی سے صاف تھے۔ لیکن اندر سے میں ان لوگوں کو نہیں دیکھ رہا تھا۔

اپنی بھرپور قسم کر کے پرنس نے اندر کا رخ کیا اور کیلے ٹیچا کا دواں لپٹے عتبہ میں بند کر دیا۔ اندر آکر پہلے انہوں نے ملاقات گھروں سے توڑ پھوڑ کا جائزہ لیا پھر کمانی وار بینک باک پر صبح طرحے سے بچاتے ہوئے ہوئے۔ "میں۔۔۔ میں بھی۔۔۔" یہ کلچ طلبہ کو متھون اور مذہب فہری ہانے کا دعوہ دار ہے اور اس کی تاریخ میں کبھی ایسا نوازی جھگڑا نہیں ہوا۔

انہوں نے من کو سارا دے کر ایک کرسی پر بٹھایا۔ مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک نظر ایجاب پر ڈالی اور پھر ہم سے جھگڑے کی تفصیل پوچھنے کی بجائے مدفن دین کی طرف جیسے جو کیلے ٹیچا کا ٹھیکیدار تھا اور اس وقت لاؤنجر کے پیچھے سا بیٹھا تھا۔ انہوں نے مدفن دین سے ساری تفصیل معلوم کی پھر ہمارے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے ہوئے۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمارے کلچ میں بھی ایسا واقعہ رونما ہو سکتا ہے۔ چہ بیٹھے اور تم لوگ گریجویٹ ہونے والے ہو، مذہب خاندانوں سے تمہارا تعلق ہے اور حرکت تم نے چہ سبوں؟" بھگیوں اور شریعوں والی کی ہے۔ میں اب اس پر بحث نہیں کروں گا کہ قصور کس کا ہے؟ باہر دونوں طرف کے لڑکے بھڑکے کھڑے ہیں۔ میرے سامنے عین راستے ہیں ایک تو یہ کہ تم دونوں بگڑے چاندوں لڑکوں کو بدکرداری کا سرٹیفکیٹ دے کر کلچ سے باہر کر دوں اور جھگڑا ہمیں ختم کر دوں، دوسرے یہ کہ پولیس کو طلب کر کے سارا معاملہ اس کے ہاتھوں میں دے دوں اور کلچ کی ریسپنسیبلیٹی کا بیڑا غرق ہونے دوں۔ یہ دونوں طریقے حتیٰ ہیں۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ میں تم دونوں کو کان سے پکڑ کر باہر لے چلوں۔ سب کے سامنے تم ایک دوسرے سے مضرت کرو اور کہہ دو کہ یہ تمہارا ذاتی اور معمولی نوعیت کا جھگڑا تھا۔ وقتی اہل تھا جو ختم ہو گیا۔ یو لو تمہیں کوئی طریقہ پتہ ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے کدھے اچھا کر من کی طرف دیکھنا۔ میرے خیال میں وہ اس قبل کا تو ہی نہیں تھا جو جلد گھست تسلیم کر لے یا اپنی لفظی کا اعتراف کر لے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان میں کسی جذبہ کی جھلک نہیں

تھی لیکن نہانے کیلئے یقین تھا کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں غرور کی تہوں میں لپٹا ہوا کوئی طوفانک منصوبہ کھو رہا ہو گا۔ ہر حال مجھے اس کی کوئی خاص پدا نہیں تھی۔

صافائی مانگی بھی نہیں ہی چاہئے کیونکہ لفظی تسماری تھی۔ "میں نے کہا۔" پر لیل آتا رہا ہم دونوں کو باہر لائے اور ایک چوتھے پر کھڑے ہو کر سب کے سامنے ہماری صلح کرانی اور جھوم کو لٹھا کر کے حشر کر دیا پھر انہوں نے من "نزل اور پر شاہ کو ہتھکڑی لگاوا لے کا بندوبست کیا۔ من کی کمانی کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی، نزل اور پر شاہ صرف بے ہوش تھے۔ شاید انہیں کوئی امدادی چوٹ بھی آئی ہو مجھے انداز نہیں تھا۔ حالات پر سکون ہوئے تو میں اور ایجاب گریڈ میں آ گئے۔

"ہماری تو پہلی ملاقات ہی بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔" وہ میری گاڑی سے نکل گیا کر کھڑے ہوئے ہوئے مسکرا کر کہی "یہ اچھا لگتا نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں تو یہ اچھا لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"لگتا ہے کہ ہماری آئندہ زندگی ہنگاموں ہی سے عبارت ہو گی اور مجھے کچ پہلی مرحلہ احساس ہوا ہے کہ ہنگامہ بخیزی سے میرے جسم میں ہی زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔"

"اچھا ایک بات تو یہ ضرور۔" ایجاب کو پیسے کچھ یاد آ گیا۔ "تم نے ادرے میں میرے ساتھ دھل کرنے سے کیوں انکار کر دیا تھا جب کہ مجھے امید تھی کہ اس میں میری شمولیت کا سن کر تم ضرور حاضری بھر لو گے؟"

"میں خود نہیں جانتا۔" میں نے قائل ہوٹ پر دیکھتے ہوئے کہا۔ "جس دن مجھے کچھ فہمی سا لگا۔ کچ کل ہماری گھروں میں بھی کچھ ہوتا ہے۔ اب وہ اور ہیروئن کلچ کے کسی ادرے یا لیبل میں ایسے کام کرتے ہیں جس میں پینتیس سالہ ہیروئن چودہ سالہ لڑکی والے غلوں کے ساتھ ایک بازاری دھن بھی ضرور فٹن کرتی ہے۔ پھر ہیرو صاحب دو چار طنز ہیروئن کے پیچھے دم ہلاتے پھرتے ہیں اور وہ انہیں قہقہے گھاس نہیں دیتی پھر ایک تختہ ہی اتنی سہولت ہو جاتی ہے کہ ہماری پری سڑکوں پر ہیرو کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ڈونٹ گاٹی پھرتی ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر میں نے ادرے میں کام کیا تو یہ مراسم کا بڑا چپ سا کٹنا ہو گا۔ معلوم نہیں تم میری بات سمجھ رہی ہو یا نہیں۔"

"میں تو اسی وقت سمجھ گئی تھی کہ تمہارے انکار کے پیچھے کون سے حسوسات کام کر رہے ہیں۔" ایجاب مسکرائی۔ "اور مجھے تسماری یہ لوا اچھی لگی تھی۔ اگر تم ادرے میں کام کرنے کی حاضری پھریچے تو شاید غلوں کے برعکس پلٹ دیں اسلحہ ہی ملے ہو جاتی اور ہمارے مراسم کا کٹنا نہ ہو پاتا۔" پھر اس نے لپٹنے کیا سوچ کر ایک ہٹا سا قہقہہ لگایا اور شری غلوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کوپسے کیا موجودہ انداز؟ تمہیں فہمی نہیں؟"

"مطلق نہیں۔" میں نے کہا۔ "مظہور میں تو دیکھنے والے جسم والا ایک صاحب تو ہوتا ہے جسے کسی جسم والوں کو مار بھگتا ہے جبکہ حقیقی زندگی میں وہ ایک چھپے ہوئے کو بھی نہیں مار سکتا جب کہ مجھے دیکھ کر کوئی بھی وہی ہوش ابراز نہ کر سکتا ہے کہ میں کیا کچھ کر سکتا ہوں کیونکہ میرے پیچھے میو برس کی ماضیت ہے۔"

"میری گاڑی آگئی۔" ہاتھب نے گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمب میں چلی ہوں۔" فی الحال میں جیسے الماری کی لکڑی کی بیڑوں کی طرح اپنے منہ سے مٹانے کے لیے گھر نہیں لے جاؤں گی کیونکہ وہ گھر ہو گئے ہی نہیں۔ میرے اما کو کاروبار سے فرصت نہیں ملتی۔ اور اسی کو سیاست کا چمکا ہے۔ دونوں سے رات کے کھانے پر ہی ملاقات ہوتی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

میں اپنی جگہ کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد میں نے اپنی گاڑی لال اور گھر روانہ ہو گیا۔ منہ سے گھر کی پرزور آواز آئی۔ آج بہت طوفان تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھ سے آجھ ملاقات پر انہیں ہاتھب کے حلقوں میں لگا لور ہو سکا تو کسی روز ان کی ملاقات بھی کراہوں گا اور دیکھوں گا کہ مجھ سے اس کے حلق کیا رائے ظاہر کرتی ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی اسے بے حد پسند کریں گی۔

اگلے دن منہ کلچ نہیں آیا۔ اس کی درخواست آئی تھی۔ اس کے والد پر پانچ سو روپے کا لور وہ گھر آکر رہ کر رہا تھا۔ نزل اور پر شو اہل آئے تھے لیکن کچھ حوصلہ خراب رہے تھے اور مجھ سے آگے نہیں ملا رہے تھے۔ میں دن تک کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ کلچ میں میری اور ہاتھب کی بڑی مشورہ ہو چکی تھی۔ اور ہم بدھ بھی اپنے لیتے تھے ہمیں رات میں گھیر گھروں سے دیکھا جاتا تھا۔

اس روز تھوڑا تھوڑا غم ہوا ہی تھا کہ پرنسپل کا چھڑا ہی کلاس میں گیا اور پچھلے لاکھ میں ہاتھب کو بھی لے کر اس نے ہاتھب کو دیکھا کہ پرنسپل کے دفتر میں اس کا فون آیا ہے۔ ہاتھب اس کے ساتھ چلی گئی کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو دیکھ کر شہد ہو چکا تھا۔ اس کا چھوڑا ہوا ہوا تھا اس نے انکوائری کے پروفیسر متہ جی کو دیکھا کہ اس کے لپٹا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ سول ہسپتال سے فون آیا تھا اور وہ وہاں جا رہی ہے۔

"سرا" میں نے کھڑے ہو کر پروفیسر متہ سے کہا "مگر آپ اجازت دیں تو میں ہاتھب کو ہسپتال پہنچا دوں گا؟"

"جی ہاں" متہ جی نے ماضی کے رجسٹر سے نظریں اٹھائے بغیر کہا باہر آکر میں نے ہاتھب سے پوچھا "کیسے ہوا ایکسیڈنٹ؟"

"ہسپتال والوں نے زیادہ کچھ نہیں بتایا صرف اتنا ہی کہ انہیں خون کی ضرورت ہے۔" ہاتھب دلاتے ہوئے بولی۔ "انہوں نے پہلے گھر فون کیا تھا وہیں اسی جگہ نہیں تھیں۔"

کسی نوکر نے انہیں میرے کالج کا فون نمبر دیا تو انہوں نے مجھے اطلاع دی اور اس پھر میں کالج ناخبر ہو چکی ہے۔

میں نے گراڈ سے گاڑی نکالی۔ کالج سے نکل کر ہم ہسپتال آئے لڑانگ دور ہی گئے تھے کہ اگلے گھر گھر کی عجیب سی گواہ کے ساتھ بند ہو گیا۔ میں نے اسے اشارت کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ہر مرتبہ وہ وہی ہی "گھر گھر" کی مختصر سی گواہ پیدا کر کے خاموش ہو گیا۔

"کسے بھی ابھی غائب ہوا تھا۔" ہاتھب نے مظلومانہ لہجے میں کہا۔ "اگر کوئی دوسری ساری کوشش کرتے ہیں۔"

ہم ابھی گاڑی سے اترے ہی تھے کہ ایک ٹیکسی سٹ رانڈری کے ساتھ قریب سے گزرتی دکھائی دی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ دے کر اسے روکا۔ اور ہم لپٹ کر اس میں بیٹھ گئے۔ "سول ہسپتال" میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "تیرا چلتا" ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

دبے پتے لور کچے بدھسی ڈرائیور نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ "بھئی آپ پولیس میں چلاؤں گا صاحب؟ لیکن اگر ایک اور ایکسیڈنٹ ہو گیا تو آپ کی اسے واری۔"

اس نے ایکسیڈنٹ دیکھا اور گاڑی فرارے بھرنے لگی۔ میں اس وقت چوکا جب میں نے دیکھا کہ ڈرائیور نے گاڑی اسٹیڈنٹ روڈ کی طرف موڑنے کی بجائے مضامین کی طرف جاتے والی سڑک پر ڈال دی تھی۔

"میں اسٹیڈنٹ روڈ کی طرف سے کیوں نہیں چل رہے؟" میں نے پوچھا۔

"کپ کو نہیں معلوم صاحب؟" گھوڑی چوک میں کل سے سڑک کی مرمت کا کام ہو رہا ہے۔ ہمیں لور سے گھوم کر آنا پڑے گا۔" ڈرائیور نے سادگی سے کہا۔ کل صبح سڑک کے مالک میں گزر گئے۔ میری پھٹی جس مجھے کسی خطرے سے خبردار کر رہی تھی لیکن میں نے فیصلے پر کھینچے میں ناخبر کر دی۔ جب ڈرائیور ایک لور گج راستے کو چھوڑ کر بدستور سسٹن سڑک پر گاڑی بھگاتا رہا تو میں نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ "گاڑی روک لو" دندہ گردن توڑ دیا۔ میں نے اس کی پٹی سی گردن کے نیچے پر اگوتھے سے دھکا ڈالتے ہوئے کہا۔

"جیسے اچھا صاحب!" اس نے سعادت مندی سے کہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کی سعادت مندی کی وجہ یہ تھی کہ اسی وقت ایک اور کار ہمارے عقب میں رک چکی تھی میں نے اس کے دروازے کھینچے اور بند ہونے کی گواہی سن کر مڑ کے دیکھا۔ اس کا اگلا پھر ٹیکسی کے پچھلے بغیر سے تقریباً "لا ہوا تھا اور چار گوی اس سے اتر کر ٹیکسی کے دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔"

شوق نہیں میں تو موقع دیکھ کر دار کرنے کا ملو ہوں اس وقت موقع میرے ہاتھ میں ہے
بچھن واوا یہاں موجود ہے۔ اس نے بیڑیوں پر بیٹھے ہوئے کمرہ صورت کوئی کی طرف
اشارہ کیا۔ مگر میں تھما رہے ہاتھ کھول بھی دوں تو ضرورت پڑنے پر بچھن واوا جھپٹ
میں سے کھڑی کی طرح قولا سکتا ہے لیکن میں قولا گلاہ لٹی میں آ کر کوئی غلطو کیوں معل
دلنا لگے کیا ضرورت ہے؟

”یہاں ایک چھوٹا سا دروازہ ہو رہا ہے جس کا نام ہے ”بے عزتی کا دروازہ“ تم
چاہو تو اسے خود کی عقل کا دم بھی دے سکتے ہو۔ ہاتھ میری خدمت میں بھی ہے اور میں
نے ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کا تہہ کر رکھا ہے۔“ اس نے ایک خطرناک ہاتھ کی طرف
دیکھا اور بکھٹ اس کی آنکھوں کی چمک دیکھی۔ ”کچھ دیر بعد یہاں میری اور ہاتھ کی
ایسی بہت سی تصویریں بنائی جائیں گی جنہیں منہا نہ لیان میں قابل اعتراض کہا جاتا ہے۔
بے فکر رہو! ان تصویروں میں میرا یہ پستردہ بالو نظر نہیں آئے گا۔“ اس نے اپنے
منسوب بالو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہایت استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ بے میاں جن
کا اصل دم تو کچھ اور ہے مگر ہم انہیں بھولے رام کہتے ہیں“ اس قسم کی قولا گرفت میں
بے باہریں ہوں کچھ اپنے لہجے کے بادشاہ ہیں۔“

اس نے کمرے کے قریب کھڑے ہر اس بولنے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ
بندستان کی کئی ابھری ہوئی قس بیہوشوں کی بیڑی ”نار“ تصویر بنا چکے ہیں۔ اب تم شاہ
پہچو گے کہ میں اتنا تھک کس لئے کر رہا ہوں؟ اگر متھد صرف ہاتھ کو دائدار کرنا ہی
ہے تو وہ میں اب بھی کر سکتا ہوں لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں جب کسی چیز کو حاصل کرنا ہوں
تو اس وقت تک اپنے لہجے میں رکھتا ہوں کہ میں جب تک میرا دل نہ بھر جائے اور
ہاتھ کے حلقے میں بھی ایسا ہی پھنسا کر رہا ہوں۔“

میری کانپوں میں خون غور کریں مابنے لگاؤ میں اپنے اندر ہمت میں پا رہا تھا کہ
مڑ کر ہاتھ کے اثرات دیکھ سکوں۔

ان تصویروں کے گیسٹ میرے ملاحظہ بچھن واوا اور اس کے خاص آدمی کے پاس
مطلوبہ رہیں گے۔ ”دن نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”کل سے ہم تینوں معمول کے
مطابق کالج اسٹڈ کر رہے ہوئے لیکن احسان سے قاصر ہوتے ہی میں ہاتھ کے ہاں ہاپ
سے ہاتھ کا رشو طلب کروں گا اور ہاتھ انہیں مجبور کرے گی کہ وہ یہ رشو قبول کر
لیں اگر ہاتھ ایسا نہیں کرے گی یا میرے بھانجے تم یا کوئی بھی اور لڑکا ہاتھ سے شادی
کی کو خوش کرے گا تو ان تصویروں کے پرنٹ کالج کے ہر لڑکے کے ہاتھ میں پہنچ جائیں گے
جس کلب میں ہاتھ کے ادا چلتے ہیں“ اس کے پارنگ لائٹ اور لائن میں اچانک بھی پرنٹ
اگرے پائے جائیں گے اور ہاتھ یا اس کی فلی کا کوئی جائے والا ان کے نظارے سے

میں نے ڈرائیور کی جھپی چھٹا پر گھونسا رسید کیا اور وہ کراہ کر اسٹیرنگ پر سر دھ کر
ساکٹ ہو گیا۔ میں اس لئے پچھلا دایاں دروازہ کھلا اور ساتھ ہی میں نے ہاتھ کی جھ
ٹی۔ کسی نے اسے بے وردی سے باہر تھکیٹ لیا تھا۔ میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر
باہر قدم رکھا ہی تھا کہ میرے سر کی ٹھوس اور دھڑکی جھڑ سے ضرب پڑی اور میرا لہجہ
تاریکی میں ادب گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میرے سر کے پچھلے حصے میں نہیں اندھ رہی تھیں۔ کئی مرتبہ
سر تھکتے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے کھلی ہوئی دھڑ تو چمٹ گئی لیکن سر کا درد کچھ
بہہ گیا۔ میری نظر سب سے پہلے من پر پڑی جو پستردہ سے ڈھکا ہوا اپنا ایک بالو لگے میں
حاصل پٹی کے حلقے میں دکھائے مجھ سے کچھ فاصلے پر سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر
ایسی شوناک مسکراہٹ تھی کہ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑا اور خون طوار نظر آ رہا تھا۔

اس کے عقب میں بیڑیاں تھیں جو لوہے کو چا رہی تھیں اور ان کے وسط میں ایک
بیڑی پر بیٹھ لہ چہرے والا ایک سیاہ لاس ٹیم کوری بیٹھا چلیے چلے ایک لہجے
سے چاقو کی دھار پر ہاتھ بکھیر رہا تھا۔ اس کے جسم پر اچھل اچھال شوار تھیں اور ساکٹ
تھی لگے میں سرخ نظر لپٹا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ پانا چاہے تو احساس ہوا کہ وہ میری پشت
پر بندھے ہوئے ہیں۔ یہ غالباً کوئی تہ خلد تھا جس کا فرش انہوں کا تھا۔ اور چمٹ میں
ایک لمبی سی نار کے سرے پر ایک بڑا سا بلب بھول رہا تھا لیکن تہ خلد کی لمبائی چوڑائی
کی مناسبت سے اس کی روشنی کم معلوم ہو رہی تھی۔

تہ خلد میں دو آدمی اور تھے جو اسٹینڈ پر لگی ہوئی دو بیڑی بیڑی لٹ لٹیں خاص
دلوں پر کھڑی کر رہے تھے ان لائٹس کے درمیان ایک بیڑی لگا ہوا تھا جس پر استر اور گچے
بھی موجود تھا۔ بیڑی کی پائنتی کی طرف اسٹینڈ پر ایک کیس وقت تھا۔ لٹ لٹیں روشن نہیں
تھی ان کے ساتھ ٹسک بائیں بیڑیوں سے ہوتی ہوئی اوپر کہیں جا رہی تھیں۔ کمرے
کے قریب چھدرے سے ہاتھ والا ایک پتہ قد بوڑھا کھڑا جلدی جلدی سگریٹ کے کل
لے رہا تھا اور حوصلہ فکروں سے اوپر اوپر دیکھ رہا تھا۔ مگر بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی فلم
کی حرکت ہو رہی ہو۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر دن کی مسکراہٹ کھل گئی۔ تصویریں ہی کو خوش کر کے
میں اندھ بیٹھا۔ دن کچھ اور قریب آ گیا اور ناچیں چڑی کر کے ہلا کھڑا ہو گیا گویا کوئی
انارڈی شادی اپنے ہلاک کئے ہوئے شیر کے قریب آ رہا ہو اور سوچ رہا ہو کہ کس پور میں
صور پھنسا ہے کیا حال ہے بیڑی؟ اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”حال پرچھتا ہی ہے تو ہاتھ کھول کر پچھو۔“ میں نے کہا۔
”نہیں نہیں۔“ اس نے اٹھ اٹھا کر شاطراہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے بیہوش کرنے کا کوئی

اس نے سیدھا ہونے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے میری دوسری لالت اس کے منہ پر پڑی۔ اس کا منہ شہد چھو لود منہ ہو گیا ایک خوفناک آکراہٹ کے ساتھ اس نے مجھے میں اندھے ہو کر ہوا میں ہاتھ لڑائی۔ چاقو اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا اور اسے میں نے ٹھوکر کے ساتھ قہر خانی کے اس حصے میں پہنچا دیا تھا جہاں دھڑکنی بہت کم تھی۔ اسی لمحے میری فکر بدلت دین پر چڑھ گئی ہو رہا لود بھل چکا تھا لیکن پائیں ہاتھ سے اسے نشانہ

اس کی کئی وجوہات تھیں۔ "منا نے ہنسی مٹا دی اور کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ تمہیں لڑا نہیں گیا اور حقیقت تم خود ہی آگئے ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ ہاتھ جب فٹن ہو لپٹ لیا کے فٹنی ایکسیڈنٹ کی خبر ملے گی تو اس وقت اس کی گاڑی کالج میں موجود نہیں ہوگی اور تم ہی اسے اسپتال پہنچانے کے لئے کھڑے اس لئے میں نے احتیاطاً قسماری گاڑی کی جگہ میں قبوڑی سی چینی ڈیلا دی تھی جب تمہیں مارے گاڑی کی فٹنی سے اترنے وقت بے ہوش کیا گیا تب بھی ہم تمہیں سٹیشن سڑک پر بے ہوش چھوڑ کر آگئے تھے لیکن میری دلی خواہش تھی کہ تم یہ فٹس نہیں ہو جس میں ڈرامہ دیکھ سکو تاکہ یہ بات

ہل دیکھ کر ہنسے بلیر نہ وہ سکا لیکن اس وقت میری حس مزاج میرے جسم میں پھوٹنے لپٹنے کے ساتھ بھڑکنے لگی تھی۔

"بوندہ رہنا چاہتے ہو؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ اس کے زخموں میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے ہاتھ "تھچ" کی آواز کے ساتھ ٹھوکر لگتے ہوئے اٹھت میں سر ہلایا۔ اس کی دھنکی دھنکی آنکھیں پھیل کر کپ کے پیرے بھی ہو چلی تھیں۔

"اور کبیں فرش پر چاقو پڑا ہے اسے اٹھو۔" میں نے آنکھوں سے تہ خانے کے اندر میرے گونے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں تمہارے پیچھے ہوں۔ کوئی غلط حرکت کی کو مٹش نہ کرنا۔ تم تو ایک ٹھوکر کی مار ہو۔"



لیجے میں وقت پڑا؟ وہی تھی میں چلا تک لگا کر اس کے قریب پہنچا اور اس کے سچے پر ایک لائٹ رسید کی۔ وہ کھلی دیوار سے ٹکرا کر اوجھے سے گر کر اور اسچے پلستر بندہ پاند کو قہقہہ کر پڑے۔ ریو اور اس کے ہاتھ سے گل چکا تھا لیکن اس کے قریب ہی پڑا تھا تاہم اپنی تکلیف میں اسے اس کا ہوش نہیں رہا تھا۔

لیجمن دلوں میرے قریب پہنچا تھا اس کا چوڑا رخسار میں چھپ گیا تھا وہ اب بھی لپٹے زعم میں تھا اور کسی طرح مجھے پکڑ لینا چاہتا تھا۔ اگر وہ مجھے پکڑ لیتا تو شاید واقعی کچھ کر مگرتک اپنی کے بل گھوم کر میں نے ایک بار پھر چاکی واڈ آکر لیا اور وہ اس قادر درخت کی طرح فرش پر آ رہا جس کی جڑیں طوفان نے اکھاڑ دی ہیں۔

میں اس لمحے میں نے دیکھا کہ وہ دو نوجوان جو اسٹیڈز پر لگی ہوئی لائٹس درست کر رہے تھے ان میں سے ایک مدین پر سے پھلاگ کر بیڑیوں کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ وہ غلام تہ خانے سے گل کر رہا وہ دایر سے منتقل کرنا چاہتا تھا یا پھر اسے سے کوئی تکلیف لینے جا رہا تھا۔ میں لپک کر اس کے پیچھے پہنچا جب وہ تیسری بیڑی پر قدم رکھ چکا تھا اس کی ہانگ میں ہانگ پھنسا کر میں نے اسے پیچھے کھینچ لیا۔ "اور مجھے سے بیڑیوں پر گر کر اور وہ وہ سے ہلایا۔ میں نے اس کی کٹی پر لگی سی ٹھوکر رسید کی اور وہ نیچے فرش پر آ کر اور بیڑوں ساکت ہو گیا۔" دو نوجوان اسٹیڈ سمیت ایک لائٹ اٹھ کر میرے سر پر آن پہنچا تھا لیکن اس نے غلام "دوسروں کے الجھن سے سبق حاصل کیا تھا اور اندھا دھند مجھ پر وار نہیں کیا تھا۔

ہم ایک "دوسرے کے سامنے نیم دائرے میں گھومتے تھے۔ دھند" اس نے گرد کی طرح لائٹ کو گھمایا۔ میں پیچھے کو لیج کر دیوار سے جا لگا اور لائٹ بیڑیوں سے گھوا کر پکڑا چڑھ گیا۔ نوجوان نے لائٹ وہیں پھینک دی۔ اس کی نظر اچانک مدین کے ریو اور پر پڑ گئی تھی۔ "وہ ریو اور کی طرف لپکا اور جلد بازی میں مار کھا گیا۔ میری ٹھوکر اس کی ہانگ پر پڑی۔" وہ ہوا میں کھلی فٹ اور اچھلا اور ایک کھٹاک چپ کے ساتھ فرش پر آ رہا۔ میں نے اسے بے ہوش کرنے کے لئے کھلی پر ٹھوکر دیا اور وہ اس طرح ہی آ رہا۔

میں نے دیکھا کہ مدین کا لپٹا ہوا ہاتھ ریو اور کی طرف رہا تھا اس کے قریب پہنچ کر میں نے ہاتھ پر اپنی سے دھنکی سی ضرب لگائی۔ اس نے کراہ کر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ میں نے ریو اور کو بھی ٹھوکر مار کر تہ خانے کی پہلی دیوار کے پاس پہنچا دیا۔

دھند مجھے احساس ہوا کہ یو وھا فو لو گر اگر نظر نہیں آ رہا۔ میں نے اس کی تلاش میں نظر دو لائی تو بید کے نیچے مجھے اس کے جوتے حرکت کرتے دکھائی دیے۔ "باہر آ جاؤ۔" انھوں نے بید کے قریب پہنچ کر اس کے پیروں پر لگی سی ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ہمتل تمام وہ رہتا ہوا بید کے نیچے سے گل آیا۔ صورت حال اگر کچھ اور ہوئی تو شاید میں اس کی

تھے۔

میں نے اسے فرش پر کھڑا کیا اور اس کا کیمو اٹھا کر فرش پر دے مارا۔ ملائکہ اس حرکت کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ ابھی تو کیمو استعمال بھی نہیں ہو پایا تھا۔ لیکن میرے اندر جو حسد تل رہا تھا اسے کلاس کو کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ دن نے اگر بات میری ذات تک محدود رکھی ہوئی تو شاید میری یہ کیفیت نہ ہوئی۔ لیکن اس نے مہتاب پر ہاتھ ڈالنے کے لئے جو گھٹیا اور غلط منصوبہ بنایا تھا اس پر میرا دل تو بھرا ہوا تھا کہ وہ خانہ میں موجود تمام افراد کے سر اڑیں۔ یہ کمال دماغی ہے۔ وہ پہلے ساتپ آکھہ ساشے میں بیچنے کے قتل نہ رہیں لیکن میری عقل سو دست گئے قتل اور طوفانی سے دامن پھانے رکھے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس لئے میں نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ میرے کسی وار سے کوئی مرے نہ پائے۔ صرف وقتی طور پر ہلاک ہو جائے۔ البتہ پھینک دلوں پر مجھے مجبوراً خطرناک وار کرنا پڑا تھا کیونکہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور کسی دوسرے طریقے سے اس کا میرے کالج میں آنا مشکل تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی اور مجھے امید نہیں تھی کہ وہ دوبارہ اپنے جوتوں پر چلنے کے قتل ہو سکے گا۔

میرے کے گھر سے اوجھڑا اور بکھر چکے تھے۔ میں نے بوڑھے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "ہو۔ ہزار روپے تمہیں مل چکے ہیں۔ ان سے دو سو کیمو خرچ لےنا اور آکھہ ایسا کام نہ کرنا۔ اس بھاپے میں تمہیں ایسے کام نہ پھنس دیتے۔"

میں دن کے قریب پہنچا اور مردان سے پوچھ کر اسے اٹھا لیا وہ میری طرح کر رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر اسلئے ہاتھ کا قبضہ کر دیا۔ وہ الٹ کر دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اس کے ہوشوں سے خون کی تپتی سی گھیر رہی تھی۔

"یہ دو سو اور آخری موقع ہے کہ میں تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں۔ خارش رو کہتے ہیں۔" میں نے اپنے سینے میں ہلکی ہلکی آگ کو ہٹا دیا۔ "لیکن آکھہ تم نے ایسی جرات کی تو میں منہ کی ہوا کے بغیر کب از کم تمہارا پتا تو صاف کر ہی دوں گا۔"

میں نے اس کے گلے پر ٹھوکر رسید کی۔ "موتی کتنے آری ہیں؟"

"موتی نہیں۔" وہ کراہا۔

میں نے مہتاب کا ہاتھ پکڑا اور میزبوں کی طرف چل دیا۔ وہ ابھی تک گویا ایک دم خواب میں چل رہی تھی۔ میزبوں کے انتظام پر چھوٹا سا دھندلا ہوا تھا۔ میں نے اس سے سر ہٹا کر لوہر لوہر دیکھا۔ ہمارے سامنے ایک وسیع ہل تھا جس میں کوئی فرنیچر وغیرہ نہیں تھا۔ دیواروں کا پینٹر بھی جگہ جگہ سے اکڑا ہوا تھا۔ اس ہل سے گزر کر ہم ایک کمرے میں آئے۔ یہ بھی خالی تھا۔ دن نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اور کوئی نہیں ہے۔ اس کمرے سے گزر کر ہم برآمدے میں آ گئے اور تب میں نے دیکھا کہ یہ شہر کے عمارات میں واقع ایک

وہ ڈنگلے قدموں سے اندھیرے گوشے کی طرف بڑھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ چاقو کے پھل کی ہتھکڑیوں نے بوڑھے سے پہلے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "وہ پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے اٹھا اور چل کر لڑکی کی بندشیں کالو۔ میں ایک بار پھر تنبیہ کر رہا ہوں کہ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پکھٹانے کی سلیک بھی نہیں ملے گی۔" میں محض احتیاطاً اسے خیار کر رہا تھا ورنہ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی چالاکی دکھا سکا اس کے منہ سے جسم پر لڑا طاری تھا۔

چاقو اٹھ کر وہ مہتاب کے پاس آیا جس کا چہرہ وحشت سے بھلا پڑا ہوا تھا۔ لیکن لب اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک۔ بوٹ آئی تھی۔ بوڑھا گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کی پسلیاں کاٹنے لگا۔ میری نظر اس کے ہاتھوں کی حرکت پر تھی جو اب بھی اس طرح کھپ رہے تھے کہ مجھے غدرش محسوس ہونے لگا کہ وہ رسی کی بجائے مہتاب کے ہاتھ کی کوئی رگ نہ کاٹ دے۔ "منہل کر کالو۔" میں نے اسے نرم لہجے میں تنبیہ کی۔

ہاتھ کھلتے ہی مہتاب اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی کلائیوں کو مسلتے لگی۔ ٹارک جلد پر رسیوں نے گہرے سرخ نشان ڈال دیئے تھے۔ "مہتاب! بوڑھے سے چاقو لے لو اور جلدی سے میری پسلیاں بھی کاٹ دو۔"

مہتاب نے میری بندشیں کاٹ ڈالیں تو میں نے اطمینان کی سانس لے کر اپنی کلائیوں کا جائزہ لیا۔ اچھل کود کے دوران ہانڈوں کے عضلات بھی زبردست کھچاؤ کا شکار رہے تھے اور رسیوں کی رگڑ سے میری کلائیوں میں جھنجھکی تھی۔ مہتاب سے چاقو لے کر میں نے اسے بند کر کے جیب میں ڈالا۔ پھر دوسرے گوشے میں جا کر دیوار تلاش کیا اور اسے بھی جیب میں رکھ لیا۔ میں واپس مڑا تو بوڑھا طویل الجھوسوں کی طرح راستے میں کھڑا تھا۔ میں نے گریبان سے پکڑ کر اسے فرش سے اوپر اٹھا لیا۔ وہ کٹہر کی طرح ہوا میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

"تمہیں کتنے پیسے ملے تھے اس کام کے؟" میں نے پوچھا۔

"چار ہزار۔" وہ ترغرائی نوالہ میں بولا۔ "دو ہزار الجھالیں اور دو ہزار بعد میں ملے۔"

پھوٹا سا مکان تھا جو چاروں طرف سے غیر آباد تھا۔ اس کے پھوٹے سے لائن پر بھارا جھنگر بکھلا ہوا تھا اور دو اونٹوں پر سوار دو سیاہی سی بھی ہوئی تھی۔
یہ آدے کے قریب دن کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے انکسٹن میں چلای نہیں تھی۔
میں چاہتا تو واپس جا کر دن سے چلای لا سکتا تھا مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ سڑک پر چلتے ہیں۔ میں نے ہاتھ سے کہا میرا خیال ہے اس علاقے سے شہر کے لئے میں کوئی بس مل جائے گی۔

”میسور“ ہاتھ نے میرا ہاتھ تھام کر چلتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اب بھی چین نہیں آ رہا کہ ہم اس مصیبت سے نکل گئے ہیں۔“ اس کے ہاتھ میں اب بھی اگلی لڑائی تھی۔
”ہب تو چین کر ہی لو لڑائی“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے ہلکی مڑبھرا لہجہ کہا تھا۔ اس کے رخساروں پر زندگی کے گلاب ایک بار پھر نکل اٹھے۔ پھر قدم چل کر وہ جیسے کچھ سوچ کر غصیلے لہجے میں بول۔۔۔ ”میں اب سے کہہ کر اس طبیعت من کو مڑو چکائوں گی۔“

”میں۔“ میں نے کہا۔ ”سارا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں اس معاملے کی ہوا بھی کسی کو گھنے نہیں دینا چاہتا۔ بات خواتینہ چل کر چھوٹنی جاتی ہے اور ہمیں تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایسی اوقات اقواموں سے لڑکیوں کا مستقبل برباد ہو جاتا ہے۔“

میں تو اس کالج میں آکر پھنس ہی گئی۔ ”ہاتھ نے اپنا سکارف درست کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اب تنہائی سے سوچ رہی ہوں کہ کسی اور کالج میں داخلہ لے لوں۔“
”مگر تم اس کالج میں نہ آئی ہو تیں تو مجھ سے تمہاری ملاقات کیونکر ہوئی؟“ میں نے کہا۔

”ملاقاتیں اگر آئیں پر لکھ دی گئی ہوں تو وہ ہو کر ہی رہتی ہیں۔“ مقامات کی تبدیلی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ مسکرائی۔

”یہاں لگتا ہوتا جا رہا ہے۔“ میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ ہلاتا۔
”تلف نہیں یہ حقیقت ہے۔“ اس نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ پھر ایک لمبے لمبے ہوتے ہوئے بول۔ ”یہ بات سچ ہی میں رہ گئی۔ مجھے واقعی دن سے غول آئے لگا ہے۔ وہ ایک آہستہ کی طرف میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔“

”تج میرے ہاتھوں اس کا اور اس کے کرائے کے ہمسافروں کا مشورہ دینے کے بعد بھی ہمیں اس سے خوف آ رہا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”اس کا مسئلہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“
”اب میری ذمہ داری ہو۔“

”میں سے؟“ وہ شرارت سے مسکرائی۔ ”میں تو تم میرے ابو سے بھی نہیں ملے۔“

”آج مل ہی لیتے ہیں۔ اب تو پوچھنا ہی پڑا ہو گی ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ اس نے مسکراہٹ کے ساتھ انکسٹن میں سر ہلایا۔ ”اب میں ملنے کے لئے آچکی تھی۔ سورج ڈھلنے لگا تھا۔ میں نے سڑک پر کھڑے ہو کر انتظار کرنے کے بجائے چلتے رہتا ہوں سمجھا۔ کچھ دیر بعد ہم نے پیچھے سے آئی کسی گاڑی کی آواز سنی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو کوئی انگریز جوتا تھا۔ میں نے فوراً نلٹ کے لئے اشارہ دیا۔ انگریز نے کار روک لی۔

”ہم نے کر راسے میں ہم انگریز جوتے سے بھرتی کیا ہاتھ کرتے دیکھا لیکن تک آنے اور ٹھیک ادا کر کے اتر گئے۔ وہاں سے ہاتھ کے گھر کا لہسل ایک فرلانگ کا تھا۔ کچھ دیر بعد میں ہاتھ کی رہنمائی میں جس جگہ میں داخل ہوا وہ زیادہ طویل و عریض تو نہیں لیکن خوبصورت ضرور تھا۔ لان پر ایک نوپور عمر آدمی چھڑی لئے ہے۔ چینی سے لومر لومر شل ہوا تھا۔ یہ قاتل“ ہاتھ کے ابو تھے۔ ملاکہ ابھی سووی مکمل طور پر نہیں نکلی تھی لیکن انہوں نے قہری ٹیٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر ترکی ٹوپی تھی اور ناک پر موٹے موٹے دو سون کی کمانی دار ٹیگ۔ تقریباً“ انہی کی عمر کی ایک کئی ستوری میانہ قد خاتون جن کے جسم پر ایک گلداز ساڑھی بڑے سلیقے سے لپی ہوئی تھی۔ ان کے قدم سے قدم ملا کر چلتے کی کو خوش کر رہی تھیں۔ وہ دونوں میز پر لپے میں کوئی بات کر رہے تھے۔

”ہاتھ نے ہم پر نظر پڑتے ہی وہ بے تکلی سے چلائے اور پھر دونوں ہماری طرف لپک۔ دونوں نے ایک وقت ہاتھ کو پھٹا لیا۔

”تم کہاں تھیں بیٹی اب تک؟“ بڑے میاں نے ٹیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”دراپور“

”میں اپنے کیا تو تمہاری ایک کلاس قیلے نے بتایا کہ تمہیں لون۔۔۔“
”ہاں ابو! پہلے کن ہمسافروں نے میرے لئے یہ چال پھیلائی تھی۔“ ہاتھ بولی۔
”وہ تو شکر ہے کہ منصور مجھے اپنی گاڑی میں چھوڑنے چل پڑے تھے۔ راستے میں چار ہمسافروں نے مجھے انہما کرنے کی کوشش کی لیکن منصور نے ان سب کو مار بھگایا۔۔۔۔۔“
منصور میرے کلاس لیتے ہیں۔“ اس نے بھی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ میرے ابو ہیں۔“
”اب رانا سورج علی خان۔“

”اے۔۔۔۔۔ تو اب دن دھالے ایسی غصہ گردی ہوئے تھی ہے۔ کون تھے وہ ہمسافروں؟ میں انہیں پھٹ کا دھواں دلا دیا۔“ لوانہ کچھ سورج علی خان نے میری طرف معلق توجہ دینے پھر ہوا میں چھڑی لڑاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ضرور اس کم بخت فیروز خان کی شرارت ہو گی۔ وہ اب ان طرفوں سے میری دولت چھیننا چاہتا ہے۔ میں تو سوچتا ہوں کہ فیروز اس کا لحاظ کرتا ہوں۔۔۔۔۔ اسے جیسے بھائیوں بھی عزت دینا ہوں لیکن۔۔۔۔۔“

"تقریر بعد میں کرتے رہتا۔۔۔۔۔" ٹیکم سراج نے ناگواری سے مداخلت کی۔ "سنئے بلکہ وہ رہے ہیں۔ ذرا دیکھو تو کیا ذرا اور سے منہ لگے ہوئے ہیں۔ چو اندر چلو۔"

"ارے ہاں جی۔۔۔۔۔" سراج صاحب نے میری طرف معانے کے لئے پہلے چھری اور پھر چونک کر اسے بھل میں دبا کر ہاتھ بچھا۔ "کیا ہم جیلا خان کا بیٹی؟"

انہوں نے ہاتھ سے پرچھا۔

"منصور! ہاتھ نے میری طرف دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہاں تو منصور! بہت سے شکرینے ہیں کہ تم نے ہماری جان کے لئے اپنی بیٹی کو میرا مطلب ہے ہماری بیٹی کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا۔ آج کل کون کسی کے لئے ایسی تکلیف کرتا ہے۔ نائے سے مرعوت تو۔۔۔۔۔"

"پھر تقریر؟" ٹیکم سراج نے آنکھیں جھپکیں۔۔۔۔۔ "تمہیں تو جوہری کے بھائی لیڈر ہونا چاہئے تھا۔"

"وہ ہمیں امید لائیں۔ ملازمہ کو امراتی قہ لائے کا حکم دیا اور اطینان سے بیٹھنے کے بعد سارا قصہ پڑھا۔" ہاتھ نے کافی ترانیم کے بعد مظلوم لفظوں کی کوشش اور میری بددوری کا قصہ سنایا۔ جس کے دوران سراج صاحب ہار ہار لقمہ دیتے رہے کہ یہ اس بدعاش فیوڈ کے طاقتور کسی کی حرکت نہیں ہو سکتی اور ان کی ٹیکم ہار ہار ان کی تردید کر کے انہیں چپ کرائی دیں۔ ان کی دیکھ یہ تھی کہ فیوڈ خان کے پاس تو شراب کا ادھا خریدنے کے لئے دس روپے نہیں ہوتے وہ کرائے کے بدعاشوں کی خدمات کیسے حاصل کر سکتا تھا۔

"میں تو پولیس کو اطلاع دیتے والا تھا۔۔۔۔۔" ہاتھ کے خاموش ہونے پر سراج صاحب بولے۔۔۔۔۔ "اکیس بی سیرور ہاتھ میرا لگوشا ہے شہر کے سارے بدعاشوں کو لائن حاضر کرا دیتا تھا میں نے۔"

"میں تو کہتی ہوں چلو جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن خدا نے کرم ہے کیا کہ اس بچے کو فریڈ ریمٹ بنا کر ہاتھ کے ساتھ بھیج دیا۔" ٹیکم سراج پھر پھر لپکتے ہوئے بولیں۔ مگر وہ عربے اور میرے گھبراہٹ کے متعلق کچھ کہہ کر پوچھنے لگیں۔

میں نے انہیں بتا دیا کہ میرے والد کا میرے بچپن ہی میں انتقال ہو چکا ہے۔ والدہ دیکھاری کا ایک ارادہ چلائی ہیں۔ جس کا مالک کوئی اور ہے، باپ کا چھوڑا ہوا تھوڑا سا اثاثہ موجود ہے جس سے میری والدہ گریجویشن کے بعد مجھے بزنس کرائی جاتی ہیں۔

"ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ ماشاء اللہ۔" میرے خاموش ہونے ہی سراج صاحب بول اٹھے۔

"بہن! اہلرا ارادہ تو گریجویشن کے بعد ہاتھ کو وراثت بھیجے گا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس کے ہاتھ پہلے ضرور کر دیں گے۔۔۔۔۔ پھر اگر ان کے مہال کی مرضی ہوگی تو وہ بھی

ساتھ چلے جائیں گے ہم نے تو سوچ رکھا ہے لڑکا طوطہ کہا ہو اور اس کے حالات کیسے بھی ہوں مگر ہمیں وہ غیرت مند اور ختم ملی ہو۔۔۔۔۔ دیکھو نا میاں۔۔۔۔۔ ملی حالات کا کیا ہے۔ تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔ آج کوئی انسان ہونے ہزار کہتا ہے کل کو پانچ لاکھ بھی کا سکتا ہے لیکن خاندان نہیں بدلتا۔ آج بھی کل بھی کچھ رہے گا چاہے اس کے پاس لاکھوں روپیہ آجائے اور نجیب المظہن پیش نجیب المظہن ہی رہے گا طوطہ اس کی جیب خالی ہو۔۔۔۔۔ کیوں ٹیکم؟ انہوں نے تائید طلب لفظوں سے ٹیکم کی طرف دیکھا۔ ہاتھ نے کچھ لڑا ہی سر جھکا لیا تھا اور قہوے کی چشکیاں لپکتے گی تھی۔

"تم تو ہمیشہ فضول کی باتیں لے کر بیٹھ جاتے ہو۔" ٹیکم نے مصنوعی نکل سے کہا اور پھر جھ سے غلبہ ہو گیا "تمہاری ذات کیا ہے بیٹے؟"

"ہم لوگ مغل ہیں۔" میں نے کہا۔۔۔۔۔ (پیش خوں 03 03 63 64 59)

"دیکھا۔۔۔۔۔ مجھے تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکے کی دیکھ میں ہوشیلا خون درز رہا ہے۔" سراج صاحب نے بات ایک لی۔ "بہن چار بدعاشوں کو قہ تھا بھگا دیتے والا مظلوم ہی کی نسل سے ہو سکتا ہے۔" پھر وہ مجھ سے غلبہ ہوئے۔ "لیکن میں مظلوم کے انجام سے دل بھوتا مت کرنا۔۔۔۔۔ پادشاہوں کے ساتھ اونچی نیچی ہوتی ہی رہتی ہے۔ اب ہم مظلوم کی تاریخ۔۔۔۔۔"

"خان صاحب۔۔۔۔۔" ٹیکم سراج نے اسے سہا سہا کو گھورا اور قہ دیک کر قہوے پیا طرف حجب ہو گئے۔

ہاتھ کے والدین سے ملاقات ہوئی دلچسپ رہی رات کو جب میں گھر لوٹا تو میرا سوا تمام تر تحسن کے باوجود غایت طوفانوار تھا۔ ہاتھ کے والدین نے مجھ پر پند کیا تھا اور حسین معشوق کی خوشبو میرے قریب آ جی تھی۔ اگلے صبح میں جلدی گھر سے نکلا اور گاڑی میکینک کے پاس پہنچا کر کالچ چلا گیا۔

اس دن سے میرا تقریباً معمول ہی بن گیا کہ کالچ سے واپس کے بعد شام کو میں ہاتھ کے پاس چلا جاتا اس کے والدین کی سوجھ بوجھ میں دیکھتا ہوں تو نہیں ہو سکتی تھیں کبھی وہ چاہتے والے کیا کہتے ہیں۔ پھر بھی وقت اچھا گزر جاتا تھا۔

دن ان دنوں کالچ نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔۔ تقریباً دس دن بعد وہ کلاس میں نمودار ہوا بوا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے نشان مندرج ہو چکے تھے لیکن والد پر بدستور پلستر تھا۔ پلائیڈ دستہ بی کا قہارہ حاضری لینے لگے تو ان کی آواز سن کر چوٹ گئی۔

"سنو بھی تمہاری صحت خراب ہو گئی ہے؟" انہوں نے غصا سنے میں کہا۔ پھر من کو کھڑے ہوتے دیکھ کر بولے۔ "بہن! تم تو پہلے سے لڑاں صحت مند نظر آ رہے ہو۔۔۔۔۔ گنا ہے اچھے دن خوب آرام کیا ہے۔"

"آرام کہاں سرا" من مسکرا کر بولا۔ "میں تو بڑی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا اور بھگوان کی کڑ سے میری بھاگ دوڑ بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ مجھے ایک ایسے راز کا پتہ چلا ہے جس کا چنا شاید پوری کدس کے لئے مفید ہو اور خاص کر مس بہتاب کے لئے۔" اس نے چھٹی ہوئی نظروں سے بہتاب کی طرف دیکھا اور اس کی نظروں کے تعاقب سے سبکی نظریں بہتاب پر مرکوز ہو گئیں۔

مستہ می نے کوئی سوال نہیں کیا لیکن من نے بات جاری رکھی۔ "مس بہتاب کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ مسز منصور جنہیں وہ اپنا جیون ساتھی جانے کے خواب دیکھ رہی ہیں ایک طوائف کے بیٹے ہیں۔"

پوری کدس پر چھایا ہوا سناٹا ایک لحظہ کے لئے گرا ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو گویا کائنات کی گردش ختم ہو گئی۔ میرے جسم سے شاید کسی نے مدح سمجھ لی تھی کہ میں بکھ بولتا تو رد نگار پنک تک نہیں جھپکا رہا تھا۔ شاید میرے قدموں سے کوئی ڈانکا میٹ پھٹ گیا تھا۔ میرے چہرے اور آنکھوں سے اور میری مدح اس وقت مالم فانی اور عالم افلاک کے درمیان کیس مٹتی تھی۔ میں چٹخا چٹخا تھا اور اس کائنات کو تہہ و بالا کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت جسم کا ایک مداف بھی شاید میرے اختیار میں نہیں تھا۔

بھر جیسے دھماکے سے اڑتی ہوئی گرد و آلودہ کے دیوارہ نشین پر آج ہوئی۔ میرا ٹھہرا ہوا وجود کچا ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس حمل میں چند صدواں لگی تھیں یا چند لمحے۔ جب من کا چہرہ میری نظروں میں صاف ہوا تو میں اٹھ کر اس تک پہنچا۔ میں نے اس کا گریبان اس سختی سے پکڑا کہ اس کے پاؤں زمین سے چھٹا اچھ اور اٹھ گئے۔ کلاس روم میں اس قدر گھبراہٹ مچا تھا کہ مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"تمہیں یہ کہنے کی جرات کس طرح ہوئی غلامی کے کپڑے؟" میرے ہوشوں سے الفاظ سانپ کی پٹنگار کی طرح نکلے۔ "کیا تمہیں اپنی زندگی بالکل عزیز نہیں؟"

"مجھے مار کیم تم حقیقت کو تو نہیں پہل سکتے۔" من نے کھلی کھلی آواز میں کہا۔ "آج میں تو کل لوگوں کو معلوم ہو چکی ہوں کہ کل کی طوائف اور آج کی ڈانگہ خانم جو پہلی کے فارس رول پر وہاں کا سب سے بڑا گولڈ آباد کئے بیٹھی ہے وہ تمہاری ماں ہے۔"

میں نے اسے ڈھک پر بیٹھ دیا۔ وہ چٹ کی پردا کئے پتھر بولا۔ "تم تو ایسے ہی رہے ہو جیسے تم کو اس حقیقت کا علم ہی نہیں تھا۔ کیا کسی بیٹے سے ماں کی اصلیت لگی نہیں رہ سکتی ہے؟"

میں شاید اسے اسی وقت اور اسی جگہ ختم کر دیتا لیکن میرے ذہن کے کسی چور دروازے سے شک کا سہولیا اندر رینگ آیا تھا۔ کوئی پتھر کسی بنیاد کے اس طرح منہ بھر کر اپنی بڑی بات تو نہیں کہہ دیتا اور پھر پچھن سے میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں چڑا

ایک بھولا بھرا سا سوال میرے سامنے یک لحظہ عرصت میں کر آکھڑا ہوا تھا۔ آخر میں نے کج تک مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھا تھا؟ پھر مجھے اپنی غلطی وہ بچپن کی وہ رات یاد آئی جب میں نے من کے گالے میں ہاتھیں ڈال کر کہا تھا۔ "میں! آپ مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں؟ کیا میں آپ کو اچھا نہیں لگا جو آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھتے؟"

مجھے یاد تھا کہ اس سوال پر وہ کس طرح جھجک کر رہی تھیں۔ مجھے آج کل یاد تھا انہوں نے کہا تھا۔ "ابھی وقت کیا نہیں بیٹے؟ تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری مٹی تم سے دور رہ کر کس طرح لمبی گزار رہی ہے۔ ابھی وقت نہیں آیا۔۔۔۔۔ وقت نہیں کیا۔۔۔۔۔"

ابھی کس وقت کا اظہار تھا؟ کیا ملازمت پیشہ ماں نے اپنے بچوں کو ساتھ نہیں رکھتے۔ کیا وہ اپنے بچوں کو میری طرح الگ گھر میں توکروں کے ساتھ رکھ کر اسٹریٹ کی اخراجات کا بوجھ اٹھاتی ہیں؟ شک کے سپہ نے ان کی کون میں ایسے بیسیوں سوالوں کا زہر میری لیس فیس میں پھیلتے دیا۔ میرے دانت اتنی سختی سے نچلے ہوئے تھے جیسے کہ رستے ہوئے خون کا کھارا پن لہان پر محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے ایک بار پھر من کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں ہوتی ماں ہیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ "میںو من!" میں نے اپنی مدح کی تمام تر بیٹی کچی ڈانکی جھنجھ کر کے بیٹھی بیٹھی سی کوالا میں کہا۔ "اگر یہ بات غلط ہوئی تو یاد رکھنا کہ میں اس جگہ جیسے ذبح کر کے تمہاری لاش کا ریٹہ ریٹہ الگ کر دوں گا۔"

"اگر یہ بات بھوٹ ہوئی تو میں خود ہی اپنی گردن اتار کر تمہارے ہاتھ میں دے دوں گا۔" من نے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میرا اگر درست ہوئی تو یہاں وہیں مت آنا۔۔۔۔۔ کس منہ سے آوے گا؟"

میں نے اسے ڈھک پر پٹا اور تیزی سے باہر چل دیا۔ میں نے لپٹے عتب میں بہتاب کی آواز سنی لیکن یہ مجھے بہت دور کی آواز محسوس ہوئی۔ ہزاروں پردوں کے قہقہے میرا تعاقب کر رہے تھے۔ ان میں بہتاب کی "والدہ کر رہ گئی۔ طوفانی ہوا کے تھوڑے مجھے دھکیلنے لگے جا رہے تھے۔ گراؤ میں پہنچ کر میں نے گاڑی لٹلی۔ اب نہ جانے کیوں یک لحظہ ہی میرے ذہن و دل پر گھرا سنا چھا گیا تھا۔ ماحول پر بھی گویا موت کا سا سکوت طاری تھا۔ گراؤ میں درختوں پر اکا دکا پرندوں کی آوازیں مجھے قبرستان سے بلاتے ہوئے والے لوحوں سے مشابہ محسوس ہو رہی تھیں۔

گیت پر پہنچ کر ایک لمحے کے لئے گاڑی روک کر میں نے پیچھے دیکھا۔ ستونوں والے برآمدے پر ایک مٹی میں نصب گھڑیاں کسی چھوٹی چہرے والے عرصت کی طرح جھانک رہا

ایک لکھت ساز خاموش ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی ہاتھ کی بجھڑکٹ بھی ختم ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے گویا کاکلیٹ خاموش ہو گئی۔ ”ٹوکی جو غزل کی مطلع کر رہی تھی“ اچھی اور فرشی سلام کرتے ہوئے بولی۔ ”شریف لاپتے سرکار۔۔۔“

میں نے جب اس سے سوال کیا تھا تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ سوچ ہی

معرورہ خاتم کہاں ہیں؟ میرے حلق سے شاید کسی نور کی نواذ نکلے۔ وہ کونج
تشریف نہیں لائیں۔ لڑکی نے حرم کو از میں کہا۔ میں کی طبیعت کچھ ہمارا ہے۔ گھر
ہی آرام کر رہی ہیں۔

گھر کہاں ہے؟ میں نے انکڑے انکڑے لمحے میں پوچھا۔

بھگوانے ہی میں ہے۔ لڑکی نے انہیں آہستہ طور سے میرا جائزہ لیتے ہوئے
کہا۔ اگر کوئی ضروری کام ہے تو پیغام بھجوا دیجئے ہیں۔ آپ تشریف رکھئے۔
مجھے گھر پہنچا دیجئے۔ میں ان کے لئے ایک ضروری پیغام لے کر گیا ہوں۔ اس
بادار میں مجھے محنت کوئی اور دماغ کوئی آگئی تھی۔

”بی مغلانی!“ اس لڑکی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ میرے حجب سے وہی پھینکا لگی
آئی جس نے میرے کپڑوں پر غصہ لگائی تھی۔ ”میں خاتم کے پاس لے جاؤ۔“ لڑکی نے
اسے حکم دیا۔ پھینکا لے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہلا خانے سے اتر کر ہم گلی میں
آگے چند قدم چل کر پھینکا دائیں طرف مڑ گئی اور ہم ہلا خانے کے بھگوانے آگے۔
پھینکا ایک ایسے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی جس کی دیواروں کا پتھر کہیں
سے اکڑ رہا تھا۔۔۔ سیڑھیوں کے انتہائی پر نقش کڑی کا ایک بلور نور ٹرائی دیوانہ تھا
جس کی چمک کے ساتھ دائیں دائیں وہ پھولے پھولے ستونوں پر پھر سے تراشیدہ و شیر
پیشے تھے۔ دیوانہ کون کر اندر داخل ہوئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ دیوانہ سے گزر
کر ہم ایک وسیع لابی میں پہنچے جہاں چاروں طرف کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔
ایک دیوانہ کھلا تھا اور اس پر حریری پردے لہا رہے تھے جن سے دیوانہ روشنی چھن چھن
کر دالان میں آ رہی تھی۔

”خاتم کی فریب گاہ ہے۔“ پھینکا نے دور ہی رتب کر اشارے سے مجھے بلایا۔ ”ہم
دیوانے پر دستک دیا۔ اگر وہ اجازت دیں تو اندر چلے جاتا۔“ وہ دائیں چلنے کے لئے مڑ
گئی۔

میں نے آگے بڑھ کر کھلے دروازے پر دستک دی اور دوسرے ہی لمحے میرا دل اچھل
کر حلق میں آگیا۔ خاتم میں نے مٹی کی آواز سنی۔ ”کون ہے؟ آ جاؤ۔“

ایک ہاتھ سے پردہ اٹھا کر میں نے اندر قدم رکھا۔ وہ میری طرف پشت کیے کھڑا
کڑی کی چمک پر کنیاں نکالتے کڑی تھیں۔ ان کے جسم پر مسی عورتوں کا سا اچھا
دھارا رہتی لہا تھا اور سلیبی بال سنہرے ہل کدھوں پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کی کمر
کسی انہلے بوجھ سے بھٹی ہوئی تھی۔ بڑی آہستگی سے وہ میری طرف مڑیں اور میرا دل یک
لخت کرب کے محقق سمندر میں ڈوب گیا۔

☆☆☆☆

چند دن قبل میں نے انہیں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ محفل نظر آ رہی تھیں مگر اب
تو ان کا چہرہ بالکل ہی ازاد و چمکا تھا اور آنکھوں کے گرد تھے نوردار ہو چکے تھے۔ اب مجھے
دیکھ کر ان کے ہرے سے زندگی کی آہری رقی تک محسوس ہو گئی۔ نہ جانے کتنی دیر تک
ہم ساکت کھڑے بیٹھیں چھپکاتے پھر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے ہوں لڑکھا
کر لہجی مسی کے سہارے کے سہارے کا سارا لہا۔ گویا ان کی انگلیوں نے ان کا بوجھ سارے
سے اتار کر دیا ہو۔ سسکیں نوز۔ 0303636095-9
”مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا۔“ ان کے کپکپاتے ہوئے حلق سے کو از نکلے جو کمرے کے
پتھروں کی سرسراہٹ سے بھی مدہم تھی کہ ایک نہ ایک روز تم یومی اچانک اپنی آنکھوں
میں ہزاروں سوال لے میرے سامنے آکھڑے ہو گے۔“

”ہی۔۔۔“ اس ایک لفظ کے ساتھ ہی میری کو از دھڑک رہ گئی۔ اس ایک لفظ
میں میری زندگی کا تنفس خیر نور کرب سمٹ گیا تھا۔ میں کتنا چاہتا تھا مٹی! اسے بڑے راز
زندگی بھر کے لئے تو پھپھاتے نہیں جاسکتے تھے پھر آپ نے کیا سوچ کر لپٹ جگر گوتے کو
اب تک ایک دور اللہ اندھیری دنیا میں رکھا اور اس کے محسوس عقین اور کتواری
خواہشوں کا سہارا بھرے بازار میں لٹا دیا؟ یہ رسوائی بچپن ہی سے ساتھ چلتی تو شاید اتنی
گرم نہ لگتی مگر اس اچانک انکشاف نے تو میرا حلق اسی پکڑ کا سا کر دیا جو چاند کی
طرف اڑنے اڑنے کی لخت کھلی میں آگرا ہو۔

اچانک مٹی نے چپے ہ ہاتھ رکھ لیا اور کسی اندھیل تلیف سے ان کے ہرے سے
صلوات کچھ کر رہ گئے۔ گردن کی نیس پھل گئیں وہ مسی کا ہاتھ پر چبھ گئیں۔ کپکپ ہاتھ
سے انہوں نے سہارے کی طرف رکی ایک تپائی سے ایک چھل متدہنی اٹھائی۔ کوئی کھانا
کر اسے کھانا اور اس میں سے چڑے کی سیاہ جلد والی ایک پھولی سی کتاب نکلی۔ پھر مجھے
اشارے سے قریب بلایا مگر میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ تب وہ مسی پر اجبر ہو گئیں ان کے
ہرے پر پیٹے کے قطرات نمودار ہو رہے تھے اور پیٹے پر بائیں ہاتھ کی گرفت سخت ہوئی جا
رہی تھی۔ گویا کوئی انہما اور ناقابل برداشت درد ہو رہا ہو۔ تب میں ان کے قریب چلا گیا۔
انہوں نے وہ کتاب سی میری ہڈی کی جیب میں ڈال دی۔

”اس نوٹ بک میں۔۔۔ میں نے اپنی زندگی کی کل کہانی رقم کر رکھی ہے۔ موصو
را انہوں نے لپٹے سے لپٹے میں کیا۔۔۔ مورد یہ سب کچھ میں نے تمہارے ہی ہاتھ لکھا تھا۔
۔۔۔ سوچا تو میں نے کچھ اور تھا لیکن پھر۔۔۔ اسی خیال سے یہ جیب بکھڑے۔۔۔ لکھ کر رکھ
لیا تھا۔۔۔ کہ شاید کل اس وقت اسی طرح۔۔۔ تم میری دلیلی ہو۔۔۔ کون پہنچے۔۔۔ کچھ
سنے سنے کا وقت نہ ہو یا تمہارے ذہن پر غیظ و غضب کا قلب ہو۔ میری اس خود نوشت

انہوں نے ان کی نبض دیکھی۔ پہلے الٹ کر آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں، ناک پر ہاتھ رکھ کر سانس محسوس کرنے کی کوشش کی، پھر میری طرف مڑا اور غول خوار لہجے میں بولا۔ "تم نے ظالم کو کیوں مار دیا؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا میں دیوار سے لگا کھڑا تھا اور دنیا کی ہوجھ بھجھ سے متنی و سہ وقت محسوس ہو رہی تھی۔ ان چاروں کا وجود بھی نہایت غیر اہم لگ رہا تھا۔ سوال کرنے والے نے آگے پیچھے کرکھے گریبان سے پکڑ کر ہٹکا دیا۔ "موت لیتے کیوں نہیں۔۔۔"

کیوں مارا ہے تم نے ظالم کو؟ وہ دباؤ اس کے موٹے مونہ سے سوجھ بوجھ سے نکلتا تھا۔ میں نے اس کی میلی سی کلائی پر مضبوطی سے ہاتھ ڈالا اور گریبان سے اس کا ہاتھ اٹھائی سے ہٹا دیا۔ میں حیران تھا کہ کیا اسے میرے چہرے پر ہلکی سی موت کا دکھ یا آنسوؤں کی نمی نظر نہیں آ رہی تھی جو مجھے قاتل سمجھ رہا تھا۔ شاید میرے آنسو شگ ہو چکے تھے اور چہرہ پتلا کیا تھا۔

"میں نے انہیں نہیں مارا۔" میرے جسم کے غلغلے سے ہلا کر تھوڑا سا ٹھہرا۔ "میں انہیں مار بھی کیسے سکتا ہوں۔۔۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔"

"بیٹا؟" اس نے دہرایا اور دنیا بھر کی بے چینی اس کے لہجے میں سمٹ آئی۔ "میں بازار کی عورتوں میں بیٹوں کو جنم دینے کا رولج نہیں آتا۔ جی جی کا تاناؤ تم کس کے آری ہو ایک لخت وہ گریج اٹھا اور اس نے ساتھ ہی میرے منہ پر اسلے ہاتھ کا پھیر رہا تھا کہ کسی عام گولی کو پڑا ہوتا تو وہ تیرا کر گر جاتا۔"

میرے لہجے ہوت پر حرارت آہستہ سی نمی پھوٹ پڑی۔ میں نے ہوشیار پر لبوں کی پھیری تو طون کی چھبکی کا احساس ہوا۔ دھماکہ پر ہاتھ رکھے رکھے میں نے اپ گویا حقیقت کی دنیا میں لوٹ کر ان کا ہاتھ لیا۔ ان میں ایک دروازے پر جا کھڑا تھا۔ ایک مسی کی قریب تھا ایک نے کھلی جگہ سنبھل رکھی تھی۔ میرے جسم کی کسی لخت شریان سے چنگاریاں سی پھوٹیں اور خون کے بھاؤ کے ساتھ گویا کشیدگی میں جج ہونے لگیں۔۔۔ اور دوسرے ہی لمحے دھن میں جیسے کوئی بارود غبار پھٹ پڑا۔ میں نے اتنی قوت سے اپنے منہ کی پھٹائی پر گونسا رسید کیا کہ اس کی جگہ کوئی عام شے کا آوی ہو تا تو دوسری سانس نہ لیتا اس نے ایک بار پچھو کہ بجھوا کھایا پھر کھلے ہوئے شہر کی طرح زحیر ہو گیا۔

بالائی تھیں عجیب و غریب کوازیں نکلتے تھے پر پیچھے ان میں سے ایک کے بال غلے لہجے تھے۔ ان ہاتھوں کو طغی میں جکڑ کر میں نے اس کا سر دیوار سے کرا دیا۔ وہ مجھ سے بدی طرح لپٹ پڑے تھے۔ ان میں سے ایک میری کمر کے گرد گھبر ڈال کر مجھے گویا شگ طغی کی طرح درمیان سے ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کے طغی سے بھونڈا خراپٹیں

میں جھپٹے ہر سوال کا جواب مل جائے گا اور پھر شاید میں تمہاری نظروں میں۔۔۔ کھنڈار نہ رہوں۔ ان میں میری وصیت بھی لکھی ہے جو تمہارے لئے بہت بھاری قدر داری ہو گی۔۔۔ لیکن اگر تم نے اس پر عمل نہ کیا۔۔۔ تب بھی مجھے تم سے کوئی شکوہ نہ ہو گا البتہ میری مدد بے شکن رہے گی۔۔۔ آجائیں میں پہنچتی پھرے گی۔۔۔ کہ یہ دل کا درد۔۔۔

ان کی گریبان کی نیس اور لٹا ہوا پھل گھٹیں اور سانس کھینچنے میں آگے لگی۔ ذرا سانس آئی تو وہ آنکھیں کھول کر محفل سے انداز میں مسکرائیں اور مجھے اپنے اوپر جھکا دیکر "کروٹھی تواد میں پولیس۔۔۔" مجھے پورا اذیت سے نہ دیکھو بیٹا۔۔۔ میرے سینے پر سر رکھ دو۔۔۔ میں اب بہت تھک گئی ہوں۔۔۔ مجھے صاف کر دینا بیٹا۔۔۔ میں جھپٹیں چلی پر نہیں پہنچا سکتی۔"

غیر ارادی انداز میں "میں نے ان کے سینے پر سر رکھ دیا۔ ان کا ہاتھ سینے سے ہٹ کر میرے سر پر کھ گیا۔ ایک لمحے کے لئے میں سب کچھ بھول گیا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا رکا ہوا سیلاب اٹھ پڑا۔ دلت "میں کا جسم یک پارگی زور سے کھپایا اور میرے ہاتھوں میں رینگتا ہوا ان کا مرقش ہاتھ پھسلا اور پھر ماند مسی سے لپٹے بھول گیا۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ میں کی غم و آنکھیں ساکت ہو چکی تھیں۔۔۔ اور ہوشیار پر ایک بھوج مسکراہٹ نمودار تھی۔ میں نے انہیں چھوڑا تو ان کی گریبان ایک طرف کو دھٹک گئی پھر میں نے ان کی دھڑکن سننے کی کوشش کی دھڑکن بھی معدوم تھی۔ ایک لمحے کے لئے میں اس بچے کی طرح کھڑا رہ گیا جسے کوئی حق دہلی صرا میں غما چھوڑ گیا ہو۔ کمرے کی لوہی چھت میرے لئے دھوپ کا ساہبان بن گئی اور گلابی تلے دیا ہوا فرش ریخوار۔۔۔

اس ایک ہی لمحے میں مجھے احساس ہو گیا کہ میں کے جرنے کے بعد انسان دنیا میں کتنا بے امن رہ جاتا ہے خواہ میں طوائف ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ وہ ہفتے میں صرف ایک ہی بار ملے کیوں نہ آئی ہو "چند لمحے پہلے میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ اگر میں کی پھٹتی پر اس بازار کا دلت میرے لئے ناقصی برداشت ہوتا تو اسے قتل کر دیاں گا اور اب میرا جی چاہ رہا تھا کہ ہاؤس مار مار کر بھٹکے۔

دلت "پہلے ایک جھگڑے سے ایک طرف کو سٹا اور مدد اور سائڈز کی طرح دھڑکتے ہوئے چار نیم و نیم افراد کمرے میں گھس گئے یہ قلم" وہی تھے جنہیں میں نے پوچھا تھے۔ پر تاش کھیلنے دیکھا تھا ان کے چوڑے چنگے چہرے آگ پر رکھی تانبے کی پانیوں کی طرح دھک رہے تھے اور آنکھوں میں طون اتر رہا تھا۔ ان میں سے ایک لپک کر میری کے قریب

Scanned By Azam & Ali

دوبے پر چڑھ کر میں دوسری بھرتی کر دیا۔ اس سے آگے کوئی مکان نہیں تھا۔ سامنے گلی آگئی تھی۔ میرے عقب میں دو نکس و پٹلی گھونچ رہی تھیں۔ ان کی بہت دھم دھم سی گواڑ یہاں تک پہنچ رہی تھی کہم اس سے مجھ پر کوئی خاص گھبراہٹ نہیں تھی اور نہ ہی سانس بھولی ہوئی تھی۔ یہ بھاگ دوڑ میرے لئے معمولی سی ورزش تھی۔

مجھے اندھیرے میں میں نے چھت کا جائزہ لیا۔ یہاں لوہے کے دو پتنگ اور چند بھدی سی کرسیاں چڑی تھیں۔ انگی پر چند کپڑے لگے ہوئے تھے جو دھم سی ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ آگن کے قریب ہی سے بیڑیاں چمچے جا رہی تھیں۔ میں نے ایک نظر چمچے بھاگنا اور بیڑیاں اترنے لگی۔ ایک حیل چمچے اگر بیڑیاں اچانک ہی ختم ہو گئیں۔ اور میں نے اپنے کپ کو ایک ایسے کمرے میں کھڑا پایا جس میں کئی کڑکیاں تھیں اور ان پر جتنی گلی ہوئی تھیں۔ ایک گوشے میں ایک مسوی پر ایک ٹوکی لگا دی تھی۔ سے ٹیک لگائے کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ یہی بھٹ سن کر اس نے کتاب بندے اطمینان سے چہرے کے سامنے سے ہٹائی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے یوں اچانک کمرے میں پا کر نہ تو اس کے ہاتھ سے کتاب بھوٹ کر گری اور نہ ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھلیں۔ کتاب اس نے نلیف سکون سے ایک طرف رکھ دی اور میرا سر تاپا جانتے لینے لگی۔

وہ عجیب سی ٹوکی تھی۔ اس کے حسن میں کچے انہوں کا سا رینگنا پن تھا۔ بھرا بھرا سا چوہ۔ موٹی موٹی سیاہ پٹلی سی آنکھیں، مسوی سے چمچے تک گلی ہوئی چمچیلے سیاہ ہاتھ کی موٹی سی چٹنی قرعہ مائل جسم، لیکن اس لڑکی میں بھی عجیب لطیف کا حساب تھا۔ مسوی پر لٹھی وہ خاصی طویل انکسٹ لگ رہی تھی لیکن جب اٹھ کر بیٹھی تو گولائیوں میں مٹ گئی۔

”کواڑ میں گھر کارکنوں والی کھک تھی۔“

”کچھ نہیں۔“ میں نے ایک لمبے کے توقف سے جواب دیا۔ ”البتہ اگر نہ بھاگتا تو شاید جرم ہے گتھی میں پھنس جاتا۔“

”پھنس تو اب بھی سکتے ہو۔“ میں حیران تھا کہ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی۔

”نی الحال مجھے یہ اندیشہ محسوس نہیں ہو رہا ہے۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا اور میری یہ لاپرواہی لوانگری پر جلی نہیں تھی۔ لیکن تم نے مجھے دیکھتے ہی ہر چیز سمجھ لیا کہ میں کچھ کر کے کیا ہوں؟ میرا خیال ہے میرا خیال کچھ ایسا بگڑا ہوا تو نہیں ہے۔“

”یت ملنے کی نہیں انکسٹ کی ہے۔“ اس نے کوئی گڑبگڑ پر نکالی۔ ”جب تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے میں کسی کمانی کا کواڑ ہوں۔ یہ تیرا موقع ہے کہ کوئی اس طرح بیڑیوں کے راستے میرے کمرے میں تپا نہ۔ ایک مرتبہ کھنڈ کا اچھہ پاتا کیا تھا جس نے ایک طوائف کو گلا گھونٹ کر مارنے کی کوشش کی تھی اور اس کے شور مچانے پر

بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ایک باروازی بیٹھ گیا تھا جس نے نشے میں کسی تلاش میں کو قتل کر دیا تھا۔ طوائف دیکھ کر اس کا سارا اندھ بھین ہو گیا تھا اور اس نے نہ جانے کہاں سے بھاگنے کا راستہ (موجود) لیا تھا۔ اب تیسرے تم آئے ہو۔ عجیب اتفاق در اتفاق میں ہے کہ ان تین موقعوں پر میں اسی مسوی پر موجود تھی؟ حالانکہ عام طور پر میں روزانہ اس وقت اس کمرے میں نہیں ہوتی۔ مجھے لگتا ہے کہ آسمان میں جب بھی اس وقت یہاں لپٹا کواڑ کی تو مجھے انتظار رہا کرے گا کہ ابھی کوئی ہاتھ کا پتلا بیڑیوں کے راستے آجائے گا۔“ پھر وہ خود ہی گھبرا اس تصور سے فس پڑی۔

”مجھ سے پہلے آئے والوں کا کیا انجام ہوا تھا؟“ میں نے دونوں ہاتھ بالندوں کی بیڑیوں میں ٹھونکنے ہوئے پوچھا۔

”پکڑے گئے تھے۔ میں نے انہیں پکڑا دیا تھا۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”لیکن مجھے پکڑانے کی کوشش نہ کرنا۔“ اب میں بھی مسکرا دیا۔ ”کیونکہ میں نے کچھ نہیں کیا اور نہ میں ہاتھ کا پتلا آیا ہوں اور مجھے ایسے لوگ ہاتھ پاند نہیں جو کیڑیوں کے ساتھ گھن کو بھی پیچنے کی کوشش کریں۔“ پھر میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”وہیے ہائی دے دے تم کون ہو؟“

”اس بازار میں موجود عورت کیا ہو سکتی ہے؟“ اس نے گویا میری کم حسی پر اہم کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم اس بازار کی ہو تو اس وقت کمرے میں لیٹی کیا کر رہی ہو؟ تمہیں تو اس وقت کوششے پر ہونا چاہیے تھا۔“ میں نے اپنے سوال کا جواز پیش کیا۔

”میں ابھی زیرِ تربیت ہوں اور سچے پر کچھ دن میرے آرام کے ہوتے ہیں۔ سمجھے؟ اور تم کون ہو؟“ اس نے ایک بار پھر گہری ٹھٹھکیوں سے میرا جانچ لیا۔

”طوائف ڈالو۔“ میں کہنے لگا تھا لیکن میری زبان نے ساتھ نہ ط۔ میرے حلق میں ایک لخت کڑواہٹ سی گھل گئی اور میرے حواس پر ایک بار پھر اس صدمے کی بخ بنگلی چھا گئی جس سے میں گزر کر تھا تھا۔ میں نے دھم سی آواز میں کہا۔ ”میں بلندیوں کی دنیا کا سالر تھا مگر اچانک میرے قدموں سے زمین کھینچ لی گئی ہے۔“

”پھر تو ہزاری ایک سی کمانی ہے۔“ وہ ہر شور مسکرا رہی تھی۔ شاید مسکراہٹ اس کے ہوشوں میں ایک کا ایک حصہ تھی۔

”دقت“ مجھے کہیں قریب ہی سے پولیس کی دسل سنائی دی مجھے پولیس والوں کی یہ آواز بہت اچھی لگی کہ وہ مدد ہی سے اپنے مطلوبہ آدمی کو خیرباد کر دیتے تھے کہ وہ اپنی حفاظت کا بندوبست کر لے۔

”بھاگتا چلے ہو؟“ ٹوکی نے پوچھا۔ پھر جواب، کا اظہار نہ کر پھر ہوئی۔ ”بہتر ہے کہ

بھاگ ہی جلتا۔ نہ چلتے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ وہ اس گمراہی طرہ لیں گے۔
مجھے بکارتو کی تو نہیں؟ میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

"جیسے بکارتو نے کوئی خاص چارہ نہ۔" وہ اٹھتے ہوئے بول۔ "بلکہ اگر تم ان حالات میں نہ آئے ہو تو شاید ایک رات کے لئے میں خودی تمہیں گرتا کر لیتی۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ پھر پھر ہی لے کر اپنی فاکس سی پٹیا کو پشت پر پھینکا اور میرا ہاتھ قہقہے ہونے لگا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" اس کا نرم و گداز ہاتھ مجھے کاٹا کر قہقہے لے لے مجھے سر سے پٹیاں تک ہٹا کر رکھ دیا۔ لپٹے جسم میں ایک ہلکا سا ارتعاش لے لے میں اس کے ساتھ چل دیا۔ اس نے گویا اپنی ہفت جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہیے میں بھی کسی کے ساتھ ایک دھڑا کر چکی ہوں۔ ویسے ہم لوگ زندگی میں وعدہ نہیں کرتیں اور کرتی ہیں تو آخری سانس تک بھاتی ہیں۔" پھر وہ گہری اور سرد سانس لے کر بول۔ "حاشی تم مجھے پتہ نہ پہلے نظر آئے ہو۔"

"پھر کیا ہو جائے؟" میں نے پوچھا چلا لیکن تھلے کیوں خاموش ہو رہا۔ کمرے سے نکل کر ہم ایک چھوٹی سی ٹیرس نما جگہ پر آگئے۔ یہاں سے نگاہ سی بیڑیاں نیچے جا رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ مکان زیادہ اونچا نہیں تھا۔ لیکن جب اس کی رہنمائی میں میں نے بیڑیاں اترا شروع کیں تو یوں لگا جیسے ہم کوئی کی قسم کی طرف جا رہے ہیں۔ بیڑیوں کے انتظام پر ایک مختصر اور نگاہ سی بیڑیوں میں تھی جس کی دیوار کے ساتھ تھلے کیا گیا کالھ کھارہ تھا۔ چھت میں ایک چھوٹا سا بلب نصب تھا جو گہرے گہرے سے اس قدر دھندلا ہوا تھا کہ اس کی روشنی چرخ سے بھی کم تھی۔ اوپر کولوں میں کھڑیوں نے چلتے نکلے رکھے تھے۔ نیچے ایک کمرے میں ل تھا جس سے پورے پورے پانی ٹپک رہا تھا۔

اس بیڑیوں سے ہم بیڑیوں کی طرف سمت میں مڑ گئے اور ایک ڈوبے نما کمرے میں پہنچ گئے۔ ان مکانوں کی ساخت ہماری کچھ سے ہلاتی تھی۔ نہ چلتے کس کی چھت کس سے لی ہوئی تھی۔ اور کس کے دروازے کس کن گھیرے میں تھتے تھے۔ اس ڈوبے نما کمرے میں گہرے نیچے کچلے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کمرے کے پچھلے دروازے پر رکب کر وہ میری طرف مڑی۔

"اس دروازے سے تم عین جلی میں ٹھو کے تو سامنے ہی وہ عمارتوں کے درمیان ایک تاریک جگہ نظر آئے گا۔" مجھے سمجھاتے ہوئے بول۔ "اس میں گھس جانا اور سیدھے ہی چلے رہنا۔ راستے میں وہ جگہ چھوٹے چھوٹے چوراہے آئیں گے۔ وہ سب چوراہے سے ذرا آگے ہائیں ہاتھ پر ایک بہت اونچی دیوار ہو گی۔ وہ بھیجک سیٹھا کا پیچہ حصہ ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا آہنی دروازہ ہو گا۔ اس میں داخل ہو کر سیٹھا کے کپڑوں سے گزر کر تم قارس ریل کی حدود سے باہر پہنچ جاؤ گے وہاں سے چارٹر سیکر

سامنے بھاگ جاتا۔ اب زیادہ وقت ضائع نہ کرنا۔ اگر پولیس کی فوری آگاہی تو شاید وہ بازار کی ناگہ بندی کی کوشش کریں۔ اب یہ پوچھنے کا وقت نہیں ہے کہ کیا ہوا تھا۔ لیکن معاملہ کٹلی عین ہی لگتا ہے۔ جی بھاگ دوڑ کی گواہیں آ رہی ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

میں دروازہ کھول کر بیڑی سے نکل گیا۔ یہ ایک نگاہ اور نیم تاریک سی جلی تھی۔ لیکن ابی زیادہ مشابہ نہیں تھی۔ ہر اسرار بیڑیوں کی طرح خاصی قندیلوں میں لوگ اور اورا دھڑا جاتے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے قندیلوں سے اوپر اور دیکھا اور بیڑی سے سڑک عبور کر کے سامنے دو عمارتوں کے درمیان خلا میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک متعلق اور نگاہ تاریک سی جگہ سی جلی تھی۔ قدم قدم پر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ زمین نیکی اور اونچی نیچی تھی۔ اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے تھے آگے چوراسے تک پہنچنے میں کٹلی دھڑا لگ گئی۔ چوراسے سے آگے گلی بکھ کھٹا ہو گئی اور یہاں بکھ روشنی بھی نظر آنے لگی۔ یہ روشنی وہ چھت بکھ مکانوں کی عین کڑیوں کے فیشوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ میں تیز چل کر قدم اٹھانے لگا۔

راستے میں میں نے کوڑے کا پدا سا ڈرم دیکھا جس کے اوپر گرد بھی کھڑا تھا ہوا تھا۔ ڈرم سے آگے چار چھ بیڑیاں تھیں۔ یہاں سے گلی اونچی ہو گئی تھی۔ میں بیڑی سے بیڑیاں چڑھ رہا تھا کہ سامنے سے بیڑی سے بیڑیاں اتر آ رہی تھیں جس سے کھرا گیا۔ وہ لو کھڑا کر دھپ سے بیڑی پر گرا اور اس کے ہاتھ سے کوئی چڑچوٹ کر چھری بیڑیوں سے گری اور لڑکھتی ہوئی کوڑے کے ڈرم کے قریب تاریکی میں چلی گئی میں سنبھلا اور رک گیا وہ شخص فوراً اٹھ کر دیواروں کی طرح ڈرم کی طرف لپکا۔

"کیوں گئی۔ کیوں گئی؟" وہ ہاتھ بٹھرتے ہوئے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور میری طرف ہینے کے اشاروں کے بل زمین پر گر کر اندھیرے میں چل دیا۔ اس نے لگا لگا اس کی عمر بھر کی کٹلی گھونٹ لی ہو۔ میں چلتا تو اسے اس کے حال پر ہموڑ کر آگے چل دیتا لیکن غیر ارادی طور پر رک گیا شاید شخص کے تخت۔

اندھیرے سے کوئی چڑا اٹھا کر وہ سیدھا کھڑا ہوا اور جب اس کا ہاتھ قدرے روشنی میں آیا تو میں نے دیکھا وہ ایک ٹیٹی ہوئی لہی سی سڑک تھی۔ وہ آنکھوں کے قریب لا کر اسے وحشت دہانہ دکھانے سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چوڑے چکے ڈھلچے کا ایک طویل القامت اور پیر عمر کوئی تھا۔ اس کے جسم پر ایک سیلا کپڑا پرانا اور ڈھیلا ڈھلا تھا۔ اس کا ہاتھ تھا۔ اس نے لہلہ کا تھا جب اس کی جسم پر گوشت موجود رہا ہو گا۔ اس کے گلے نیچے ہونے لگے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک عجیب و غریب دھندلی دھندلی سی چمک

دی تھی۔ رہنماؤں پر کسی دن کی بڑی ہوتی تھی۔ اس کے استخوانی مگر بڑے سے ہاتھ میں آگنی کی لڑائی تھی۔

توڑ دی۔۔۔ غیبت۔۔۔ کھینچنے تو نے میری سرخ توڑ دی۔ بھری بھرائی سرخ توڑ دی۔۔۔ "وہ بیٹا ہوا۔۔۔ معلوم ہے تیرے کل مارنا کا کیا بھاد ہے۔"

اگر میں اس کی بات سمجھ کر ہوں تو شاید میں اسے کچھ دیکھ رہا ہوں اس نے مجھے اس کی سلسلے میں نہیں دی اور اچانک اس سرخ سے مجھ پر حملہ کر دیا جس کے ایک سرے پر اب شادک کی دھواں کی طرح نوکیلی ہوتی تھی۔ مجھے اس وقت حال اور زندہ درگور انسان سے ہونے کی توقع نہیں تھی۔ وہ سرخ کو بھڑکی طرح بکا کر ایک تختہ ہی مجھ پر چھینا تھا اور میں نے غیر ارادی طور پر ہاتھیں بالذات اڑا لے کر اس کے وار سے بچنے کی کوشش کی تھی فوراً ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ یہ میری غلطی تھی جو اس کی لڑائی میں بھول چوک بعض اوقات ہوتی ہے۔ لڑا دیر پہلے میں چار نیم نیم لور پش در سرخ لڑاؤں سے بچ کر نکل آیا تھا لیکن اسی شے کے سامنے غلطی کر گیا۔

سرخ کی نوکیلی کشتی سے بچے کپڑوں سے گزر کر میرے والد میں سے گستاخ ہو گئیں اور کسی اچھے تک چرنا چلی گئیں۔ اگر میرے جسم پر حملہ نہ ہوتا تو شاید مجھے تک میری گلائی پر لیے زخموں کی گہری گہری پڑ جائیں۔ تکلیف سے میرے دانت جھجک گئے۔ شے نے دوسرا ہاتھ میری کمر میں ڈال دیا تھا اور مجھے سیڑھیوں سے بچنے کے راستے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی کشتی پر ایک ہاتھ رسید کیا۔ اور وہ اچھل کر کوڑے کے ڈرم کے قریب جا کر اور وہیں ساکت ہو گیا۔

میں نے ایک نظر اپنے ہاتھیں والد پر ڈالی۔ زخموں سے خون اٹھ چا تھا اور دھیرے دھیرے دھڑ دھڑ کی آستین سے رستے لگا تھا۔ فی الحال اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ میں نے دائیں ہاتھ سے کشتی سے لڑا اور والد کو تختی سے قتل اور دود پڑا۔ اس وقت پتی شرف سے مجھے اپنی گاڑی کا خیال آیا تھا۔ کاش کسی طرح میں اس تک پہنچ سکتا۔ لیکن اب مجھے سڑکوں کے کنارے سے اندازہ نہیں رہا تھا کہ میں نے گاڑی کہاں کھڑی کی تھی اور یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں غیر چھٹی طور پر گاڑی کی تلاش میں لوہر لوہر پھیلنے کا خطرہ مول لیتا۔

دوسرا چور ہا محدود کرنے کے بعد میں لڑکی کی چابی ہوتی نکالنے کے مطابق سینما کے پھولے سے چھٹی گیت پر پہنچ گیا۔ میرے ہاتھ سے اب خون کی بوندیں چپکنے لگی تھیں۔ گیت سے گزر کر میں نے تاریک احاطے میں پہنچا اور پارکنگ لائٹ کے قریب سے گزر کر سینما کی عمارت کے پہلو میں چلے گئے۔ کہاؤڑ کا اگلا حصہ روشن تھا۔ سامنے دائیں ہاتھ پر دیوار کے ساتھ کچھین لور پش سڑک کی دھواں نظر آرہی تھی جس پر لاؤسٹر کے پیچھے وہ تین آدمی لوگ رہے تھے۔ کہاؤڑ میں دہرائی تھی۔ میں نے گہری دیکھی سوا دس بج رہے تھے۔

نابھہ آخری شے شروع ہو چکا تھا۔ اس نے کہاؤڑ میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ کچھین کے سامنے پہنچ کر میں نے آدے میں ہو گیا کیونکہ لاؤسٹر کے پیچھے اونگھا ہوا آدمی کچھ پھونک کر میری طرف دیکھنے کے بعد سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی نظر میرے والد پر پڑے۔ جس کی آستین اب خون میں بیک بن چکی تھی۔ برآمدے سے گزرتے وقت میری نظر جنگ کی کڑکیوں پر پڑی ایک کڑکی کے پیچھے ابھی روشنی نظر آرہی تھی۔ گیلری کے کھٹ ابھی ختم نہیں ہوئے تھے اور جنگ لڑک ایک ہاتھ پر فوری طعنے بیضا حویج لکھوں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ بجلی کے کونڈے کی طرح ایک خیال میرے ذہن میں لپکا کہ اگر میں کھٹ لے کر اندر جا بیٹھوں تو ہال کے اندر میرے میں ایک تو میں اپنے والد پر اطمینان سے کوئی دھواں وغیرہ ہانڈے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ دوسرے مجھے سکون سے کچھ سوچنے کی سلسلے لے جانے کی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

جنگ دھند خاص لڑائی تھی لڑک لڑک وہاں سے میرے والد پر نظر نہیں ڈال سکتا تھا۔ میں نے خاموشی سے پیچھے اس کی طرف پھوٹ کر کھٹ لیا اور کڑکیوں کے ساتھ ہی گیلری کی طرف رہنمائی کرنے والا ایک تیر کا نشان دیکھ کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا۔ یہاں روشنی تھی۔ میں نے ہاتھیں بالذات بالکل پہلو سے لے کر ہاتھ جیب میں فٹوس لیا اور گیت کچھ کھٹ دے کر آدھا حصہ واپس لے کر جلدی سے دوداڑ کھول کر اندر گھس گیا۔ گیت کچھ نے مٹھی انداز میں اپنا کام انجام دیا تھا اور میری طرف قہقہہ "توجہ نہیں دی تھی۔"

اندروں پہنچ کر میں چھ کھٹے تو دوداڑے سے ٹک لگائے ہی کھڑا رہا اور جب انھیں ہال کے اندر میرے سے کچھ باتوں ہوئیں تو میں نے کرسیوں کی قطاروں کا جائزہ لیا۔ پردے پر جب کوئی زیادہ روشن سین آتا تو کرسیوں پر موجود اسٹیمپے نیچے انسانی ہونے نظر آنے لگتے تھے۔ ہاتھیں طرف کی کچھل قطار تقریباً غلطی تھی۔ میں اس کی آخری کرسی پر جا بیٹھا۔ مجھ سے آگے بھی کسی کرسیاں خالی تھیں۔ قدمے اطمینان کا سامنہ لینے کے بعد میں نے جیب سے دھواں نکالا۔ مگر مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی نیپلی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ دوسری چڑھائی ی تھی جو اس منصوبہ کے لئے مولوں تھی۔ میں نے ہائی کھولی لور اسے کشتی سے اور والد پر دو تین پکڑ دے کر ایک ہاتھ لور دھواں کی مدد سے حتی الامکان تختی سے گدھا لگا لی۔ زخم کی تکلیف تو یک وقت بڑھ گئی لیکن مجھے امید تھی کہ کچھ دیر بعد خون کا بہاؤ بہت کم ہو جائے گا۔

والد کی طرف سے توجہ کچھ ہٹی تو خیالات نے یک وقت ذہن پر طاری کر دی۔ کالج کا تصور انتہا کی یاد میں کی موت کا وہ سب کچھ کالج کی باتیں تھیں مگر زندگی گویا پک پکچھتی ہی وقت کی بہت ہی علیحہ بھلائی کر کہیں سے کہیں نکل گئی تھی۔ اب سوچا تو یک وقت ہی آنکھوں میں آنسوؤں کا طہار سا ٹپکنا لپکا اور پہلو میں بٹلے کھٹے زخموں کے منہ

کھل کھٹے چٹھے اٹھائے یہ کیا ہو گیا تھا اور میں کس انداز میں کھائی کے جانے پر اکٹڑا ہوا تھا؟
مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک بات تو بہر حال طے تھی کہ میں اب لوٹ کر پناہ نہیں پاسکتا تھا۔ کم از کم ان لوگوں کے چلنے میں نہیں پاسکتا جن کی مجھ سے راسخا ہی نہیں تھی۔ منانے یا پھر شاید میری اپنی ہی تقدیر نے مجھے ان لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ یہی میں بھی کم از کم اس وقت میں خطرات کے چنگل میں ایک رہا تھا۔ پولیس چھینا میری تلاش میں سرگرم ہو چکی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے ہلے وقوع سے گزار ہو کر کچھ قدم اٹھایا تھا یا نہ تھا۔ مگر وہاں ٹھہرا ہی نہیں تھا۔ میرے لئے کوئی ایسے حالات کا نظام نہ کر دے آتا اور ویسے بھی اب جو کچھ ہو چکا تھا اسے بدلنا تو میرے اختیار میں نہیں تھا۔

مجھے یہ بھی نہیں تھا کہ جھگڑے میں جو وہ افراد لہجہ بچے تھے انہوں نے اپنے وہ ساتھیوں کے قتل کا الزام مجھ پر ہی ڈالنا تھا اور ان دونوں کے علاوہ بلا جانے میں جس لڑکی سے میرا سامنا ہوا تھا اور جو خاموش مجھ کی کے پاس لے کر گئی تھی وہ پولیس کو میرا حلیہ خاصی تفصیل سے بتا سکتی تھی۔ اس لڑکی اور خاموش کے دہانے سے ویسے بھی میں نے شہرہ ی میں محسوس کیا تھا کہ انہیں میری آمد کا انداز خاصا مشکوک لگا تھا۔ اور میری طرف سے کھٹک سی گئی تھی۔ اور تو اور میری اپنی ماں کے قتل کا الزام بھی مجھ پر آسکتا تھا۔

ان کا پیار دل مجھ سے یوں سامنا ہونے کے اثرات شاید برداشت نہیں کر سکا تھا مگر کون چھین کر سکتا تھا کہ اس ملاقات کے صدمے نے ان کی دھڑکنیں چھین لی تھیں۔ کسی کو صدمے کی نوعیت کا علم ہی نہیں تھا۔ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ انہوں نے اپنی اصلیت کو میری نظروں سے اوچھل رکھنے کے لئے میں سال تک مجھے ایک علیحدہ دنیا میں رکھا تھا مگر ان کی ساری جدوجہد اکارت مچی تھی۔

صورت حال کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ تین افراد کے قتل کی یہ کہانی اگر اخبارات میں آجاتی تو منانے نے بھی میرے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لئے پولیس کو میرے بارے میں ہر وہ بات بتائی تھی جو اس کے علم میں ہوئی۔ میرے گھر کے بارے میں پولیس کو مطلع کرنا تھا تاکہ میں وہاں بھی پناہ نہ پاسکوں۔ اس نے تو ویسے ہی میری زندگی کا کئی کمزور پہلو اچھوڑنے کے لئے نہ چنے کتنی محنت کی تھی۔ مجھ سے دشمنی شروع ہونے کے بعد اس نے چھینا میرے گھر کی گھرانی کی تھی اور اس دوران میں مجھ سے لئے آئی تھیں تو منانے یا اس کے کسی گھر کے لئے چھینا ان کا تعاقب کیا تھا اور جو بات مجھے ہیں برسوں میں معلوم نہیں ہو سکی تھی وہ اس نے چند دنوں میں معلوم کر لی تھی۔ دشمن تھا نا۔ گھنٹہ میں لگا ہوا تھا۔

قصہ ہی قصہ میں اس کی عقل دیکھ کر میرے جسم کا زلزلہ دووں شطہ بن گیا اور بے چینی اور بے لیلی کے اس لئے میں بھی میں نے یہ ضرور سوچا کہ اس لہجہ کے چٹکے کو کبھی ضرور چھوئے تھے بدتر کر چھوئے گا۔ مجھے پہلوی کے جنم میں دشمنی کر اسے نہ جانے کیا ملا تھا۔ ہاتھاب تو وہ اب بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اتنا مجھے چھین تھا۔ میرے ساتھ تو اب جو بھی ہوتا تھا سو ہوتا تھا لیکن میں اپنی پہلوی کے بعد اسے زندگی سے لڑتیں کھیر کر کے لئے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ دل ہی دل میں اس فیصلے سے مجھے ایک گوند سکون نہ ملا تھا۔

پیس فون 03036360959

پھر مجھے اس ڈائری کا خیال آیا جو میں نے میری جیب میں ڈالی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس میں میرے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ وہ میں دل میں لئے کن کے درد اسے پہنچا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں اندھیرے میں ڈائری کا مطالعہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اضطراب سے پہلو پھلا اور میرے والدین ایک بار پھر نہیں آتھی۔

میری طرح تمہارا دھیان بھی فلم میں ہرگز نہیں ہے۔

میں اپنے کان کے قریب سے سرگوشی من کر تقریباً "لو چل پڑا۔ وہ لڑکی بولنے کب میرے برابر والی سیٹ پر آئی تھی۔ تجھے اندھیرے میں میں نے اس کے غدغلا کا جانچ لینے کی کوشش کی۔

اس کے ہل کئے ہوئے تھے۔ ٹھنڈوں کے نیچے تک کے اسکرٹ پر اس نے پہلو پھلائی سی لڑکی کی ہنسی دیکھی تھی۔ اس کی عمر میں سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس کے دلہنہ بھرے ہوئے اور پائلیں بھی تھیں۔ فلم کے پردے سے ٹھنڈے ہوئے والی مدغم روشنی میں اس کے ہونٹوں پر گل ہوئی لب اسٹک چمک رہی تھی۔

اس کی رنگت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ پہلو پہلو جڑی میں اس کا جسم یوں قہر تھا گویا پھوٹے چال میں بیٹھی چل کر نکلتی ہو۔ اس کے کپڑوں سے کوئی سنسنی سی خوشبو پھوٹ رہی تھی تاہم میری نگاہیں لگ رہی تھیں۔

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی پھر میں نے آہستگی سے کہا۔ "ہی۔۔۔ فلم کی طرف واقعی میرا دھیان نہیں تھا۔"

"کیوں؟ کیا تمہیں ان فلمی ہیروئینوں سے کوئی دلچسپی نہیں جن کے مشق میں آج کل کے نوجوان مرے جا رہے ہیں؟" آپ اس نے گھبراہٹ سے کہا کہ میری آنکھوں میں جھانکا اور اس کی سانسوں کی طوفانوار حرارت مجھے اپنے دلہنہ کی طرف پر محسوس ہوئی۔

مجھے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ ایک بار تو میرا ہی چلا کہ اچھ کر بھاگ لوں لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ تو زبان ہی مشکوک بننے والی بات تھی۔ میرا ذہن بداصل نہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ "بلا غور میں نے کہا۔"

کی طرف سے۔ ہر کمرے کا دروازہ سیاہ رنگ کا تھا جو کبھی سلیش دیا ہو گا۔ لڑکی نے بائیں طرف کے آخری کمرے کا دروازہ کھولا اور لائٹ کن کر کے یوں ایک طرف کھڑی ہو گئی گویا مجھے کمرے کا معائنہ کر رہی ہو۔

عمارت چھٹی پر تھی۔ حال فکر آ رہی تھی۔ اس کی نسبت کمرہ اندر سے نکلتا تھا۔ سحرانہ قتلہ حتی کے دیواروں پر تارہ سیدی بھی نظر آ رہی تھی۔ فرش صاف مہرے کا ٹکڑا تھا۔ ایک گوشے میں مسمیٰ مٹی ہوئی تھی جس پر صاف سحرانہ قتلہ اس کے قریب پھولی سی تپائی اور ایک کرسی تھی۔ تپائی پر چند کتابیں رملے اور المومین کی ایک کیتھی اور کپ رکھا ہوا تھا۔

ایک کونے میں کھڑکی کے قریب بیڑی سی کارنس تھی جس پر اسٹون اور چند برتن چڑے تھے۔ کارنس کے قریب ہی وائش تھیں قتلہ ایک طرف اور کبھی سی دیوار گیر الٹاری تھی۔ جس کے ایک ہٹ پر خاصا بڑا آئینہ لگا ہوا تھا قریب ہی ایک پھولی سی سنگھار میز رکھی ہوئی تھی۔

لڑکی نے دروازہ بند کر کے کھڑکی چڑھا دی اور مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ہنسنے لگا تھا تو اس نے پھولی پھول سی لون والی برسی اتار کر مسمیٰ پر پھینک دی اب میں نے دیکھا کہ وہ اتنی جوان نسیم تھی چھٹی جیڑی میں نظر آ رہی تھی۔

”اب چلو پہلے کمرے دیکھو والد کا ہمراہ کیا جانے یا نا آسوں خواہشوں کا؟“ اس نے دونوں ہاتھ کر پر رکھ کر ایک لڑا سے ہاتھ کو جھکا دے کر پوچھا۔ پھٹ میں تار کے سرے میں لٹکے ہوئے بلب کی روشنی میں اس کی متدل رنگت میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

”والد کا علاج پہلے ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا کافی خون ضائع ہو چکا ہے۔“

اس نے اٹھت میں سر ہلایا اور سنگھار میز کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی تینوں درازوں میں ہاتھ مارنے کے بعد ہاتھ اس نے چوڑی پٹیا کا ایک پتلا سا رول اور پتھر آویڑی کی ایک چھٹی لٹائی اور ہلکا۔ ”ہلکا اتار کا وائش تھیں پر آج۔“

میں نے اس کی بداعت پر غل کیا۔ اس نے فیض کی آستین کو تہہ در تہہ لوہ کر اٹھنے کے بعد دم کا معائنہ کیا اور اس کے ہونٹ پٹی بھانے کے انداز میں سکڑ گئے۔ دم واقعی میری توقع سے بھی بڑا تھا بلکہ یہ ایک نہیں تھی دم تھیں۔ ایسا گتھا تھا کہ کسی شانہ چاقو سے والد کا حصہ چر دیا گیا ہو۔ اس نے پٹی کا کچھ حصہ بھاڑ کر پتھر آویڑی میں بھگوا اور اسے دم پر چھپتے گئی۔ میری چٹ لٹکے لٹکے رہ گئی۔

”ارے۔۔۔ اس میں تو بیٹھے کے ذمے بھی ہیں۔“ وہ والد پر جھپٹتے ہوئے بولی۔

”کیا اسے کچھ اور چیزیں پر دھیان دیتے کے لئے بھی دیکھیں نہیں لایا جا سکتا؟“

”سکرائی۔“

”میں نے پوچھا۔“

”نہ ایک چھوٹے مگر پر سکون اور آرام دہ کمرے میں کسی کی میڈیاں میں رات گزارنا دیا ہر کی پریشانوں سے نا آسوں سے بے نیاز ہو جانا وغیرہ۔“ اس نے ہر شے سے سکرانے ہوئے سرگوشی کی۔

”دیکھیں اور کیسے؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں ابھانک ایک خیال نے سراپا قتلہ لڑکی یک طرفہ مجھے بہت اہم محسوس ہونے لگی تھی۔

”میں اس سے کچھ ہی دور۔ ایک کمرے میں۔“ اس نے جواب دیا اور وہاں پہنچنے پہلے کو بھی کچھ مل سکتا ہے ہر طریقہ اس کی قیمت طیور سے ادا کر سکو۔“

”پہنچنے پہلے کو پھونڈ۔“ میں نے قہرک گل کر کہا۔ ”مجھے حقدور ہے۔“

”تو آؤ پھر چلیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا رخ لگے دروازے کی طرف تھا۔ میں نے ایک قدم بڑھا کر اسے روک لیا۔

”کچھلے دروازے سے ہی سے پہنچے ہیں۔ میں نے کہا۔“

”دیکھیں لڑنگ رہا ہے؟“ اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”نہیں۔۔۔ دراصل۔۔۔“ میں کچھ ہلکیا۔

دراصل ایک جھگڑے میں میرا والد لڑھی ہو گیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی طرف کسی کی توجہ مبذول ہو۔“

ایک لمبے کے لئے وہ یوں ساکت کھڑی رہی گویا کسی سوچ میں پڑ گئی ہو۔ ہر اپنے تراشیدہ ہاتھ کو خلیف سا جھکا دے کر بولی۔ ”غیر لکھیک ہے۔۔۔ لڑھی ہاتھ سے میرے گارڈ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“

میں کچھلے دروازے سے باہر آئے۔ گیٹ کچھ کہیں قلاب ہو چکا تھا نیچے آکر سینا سے لٹکنے کے بعد ہم نہ ہاتھ پر چلے گئے۔ چند قدم آئے فٹ ہاتھ کے ساتھ گئی کبھی لکھیں اور سائیکل رکھا کڑے تھے۔ ایک ٹیکسی کی کھڑکی میں ہاتھ اٹھ کر لڑکی نے کونچتے ہوئے ادرائچہ کو بلایا۔ ”اے۔۔۔ ٹیکسی اسٹینڈ چلو۔“ اس نے تھکمانہ لہجے میں کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر پچھلا دروازہ کھول کر خود بیٹھنے کے بعد مجھے بھی اندر کھینچ لیا۔

کچھ دیر بعد اس نے جس عمارت کے سامنے ٹیکسی رکوائی اس کی دروازہ ہم دونوں دیواروں پر کہیں کہیں سیاہ کٹی جی ہوئی تھی۔ سامنے ہی بغیر دروازے کے ایک خاصی کشادہ لابی تھی جس کے ایک طرف سے پکڑدار چیل رینڈ اوپر جا رہا تھا۔ کھٹ کھٹ کرتے کرتے اس دپے سے چڑھ کر ہم پہلی منزل کی راہ داری میں گئے جہاں دونوں طرف کھلیا

"کسی طرح انہیں لال رہے۔" میں نے رقم پر سے نظر ہٹاتے ہوئے کہا۔ اس نے ہاتھ کی ایک تیلی پر ذرا سی پٹی لٹائی اور اسے اکبرائیں میں بھگو کر دواخانہ والد پر بھجک گئی۔ اس نے حتی الامکان احتیاط کے ساتھ رقم کی گہرائیوں میں سے تمام ڈسبے لالے اور میں وائٹ پر وائٹ جمائے کھڑا رہا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ نرسنگ عورت کی فہمیاری خصوصیت ہوتی ہے اور اس کے لئے اسے کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا عملی ملاحظہ میں نے آج دیکھ لیا تھا۔

پیشے کے اربے ٹھلے کے بعد اس نے رقم کو صاف کیا اور اس پر مزید اکبرائیں لگا کر خوب اچھی طرح کس کر کئی پھر دے کر پتی پتھر دی اور ہاتھ دھوئے گئی۔ پٹی کی بندشیں اس قدر سخت تھیں کہ میرے ہاتھ کی پشت پر پٹی لگی رہیں اور کئی تھیں تاہم لب اکبرائیں کی جلن اور رقم کی انصاف کلفتی حد تک ختم ہو گئی تھی اور مجھے کچھ سکون سا ہو گیا تھا۔

دواخانہ کرسی پر بیٹھنے کے بعد میں نے کئی گہری گہری سانسیں لی۔ وہ میری کٹی پٹی پر آج بھی تھی۔ دونوں ہاتھ پیچھے کو ٹکا کر وہ ترجیحی پٹھی گہری گہری تھکوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں طلب تھی یا اس تھی۔ میرے کانوں کی نوکیلی پٹے تھیں۔ دفعہ اس نے اپنی طلب اور پاس پر سو میری کا ہمد فال کر دے آگے کو بھجک کر ہاتھ پھیلاتے ہوئے خالص گہری کہے میں کہا۔ "میرے چنگی ٹال رہا۔"

میں نے سو سو کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف پھسلانے آپ میرے پاس کل چار سو روپے رہ گئے تھے۔ اس نے ایک نوٹ پوری تلاشت کے ساتھ تجھے کے پیچھے رکھا اور دوسرا نوٹ تجھے واپس کرتے گئی۔ میں اس کے کمرے حساب کتاب پر حیران رہ گیا۔ "دیکھ لو تم نے میری پٹی بھی کی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ میں نے انسانیت کے ناطے کی ہے۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "پوشہ اپنی جگہ ہے۔ انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے۔" اس نے نوٹ میری گود میں پھینک دیا اور پھر اٹھ کر مجھ پر آگئی۔ بلاشبہ وہ اپنے پیچھے میں بہت باہر تھی یا پھر شاید میں ہی تو آہستہ تھا۔ کتا تھا اس نے مجھے والد کی تالیف پہلا دی۔

ابھی میں ٹھیک اور گہرا ہٹ کے پھرے سے نکلا ہی تھا کہ باہر ہماری ہونٹوں کا دھک سنائی دی۔ پھر کسی نے زور سے دواخانے پر دھک دی۔ میرے پیچھے میں پڑنا سامنے کا پچیس ایک وقت ساکت ہو گیا۔ لڑکی گہرا کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور حوصلہ تھکوں سے دواخانے کو دیکھنے لگی۔

"تم جلدی سے کہیں چھپ جاؤ۔" اچانک اس نے سرگوشی کی۔ میں ہکا بکا اس کی ہل دیکھنے لگا۔ یہ کہہ کر سر پھپھانے کے لئے مولوں تھا مگر پیچھے کے لئے نہیں۔ لے دے کے

ایک خسرہ تھی مگر اتنی بچی تھی کہ اس کے پیچھے میرا جبر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ سوال بھی میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ اگر اس کا پیشہ کیا تھا تو وہ اس بھاری کی طرح کیوں گہرا گئی تھی جس نے شوہر سے چوری چوری اپنے کسی آشنا کو یاد رکھا ہو۔ لیکن پھر مجھے ظاہر سا اندیشہ یہ محسوس ہوا کہ شاید دواخانے پر پولیس ہو۔ راستے میں چپکنے والی میرے ٹون کی بوندوں نے لن کی یہاں تک رہائی کر دی ہو۔ یا شاید جیسی ڈرائیور نے کسی گفت کرتے والے پائی کو میرے حلق میں ڈال دیا ہو۔ کیونکہ جیسی سے اترتے وقت میری تمام تر احتیاط کے باوجود اس کی نظر میری غول میں پھنکی ہوئی آستین پر پڑ گئی تھی اور اس نے ٹک آؤ کی تھکوں سے مجھے گھورا تھا۔ یہی اندیشہ تھے جنہوں نے مجھے ہڑبوا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

"طہاری میں چھپ جاؤ۔" لڑکی نے سرگوشی کی۔ "میں میں کافی جگہ ہے۔" میں طہاری کی طرف پکا اور دواخانہ کھول کر اندر کھس گیا۔ لڑکوں پر ہلکے ہوئے اور اسی باروں کی خوشبو میں رہے ہوئے بہت سے کپڑے میرے چہرے سے ٹکرائے۔ انسانی کے فرش پر لوہی ہیل والی جوتیوں کے کئی جوتے رکھے تھے۔ لن پر پاؤں پڑنے سے میں لڑکھڑا ہی گیا۔ ہر حال سنہل کر میں نے کپڑے ادھر ادھر ہٹائے اور طہاری کی پگھلی دیوار سے پشت ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے جھپٹ کر دواخانہ بند کر دیا اور تار کی لے مجھے الٹا پتہ میں لے لیا۔

"دواخانہ کھولو شوہر!" باہر سے ایک گوجیل کواڑ سنائی دی اور اس مرتبہ دواخانہ بالکل دھڑلایا گیا۔ چند لمبے بعد میں نے دواخانہ کھلنے کی آواز سنی پھر قدموں کی دھک سے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ہینسا کمرے میں کھس آیا ہو۔

"تم کچ بہت جلدی آگئے سرہر!" میں نے شہما کی پٹھی پٹھی سی کواڑ سن لی آپ مجھے لپٹ کر کپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ اتنے موٹے طے کرنے کے بعد بھی میں نے لڑکی کا نام نہیں پوچھا تھا اور وہ مجھے آپ معلوم ہوا تھا۔ اس کی قالہا "یہ وجہ تھی کہ اس نے بھی میرا نام نہیں پوچھا تھا۔"

"پتی دی لال تم نے دواخانہ کھولے میں؟" میں نے سرہر کی ہماری آواز سنی۔ "تازہ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گراؤٹیں کوئی ہو گا۔ مجھے حیرت تھی کہ شہما اس سے یہ کہنا نہیں کہ رہی تھی اس وقت میرے پاس کوئی موجود ہے۔ تم چلے جاؤ پھر کسی وقت آؤ۔ لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ میرا جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ شہما نے اس سے بلا سوال ہی کیا تھا۔" تم کچ بہت جلدی آگئے سرہر۔"

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ دراصل وہ مجھے اونگھ آئی تھی۔" میں نے شہما کی کواڑ سن لی۔ "اور اونگھ ہی اونگھ میں تمہاری ساری لب انٹک خراب ہو گئی۔" سرہر کی کواڑ میں طرکی کاٹ تھی۔ ایک لمبے کے ٹولف سے اس کی کواڑ دواخانہ کو گئی۔ "اور یہ تم نے

کتاب پر تکتے و تکتے سے قیمت و عنوان کو بڑھانے

”مگر تمہیں اپنے خلود کا اتنا ہی ڈر تھا تو مجھے یہاں لائی کیوں تھیں؟“ میں نے قدمے پھیلے لمبے میں کہا۔

”یہ میرا خلود نہیں بھائی ہے۔“ وہ چلائی پھر قدمے نیچی آواز میں بولیں۔ اور جب میں اسے شرب نہیں لیتی اس کی غیرت جاگ اٹھتی ہے۔ بہر حال یہ جیسا بھی ہے لیکن میں برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی یوں ہے وہی سے اسے مارے۔ جانتے دیکھ ہو بیوقوف۔ کم کر لو شکل میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہے۔

میں نے اس کی آواز غصہ بند ہونے کا انتظار نہیں کیا اور تیزی سے باہر آگیا۔ اٹھوس پندس کے دھڑاے کھانے گئے تھے بیڑیوں کے قہب ایک ٹوہلوں نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ سینے پر ہاتھ مار کر میں نے اسے ایک طرف دھکیلا اور چوڑی سے بیڑیاں اتر گیا۔

ایک بار پھر میں ایک مسافر بے اماں تھا اور کئی کونوں کی خاک چھان رہا تھا۔ کل رات تک میرے سر پر ایک بے کسانکل گھر کی پھٹ تھی مجھے کھینک دلوں کی چھلکوں میں سر تھی اور کوچ کہیں سایہ دربار میں بھی مجھے پتا نہیں مل رہی تھی۔

میرے دل کو دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ جیسے کوئی ٹھہرہ ہاتھ میرے تعاقب میں ہے۔ گھبراہٹ میں تھیں اور وقت نامہ میں۔ لمبے پہاڑ تھے اور دل ٹوٹاؤں، تقدیر نے اچانک ہی پٹا کھانا تھا کہیں تو عملی زندگی کی کسی جگہ سے واسطہ ہی نہیں پڑا تھا اور کہاں زمین و آسمان نے ایک دم ہی بے مری کے تمام ہتھیار آزمائش شروع کر دیئے تھے۔

ہال میں ایک بار پھر جس جس ہونے لگی تھی۔ ایک الیکٹریک چل کے قریب رک کر میں نے ہاتھ کا جائزہ لیا کسی ہوئی ہنی پر کھیلانی کی علامت کے درمیان خون کی سرخی نمودار ہونے لگی تھی۔ خون دھیرے دھیرے رس رہا تھا۔ مجھ پر اب حشک اور ٹھہرے کا ظہر تھا۔ اوصاف اب کرام مانگ رہے تھے جسم کو پتہ کی طلب تھی۔ رات اب گہری ہو چلی تھی تاہم کچھ گلیوں اور بازاروں میں اب بھی روشنی تھی اور میں ان سے بچتا بچتا سڑکوں اور نیم مارکیٹ گلیوں میں چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک بار میں نے سوچا کہ کسی طرح پناہ واپس چلا جاؤں۔ کم از کم کم کوچ کی رات تو

لوگوں والے ہالوں کب سے پہنچے شروع کر دیئے۔

”ہالوں۔“ شربا کی کھنکھن سی آواز ابھری۔

”اے۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ میں نے پھر لڑکے کو بلایا تھا۔ شاید وہ بھول گیا ہے۔“ پاپ لیک کر رہا تھا۔ اس لئے میں نے لڑکے کو بلایا تھا۔

”پانی کے پائپ سے فالہا“ خون لپک ہونے لگا تھا جو پلہری اسٹین لورڈ واش میں پھیل گیا۔ ہے؟“ سرور کا لہجہ زہر میں بچا ہوا تھا۔ ”میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ جلدی مجھے کوئی کام مل جائے گا تم اپنی یہ حرکتیں بند کرنا۔“

”ایک سال تو ہو گیا ہے مجھے یہ سنتے ہوئے کہ جلد ہی کام مل جائے گا۔ جلد ہی کام مل جائے گا۔“ میں نے شربا کو پھٹ پڑنے والے انداز میں کہتے سنا۔ ”مجھ سے نہیں برداشت ہوتے تھے اور نہ میں روز روز مالک مکان سے بے عزتی کر سکتی ہوں۔“

”پتھر“ میں نے زور دار طعنے کی آواز سنی۔ شربا کے گرنے اور پھر ہونے ہوئے سکھیں لینے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی سرور گرچہ ”کہاں ہے وہ مرود؟ پھر وہ خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ ”لٹاری میں ہو گا اور کہاں ہو سکتا ہے۔“

میں نے ہماری قدموں کی دھمک لٹاری کی طرف پڑتے ہوئے محسوس کی۔ یہ اندازہ تو مجھے پہلے ہی ہو چکا تھا کہ سرور کوئی ہماری تن و قوت کا شخص ہے میں نے اپنے چہرے کے سامنے سے کپڑے ہٹائے۔ ہاتھ سیدھا کیا اور سمجھل کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ کھلتے ہی میں نے ایک مرد ضائع کے لپٹے دروازہ کو لے والے کی کینٹی پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ چچا مار کر لٹ پڑا اور فرش پر جا گرا میں نے دیکھا وہ ایک قد قد توہین تھا اس کے ہاتھ میں ایک پھولا سا مگر ہماری ڈوڑا تھا اور وہ فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا میں نے اس کی کینٹی پر ٹھوکر رسید کی اور وہ چنگی سی لے کر اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ مدتی ہوئی شربا اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر چوڑی سے اس کی طرف جھپٹی اور فرش پر بیٹھ کر اسے جھنڈے لے گی۔ ”سرور۔۔۔“ پھر وہ میری طرف مڑ کر غضب مانگ لیے میں بولی۔ ”مٹھ ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔“ ورنہ میں انہی چچ چچ کر لوگوں کو جمع کر لوں گی۔“

میرے خیال میں لوگوں کو جمع کرنے کے لئے چچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی آواز پہلے ہی ہمت بندھ گئی اور سرور بھی طوب غل کا چکا تھا۔ اٹھوس پندس میں کچھ لپٹل کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔

میرا مگر محفوظ تھا لیکن معلوم نہیں تھا اس وقت کوئی ٹرین اس طرف جاتی تھی یا نہیں اور
پھر مجھے اسٹیشن بھی بے گھم جگہ پر جانے کے تصور سے بھی طرب آ رہا تھا۔
چلتے چلتے مجھے بہت دیر ہو چکی تھی اور میں نہ جاننے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا اب میں
ایک ایسے علاقے میں پہنچ چکا تھا جہاں مکمل طور پر ویرانی تھی۔ خالی عمارتیں تھیں۔
کچھ آگے چل کر مجھے سڑک کے بائیں ہاتھ ایک میڈیٹن سا ٹکڑا لیا۔ اس میدان میں کئی
حوالہ عین عمارتیں دیر تعمیر تھیں۔ میں سڑک چھوڑ کر ان عمارتوں کے درمیان چلتے لگا۔
ایک عمارت تقریباً مکمل ہی تھی۔ ایک میں ٹکڑی کا کام ہوا تھا۔ دوسرا دلہا پر چڑھیں بھی
گئی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں بہت بھی ٹکڑے تھے۔ باہر بھی زمین پر وہ عین الے بھی گئے
ہوئے تھے جن پر بدھن کام کرتے ہیں اور ان کے ارد گرد ٹکڑی کا بہت سا پرانہ اور چھل
ہوئی کھیریں وغیرہ پھری ہوئی تھیں۔

میں نے ایک بے ہت کے دروازے سے اندر بھاگ کر نکلتا۔ سنا اور تادی میں نے
احتیاط سے اندر قدم رکھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتا۔ کچھ فاصلے پر ایک اور دروازے کا
دھندلا سا غلا نظر آیا تھا۔ اس سے گزر کر میں ایک کشادہ حصے میں پہنچ گیا جہاں چھت
تھیں تھیں اور اندر میرا کچھ کم گھرا تھا۔ اچانک میں اچھل پڑا۔ کسی نے میرے قہقہے ہی جہاں
کی تلی ہلکی۔ اس کی سربراہت مجھے ہم کے دروازے کے زیادہ بلند محسوس ہوئی تھی۔
"کون ہے؟" تلی کا شعلہ میرے چہرے کے قہقہے آگیا۔ لڑائی زدہ روشنی میں
میں نے اپنے طالب کو بھی دیکھ لیا۔ وہ مجھے ہونے جسم کا ایک میاں قدر کوئی تھا۔ اس کے
سیاہ چہرے پر چٹائی سی چمک رہی تھی۔ اس کے ہاتھیں ہاتھ میں ایک بندوق تھی۔
"تم چکیدار ہو؟" میں نے سنبھل کر پوچھا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی خیال اٹھا
تھا کہ اسے ہاتھ دس روپے دے کر رنج کی رات کے لئے اس ادارے میں کہیں پڑے رہنے
کی اجازت لینے کی کوشش کروں گا۔

”مجھ کو یاد ہے اس نے دہرایا اور لار سے ہنس اس کے چپے چپے دانت ایک لمحے کے لئے چمکے اور پھر تلی بجھ گئی۔ اس لمحے میرے دل میں آئی کہ اسے چھٹ فی کروڑوں کا کم الاکم اس کی تعلیق تو ایک ہی لہلہا پھر سوچا کہ اگر وہ میرے لئے الجھن کا ہاسٹ نہ بنے تو بوجھ بنگے کی کیا ضرورت ہے۔“

اس نے بڑی بھرتی سے دوسری تیلی چلائی اور بتدریج دواؤں سنبل لی۔ جیسے سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا۔" اس نے لہجہ ترا سا سر ہٹا دیا۔ "پتہ کی تلاش میں ہوں۔ میرے ساتھ آجائو۔" اس کی آواز کھوری لیکن لہجہ دوستانہ تھا۔ اس کا رخ میٹروں کی طرف تھا۔

"آجائو۔ آجائو۔" اس نے مزکر میری طرف دیکھ کر۔ "ہم بھی تمہارے ہی بھائی ہیں۔" میں اس کے پیچھے چل دیا۔ میٹروں پر آئے اور بے پٹ کے

ایک دھوا لے سے گزر کر میں نے اپنے آپ کو ایک ہل میں پایا۔ یہاں کا منظر دیکھ کر میں
 لہلہکتا دیوار کے ساتھ دو میلے کچیلے گدے بچے ہوئے تھے اور ان پر چائے افروغ موجد
 تھے۔ کوئی نیم دراز تھا کوئی آرا ترچھا بیٹا تھا۔ ان میں سے دو سگریٹ پی رہے تھے اور ہل
 میں چرس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

ایک طرف وہ لاشیں پر لاشیں رکھی تھیں۔ گولوں سے کچھ دور رہے کی ایک اچھیلی
رکھی تھی جس میں کھٹے دھبے تھے۔ اچھیلی پر ایک دھبھی دھری تھی جس سے بھاپ
اٹھ رہی تھی۔ ان پانچوں میں ایک قدرے جٹ کر بیٹھا تھا۔ اس نے سہانے رکھی ایک
تھوڑی سی پرکھی تھی۔ جماعت کے اعتبار سے وہ پورا دیو کا دیو تھا۔ اس کے سر
کے بھال ہچکاڑ پل اور والا سی موٹھیں انہیں میں یوں دھلم تھیں کہ چہرے کی جلو بہت کم
نظر آ رہی تھی۔ لاشیں کی دھم روشتی میں اس کی سرخ انگارہ سی آنکھیں چمک رہی تھیں۔
اس کے ہاتھ کے قہبے ہی ایک ایسی سی تل کا دیو اور گولوں کی جی پی تھی۔

”ایک صہان آلا ہے سوارا“ مجھے ساتھ لانے والے نے دبو کو طالب کیا۔ اس کی باتیں نہ جانتے کیوں کھلی چاری تھیں۔

”آجائے آجائے آپ آگے آجائے۔“ دریا کھل رہا تھا۔ ”وہو زلزلے مجھے اشارہ کیا۔ نہ جانے کھلے اسے خوش خوش ہوئی تھی کہ میں دریا بہا تھا۔“

میں لورا قریب چلا گیا جنہیں اگلی شیں پر دیکھی میں کچھ اہل رہا تھا۔ جس کی بڑے
درمیان ہی جائے کی صبح میرے ہاتھوں سے گر گئی۔

”بیٹہ جاؤ۔“ دلی زادے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ ”میں وہیں بیٹھ گیا جہاں کھڑا تھا۔ وہ سب عجیب
کی نظروں سے مجھے سر نہا کر دیکھ رہے تھے۔ شاید نظروں کی نظروں میں قتل رہے تھے۔ میں
ان کے ہاتھ لے رہا تھا۔ وہ سب کھلی کھلی شلوار قمیضوں میں لباس تھے۔ دلی زادے کے
جسم پر موٹی سی واسٹ بھی تھی۔ ان میں سے ایک دھڑلہ دھڑلہ طور پر دھڑکتا تھا۔ اس کی
دھڑکن کے قریب ایک موٹا سا مٹا ہوا ایک ٹاکہ مگر چوڑا چمکا اور مضبوط کوئی تھا۔ تیسرا بھی
دھڑکتا تھا۔ میں تقریباً لگا ہی تھا مگر اس کے چہرے پر ہلکے سے گہرے دلچسپ چہرے کی
موجیں بھری اور رنگت گہری تھی۔ اگر وہ کچھ صاف ستھرا ہوتا اور اس کا لباس فریج کا
ہوتا تو کسی محترمہ گھرا لے گا تو لگتا کہ لکڑی کی کھل لکڑی سے ملتا ہے۔ مگر جسم تل کی
طرح مضبوط نظر آتا تھا۔ مجھے اوپر لانے والے آدمی کو ملا کر وہ چھ آدمی تھے اور ان میں
سے کوئی بھی کم خطرناک نہیں لگتا تھا۔ ان کی نظریں میرے جسم میں چبھ رہی تھیں۔

مگر سے بھاگ کر کیا ہے کیا؟ یہ تو بچنے کے لئے دوڑنے پر مجبور اور پھل میں گھرے ہوئے اس کے موٹے موٹے ہونٹ کھیل گئے۔ شاید وہ منکرا ہوا تھا۔ میں نے نقل میں سر

[illegible]

"کسی سے بھڑا کر کے آیا ہے؟" اس نے کھدڑی آواز میں پوچھا۔ میں نے اس پر بھی لگی میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر یہ باند کسی شیر کے منہ میں دے دیا تھا کیا؟" اس نے میرے باند کی طرف اشارہ کیا جس کی پٹی اس خون میں پوری طرح بھیگ چکی تھی۔ میں نے ایک بار پھر لگی میں سر ہلا دیا تو وہ ہنسنے لگا۔

"منہ میں لہان نہیں ہے کیا ہو یہ دھڑی بھر کا سر ہلاتے جا رہا ہے؟" میں نے کھٹار کر گلا صاف کیا۔ منہ میں گھر سے بھاگ کر پہنچنے آئے ہوں نہ میرا کسی سے بھڑا ہوا ہے۔" میں نے ملامت سے کہا۔ "میں کسی کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں اور یہ والد۔۔۔ یہ ایک دشمن پر کام کرتے ہوئے دشمن ہو گیا تھا۔"

"اپنے پہلے جھوٹ بولنے کا دھنگ تو سیکھ لے پھر استادوں کے سامنے رہن چلائیے۔" دیو داد نے سیدھا ہو کر بیٹھے ہوئے کہا۔ اس کے سامنے میں نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا پھر ان میں سے ہنسنے لگا۔ "تو کچھ کہیں وہ آدمی ہم میں تو نہیں جس کی جگہ کھوج ہے؟" اس نے اپنا کمرہ چوکے کر دیا۔

ہاتھوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میں خاموش رہا۔ ان کی اسے بے جگہ ناگوار مگر دہی تھی۔ انہوں نے ایک بار پھر ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا اور گردن میں سیدھی کر لیں۔ ان کا قہقہہ دیرین عمارت میں اس طرح گونجتا تھا جیسے کسی گھنڈر میں ہینکڑوں بدھ میں چلا اٹھی ہوں۔ دیو داد نے اب اپنا رخ اور اٹھا لیا تھا اور اسے کھولنے کی طرح بار بار ہاتھ میں اچھال رہا تھا۔

لومڑی کی شکل والے نے ایک چلے کپڑے سے دیکھی بکڑ کر ایشیوں سے اتاری اور قریب رکھی انگوٹھی پیال میں چائے اٹھائی۔ "چائے پیئے گا؟" اس نے دیکھی دائیں ایشیوں پر رکھ کر مجھ سے پوچھا اور تب مجھے اچانک احساس ہوا کہ صحت دیو سے میرے صدمے میں جو کیسی اٹھ رہی تھی وہ دراصل بھوک کی تھی۔ میں نے صبح بستر کیا تھا اور اس کے بعد سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ مجھے چائے کی منک اتنی اچھی لگ رہی تھی۔ بھوک کے احساس سے یک لخت مجھ پر فضاہت سی طاری ہو گئی۔ تھوک گل کر میں نے چائے کی پیالی کی طرف دیکھا اور اٹھت میں سر ہلا دیا۔

"قیمت ادا کرنی پڑے گی۔" لومڑی کی شکل والے نے کہا۔ "میرے پاس تھوڑے سے پیسے ہیں۔" میں نے کہا "کیا قیمت لوگے؟"

"تم جیسے نئی عمر کے چھوٹوں سے ہم قیمت پیسوں میں نہیں لیتے۔" ہنسنے لگا۔ چہرے والے نے کہا اور ایک بار پھر انہوں نے قہقہہ لگایا اور تب میں نے صوفیوں کیا کہ اتنی بھوک نظر آ رہی تھی کہ میں چائے کی پیالی کو نہیں دیکھ رہا تھا جتنی بھوک نظروں سے وہ مجھے گھور

رہے تھے۔ پہلی بار طوف کی ایک لہریں کی لہریں جسم میں دوڑ گئی۔ اب میں نے ایک نئے راتوں نگار سے ان کا جائزہ لیا۔ لومڑی کی سی شکل والا میرے سب سے قریب تھا اور اس کا سوار مجھ سے سب سے زیادہ لاسٹے پر تھا اور اس کے ہاتھ میں رخ اور تھا اور یہی ایک چیز میرے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ خصوصاً اچھے وقت میں جب کہ میرے دشمن ہاتھ بھوک، شکن اور اصرار توڑ پھوڑ نے میری کوشش سے زیادہ جان کھینچ رکھی تھی۔

"مہربان کیوں ہو گیا؟ لے چل پل لے۔" لومڑی کی سی شکل والے نے چائے کی پیالی اٹھا کر میری طرف بڑھائی۔

"مہربان۔۔۔ مجھے نہیں چاہیے۔" میں نے کہا۔ "توڑ گیا بے چارہ۔" ہنسنے لگا۔ "توڑ گیا اور چہرے والے نے کہا۔

"بے زیادہ غم نہ رکھنا۔ چل۔" لومڑی نما آدمی نے سخت لہجے میں کہا اور پیالی دوبارہ میری طرف بڑھائی۔ میں نے پیالی لے لی۔ ایک چٹکی لینے سے میرے تنگ ہوئے کچھ غم ہوئے اور میرا پیچھا کر ایک ہی سانس میں یہ لپٹا ہوا سیال صدمے میں اتر پڑا۔ اس کا جسم میں کچھ تو زندگی کی حرارت تھی۔ بھٹکنا میں نے اپنے آپ کو اس خواہش کی عقل سے باز رکھا۔ یہ گرم سیال اس وقت میرے لئے بہت اہم تھا۔

چٹکی لے کر میں نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ سب ساکت بیٹھے میری ہی طرف دیکھ رہے تھے گویا میں کوئی دلچسپ شاعری کر رہا تھا۔

پیالی عقل پر سنبھل کر میں نے دوبارہ چٹکی لینے کے لئے سر ہٹایا لیکن اس بار میں نے چٹکی لینے کے بجائے پیالی سوار کے منہ پر کھینچ ماری۔

جی لامتناہی بھڑی سے اٹھتے ہوئے میں نے ایشیوں کو گھور کر رسید کی۔ انہوں نے کھڑے اور دیکھی کے اٹھنے کا مہر میں نے نہیں دیکھا اور دواؤں کی طرف چھٹا ہنگ لگا دی۔ وحشیانہ چیخیں اور دیو زلوی دواؤں میں نے اپنے عقب میں سنی لیکن میں دواؤں پار کر چکا تھا۔

اندھیرے میں تیزی سے میزبانیوں عہد کرنا خطرناک کام تھا۔ تاہم میں نے جگہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ میں آخری میز پر تھا جب میرے عقب میں میزبانیوں پر وحز وحز کی آوازیں آنا شروع ہوئیں اور پھر ایک آواز ہوا۔ دھماکہ گو میرے کان کے قریب ہی ہوا تھا تاہم گولی سے میں بچ گیا تھا میں تیزی سے اس راستے کی طرف بھاگا جس سے اس دھم خراب میں داخل ہوا تھا۔

"بھائیوں گا نہیں ملے گا۔" میں نے اب کافی لاسٹے پر دیو زاد کی گونج سنی۔ دواؤں سے نکل کر میں تاک کی سیدھ میں بھاگا چلا گیا۔ پیچھے مکی لیکن پر ان کے قدموں

آگئیں اور میری دھڑکیں تیز تر ہوتی گئیں۔ اس وقت میں نے اپنے چہرے میں غصہ سانس کو دھیرے دھیرے آزاد کیا۔ جب دھب دھب کی یہ گواہیں میں ہول کی دھمکی پر گہرے کے بعد آگے بڑھتی چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد یہ گواہیں معدوم ہو گئیں لیکن میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ میری تلاش میں ناکام ہونے کے بعد قاتل "و" اسی راستے سے واپس آئیں گے۔ اس وقت تک کے لئے میرا اس کہیں گہ کو چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پھر سانس روکی اور انتظار کرتے لگا۔

میں اس لئے مجھے ایک تکلیف "و" احساس ہوا۔ میرے دماغی والد پر بددعا ہوئی تھی میں لب خون کو مزہ جذب کرنے کی گنجائش نہیں تھی اور خون کی بدبو میں لب غلیظ پانی میں تھک رہی تھیں۔

"خدا کیا۔ کیا اس رقم کے راستے میں میرے جسم کا تمام طرہ بہ جانے کا کام میں نے دوستی دل سے سوچا۔ گو کہ مجھے خون کے چھپنے کا صرف احساس تھا اور میں اسے دیکھ نہیں پا رہا تھا پھر بھی میں نے اپنی آنکھیں کھلیں گویا اس طرح یہ تکلیف "و" احساس گھٹ جائے گا۔

کچھ دیر بعد میں نے جیس جیس کی ایک بھرہ سی گواہ سن کر آنکھیں کھولیں۔ میرے جہول کے قریب ہی وہ گول گول لفظ سے چمک رہے تھے۔ جیس جیس کی کچھ گواہ وہاں میں ہول میں گونجی اور تب مجھے احساس ہوا کہ "و" ایک چھپا ہوا اور قاتل "و" خون کی بدبو کر کہیں سے آن پہنچا تھا۔ ظاہر میں مجھے سب سے زیادہ کراہت چھپے سے آتی تھی اور پھر غلیظ گنز کا چھپ۔ میرا دل حائل تھا اس سے پہلے کہ میں اسے ٹھوکر رسید کرنا "و" میری جہول پر چڑھ گیا۔ میں نے ٹانگ کو جھکا دیا مگر وہ میری طرح چمٹ چکا تھا۔ میری ٹانگ سانس ہونے ہی نہ کچھ اور اب چڑھ آیا۔ مجھے اپنی ٹانگ پر اس کا بالکل وہاں محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی جسامت میری سے شاید کچھ ہی کم تھی۔

میں اسے ہاتھ لگنے کا قصد بھی نہیں کر سکا تھا لیکن اس وقت نہ جانے کس طرح میں نے دماغی والد والے ہاتھ سے اسے ہٹا بیٹھنے کی کوشش کی تلاطم میں تھری ہوئی لہجی اور بالکل بھری کھال کے لمس سے میرے دھڑکنے کڑے ہو گئے۔ چھپا ٹانگ پر سے تو ہٹ گیا لیکن پتا نہیں لیٹے ہوئے والد سے ہٹ گیا۔ میں نے دماغی والد کو دیوار وار جھٹکے دینگے اور ہر جھٹکے پر میرے حلق سے جھج جھج لگنے "و" گئی لیکن چھپا گویا جھول کے ساتھ ہی لپٹ گیا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے سلاخ پکڑ رکھی تھی۔ اسے چھوڑنے پر میں سیدھا چلے گئے تھیں کے دھارے میں گر چاک۔

ایک لمحہ اس شخص کو میں میرا دم گھٹنے لگا اور آنکھیں کھول کر دیکھنے لگیں۔ میرا سر ہی طرح گھوم رہا تھا۔ میں نے میں ہول کی محسوس ہوا میں ہے در ہے لبی لبی

کی دھب دھب ستائی دے رہی تھی۔ دوسری ذریعہ غیر عمارت کے گرد پھر لگنے کے بعد میں ایک گھٹ کھلے میدان میں پہنچ گیا۔ جہاں لہجی روشنی تھی۔ میدان میں بھاگنے کی صورت میں مجھے بڑی آسانی سے گول داری حاصل تھی۔ چنانچہ میں بائیں طرف مڑ گیا اور عمارت کی چھٹی دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ قدموں کی گواہیں میرے تعاقب میں تھیں۔ تاہم وہ رونے اور سڑاؤ نہیں کیا تھا۔ میں اپنی تمام تر فکر حال کے باوجود حتی الامکان تیزی سے بھاگ رہا تھا۔

والد "و" کئی زمین فٹ ہو چکی اور میں سڑک پر آ پہنچا سڑک تیزی سے عبور کر کے میں ایک گلی میں گھر گیا۔ گلی کافی طویل تھی اور اس میں روشنی بھی تھی۔ قدموں کی گواہیں گو کہ کال پیچھے رہ گئی تھیں لیکن وہ لوگ میرا پیچھا چھوڑنے پر تیار نظر نہیں آتے تھے۔ وائیں بائیں مجھے کوئی جہانے پتا نظر نہیں آ رہی تھی اور اگر میرے گلی عبور کرنے سے پہلے وہ کچھ موڑ پر پہنچے تو آسانی سے میرا نشانہ لے سکتے تھے۔

بھاگتے بھاگتے اچانک میری نظر الیکٹرک پل کے صحن قریب پتھری سڑک کے وسط میں موجود بین ہول کے ڈسکن پر پڑی۔ ڈسک کھول اور گرد سے اٹا ہوا آہنی ڈسکن سڑک کے چپے پر پڑنے کی طرح چمک رہا تھا میں نے جھک کر ڈسکن کے کپ میں انگلیاں پھنسا لیں اور اسے لہر کو کھینچا ہو کھالوں پر تکی ہوئی مٹی میں خاصی مٹی سے چسپ تھا لیکن میرے چھوڑا نہ گئے پر ہر حال کھل آیا۔

میں نے میں ہول میں بھاگ کر دیکھا میری توقع کے مطابق ایک کونے میں لوہے سے لے کر پیچے تک لپٹے کی سلاخیں بچست تھیں جو بیڑیوں کا کام دیتی تھیں۔ میں نے ڈسکن ایک طرف کھسکا کر دیکھا اور اندر تک کر ان سلاخوں پر چڑھ کر دیکھا لیکن اتر گیا۔ سر بھی سا زمین کے چپے آہلنے کے بعد میں نے ایک ہاتھ سے ڈسکن کھسکا کر دیوار میں ہول کے چلنے پر رکھا لیا اس عمل میں مجھے بہت کم وقت لگا تھا لیکن اگر اس دوران وہ لوگ گلی کے موڑ پر پہنچ چکے تھے اور انہوں نے مجھے میں ہول میں اترتے دیکھ لیا تھا تو پھر بھی غلیظ کتوں میری قبر بننے والا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں کچھ اور بیڑیاں لپٹے اتر گیا کھل کھل ہوتا شخص پانی لب میرے پیوں سے قاتل "و" چھپ لہجی ہی چھپے "و" گیا تھا۔ سلیپ "و" محسوس اور سڑک سے سانس لیتی "و" بھر رہی تھی۔ چنانچہ میں نے سانس روک لی تھی۔

یوگا کی مشقوں سے استفادہ کرنے کا یہ بہترین موقع تھا ایک بار میرا ہاتھ میں ہول کی دیوار سے مس ہو گیا۔ میری انگلیوں نے ایک ایسی کھلی کالس محسوس کیا جس کے قصور ہی سے مجھے اٹنی سی آواز تھی اگر میں نے سانس نہ روکی ہوئی تو جہاں طور پر تے نہا لے۔

میں ایک ہاتھ سے سلاخ تھامے اور نیچے ایک سلاخ پر دونوں پاؤں جھلنے ساکت کڑا تھا۔ چھپ بیٹھ بعد میں نے قدموں کی دھب دھب سنی۔ یہ گواہیں تیزی سے قریب

سانس لی تھیں۔ پھر چہرے کے دانت سونہ کی طرح میرے دغی ہاتھ میں اترے چلے گئے۔ اب میں اپنی چیخ کو نہ روک سکتا۔ مظلوم نہیں میری کوڑا ہار تک مٹی تھی یا اسی چالہ بڑا ب میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ ہر حال اب مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ چہرے کے دانت مٹھین کی سی تیزی سے میرے دغی ہاتھ کو چھو رہے تھے مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں مزید ایک لمحہ بھی میں ہول میں رہا تو سب ہوش ہو کر گر پڑیں گے۔

میں اندھا دھند سیڑھیاں چڑھنے لگا میرے طوفان کے پائے گل میں دھنکے آئے تھے یا نہیں مجھے اب اس کی بھی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرے ہوش و حواس قتل ہو چکے تھے۔ میرا سر میں ہول کے دھنکے سے گھرایا اور میں نے مزید ایک میڑھی چڑھ کر سر میں سے اسے اوپر کو اٹھ دیا اور اس سانپ کی طرح تیزی سے باہر نکل گیا جس کے دل میں آگ بھرمی ہو۔ تازہ ہوا میرے نکلنے سے گھرنی لگیں میرے حواس کو سنبھالنا نہ دے سکی۔ میں پاگلوں کی طرح گل میں لوہر لوہر بھاگنے لگا۔ نہ جانے کتنی دیر میں یونسی پکراتا رہا۔ پھر مجھے ایک دیوار نظر آئی اور میں نے اپنے ہاتھ کو اس پر دے مارا۔ ایک بار دیوار میں بار ہر ضرب پر چھ دیوار کے ساتھ کھلا گیا۔ آخر کار اس کے دانت میرے گوشت کی تھوں سے نکل آئے اور وہ چلنے سے لپٹنے پر آگرا اور ساکت ہو گیا لیکن اس کی لمبی سی کمرہ دم اب بھی تنگ لے رہی تھی۔

دھندلی ہول نظروں سے میں نے دیکھا چہا واقعی جہالت میں کسی اوسط درجے کی بلی سے کم نہیں تھا اور وہ پورا کا پورا سیاہ تھا صرف اس کی منہ تھنی کا بچہ حصہ سرخی مائل بھورا تھا۔

میرا دغی ہاتھ اب ہے جان انداز میں میرے پیلو میں بھول رہا تھا۔ لیکن مجھے بلی محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے کال کر میرے جسم سے ٹکھڑا کر لیا گیا ہے۔ میں چہرے کے دانت کے سارے سلجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر چہرہ را کر گرا اور لامتناہی اندھیرے لے مجھے آخر میں لے لیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو سب سے پہلا احساس مجھے یہی ہوا کہ مجھے قبر میں اتارا جا چکا ہے۔ وہ جگہ اتنی ہی تنگ اور سبک زدہ تھی۔ پھر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ میں ایک جھٹکا سی چار پائی پر لیٹا ہوا تھا اور میری آنکھوں کے عین اور چست میں ایک چھوٹا سا بلب نصب تھا۔ جس کی روشنی مدھن یوں تو نہ ہونے کے برابر تھی لیکن اس وقت میری آنکھوں میں چھ رہی تھی۔ قبر میں چاہائی اور بلب نہیں ہو سکتا تھا۔ تو پھر میں کہاں تھا؟ میں نے سوچا اور اسی دھندل میں کھسک پھری آواز سننے۔ دوسری گرجن موڑ کر میں نے آواز کی سمت بھاگنا شروع کیا۔ سفید بلبلان اور چار خٹے کی دھول چلتے ایک دھلا اور ساٹھلا سا لہولہا گھبراہٹ سے سینچے کے ساتھ انہوں کے فرش پر بھاگتا دے رہا تھا اور بڑی محنت سے

انہوں کی درمیانی سڑکوں سے بھی مٹی لال رہا تھا۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ بھاگتا رہ کر میری طرف لپکا اور قریب آ کر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بٹکتے ہوئے بولا۔ "نیکیں شہزادے اب کیسی طبیعت ہے؟"

"میں کبھی ہوں؟" میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ "عاشق علی عرف طبلہ کے گھر میں۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھ اور مجھے ہونے کہا۔

"طبلہ؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "میرا قلمی نام ہے؟" اس نے اختلال سلامتی سے جواب دیا۔ اس کے ہاتھ ہونے پر اتنی غصہ موم نہیں تھیں کہ پیل نظر میں نمایاں گزرا تھا کہ شاید وہ کھپاں بیٹھی ہیں۔

"تو تم قلمی ہیو؟" میرے منہ سے اچانک نکلا۔ درحقیقت میں پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ غصہ میں کام کرتا ہے۔ "میں؟" اس نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں لٹکا طویل لقمہ لگا کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ لقمہ نہیں شاید اپنے حال پر خودی دے دیتے والے کسی انسان کی طویل چیخ تھی۔

"میں کھولوں میں رہتے ہیں کیا؟" اس کے سینے کی گھرنی سے دغی سی آواز نکل۔ "تو جو جو؟" نام اور باند پر رہتے ہیں۔ میں تو ایکسٹرا ہوں ایکسٹرا دنیا میں بھی ایکسٹرا اور لکھوں میں بھی ایکسٹرا۔ یعنی اگر میں نہ بھی ہوتا تب بھی دونوں کا کام چلتا رہتا۔ کبھی کبھار کسی قسم میں کام مل جاتا ہے تو میں دھوپ دھائی ل جاتی ہے۔ جب میں نے تمہیں گل میں بے ہوش پڑے دیکھا تو اپنی دم دی کی طوٹ سے مجبور ہو کر تقریباً گھسیٹا ہوا اپنی کھول میں لے گیا۔ حالانکہ یہ بھی ایسا گھر ہے کہ اگر راستے میں کسی کو لاش بھی پڑی نظر آجائے تو وہ اسے پھلانگ کر اور ڈالا تیزی سے گھرنی طرف چل رہا ہے۔

"میرے قریب ہی فرش پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔" لیکن یہ جو اپنا دل ہے نا سالار!" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہ موم کا بنا ہوا ہے۔ میں جب تم کو یہاں لایا تو تمہارے ہاتھ سے اتنا خون بہہ رہا تھا جتنا سرکاری گل سے پانی بھی نہیں آتا۔ میں دوڑا دوڑا ڈاکٹر جگا کے گھر گیا۔ اب تم شاید اس نام پر بھی حیران ہو گئے۔ نام تو اصل میں اس کا ڈاکٹر ایڈور تھا۔ لیکن وہ دلا لٹکا ہے کہ ہم سب کھولوں والے اسے اتفاق رائے سے ڈاکٹر جگا کہتے ہیں۔ لیکن بھائی۔" یہ بڑا کمال کوئی۔ اس نے تمہارے زلموں پر صرف ایک سرخ سی دوا نکالی۔ پھر ایک پاؤڈر بھر دیا اور طوفان یوں رک گیا جیسے دھوئے ہوئے بچے کو مٹھائی لٹے پر اس کے آنسو رک جاتے ہیں۔"

میں نے اپنے ہاتھ پر ٹھوڑا لیا۔ اس پر اب کوئی پتی دھوپ نہیں تھی۔ بس سرخ سرخ

کیوں کے درمیان سفید پتھر ہوا تھا اور وہ بالکل ٹنگ تھا۔ ہندو میں لب کوئی تکلیف
ہی نہیں تھی۔

لوہان باقی معلوم ہوتا تھا۔ اپنی دھن میں گن کہہ رہا تھا۔ "پاکمل ہونے کے
ساتھ ساتھ ڈاکٹر کا بھی طرح دھم مل بھی غما ہے اب کیا دیکھ لو کہ رات کے وقت گھر
سے گئے کی فیس میں روپے سے کم نہیں لیکن میرے پاس کل انہیں روپے تھے وہی میر
شکر کر کے لے گیا۔ ایک روپہ سال کر گیا۔" اس نے دونوں ہاتھ پیچے پر رکھ کر ایک
سہری سانس لی۔ تو یہ بھی بھائی کل کی کہانی لب تم ہوش میں آگے ہو۔ بیٹا "بھوکے بھی
ہو گئے اور کچھ کھانے کو بھی مانگو گئے۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے وہی انہیں روپے اپنی
کل پر ملی تھی۔ گھر میں کھانے پکانے کا سلسلہ نہیں ہے اور ہونے والا لمبا دی اوجہ نہیں
کرک۔ کم از کم مجھ سے تو نہیں کرتے۔"

"کیا اتنی رات مجھے ہوئی کلا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔ کھانے کا ہم سن کر اچانک
میرے صدمے میں ایک بار پھر ٹیس لپٹے لگی تھیں۔

"رات مجھے؟" طبلہ ایک بار پھر خود استہزائی کے انداز میں ہنسا۔ "بھائی یہ دوسرا کا
وقت ہے۔ کھانا میں چلتے ہوئے لب پر نہ جاتا۔ یہ غریب آدمی کا گھر ہے۔ یہاں سے
مددنی کا ترکم ہی ہوتا ہے۔"

غصہ کے سے عالم میں میں نے ذرا پلو بدلا اور جھپٹیں نکل کر چٹپٹ کی جیب سے
بڑا نکل کر فرش پر پھینکے ہوئے کہا۔ "اس میں کچھ پیسے ہیں بھائی طبلہ۔ جتنی جلدی ممکن ہو
لپٹے اور میرے لئے اچھے سے لپٹے کھانے کا انتظام کرو۔"

"یعنی۔۔۔ کیا۔۔۔ تمہاری طرف سے اجازت ہے؟" اس نے پچھتے ہوئے پرس
اٹھایا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو یا رات تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ لب اگر تم مجھے
اٹھا کر چھ ہی آؤ تو مجھے کوئی فکر نہیں ہو گی۔" میں نے مسکراتے کی خوشی کی۔

"سچو ہاں" اس نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر قسم لگایا۔ "تم بھی اپنی طرح کھلے دل کے
آدمی ہو۔" اس نے بڑا کھول کر اس میں سے پکاس کا ایک ٹوٹ لٹا اور اللہ کر اس
دروالے سے باہر چلا گیا جو بالی ظہر میں گھل رہی تھی وہ معلوم ہوتا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے لیٹے لیٹے گردن فرش پر تھر دوڑائی۔ کھودی اور پھر
چاسٹر کے سلیں لہہ دیوادل والی یہ کوٹھڑی بس اتنی ہی بڑی تھی کہ وہ چنگ اس میں سا
سکے۔ قرنچہ کے طور پر اس میں صرف یہی جھلکی سی چار پائی تھی جس پر میں لیٹا ہوا تھا۔
پہلی دیوار کے ساتھ چٹائی چھپی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں صراحی اور اس پر الوٹیم کا گلاس
اوندھا رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف سینٹ کا وہ انگل لوپا چھوڑا تھا جس پر بالی اور لونا رکھا

تھا۔ یہ "فلپا" ہیلے کی تھک تھی۔ ایک طرف دیوار پر قلموں کے دو تین پھرتے ہوئے
تھی اور ان کے قریب ہی کیلوں پر چند کپڑے لگے ہوئے تھے۔ فرش پر چٹائی کے قریب ٹیچ
کا ایک سیاہ رنگ رکھا تھا جس پر ایک نکل رضائی لپیٹ پیچے سے تھک کر کے رکھی تھی

پھر صوف بھر ہی طبلہ بڑی شان سے ایک ہاتھ سے دھوئی کی لٹ سنجالے کھولی میں
داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے گیانا ہاں سال کا ایک مضوک اللال لڑکا دونوں ہاتھوں
پر کھانے کی ٹرے اٹھاتے آ رہا تھا۔ ٹرے فرش پر رکھوانے کے بعد طبلہ نے اسے حکم دیا۔
"دو صوف بھر کڑک چائے کے وہ گلاس بھی لے آنا۔" لڑکا اٹھت میں سر ہلا کر ایک اچلتی
ی ظہر پر ڈال کر باہر چلا گیا۔ سسیمی ٹوٹے 03036360959

میں نے اچھے کی خوشی کی تو یہ پتہ فطرت محسوس ہوئی۔ طبلہ نے سارا رے کر
مجھے چارپائی سے اٹھا اور ہم چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ پہلے وہ ایک تھے تو کھانا طلی
کو چرتے ہوئے صدمے میں اترے۔ اس کے بعد میں مریخوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ
پڑا۔ یہ بھی زندگی کا لہجہ ترین کھانا تھا اور کھانے کے بعد صراحی کے لٹھے پانی اور گرم
گرم کڑک چائے لے گیا جو اس کی بھر آگھیں کھول دیں۔ ساری کھٹ اور فطرت دور ہو
گئی۔ لب جو تھوڑی بہت کھودی ہوتی تھی وہ "فلپا" خون خلائع ہو جانے کی وجہ سے تھی۔

"واہ سہلا رتی دینے والا ہے کب تو ہے۔" طبلہ نے چائے کا گلاس ایک طرف
رکھ کر دونوں ہاتھ دھاتی انداز میں اٹھا کر بڑے سرفراز لہے میں کمال اور دیوار سے ٹک
ٹکی۔ میری رگ و پے میں بھی چھ لہے کے لئے بجلی سی مددنی تھی لیکن لب جیسے سا خوار
طاری ہو رہا تھا۔ شاید یہ گندم کا خوار تھا جس نے بھی دیوار سے ٹک لگائی۔

"اب کیا پھر گرم ہے بھائی؟" طبلہ نے ٹیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے
پوچھا۔ "میں تو اسٹوڈنٹ چائے کی سوچ رہا تھا۔ ایکسپریس لپٹا لے لینا تھا۔ شاید کوئی کام نکل
آئے شنگ۔ تو کسی لٹوں کی چل رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے تم ہو کہ۔" میں نے کہا۔ "میں اتنی دیر آرام کر لوں گا۔ اگر تم اجازت
دے گے تو چند دن میرا قیام نہیں رہے گا۔"

"اس کے لئے اجازت کی فیس عیوں کی ضرورت ہے گی میرے بھائی اگر میری
باڈی گتی رہی تب تو گھر کی کوئی بات نہیں۔ دیکھ لو ان گھبرائے کی ضرورت نہیں۔ ابھی
تک تو مولا کا گرم رہا ہے کہ کبھی قلمے کی لوبٹ نہیں تکی لیکن اگر آجائے تو حوصلہ مت
ارٹا۔" اس نے اٹھ کر کھٹی پر لگے ہوئے کپڑوں میں ہاتھ مارے ہوئے کہا۔

"قلمے کی لوبٹ نہیں آئے گی۔" میں نے وقت سے کہا۔ "چند دن کے گزارے
کے تو میرے پاس پیسے موجود ہیں اور اگر لونا ہی کوئی مسئلہ ہوا تو میرے پاس یہ بھی ہے۔"

ساتھ چلو۔ فیسی میں چلے ہیں۔ دراصل میں یہاں آئی ہو۔
 "ہاں! اس نے گویا اطمینان کی سانس لی۔ "شکر ہے تم تو کوٹ ہی بھول آئے ہو۔
 ہمارے ایک ڈائریکٹر صاحب ہیں۔ وہ کسی لڑکی کے ہاں جاتے ہیں تو بلیوں ہی بھول آتے
 ہیں۔ ویسے استوا داستان تمہاری بھی کچھ پرچہ ہی معلوم ہوئی ہے۔ فیسی اسٹیٹ پر لڑکی
 کے ہاں کوٹ بھول آئے۔ اور پھر ٹیکسی امیڈا میں ایک گل میں دغی حالت میں پڑے پائے
 جانے والے۔" وہ خود کھائی کے سے لیجے میں بولا پھر توجہ سے چربک کر پوچھنے لگا۔ "لڑکی
 کے بھائی کتنے تھے کیا؟"

"نہیں۔ نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "وہ ایسی ہی تھی۔ پیشہ ور قسم کی۔
 میرے دغی ہونے کا پتہ نہ سنا تھا۔ اب وقت ضائع نہ کرو۔ میرے ساتھ چلو۔"
 "چلو بھائی!" اس نے لٹری سانس لے کر ایک بار پھر آگے میں اپنا ہاتھ لیا اور
 دروازے کی طرف بڑھا دیا۔ "مجھے اپنی فیض کا خیال آتا جس کی آستین کندھے تک خون
 میں تھڑک رہی تھی۔"

"یار ظیل! تمہارے پاس کوئی دوسری فیض نہیں ہوگی؟" میں نے پوچھا۔
 "فیض؟" اس نے بخداد نظر سے میرا سر دیا یا جانے لیا۔ "فیض تو ہوگی لیکن
 سوال یہ ہے کہ کیا میری فیض تمہیں آجائے گی؟ ہون کی کھل گھولے پر مڑنے والی
 بات ہے۔ لیکن تمہارے میں نے پانچ سو سال پہلے کی ایک فیض بھور فیرت سنبھل کر
 رکھی ہوئی ہے۔ اسے اچانک یاد آتا۔"

"کس بات کے قیامت پر؟" میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔ "مگر کبھی میں بھی
 صحت مند تھا۔" اس نے لٹری سانس لے کر کہا اور صندوق کی طرف بڑھ گیا۔ رضائی ہٹا
 کر اس نے صندوق کھولا اور احوال وحوالہ کر اس میں سے ایک پرانی اور مسلی ہوئی سی ترد
 فیض نکالی۔ "چین نہیں آتا تھا کہ یہ فیض ظیل ہی کی رہی ہوگی۔ یہ مجھے کچھ اچھی ہی
 رہی۔"

فیض بلیوں میں اڑنے کے بعد میں نے اوپر ادھر دیکھا اور جھجکتے ہوئے پوچھا۔
 "تمہارے پاس بیچا؟" کوئی لڑکی نور سیاہ فیشوں والی بیگ بھی ہوگی؟"
 "ہاں کیا ہے یاد؟" اس نے فک تھوڑی سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "میں اس
 سے بھاگے ہوئے تو نہیں ہو؟"

"ایسی کوئی بات نہیں یاد؟" میں نے اس کا کندھا تپکا۔ "میں وہ ذرا ایک لڑکی کے
 محلے میں کچھ نٹ بولتی تھی۔ میرے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اب ان سے سامنا ہونے کا کوئی
 امکان تو نہیں لیکن میں فی الحال احتیاط ہی سے کام لیتا چاہتا ہوں۔ یاد دغی ہے اس لئے
 لڑکی بھڑائی سے پرویز کی رکھوں تو بہتر ہے۔"

میں نے گھٹے میں چڑی ہوئی سونے کی زنجیر سے دکھائی ہو اعلیٰ تین تولے سے کم نہیں
 تھی۔

"میں پھر تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ خوب مکرے کی جو مل بیٹھیں گے ہاں کھٹے
 نہ۔" وہ اپنی انگلی سے بلیوں پہنچے ہوئے ٹنگلیا پھر سمجھہ ہو کر بولا۔ "ایک دوسرے کی
 داستان تم پھر کبھی فرصت میں بیٹھ کر سنیں سناکیں گے۔ اب میں چلا ہوں۔ تم بے فکر ہو
 کر لیجی تاکہ سو چلا۔" اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو دروازے سے گل ڈالیں ہاتھ پر
 بڑھیاں چڑھ کر سامنے ہی گل میں لمبائی کے ہوٹل چلے جانا۔ پیچھے لمبائی کے منہ پر مارا
 اور وہ تمہاری مطلب چیز فوراً باہر والے کے ہاتھ پہنچ دے گا۔ بیٹوں کے ذکر پر یاد آتا۔
 ذرا اس کے کرکے دیکھو کے لئے پانچ مددپے تو متانت قراء۔"

"بڑا پنڈال کے قریب ہی پڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مگر
 دوستانہ قسم کی باتیں کہیں کرتے ہو یا راجتے بیٹوں کی ضرورت ہو اس میں سے نکال لو۔"
 وہ انگلی سی بلیوں پر ایک حکم کرد فیض بلیں چکا تھا اور دیوار پر لگے کپتے کے
 سامنے کھڑا تھل میں چڑے ہوئے بلیوں کو جوسے سینچے سے چھانی پر بھا رہا تھا۔ میں اس کی
 طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس کے چلنے کے بعد اطمینان سے لیٹ کر اس ڈائری کا
 مطالعہ کروں گا جو میں نے مجھے دی تھی اور جس میں بھول ان کے میری زندگی کے تمام اہم
 ترین سوالوں کے جواب موجود تھے اور تب اچانک جیسے میرے ذہن میں دھماکا سا ہول
 ڈائری تو ہلچل کی جیب میں تھی اور ہلچل اس وقت میرے آس پاس کہیں موجود نہیں تھا۔
 مجھے یاد آتا کہ ہلچل تو میں بھلت میں اس لڑکی شہما کے کمرے ہی میں بھڑو کیا تھا جو مجھے
 گلاب بنا کر ساتھ لے گئی تھی۔

ظیل اس وقت میرے پاس میں پانچ کا کوٹ احوال رہا تھا۔ میں نے گھمرائے ہوئے
 انداز میں اسے ہاتھ سے جا پکڑا۔ وہ غل سے اچھل پڑا۔ "کیا بات ہے؟ تمہارا ارادہ بدل
 گیا ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"ظیل! اس مسئلے کا نام کیا ہے؟" میں نے اس کے سوال پر دھیان دیئے بغیر کہا۔
 "کدو ش مگر۔ اس نے کمری سانس لے کر کہا۔ "لیکن نام سے کسی ظیل جس میں
 جلا نہ ہوئے یہاں لپاؤ تر وہی لوگ سچے ہیں جن کا ایک بھی آدرش پورا نہیں ہوا۔ اب
 مجھ ہی کو لے لو۔"

"لیکن اسٹیٹ؟" اس نے لہن پر زور دیا پھر پکلی بھلتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔
 آگیا۔ کتنی دور ہے یہاں سے۔۔۔ کیوں بات کیا ہے؟"

"وہ بات دراصل یہ ہے ظیل! کہ میں وہاں ایک لڑکی کے گھر اپنا کوٹ بھول گیا
 ہوں۔ کوٹ میں کچھ ضروری کتھرات ہیں۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "تم ذرا میرے

"ایک رات کی دوستی میں مواند دیا یا" وہ بیڑا پھر قہر سے اپنے آواز میں بولا۔
 "دونوں چھریں ہیں تو کسی میرے پاس لیکن انہیں پہن کر اچھے بھلے کارلوں کو گئے۔"
 "میرا نہیں۔ تم فلاں تو سی۔" میں نے جھالی سے کہہ دیا ایک بار پھر جا کر مہو عیار
 کی زنجیل سے مشابہ اس مشعل پر جھک گیا۔ اور گویا سمندر میں غوطہ کھانے کے مراد کے موٹی
 لال لایا۔ سیاہ لال کی مٹی لپٹی اور ایک سستا سا دھوپ کا چشمہ لگا کر میں نے دروازہ پر
 کورچوں دھندلے سے آنکھیں میں اپنا جائزہ لیا۔ میری بہت بکریاں بکریاں تھیں۔
 "میرا خیال غلط تھا۔" طبلہ نے میرا سر ہاتھ پا جائزہ لیتے ہوئے کہہ دیا۔ "میری فیض
 لپٹی اور ٹیک کے ساتھ تم کارلوں کو گئے۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتا۔ "ہاں ہے۔"
 "ہاں؟" اس نے ایک بار پھر غلطی سانس لے۔ "مگر تو بھروسہ لوگ ہر حال میں غور و خیر
 کرتے ہیں۔ آؤ چلیں۔"

کھولی سے لال کر وہ دروازے میں نکلا ڈالتے ہوئے بولا۔ "تعمیری مصلحت کے
 لئے جانا چاہوں کہ یہ کالا مصلحتی کا دانت ہے۔" پتھر چلی کے کہتا ہے۔ آئندہ جب بھی
 میری دم مچھوگی میں کتا چڑے تو چلی کے تردد میں نہ پڑا۔ ایک کالا سا مچھوگا دیا اور اس
 کمال حاسم م۔"

میں نے اور مرد کا جائزہ لیا۔ یہ ایک بہت بڑا اسلحہ سا تھا۔ جس کی بہت گتہ تھا
 تھی اور دروازہ کے ساتھ چاندی طرف اسی قسم کی کھولیاں بنی ہوئی تھیں۔ مٹھوں کے ڈالنے
 میں اس طرف پر اسلحہ بنائے جاتے تھے۔ ہاتھیں ہاتھ پر وہ دروازوں کے درمیان ایک تنگ
 سا راستہ تھا۔ اس سے گزر کر ہم چند پانچ بیڑیوں تک پہنچے۔ جن کے انتظام پر بڑا سا
 دروازہ تھا اس دروازے کی بیڑیوں میں اتنی مٹی جم چکی تھی کہ اب اس کے پت اپنی جگہ
 سے ال ہاں بھی جنبش نہیں کر سکتے تھے۔ دروازے سے گزر کر ہم سڑک پر آگئے۔

بیڑی بارش کی تھی دونوں طرف اچھے بھلے اور بچے ہتھ مٹھوں کی قطاریں
 تھیں جن کے پچھلے حصوں میں دکانیں تھیں۔ کھولیاں زمین کی سطح سے کم از کم آٹھ فوٹ
 بچے تھیں اور ان کے اوپر بھی مکانات نہ جانے کس حساب سے بنے ہوئے تھے۔
 "بارش میں تو پانی کھولوں میں چلا جاتا ہو گا؟" میں نے طبلہ کے ساتھ چلتے ہوئے
 کہا۔

"شکر ہے بیٹی میں لوہا بارش نہیں ہوتی۔" وہ بولا۔ "جب سے میں یہاں آ
 ہوں تب سے ایک ہی اور دار بارش ہوئی ہے۔ شکر ہے اس دروازے میں چٹائی پر نہیں سوتا ہوا
 تھا ورنہ ادب ہی جاتا۔ میری تو نیند بھی کبھت ایسی ہے۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب بارش
 ہوئی اور کب کھولوں میں کھولوں کھولوں پانی بھر گیا۔" رات "وہ چمک کر بولا۔
 "موت لیا؟"

"کسے؟" میں نے چمک کر پوچھا۔
 "وہ ایک ٹیکس تھی ہے۔" اس نے سادگی سے کہا اور سامنے اشارہ کیا۔
 "موت؟" موت؟ میں نے خود ہی ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ٹیکس ہمارے قریب آئی۔
 "جسٹ جی رول کی طرف چلو۔" طبلہ نے کھلی بیٹ پر چلتے ہوئے ارا تیر کو ہر ایک
 کی۔ "کسے میں راستہ بتاؤں گا لیکن اسٹریٹ چلتا ہے۔"

"تقریباً" مٹھوں صحت بہت ہم لیکن اسٹریٹ بچے اور مٹھوں عمارت کو پہچاننے کے بعد
 میں نے جیسی رکوائی۔ "تم ہمیں گاڑی میں گھسو۔ میں ابھی گیا۔" میں نے طبلہ سے کہا اور
 پھر دار چلی بیڑیاں بھلا نکلا اور پھلا۔

مٹھوں کرے کے سامنے کھج کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ دروازے پر تھوٹک ہا
 تھا چہ لے تو میں گم سم کھڑا رہا۔ پھر میں نے لپٹ آپ کو تسلی دیا کہ رات کے وقت پھر
 لگاؤں گا۔ اس وقت شاید لڑکی اور اس کا بھائی دونوں ہی کہیں نکلے ہوئے تھے میں واپس
 جانے کے لئے سڑک تو اچھا ہوا کہ برابر والے دروازے میں کھڑی ایک سوکھی سی عورت
 بیٹھی تھیں۔ مجھے سمجھ رہی تھی۔ اس کے ہاں تو سیاہ تھے مگر جیسے پر بیڑی بولہ جوں کی
 طرح جھریاں تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھنے کی جرأت کرنا وہ خود ہی بول
 پڑی۔

"مٹھوں کے کاک ہو گیا؟" اس نے کڑھت اور دہریلے لہجے میں پوچھا۔
 "کاک؟" میں نے پوچھا کر کہہ "نہیں۔ نہیں تو۔۔۔ میں تو ایک دکان دار
 ہوں۔ کل سڑک پر میرے پاس کچھ دواکیں لینے آتا تھا تو سڑی سے ٹکھڑا ہوا تھا۔ میں نے
 اس کا کہ اسے اپنا کوٹ دے دیا تھا۔ میں وہ کوٹ واپس لینے گیا تھا۔ اس نے تو دھڑے
 کے مطابق صبح نہیں پہنچا۔ کہاں گیا ہے؟"

"بھلا؟" میں نے پوچھا۔ "مجھ مانگ مکان نے انہیں دیکھے دے کر لال
 بولا۔"

"لال دیا؟" میں نے دہریلا اور میرا دل بیٹہ سا گیا۔



"اگ مکان سے کہاں نکلتا ہو سکتی ہے؟ دراصل مجھے کوٹ کی تو اتنی ہوا نہیں تین قطعی سے اس کی جیب میں میری ایک حساب کتاب کی وائزی آئی تھی۔ میں قدر اکرا کھرا کر دیکھتا چاہتا تھا۔ شاید سرحد وہ وائزی کمرے میں ہی چھوڑ گیا ہو۔" میں نے امید بھرے لیے میں کہا۔

پوچھا نے بڑے دھڑل سے تلی میں سر ہلایا۔ "کمرے میں تو ان کا ایک بٹکا بھی نہیں رہا۔ میں خود دودھانے میں کڑی دیکھ رہی تھی۔ ہانڈنگ والوں ہی نے تین کا سارا سامان باغیچہ باغیچہ کر ان کے حوالے کر دیا تھا۔ مجھے تو کہیں کوئی وائزی نظر نہیں آئی تھی۔ اگر ہوگی تو کوٹ کی جیب ہی میں ہوگی۔" اس نے میری آخری امید کو بھی لٹکوں کے ہے روم قدموں سے پھیل کر رکھ دیا تھا۔

میں نے خودی لٹکوں سے آخری بار بند کمرے کے دودھانے پر حطوب ہانے کو دیکھا اور وہاں کو گھسیٹا بیڑیوں کی طرف چل دیا۔ لوگ بھی چھپ ہوئے ہیں۔ رات کی رات کن کی کن میں کسی کی کاکلت اجاڑ کر رکھ دیجے ہیں سب کچھ جسہ وہاں کر دیجے ہیں۔ اب میں کہاں دھوؤں گا سرحد کو؟ کہاں ملے گی مجھے اس بکراں شرمیں وہ سخی سی وائزی؟ اور کیسے سلجھوں گا میں اس ابھی ہوئی داستان کا نانا پانا جس کی کھوج نے مجھے ایک رات میں کہاں سے کہاں لا پھینکا تھا؟

پچھلے آکر میں تھکی میں طلبہ کے قہقہے سننے شہیر کی طرح اجبر ہو گیا۔ اس نے ہر تھکائی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "میرے تو ہے؟" میں نے ٹھہرا۔ اسے بتایا کہ جس چیز کی تلاش میں میں یہاں آتا تھا وہ کس طرح میری دسترس سے کہیں دور نکل گئی ہے۔

میں دلیں اپنی گلی میں پہنچ کر تھکی سے اتر گیا اور طلبہ مجھے گھر جانے کی ہدایت کر کے خود اسٹوڈنٹ روڈ پر ہو گیا۔ میں اس جگہ سے کچھ دور ہی اتر گیا تھا اب میرا مسکن تھی۔ راستے میں ایک جگہ ٹٹ ہاتھ پر مجھے کچھ اٹھارہ دودھانے رکھے نظر آئے۔ میں نے انگریزی ہندی دودھانے کے کئی اخبارات خرید لئے اور کھلی میں آکر بے چینی سے تین کی دہلی گروائی کرنے لگا۔ صرف عین اخبارات میں بازار حسن میں ہونے والی گل کی وہ داداؤں کے بارے میں مختصر خبریں لکھی تھیں۔ پولیس کی تھیلی کے مطابق می کی موت تو طبعی تھی۔ جلد تین کی رائے میں می کی موت کے بعد نامعلوم قاتل اور دہلیوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا تھا جس میں وہ طالبہ مارے گئے تھے۔ پولیس کے خیال میں اس جھگڑے کے پیچھے وہ حقیقت کسی اور کا ہاتھ تھا اور مجھے انہوں نے کرائے کا قاتل قرار دیا تھا۔ خوش قسمتی سے تھیلی کے دودھانے میری کوئی خاص شہادت حسین نہیں ہو سکی تھی۔ وہ دھماکہ لڑی جس سے میں نے ہٹا خالے پر می کے حلق پر چھاپا تھا میرے حلق

"مکان نہیں تو اور کیا کرتا۔" پوچھا ہاتھ ہاتھ بچا کر بول۔ "مجھے پہلے سب شریف لوگ کہہ ہیں اس لڑکے میں۔ اس اکیلی لڑکی نے گند ڈال رکھا تھا۔ ایک چھل سارے جل کو گندا کر لی ہے۔ یہاں بہت سے بو طیلوں والے بھی رہتے ہیں۔ سب کب سے دودھانے میں رہے تھے مالک مکان پر۔ ایک تو شہا کے بھائی ہی کچھ کم نہیں تھے۔" ادھر سے اس کا وہ بے غیرت بھائی دودھانے کی کر آجائے تھا اور رات بھر غل خلیا چا کر دن میں سوتا رہتا تھا۔ کل اکی اس نے یہاں وہ دودھانے کھلا کہ خدا کی پتہ اگر مالک مکان کو لیوٹ بھی گئی۔ اور وہ بھی شاید اس لئے کہ تین پر لب تیرے پہلے کا کر لیا ہی چھ گیا تھا۔"

پوچھا کے لفظ میرے ہونے صحت کو چھو رہے تھے۔ اس کا اصطلاح طبع کا جوش کچھ کم ہوا تو قدمے نرم پڑتے ہوئے بول۔ "کیا بتایا قائم نے؟ دکاندار جو رقم؟ تمہارا کوٹ مالک کر لیا تھا سرحد پر؟"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ میں نے قورک گل کر کہا۔" میں نے ساتھ ساتھ کہا پھر یہاں بھی پھر کی ہو گئی تھی۔

"میں نے دیکھی دار سا کوٹ تھا؟ اس کے سامنے والی جیب پر میرے دھماکے سے ایک چھاپ سی کڑی ہوئی تھی؟" پوچھا کی آنکھوں میں چمک سی لڑائی گویا وہ مجھے کوٹ کے حلق کوئی اہم بات بتانے لگی ہو۔ کوٹ کی جیب پر کتے ہوئے حطوب کو اس نے چڑھا دیا تھا لیکن ہر حال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ پوچھا نے کوٹ دیکھا تھا۔

"جی ہاں جی ہاں۔ بالکل وہی کوٹ تھا۔" میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔ "وہی کوٹ تو سرحد نے اس وقت پہنا ہوا تھا جب مالک مکان کے کومیں نے اسے دھکے دے کر لٹایا۔" پوچھا نے اطمینان سے کہا۔ "مکان کی گھڑی سرے لڑی ہوئی تھی اور وہ ساری ہانڈنگ والوں کی صحت صحت ستا وہی کوٹ پہنے ہیں دھلی سے آئے ہوا جا رہا تھا جسے شای صحت بہن رکھی ہو اور بتایا اس کی شان میں قصیدے چہ رہی ہو۔" "کچھ اندازہ ہے وہ دونوں کہاں گئے ہوں گے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"مجھے کیا پتا؟ پوچھا نے گویا براہن کر کہا۔ "مجھے ہوں گے کسی ایسے نکلے میں جہاں ان کا دھماکہ اچھی طرح چمک سکے۔"

صرف لٹکا ہوا تھی کہ وہ ایک وجہ اور دروازہ سارا تھا۔
بہر حال یہ کوئی زیادہ اطمینان بخش صورت حال نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خیرین
جب ملک کی نظروں سے گزریں گی تو وہ چلیں گے میرے بارے میں ہر ممکن معلومات فراہم
کرنے کی کوشش کرے گا۔ میرے لئے یہ اہل مال و دولت رہنا ناگزیر تھا۔

وہ دن اب میرے پاس پہنچے تھے۔ طیلہ اس دوران بکاس ساتھ دوپے کا تھا
تھا لیکن میں نے اس پر بوجھ بنا مناسب نہ سمجھا اور اس کے ہاتھوں اپنی سونے کی انگوٹھی
ہزار بھرا کر نکال دی۔ انگوٹھی ہزار روپے مل گئی جو کھول کے معیار زندگی کے مطابق کم تو
کم ایک ماہ کے لئے ہم دونوں کو کافی تھے۔ میں نے اپنے لئے وہ جوڑے کپڑے بھی قبضہ
کئے۔

طیلہ دن چڑھے اسٹوڈیو چلا جاتا تھا اور رات کے لوٹا تھا۔ میرا معمول بس یہی تھا کہ
اس کے جانے کے بعد میں لینا اخبار رسالے پڑھتا رہتا۔ ڈاکٹر نکالے سے میں ہانڈ کی مرہم بھی
بھی کڑا رہا تھا۔ دسویں دن رات پر کھڑے گئے۔ والد اب بالکل صحت مند تھے۔ ہم نے گھر
تھا۔ چھ دسویں دن پر کھڑے بھی اتر گئے۔ اس عرصہ میں میں نے دانتوں پر شہ نہیں
کھائی تھی اور اب میرے چہرے پر عکسری والی موٹیوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ میرا اسٹائل
بھی میں نے بدل لیا تھا۔

طیلہ اور میں اب گھر سے دست بردار بن چکے تھے۔ وہ ایک دلچسپ ٹوی تھا اور اس کی
صحبت میں میرا بہت اچھا وقت گزرتا تھا۔ گھر میں کچھ خلیں دن گزر گئے تو دل
نہہنے لگا۔ بیکار پڑے پڑے میری جان تھک رہی تھی۔ گو کہ اب میں نے ورڈشیں بھی
شروع کر دی تھیں لیکن کھول کی سلیں لود تھا میں رپے رپے اب مجھے اپنا وجود ایک
چنگڑ سے ملایہ معلوم ہونے لگا تھا۔

"میں طرح کب تک گزریں گی؟" ایک روز میں نے طیلہ سے کہا۔ "میں تو بیکار
پڑے پڑے مفلوج سا ہو گیا ہوں۔"

"میرے ساتھ اسٹوڈیو چلا کرو۔" اس نے کھول کے چہرے پر اپنی انگوٹھی ہانڈ کی
چھلک دھونے ہوئے کہا۔ "شوٹنگ دیکھنا ہوں تو کوئی خاص دلچسپی کا کام نہیں لیکن بیکار پڑے
رہنے سے بہتر ہے اور پھر شاید اسٹوڈیو میں ہمیں بھی کوئی کام مل جائے۔ مجھے تو یہ ڈانٹنا
ترقی کرتے دیکھنا نہیں چاہیے۔ ایکسٹراؤں کے جھم میں سب سے پیچھے کھڑا کر دیتے ہیں۔
جس اٹالاکہ میں بھی کھار کمرے کی دہلیز میں آتا ہوں۔ ایک دفعہ ایک فلم میں میرا
پورے ایک ماہ کا پارٹ تھا۔ میں پورے فیس سے اپنے دہلیز میں اسٹوڈیو کو اپنا کام دیکھنے
سیٹا ہوا تھا۔ فلم ختم ہو گئی مگر میری شکل کس طرح آئی اب میں نے ڈانٹنا
سے جا کر پوچھا تو لاپرواہی سے کہنے لگا۔ "وہ صدمہ ہم نے ایڈیٹنگ میں لٹل دیا تھا۔"

میری زندگی کا طویل ترین پارٹ تھا۔ ویسے تو ایک اور فلم میں بھی میں نے تقریباً ایک
ماہ کا رول کیا تھا لیکن اس میں میں ڈانٹوں کا ساتھی تھا اور میرے منہ پر فلب تھی۔
میں نے چھلک کو ہاتھ میں پکڑ کر ایک کہہ دیا۔ "کیا لگتا ہے ایسی زندگی کا۔"
"ہارا مجھ تو تمہاری اچھی ہے۔" میں نے چارپائی پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھ
مجھے بھی ساتھ لے کر چلا۔"

مجھ چار ہو کر اس کے ساتھ روانہ ہوتے وقت میں نے کہنے میں اپنا جانتے لیا۔
میرے پر بھاری عکسری والی موٹیوں دھوپ کے جھلنے اور بدلے ہوئے عکس
اسٹائل نے کم از کم تین لوگوں کے لئے تو میری شناخت تقریباً ناممکن بنا دی تھی جنہوں نے
پہلے مجھے دیکھا تھا۔ مطمئن ہو کر میں طیلہ کے ساتھ باہر آگیا۔

میں میں چند کریم ایف ایم اسٹوڈیو پہنچے۔ طیلہ نے دروازے پر موجود چکیدار سے
لے کر اندر گھر تک ہر گھر والے شخص کو اپنے خوشامد انداز میں جھک جھک کر سلام کیا
کہ مجھے اس کے ساتھ ملنے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی۔

"طیلہ! ایک بات کہوں برا تو نہیں سمجھو گے؟" میں نے بے غیر نہ رہ سکا۔
"ہارا اب ہم ایک دوسرے کی باتیں کا برا ماننے کے بجائے سے گزر چکے ہیں۔ البتہ
اگر تم نے آج کل کے شکوک کے ساتھ شکوک کی تو میں ضرور برا مانوں گا۔" اس نے کہا۔
"تم لوگوں کے ساتھ اپنے خوشامد انداز میں پیش نہ کیا کرو۔ میرے خیال میں
تمہاری بھائی کی وجہ سے وہ تم ایکسٹرا کے بجائے اپنے پہلے کامیڈین بن چکے تھے۔"
میں نے خیال ظاہر کیا۔ "تمہاری صلاحیتیں تو وہیں ایک طرف۔ میرے خیال میں تو
تمہارے کامیڈین بننے کے لئے تمہاری موٹیوں ہی کافی ہیں۔ ہاری قسموں میں کامیڈین
صرف منہ پکڑنے اور الٹی سیدھی اچھل کود کرنے کے علاوہ کچھ ہی کیا ہے؟"

"لیکن ہارا مجھے تو ایک ہارنے گر کے نے بتایا تھا کہ تمہی دنیا میں کامیابی کا پتھر
ترین راستہ خوشامد ہے۔" طیلہ نے سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

"اور تم اس (پتھر ترین) راستے پر چھ سال سے جا رہے ہو۔ کہاں تک پہنچے؟"
میں نے کہتے ہوئے لہجے میں کہا۔ خوشامد کسی کسی کو راس آتی ہے تم تھوڑے سے ادا
پرست بن کر رہو۔"

"میں ایک ادا پرست کو بھی جانتا ہوں۔ ایک سال پہلے تک وہ بیو تھا۔ کل اسے
میری ٹوریم میں داخل کرانے کے لئے چھہ جمع کیا جا رہا تھا۔" طیلہ کے الفاظ سچ مگر لہجہ
داخل ہوا تھا۔ کم بہت بڑی سے بڑی بات بات لہجے میں کرتا تھا۔

"بہر حال اس نے صوبہ تو دیکھا نا؟" میں اسٹائل پر ہر ہوا تھا۔ "ہائی رہا اس کا دور
ناک انعام۔ تو شاید اس کی وجہ اس کی اپنی ہے احمدیایں رہی ہوں۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔" اس نے تسلیم کیا۔ "مصلحت کے دلائل میں وہ ہر ایک کو
مکڑی مکڑی کاٹتا ہے۔ دن رات شراب کے نشے اور خلاب کے سمندر میں طوق دھار
تھا۔ کئی بات مرضی کے خلاف ہو جاتی تو جی شوق چھوڑ کر بیٹ کو لہو کر مار کر پھاڑ
تھا۔"

یہ باتیں کرتے کرتے ہم ایک قور کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ طبلہ حسب مروت
دروازے پر کڑے نو عمر سے چوکیدار لڑکے کو جھٹک کر سلام کرتے ہی لگا تھا کہ شاید اسے
میری طبیعت یاد آگئی۔ اس نے بڑے ہادار انداز میں سلام کیا اور گیسٹ کھول کر اندر چلے
گئے۔ لڑکے نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کرمبائی کی شوق چھوڑ رہی ہے۔" اس نے
کہا۔ "خوار کیا۔" انہوں نے کہا تھا کہ کئی سالوں آری بیٹ پر نہ گئے۔"

"سبے بہتہ پڑا گیا کرمبائی کا چچا۔" طبلہ نے اسے لڑکے کی طبیعت پر کچھ دیا
ہی اثر کر گئی تھی۔ "تجربہ تک کسی بیٹ پر کسی لڑکے لپٹنے سے طبلہ کا راستہ نہیں
بہکے۔ تو اپنی لڑکھٹ بھول گیا ہے یا تجھے ہمارا قصہ دیا میں تے کا سن یاد نہیں رہا۔
اسی؟" لڑکا ہکا بکا رہ گیا اور طبلہ میرا ہاتھ پکڑ کر اندر چلے گیا۔

یہ بہت لمبی چست دلا ایک سیٹ نما ہال تھا۔ چست سے کافی نیچے ہانسل کی بد
سے ایک چل سا بچھا کر گیا ایک اور چست چلی گئی تھی۔ جس میں بڑی بڑی کڑا لکڑی
لٹ کی جا رہی تھیں۔ لی اٹھل صرف ایک ہی لائٹ روشن تھی اور رات کا ساہل تھا۔
لائٹ میں اور ہانسل کے ہال پر چڑھے ہوئے تھے اور الٹکڑاٹن سوکے پورے اٹھائے تھیں
تھیں۔ لڑکھٹ اور ادھر آہا رہے تھے۔ ایک طرف چوڑے پر ہاتھ دہری کا سیٹ لگا ہوا تھا جس کے
تحت میں ابھی تکلیں لٹکی جا رہی تھیں اور پتھوڑی کی ہر طرف کے ساتھ سنگ مرمر کی
ہاتھ دہری لڑ رہی تھی کہ یہ سنگ مرمر ٹھن پڑا پورے پر سفید رنگ کر کے تیار کیا گیا
تھا۔ چوڑے سے کچھ دور ایک حوض بھی بنا ہوا تھا۔ جس میں چار چار اچھ گولائی تک گھرا
پانی بھرا ہوا تھا۔

حوض کے دونوں طرف نیم لٹے مڑ چھ درخت بھی کھڑے تھے جن کی پڑیاں زمین
میں پکست نہیں تھیں۔ ہاں وہ کٹے ہوئے تھیں پر ہی کھڑے تھے اور دراز سے اشارے سے
کر سکتے تھے۔ ہاتھ دہری کے وسط میں کھڑے کا ایک قانون بھول رہا تھا۔ ہاتھ دہری میں قانون
میں پہلی مرحلہ دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف روشنی میں لہے کی چھ کرپیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان
میں ایک پر ایک لڑکھٹ مر گئی مرے سفید پی کپ رکھے تقریباً "نیم دراز تھا اس کی لڑکھٹ
تالیا" اسے سیدھا لپٹنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ چھوڑے سے بائیں دلا ایک
لڑکان کپ پورے پر گئے ہوئے کچھ تھنوں کا لپٹہ تھا۔ سیدھا انداز میں جھکا اسے کچھ
سن رہا تھا۔

"یہ الٹکڑا کرمبائی ہیں۔" طبلہ نے اشارے سے لکھ دیا۔ "مور وہ لڑکان کھڑا
انہیں اسکرپٹ چھ کر سنا رہا ہے۔ ان کا اسٹنٹ ہے۔ کرمبائی بڑے مشہور الٹکڑا ہیں۔
تم نے ان کی فلم "پانی رات" تو دیکھی ہی ہوگی یا کم از کم اس کا قسم تو ضرور سنا ہوگا۔
مشہور سیدہ ہانسل نے ہی خلاف کرایا تھا۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا۔ مدقتی میں پہنچ کر اس نے کرمبائی کو سلام کیا۔
کرمبائی نے کچھ فحشگی سے چٹک کر ہنسیں لپکا کر اس کی طرف دیکھا اور سر کی خلیب
ی ہنسی سے جواب دے کر ہماری آواز میں پڑھا۔ "کیسے ہو بھئی طبلہ؟"
"جس کپ کی فکر کریم کا بھڑک رہی۔" طبلہ نے سلامت معاند انداز میں کہا اور
ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ میں اس سے لڑا چھوٹ بیٹ کر کھڑا تھا۔

"آگے چلے رہا کرو۔" کرمبائی نے طبلہ کو چاہت کی۔ "مثلاً لگے بیٹے کی شوقوں
میں ہماری ضرورت ہے۔" فخری کے اشارے پر لکھنے کے کچھ سین ہیں۔"
"کرمبائی سب کرمبائی۔" طبلہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "کسی سین میں آپ مجھے کھل
پنا کر ہار سکتا ہے۔ کاراہ تو نہیں رکھتے جیسا آپ نے "موروری دلا" میں میرے ساتھ
کیا تھا؟"

"مورے نہیں ہیں۔" کرمبائی کی توجہ میں معنی سی لپل پیدا ہوئی۔ "وہ تو نہیں وقت
پر ہاتھ لگتا نہیں۔" اس نے تم سے کام چاہا تھا۔ اس مرحلہ ہم تمہیں فخری کا
سلامت دے گئے۔"

"فخری کا سلامت بننے میں تو مجھے کئی اعتراض ہیں کرمبائی۔" طبلہ نے بڑی
سادگی سے کہا۔ "سلامت ہاتھی پر پڑتے ہوئے مجھے خوف ہے۔"
"سلامت ہاتھی ہلنے لگا ہے۔" کرمبائی کی توجہ ایک بار بھرلی۔ "تمہ رہا ہے۔"
اس لب کچھ بن ہی جائے گا۔"

"آپ نے ہی مجھے طبلہ ہلا کا حضور! لیکن یہ طبلہ ہاں ایک ہی پارچہ کر خاموش
ہو گیا۔" طبلہ نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"مگر نہ کہ۔" کبھی نہ کبھی تھوڑے ساہلے ٹکڑے دور کر دیں گے۔" کرمبائی نے کہا
اور اپنے اسٹنٹ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "ہاں تو آگے شٹ کیا تھا؟"

طبلہ نے سڑک سرگوشی نا لہجے میں لکھ دیا۔ "کرمبائی کی ایک فلم میں کپ کے
سین میں" میں نے بڑے جھوم جھوم کر چھ بیٹوں کے لئے طبلہ بچایا تھا تب سے میرا نام
طبلہ پڑ گیا ہے۔"

"مگر ہے تم نے۔" میں پرہ نہیں بھلا تھا۔ "میں نے سرگوشی میں کہا۔" یہ نام تو تم
پر بالکل نہ چلا۔"

اس دوران سیٹ تیار کرنے والوں نے اپنا کام ختم کر لیا اور اپنے لوازم سیٹ کر رہے تھے۔ اس کے چند ہی منٹ بعد گھبراہٹ والے چھ گروہوں کی فوجی امداد آئی۔ ڈھیلے اعلانے طریقہ لہذاں، گلیزوں اور نقل موچھوں کی مدد سے قاتلانہ انہوں نے آؤکھوں کا دھوپ دھارنے کی کوشش کی۔ ان کی کمریوں کے گرد لپٹے ہوئے کپڑے میں ٹھن کی ٹکڑیاں بھی اتاری ہوئی تھیں۔ ان میں سے سب سے آگے ہائی سی رگھت والا ایک لہوان گیت لپ میں نہیں تھا۔ اس کا قد درمیانہ تھا لیکن جسم خاصا گھٹا ہوا تھا۔ موسم خاصا ٹھک تھا لیکن اس نے گود میں استیتوں کی "ٹائٹلٹ" کی چست ٹھٹ پین رکھی تھی۔ قاتلانہ اپنے ہاتھوں کی ابھری ہوئی چھلپوں دکھانے کے لئے اس کی آنکھ کے قریب رقم کا ایک لہسا سا نشان تھا اور ٹپا ہوٹ نہتا کچھ لہا ہوا ہوا تھا۔

”یہ فٹنس انسٹرکٹر کاالی شاہ ہے۔“ ٹیبل نے سرگوشی میں مجھے بتایا۔
مرل اور بھلے سے ”اُلو“ کر شاہی کو دور ہی سے سلام کر کے ایک نیم تاریک
گوشے میں کھڑے ہو گئے اور قادی شاہ کر شاہی کے قریب آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
”تم نے کل فٹنس کی ابھی طرح رپورٹ کر لی تھی؟“
کر شاہی نے پوچھا۔

”ہاں گی۔ میں نے ہن کی تسلی کرا دی تھی۔“ قاری شہ نے کرحا کے اسٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔ ”مولا کے کرم سے پہلے ہی شاٹ میں لوگ ہو گا سین۔۔۔ جیڑیک میڈم بچا اپنے ڈانیاک نہ بھل گئیں۔“ اس نے بیٹی لدا سے اپنی سرکٹ لاگل بھاڑا۔

”بچا کے ڈانیاک ہیں ہی کلن ہے۔“ کرحا نے جیب سے ایک چمک فل کر ٹاک پر جالتے ہوئے کہا۔ ”ہائے اللہ ابھی اللہ ہی تو کرنا ہے اس نے۔“

”چمک ٹیک ہے۔ اس قسم کی آوازیں نکالنے میں تو میڈم بڑی ماہر ہیں۔“ قاری شہ شاعرانہ انداز میں مسکرایا۔

میں چپ چاپ ایک طرف کھڑا معنوی دنیا کی یہ فحش طرار باطنی سن رہا تھا۔ وہ
 ہنس کے ہل پر چڑھے ہوئے ایک لائٹ میں نے ایک لگائی۔ "ٹھنک۔۔۔ لائٹس آن۔"
 ہالوں پر فحش ہوائی لائٹس روشن ہو گئیں اور بارہ ددی کا سیٹ، گلاب اور
 درخت حیر روشنی میں جھکا اٹھے۔ لائٹ میں نے ایک وہ لائٹوں کا دلویہ درست کیا پھر لوہے
 سے ایک لگائی۔ "ٹھیک ہے کرنا ہی؟"
 کرنا ہی نے بخترانہ قلموں سے سیٹ کا جائزہ لیا پھر کواڑ دے کر کسی سے پوچھا۔
 "ٹھیک ہے اجیت؟"

خود کے کسی اندھیرے گوشے سے ایک پتلا رطل مسخر آدمی بہ تہد ہوا اور درختوں کے قریب نزل ہوا۔ دیکھ کر یہ کہ "اس کے" چند لمبے ہونے اس نے سر اٹھا کر

کہا۔ لڑا ٹش ایک بار پھر مجھ گئیں۔ صرف ایک لاکھ تین رہی۔
 پہلا بھی۔ شہر کو دہلا کر ہلاک کر دیا۔ اور وہ ایکسٹرا لوکیں کہاں ہیں؟ کرکٹ کی
 ترازو اپنے اسٹنڈ سے غائب ہوئے۔ فوراً پر یک لخت لٹ جلی سی گئی۔ ہمارے
 دوڑی شہر ہو گئی۔ تھوڑے گھنٹوں سے مرنے والے سے اتر کر آئے۔ اسٹنڈ نے
 کسی کو باہر دھکیلا اور ساتھ ہی کرکٹ کو ہٹا دیا۔ ایکسٹرا لوکیں تو کب سے تیار ہو کر
 کھینچیں میں بھی ہیں۔ میڈم دہلا کا میک اپ ہوا ہے۔ آپ نے انہیں چھپا کر رکھے ہیں کہ
 خالکوں سے ہل کئے رکھے پر اصرار کر رہی تھیں۔ جی مشکل سے میں نے انہیں سمجھایا
 تھا۔

اس جاں نورت نے کبھی تکیہ نہ چھی ہو تو اسے پتا ہو کہ شہزادیاں ہاں کئے تھیں
رکعتی تھیں۔ ”کرکھائی نے برا سا منہ بنا کر کہا: ”کمل واسے کے ایک سیٹ پر تو میں نے
دکھا تھا کہ مومن لگے نی پٹی تھی اور کھائی ہے ناہ ترین باطل کی ویسٹ ایڈ گھڑی ہر
ہوئی تھی۔ اب میں کمل واسے تو نہیں ہوں نا۔ کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان نہ
دوں۔ میں ان منہ دور بیویوں کو اشاروں پر چلاؤ چاہتا ہوں۔“

جوشِ ہدایت سے کربلای ائمہ کثرے ہوئے غالباً بیٹ کا ساتھ کرنے چل دیے
جلدی میں ایک درخت سے لٹ کا ہاتھ کرا گیا اور درخت فوراً ٹٹن پر آہٹ نصبت تھا
کہ درخت نواہ لہا چڑا نصبت تھا۔ ورتہ کربلای بھی اس کی لچٹ میں کھپتے۔ وہ ٹڑکے
فوراً آگے اور الٹے لے درخت کو الٹا کر دیوارہ سیدھا کھڑا کر دیا۔

کرنٹلی سیٹ پر پہنچے تو دس ہاں ایکسٹرا لوکیں بھی آگئیں۔ وہ حتی المتحدہ یعنی سنووی تھیں۔ ان میں سے دو عین خوب کھلی کھلی سی تھیں۔ چار چھ مرحال ہوئی سی تھیں اور ایک وہ تو بالکل ہی مدوق تھیں لیکن گھٹیا قسم کے میک اپ سے ان سب کو حتی الامکان خوبصورت بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

۱۱ رنگ برنگے پرانے ٹکر دیسی ہلکے فرائوں میں اور چوڑی دار پاجاموں میں بیٹھیں۔ وہ سب کرشماتی کے پاس جا کر کھڑی ہوئیں۔ کرشماتی نے غصہ اٹھیں کچھ سمجھایا اور وہ ہانہ دیسی کے چینی فرش پر کچے ہوئے ایک بھولے سے قابیل کے گرد گھیرا ہل کر بیٹھ گئیں۔ ان میں چند ایک آپس میں کچھ باتیں کرتے ہوئے بے اچانک پن سے ہنس رہی تھیں۔ اب غالباً "مرل ہیوٹن" کا اظہار قہر کرشماتی سیٹ سے اتر آئے اور مختلف لوگوں کو کچھ ہدایات دینے لگے۔

خود پر غلطی سے ہوا۔ "میڈم آرمی ہیں۔ میڈم کمری ہیں۔" پھر دوبارہ نکلا۔
اور خود پر سکوت سے چھا گیا۔

میٹم بھلا بھشتی کی حدود میں آئیں تو میں نے اسے دیکھا۔ وہ ایک دراز قد عورت

آگے بڑھ کر ایک سیلہ تختی کمرے کے سامنے کر دی اور ساتھ ہی ہاتھوں پر کھڑکے کھڑکے
تھری ایجنٹ ٹیکہ دینے والی تختی پر بھی چاک سے بھی لکھا تھا۔ کمرے کی درمیان میں کھڑکیوں
مٹائی دیکھ کر کمرے کی در سے کئی دور ایک لوسٹ اسپیڈ پر ایک رنگ گہرا سا رنگ
ہوا میں بھول رہا تھا۔

سیلہ لہلہا میں بیٹس ڈاکو تالاب کے کنارے پہنچے تھے۔ تختی کمرے کے
سامنے سے پہنچے ہی انہوں نے لہلہا ہانڈلڈ انداز میں تالاب کو پار کرنے کے لئے
چلا گئیں۔ وہ تو بڑی جلدی سے چلا گیا تھا۔ ایک لہلہا کے پہلی طرف پہنچ کر
لڑکھ گیا اور خاصی پور کواڈ میں کراہ اٹھا۔ چوتھا تالاب ہی میں گر گیا۔ میں بھی دیکھی
سے ان کی حرکت و سکت کا جائزہ لے رہا تھا۔

ٹیکہ۔ "کرشنا کی قصہ بھری کواڈ گونگی۔ قاری شاہ پک کر آگے آیا تو کرشنا
نے بھرتے ہوئے کہا۔ "تو برسر کرشنا کی تم ۲۱"

مٹی تو ٹیکہ خاک نام کیا تھا ان کم بختوں نے۔ قاری شاہ نے کہا اور اپنے
اوپر پر گولے لگ کر گرنے والے اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن جو تالاب میں گرا تھا اس کی
موج پانی میں بھیک کر ڈھلک گئی تھی۔ ایک میک اپ میں نے آکر اس کی موج و دست
کی۔ قاری شاہ نے انہیں ڈانٹ ڈیٹ کے ساتھ مزید ہدایت دی۔ خود چلا گیا کہ کر
دکھائی۔ وہ واقعی اس قسم کے کھول میں ماہر معلوم ہوتا تھا لیکن گرنے والے دلوں کوئی
اس ٹیکہ پر عمل نہیں کر رہے تھے۔

میرے خیال میں انہیں ایک دوسری ٹیکہ سے چلا کر گولے کی ضرورت تھی
لیکن قاری شاہ اپنے ہی طریقے پر اصرار کے جامد تھا۔ آخر ایک بار چاند نے کچھ طریقے
سے تھاپا دی کہ کر چلا گیا۔ کئی تو سینے دیوار ٹوٹ ہوئے۔ اس بار پھر ایک کوئی کر
پڑا۔ اس طرح یہ سینے پانچ مرتبہ ٹیکہ ہوا لیکن لوگ نہ ہو سکے کرشنا کا پاؤں چمک گیا تھا
اور وہ قاری شاہ کو بھی مٹی مٹی سا رہے تھے تازی شاہ انہیں دیکھ کر کے اپنے گویوں کی
طرف غفلت کر رہا تھا۔

ایک بار تو میں نے دیکھا کہ حرم کواڈ بھی سنی۔ وہ کرشنا کو کواڈ دے کر کہہ رہی
تھی۔ "آپ سیدھے سارے انداز میں چلا گیا کیوں نہیں گویا لیتے۔ انہیں قادیانوں کھلائی
نہو رہی ہیں؟"

"اس کے بلیر سارا ڈولہ ختم ہو جائے گا۔ ہمیں کیا معلوم ہوسکے؟ یہ سینے میں
طرح تھا ہے۔" کرشنا نے جی کر جواب دیا۔ "سیدھے سارے طریقے سے تو میں بھی
چلا گیا کہ سکتا ہوں میں نے ان "ہاں ہاں" قانونوں کو دو سو روپے دیا ڈی پر کس لئے پایا

تھی۔ اس کے جسم میں مہارت بھی تھی اور مہارت بھی شیرینی اور صحتی کا اخراج۔ قادیان
ہو چکا تھا کی امیدوں کا نتیجہ تھا۔ سولی سولی سیاہ آنکھیں جن میں اگر کابل نہ لگتا ہوتا
تو بھی وہ شاید ایسی ہی نظر آتیں۔ بھرتے بھرتے ہونٹ سانس اور بے پناہ پر کشش رنگت
اور تکریمات کھنکھناتے ہوئے ہیں۔ یہ اس کی دل کشی کی بنیادیں تھیں۔

میں نے اس کی ایک کہہ فلم دیکھی تھی۔ ان کے سینے میں کھل تو کھڑے ہی تھے جو
فلم کے پردے پر نظر آتے تھے مگر اس کی شخصیت اس ایجنٹ سے مختلف تھی جو اسے پردے
پر دیکھ کر ان میں ابھرتا تھا۔ نظری طور پر وہ لپٹے کس سے کم خواہش تھی مگر احساس
کے پانے سے قاپا جاتا تو وہ حقیقی زندگی میں لڑاؤ پر کشش تھی۔ لپٹے فلم تر معوی پنا
کے پورے اس نے سلیہ سانس کا ایک خوب سا چکلا لہلاہ پن دکھا تھا جس میں اس کے
جسم کی شاگ گل کی سی پک پر ہر قدم پر کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہی تھی۔ اگر اس نے
پاؤں کی پٹا نہ ہا رکھی ہوتی تو پٹیاں کیا گلیں گزرتا کہ گلیاں گزرتی ہیں اس کے ساتھ
ساتھ چلی رہی ہیں۔

پٹے سے احساس قاصر سے اٹھی ہوئی گردن اور چہرے پر بھلی ہوئی ایک جیب سی
پاس امید بھری نے اس کے خدو خالی کے گرد گری محسوس کا ہار سا پٹا دکھا تھا۔ بھلی
کرشنا کے اگر وہ چال اور ان پڑھ تھی تب بھی اس کی ایک ایک جھنجھ میں صدیوں کے
تھکن کا قریب تھا۔ وہ جیب غور و برہم نہیں گئی تھی۔ اس لائق خود تھی کہ اسے مجھ
خود ہو کر محسوس کیا جاتا۔

اس کے پیچھے ایک تلوار تھی جس نے اس کی شکل اور چہرہ ایک دیو الہا دکھا تھا۔
ایک نو عمر لڑکا تھا جس نے جوا میں قسم کا بھلی بکس الہا دکھا تھا۔ وہ دلوں کرسیوں کے
قرب ہی رک گئے اور دیکھا سیدھی کرشنا کے سامنے پہنچی تھی۔ کرشنا نے ایک بھی
مسکراہٹ سے اسے نہسکار کیا۔ اب ان کے چہرے پر جامد پن کا کس نام و نشان تک
نہیں تھا۔ دیکھا نے بھی خاصی گرم جوش سے انہیں نہسکار کیا۔ مگر اس کی گرم جوشی میں بھی
ایک ٹھنڈی تھا۔ وہ دلوں بیٹ پر چلے گئے۔

کرشنا کا اسٹنٹ بھی ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ دلوں خاصی دیر تک دیکھا سے
پائیں کرتے رہے۔ قادیان "سین بھا رہے تھے۔ دیکھا دیکھے دیکھے سے بھی انداز میں سر
ہلاتی رہی۔ پھر ایکسٹرا لوگوں کے جھرمٹ میں غائب ہو کر چلی گئی اور کرشنا اور اسٹنٹ
بیٹ سے اتر آئے۔ مگر کیمو میں ٹرل پر کمرے کے قریب شعل سبھل کر بیٹھ چکا تھا۔
ایک مٹی زانی کو دکھا گئے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

"سائنس پلین۔ لائیس کن۔" کرشنا کی کواڈ گونگی۔ لہ لہا کس روغن ہو گئیں
اور خود پر سہارا افراد کی جھنجھٹ قسم گئی۔ "کیپ" کرشنا کی کواڈ گونگی ایک آدمی نے

جسے گدھوں کی طرح دو تہیں بھالنے کے لئے؟
مجھ سے نہ رہا گئے مجھے قلمی دنیا کے طور طریقوں وغیرہ کا تو کچھ لحاظ علم نہیں تھا، بس
یہ نئی لاہلی انداز میں آگے جا بیٹھا۔

”میرے خیال میں تم صحیح طرح نہیں آتا رہے۔“ میں نے قاری شاہ سے کہا۔
”تم کون ہو میاں؟“ وہ پلٹ کر دھاڑا۔ ”مگر کہاں سے آئے ہو مجھے طرح
سمجھانے؟“

”میں تمہاری طرح لاٹرو نہیں۔ میں تو دوستانہ طور پر مٹھوں دینا چاہتا تھا کہ اگر تم
ایک اور طرح استعمال کرو تو یہ ہمارا اس سے بھی زیادہ کوئی چھلاگ لگا کر کتاب کے پار
بچ سکتے ہیں۔“ میں نے اُست سے کہا۔

وہ بری طرح کھینچا ہوا تھا اور ساری جھنجھوٹ شاہ مجھ پر ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے
انداز میں اس نے سب کو مخاطب کیا۔ ”ایک تو ہر لڑکا لڑکا استاد بنا پڑتا ہے۔“ پھر وہ
انگوٹوں سے میرے ٹھوڑی چھوٹے ہوئے خاص قلمی انداز میں ہلکا۔ ”میں چاہوں تو ایک
ٹھوکر میں تمہیں بھی کتاب کے پار پہنچا سکتا ہوں۔“

اس نے جھنجھوٹ کے ساتھ لیکن بڑے ماہرانہ انداز میں جگہ گھمائی میں نے
قد سے پیچھے ہٹ کر اسی جگہ سے بچا کر اسے کتاب کے پار اچھل دیا۔ وہ بچنے کے بل
دوسرے کنارے پر جا گر۔ سر کے بل گرنا تو بھیجا ہوا تھا ایک بار تو اس کی ریزہ کی ٹوٹی
کے تمام ٹکے جھنجھٹا اٹھے ہوں گے۔ شاید وہ سمجھ ہی نہیں سکا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا
ہے۔

چہرے کے تک وہ چپ چاپ آگئیں جھپکا رہا۔ پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھا اور کتاب
کے پانی میں چھپ چھپ کر آٹھوٹا ہوا میرے سامنے کیا ایک لمحے کے لئے تو وہ میری
آنکھوں میں آگئیں ڈالے کھڑا رہا گویا فیصلہ کر رہا ہو کہ میری گستاخی کی مجھے کیا سزا دے۔
پھر اس نے کھلی کی سی پھرتی سے میرے کھمبے پر پیچے رسید کرنے کے لئے ہاتھ گھمایا۔ یہ ہاتھ
عامیانہ وار تھا میں نے اپنی جگہ سے حرکت کئے بغیر یاد پر یہ وار روک لیا۔

وہ کوئی اور وار کرنے کے لئے اچھلا لیکن یہی لمحے کرشماتی قلم میں گھسے۔ ”ہندو کہ
کھٹا کھٹی۔“ انہوں نے قاری شاہ کو بھاڑا۔ ”مگر کام نہیں آ رہا اور کوئی بتا رہا ہو تو سیکھ لیتا
چاہیے مگر تم ماسپت قاریوں کو اتنی فطرت نہیں ہوتی۔ چار دلوں سیکھ کر میڈیک کی طرح چند
پھلا کر آجاتے ہو اسٹوڈنٹ میں۔ اندھوں میں کھانا رکھنا۔ یہاں کسی لڑکے نے خواب
میں بھی اکمالے کی شکل میں دیکھی ہوئی۔ ہاتھ جا کر کرسی پر چھو اور چار چھار کا ایک
سگریٹ ہے۔ اتنی دیر میں میں اس بات کے کی مدد سے سین ٹوٹ کر اُڑا۔ ہاں۔

شاہ۔ ”انہوں نے قاری شاہ کو پہلے دھکیلا۔

وہ خاموشی سے کرسیوں کی طرف بڑھ گیا۔ تو کرشماتی میری طرف حوجہ ہوئے۔
”ہاں تو یہی تم کو کسی ٹیکسٹ کتاب سے تھے؟ ذرا سمجھو تو۔“ انہوں نے ان باتوں پر ہماروں
کو۔ ”انہوں نے ڈاکٹروں کی طرف اشارہ کیا جو چھلاگ لگا کر بے حال ہو چکے تھے۔

کرشماتی کا انداز خطاب ایسا تھا گویا وہ اپنی دیر سے مجھ سے ہم کلام تھے اور میں
انہی کے محلے کا کوئی رکن تھا۔ میں نے ڈاکٹروں کو اپنے قریب کھڑا کیا اور پہلے خود انہیں
چھلاگ لگا کر دھکیلی جب میں کتاب کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر سیدھا کھڑا ہوا تو میں
نے دیکھا وہاں ایکسٹرا لڑکیوں کے جھرمٹ سے نکل کر باہر دروازے کی سیڑھیوں پر کڑی جھب
ی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی گہری کالی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک تھی۔ ایک
لمحے کے لئے ہماری نظریں ملیں۔ پھل کا سر رکھنے والی ان آنکھوں کے پھوٹے سے میں
نے ہنسل اپنے آپ کو چھڑایا اور الٹی چھلاگ لگا کر کتاب کی دوسری طرف آگیا۔

میں نے غصوں کیا کہ کتنی ہی سادگی آنکھیں فلف سہوں سے مجھے گھور رہی
تھیں۔ میں نے اب ڈاکٹروں کو چھلاگ لگانے کا دوسرا طریقہ کھلیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔
طلبہ بڑے حوش سے میری طرف پلکا اور میرا ہاتھ پیچھے ہونے ہوا۔ ”تم تو چھو
رستم لے مارا! تمہیں تو اسٹوڈنٹ میں بڑا کام مل سکتا ہے۔“

”مگر مجھے یہاں کام کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔ آؤ چلیں۔“

”چلتے ہیں۔ اورا فھر چلو۔“ طلبہ نے مجھے روک کر شہابی نے ڈاکٹروں کے آگے دھا
کے پیچھے چلانے اور اس کی سیڑھیوں کے تیز ہونے کا سین ٹوٹ کر لیا اور قہرغ ہونے
ی سیدھے میری طرف آگے مجھے کرسی ٹوٹ کی اور میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہوئے۔
”توہ ان تم کون ہو؟ کیا کرتے ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“

”میں میں کوئی بھی نہیں ہوں! کچھ بھی نہیں کرتا اور کہیں سے بھی نہیں آیا۔“ میں
نے سادگی سے جواب دیا۔

”ہمت خوب۔ ہمت خوب۔“ ان کی غصوں خاموشی انہی کے ساتھ ان کی توجہ
مختصاتی۔ ”میتا نہیں چاہیے۔“ پھر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو دوستانہ طور پر تمہیں مٹھوں
دنا چاہتا تھا کہ تم لڑکوں کے لئے فٹ انٹرسٹرکٹ کے طور پر کام کیوں نہیں شروع کر
دیتے؟“

”میں میں مجھے کیا مل جائے گا۔“ میں نے ہاتھ فلف پر پھل۔

”کچھ کام نہیں جا سکتا۔ اب قلم کہیں میں ملازم رکھنے کا مبالغہ تو کم ہو گیا ہے۔

کندھے اچکاتے

لوہے کی رہائی میں ہم چھوٹے چھوٹے کھول کی ایک قطار کے قریب پہنچے ایک کمرے کے دروازے پر رک کر لوہے نے اچھائی شانہ اور مطریت خوبانہ لیے میں طبلہ سے کہ "کمپ باہر ہی قہقہے لگ میڈم اکیلے میں فن سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔" لوہا خود بھی باہر ہی رک گیا اور اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

ایک نظر ملاحظہ کرنا تھا۔ دروازے کے ساتھ ایک بڑی سنگھار میز تھی جس پر ایک لمبا کاغذی رول کا اقسام کا سامان بکھرا ہوا تھا اور اس کے سامنے ایک لمبی کرسی پر دو سگریٹ سٹیل بیچی تھیں۔ اس کی ڈال کرسی سے مجھے بھول رہی تھی۔ سنگھار میز کے آگے پر دو بڑے بڑے بلب نصب تھے۔ فن کی روشنی کینے سے بھی منکس ہو رہی تھی اور چھوٹا سا کمرہ کچھ لالہ لعل روشنی سے بھرا ہوا لگ رہا تھا۔

میڈم دیبا کے ہال کھلے ہوئے تھے اور اب وہ پہلے سے کچھ مختلف سی لگ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی اس کی خلاصہ کرسی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ سنگھار میز پر تھا ہوا تھا پور ایک ہاتھ میں سبز جلد کی ڈائری تھی۔ اس ڈائری کو دیکھ کر میرے ذہن میں سیاہ جلد والی اس ڈائری کا خیال ایک درد کی طرح ابھر آیا جو میں نے مجھے دی تھی اور جو میرے لئے کمپ ایک حلقہ گم کشہ بن چکی تھی۔ اس کی کششگی کا نامور فراموشی کے چاہے تھے ایک بار پھر اس اٹل ایک لمبے کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ شاید میں کی صبح اب بھی اٹلتے لیجا میں کہیں سے نکلتی وہ قراہ پھر رہی ہے کہ انہوں نے سراسر راتوں کی جو کائنات میرے بچہ کی تھی میں اس سے آشنا نہ ہو سکتا۔

طے سے اٹھنے والی ہے عنوان سی ہوگ کو دیا کر میں نے دیبا کی طرف دیکھا۔ حوالہ ملی اظہار دلانے اس کے ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر رکھے ہوئے تھے اور وہ ساکت بیٹھی میرا سر اپا جانے لے رہی تھی۔

"بیٹہ جی۔" بلا اثر اس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ میں اس کے سامنے دو سری کرسی پر بیٹھ گیا وہ قدرے نیچی تھی۔ "تم باہر جاؤ۔" اس نے خاور کو حکم دیا۔

میں کیا ہم سے قصارا؟ خاور کے جانے کے بعد اس نے پرچھال اس کی کوار سرگوشی سے بلند نہیں تھی۔ مگر سرگوشی گویا میرے تھکن کے قریب ہی ابھری تھی۔

"مستور مٹل" میں نے ایک لمبے کے وقف سے کہا۔ میں نے اسے اپنا نام طانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔

"یہا شعلی سا نام ہے۔ طلی پر نور دے کر یوں پڑا ہے۔" اس کے لہجے پر

سب لوگ آزادانہ طور پر کام کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے سارے غریب و غنیو لال کر نہیں تھیں ہزار روپے میں بیٹھ کر بیچا کرے گا اور بعض اوقات ٹھوں کی ایسی لائن لگتی ہے کہ کوئی دو ٹھوں ہاتھوں سے کٹا ہے۔" کرشنکی نے کہا۔

"میں مطریت چاہوں گا کرشنکی! دراصل اسٹیج و میں کام کرنا میری طبیعت سے مطابقت نہیں رکھتا۔" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا اور پھر اہارت طلب کر کے طبلہ کے ساتھ طور سے باہر آگیا۔ وہاں روٹیاں بچھ چکی تھیں اور نہ جانے کس میز اس ماحول میں واقعی دم گھٹ رہا تھا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا یا را" طبلہ نے باہر میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ کرشنکی کی مدد سے کام شروع کر رہے تھے۔ کسی دھند سے تو گتے۔ پھر کو کے کہ بیکار پڑے چڑے بدن لڑنے لگا ہے۔"

"تم بے فکر رہو طبلہ! مجھے لگتا ہے کہ میں اب لیوان عرصے بیکار نہیں رہوں گا۔ میں کسی اور قسم کا راستہ چاہتا ہوں۔ ٹٹ پر نیچا قسم کے کام مجھے پسند نہیں۔"

ہم راستے میں ایک فوارے کے قریب دیوار سے ٹک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دور ایک فن میں شغف ہو رہی تھی۔ ایک صاحب گھوڑے پر بیٹھے اور ہار اس کی لکم کھینچ کر زندگی اس کی گھٹن ہلا رہے تھے۔ گھوڑے کے دائیں طرف کیوس کا ایک بڑا سا درم ایک روٹیلر بکھایا جا رہا تھا۔ درم پر رنگ برنگے متاعز ہاڑ اور درخت بنے ہوئے تھے اور اسے گھما کر یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ گھوڑا ایک ہی جگہ نہیں کڑا بلکہ جیڑی سے بھاگ رہا ہے۔ درختوں اور پھاٹوں کو پیچھے چھوڑتا جا رہا ہے۔ شغف میں یہ دشواری پیش آرہی تھی کہ گھوڑا ہار ہار گھٹن ہٹا کر لال کی گھاس چرے لگتا تھا۔

کلی ہوا میں چند گہری گہری سانسیں لے کر ہم آگے بڑھے ہی تھے کہ کسی نے عتب سے نوازی۔ "اورا بھئی" میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہی کس سا لوہا اپنی طرف پکا آ رہا تھا جسے میں نے میڈم دیبا کا چھٹی بکس اٹھائے دیکھا تھا۔

"میڈم دیبا کمپ کو بلا رہی ہیں۔" قریب آکر وہ مجھ سے خطاب ہوا۔ میں نے طبلہ کی طرف دیکھا۔

"خدا خیر کرے۔" وہ کندھے اچکا کر رہا۔

مکمل ہے وہ؟ میں نے لوہے سے پرچھال۔

"اسپتہ میک اپ دوم میں۔" لوہے نے جواب دیا۔ "میرے ساتھ آجائیے"

ان ساہر آنکھوں کے تصور میں میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔ "تل لپٹے میں کیا حرج ہے؟" میں نے مشورہ طلب ٹھوں سے طبلہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک بار پھر

دوسرے کنوڑ کا سارا اور بھی پہلے بنا دیتا ہے۔ اور سنو میں نے تمہیں حضور لپٹے کے لئے نہیں بلایا۔ دیتا چاہتے ہو تو مجھے اپنی بے جگری دے دو، شہ لادری دے دو، پناہ دو، قحط ہو، میں ان کی قیمت تو نہیں دے سکتی، مگر دنیاوی ضروریات کے لئے دس ہزار ملتان دے سکتی ہوں۔ کھانا میرے ساتھ دسٹر خوں پر کھاؤ گے، رہائش میرے پتھر کی اچھسی میں ہوگی جس میں اس فرض سے لپکا خون بھی موجود ہے۔ کہ کسی بھی وقت ضرورت پڑنے پر تمہیں بلایا جاسکے۔ اگر تم دیکھو ہی غصت ہوئے جیسا میں تمہیں دیکھتا چاہتی ہوں تو پھر میرے اور تمہارے درمیان کوئی حساب نہیں ہو گا، جو میری بے لوثی ہو گا تمہارے لئے کر دیا گی۔ غصوں میں آنا چاہو گے تو میں تمہاری سطرش کر دیا گی اور فی اللہ کسی دشا میں میری سطرش پختی ہے اور نہ بھی چلے تو میں تمہارے لئے ذاتی قلم اٹھائیں کر دیا گی، اور تمہارا کوئی مسئلہ ہو گا تو داسے، دے دے، ملے اس میں مجھے اپنے ساتھ پناہ کے، بولو کیا کہتے ہو؟



ستراہٹ صبح کی پہلی کرن کی طرح دھیرے دھیرے ظہور ہو رہی تھی۔ نہایت ہی ہے حضور! اس نے سرکری کے پتے سے نکال دیا۔ مگر میں بھی حضور ہی۔ دولت مند لیکن نہایت کنوڑ عورت ہوں۔ وہ عورت بہت ہی کنوڑ ہوتی ہے جو دنیا میں تھا ہو۔ میرے اور گرد انسانوں کا دھوم ہے مگر میں نما ہوں اور کچھ لوگ میرے دشمن ہیں میری گھلت میں ہیں۔ میری جان کے دہپے ہیں۔ جب میں مرنا چاہتی تھی تو کوئی مجھے نہیں مارتا تھا اور اب مجھے زندگی سے کچھ انسیت ہو گئی ہے اور میں کسی ہوئی ہائی کی طرح زندگی کے دامن سے ہٹا ہوتی ہوں تو کچھ لوگ یہ فحمت مجھ سے چھین لیتا چاہتے ہیں۔ اس نے ایک طویل سانس لی۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی مضبوط اور بے جگر مرد جو سائے کی طرح میرے ساتھ رہے، اس وقت تک میری حفاظت کرے جب تک زندگی میرے لئے بقاء ہے۔ وقت نہیں ہو پائی۔ لیکن وہ شخص جس نے کونڈ اور چہرہ آسمانوں کی خاطر اس قریبے کو اس طرح نہ بھلے جس طرح چشمہ در چہ کیدار راتوں کو ڈھالے کر گلیوں میں گھومتے ہیں لیکن اپنے سے طاقتور چوروں کو دیکھ کر کئی کھڑا جاتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی میری اس طرح حفاظت کرے جس طرح اپنی جان کی کی جاتی ہے اور وہ اس کا دل بھی ہو۔ گزشتہ دو سال میں میں نے کچھ ایسے دیکھے ہیں چار آدمیوں کو غلاموں کی طرح نہیں، اپنی کی طرح رکھتے ہیں وہیں مارتے تھے بڑے لڑاکے حضور تھے ہائی بے جگری کی باتیں کرتے تھے، بڑے لپے چڑھے جو میں تھے لیکن جب میری خواہش گاہ کا دروازہ توڑا گیا، جب میری کار پر فٹ سڑک پر گولیاں چلائی گئیں، جب مجھ پر حیراب کیجئے کی کوشش کی گئی تو میرے کسی ساتھ سے اتار بھی نہ ہو سکا کہ حملہ آوروں میں سے ایک آہ کو ہی کھار کر سٹکا۔ تاکہ میں اپنے دشمن کے خلاف پولیس کو کوئی ثبوت تو دے سکتی۔ مجھے معلوم ہے میرا دشمن کون ہے مگر میں اس کا کچھ نہیں پتا نہ سکتی کیونکہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ وہ خاموش ہو گئی اور نیم دا آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں کچھ بولوں۔

”اگر تم کنوڑ اور عمارت تو شادی کیوں نہیں کر لیتی؟ کوئی مضبوط سارا اصول کر۔“

میں نے پہلے بار ہی اسے تم کہہ کر قابض کیا۔

”وہ دھیرے سے انہی اسی کی ہنس بگنی سے مضطرب تھی۔“ شادی میں میرے لئے کوئی کشش نہیں رہی۔ میں کسی دنیا میں آنے سے پہلے شادی شہر تھی۔ اب کچھ سواہ دانا ہیں جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی وہ دین عین کاٹنی ہڈوں پہلے ہی موجود ہیں۔ غیر کاٹنی ہڈیوں کی تعداد کا مجھے علم نہیں۔ میں کسی کا واقعہ بدلنے کی خاطر اس کی خواہش کی نہت بنانا نہیں چاہتی۔ کچھ شخص ہیں مگر وہ کنوڑ ہیں اور ایک کنوڑ کی

مری باتوں پر۔

"خطرناک ہے تک۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تو پھر میری شکل کے جواب میں کیا کہتے ہو؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت چاہیے۔" میں نے جواب دیا۔

"میری قسمت معلوم تو ہوتی ہے کہ فیصلہ تم نے کر لیا ہے۔ لیکن خیر۔ اگر مختلف پارے کرنے چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔" اس نے شال کندھوں پر کھینچی لی۔

"میں اس اسٹوڈیو میں چھ بیچے تک شوٹنگوں میں مصروف ہوں۔ تم اس دوران گھومو، بھوکے سوچنے کو کچھ باقی ہے تو سوچو۔ کسی سے مشورہ کرنا ہے تو کر لو۔ میں چھ سے سات بیچے تک اسی میک اپ روم میں انتظار کروں گی۔ اگر فیصلہ بدل نہ لو تو آہٹا۔"

"میں اٹھا لوں یا ہر ایک۔ طلبہ برکدے میں ایک ستون کے قریب بیٹھا کتے جانے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کسی خاص شخص یا اشتیاق کا اظہار نہیں کیا۔ خاموشی سے اٹھ کر میرے ساتھ چل دیا۔ فوارے کے قریب پہنچ کر ام لان پر بیٹھ گئے۔

"کیا بات تھی؟" اب اس نے درم لہجے میں پوچھا۔ میں نے بے جا کم و کسر اسے سب کچھ بتا دیا اور آخر میں پوچھا "تم کیا مشورہ دیتے ہو؟"

"تم نے کیا سوچا ہے؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

"میں نے سوچا ہے کہ اس ٹیل کش کو لٹل کر لوں۔"

"میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہہ دیا۔" میں چل کر اس میں وہ تمام چیزیں نکالتی ہیں جن کی فی الحال مجھے ضرورت ہے۔ میں نے مستقبل کے بارے میں کچھ اہم پروگرام بنائے ہیں جن میں سے ایک اچھا آغاز چاہیے۔"

"ایک بار پھر سوچ لو۔" طلبہ نے درم لہجے میں کہا۔ دنیا یہاں پر سے گئے لوگوں میں "معاذ" اور ان پڑھوں میں خطرناک عورت کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ساتھ رہنے میں ایک نقصان ہے کہ لوگ حد پر تو تمہاری بڑی عزت کریں گے لیکن بچے بچے بڑی حقیر کریں گے۔ ذاتی اڑائیں گے۔"

"بچے بچے تو لوگ بادشاہوں کو بھی گالیاں دیتے آتے ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے کہا۔ "مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ اس کام میں مجھے میری ضرورت کی ہر چیز مل رہی ہے۔"

"تمہاری مرضی۔" اس نے کندھی اچکاتے۔ "تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اب تک تم مجھے کئی پندرہ سم اور صحت مند لڑکیوں کو کسی نہ کسی بدلے لازم رکھ چکی ہے مگر زیادہ دن نہ کی کسی سے نہیں بنی۔ بہر حال۔" اس نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ "میں میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی بات منوانا چاہتی ہے۔"

"انہوں میں آنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ بات ملازمت کی نہیں دو انہوں کے درمیان ایک بے نام رفاقت کے رشتے استوار کرنے کی ہو رہی ہے۔"

"ہاں" اس نے ہاتھیں کمال اور اس کی آنکھیں گھبراہٹ سے بھر گئی ہیں۔

"یہ بات مجھے پسند آتی ہے۔ لیکن تم نے کیا سوچ کر اتنی وضاحت اور تعین و احتیاط کے ساتھ مجھ سے باتیں کی ہیں؟ جب کہ تم نے مجھے پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ تمہیں میرے حلق کچھ بھی معلوم نہیں اور تم نے پوچھا بھی نہیں۔"

"زمین میں ان گنت ٹھوکریں کھا کر ایک ہی فن تو سیکھا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر اوجھری سی مسکراہٹ ابھری۔ "ذات کی پہیلیاں پونچھنے کا فن۔ میں نے تمہیں غور سے دیکھا تھا اور اب خاصی دیر سے تم سے باتیں کر رہی ہوں۔ اس تمام وقت میں تمہیں پوچھ رہی تھی۔ یوں تو انسان کی ذات کا سارا حساب کتاب اس کے غور و خفا پر لکھا ہوتا ہے۔

آنکھیں تو قصداً ذات کا ردالہ ہیں۔ میں نے تمہارے غور و خفا پر کبھی ہولی کمالی نہیں دیکھی۔ یہ لوگ آنکھوں کے ردالہ سے انداز کر رہے ہیں۔ انہوں نے تمہاری ذات کی بھول چلیں گی۔

توڑی سی پیر بھی کی ہے۔ کو تو ظہر کچھ چھو؟"

"ہاں" میں نے قدرے دلچسپی سے کہا۔

"تمہاری رنگوں میں شعلہ خنیاں دوڑ رہا ہے۔" اس نے گویا لوگ لہان سے ذات کی گریں کھولنا شروع کیں۔

"پڑھ گئے ہو۔ کچھ کل کسی مسئلے سے دوچار ہو۔ تمہارا کچھ کھو گیا ہے شاید کوئی قیمتی چیز یا کوئی عزیز الا جان۔ لیکن ان سب باتوں میں کئی نواہ دیکھی نہیں۔ مجھے سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا وہ یہ کہ تمہاری ذات کی بھول چلیں گی۔ انہوں نے کسی غور کا نام و نشان نہیں ہے۔ تم ایک بے خوف انسان ہو اور یہ انسانوں کی ایک بات ہے۔ ہر انسان کے قصور یا لاشعور میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی غور کا سچا پلا رنگ ہوتا ہے۔ پتہ کیا مجھ میں پڑھ عورت کا یہ معاملہ درست ہے؟" اس نے کرسی کے پٹے پر

چند لمحے خاموشی رہی پھر میں نے کہا۔ "مستقل طور پر تو مجھے بھی اس کام کی ضرورت نہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری حوصلہ تو درحقیقت کچھ اور ہے جو نہ جاننے مجھے کب ملے گی۔ نی اٹل تو مجھے صرف تنہائے کی سلسلہ چاہیے۔"

"تھک ہے یا رہا ہے۔" طیلہ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "تمہیں یہ سارا مبارک ہو۔ کبھی کبھار ملنے دیا کرتا۔ میں انہیں دفنوں ہی میں تم سے کچھ ایسی الیت ہو گئی ہے جیسے تم مجھ کے دوست ہو لگو لے ہو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو یا رہا ہے؟" میں نے طرول سے اس کا ہاتھ دھوا۔ "تم صرف چند دن غور جوت پھر دیکھنا میں تمہارے لئے کیا کرتا ہوں۔ ہمیں صرف ملنے ہی نہیں رہنا ہے؟" ل کر کچھ ہرگز ہم بھی ملنے ہیں جن میں تم میرے شانہ بشاد رہو گے۔"

اس کے بعد کچھ وقت ہم نے گفتگو ٹھنڈی دیکھنے میں گزار دی۔ پانچ بجے کے قریب طیلہ کو ایک سین میں کچھ کام مل گیا اور وہ گیٹ اپ کرانے کے لئے میک اپ روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ سیٹ پر گیا تو اس کے کوسے بل سٹیج ہو چکے تھے۔ چہرے پر جھاڑ بھٹکار والی تھی۔ جسم پر ایک بڑا بڑا لہلا تھا۔ وہ سیٹ پر کسی صوفیانہ سے لٹنے کے بعد بل بکھرا کرانے لگا۔ اس وقت سوا چھ بج چکے تھے۔ میں نے اس سے اجازت طلب کی اور اسے کام میں مصروف چھوڑ کر دبا کے میک اپ روم میں گیا۔ وہ میری طرف تھی۔ اس کے چہرے پر مسرت ہلکا سا میک اپ تھا۔ وہ پہلے سے لہلا پر کشش لگ رہی تھی۔

"تمہارا کہیں کوئی سلمان تو موجود نہیں ہے تم ساتھ لینا چاہو؟" اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ وہ بچنے کے لئے چار تھی۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ گو کہ طیلہ کی کھول میں میرے وہ جوتے کپڑے تھے لیکن ایک تو اس وقت وہ مجھے نہایت فیرام محسوس ہو رہے تھے۔ وہ مرے میں دبا کے ساتھ کھول کی طرف جتا نہیں چلتا تھا۔

ہم میک اپ روم سے کل گئے۔ کس لڑکا اور خاور عمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ پارک لائٹ تک آتے آتے رستے میں جیسوں تو میں نے دبا کو جک کر سلام کیا۔ پارک لائٹ میں وہ قرمزی رنگ کی ایک کھور ٹھیل شہر لیٹ کے قریب رکی۔ "تمہیں ارا نیو تک آتی ہے؟" اس نے مز کرنا سے پوچھا۔ میں نے انہماک میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر تم ہی چلاؤ۔" اس نے چاویاں میری طرف بوجھائیں۔ "میرے بیٹے پر سے جیسے کوئی بوجھ سا اتر گیا ہے۔ میں ذرا دیکھیں کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ اگلی سیٹ پر میرے برابر بیٹھ گئی اور شل تہ کر کے ڈپٹی بورڈ پر دیکھنے ہوئے رہی۔ میں نے ذرا تہور دیکھنے کا بھیجیٹ ختم کر دیا ہے۔ کچھلے دنوں میرے لئے ذرا تہور نے مجھے اٹھا کرنے کی کوشش کی تھی میری شاید قسمت ہی ایسی ہے کہ میں اب تک کچھ

رہی ہوں۔ لیکن قسمت کب تک لڑی کا ساتھ دیتی ہے؟"

میں نے کبھی تہنوت کیا۔ اسٹوڈیو سے کل کر میں نے کہا۔ "راستہ ہائی جاؤ"

میں ٹھیکس سٹاپ کے بعد ہم جس سڑک پر پہنچے وہ وہیں پام کے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ اسی سڑک سے ایک بجلی سڑک پر سڑک دھوا نے لیوٹہ درجے کے ایک ہنگامے کے سامنے گاڑی رکھ لی۔ میں نے ہارن بجا دیا تو ایک ادھر عمر بھٹی ہوا پر کپڑے اڑنے آ کر گیٹ کھولا۔ پوسٹ میں جا کر میں نے گاڑی روکی اور اٹھیں بند کر دیا۔

تمہیں انجی ڈرائیو تک کرتے ہو تم۔ لگتا ہے عرصے سے کر رہے ہو۔" اس نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

"بہت راستوں سے ٹھاسلی ہو جانے کی تو اس سے بھی انجی کرتے لگوں گے۔" میں نے مبتکرا کر کہا اور گاڑی کا دروازہ بند کر کے گرو جی کا ہاتھ لیا۔ ہتھ روٹی کے دلوں طرف ہتھ روٹا لیکن قہار اور کتاہوں پر پتے پتے چل لیتے تھے جس پر درد گلوب گئے ہوئے تھے۔ نہ جاننے کس طرف سے کاشی کے پھولوں کی ایک تھل اگر پوسٹ کی پست سے بچے بھول رہی تھی۔ بائیں طرف لان پر تھوڑے تھوڑے قسطے پر سیٹ کے گول گول بچے لگے ہوئے تھے۔ ان پتہ ٹھولوں کی قطار عمارت کے پیچھے کی طرف جا رہی تھی۔

"اٹھا تمہیں انجی میں لے جائے گی۔" دبا مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "ہاں تمہاری ضرورت کی ہر چیز موجود ہو گی۔ اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا اب جا کر دبا دھو اور آرام کرو۔ میں بھی ذرا تازہ دم ہو لوں۔ تمہاری ضرورت ہو گی تو میں فون کر لوں گی۔"

"کب۔" خاور نے مجھے اشارہ کیا اور میں چاویاں دبا کو دے کر اس کے پیچھے چل دیا۔ لان پر سب سے پہلے دھندلا پر سے ہوتے ہوئے ہم عمارت کے پہلو میں پہنچے۔ انجی وہ خوبصورت آرامدہ و پراسد کھول اور پھولنے سے برآمدے پر مشتمل تھی۔ طرفہا سے ملحق ہاتھ روم بھی تھا۔ انجی میں واقعی ہر چیز موجود تھی جس کی ضرورت دبا کل اختیار کرنے کے سلسلے میں پڑ سکتی تھی۔

قریباً "ایڈو" مجھے ہوا جب کہ میں نما دھو کر اپنا طیلہ درست کر کے بیٹھ رہا تھا۔ دھماکے کے ساتھ ایک انگریزی رسالے کی برقی گردانی کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔

"کھانا کب کھانا پندر کو گے؟" وہ سری طرف دبا کی پوچھل سی سرگوشی سنائی دی۔

"جب تم کھاؤ گی۔" میں نے کہا۔

"تو پھر تم آئی ہو۔" میں کھانا کھانے کی تیاری کر رہی ہوں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے اٹھ کر رسالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں جائزہ

ہا ہے کہ رفتہ رفتہ تم مجھے اور میرے درد کو سمجھ لو گے۔
 مجھے کتنی غمی ہو رہی ہے یہ دیکھ کر کہ مجھے برہوش اور غمزدہ پا کر تم نے ہر روزی جنگلے اور
 دلا سے دیتے دیتے میرے ہاتھ میں مجھے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے پہلے میں نے جتنے بھی
 روکا اس نے سوچ پاتے ہی ایک ہی ساعت میں تمام مہلے طے کرنے کی کوشش کی۔ لیکن
 کے خیال میں میرے امرا و اطوار کلی دعوت کے اشارے تھے۔ میں نے یکے بعد
 دیکھے انہیں رخصت کر دیا اور رقم اضافی میں میں عیاش مشہور ہو گیا۔ میں نے
 میں عیاش نہیں ہوں مہسورا۔
 اس کے لیے میں عورت آئی اور چوہاں سرخ ہو گیا گویا میں نے اس پر کوئی
 الزام لگایا ہو اور وہ اس کی تردید میں اپنا زور بیان صرف کرنا چاہتی ہو۔ میں نے مجھ میں
 عیاشی کی سکت ہی نہیں ہے۔ مجھ میں تو عشق کی سکت ہی نہیں ہے۔ مجھے اپنا آپ کو کھلا
 کو کھلا سا لگتا ہے اور وہ دم غلط کا احساس مجھے اور بھی ہو لائے رکھتا ہے۔ اور میں اس
 لئے میں آپ تک ایک مضبوط سارے کی تلاش میں تھی۔ ایک دوست جو مجھے دنیا والوں
 کی نظر سے نہ دیکھے۔ میری اپنی آنکھ سے دیکھے۔ میرے ظل غلام میں پتھریں مارتے
 خوف کو ٹٹل چیکے۔ اس کے ماتھے پر پتھر کے قطرے ابھر آئے تھے اور وہ اپنے سینے میں
 چھتا سدا غبار ہے وہ جہلوں کی قتل میں آگ لے رہا چاہتی تھی۔
 "وضاحت کی ضرورت نہیں۔" میں نے نرمی سے اس کا کھیرھا تھپک۔ "آپ سوچاؤ
 اور ساری باتیں اور پتھریاں دامن سے جھٹک دو۔ گو یہ ممکن تو نہیں مگر کوشش ضرور
 کرو۔ فرض کر لو کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کی قمیص تلاش تھی۔ رفتہ رفتہ شاید قمیص
 چین بھی آجائے۔ آپ بس سوچاؤ۔" میں نے اسے کراٹ دیا۔
 "مجھے چین آتا جا رہا ہے۔" وہ بیوقوفی اور آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گئی۔ باہر
 نکلے سے پتھر میں نے دوبارہ اس کا ہاتھ لیا اس کا ہاتھ کاٹا لہجہ صبر اور اتویک تھا۔
 اندر سے لیور دہانے سے کل سکنا تھا جب کہ باہر سے اسے صرف چٹائی سے کھولا جا سکتا تھا
 کوئی پشیل و خیمہ نہیں تھا۔ میں نے کمرے پر اودھائی نظر ڈالی اور باہر آکر دوبارہ بند کر دیا۔
 تک کی بھی سی آواز کے ساتھ تلا بھی بند ہو گیا۔
 اگلی صبح ڈانٹک دم میں ناشتے کی میز پر بچا سے سامنا ہوا۔ وہ گزشتہ روز کی لہجہ
 کس زیادہ تر تانہ اور پشاش پشاش نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ
 ملتے تھے یہ ملتے میرے امرا سے کے مطابق خالص پرانے تھے لیکن کل ایک آپ کی تھی
 میں مجھے نظر نہیں آتے تھے۔
 "راست میں پھولیا آجاندوں اور ٹکیوں کے طراب دیکھتی رہی۔" اس نے میرے
 کب میں کئی اوز پختے ہوئے ایک مصلحتی مسرت کے ساتھ مجھے بتایا۔ "اس سے

مکمل ہے یہ مہلے یہ دولت یہ شہرت بہت جلدی تھیں ہیں جو اس کی بدولت مجھے ملی
 ہیں۔ وہ مجھے کہیں ملے تو میں اس سے کتنا چاہتی ہوں کہ یہ سب کچھ مجھ سے لے لے لے
 اور میرا ہاتھ لگا کر مجھے لوٹا دے جس میں میرے محسوس بچے کی فکراں کو بھی نہیں
 اور جس میں میرا دنیا مگر محبت کرنے والا شوہر انکار کیا کرتا تھا۔"
 دولت اسے لار کی کھانسی آئی۔ چٹکنا ہوا گلاس اس نے میرے پیشے پر ہلکا ہوا اور
 برابر دلی کرسی پر چڑے لیٹ چکے۔ سے ایک فحاشی نکل کر اس میں سے ایک گولی نکال اور
 منہ میں ڈال کر چمتے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ کچھ پر سکون ہوئی تو میں نے دیکھا اس کے
 رخساروں پر آنسوؤں کی گیریں بہت رہی تھیں۔ کچھ کے بغیر وہ اٹھنے لگی مگر کرسی سے اٹھنے
 کر ہی طرح لڑکھرائی۔
 میں نے اٹھ کر اسے سارا دیا۔ اس کا جسم بری طرح تپ رہا تھا۔ "تمہیں بخار ہے۔"
 کیا؟ میں نے پوچھا۔
 "نہیں۔ میرے جسم میں ماضی کی چٹا جلی رہی تھی۔" وہ محسوس انداز میں
 مسکرائی۔ "مجھے بڑے دم میں پچھا۔"
 میں اسے سارا دے کر بیٹے دم میں لایا۔ بیٹے دم کی پانی دو دھانسیں پر بھی بچوں ہی
 کی رنگ برنگی قصوریں گویاں تھیں۔ "تمہارا کچھ کہاں گیا دھوا؟" میں نے غیر ارادی طور
 پر پچھا ملائکہ میں اس کے زخموں کو کھینچنا نہیں چاہتا تھا۔
 "موتیوں سے مر گیا تھا۔" اس نے اختصار سے جواب دیا۔ گویا کئی کل داستان تھی
 میں کھانا کھا گیا تھا۔
 "اور تمہارا شوہر؟" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ سوال کیسے عمل کریں۔
 "ایک حادثے میں اس کی آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں اور آنکھوں کے ساتھ ہی گویا
 اس کی ساری قوت برداشت حاصل اور جوانمردی جلی گئی تھی۔ مصائب سے گھبرا کر وہ ایک
 روز گھر سے نکلا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔" دھوا نے کہا اور میرے ہاتھ کا سارا پھوڑ کر
 دم سے اس پر ابھر ہو گئی اور یوں سکرست کر لیٹ گئی گویا اسے گندہ ڈال سے خوف گویا
 تھا۔
 "کھانا نہیں کھاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔
 "نہیں۔ تم جا کر کھاؤ اور مجھے کھانا پھوڑ دو۔" اس نے ذوقی سی کواز میں کہا اور
 کچھ رخسار پر رکھ لیا۔ میں نے کہیں اس کی ٹانگوں پر ڈالا۔ کڑکیوں کے پردے کھینچے اور
 کمرے سے نکلے ہی لگا تھا کہ اس نے پھارل ہنسنا۔
 میں پلٹ کر اس کے قریب گیا۔ اس نے رخسار سے ہکیے ہٹا لیا تھا اور ہکیے
 نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ "تم بہت سلیجے ہوئے لو جوان ہو مہسورا مجھے قصور

مجھے پیشہ ہونے اور لڑنے خواب آتے تھے۔

”تم نے خوار خواہ اپنی ذات کو چھوڑ لو اور اپنے مسائل کو سمجھنا رکھا ہے۔“ میں نے تک اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ”دنیا میں تم سے بھی کہیں زیادہ دنگی کن محنت لوگ ہوتے ہیں جنہیں یہ سہولت بھی میسر نہیں کہ کسی کے سامنے لب کھول کر دل کا بوجھ بھار کر نکالیں۔ اگر سواڑہ کرتے ہیں تو لاکھوں انسانوں سے اپنے آپ کو آسان پاؤ گی۔“

”اپنی عمر سے بڑی بڑی باتیں نہ کیا کرو۔“ اس نے گویا مجھے ڈانٹا مگر اس انٹ میں بار بھی تھا۔ غوطی بھی لوہہ احساس قاصر بھی۔ اس نے ہاتھوں کا وہ چٹا ہا کر بیٹے پر ڈال رکھی تھیں۔ اس سیر لٹائل اور کچھ اس کی گفتگو کی بدولت اس کی عمر کا برس کم معلوم ہو رہی تھی۔

چند لمبے بعد کالی کی چکیاں لپٹے ہوئے اس نے بتایا۔ ”بھئی۔۔۔ دیر بعد لیلہ باشر آکر تمہارا دلپ لے جائے گا اور تین چار روز میں ہی تمہارے چند سوٹ و ڈیو سل کر آجائیں گے۔“ پھر ایک لمبے کے وقف سے وہ بولا۔ ”مجھے پاس احتیاطی تین سو کا روٹ اور ہے۔ وہ اپنے پاس رکھا کرو۔ اس کا لائنس مل جان کے نام پر ہے لیکن تم ہر حال ضرورت پڑنے پر اسے بلا خوف و خطر استعمال کر سکتے ہو۔ مگر کچھ پر چوڑی دیکھ۔ اس کے علاوہ تمہاری آئینسی کی ایک ٹھاری میں شارٹ ریج رائل بھی رکھی ہے۔ اس کا کوئی لائنس دیکھو نہیں ہے لیکن اس کے استعمال کے سلسلے میں بھی نہیں بھلا“۔ مجھنے کی ضرورت نہیں۔“

اس نے ایک اور خلاصہ جس کا نام وکیل تھا کو اشارہ کیا اور وہ انتہت میں سر ہلا کرے سے چلی گئی۔ چند لمبے بعد وہ دائیں کٹی تو اس کے ہاتھوں میں ہولسٹر میں محفوظ ایک روٹ اور تھا۔ میں اس وقت چٹان بش شرٹ میں لیوس تھا میں نے روٹ اور لیا کر کے چٹان میں اڑس لیا۔ کچھ فاصل گولیاں جیروں میں ڈال لیں اور ہولسٹر خلاصہ کو دائیں کر دیا۔

”اسٹریج میں مجھے زیادہ خلاصہ محسوس نہیں ہوتا۔“ مہا نے تک میو پر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آہم میں جس طور پر بھی شوٹنگ کے لئے جاؤں تم یا تو سیٹ پر ہی موجود رہا کرو یا کم از کم طور کے اس پاس ہی کہیں نہ کہیں موجود رہا کرو۔ میرے دل کو تقویت دے گی۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہولے سے سسکرائی۔ ”بظاہر تمہاری حیثیت میرے پیچھے کی ہو گی کو یہ علم نہ ہونے پائے کہ میری حفاظت تمہارے ذمے ہے۔“

میں نے خاموشی سے اس کی ہدایات سنیں۔ پھر ہم اوپر لوہر کی باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد دوری آگیا۔ اسے ٹاپ دے کر ہم اسٹریج روٹہ ہو گئے۔

اس روز میں کئی غلوں کے سیٹوں پر مہا کے ساتھ رہا۔ کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا اور میرا لیونہ وقت بوقت میں گزرا۔ آہم یہ دیکھ کر مجھے طوفی ہوئی کہ ہر سیٹ پر

فلٹر گھنٹوں وغیرہ کے دفتروں میں مہا نے میرا تعارف میری حیثیت کو خوب بیجا چڑھا کر کرنا تھا۔ میرے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بھلی نسب ہونے کا خصوصی ذکر کیا تھا اور تاثر بھی دیا تھا کہ میں نے اس کے فلیٹ اصراء پر اس کی ملازمت قبول کی ہے۔ خود اپنی ذات کے لئے مہا کا افسار مجھے ہلے باعث حیرت تھا۔

ایک عام اور سہ حیثیت عورت کو بھی اپنی ذات پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اگر قدرت اسے کسی کو ملازم رکھنے کی بخش دے دے تو اس میں راتوں بھی غرور آجاتی ہے لیکن مہا بھی دنیا میں اپنے فاحر مرتبے کے باوجود سہ سے منکسر المزاج تھی اور اس کی بھی خصوصیت تھی اس کے ساتھ وابستہ رکھ سکتی تھی۔ اس کا یہ انداز مصلحت تھا یا مروت ہر حال اس سے مجھے یہ لائنہ خود ہوا کہ ہر شخص مجھ سے نہایت احترام سے باتیں کیا۔ دن بھر اسٹریج میں میں جہاں جہاں بھی با میری آنکھیں ملنے کی تلاش میں مصروف رہیں لیکن حیرت کی بات تھی کہ وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

پانچ شفت میں مہا کام نہیں کرتی تھی۔ سات بجے کے بعد کا وقت وہ کسی قہسار کو نہیں دیتی تھی اور سیدھی گھر آتی تھی۔ دن بھر وہ بلا ٹکٹن کام کرتی تھی اور اگر پانچ صفت کے لئے بھی سستانے کا موقع میسر نہ آیا تب بھی قہسار پر دیا نہیں کرتی تھی۔ تین چار دن میں مجھے اس کے معمولات اور ملاوت کو سمجھنے کا اچھی طرح موقع ملا۔ پانچویں دن اس کی دو غلوں کی ٹیک وقت ٹوٹ اور شوٹنگ شروع ہو گئی۔

ایک قسم کے لئے ہمیں بھیجی کے ایک لڑائی ملائے میں جانا پڑتا تھا جس ٹنگ و قیلا میدان اور یہ آپ دیکھا لیجئے پھر تھے اور دوسری قسم کے لئے ہمیں باہم کرک کے ایک خطرناک جے میں جانا پڑتا تھا۔

مخصوصیت بہت زیادہ چھ مگلی اور ساتھ ہی میری دے داری بھی۔ ان دونوں ملاوتوں میں ٹوٹ اور شوٹنگ کے دوران مطلوب جے کے گرد قار دار تاریں لگائی جاتی تھیں مگر اور گرد سے آنے والے سیکڑوں المراد شوٹنگ دیکھنے کے لئے آجج ہوتے۔ ان میں لیونہ قہسار ملاحت اور خودوں کی ہوئی تھی اور لن میں سے بہت کم لوگ پونٹ کے تختیوں کی ہدایت کی ہوا کرتے تھے۔ مہا کے دشمن اس جہم میں شامل ہو کر اگر کچھ کر گزرتے تو ان کا سراغ لگانا بے حد مشکل ہوتا۔ مجھے ہمہ وقت مہا پر نظر رکھنا پڑتی۔

اسی الجھن میں تھا مصروفیت میں چند دن گزر گئے۔ اس دوران ایک ہدایت کار سبے میرا گھرا دوست بن گیا۔ وہ ایک ذمہ دار لوہو تھا اور مل ہی میں اس کی وہ تھیں اور سنے باکس آفس پر ہٹ ہوئی تھیں جنہوں نے اس کے لئے کامیابیوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ آٹھ اور شوٹنگ کے دوران فرصت ملنے ہی وہ اکثر مجھے کھینچ کر اپنے غینت میں لے جاتا تو لب کھول کر چنہ جاتا اور بے تحاشا باتیں کرتا۔

چاہائی پر وہ اذیت دیتی تھی کہ اس نے آنکھیں کھولیں۔ کہہ رہا تھا کہ یہ تو وہ پہلے ہی تھا، اب کچھ زیادہ ہی صیغہ نظر آ رہا تھا۔

”آؤ میرے بارے؟ تم نے تو بیش و محض میں نہیں بھلا ہی دیا۔“ اس نے رشائی پھینک کر اپنے ہی لیے دو تھیں والد بچھا۔ میں نے اس کی گردن کے نیچے ہاتھ ڈال کر کچھ دیر اٹھا کر اسے سینے سے لگا دیا۔

”تم کس فلم میں اپنی ادا کرتی تھیں؟“ میں نے اس کے قریب ہنسنے کی ایک شیشی کی ٹیک اٹارنے پر پوچھا۔

”تین دن سے طبیعت کچھ خراب ہے بار!“ اس نے سنبھل کر پوچھتے ہوئے کہا۔ ”میں سے پہلے اسٹوڈیو میں کی مریج تمہارا پتہ کیا۔ معلوم ہوا کہ تم کو کٹ ڈور شوٹنگوں میں دلو کے ساتھ ہی مصروف ہو۔“ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”پہلے میں چائے کا آرڈر دے آؤں۔ پھر باتیں ہوں گی۔“

”تم بیٹھے رہو۔ میں خود کہہ آؤں۔“ میں نے اسے روکا۔

”نہیں۔ آج میری طبیعت بہت خراب ہے بلکہ میں تو اسٹوڈیو چلنے کا بھی ارادہ کر رہا تھا۔“ اس نے ہاتھ پھڑکتے ہوئے کہا۔ ”دو دنوں کے قریب کچھ کر رہا تھا اور پلٹ کر سکرانے ہوئے بولا۔“ ”مہارشی کی سڑی ہوئی چائے پی لو گے؟“

”چائے ہو یا دھپ رسید کھائے؟“ میں نے فرش پر پاؤں مار کر کہا۔ وہ ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

چائے کے دوران ہم ایک دوسرے کو اپنی اپنی مصروفیات کا احوال سناتے رہے۔ پھر میں نے دو ہزار کے نوٹ نکال کر اس کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”یار طبلہ! میں چاہتا ہوں تم اس کھولی کو چھوڑ کر کسی اچھی جگہ منتقل ہو جاؤ۔“

وہ ایک قہقہہ بھینچا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں مہری سرور مری ہو آئی۔ ”میں قسم کی باتوں کی ضرورت نہیں ضرور ڈیڑھا!“ اس نے اچھی سے نیچے میں کہا۔ ”من اندری کاروانی کے بغیر بھی میں تمہارا دوست ہی رہوں گا۔“

”لیکن انہیں قبول کر لینے میں تمہیں کیا تکلیف ہے؟“ میں نے غل سے کہا۔ وہ دلا ”تھوڑی دیر تو میں نے اس کا کہہ چکا ہے۔“ ”میرا بھائی۔“

”کہہ دیا۔“ ”میرے تو نہیں؟“ اس نے بدستور پوچھتی سے کہا۔

”میرے ہونے کو کیا بات؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی روشنی تھی اب میری اس نے عجیب سی نظروں سے میرا سر تاپا جانے لیا۔ میرے لئے سوٹ، کو دیکھا چمکتے ہوئے پر نظر ڈال کر وہ دم لے کر بھاگ گیا۔ ”میرا تم مجھے اس وقت موٹو اٹک رہا ہے۔“ ”تمہاری کمانی کمانے کو میرا دل نہیں مان رہا۔“

مجھے اس کی ایک خصوصیت پسند تھی کہ زندگی کے بارے میں اس کا مظاہرہ ہے چہ چہ تھا اور اس کم مہری میں اس نے اپنے سینے میں جگر غراش تجلیات کا غریب صبح کر رکھا تھا۔ اب یوں لگتا تھا گود و لہجہ گنت کامیابیوں کے بحر میں گھر کر نالے سے اپنی تمام گزشتہ باتیں، تکیوں اور فکری کا نظام لے رہا ہے۔ ضرورت سے زیادہ خود احتار ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے لوال بھی جلد ہی آئے گا۔ دوڑتے دوڑتے اوپر سے مت گرنے کا۔ اسے خود بھی اس حقیقت کا اندازہ تھا کہ وہ نہیں کرتا تھا۔ کتا تھا کہ مروج غلوہ ایک دن کا ہو اس میں اپنی تمام سرگرمیوں پوری کر لیتی چاہیے۔ ہر حال اپنی تمام تر کامیابیوں سے قطع نظر وہ دوست بہت اچھا تھا۔

آؤٹ ڈور شوٹنگوں سے فارغ ہو کر وہ دن تک دیر اسٹوڈیو نہیں گئی۔ دوسرے دن مجھے طبلہ سے ملنے کی غراش نے بتا دیا۔ ”میرا نے صبح ہی بتا دیا تھا کہ وہ اسٹوڈیو نہیں جائے گی۔ میں نے اس سے دو تین گھنٹے کے لئے اجازت طلب کی۔ وہ لان پر بیٹھی تھی۔“

”اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے حضور؟“ ”مسکرائی۔“ ”تم مرضی کے مالک ہو۔“

”میں جلدی آنے کی کوشش کرتی تھی اور میرا دھڑکتا ہوا ہے تو مجھے بے اختیار تپتی سی رہتی ہے۔“ ”کار کی چابیاں میرے ہی پاس تھیں۔ میں اٹھنے لگا تو مجھے اسے کچھ یاد آئی۔“ ”تو نہیں ضرور۔“ اس نے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ چہ لے لے بعد واپس نکلی تو چند ایک اس کے ہاتھ میں تھا کچھ نوٹ نکال کر اس نے گمن کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ چار ہزار رکھ لو۔ شاید تمہیں ضرورت پڑ جائے۔“

”جی ہاں! تو مجھے ضرورت نہیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”بب ہو گی تو ناگ نہیں گا۔“

”میں کہتی ہوں رکھ لو۔“ اس نے ڈانچے کے سے انداز میں کہا۔

”ہاں۔۔۔ مجھے یاد آئے۔“ میں نے کچھ چمک کر کہا۔ ”ایک دوست کے لئے مجھے شاید لن کی ضرورت پڑ جائے۔“ میں نے نوٹ لے کر کوٹ کی اندر چلی جیب میں رکھ لئے۔ میرا ہاتھ رخ اور سے مس ہوا تھے اب میں اپنی ہوسٹر میں دیکھنے لگا تھا۔ آؤٹ ڈور شوٹنگوں کے دوران میں نے رخ اور کو ہوسٹر سے نکالنے اور نکالنے لگانے کی اچھی محنت کر لی تھی کہ اب میں پلک جھپکتے میں یہ عمل دہرا سکتا تھا۔

”تو رش مگر کچھنے کے لئے مجھے صرف ایک جگہ راستہ پر چھنا پڑا۔ کچھ دیر بعد میں نے اس جگہ سی گل میں گاڑی روکی اور اتر کر پیدل آگے بڑھا۔ ہوئی دس لمباڑی نے بڑے سے دنگ سے سائن نکالتے نکالتے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر سر جھٹک کر وہاں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔“

طبلہ کی کھولی کا دروازہ کھلا ہی تھا میں بیدار اندر چلا گیا۔ وہ رشائی لئے جھٹکا سی

کی حکمت اور معنی کیا ہے۔

”ہاں۔ آتے ہی از گلی تھی۔“ اس نے دونوں ہاتھ گدی کے پیچھے دھک کر رکھ دیے اور پہلے ہوئے کہا۔ ”کل صبح بچے کی امیدوار ایک لڑکی آئی تھی اور معلوم ہے اسے لے کر کون آیا تھا؟ اس کا بھائی! وہ بچے دونوں ہاتھ میرے آثار کر اچانک مہو ہو کر رہ گیا۔“ ”مارا بھی بھی مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ یہ تمہارا میرے لئے لایا نہیں تھا۔“ کہ شہرت دلائی اور آہستہ آہستہ کی طلب انسان کو کتنا یہ غیرت مارتی ہے۔ میں نے لڑکی کے بھائی کو سگڑے لینے بھیج دیا اور وہ بھلا ماس میرا مطلب سمجھ کر پورے ایک گھنٹے میں سگڑے لے کر واپس آیا۔ اس دوران میں نے پیچھے ریٹائرنگ روم میں تعاقب اطمینان سے لڑکی کا اسکرین شٹ لیا۔“

”مہر تو وہ جیلا ہائیں پہلے ہی سے تربیت یافتہ ہے غیرت ہو گک شہرت اور دولت کے
لحاظ میں ٹانا گیا ہے غیرت نہیں بنا ہو گک“ میں نے کہا تم نے انہیں جواب کیا ہو؟“
”جی کہ ابھی میں کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کل پھر آنا۔“ وہ نے جواب دیا۔ ”گج
و پھر آئیں گے بلکہ تمہارے والے ہیں۔ اور! جب وہ آئیں تو یہ کہ مہلتی تم بھی رخصت ہو
وگک“ اس نے مہلتی کو لیے میں کہا۔

”میں ابھی چلا جاتا ہوں۔ میں نے سہرا کر لیا۔“
 ”نہیں۔۔۔ نہیں۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ ”مستقبل کی بیویوں کے درشن کر کے
 ہاں۔“ پھر وہ قدمے پیچھڑکی سے بولا۔ ”یارا ویسے ہی بات ہے کہ لڑکی میں بیویوں بننے
 کے محسوس ہیں کل سے یہی سوچ رہا ہوں کہ۔۔۔“ چہرہ اسی کو اندر آتے دیکھ کر وہ خاموش ہو
 گیا۔ چہرہ اسی نے ایک چٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

”بھئی! وہ“ وجہ نے چٹ پر نظر ڈال کر کہا اور بلی کی گرد و دست کر کے بیٹھ گیا۔
 پھر لے بھ پھ پھولے پھولے سے گھول والی ایک لڑکی ایک لمبے ترنگے نوپون کے ساتھ دختر
 کی داخل ہوئی۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے کلی کا شاگ سا لگا اور میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ
 ٹوٹا لور سرحد رہتے۔

انہوں نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ سرحد پر تو گزر اس رات میری اہلی ہی نہیں
 بیکس تھی جب میں نے اسے یہ ہوش کیا تھا۔ شہر اس لئے میں پہچان پائی تھی کہ اب
 میرے چہرے پر فریج کٹ داڑھی تھی اور آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک تھی۔ انہوں
 نے قدرے ٹھسک کر میری طرف دیکھا اور وجہ کا اشارہ پا کر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

اس سے پہلے کہ دستہ ان سے بات شروع کرنا میں ان کے سامنے میری جگہ گیا۔ ایک ہاتھ میرے ٹاکرہ سے ہاتھ سے جیک اٹھ کر میں نے براہ راست شوہا کی آنکھوں میں جمائے ہوئے کہا۔ "مجھے پہچانتی ہو شوہا؟"

ایک شرط سامیہ کچھیں سے ابھرا اور چروں کے ٹکڑوں تک لپک گیا۔ میں نے
بجٹل اپنے کپ پر تھو رکھا۔ اگر میں اسے ایک ہاتھ بھی مار دیتا تو اس کی گردن ٹوٹ
جاتی۔ چند لمبے ہونے بجٹل میرے حلق سے گوارا لگی۔ "ہاری فرسودہ سوسائٹی میں عورتوں
کے حلق اگلے تراشنے کا مایع بنا پاتا ہے لیکن مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تجھ
سے ضروری تفصیل پہنچے البتہ تم دنیا کے اور میرے حلق کے بارے میں اتنی بڑی بات
کہ دو گے۔ میں نہیں جانتا ہوں کہ اس کے ساتھ میرے شب و روز کس طرح گزرتے
ہیں۔ پھر خود ہی فیصلہ کرنا کہ میں اس کے لیے کیا ہوں۔ میں تو کسی چیز پر نہیں پہنچ سکا۔"
پھر میں نے اسے دنیا کے ساتھ گزرے ہوئے دلوں کے ایک ایک لمبے کی تفصیل
کم و کثرت بتادی جس میں کہیں رنگین راتوں اور منگنی غلوٹوں کا ذکر نہیں تھا۔ "مجھے
تمہاری تسلی کے لئے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ یہ سب کچھ لفظ بہ لفظ
ہے۔"

”مجھے اعتبار آیا اور میں تم سے ملانی لگتا ہوں۔“ اس نے میرے سامنے ہاتھ جھکا دیئے۔ ”میں اپنے جہان نہ تعبیرے پر سخت شرمیں ہوں۔ میں تمہارے دیکھے ہوئے ہوں۔“
اپنے لئے دوستی کا اعزاز سمجھ کر رکھ رہا ہوں لیکن رہوں گا میں اسی کھول میں۔“
”کیوں۔“ میں نے پوچھا۔ میرے دل سے فیسے کا غبار پھٹ گیا تھا۔

”ہیں تمہارے کہنے پر ابھی تک قتل ہو چلاؤں۔ جب تک تم یہاں ہو مجھے عیاشیوں کراتے رہو گے لیکن تمہارا کیا بھروسہ؟ تم مجھے سیلابی سے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کل کلان کو کہیں چلے گئے تو مجھے عرش سے فرش پر آئے میں بڑی تکلیف ہو گی۔ نہ پاپ۔“ اس نے کلان کو ہاتھ لگائے۔ ”میں اس کھولی میں رہ کر جتنا جی چاہے سیار زندگی بسر کر لوں گا لیکن رہوں گا نہیں۔ اس کا کرایہ چالیس منڈے ماہوار ہے جو میں برسے وقت میں بھی آسانی سے دے سکتا ہوں۔“

اس کی بات میرے دل کو گئی۔ میں نے مزید اسرار نہیں کیا۔ پہلے اس نے دیکھ لئے۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گاڑی تک مجھے چھوڑنے آیا۔ اگلے دن شام کو اسٹوڈیو میں میں رہا کہ شوٹنگ میں مصروف چھوڑ کر وہ اپنے کام میں آجیٹا ہوا اس غور سے لایا کہ اسلے پر نہیں تھا جہاں رہا کام کر رہی تھی۔ دیکھ ہوئے انارے دونوں انگلیں میرے دیکھے رہے ہوئے تھے ہم دراز تھا اور سہل کا وہ گانا سناتا رہا تھا جو کبھی ہے حد تبدیل تھا۔

فہم دے مستقل کتنا ذرا کہ ہے مل " یہ نہ جانا
 دے کی ہے خاص حالت تھی جب بہت خوش ہوتا تھا تو الیہ گالے کاٹا تھا۔
 "چھوٹے خوش فکر آ رہے ہو۔" میں نے سوئے پر دھیر ہوتے ہوئے کہا۔ "آکٹ کی

کیوں نہ منگوا جاگ

کچل سے کام کم کرنا پڑا تھا اس لئے خاصی تالہ دم نظر آ رہی تھی۔ کھانے کی نہ رہی
ی چٹھے چٹھے کالی درجہ تک ہاتھیں کرتی رہی۔ آج میرا اس کی ہاتھوں میں دھیمان بہت کم تھا۔
مجھے بار بار جیب میں رکھی ڈائری کا خیال آ رہا تھا میں جلد از جلد اپنے بیڈ روم میں جا کر
اس کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ تقریباً گیارہ بجے پہنچنے والی تھی اور بطور میری طرف دیکھتے
ہوئے بولے۔ "آپ سنا چاہیے۔ تم بھی کچھ کچھ کم کم سے نظر آ رہے ہو۔"

"در اصل میں.... کچھ غلطیوں گھٹا چاہتا ہوں۔ دن میں تو وقت نہیں ملتا۔ میں نے
بات کہی۔" غلطی پر یاد کیا کہ جیسا بھی وہ دن سے نہیں آ رہی۔ کافی جواب طلب غلطی تھی
ہو گئے ہیں۔" وہ لڑکتے ہوئے بولے۔ جیسا اس کی نیکوئی تھی۔ اگر وہ کل بھی نہ آئی تو کچھ
بیم غلطی کے جواب کچھ دینا پڑے گا۔"

میں نے انہی میں سر ہلایا اور گویا قید سے نجات کرا لیکسی کی طرف بھاگ بیڈ روم
میں پہنچ کر میں نے کپڑے بدلے۔ رات الود سہانے رکھا اور بیڈ لیمپ جلا کر لیٹ گیا۔ جس
ڈائری کے کچھ جانے کا مجھے اچھا لگا تھا اب اسے کھولتے ہوئے نہ جانے کیوں ڈوب آ رہا
تھا۔ کافی درجہ تک میں اسے دونوں ہاتھوں میں فٹاتے بے حس و حرکت لیٹا رہا پھر پہنچنے سے
اسے کھولا۔

دلچسپ ٹیلیفون کی محنت سن کر میں یوں اچھل پڑا گویا میرے قریب ہی ہم پہنا ہوا۔
ایک لمحہ سمجھنا نہ ہوئے اصرار پر کچھ پا کر میں نے ڈائری سوائے رکھی اور کھلی کے بل
اٹھ کر دبیزور اٹھایا۔

"منصور....!" رات کی سرگوشی نے مجھے چمکا دیا۔ "کوئی میرے بیڈ روم کی کڑی
ڈولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جلدی آؤ۔ جلدی۔" اور سلسلہ منتقل ہو گیا۔

اس نے قدمے پیچھے کو ہٹ کر سسی سسی سی ٹھنڈوں سے مجھے دیکھا پھر ہچکچاہٹ
آہستہ انداز سے انہی میں سر ہلایا۔ "مجھے وہ ہلکا چاہیے جو اس رات میں تمہارے کمرے
میں بھول گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس ڈائری سمیت جو اس میں موجود تھی۔"
"میں دونوں چیزوں کے حلقے اس سے پہچانو۔ مجھے کوئی علم نہیں۔" شرماتا اپنے
بھائی کی طرف اشارہ کیا۔

تم وہی ہو جس نے اس رات کپڑوں کی الماری سے مجھے گھون مارا تھا؟
میرے دہلے ہلے۔

"ہاں۔ میں وہی ہوں۔" میں نے گھبرے گھبرے لیے میں کہا۔ "اور اگر تم نے وہ
ڈائری مجھے دلپس نہ کی تو میں تمہیں ایک اور گھون مارا دوں گا اور وہ تمہاری زندگی کی آخری
چوٹ ہو گی۔"

"تقاضا ہونے کی ضرورت نہیں پڑتی؟" سر پر نے خوشامداتہ لیے میں کہا۔
"آپ سچے سچے دوست ہیں تو ہمارے بھی دوست ہیں۔ وہ ڈائری اس وقت بھی میرے
پاس موجود ہے۔ اس میں ذخیرہ سارے ورقوں پر تو آمد میں لکھا ہوا تھا۔ اور مجھے چھٹا
نہیں آئی لیکن میں نے ڈائری کو اس لئے اپنے پاس رکھا ہوا ہے کہ اس میں کافی دقیقہ خالی
تھے۔ کن پر میں اپنا اور شرمکا کا خرچ پالی کا حساب کتاب لکھتا ہوں۔ ہر حال ڈائری تمہاری
امانت ہے۔ ابھی سے لوگوں میرے گھر پڑا ہے۔ کچھ تو ابھی لا دوں اور کو تو کل بھیجیں پچھا
دلو۔" اس نے اپنی واسکت کی اندر دینی جیب میں اتار ڈالا۔

ٹکٹ کو گیلی مارا۔ ڈائری نکالو۔" میں نے چٹائی سے کہا۔

جس وقت میں نے ڈائری اس کے ہاتھ سے لی میرا دل اس شدت سے دھڑک رہا
تھا جیسے ابھی سچے سے باہر آجائے گا۔ ڈائری جیب میں رکھ کر میں وجہ کی طرف مڑا جو دم
بلو بیٹا تھا۔

"سچہ! اس فکی کے لئے میری بھرپور سفارش ہے۔" میں نے شرمکا کی طرف اشارہ
کیا۔ "میرے تو اسے کچھ نہ کچھ جاننے کی کوشش ضرور کرنا ہے۔ وقت بچانے کے علاوہ"
"سچے کو کچھ کچھ کا موقع دینے بغیر میں اس کے دفتر سے نکل گیا۔ دیکھا مجھے پر کمرے
میں بی۔ وہ لباس تبدیل کرنے جا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اگلے صبح کی شرمک کا کمرے
میں ہے کچھ کچھ میرا صاحب ابھی تک نہیں پہنچا۔

گھر پہنچے پہنچے میں تو بچ مجھے راستے میں دیکھا کو میں تقسیم کاروں کی دفتروں سے
اپنے مطالعے کی قسطوں کے چیک لینے تھے۔ کن دفتروں میں لوہر لوہر کی باتوں میں خاصی
دیر لگ گئی۔ گھر پہنچے ہی ہم کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ دوسری ڈیکٹریوں کے پرکھنے دیکھا سیتھ
پر پرنٹ سہا کی طرف سے منگوا گیا کھانا نہیں کھائی تھی خواہ وہ کتنے ہی اعلیٰ ہو جس نے

غلاب پوش کا ہالہ بے جان ہو کر بھول گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی دوسری فلوکر اس کی ٹال کے نیچے رسید کی۔ یہ ضرب اس کے لئے ناقابل برداشت تھی وہ زخمی اونٹ کی طرح ہلچلا اور دیوار سے جا بکرایا۔ میں نے دھپ سے اسے فرش پر گرتے دیکھا۔ میں اسی وقت کوئی ہانگی سی چیز سنائی ہوئی میرے کان کے قریب سے گزری اور دودارے کی چونکت میں بے حس ہو گئی۔

پلٹ کر دیکھتے ہیں بھی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک بھر تھا۔ یہ بھر ایک دوسرے غلاب پوش نے پھینکا تھا۔ کمرے کی پل دیوار سے نمودار ہوا تھا۔ وہ قاتل اس طرف کھڑی کھولنے میں مصروف تھا اور مجھ کی آواز سن کر ادھر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ ہاتھ میں لوبہ کی تقریباً دو فٹ لمبی ایک سلاخ اب بھی موجود تھی۔

خونخوار چیتے کی طرح اس نے مجھ پر زبردستی اور ساتھ ہی سلاخ اس جیڑی سے کھائی کہ اس کی ضرب شاید پتھر کی سیل کو بھی دو ٹکڑے کر دیتی تھی اس کے بدلے سے ہٹ چکا تھا۔ وہ مٹکوں کے بل گرا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکا میری لاسٹ اس کی پشت پر پڑی اور وہ تباہی کھا گیا۔ وہ میری کی رنگ کے قریب پہنچ چکا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ اٹھا اور رنگ سے نیچے کود گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا غلاب پوش بھی فرش سے اچھلا اور زبردستی رنگ سے کود گیا۔ اب تک میری کوشش بھالنے کیوں تھی وہی تھی کہ مجھے فائر نہ کرنا پڑے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اعشاریہ تین کا ہو پرانی سائنس کا دیوار اور میرے پاس تھا۔ توپ کی طرح گرجتا تھا۔ لیکن اب چھلانگ لگا کر میں رنگ تک پہنچا۔

لان پر کچھ دور تک ابھی روشنی تھی۔ اس روشنی میں میں نے دسایوں کو آگے پیچھے دیکھا میں نے اندازہ دھند چار فوٹ کے لیکن دسایوں کی رفتار میں کوئی فرق نہ کیا۔ پھر وہ اندھیرے کے فکر میں اتر گئے۔ چند لمحے بعد میں نے ان میں سے ایک سانس کو لان کی جھٹی دیوار پر نمودار ہونے دیکھا میں نے ایک اور فوٹ کیا لیکن وہ سانس بدوقت بہک گیا۔

میں نے دیکھا وہ اپنے ساتھی کو سارا دے کر دیوار پر چڑھا تھا اپنے ساتھی کو دیوار پر چڑھاتے ہی وہ خود دیوار کی دوسری طرف کود گیا۔ دوسرا بھی کوونے ہی لگا تھا کہ میں نے ایک فوٹ اور کیا۔ کوئی قاتل اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ وہ کوونے کی بجائے بے جان سے انداز میں دوسری طرف فزحک گیا۔ پھر میں نے انہیں گرتے پڑتے سوک پار کرتے دیکھا۔ دوسری طرف مارکی میں قاتل کوئی گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ٹیکہ دیا لیکن دیوار سے محض "ٹھک" کی آواز برآمد ہوئی۔ دیوار خالی ہو چکا تھا۔

میرے عقب میں ایک دھماکا ہوا۔ میں نے ہڑچکا کر سڑکے دیکھا۔ کوٹھی کا پتھر دیوار

کتاب پر منسلک نسخہ
کتاب پر منسلک نسخہ

میں نے ڈائری نیچے کے نیچے رکھی اور دیوار سے کمرے کی دیوار کی طرف دوڑا۔ پڑھیں صبر کر کے میں میری پر پھینکا تو پست سیاہ اور چڑے کی ٹیکٹ میں لمبوس ایک شخص دودارے کے تالے پر جھکا نظر آیا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ میں دسے تھوڑے ہی اس کے قریب پہنچا۔ وہ تپکشی نما ایک آلے سے آلا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں اس کی کپٹی پر دیوار کا دستہ رسید کرنے ہی لگا تھا کہ اسے قاتل میری موجودگی کا احساس ہو گیا۔ اپنے لوزار کو تالے ہی میں پھنسا چھوڑ کر وہ کھلی کی سی جیڑی سے پلا اور ایک ہاتھ سے اس نے میرے سر پر دھبہ دیا۔ گھونسا رسید کیا۔ گھونسا کیا لوبہ کا ایک دہلی ہتھوڑا تھا جس نے دھبہ میں گویا میری آنکھوں کو کھل کر رکھ دیا۔ ابلائی لے کر میں لاکھڑا۔

دھبہ لاتی نظروں سے میں نے دیکھا اس شخص کے کوسے چہرے پر غلاب تھی۔ غلاب پوشانی کے نیچے اس کی غیر معمولی طور پر گول گول آنکھیں نہایت بھانک رہی تھیں۔ اس نے بھی بھانک وہ شخص پھل تھا جو اس کے دوسرے ہاتھ میں تھا۔ یوگا کی ایک سے کام لیتے ہوئے میں سانس روک کر سنبھل گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں فوٹ کر سکا اس نے مشین پھل سے ایک برسٹ مارا۔

میری قسمت اچھی تھی کہ ابھی میں سیدھا نہیں ہویا تھا ورنہ گولیوں کی بوچھاڑ سے شاید میرا لونی دھڑ جسم سے طبعاً ہو جاتا۔ مشین پھل سے "ٹوٹ ٹوٹ" کی آواز تھی۔ یہ تو آواز برآمد ہوئی تھی۔ قاتل اس پر سائبرنگ لگا ہوا تھا۔ یہ گن بھی نہایت ہلکے تھی۔ غلاب پوش بھی نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ گویا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں معمولی چوک سے بھی میرے پر گئے اڑ سکتے تھے۔ موت کے خوف سے تو میں نا آگیا تھا لیکن اب بیلٹ میں جان کی خطرات کا جو احساس کار لرا ہوتا ہے اس نے میری تمام غصہ صلاحت اور طاقتوں کو بیدار کر دیا۔

تباہی کھا کر میں نے اس کی فلوکی کے نیچے فلوکر رسید کی اور سیدھا ہوا۔ ہوئے اس کی کلائی پر کراٹے کا ایک ہاتھ رسید کیا۔ مشین پھل سے دوسرا برسٹ مارا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پھل اس کے ہاتھ سے ٹل گیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ کا سنا ہوا تھا۔ ہا۔ پلٹ فرش سے سخت کے ان گنت ٹکڑے اکڑ کر ہوا میں بکھر گئے۔

اشفاق خان یو کلاہٹ کے عالم میں بیڑیاں بڑھاتا آیا تھا اور اس نے اپنی راکٹل سے ہوائی فائر کیا تھا۔

"کیا ہوا کدھر گیا۔ کون تھا صاحب کی؟" اس نے میرے قریب پہنچ کر پوچھے ہوئے پر چھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر دوسرا فائر کرنے لگا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔

"کچھ نہیں ہوا۔" میں نے دیواروں جیب میں دیکھے ہوئے کلمہ "تم گیت پر ہی رہو۔۔۔ اور پھر کس رہنا۔"

وہ حوصلہ بھر سے نوحہ نوحہ دیکھتا ہوا واپس پھا گیا۔ میں نے خواب گاہ کے دروازے پر دھک دی۔ "کون؟" فوراً ہی دروازے کے عقب سے اس کی دھم اور لڑائی سی گواہ سنائی دی۔

"منصور۔" میں نے جواب دیا۔ "دروازہ کھولو۔ غلو مل گیا ہے۔"

دیوار نے ایک گہری سانس لی جس کا ہنگامہ مجھے باہر بھی سنائی دیا۔ پھر کلمہ کی گواہ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ دیوار ایک ہاتھ سے دیوار سے ملنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکے سے خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ انہوں کی سب سے ترتیب شام رشادیں نور کندھوں پر سلیقہ لگن تھیں۔

باہل میں انکھوں سے ٹھٹھکی کرتے ہوئے اس نے انہیں پشت پر پھینکا اور ہموار لیے میں بولی۔ "کتنے تھے وہ؟"

"وہ۔" میں نے جواب دیا۔ "دونوں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے مگر ان کے ہتھیار ہمیں رہ گئے۔ وہ دروازے کی چوکت سے باہر آئے۔ پھر اس نے چوکت میں عیاست بکھر اور بیڑیوں پر پڑا شیشین ہٹل دیکھا۔

"بڑی عمدہ چیز ہے۔" میں نے شیشین ہٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس پر سائیکل بھی لگا ہوا ہے۔"

"مگر ہمیں پتہ ہے تو رکھ لو۔" وہ یوں شفقت سے منکرائی گویا میں ایک بچہ تھا اور وہ مجھے کھلونے دلوانے بازار لائی تھی۔

"پولیس کو اس کے متعلق بتاتا تو ضروری نہیں؟" اس نے جبکہ کر شیشین ہٹل اٹھایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ٹوپیگ میں لے آئی۔

سگھار میز کی دروازہ کھول کر اس نے باہل دیکھا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ "صبح مجھ سے ملے۔"

پھر اس نے پٹ کر اچانک مجھے ہستہ زہکا دیا اور میری ہانپوں میں آئی۔ "منصور! میرے پیارے۔۔۔ میرے دوست۔" وہ سب سے ترتیب سانسوں کے درمیان کھینچے کھینچے میں کہہ رہی تھی۔ "تم نہ ہونے تو سچ نہ جالے کیا ہوا۔۔۔ منصور مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جانا۔"

کئی تو ہو جو زندگی بھر میرا ساتھ بھائے۔ مجھے بھیڑیوں سے بچائے۔"

وہ "باہر بیڑیوں پر جھٹوں کی دھپ دھپ سنائی دی۔" دیوار اسٹوڈیو کے آئینے لٹکان کو سیٹ کر رہی تھی۔ میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آگے والا اشتعال خان قلم لکھ رہی تھی کہ ہاری ٹکھوں سے اونچا ہل رہے ہوئے اس نے ہمارا "بی بی کی۔ بی بی کی۔" کہا بات ہے؟" وہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے یہ آواز بلند کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی دروازے پر پہنچا۔

"وہ کی پولیس کی جیب آئی ہے۔" اشفاق نے بتایا۔ "گفت کے دوران انہوں نے فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ پوچھ رہے ہیں۔" کیا پھر ہے؟"

"نہیں نہیں لے کر آؤ تاکہ پھر کے آثار وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔" دیوار نے کہا۔

کلمہ 03036360959
کچھ دیر بعد چار پولیس والے یوں بندھ گئے سہما لے آئے۔ گویا میدان جنگ میں انہیں زبردستی کسی سوڑے سے باہر دھکیلا گیا ہو۔ ان میں ایک انسپکٹر تھا جو تین کاشیہلوں سے پیچھے رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دیوار تھا۔ مجھے اور دیوار کو اطمینان سے بیڑیوں پر کھڑے دیکھ کر ان کی جان میں جان لگی۔ انہوں نے بندھ گئے جھانک لیں اور انسپکٹر صاحب سید قدرے تھکن کر منکراتے ہوئے آگے آئے۔

"جستے رہا کی؟" اس نے دیوار ہولسٹر میں رکھ کر دونوں ہاتھ جڑتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا پکڑا تھا۔۔۔ فائرنگ وغیرہ۔"

"یہی پر لٹا پکڑ ہے ہوا اس کی۔" دیوار نے منکراتے ہوئے کہا۔ "ابت اب آپ کی راہدہ جلی میں ان کی ہمت اتنی بڑھ گئی ہے کہ کچ گھر بھی چڑھائی کر دی۔"

پھر دیوار نے انہیں بیڑیوں کے ایک گوشے میں چڑی کر بیڑیوں پر بٹھایا اور تھم واٹھ بتایا جو نہایت غصہ تھا۔ "میرے میرے منیجر صاحب آپسچے۔" آخر میں دیوار نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ دونوں کلمہ پوش بھاگ گئے۔ فائر انہوں نے ہی کئے تھے۔"

انسپکٹر ایک ڈائری میں سب کچھ لکھتا رہا۔ دیوار کے خاموش ہونے کے بعد اس نے اٹھ کر چلنے والی بات کا ساتھ کیا۔ پھر ایک کاشیہلو کو نقشہ تیار کرنے کو کہا جس نے کافی دیر تک شرفا قیام کی گردن کرنے کے بعد بلاخر ایک کانڈ پر کچھ دائرے اور چند آڑی ترتیبی لکیریں کھینچ لیں۔ پھر وہ لوگ میرے ساتھ لائن اور سڑک پر بھی آئے۔

جہاں جہاں میں نے غلبہ پریشوں کو دوڑتے دیکھا تھا وہیں سڑک پر ہمیں طوفان کے دھبے بھی دکھائی دیے اور ایک جگہ درختوں کے قریب کسی کار کے چٹروں کے آواز ٹھان بھی نظر آئے۔ سچانے کے دوران میں نے دیکھا کہ اردگرد کی کئی کوشیہلوں میں مدھنی ٹھکر لے

مٹی حتی مگر کوئی شخص باہر آنا دکھائی نہیں دیا۔ لائبریریل نے تمام شکایات وغیرہ کی تفصیل نوٹ کی اور ہم ٹیبل پر آگئے۔ دیا نے اس دوران لسنکج کی ایک پندرہویں اور چار گلاس میں لارکے تھے۔

"شوق قریبے انیکر صاحب۔" دیا نے کہا۔

"شکریہ دیا جی۔۔۔ لیکن کب کو تو علم ہے کہ میں جتنا نہیں ہوں۔" انیکر ہوس نے لپٹی نظروں سے بوتل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اس وقت تو میں ویسے بھی اپنی پر ہوں۔ گھر بھی بھی مہمان آجائیں تو ایک آدھ چمک کا شغل ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر میری طرف سے مہمانوں کے لئے رکھ لیجئے۔ میں بھی مہمانوں ہی کے لئے رکھتی ہوں۔" دیا نے مسکرا کر کہا اور پھر اشفاق خان کو بلا کر کہا۔ "یہ بوتل اخبار میں لپیٹ کر انیکر صاحب کی گاڑی میں رکھ دو۔"

"آپ خواجہ تکلیف کر رہی ہیں۔" انیکر نے مزاحمت سے عاری لہجے میں کہا۔ "مگر آپ اصرار کرتی ہیں تو رکھ لیتا ہوں۔ آپ جس بستی سے لی ہوئی چیز تو ویسے بھی نکالی کے طور پر رکھی جاسکتی ہے۔" پھر اشفاق خان کے ہاتھ ہی اس نے خود بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر رحمت نہ ہو تو اپنے میجر صاحب کو میری ساتھ پولیس اسٹیشن بھیج دیجئے۔ یہ ایک آئی کر پے دھلا کر دیں گے۔"

"ایک آئی کر کی کوئی ضرورت نہیں ہوسکتی۔" دیا نے ہاتھ اٹھ کر لپٹ کر لے لے لے لے میں کہا۔ "ہاں ایک آئی کر تو درج ہو چکی ہیں۔ وہ آپ کے علاقے میں اور تین دوسرے علاقوں میں انہی کا آج تک کچھ نہیں بنا۔ خواہ تو وہ رجسٹر کالے کرنے سے کیا کام؟ میں آپ مزید کوئی ایک آئی کر درج نہیں کراؤں گی۔"

"تو پھر آپ نے پہلے ہی کیوں نہ حج کر دیا؟ میں نے خواہ تو وہ اتنی سرکھائی کی۔ انیکر نے غصے سے خلیف سے احتجاج کے ساتھ کہا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ چلو آپ گھنٹیں کا شوق ہی پورا کریں۔" دیا نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہوا۔ "انیکر بھی تو دسے ہے ہی سے مسکرا کر رہ گیا۔ انہیں رخصت کرنے میں اور دیا پہنچیں تک گئے اور وہیں سے پلٹ آئے۔ میں نے گہری دیکھی۔ کوچ رہے تھے۔

"بیت آری ہے۔" میں نے ایک معمولی جملی لپٹے ہوئے کہا۔ "آپ میں چن ہوں۔" میرے ذہن پر ایک بار پھر ڈائری سوار تھی۔ جسے میں نیچے تھے رکھ آیا تھا۔

"مجھے ارگے گا۔ میں سو نہیں سکوں گی۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

بستر پر لیٹے لیٹے دیا نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور انٹر کام کا سوچ توں کر کے تین نمبر کا فون دیا۔ جس سے اشفاق کے کمرے میں گئے ہوئے سیٹ کی گھنٹی بجتی تھی۔ چند

لے کے توقف کے بعد وہ ہلی "اشفاق! جب جہا گئے تو اس سے تمنا کہ ڈائری میں گرج کی شروعات دیکھ کر انٹرکسٹوں کو اطلاع دے دے کہ گرج میں نہیں آسکوں گی۔۔۔ نہیں نہیں

میری طبیعت خراب نہیں ہے۔۔۔ بلکہ میری طبیعت تو بڑوں اور آج ٹھیک ہوئی ہے۔۔۔ ہاں۔۔۔ ٹھیک ہے؟ لوگ۔"

دیکھو رکھ کر وہ کرکٹ لے کر میری طرف غور نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائی اور کچھ رعناہ تے دیا کر انکھیں موند کر لپٹ گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ بے سرح ہو گئی۔ اس کے کمرے کا دروازہ بند کر کے میں اچھی میں آیا اور کپڑے بدلنے کے بعد اپنے بستر پر جا بیٹھا۔ مجھے طے سے ڈائری نکالنے وقت ایک بار پھر میری دگ و پے میں اضطراب سا رہا گیا۔ جی شب کی سرشاری اور غار کا نور ہو گیا۔ ڈائری کھولتے ہی میری نظر پہلے صفحے پر پڑی جس پر صرف ایک سطر لکھی تھی۔

"میرے بس میں ہو آؤ اس داستان زندگی کا ایک ایک لفظ اپنے لو سے لکھتی۔" میں نے دہل چلا۔ میں نور فگتہ سے لفظ کا ایک جال میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔

گرج میں اپنی نو نو زندگی کا کل احوال لکھنے کے دن بے جاں نظروں پر غفل کر دیا جاتی ہوں۔ کچھ نکل وار بارغ ایسے ہوتے ہیں جنہیں حافظ میر نہیں آتے۔ لیکن جب بھی کسی کو ان کی حاضرت کا فریضہ سونا چاہئے تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے ایک ایک پہلو سے آگاہ ہو۔ اسے ہانا چاہیے کہ اس کے ہار کے کس کس پہلو کو کس کس نے اپنا "دوڑا اور بھاد" کیا۔

اسے لپیروں اور ان کے مظالم کی ایک ایک تفصیل سے آگاہی ہوئی چاہئے کیونکہ ہانوں کو اجالنے والے غیرے اپنے مظالم سے کبھی والا نہیں آتے۔ وہ لوٹ کر نہ بھی آئیں تو بھی نئے ہانوں کو اجالنے کی دھن میں ہواں دواں رہتے ہیں۔ انہیں تلاش کرنا اور ان کے کئے کی سزا دینا انسان کی زندگی کا بہترین معرکہ ہے۔ میری فکر میں۔

بچے! میں نے اپنی کمائی تمہارے علم میں لانے کے لئے کتنے اور تم کا سارا اس لئے لیا ہے کہ اسے تمہارے سامنے بیان کرنے کا جھ میں حوصلہ نہیں۔ اس میں کئی پہلو۔ اتنے شرمناک ہیں جنہیں کوئی بھی مان اپنے بچے کے مدد و لشکروں کا قالب نہیں دے سکتی۔ تحریر میں یہ کام گمان ہے اور میں یہ سب کچھ اس لئے تمہارے علم میں لانا چاہتی ہوں کہ میں اپنے اوپر ہونے والی ایک ایک لڑائی کا بلا کم و کاست بلا کر کئے بغیر اس دسے داری کی تکمیل کی امید نہیں رکھ سکتی ہو میں تم پر مان کر چاہتی ہوں۔

تم تاخیر سے کچھ دالے وہ حافظ ہو جتے لپیروں سے ان کے ایک ایک ظلم کا

میں ڈھیر کر سکتے تھے لیکن شاہ وہ نمانہ اچھا تھا کہ جس کے موسم کے موسموں نے دور نہیں بچا تھا پھر شاہ الہی خدا کے کون پندرہ بدلوں میں سے ایک تھے جو ناپاب ہوتے جا رہے ہیں۔

ہمارے تو میں کہہ رہی تھی کہ میری کمائی کا تھکا موسم بہار کی ایک رات سے ہوتا ہے۔ کائنات سکوت میں ڈھل چکی تھی۔ میں اس وقت عمر کے بارہویں برس میں تھی اور عمر وہ ہے جب لڑکیوں کی نیندیں گہری ہوتی ہیں۔ دلچسپی میں گہری نیند سے جاگ نہیں۔ میں نے دیکھا الہی اپنے چنگ سے اللہ بچے تھے اور ملک میں رکھی لاشیں کی جی اڑی کر رہے تھے اور مکان سے باہر کہیں دور دھڑکے دھڑکے گونج رہے تھے۔

”یہ گواہیں کیسی ہیں الہی؟“ میں نے سہم کر پوچھا۔
”گواہیں جی رہی ہیں چٹا؟“ الہی نے جواب دیا۔ ”تم گھبراؤ نہیں! اپنے بستر میں لیٹی رہو۔ میں دیکھا ہوں۔“ لیکن وہ باہر جانے کی بجائے ملک سے لاشیں اُتار کر کھلی دیو تک اپنی جگہ ساکت کھڑے رہے۔ اس دوران دھڑکے محسوس ہوئے تھے۔ الہی شاہ خوفزدہ تھے شاید وہ گواہوں کی سہمے چھین کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

طارا ذہرہ ٹاپور کے سلسلہ دیہات کے پہلے دیہہ میں قلعہ ہمارے مکان کے دروازے سے ہی میں سیدہ میں پلاڑی کھانوں کی طرف جاتی تھی۔ دائیں طرف کھلا میدان تھا اور صوبہ میں ایک بہت بڑا بھڑکھٹا جس کی پہلی طرف ایک کھلا گھر کی سڑک تھی جو آگے کہیں سے کھلتی جانے والی بڑی سڑک سے ملتی تھی۔

اس بڑی سڑک کے پار ایک طویل و عریض بھل قلعہ ہے۔ بھل میں کھیلنا ہوا تھا اور میں نے سنا تھا کہ اس کے دوسرے سرے پر کہیں کوئی شاندار قلعہ گاہ تھی۔ اس قلعہ گاہ سے کبھی قاتلوں وغیرہ کی گواہیں یہاں تک نہیں پہنچی تھیں۔ درمیانی فاصلہ قابلہ“ میں نے قلعہ کا قلعہ

الہی نے پچھلے آسمان اڑا میں قدم اٹھایا اور آگے بڑھ کر دروازہ ڈرا۔ ماحول برابر جمنا تھا۔ ”خدا“ میں نے دھم کی سی گواہیں دیا ہوئی جیسے کوئی ہماری بھر کم آدمی دیوار سے اندر کودا ہو۔ مکان کی چار دیواری لڑا لڑا نہیں تھی کیونکہ اس قلعے میں لوگ کبھی چار دیواری میں بھی اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ خصوصاً قریب لوگ۔

الہی نے پلٹ کر کہنے میں کھڑی لاشیں الہی اور دائیں بائیں شمع جلی کواں نکالنے کو کہنے لگی۔

”مکان ہے؟“ چند لمحوں بعد میں نے ان کی گونجی آواز سنی۔
”خدا نہ رکھی گئی اور قلعے خوفزدہ ہونے کے باوجود سلجھنے لگے تو ہمیں دپے ہی نظام بنا ہماری سے باہر جمنا گئی۔ آگے چلنے کی مدد سی“

مناسب لینا ہے۔ میں ایک کنوڑ عورت تھی اس لئے لٹ گئی۔ لیکن میں جیسے کنوڑ نہیں رہنے دلائی۔ میں جیسے ہر طرح کی حالت کا مالک بنانے کی۔ ”سلسلہ حالات“ دولت کی حالت اثر و رسوخ کی حالت“ دنیاوی طاقتوں میں کیا تین بڑی طاقتیں ہیں۔ میں جیسے اس لئے طاقتور بنانے کی کہ تم اپنے قرض سے عہدہ پر آؤ گے میں کوئی طرہ نہ کر سکو۔ تم یہ نہ کہہ سکو کہ تمہاری راہ میں ہمارا مجبوری حائل تھی۔ دنیا بھر کی بھڑکوں سے میں گور چکی ہوں۔ میں جیسے مجبور نہیں رہنے دلائی۔

میری کمائی کا تھکا موسم بہار کی ایک رات سے ہوتا ہے۔ ریاست کھولی سے تقریباً میں ملک کے قلعے پر نہیں چاہیں ریاست پر مشتمل ایک وسیع جاگیر پھیلی ہوئی تھی جسے ٹاپور کہا جاتا ہے۔ وجہ تسمیہ تو شاید اس کی یہ تھی کہ وہاں سب بہت پائے جاتے تھے لیکن وہاں بسنے والے انسانوں پر سبیلوں کی خصوصیات تھیں۔ اثر انداز نہیں ہوتی تھیں۔ بہت محسوس“ بہت کرنے والے اور اپنے محسوسوں کے وقار تھے۔

تمہاری ملٹی یعنی میری والدہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی سب سے بڑے سے صحت بولتی میں اس دنیا سے نانا توڑ چکی تھیں لیکن اس علاقے میں بسنے والے انسانوں کی مردہ بہت اور ہاپ کی سختی نے کسی مجھے ان کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

ٹاپور کی جاگیر کسی نواب شرافت علی کی ملکیت تھی اور تمہارے قلعہ میرے والد اس زمین کے ایک حصے کے گھر تھے لیکن انہوں نے تو کیا اس جاگیر پر بسنے والوں میں سے کسی نے بھی نواب صاحب کو نہیں دیکھا تھا۔ ہر فصل اٹھنے کے موقع پر نواب شرافت علی کا بیٹا ہوا دام آگے وہ تمام شخصیتوں سے حساب لیتا۔ فلیس انشورنس اور شخصیتوں اور کاشتکاروں میں ان کا حق بہت تقسیم کرتا اور چلا جاتا۔

کوئی بھی مسئلہ کھڑا ہونے پر اسے ہی بلایا جاتا۔ وہی تمام معاملات طے کر آگیا وہی قلعہ کل جاگیر میں بسنے والا ہر فرد اسے جانتا تھا اور نواب صاحب کا نام تو لوگوں کو محض کسی کمائی کے کردار کی طرح یاد تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ان کی اور کئی مملکت پر اس سے بھی زیادہ بڑی جاگیریں تھیں جہاں کبھی ایک توہ بار ان کی قلعہ دیکھی گئی تھی لیکن ٹاپور شاید ان کے لئے اتنا اہم نہیں تھا کہ کبھی وہ یہ قلعہ نہیں بھلا آتے۔ بسنے میں آگیا تھا کہ اگرچہ ان سے ان کے کہا اہل لو کے خاص الخاص تعلقات تھے اور ان کی تمام جلد و حسرت اور جاگیرداری ان کے دربار سے زیادہ انگریزوں یا لواؤں کی رہیں منت تھی۔

الہی کی کھڑی قلعہ میں تھی لیکن سال بھر کے لئے ایلچ وغیرہ مل جاتا تھا۔ رہائش کے لئے ایک نیم پختہ مگر خاصا وسیع مکان ملا ہوا تھا۔ گھر میں مال موٹی سب کچھ تھا اس لئے گور ہر بڑی عورت سے ہو جاتی تھی اور الہی اس پر قلعہ تھے۔ ان کے ہاتھ میں جو قلم و نقل تھا وہ چاہے تو معمولی سی بیڑا بھری سے ان گنت دنیاوی آسائشیں اپنے قدموں

دعا ہے۔ لیکن مضرت جائے گا۔ میں اس گمرانی کے کام میں ہی ٹھیک ہوں۔" اور بدستور ہاتھ باندھے گھسیٹنے لگے۔ "مجھے میں نفع کے ساتھ ساتھ نقصان کا بھی ذمہ دار پڑتا ہے۔ میری گزشتہ برسر تو اس لئے بندھے میں ہی بیوی ابھی طرح ہو جاتی ہے۔"

"اچھا۔۔۔ ہم تمہاری بھلائی کے لئے کچھ اور بہتر طریقہ سوچیں گے۔" لڑکھن صاحب بطور انہیں دیکھتے ہوئے مسکرائے اور گاؤں کی طرف ہرٹا کر لپٹ گئے۔

"لیکن حضور۔۔۔! اپنی نے کچھ ہونے کہا۔" ہاتھ ہاتھ میں اصل بات تو یہ تھی۔ آپ کے ساتھ کیا حادثہ پیش کیا جو اس وقت اس عالم میں۔۔۔؟ انہوں نے بے ہوش ہونے لگا۔

"شکار پر نکلے ہوئے تھے ہم۔" لڑکھن صاحب کی توجہ دہی پڑ گئی۔ "رات کو نیم کی طرف واپس جا رہے تھے کہ کچھ غلاب پوش گز سواروں نے حملہ کر دیا۔ وہ اندھا دھنک کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ صرف تین محافظ تھے۔ ایک دشمن ہو کر گر گیا۔ ایک گھوڑے کو گولی لگی۔ ہمارے گھوڑے کی بھی گردن پر گولی لگی اور وہ چک گیا۔ نہ چل سکا۔ نہ حرکت کر سکا۔ کچھ بھاگتا رہا۔ پھر وہ چکھوڑے کے چنگ میں آگیا اور گردن کے درمیان سے دم ہو کر گر پڑا۔ گز سوار وہیں تک ہمارے تعاقب میں آئے تھے لیکن چنگ میں آئے تھے اور ہم جان بچا کر نکل آئے میں کامیاب ہو گئے۔ بددلت بھی نہیں گر گئی۔"

پھر انہوں نے اپنے لیے لے کر آلود ہاتھوں میں انگلیاں پھیریں ان میں سے خالص سونہ تھا۔ "تمہاری نگاہی بھی نہیں گر گئی۔ اس میں بڑا قیمتی تیرا اور موتی جڑے ہوئے تھے۔"

"لیکن حضور۔۔۔! اپنی نے گویا ارے ارے کہے۔"

"آپ کے علاقے میں ڈاکوؤں کی یہ دہادہ دہادی؟ ہم نے تو کبھی ان اطراف میں ڈاکوؤں کا نام نہ سنا۔"

"ہم اس وقت اپنے علاقے میں نہیں تھے اور نہ ہی وہ گز سوار ڈاکو تھے۔" لڑکھن صاحب کے لیے میں قدرے سنجیدگی آئی۔ "ہم جانتے ہیں وہ چند چھوٹے موٹے دہادے کے سر پھرے لڑکے ہیں۔ طالب علم ہیں۔ ہمیں تو معلوم ہی ہے تا کج کل بددلتان اگر یہیں کو قتل کی تحریک ایک بار پھر زور پکڑ رہی ہے اور یہ لوہڑے لوہڑے ہمیں قتل کتے ہیں۔ اگر یہیں کا ایجنٹ نکلتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہیں سے ہمارے مراسم گہرے ہیں۔ ہم وہ عربہ انگلستان میں گئے ہیں۔ پولیس ایجنٹ بھی ہر معاملے میں سے مشورہ کرنے آتا ہے مگر اس بناء پر ہمیں فدا کر دینا تو شرافت نہیں ہے۔ اگر یہیں سے ہمارا رشتہ بدلتا ہے۔ اس کے بغیر تو ہماری جاگیر داری نہیں چل سکتی ہے۔ دردی اصلاحات کے ہم پر اپنی ذمہ داری نہیں چھوڑ سکتے۔ جب آلودی کی تحریک

پھرے گی تو دیکھا جائے گا کہ ہم کس کا ساتھ دیں۔ اور دلی میں جن چھ توہمیں کو پھانسی دی گئی اس کا ذمہ دار بھی یہ لوگ ہمیں گردانتے ہیں کہ ہم نے قہری کی قہر۔ علاوہ بات صرف اتنی ہے کہ دہانے سے کچھ لوہڑے لپاڑے طالب علموں کا ایک گروہ ہمارے پاس لپکا تھا۔ وہ لوگ ہم کو بولتے تھے کہ تحریک چلانے کے لئے ہم ان کے قتل میں پانچ لاکھ روپیہ دے دیں۔ ہم نے انکار کر دیا۔ تب سے کچھ نوگ ہمارے خون کے پیسے ہو گئے۔ پانچ لاکھ روپیہ رقم ہوئی ہے یہاں۔ کوئی پتہ نہیں کہ کون لوگ تحریک کے ذمہ دار ہوں گے کیا کام لے جائے گا اس پیسے سے۔۔۔۔۔ اور ہم ایسے ہی افکار کرتی جی رقم تو انہیں دے دیں، ہم کو ہانگ سکتے تھے لے گا ہے؟ اور پھر ایسی باتیں اگر یہیں سے نہیں تو ہمیں رہتی تھیں۔ اگر یہیں کے جاسوسوں کا تو ہمیں پتا ہے نا۔"

لڑکھن صاحب جوش میں بولے جا رہے تھے اور لپٹا دم سلاخے کھڑے تھے۔ لڑکھن خاموش ہو گئے تو ان کی گردن کی پھول ہوئی رہیں احتمال پر آئیں۔ انہوں نے ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر پھت کی کڑیوں کو سمجھتے ہوئے کچھ بدلتے بدلتے اور پھرے پھرے لیے میں کہا۔ "لیکن ان طالبان کتب کو شرافت علی سے دشمنی منگی پڑے گی۔ ہم ان کو کھوج نکالیں گے اور ان کے سر پرستوں کو بھی اور ان کا حشر دیکھ گئی۔ یہ تو ہماری طاقت کا علم نہیں ہے۔"

"بے شک۔۔۔ بے شک حضور۔" اپنی نے قدرے دہی آواز میں کہا۔ "ارے۔" لڑکھن صاحب ان کی طرف دیکھ کر قدرے چمکے۔ "تم ابھی تک کھڑے ہی ہو بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔"

"کوئی بات نہیں سرکار۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔" اپنی گڑبڑا کر بولے۔ "میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ دشمنی فکر آ رہے ہیں۔ آپ کے لئے کوئی دوا یا مرہم یا دھیو کا ہندوست سے پہلے کرنا چاہئے تھا لیکن یہاں ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اگلے اربے پر ایک عظیم صاحب رہتے ہیں۔ آپ ہم قہانیں تو انہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔" لڑکھن صاحب یک لخت اٹھ بیٹھے۔ ان کے ہاتھ سے شے سے جگ ایک بار پھر چمکا کر رہ گیا۔

کسی کو ہلانے کی ضرورت نہیں۔ کسی کو یہاں ہماری موجودگی کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ اس حالت میں ہم کسی کے سامنے آنے کا غلو معل نہیں لے سکتے۔ گھوموں کے بل سے رعب اٹھ جاتا ہے۔ تم بس اتنا کرو کہ گرم گرم دودھ میں ذرا سی بلدی حل کر کے کھاؤ۔ علاج ہے تو ناگوار۔ لیکن لی اللہ کی قیمت ہے۔ ہم طبیعت پر جبر کر کے پی لیں گے۔"

"ہاں بیٹے۔" اپنی مجھ سے غلاب ہوئے۔ "آج جلا کے دودھ گرم کرو اور ایک

اس میں سے کچھ لوٹ لیج کر کے انہوں نے میرے ہاتھ میں کھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رکھ لو عزیز، عرف جوڑا ہوا! ہم پہلی مرتبہ تمہارے گھر گئے ہیں۔ اگر قصداً آئے ہوتے اور ہمیں تمہاری مہمانی کا طعم ہوتا تو تمہارے شان میں کوئی تحفہ لاتے۔" جب انہوں نے دیکھا کہ میرا ہاتھ لوٹوں کو گرفت نہیں لے رہا تو اپنی کوتاہی پر توبہ کی۔ "بہن! تم ہی اسے سمجھو کہ آداب کا تقاضا کیا ہے؟"

"... تو تمہیں ہے حضور والا۔" اپنی نے ہنسنے ہوئے کہا۔ "لیکن اتنی بڑی رقم کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی مدد دینا عیادت فرما دیجئے۔" مجھے خود بھی احساس تھا کہ ہر فصل پر لہائی کو جب بلا رام چھ لاکھ کی انٹرنیٹ ٹیوا لگا تب بھی ان کے پاس لے لے لوٹ نہیں ہوتے تھے۔ نواب صاحب نے لوٹ میرے پیروں کے پاس بیٹھ دیئے اور قدرے غلج آمیز لہجے میں کہا۔ "اغللو۔ اغللو۔ جلدی کرو۔ شاہاں۔"

پھر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے جھکانے کے لئے لگا سا دھوا ڈالا۔ میرے جسم سے بکھرتے وہ مخصوص شام کی سی لپک مٹھو ہو گئی اور لڑکھن کا تھکا ہوا آواز۔ تب نواب صاحب کے شہسیر نما بالوں کا دھوا بڑھ گیا اور میں جھٹکے پر مجبور ہو گئی۔ "اغللو۔ اغللو بیٹے! اپنی کے لیے میں فکرت تھی۔ میں نے لوٹ اٹھا لے۔"

"جیسا۔ اب جلدی سے لادو بالاؤ۔" نواب صاحب نے کہا اور مجھے بالوں کے پوچھ سے آزاد کر دیا۔ میں بھاگ کر کمرے سے باہر آئی۔

"مہمانی صورت! پانچ کا کھانا! حور! پی چری۔" یہ وہ الفاظ تھے جو میں بچپن سے لے کر جتنی سنی تھی اور بچپن کی تمام تر ناگہانی اور پھر لڑکھن کی معمولی سی سمجھ داری کے دور میں بھی انہیں سن کر میرے لانی گردن ایک جگہ سے متاثر سے تن ہاتی تھی لیکن آج بجانے کیوں ان الفاظ نے مجھے سن کر کے رکھ دیا تھا۔ میری ہاتھ پاؤں لٹپٹے پڑ گئے تھے اور جسم سے گول جان نکل گئی تھی۔

کچھ دنوں سے لہائی اکڑ مجھے تحقیق کرنے کے تھے۔ "تب تو سیالی ہو رہی ہے۔ دھندہ اچھی طرح لڑھا کر۔ یوں کد کڑے لگائی نہ چلا کر۔ ہر کسی سے پلٹ پلٹ مانگیں نہ کیا کر۔" لیکن ان سب ہدایات کو میں نے کبھی وہ غور اختیار نہ سمجھا تھا۔ صرف استغنیاء کے ہاں اردو فارسی اور عربی کا درس لینے کے لئے ہاتھ دھندہ مچ طرح لیتی تھی۔

لیکن اب کی ہدایات کے بغیر ہی جب میں نواب صاحب کے لئے ہلدی والا دھندہ لے کر واپس کمرے میں پہنچی تو وہیں میرے سر اور پیٹ پر اچھی طرح لپٹا ہوا تھا۔

نواب صاحب اپنی سے باتیں کر رہے تھے۔ اپنی لب ان کے پالنے ایک کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔ میرے پیٹ پر نواب صاحب نے خاموش ہو کر گرمی نظروں سے میڑا سر تپا

گلاس میں لدا سی پھی ہوئی جلدی ملا کر لے کر۔"

اب نواب صاحب یوں میری طرف متوجہ ہوئے گویا اب تک میری مہمانی سے لاطم رہے ہوں۔ میں ان کے سروانے کڑی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چمک اٹھے۔

"یہ کون ہے بہن؟" انہوں نے مبہوت سا ہر کر اپنی سے پوچھا۔

"میری بچی ہے حضور! انکوائی بچی۔" اپنی نے جواب دیا۔

"بہت کھوب۔" نواب صاحب کی آنکھیں گویا جھپکنا بھول گئی تھیں۔

"شاہاں! وہ پانچ اترا ہوا ہے تمہارے آگن میں آئی کو بھورت بچی برہن ہو کر سے گزری ہے اور وہ بھی اس کتیا میں۔ لودھ آؤ بھی۔ کیا نام ہے تمہارا؟" انہوں نے ہاتھ میری طرف پھرایا۔ نہ جانے کیوں میرے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔

"اسے بھی یہ کیا بد تمیزی ہے۔" اپنی نے مجھے گھڑا۔ "آگے آؤ نواب صاحب بلا رہے ہیں۔"

بیشکل تہم اور پائل خواستہ میں آگے بڑھی۔ میرے پیروں میں چاندی کی پھولی کی پانسب تھی۔ میرے ہر چمکتے قدم کے ساتھ یہ پانسب معمول سے کچھ زیادہ ہی چمک چمک اٹھی۔ میں چمک کی پٹی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

نواب صاحب نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور اس ہاتھ کے پوچھ سے مجھ سے گردن غم سا کھٹ گئی۔ میں ہل عموماً کھلے رکھتی تھی اور یہ کولوں سے بھی نیچے تک تھے۔ اس وقت میرے سر پر دھندہ نہیں تھا۔ نواب صاحب کا ہاتھ میرے بالوں کے پوچھ سے جھٹکا ہوا کر تک چلا گیا۔ میں کچھ مٹ کر رہ گئی۔ انہوں نے ہولے سے میری کمر جھکی دی۔ "ہم نے تمہارا نام پوچھا تھا نہیں بتا دی کیا؟"

"میری۔" میں نے ہولے سے جواب دیا۔ عجیب لڑائی ہوئی سی آزاد میرے سے لگی۔

"نواب صاحب نام ہے۔" نواب صاحب کے ہولے ہولے کے عقب سے لڑو دھندہ جھٹکا اٹھے۔ "تمہارا نام تو حور ہونا چاہئے تھا۔ ہم تمہارا ہی نام جوڑ کر کے ہیں کیا خدا داد خان؟ تمہیں پسند ہے یہ نام؟"

"یہ تو حضور کی لادش ہے جو فوڈے کو آگاہ بنا رہے ہیں۔" اپنی نے ہر سم میں کہا۔ "عزت افزائی ہے ہم غریبوں کی۔"

"آپ کو قریب مت کہو خدا دادو خان! تم تو پارس کے مالک ہو۔" نواب صاحب کی چند می چند می آنکھیں کچھ اور سکو سکیں۔ میری کمر سے ہاتھ ہٹا کر انہوں نے ناکی کوٹ کی ایک بڑی سی جیب کا غن کھولا اور پورے پورے سرخ لوٹوں کی ایک گڈی

ہارے کے بجائے ویسے ہی کچھ شے اٹھا کر بیٹھوں کے سامنے ڈال دیے اور وہ سبہ دل سے اپنا ہر حصہ مارنے لگیں۔ تب میں نے کہا ہے پوچھا۔ ”آج رجم نہیں آتا کیا؟“
 اہا نے ٹھٹھک کر کمری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”نہیں میں نے اسے صبح کر دیا ہے۔“ اہا نے اپنے مخصوص رسم لیے میں کہا۔
 ”کیوں ابا جی؟“ میں نے سگن میں بڑی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
 ”آپ تو سیالی ہو رہی ہے عزیز!“ انہوں نے میری طرف دیکھ کر بغیر کلمہ ”اور جس گھر میں لڑکی سیالی ہو رہی ہو وہاں بھون لڑکے کا کتا چلا ٹھیک نہیں ہو گا۔“
 ”تو بات آپ کو نواب صاحب نے بتائی ہے کیا؟“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔
 اہا نے میری طرح چوٹ کر پلٹ کر میری طرف دیکھا گویا کسی پھولے منہ سے بہت بڑی بات سن لی ہو۔ ”خیر“ مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ بلا سوچے کچھ میرے منہ سے یہ بات کیسے نکل گئی۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے یہی محسوس ہوا تھا گویا میرے منہ میں کسی لور کی زبان پھڑک اٹھی ہو۔
 ”کسی نے بھی بتائی ہو۔“ اہا نے غصے سے کہا۔ ”بات ہے کام کی۔۔۔ اس لئے میں نے بے پناہ لڑی ہے۔“
 ”اور بیٹھوں کا کام کن کرے گا؟“ میں نے ہاتھ کی چمٹی ہلاتے کھولتے اور پاؤں کے انگوٹھے سے کچھ سگن کی سٹی کر دیتے ہوئے پوچھا۔
 ”میں ہلا بندہ کو بھیج دلاں گا۔ وہی کیا کرے گا۔ ابا جی نے دودانے کی طرف قدم بڑھاتے پھرتے رک کر کہا۔ ”مگر اسی کے ساتھ خالہ کے ہاں چایا کرو گی۔ وہی چھین ہاں سے لے کر آیا کرے گا۔“
 وہ ہاتھ لگ گئے۔ میں نے بھی اٹھنے کے لئے چپلوں میں پاؤں پھنسائے لیکن اٹھ نہ سکی۔ نہ جانے کس احساس کے بوجھ تلے دل چھٹی رہی۔ میرا ذہن اب تک ایک کورا کاغذ تھا جس کی زیر تعمیر عمارت میں دھیرے دھیرے قدم عاتے جڑوں کے رنگ کبھی کبھی شاید اس کاغذ پر ابھرتے تھے۔ لیکن مجھے آج تک ان کا کچھ احساس نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ میرے لئے محض ایک سوالیہ نشان تھا۔ لیکن آج یہی سوالیہ نشان ذہن کے کورے کاغذ پر بہت زیادہ کھل گیا تھا۔ محسوس تھیں کہ کائنات دھیرے دھیرے اقبل بھٹل ہو رہی تھی۔
 مجھے ابا کا ہلا بدلا سا انداز کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ شاید اس لئے کہ الفاظ ان کے جیسے گہر دایات کسی لور کی۔ اس گھر میں رہتے ہوئے میرا ذہن بچپن سے کچھ ایسے سانچے میں اعلیٰ کیا تھا کہ اس میں کسی تیسرے لور کی مداخلت کی گنجائش نہیں تھی۔ اگر ایک رات پہلے نواب صاحب کی ذات شریف کا زہل اس گھر میں نہ ہوا ہوتا تب شاید ابا کے منہ سے کچھ ہوتے الفاظ مجھے یوں اجنبی اجنبی نہ لگتے۔

چائے لیا۔ من کی موٹی موٹی لڑکی سو نہیں پڑ پڑا کر رہ گئیں گویا وہ کچھ کہنے لگے ہوں مگر پھر ارادہ پھڑی کر دیا ہو۔
 میرے ہاتھوں میں دلی ہوئی شکاری سے گلاس اٹھا کر انہوں نے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ایک سانس میں غل کر دیا۔ سو پھل پڑ لگا ہوا دودھ صاف کر کے انہیں غل دے کر ایک ڈکار لے کر۔ وہ طہارہ لہائی کی طرف متوجہ ہو گئے۔
 ”بس صبح اندھیرے ہی تم ہمارے لئے گھوڑا گاڑی کا بندوبست کر دینا۔ کھانا پہنچ کر ہم کار کا بندوبست کر لیں گے۔ کوچران گھوڑا گاڑی واپس لے آئے گا۔ اب تم چاکر چند گھنٹے آرام کرو۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولے۔ ”لور ہو یا تم میں نے سمجھا ہی ہیں ان کا دھیان رکھنا۔ ان پر عمل کرنا ہم نے تمہارے ہی بھلے کو یہ سب کچھ کہا ہے۔“
 ”آپ بالکل غلط نہ کریں حضور! یہ تو آپ کی بددعا پروری ہے کہ آپ نے ہمیں اس قابل سمجھا کہ مشورہ سے لڑائیں۔“ لہائی نے کہا تاہم ان کے لیے میں اب پہلے کا سا خوشامدانی خوش و غموش نہیں رہا تھا۔
 ”ٹھیک ہے۔۔۔ بس اب چاہئے۔ میں بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں۔“ نواب صاحب نے کہا اور ہستہ پر لیت کر پانچویں رکنا ہوا کہیں چپے پر پہنچ گیا۔
 میں لور لہائی اپنے کمرے میں آگئے۔ لہائی نے دوسری لائین روشن کر کے طاق میں رکھ دی اور ہم دونوں اپنے اپنے بستوں پر لیٹ گئے۔ میں نے نواب صاحب کے دستے ہوئے ٹوٹ لہائی کے کچے کے قریب ہی رکھ دیے تھے۔ لیکن انہوں نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور نہ ہی کوئی بات کی۔ میں بھی خاموش رہی۔
 دھندل روشنی میں میں نے انہیں رضائی سے سر لگائے ’چٹ لپٹے‘ ہمت کر کے گھومتے دیکھا اور کچھ دیر بعد کھوت بدل لی۔ رفتہ رفتہ میری رگ و پے کی رخ بھگنیں ہونگی۔ جسم میں اتنی ہونگی غیر متزلزل و دھیرے دھیرے پگھلتی گئی اور لو کی حرارت لوٹ آئی۔ اس جسم میں تمام حرارت کی آغوش میں بھر گئے خیر آگئی۔
 اگلے صبح خلاف معمول میری آنکھ دن چڑھے کھلی۔ نواب صاحب نہ جانے کب رخصت ہو چکے تھے۔ اہا جی گھر پر ہی تھے۔ لور زمین پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ دودانہ صبح کو ہمارے ہاں ایک ملازم اور اس کا چھوٹا بچہ سلا کا لڑکا رجم آتا تھا۔ ملازم گھر کا کام کاج کرتی تھی۔ اہا جی کو پشت پر رکھ کر دیتی تھی۔ لور رجم بیٹھوں کے لئے چاہے وہ چار کرنا تھا۔ انہیں دلا تھا۔
 میں نے دیکھا کہ اس کی ماں تو گھر کے کام کاج میں مصروف تھی لیکن رجم کہیں نہیں آتا تھا۔ بیٹھوں کا چاہہ بھی تیار نہیں ہوا تھا۔ جانے سے پہلے ابا نے چار

غیر حقوق طور پر بلا رام اندر آیا۔ اس کے پیچھے دو خود چہرے تھے۔ رام نے بتایا کہ خلیوں میں تنگ سیڑی اور کچھ دیگر خفاک ہیں جو نواب صاحب نے بنوائے ہیں۔ اپنی ہی کچھ حیرت نظر آ رہی تھی۔ ہر حال انہوں نے بلا رام کو خفاک میں

ان دنوں میں مسافروں کی قیام گاہ طور پر دودھ اور بھلوں وغیرہ سے کی جاتی تھی۔ جب یہ چیزیں ملتی تھیں تو کچھ کر خفاک میں لے جاتے اور رام اہل سے کہہ دیتے۔ "تم لوگ یہ کھانا کھا کر جان بچا کر۔" نواب صاحب نے یہ چیزیں اسی لیے بھیجی ہیں۔

پھر اس نے اپنی کھانی دار بیگ اچھی طرح پاک پر بنا کر خیشوں کے اوپر سے میری دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس بیگ کا تو بہت ہی خیال رکھا کرو۔ البتہ عمر دراز کرے۔ پتی اور بیگ ہے۔" نہ جانے اس پر میری ہونٹوں کا کب اور کیونکر انکشاف ہوا تھا کیونکہ سے پہلے تو اس نے کبھی میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی بات

اس کے بعد کچھ معمول سامان گیا۔ ہر مہینے دو مہینے بعد نواب صاحب کی طرف سے نہ کچھ خفاک نہ معمول ہوتے۔ ان میں زیادہ تر بیگے یا کھاپ قسم کے پھل اور میوے ہوتے تھے یعنی ایسی چیزیں جو ہمارے علاقے میں مشکل ہی سے ملتی تھیں۔ ظاہر ہے یہ چیزیں گھر میں ہوتی تھیں تو والدین پر ہوس اور ہاستے والوں میں بھی ملتی تھیں۔ لہذا کی بھی ظاہر مطلب کے بعد بھی تھی اور خلیوں میں بھی زیادہ خاصہ لئے کا تھا۔ میں اس کرتی کہ عیالات کے اس تسلسل نے اپنی کو کچھ پریشان سا کر دیا تھا لیکن وہ اس

اور بعد سے متواں سا پریشانی کو دبا دے پھرتے تھے۔ میری عمر اب چھ سال ہو گئی تھی۔ دیکھنے والوں کو تھی "بڑا بوہل لگا ہے لڑکی۔" ہم عمر لڑکیوں میں شاید ہی کسی نے مجھ سا قد پایا ہو۔ شاید ہی کسی کی رنگت میرے خدوں کے گلابی رنگ سے سبیل کھائی ہو۔ شاید ہی کسی کی داغوں نے یوں ریشم کو ملت کھا ہو۔ "خیر، رنگ اور مجلسوں میں کوئی عورت سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالتی اور ایک سبتہ آمیز رنگ سے کہتی۔" "جس گھر میں جائے گی" اجالا کر دے گی۔

جس ریشم کو اپنی لے جان لڑکا کتا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس میں ہولناکیوں کی کیا بات تھی۔ میرے خیال میں جہاں کسی لیے بڑے اور سو فچوں والے گوی کو کتا جاسکتا تھا۔ ریشم بے چارہ تو ابھی لڑکا کتا تھا۔ پتا ملا ملا کہتے۔ اس کی تو ابھی سن بھی نہیں بھینگی تھی۔ میں نے بھی اس کے دھو پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی اور نہ ہی ہمارے درمیان کبھی زیادہ دیر تک گفتگو ہوئی تھی۔ میرا مدد اس کے ساتھ ایک طرح سے مامانہ ہونا تھا۔ ہر حال آج اپنی کی گفتگو سن کر ریشم مجھے کچھ پر اسرار سی محسوس ہوا۔ شاید اس کی سطح میں کوئی راز ہو تھا جس سے اہل طرف رہ تھے۔

سبیل۔۔۔ جہاں لڑکا۔۔۔ یہ کچھ اور سوالیہ لگتا تھا جو میرے ذہن کے کورے کھنڈ پر ثبت ہو گئے تھے۔ ہر حال شب و روز کچھ سے صاحب سے گزرتے گئے۔ اور پھر ایک شام ایک کار ہمارے دروازے پر آکر رکی۔



زے تاریکی کے دائروں سے گویا لائق طریت نکل کر میری طرف رنگ رہے تھے اور ہر طرف سے شرافت سے مشابہ تھا۔ وہ برس پہلے دیکھا ہوا وہ چہرہ مجھے بھولا نہیں تھا۔

"وہ رام۔" پلا غریب نے اما کی لڑکی کو تازہ سنی۔ "کیا میں اسے ملاں سمجھوں؟ یہ کیا ہے۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیا اس سے پہلے میں نے بھی تم سے ملا لیا ہے؟" میں نے پلا رام کی توازی سنی۔ "اب ہم چلتے ہیں۔" سمجھو مٹھی کی رسم ادا ہو گئی۔ چاند کی چھو آ رہی یاد رکھنا۔"

میری ہمدردی دھیرے دھیرے لوٹ آئی۔ میں نے پلا رام اور دونوں کو دودھانے کی طرف بولے دیکھا، جہاں بہت سے بچے گن جمع ہوئے تھے اور پچیس نظروں سے اندر دیکھ رہے تھے۔ کچھ بچے دودھانے کے سامنے کھڑی موز کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔

پلا رام نے انہیں ڈانٹا اور وہ تھوڑے ہو گئے۔ موثر دودھانے کے سامنے سے غائب ہو گئی۔ میں چوکھٹ کا سارا لے کر اٹھی، جسم گویا پھرا گیا تھا۔ بمشکل تمام قدم اٹھائی میں اٹھ کر ایک طرف بڑھی، وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"پلا" میرے حلق سے ایک دلخیز چیخ نکلی اور میں ان سے جا لپٹی۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میری ہانگی بندھ گئی تھی اور آتسو گویا صرف انہوں سے نہیں ہر موسم ہے پھوٹ رہے تھے۔ اما کے جسم میں بھی لرزاش تھی۔

"موت ہے۔" پلا غریب اما کی کواڈ چلنے کن گھرائیوں سے ابھری۔ "ایسا نہیں ہوگا جس میں ہونے دوں گا۔ تو نسل رکھ۔ مجھے سوچتے رہے۔" وہ بولے بولے مجھے اپنے گھر کے کچھ حوصلہ ہوا۔ میرے آتسو خیمے گئے۔

میں اس وقت بھی ان کے پیچھے سے گئی کھڑی تھی جب بھی کسی کی عورتوں کی ایک ٹولی میری داخل ہوئی۔ "ارے بھئی بچے چھپے رہو، رحم رکھو خداوندو! چپ چھپائے ہی بی بی کی شہی کر دی اور ہمیں کلاں کن ٹھہر نہیں ہونے دی۔" ایک عورت نے کہا۔

"سب ایسی بھی کیا رازداری۔ ہمیں خبر کچھ ہوئی۔" دوسری نے لقمہ دیا اور سب کے سب ہارے گرد گھیرا دل کر کھڑی ہو گئیں۔ مجھے ان سے خوف آ رہا تھا۔ حالانکہ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

"ارے بھئی ہمارے لڑکوں کے ساتھ رشہ بڑ گیا ہے مگر ابھی سے اتنی غیرت تو نہیں رہی ہے۔ ہم ہی تمہارے دکھ سکھ کے ساتھ ہیں۔" کر دت کو تازہ دلی ایک عورت نے کہا۔

پھر ایک اور عورت دوسری عورتوں کو پیچھے ہٹا کر آیا کے قہقہہ ہوئی۔ "بھئی یہ تو ہمارے ہی گل کیسے منڈھے چڑھی۔ ہم نے تو لوہا صاحب کو کبھی یہاں نہیں دیکھا، ان کے قہقہے ہی

کوئی سرد گرم چیدہ خاتون مگر اسے لوگوں کی راکھ میں اٹھایا، ہر کسی کی طرف سے ہتھیاروں کی جھلک دیکھی گئی۔ "کیا منہ اور عمر ہے! لگم ڈالنے والا بھی کئی ہوڑ کا ہو تو ہمت نہ ہے۔"

اور کوئی صرف دیکھتی اور دیکھتی ہی رہ جاتی۔ کسی مودی فکر ہیچہ کا اطلاق شروع ہو گیا تھا کیونکہ اب میرا گھر سے لگنا تقریباً موقوف تھا۔ لگنا ہوتا بھی تو سر سے پانچ تک تو گزری چاند میں پست کر۔ اس زمانے میں کم از کم گلاں و صلت میں رہتے دوسرے مودی کی نظروں اچھی بھوکی نہیں ہوتی تھیں کہ بس چلے تو سات پرہوں کو چیر کر جسم کے پار نکل جائیں۔ کسی کی نظروں تعاقب بھی کرتیں تو چنگھاہٹ، ٹھٹھک اور بے کسی کی تھوڑی سی لپٹی ہوئی ٹیٹھی طلب لے کر۔

پھر ایک روز عجیب حادثہ ہوا بلکہ شاید یہ حادثوں کا فطرت آواز تھا۔ ہمارے دودھانے کی موثر آکر رکی اور اما کی دودھانے پر پہلے تو پلا رام موثر سے اتر کر ان کے ساتھ اندر گیا اور اس کے پیچھے تین ڈانیاں بھی گھر میں داخل ہو گئیں۔ ان کے سروں پر بڑے بڑے قفل تھے جو گولے کھاری ڈالنے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ قفل انہوں نے چل گئے۔ میں رکھ دیکھ اور میری پلا نہیں لے کر ایک طرف سوپ کھڑی ہو گئیں۔ پلا رام چلے گئے۔

"یہ کیا ہے پلا رام؟" اما کی لے ہٹا ہوا کر پوچھا۔ "مٹھی کا کٹا رہ گیا ہے۔" پلا رام نے سر جھٹکا کر بڑی سلوکی سے جواب دیا۔ "لوہا صاحب نے تمہاری لڑکی کو پھنسا کر لیا ہے۔ اسی چاند کی چوڑھویں کو وہ دارات لے کر آئیں گے۔ رسم پٹی سلوکی سے ہوگی۔ تمہارے ساتھ کل آٹھ دس ڈانیاں ہوں گے۔ کوئی خاص احتیاط کرنے کی ضرورت نہیں۔" پلا رام نے خوشیوں دہن کے گل میں کھینچنے کے بعد کی جانیں گی۔ ہر حال تم اگر کوئی انتظام وغیرہ چاہو تو اس کے لیے یہ رقم رکھ لو۔"

اس نے پٹی منگلی سے ٹوٹوں کی ایک گڈی اما کی وائسٹ کی جیب میں ٹھونس دی۔ اس نے سب کچھ اتنی دھولتی سے کہا تھا گویا کوئی کھٹا کھٹا مضمون پڑھ رہا ہو۔ اما کی پٹی پٹی پٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے گویا اپنے خلاف ناکت گناہوں کی طرف لڑ جرم سن رہے ہوں۔ پھر وہ یوں کہنے لگی سے "میں میں پڑی ہوئی بی بی کی چاہائی ہے۔ مجھے گویا لاش ان کے پیروں تلے سے سرک گئی ہو۔"

میں پوربھی خلسے کے دودھانے میں کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ سب آخر شب کا طوابع محسوس ہوا۔ پھر لپٹنے کیوں میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھلکا گیا۔ میں نے چوکھٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی لیکن میرا ہاتھ اس سے رگڑ کھاتا ہوا تھا۔ آتسو گویا اور پھر میں نے اپنے آپ کو چوکھٹ پر پیٹھے پڑا۔ میری آنکھوں کے سامنے

کہا۔ ابا لیے لیے ڈگ بھرتے صحن میں آگئے۔ ان کے ہاتھ میں لٹھی تھی۔ جسم کی کچکپاہٹ دور سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔
 "نیر کو یہ کچاس۔" وہ دھاڑے۔ "ابھی کھل مچل دگنی نہیں ہوئی، صرف پیٹم آیا ہے اور تم لوگوں نے یہاں اچھل اچھکے شروع کر دیئے۔" دھج ہو چلا اپنے گھروں کو۔
 غصے کی شدت سے ان کی توالہ پھٹ گئی۔ انہوں نے لٹھی ہوا میں لرزائی۔ عورتوں میں انگڑائی لگ گئی۔ سب اٹھ کر باہر کو دوڑیں۔

"توبہ... توبہ..." ایک عورت میرے قریب سے اٹھ کر دوڑتے ہوئے چلائی۔ "ابھی یہ ہوں قریب دیکھیں نہ سنی۔" صحن میں رکے ہوئے تھال انٹ پلٹ ہو گئے اور ڈھیروں مٹا دیں اور دوسرے بھر گئیں۔ یہاں تے بکلی گئیں۔

ابا میرے قریب آئے۔ "نہو بیٹے! تم یہ سب کچھ ذہن سے نکل دے۔ بالکل نکل دو۔" انہوں نے مضبوط لیے میں کہا۔ "تو اب شرافت ملی کی ایسی کی تھی۔ تم اٹھ کر آرام سے کھانا کھاؤ اور سو جاؤ۔" سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سب قہقہہ کر لوں گا۔ میں اپنی بھول سی بچی کو اس غیبت کی ہیئت نہیں چہنٹے وہاں گا۔ چلو شاہاں اٹھو۔"

ان کے لیے کے اچھو نے مجھے بغلت گویا پاتل سے لٹل کر نکلتی پر لاٹھیا۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور باہر ہی چلنے سے کھانا نکالا جو ملازمہ نیچو تیار کر کے رکھ گئی تھی۔ توڑا بہت کھانا زہر مار کر کے ہم سرشام ہی سونے کے لیے جا لیئے۔ اب میں انگ کمرے میں لیٹی ہوئی تھی اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ ابا سونے میں کامیاب ہو گئے تھے یا نہیں، بہرحال مجھے رات گئے تک نیند نہ آئی۔ ابا کی باتوں سے گو کہ کئی اوجاس بندھ چکی تھی مگر نہ چلنے کیل طر لوب لوب جاتا تھا۔

آگلی صبح منہ اندھیرے ہی ابا نے مجھے چمکایا۔ دو دائیں اور کترکیوں کی کھڑیاں وغیرہ اچھی طرح لگا کر دیکھنے کی پدایت کی اور خود نچالے کہاں چل دیئے۔ صرف اتنا کہ مجھے۔
 "میں دیر سے کھن گگ۔ شاید دھیر تک۔"

طن چہنٹے تک ملازمہ نیچو نہ آئی اور سارا کام کلچ میں نے خود ہی کر لیا۔ یوں کچھ دیر کے لیے دھیمان بٹ گیا۔ بھیس اب ہمارے پاس ایک ہی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب چڑا ہوا آکر اسے لے جاتا تھا۔ اس بے زبان کی موجودگی سے بھی احساس تھا کہ کچھ کم ہو جاتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد گھر کھٹے کو دوڑا دیا تھا۔

ایک چلن غسل انتظار کے بعد لہا دھیرا ملے واپس آئے۔ ان کے چہرے پر مری حکن اور دھانگی تھی۔ دھل سے جوچاں لٹی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں دہرائی تھیں۔ غلاف معمول انہوں نے آتے ہی منہ ہاتھ نہیں دھوئے۔ کھلے کو بھی مس کر دیا اور سیدھے کمرے میں جا لیئے۔ میں ان کے پاس جا بیٹھی۔

نے ہیں۔"

ابا جی نے مجھے آگلی سے ایک طرف ہٹایا۔ پھر عورتوں کے چلنے کو روک کر دیوہوں کی طرف بیٹھک کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ کمرے میں گھس کر انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔ ان کے جاتے ہی کئی عورتوں نے بیک وقت مجھے پکار کر اپنی طرف کھینچا۔ "ارے دیکھو، بچی کیسے ارد ہو رہی ہے۔ خوشی ہونے کے بجائے درد ہو کر آنکھیں سیالی ہیں۔" کسی نے کہا۔

"کسی میں سنگلی ہلو کے موقع پر کیا حال ہوتا ہے۔" کسی نے ہانک لگائی۔
 "ارے یہ گھوڑی کیس سنگلی ہے۔ نہ احوک، نہ گیت، نہ شیریں، نہ سنگار۔" کوئی چا کر بول۔ "اری ہلو کو کچھ چٹھے گانے کا بندوبست کرو۔ بچی کا جی پرچاؤ۔"

آنا لگا کھس سے درمی احوک کر صحن میں بچاواں گئی۔ عورتوں نے مجھے چچ میں ہٹا لیا۔ وہ بچے سے میرا گھر گھٹ لٹل دیا اور ٹکیوں کی لے پر بے سری توالوں میں جانے کیا کیا گانے لگیں۔ پھر کسی نے چچ کر کہا۔ "ارے بھی احوک لاؤ، یوں مڑا نہیں آتا۔"

وہ عین عورتیں اٹھ کر باہر کو ہٹا گئیں۔ مجھے ان کی چٹکیں دھنڈل دھنڈل دکھائی دے رہی تھیں اور آوازیں یوں سنائی دے رہی تھیں گویا کھنڈروں میں ہزاروں چٹکیں حق ہو کر چچ دھار کر رہی ہوں۔

پھر احوک آگئی۔ جھوم کچھ اور بندھ گیا۔ میرے قریب باتوں کی جھنجھٹ جاری تھی۔ ہلو کی کے نصیب کھل گئے مگر ایک بات یہی قلعہ ہے۔
 "کیا؟" وہ سری نے بے ٹال سے پوچھا۔

"مٹا ہے تو اب صاحب نہیں تھیں بیروں کو تو اب تک طلاق دے چکے ہیں، دس بچے اب بھی محل میں موجود ہیں، کیتیز وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔" عورت نے کہا۔
 "ہائے اللہ۔ اتنی بیروں کا وہ کیا کرتے ہوں گے؟" ایک حیرت بھری توالہ ابھری۔

"مسوئل یہ نہیں۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ اتنی ساری بیواں کیا کرتی ہوں گی؟" ایک عورت نے کہا اور بے ساختہ کئی قبضے پھینچے ہوئے۔
 "ارے بھئی یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ لوہیوں کے ہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

پچھلی کسی عورت نے گویا دلواسلے مجھے تسلی دی۔
 پھر احوک پر قلعہ پڑنے لگی اور سب عورتیں گجوں میں شریک ہو گئیں۔
 عموں ہو ما تھا کہ لذت سے میرے دماغ کی نیس پھٹ جائیں گی۔ میں نے سختی سے انہوں پر ہاتھ رکھ لیے اور قریب تھا کہ میں ہیسروں کی تمام تر حالات کے ساتھ چلا آتا کہ ایک کھٹکے سے بیٹھک کا دروازہ کھلا۔

"بھولے ہاں یہ کیا سحر ڈھالا رہے۔" میت کا ہول یک لخت سکوت میں لٹا۔

یہی میں دیکھ ہوں۔ چلو تم آہستہ آہستہ جاری کرو' چلنے سے پہلے کچھ آرام کرنے کی بھی
"وہٹش کریں گے۔"

تو وہی رات کو ہم اپنے ہی گھر سے چمدوں کی طرح نکلے۔ لہانے قتل جوت کر گاڑی
پار کڑی کر رکھی تھی' میں نے ٹرنک گاڑی پر رکھا اور اس نیم پائے مکان پر الوداعی نظر ڈالی
جس کی عیادت میں' میں نے اپنے ان گنت مصوم اور اچھوتے خواہوں کا سو دے کر پار کی
تھی۔ اس مکان کے در و دیوار ہمارے ساتھ چلے گئے اور ہمارے ساتھ روئے گئے۔
یہ جان در و دیوار ہیں میرا بچپن کا قتل۔ اس کے چپے چپے میں میرے جسم کا لمس رہا
ہوا تھا' اس کی مٹی میں میرے وجود کی منک تھی۔

یہاں میں نے بھولوں کے ساتھ گڑبوں کے واہ رہائے تھے۔ اس کے طویل و عریض
میں میں ایک طرف شہوت اور چاہن کے جو گئے درخت کھڑے تھے' ان کی گھٹیں میں
نے اپنے ہاتھوں سے لٹکی تھیں۔ میرے چنے سے ہو کر سی اٹھی اور آنکھیں آنسوؤں سے
دھندلا گئیں۔ میں نے اما کی طرف دیکھا۔ وہ بہت بڑے دسری طرف دیکھ رہے تھے۔ نہ
ہنے ان کی کیا کیفیت تھی۔ ان لسانی فصلوں' غم دار چٹاٹوں' اس دھرتی اور اس مکان
سے ان کا رشتہ' ان کی وابستگی تو مجھ سے کہیں پرانی تھی۔

میں جلدی سے ہوئے میں سٹ کر بیٹھ گئی۔ اگلا پردہ میں نے اٹھایا تاکہ ابا مجھے نظر
آتے رہیں۔ ابا نے بیلوں کو ہٹا سا ٹھوکا دیا اور وہ بے لہان رشتی ہمارا بوجھ اٹھائے گردن
بکائے خاموشی سے چل پڑے۔ مکان کے سامنے سے گھوم کر ایک چھوٹے سے ٹالے کی
پڑ سے گزر کر ہم مکان کے عقب میں کچھ فاصلے طے کرنے کے بعد کچھ جگہ ہموار راستے
پر آگئے جس کے ایک طرف جنگل' دوسری طرف جوڑا اور اس سے آگے غیر آباد زمین
تھی۔

میرا دماغ مدال نہانے کیوں غیر معمولی طور پر مضطرب تھا۔ اس صورتحال میں اضطراری
کنیت تو فطری تھی لیکن اس اضطراب کی نوعیت کچھ عجیب تھی۔ مجھے ایک عجیب سا
حس تھا رہا تھا۔ مجھے چاندنی طرف سے کچھ غیر ملکی آنکھیں طاری جانب گھراں ہوں۔
اب آموں کی برائے نام سی مدفن میں چاندنی طرف کوئی ایسی مدح نظر نہیں آ رہا تھا۔
نکلنے کے دو چار کتے بھی نہانے کھل سوتے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی ابھرنے والی بھیگروں
اور بیڑوں کی نگرہ سی توانیں زمین کا احساس دلاتی تھیں ورنہ چاندنی طرف موت کا سا
سکوت تھا۔

ابناک جنگل کی طرف سے وہ آدمی نمودار ہوئے۔ وہ چل قادی کے سے انداز میں
گالوں کے قریب آئے اور ساتھ ساتھ چلے گئے۔ لہا کا انداز تھا کہ وہ ان کے لیے
آگے ہیں۔ وہ خوفزدہ ہو چکے تھے۔ میری دگوں میں بھی خون جھنے لگا تھا۔ میں نے ہوسے

دہم تک اعصاب شکن سکوت طاری ہوا۔ پھر وہ ایک لخت طوفانی کے سے لیے میں
پہل اٹھے۔ میری نظر میں تمہارے لیے جھوٹے تھے۔ میں ساری انا اور اصولوں کو
پالائے طاق رکھ کر سب کے گھر ہو آیا۔ سب کالوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ لوگوں کو یہاں تک
معلوم ہو چکا ہے کہ اس بد بخت جواب نے ہمارے ہاں مٹھی کا ٹکا دیا ہے۔
اب سب کا ایک ہی جواب تھا کہ حضور و ملا کے انتخاب پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ والدین
تو والدین' خود لوگوں میں بھی کوئی ایسا جڑی ہوا نہیں نکلا جو میری لالچ رکھ لیتا۔ حتیٰ کہ
میں اس لوگروں کے گھر بھی گیا۔ درجیم کے لیے۔ جسے میں نے گھر میں گئے
سے منع کر دیا تھا۔ وہ ظالم لاد بھی دشمن نہیں ہوا۔ "آنسوؤں میں الجھ کر ان کی
آواز دیکھ گئی۔" کوئی تم سے شادی کے لیے تیار نہیں ہوا۔"

میں پلنگ کی پٹی پر ساکت بیٹھی فرش کو گھور رہی تھی۔ میں یہ سب باتیں سننا نہیں
چاہتی تھی۔ اٹھ کر بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن کہاں جا سکتی تھی؟ ایک پار پھر سکوت چھا گیا۔
ایسا سکوت جس کا ایک ایک لمحہ صدیوں پر عید تھا۔

"اب ہمارے سامنے ایک ہی راستہ ہے۔" دلالتا' اما ہی اٹھ بیٹھے اور انہوں نے
میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ آنکھوں میں نمودار سواں لیے میں نے ان کی طرف دیکھا
مد سے کچھ نہ ہوں۔

ہم یہاں سے بھاگ چلے ہیں' کیس دور۔" ان کی آواز سرگوشی میں داخل گئی۔ میرے
ہم مردہ صاف میں لہجہ کی نئی کرن دھڑکی۔ اس سے ابھی تجربہ کیا ہو سکتی تھی۔ خدا کی قسم
موت دستگیر تھی۔ ناگہر کے سامنے نے تو ہمیں کچھ تک نہیں ستایا تھا لیکن انسانوں کے
پہن ہادی طرف لپکے گئے تھے۔ اب یہاں سے نکل چٹا ہی بہتر تھا۔

"کل گاڑی ہمارے پاس ہے۔" ابا نے کہا۔ "کھنٹی پہنچ کر کسی ٹرین میں سوار ہو
جائیں گے۔ کھنٹی گاڑی 'ایڈ' دلا نہیں بھی نکل جائیں گے۔ تم صرف قادی' زور اور پتہ
ایک خاص خاص کپڑے ٹرنک میں بھر لو۔ ہم تو جی رات کو خاموشی سے نکل جائیں گے۔
ٹھیک ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کے سینے سے لگ کر رہا
دی۔ "بھی کتنا بڑا بوجھ ہوتی ہے لیا جی!" میں نے ان کے ہاتھوں کو جن سے وہ میرے آنسو
پونچھ رہے تھے' چھوئے ہوئے کہا۔

"بھئی سے جی بوجھ دھو ہوتا ہے جان پرہا" انہوں نے میرا سر چنے سے لگا لیا۔
"تمہاری مرحوم ماں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں تمہیں حسب فتنی پڑھاؤں گے لیکن
اور تمہاری شادی کرتے وقت تمہاری پسند اور پھر اپنی فتنہ کو پیش نظر رکھوں گا۔ اور
سودا تو ہم دونوں ہی کی مرضی کا نہیں۔ خیر۔ یہ جی بڑی باتیں تمہارے سوچنے کی نہیں۔"

ناقص سے پوچھا۔ اس کے لیے میں ذرا بھی گھبراہٹ یا اضطراب کی ہلک سی نہیں تھی۔

”بھلا میری کریم کے ڈیرے پر۔“ دوسرے نے جواب دیا۔

”پلو جلدی کرو۔ یہ منزل کل پہنچ نہیں سکتی دیر میں وہاں تک پہنچائیں گے۔“ ایک بولا۔ وہ چاندی تل گاڑی پر چڑھ چکے تھے۔ ایک نے رسی تھامی اور دوسری کو درختی سے ہانکنا شروع کیا۔

میں بھی طرح پلٹے گی۔ میں کہنا چاہتی تھی۔ ”خانا! میرے باپ کی لاش تو ساتھ لے لو۔“ لیکن میرے ہونٹوں پر سے سخت بے رحم ہاتھ کا پتہ نہ لوث سکا۔ میں زیادہ چلی تو راج اور دالے نے راج اور کا بھاری دستہ میری کٹھنی پر رسید کیا اور میرے حواس کی غمارت لے گئی۔ آنکھوں کے سامنے لیے پیلے دائرے کھڑے اور پھر گری تاریکی چھا گئی۔

دب بگھے ہوئے آیا تو سب سے پہلے میری نظر ایک بہت بڑے فانس پر پڑی جو میرے چہروں کی سیدہ میں اونچی سی بھست میں بھول رہا تھا اور اس کے ان گنت پلوؤں میں رنگ برنگی دھنیاں جھل جھل کر رہی تھیں۔ پھر مجھے ان بہت سی عورتوں کی سرورنگی کا احساس ہوا جو میرے چاندی تل کی طرف چلی تھیں۔ ان میں سے ایک میرا سر دیا رہی تھی اور کچھیں پر کچھ مسل رہی تھی۔

وہ عورتیں میرے گھرے گھرے اور وہ عورتیں ہتھیلیاں سلا رہی تھیں۔ وہ عورتیں میرے جسم پر جڑ جڑو والے کسی سیال کی ہالٹ کر رہی تھیں۔ مجھے اپنا وجود نہایت ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا میں ایک عجیب سی گرمی ہوتی تھی۔ پھر اچانک مجھے اپنی بے لباسی کا احساس ہوا۔ میں نے سینے کی کوشش کی لیکن عورتوں نے مجھے جتنش نہ کرنے دی۔

”میں کہاں ہوں؟“ میں شاید کچھ اور پرچھنا چاہتی تھی لیکن میرے ہونٹوں پر یہ سوال آیا۔ سب عورتوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا، گویا جھل کر رہی ہوں کہ کان جواب دے گی۔ وہ سب ہی جوں جوں انہیں میری لور خالص مد تک خواہشورت بھی لیکن ان کے چہروں پر عجیب سا پیکا ہوا تھا۔ صرف ایک عورت جو میرے پلو میں دائیں طرف بیٹھی تھی، قدرے بڑی عمر کی تھی۔ چہرے ہرے سے سب کی سب شرمیلے اور ہنسنے لگی تھیں۔

”پانی خواب مجھ میں لور کھلے۔“ قدرے بڑی عمر کی عورت نے کہا۔

”میری۔ میری تو کوئی خواب کھلے نہیں۔ یہ کوئی جگ ہے؟“ میرے منہ سے کنواری کا ذرا ٹل جانا کہ میں غارت محسوس نہیں کر رہی تھی۔

”خواب صاحب کی زبانہ عمل سہرا۔“ اسی عورت نے ملامت سے کہا۔ ”تمہیں گھبراہٹ اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، ہر آرام ملے گا۔“

”مجھے میرے گھر پہنچا دو۔“ میرے ابا۔ ”میں نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر دنا چلا لیکن

میں پیچھے کو کھٹک کر پھللا یہ وہ اٹھایا۔ وہ آدمی گاڑی کے پیچھے پیچھے بھی آ رہے تھے۔ ان کی فٹکیں صاف فٹکیں تھیں لیکن ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ہندو لور دوسرے کے کندھے پر کھڑکی کی ہلک سی ضرور دیکھ لی۔ میں گھبرا کر لہا کی طرف متوجہ ہو گئی۔

گاڑی کے ساتھ چلتے ہوئے وہ دونوں کو میں سے ایک نے ایلے میں ہاتھ اٹھ کر ایک چہرے سا پتول لگا لیا اور اسے ہاتھوں میں اچھالتے ہوئے بڑے سرسری سے لیے میں بولا۔ ”کیس جا رہے ہو خداوار خان؟“

ابا نے کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے دیکھوں کی گیل کھینچ کر جھٹکا دے کر انہیں دھڑلے کی کوشش کی لیکن دوسرے کوئی نے رسی پر ہاتھ ڈال دیا۔

”اتنی رات گئے کیس چلا اچھا نہیں ہوگا۔“ راج اور دالے نے راج اور کا گھروڑا کھینچتے ہوئے کہا۔ ابا نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اس شخص نے دیکھوں کی رسی اتنی طاقت سے کھینچی کہ وہ ہلکا کر ایک دو قدم اٹھا کر رک گئے۔

”میں کہتا ہوں واپس گھر جاؤ۔“ وہ شخص گرجا لور لہا کی طرف منہ کر کے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ابا نے نہایت غیر محسوس طریقے سے ہاتھ پیچھے لاکر گاڑی میں پیچھے ہوئے گدے کے پیچھے سے کھڑکی نکالی اور گاڑی پر کھڑے ہو کر اس شخص پر وار کرنے کے لیے کھڑکی کو تیزی سے ہوا میں کھلایا لیکن وہ شخص اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

”مسو خداوار! وہ خوفناک لمحے میں غرایا۔“ میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ گھر واپس۔“

ابا نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے پیچھے چلائی کہ لگا دی لور ایک بار پھر کھل گئی۔ اس شخص نے وار خالی دیا اور اس لیے ایک ہی ایک دھماکہ ہوا۔ میرے منہ سے کھنکھنی کھنکھنی کی آواز نکلی۔ ابا سیدہ تمام کر ٹھیک میں ٹھیک گئے تھے۔ گولی پیچھے سے آئی تھی راج اور دالے نے فائر نہیں کیا تھا۔ پیچھے سے ان کے دونوں ساتھی بھی دوڑتے ہوئے آئے تھے کہ قریب آ پیچھے۔ میں دہشت سے سن چلی دیکھ رہی تھی کہ ٹھیک میں آیا چاندی تل کے چہرے پڑے تھے۔ ان کے جسم میں زندگی کی کوئی علامت نہیں رہی تھی۔

”تم بڑے جلد باز ہو۔“ راج اور دالے نے ہندو لور سے کہا۔

”میں سمجھا تھا تمہیں کھڑکی لگ گئی ہے۔“ ہندو لور نے لاپرواہی سے کہا۔ ابا نے لہا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اچانک میرا منہ لوتا اور میں پوری توجہ سے چلتے گئی، مسلسل لور بے تکلف۔ ان میں سے ایک اچھل کر گاڑی پر چڑھا۔

”میرے حجاب لافٹ کو دیکھو ہے؟“ اس طرح اس نے مجھے دیکھا اور ایک ہاتھ منہ کی طرف

پر رکھ دیا۔

”گاڑی تم نے کہاں کڑی کی تھی؟“ دوسرے نے تل گاڑی پر چڑھتے ہوئے

ایک مرد پانی کا گلاس دیتے یہاں نواب صاحب کے کمرہ خاص میں آئی، پھر وہاں نہیں جا سکی۔ پانی وہاں میں۔ تو میں ذرا غلط حالات سے ہوئی ہوئی یہاں آئی تھی۔ مجھے میرے سوتیلے باپ نے چند بدیہوں کے عوض 10 روپے دیا تھا۔ میرا نام نورجہاں ہے۔ تمہیں معلوم ہے ایک نورجہاں کون ہے؟

"میں سب کون ہوں؟" میں نے وحشت زدہ ہو کر پوچھا۔

"نورجہاں۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"اور نکات میں ہیں۔؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو اسی محل کے مختلف حصوں میں رہتی ہیں۔ بڑی عظیم تربیت ہی علیحدہ درجہ میں رہتی ہیں۔ ہاتھوں کا پتہ نہیں۔ بہت عرصہ ہو گیا ہے یہاں سے باہر گئے۔" نورجہاں نے جواب دیا۔ "تمہارے لیے بھی محل کا یہ علیحدہ حصہ مخصوص کیا گیا ہے۔"

احساس بے بسی سے میری آواز گھٹ کر رہ گئی۔ میں نے کچھ بولنا چاہا مگر نہ بول سکی۔ آنکھوں سے آنسو اتر کر رخساروں پر ڈھلنے سے پہلے کچھ نہیں بول سکتے۔ ہوتے ہوئے کچھ میں جذب ہو گئے۔ نورجہاں نے ایک ملائم اور دہڑ دہڑال سے میری آنکھیں پونچھیں اور جھاری مسی سے اترتے ہوئے بولی۔ "اب اندھ کر غسل کر لو اور لباس تبدیل کرو۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔"

میں اندھ بٹھکی۔ اپنے سر پر نظر پڑی تو مجھے اپنے آپ سے بھی قہار آگیا۔ عورتوں میں سے کسی نے میرا ہاتھ نہ لایا۔ کسی نے کمر میں ہاتھ نہ ڈالا۔ میں اپنے پیروں پر چل رہی تھی لیکن انہوں نے بڑے قہار انداز میں میرے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔ طویل و عریض کمرے کے وسط میں روشنی پر سے بھول رہے تھے۔ انہیں ایک طرف کو صیٹ کر دوسری طرف لے جایا گیا۔

ساتھ دیوار میں دروازہ تھا۔ دائیں طرف دیوار کے ساتھ سیاہ گلابی کی ایک عظیم الشان سنگھار میز لگی ہوئی تھی جس کا آئینہ دیوار کے تقریباً اس پورے حصے پر پھیلا ہوا تھا جو پردے کی حد حاصل سے پہچھے تھا اور یہ اتنا بڑا آئینہ بالکل بے جوڑ تھا۔ سنگھار کے سامان سے بھر بھری پڑی تھی۔

نورجہاں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ غسل خانہ بھی طویل و عریض تھا۔ کمرے سے کچھ ہی کم تھا۔ فرش اور دیواریں چکدار تانکوں سے مزین تھیں۔ سامنے کی دیوار پر اونچائی پر چنگی لگی ہوئی تھی جس کے نیچے حصے میں نوٹیاں اور خوارے نصب تھے۔ دیوار کے سامنے ہی سلیپ چمڑکی پر صحنہ چمڑکی کے دہانے تک جا رہی تھیں۔ ایک طرف لمبی سی کارنس پر رنگ برنگے دھاتی صابن رکھے ہوئے تھے۔ کھوتیوں پر چھوٹے چھوٹے سلیپ برائے تھے۔

تین بیویاں سلائے دلیوں نے میرے ہاتھ نہ چھوئے۔

"اب بھی تمہارا گھر ہے لڑکی! سب کچھ بھول جاؤ۔ چند دن میں تمہارا یہاں خوب دل لگے گا۔" عورتوں نے ہاتھ لپٹے میں کہا۔

"مجھے جانے دو۔" میں چہرہ اٹھی اور ساتھ ہی میں نے ایک تخت اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ میرے سر کے نیچے رکھے ہوئے کچے اچھے ملائم تھے جیسے ہوائے ریشم کا روپ دھار لپٹا ہوا بستر بھی ایسا ہی نرم اور گول تھا۔ عورتوں سے اپنے آپ کو چھڑانے کی میری ہر وہ حرکت میں یہ سب کچھ اٹھل پھل ہو گیا۔ میرے ساتھ ساتھ ان کے چہرے پر بھی مسکے کی بوندیں ابھر گئیں۔

"بیگم! میں اپنی جان بچان مت کرو۔" بڑی عمر کی عورت نے اپنی سانسیں پر کھج پالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں آنے کے ہزار راستے ہیں مگر جانے کا کوئی راستہ نہیں۔" جسٹس لکھنؤ کے لیے لکھی گئی تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے میرے چلو میں لپٹی ہوئی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام قدسیہ ہے۔ یہ بھی کم و بیش تمہارے ہی جیسے حالات میں یہاں آئی تھی۔ اس نے بھی بڑا دوا دلا کیا تھا۔ بعد میں تھیک ہو گئی تھی۔ صرف چار مہینے نورجہاں نے اسے شراب خلوت بخشا اور اس نے اسے دل بھر گیا تو اسے انعام کے طور پر ایک کاروبار کو بخش دیا۔ وہ نکاح پڑھوا کر لے گیا۔ دس ماہ گھر میں رکھا پھر کسی بات پر اس سے ناراض ہوا۔ صرف تین مہینے تو اسے طلاق طلاق طلاق کہا اور دھکا دے کر گھر سے باہر کیا۔ پھر خود بھی جاگیر سے باہر نہیں بھاگ گیا۔ اسے باہر کہیں اور پناہ نہ لی۔ خود ہی بیکس لٹ آئی۔"

میں نے اس عورت کی طرف دیکھا وہ باتوں کی نسبت کم عمر تھی۔ اس کی ہاتھیں لمبی اور نازک ستواں تھیں۔ رخسار دھلے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں اب بھی خوش شکل تھیں۔ اس کے ہاتھ تو بہت ہی خوبصورت اور گداز تھے جن سے وہ میری بات کر رہی تھی لیکن ان ہاتھوں میں حرارت نہیں تھی۔ میرے جسم کی حرارت بھی ان میں منتقل نہیں ہو رہی تھی۔ شاید ان میں اب حرارت جذب کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بدستور اپنی خوبصورت لمبی ہاتھیں جھکائے یوں اپنے کام میں مصروف رہی گویا بات کسی اور کی ہو رہی ہو۔

"اور یہ دونوں بیٹیاں ہیں۔" بڑی عمر کی عورت نے میری بے بسی دیکھی وہ عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہارا نور بھٹی۔ ان کی ماں نے بھی یہیں ہوئی گزار دی تھی اب یہ بھی گزار رہی ہیں بلکہ یوں سمجھو کہ گزار چکی ہیں اور یہ ہو تمہارے سرالے بیٹی ہے۔ اس کا نام سوہری ہے۔ یہ اپنی مرضی سے یہاں آئی تھی۔ پہلے بڑی عظیم کے پاس ہوئی تھی۔"

تورجیاں اور ایک دوسری عورت جس کا نام اس نے سہری بتایا تھا میرے ساتھ ہی
اندھ آگئیں۔ میں نے انہیں باہر جانے کو کہا تو تورجیاں بولی۔

"وہاں سے آئی گئیں۔ ایک دھندلے کا سلیقہ دیکھ لو" پھر یہ کام خود ہی کر لیا
کر۔"

۔۔۔ اور جس طرح انہوں نے مجھے بتلایا اس طرح مجھے لہانے کا واقعی سلیقہ نہیں تھا۔
اپنی نیم گرم اور خوشبودار تھا۔ اس سے گلاب کی منک میرے جسم میں رچ گئی۔ پھر وہ مجھے
فصل خانے کے دوسرے حصے میں لائیں جہاں دیوار کے ساتھ بنے ہوئے خانوں میں چند
لمبہ لمبہ تہ کیے رکھے تھے۔ انہوں نے میرے لیے سرخ سرخ درناں بھر لور دیا ہی خواہ
نہج کیا۔ یہ لباس میرے جسم پر یوں پورا ہوا جیسے میرے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ پھر انہوں نے
مجھے باہر لا کر سنگھار میز کے سامنے بٹھا دیا۔ تورجیاں دودھ لے کر آئیں اور ہتھ کھول کر باہر
بھاگتا پھر جانے کس سے کہا۔ مشالہ کو بھیج دو۔"

کچھ دیر بعد لورجی عمر کی ایک بچی نکلی عورت اندر آئی جس نے اپنی مشالہ کی
تہم ہر اپنے لورجی بھی جی بھر کے آنا رکھے تھے۔ تورجیاں سنگھار میز کے قریب کھڑی رہی
باقی کھینچ باہر چلی گئیں۔ مشالہ نے ایک لفظ نہ سے نالے بلکہ شہتی انداز میں میرا
سنگھار شروع کر دیا۔

آج تک مجھے دلہن بنی ہوئی ہر لڑکی تو مصورت کی تھی لیکن مشالہ کی تقریباً ہون کھنے
کی معمولیت کے بعد جب میں نے کہنے میں اپنے آپ کو دیکھا تو خود سناٹے سے قطع نظر
توجہ تک دیکھی ہوئی تمام دلہنیں اپنے سامنے بچہ نظر آئیں۔ اپنے عکس پر مجھے اظہار نہ آیا۔
کیا واقعی یہ میں تھی؟

"چشم بد دور۔" تورجیاں نے بتائیں لیتے ہوئے کہا۔ "ہماری آنکھیں چکا چوند ہو رہی
ہیں" نواب صاحب کا تو لہانے کیا مل ہوگا۔ اس محل میں چاند تو بڑے اترے لیکن آفتاب
آج اترا ہے۔"

میرے کانوں میں اپنے کانوں کی کسی عورت کے املا گونج اٹھے۔ "جس گھر میں ہلے
کی اجلا کر دے گی۔" مگر یہ گھر تو نہیں تھا جہاں قسمت نے مجھے پہنچا دیا تھا۔ میں نے تو
کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ حسن و نسوانیت کا یہ بڑا تانہ میرا مقدر ہوگا۔ میں نے تو ایک
چھوٹے سے گھر کے خواب دیکھے تھے جہاں میرا راج ہوگا۔ ایک محبت کرنے والے کے بچے
دیکھے تھے جس کی میں عزت ہوئی۔ جو میرا صرف میرا ہوگا۔ جس کے دم سے میری ہستی
سلوٹی۔ کیا میرا حسین ہونا اتنا ہی بڑا جرم تھا کہ باپ اپنی زندگی دے کر مجھے سزا سے نہ بچا
سکا۔؟

میرا مصوم ذہن نجانے کیا سوچتا رہا اور شکل ہو گیا۔ مشالہ کب کی جا چکی تھی۔

نشا اٹھ کھڑی ہوئی۔ تورجیاں والد سے فہم کر مجھے مسی ہوئی تک لائی اور گاڑیوں کے
سارے بٹھائی ہوئی بولی۔ "اب تم یونہی ہی سنو رہی رہا کرو۔ نواب صاحب کی گھر و رفت
ب اور عری رہے گی۔" پھر وہ کمرے پر ایوانی نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ "اب میں چلتی ہوں
نئی چیز کی ضرورت ہو تو صبری کے قریب یہ بھی ہوئی ڈوری کھینچ دینا" خدام کہاے گ۔
مجھے ہلکا ہوا تو اس سے کہہ دیا۔ کھانا وغیرہ نہیں آجائے گے۔ اور دیکھو ابھی چہ دن تک
باہر کل کر اور اور جانے کی کوشش نہ کرنا" خواجہ لالہ ابھی میں پڑی گئی۔ "وہ مشالہ سے
ناز میں سکرانی لور رخصت ہو گئی۔

اس کے قدموں کی تواز معلوم ہونے ہی میں مسی سے اتر کر کھڑکی کی طرف بڑھی
نہ پر ہارک ہوتے پڑے ہوئے تھے اور ان میں سے معمولی سی روشنی چھن چھن کر اندر
آ رہی تھی۔ میں نے بے تلی سے پردے ہٹائے لیکن یہ دیکھ کر دل بھ گیا کہ کھڑکی میں
سامنے کھلی ہوئی تھیں۔ باہر سرسبز گھاس کا فرش، پھولدار پھول کی کیاڑیاں اور دور ایک
بڑا حوض کے درمیان فوارہ چلا نظر آ رہا تھا۔ باغیچے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا
منظر تھا کہ میں کم از کم چھ سات گھنٹے بے ہوش رہی تھی۔

میں کھڑکی سے اٹھ کر دیوار کے ساتھ کھلی ہوئی سیر پر نظر پڑی۔ اس سیر پر مشغلوں میں
مختلف کھیل بے ہوئے تھے۔ مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ایک سرخ سیب
اٹرایا۔ چھری قریب ہی رکھی تھی لیکن میں سیب کو کاٹنے پر تیار نہ تھی۔ آدھے سے لڑوہ
سیب کھا کر باقی میں نے کھڑکی کے راستے باغ میں پھینکا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر
بھاگا۔

دروازہ ایک بیوی بی میں کھلا تھا جو بالکل خالی تھا۔ اس میں صرف لالین بچا ہوا
تھا۔ اس کے دونوں سروں پر ایک ایک دروازہ تھا۔ میں دائیں طرف والے دروازے پر
پہنچی اور اس کا لٹو کھٹا کر اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میری
ذہر آنکھ سے تھوڑی سی تواز پیدا ہوئی اور فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ میں باہر قدم رکھنے
فر کی تھی کہ کسی نے ہالو سے رسہ روک لیا۔ میں نے گردن لٹال کر دیکھا باہر ایک
انورن مسند کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں تو مجھے اس پر عورت کا گمان گزرا تھا کیونکہ اس کی
پاس میں سو گھنٹیں چٹ تھیں اور وہ عورتوں جیسی گلابی گھیر وار قبض اور سبز چوڑی دار پہنا
پنے ہوئے تھا۔ کانوں میں ہالیاں تھیں، کمر میں پٹا بندھا ہوا تھا جس کے ساتھ چھوٹی سی
تہم میں ایک بھڑ بھول رہا تھا۔

"بہاد کرم باہر تھک نہ لائیں۔" اس نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"ہائیل؟" میں نے حتی الامکان باریب تواز میں پوچھا۔

"نواب صاحب کا حکم ہے۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا اور دروازہ بند کرنے لگا۔

انہیں دور ہی سے پہچانی ہے۔

اس نے کھٹار کر گلا صاف کیا اور قدرے بلند گوار میں بولے۔ "چلو کھانا کھا لو۔"

میں نے شکل چھ لہجے زہوار کیے اور دائیں مسی پر آگریٹ آئی۔ میرا آپ بولے۔
ہاتھ پاؤں ہلانے حتی کہ سوچنے تک کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میرے حواس شکل ہو چکے تھے۔
کچھ ذہن پھر وہ کبیریں آئیں اور برتن طشچروں میں رکھ کر سنے گئیں۔ اور جہاں بھی ان کے
ساتھ چلی گئی۔

مجھے وقت کا احساس نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر میں تدریک ٹکڑوں میں مطلق رہی۔
جب میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے اور سولی ہوئی حسیات کو چنگلے کی کوشش کی تو احساس ہوا
کہ کمرے میں تدریک کی شکل رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر حق جاننے کا ارادہ کیا مگر وہ تک نہ
اٹھ سکی۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ اور جہاں ایک ہر پھر کمرے میں آئی۔ وہ کچھ جھلک میں
تھی۔ اس نے تپاں روشن کیں اور کمرہ جگمگا اٹھا۔
"آپ صاحب تشریف لارہے ہیں۔" اس نے اعلان کیا۔

مجھے پیچھے ہٹنا پڑا۔ میں نے آپ کو سرے دودارے کا رخ کیا۔ یہاں بھی میرا سامنا اسی قسم
کے ایک لہجوں سے ہوا۔ اس کا لباس بھی ویسا ہی قیاسی تھا۔ یہ ابھارا تھا۔

میں کمرے میں لوٹ آئی اور چنگ پر ڈھیر ہو گئی۔ پھر میری آنکھوں میں اپنی کا سرخ
ابھر آیا اور بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے۔ روتے روتے میری ہنسی بندھ گئی لیکن پھر وہ
ہلا سٹکار دیواروں والے اس طبقے میں میری سسکیاں ملنے والا اور میرے زخم دل پر پھلا
رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ روتے روتے نہانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ کسی نے میرا کندھا ہلاتا
تھا جس سے میری آنکھ کھلی۔ میں کوٹ لے کر سیدھی ہوئی تو دیکھا اور جہاں تھی۔
"رے تو نے تو دودھ کر سارا کاہل غروب کر لیا ہے۔" وہ بولی۔

سمماڑ میں گیا تمہارا کاہل۔ لہذا کچھ اس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں چلا اٹھی۔
اس نے گویا میری بات سنی ہی نہیں۔ ایک مہل کا کونہ گیلا کر کے لائی اور میرے
پچھنے پوچھنے دیکھ۔ "کھانا کھا لو۔" اس نے ملاحت سے کہا اور میز کی طرف اشارہ کیا۔ میں
مکمل انداز میں اٹھ بیٹھی۔ میز پر کسی قسم کے کھانے رکھے ہوئے تھے۔ "اور کسی خاص چیز
کی ضرورت ہو تو بتا دیا۔"

میں نے زخمی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے خاموشی سے گردن جھکا لی۔
پھر لمبے خاموشی رہی، دغما" میں نے گلوگیر گوار میں کہا۔ "تم کسی طرح مجھے یہاں سے
نہیں نکل سکتیں؟"

اس نے سر اٹھا کر سپاٹ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "میں نے کہا میں کہ یہاں
آنے کے تو ہزاروں راستے ہیں، جانے کا کوئی راستہ نہیں۔" پھر ایک لمبے خاموش رہ کر
بولی۔ "ایک مرتبہ ایک کبیر نے ایک لڑکی کو قرار ہونے میں مدد دی تھی۔" "پھر۔" میں نے
سے نکلی سے پوچھا۔

"اس کے سارے ناخن انہور سے سمجھے لیے تھے۔ جنہوں سے کھل اور دی گئی
تھی۔ پھر اس کے کمرے کے دودارے پر موبوں کی قطار لگا دی گئی تھی۔ وہ لہجوں تھی، پھر
بھی یہ لہجہ بدداشت نہ کر سکی۔ کچھ دنوں بعد طون تھوکی مر گئی۔ میری تو آپ ایسی مر
بھی نہیں رہی۔"

ہر سب کچھ اس نے سپاٹ اور ہر جذبے سے عاری لیے میں کہا تھا لیکن اس کی
آنکھوں میں دھواں ہی دھواں پھیل گیا تھا۔ میں نے ہنر جمی لی تو وہ بولی۔ "اور سب سے
تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ جس لڑکی کو اس نے بھاگا تھا اسے کوہے سمجھنے سے بھی کم
وقت میں دھواں کر گئی میں حاضر کر دیا گیا تھا۔ تو اب صاحب کے مافکوں کے پاس شکاری
کئے ہیں اور خود مافکوں کی ناکیں ان کھوں سے بھی لہذا تیز ہیں۔ جہاں لڑکی کی خوشبو تھی

دھیرے دھیرے ان کی منکراہٹ لوٹ آئی اور وہ کچھ آگے ٹھیکے ہوئے ہوئے۔
 "انٹلی لور آؤں سے کدو؟"

"آپ تو مجھ سے شادی کر رہے تھے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر لور دے کر کہا۔
 "ان کے ہونٹ کھل گئے۔ "تکس مگر چالاک ہو۔ شادی سے پہلا کیا فرق پڑا؟
 "تو لیت تو رہیں ہونی چاہیے۔" انہوں نے دل پر اٹلی رکھی۔ "جن سے شادی کر رہی
 ہے ان کے پاس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ ہر حال تمہیں اتنی ہی فکر ہے تو شادی بھی کر
 لیں گے یہ کونسا مشکل کام ہے۔" انہوں نے بند گئے کے کوٹ کے اوپر ہی ہن کھل کر
 ان پر لمحات بے تلی سے لڑائی ہاتھ میری طرف پھرائے۔

میری تمام تر غرت اور کراہٹ گویا اب ایک لفظ پر مونٹ کر ہو چکی تھی جس نے مجھ
 پر خوف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے لوب صاحب کے منہ پر گونہ
 دید کیا۔ وہ گوشت کا پھاڑ اپنی جگہ سے ہلا تو نہیں الہت گردن ٹھکے سے پیچے کو جھک گئی۔
 اب گردن سیدھی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ لوب صاحب کا لپٹا ہونٹ درمیان سے پھٹ
 گیا تھا اور خون کی ایک تلی سی کیر ٹھوڑی پر پھسل آئی تھی۔

"اڑی۔" وہ دھارے اور ایک ٹھکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ٹھوڑی پر اٹلی بھر کر
 انہوں نے ایک نظر خون کی سرخی دیکھی اور اس اٹلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے
 فرمے۔ "یہ خون تمہیں اپنی زبان سے چاٹنا پڑے گا مستر۔"

انہوں نے مجھ کو چپڑا دیکھ کر کہنے کے لیے ہاتھ کھلایا لیکن میں پھرتی سے ہلی اور مسہری
 سے اتر گئی۔ وہ میرے پیچھے دوڑے۔ "تم مسہری کے گرد پکر کاٹنے لگے۔ میں نے یہی طرح
 چنا شروع کر دیا۔ تب لوب صاحب بڑے اطمینان سے مسہری پر یوں بیٹھ گئے اور کچے
 کنبیوں کے بچے کھینچ کر یوں دیکھنے لگے گویا کوئی دلچسپ تماشا ہو رہا ہو۔

"چپڑا خوب چپڑا۔ کوئی نہیں نے گا۔" انہوں نے پھولی سانوں کے درمیان کہا۔
 میں دروازے کی طرف دوڑی اور ایک موبوم سی امید کے ساتھ اسے کھولنے کی
 کوشش کی۔ وہ باہر سے بند تھا۔ دروازے سے ٹک لگا کر میں نے بے بسی سے چاروں
 طرف دیکھا اور پل مرتبہ مجھے اس پنجی کے محسوسات کا اندازہ ہوا جسے نگاری ہل پھینک
 کر پکڑتے ہیں۔ پھر لمبے ٹھوڑی رہی۔ لوب صاحب دور پیچھے لاجملہ نظروں سے مجھے دیکھتے
 رہے۔ پھر انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اٹھ کر دونوں بازو پھیلا کر میری طرف بڑھے۔
 میں نے دیوار کے ساتھ کھسکا شروع کر دیا۔ کونے میں پہنچ کر میں گر گئی۔ لوب صاحب
 نے مجھ پر اٹلی اور مسہری پر لا چنا۔

"تم نے جی جی منہ لور گھوڑیوں کے کھٹے کھوا دیے ہیں تم کیا چیز ہو مٹی جلی۔"
 انہوں نے بڑے غر سے کہا لیکن اوجھے منہ کی ٹھکس لور ہاتھ پائی کے بعد وہ جھکے ہوئے

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "ایسی تمہارے لوب صاحب کی۔" میں یک لخت پہنچی۔

اس نے حوصلہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔
 منٹ گزر گئے۔ بلاخر دروازہ کھلا اور پھر میں نے اس عذرت کو دروازہ پر کھڑے دیکھا۔
 میری رگوں میں دوڑتا ہو لہرت کا لہا بن گیا۔ ان کی رنگت پہلے سے زیادہ نارنگی ہو گئی۔
 پہلے سے زیادہ بھاری اور شکل پہلے سے زیادہ نحوس نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر سرخ سرخ
 آنکھیں یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے تو بے پروا لہارے پڑے ہوں۔ یہ آنکھیں ایک
 تک گھور رہی تھیں۔ جھپکنا بھول گئی تھیں۔ پھر دھیرے دھیرے ان کے بھڑے ہونٹوں
 کدو منکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہم نے ذہن میں لکھنا چاہا تھا کہ اس عمر میں تم نے کیا روپ لٹا ہوگا۔" انہوں
 نے وہی کھڑے کھڑے بھاری کوال سے میرے پر وہ سماعت کو چھیدتے ہوئے کہا۔ "لیکن
 نے تو ہمارے اندازوں کو ملت کر دیا ہے۔ پشام لکھ۔ پشام لکھ۔"

وہ ہاتھی کی طرح قہقہہ قہقہہ کرتے آئے اور مسہری کی پٹی پر بیٹھ گئے۔ میں اپنی جگہ پر
 اور سٹ کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہو نا؟"

"میرے ابا کو قہقہہ کوانے کے بعد آپ پوچھ رہے ہیں کہ مجھے کوئی تکلیف تو نہیں
 ہوئی۔" میں نے جتنی آنکھوں سے انہیں گھورتے ہوئے ڈھریلے لیے میں نے۔

"بھرا ہم نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا تھا۔" انہوں نے تیزی سے اپنے پیچھے نما پانچ
 ہارے۔ "یہ ایک حادثہ تھا۔ تمہارے ابا کی یہ قوتی کا نتیجہ ہر حال اب تم سب کچھ بھلا
 جاؤ۔ ہم تمہاری ہر تکلیف کی مٹائی کر دیں گے۔ تمہیں سہلے میں قہقہہ دیں گے۔"

انہوں نے بڑے محبت بھرے انداز میں میری طرف ہاتھ پھیرا۔ میں نے ان کا ہاتھ
 جھٹک دیا۔ ان کی جی ہوئی موٹھوں سے سے کدو منکراہٹ یک لخت غائب ہو گئی۔ ایک
 لمحے کے لیے انہوں نے سخت نظروں سے مجھے گھورا۔ میں بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں
 والے دیکھتی رہی۔

کے کی طرح ہانپے گئے۔ پر مجھے موقع ملا اور میں نے دونوں پاؤں اڑا کر ان کے پاموں کی طرف سے ضرب لگائی وہ مسمری پر چبھ ہو گئے۔

میں اسی لمحے میرا ہاتھ قریب ہی میز پر رکھی ہوئی پلوں کی ایک فٹھری سے کھینچ کر اٹھی تو مجھے اپنے ہاتھ پر کسی تیلی کی ٹھوس جڑ کے لمس کا احساس ہوا۔ ایک امیر سے میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آگیا۔ یہ پل کانٹے والی چھری تھی۔

نواب صاحب اللہ کر ایک بار پھر مجھ پر بھیڑے تو میں نے اپنی بی بی کی جانب بھاگ کر چھری سے ان کے پہلو پر وار کیا لیکن چھری یہ کوشش با نام رہی۔

نواب صاحب کا کوٹ نہایت دھڑکڑے کا تھا اور چھری کا پھل ڈکھار نہیں تھا۔ سے کھل گیا۔ تاہم نواب صاحب کو اپنی تخلیق ضرور پتھی کہ ان کے حلق سے اپنی کھنکھل گئی۔ ارا بیچے ہٹ کر انہوں نے میری کھائی پر ہاتھ ڈالا اور بھونڈا انداز میں اسے چھو ڈالا۔ چھری میرے ہاتھ سے بھوٹ کر فرش پر جا گری۔ میں نے قہر کر دیکھا تھا کہ جب تک میرے دم میں دم ہے، شکست نہیں مانوں گی۔ مزید ایک تودہ منہ کی کھنکھل نواب صاحب سے دم ہو گئے۔

تو تم یوں نہیں مارو گی۔ انہوں نے اچانک مجھے چھوڑ دیا اور قریب ہی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ڈوری کو ہٹا دیا۔ میں نے مسمری سے اترنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے پاؤں سے پکڑ لیا اور اب میری طرح کھرجکے تھے۔ چند لمحے بعد دودھالے پر دستک ہوئی۔

”سرواڑوں کو بھیج دو۔“ نواب صاحب نے بلہجے ہوئے یہ آواز باندھ کر کہا۔ میری جگہ اب ابھی جاری تھی۔ چند لمحے بعد بڑی آہستگی سے دودھالہ نکلا اور کوئی اندر آگیا۔ دودھالہ اس کے عقب میں بند ہو گیا۔ نواب صاحب نے اب خود ہی مجھے فرش پر دھکیل دیا۔ قدمے مجھے اتران میں سر اٹھا کر میں نے دودھالے کی طرف دیکھا اور میرے لڑنے جسم میں ایک لے خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ ایسا خوف مجھے نواب صاحب کو دیکھ کر بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔

آنے والے تھی تو عورت لیکن میں تصور تک نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی عورت ان بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا قد کم از کم چھ فٹ تھا۔ زیادہ ٹھیم ٹھیم نہیں تھی مگر اس کا موہل کی طرح چوڑا چکلا تھا۔ رنگت گہری سالی اور رخساروں کی پٹیاں بہت ابھری تھیں۔ پتلے پتلے سلاک ہونٹ یوں تھنی سے ایک دوسرے پر تھے ہوئے تھے کہ دہانے پر ہر لمحہ ایک کبیری نظر آ رہی تھی۔

اس کی عمر کا انداز لگانا مشکل تھا تاہم ہل سیادہ ہی تھے جنہیں اس نے تھنی سے لوہے کی کھنکھن کر سر کے نیچے میں جڑا ہوا دیکھا تھا کہ اس کی پتی پتی جھنوں کلن ہو کر رہ گئی تھیں۔ ”کسی سیادہ کھڑے کپڑے کا مودوں جیسا کرتا پاپا۔ پٹے ہوئے تھی۔ آستینیں چھوڑ کر

پلی تھیں اور اس کی چوڑی چوڑی کلائیوں پر ہل نظر آرہے تھے۔ اس کے سر پر اس وقت ترین جڑ اس کی آنکھیں تھیں۔ میرے جسم میں دھولے والی مسمری لہر کا ہامٹ ہوا محسوس ہوا تھا۔ ان میں ایک عجیب سی پیاس تھی۔ خون کی پیاس سے ابھی زیادہ خوفناک اور یہ آنکھیں شاید جھپکتا تو جانتی ہی نہیں تھی۔

”سرواڑوں!“ میرے عقب سے نواب صاحب کی گواہ سنائی دی۔ ”موتوں بعد ایک لڑھی کھیر لگتی ہے۔“

”ہاں۔۔۔ موتوں بعد۔۔۔“ عورت کے پتلے پتلے ہونٹوں میں جھنپش ہوئی اور لفظ ایک سنگاری کی طرح برآمد ہوئے۔ اس کی نظریں بہ ستر مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر ”نواب“ کی ایک زوردار گواہ سنائی دی اور جب میں نے دیکھا کہ عورت کے ہاتھ میں ہتھکڑی بٹل تمام میں نے اپنی لڑائی لڑائی پر اپنے جسم کا بوجھ اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔

دھنک! مجھے خیال آیا کہ اگر میں دوڑ کر حسل خانے تک پہنچے میں کامیاب ہو جاؤں تو اندر تھس کر کڑی بند کر سکتی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس اقدام سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا لیکن میرے ذہن میں ایک ہی صدا گونج رہی تھی۔ مزاحمت! مزاحمت!

ابھی میں حسل خانے کی طرف دوڑنے ہی نہ پائی تھی کہ شاہین کی گواہ کے ساتھ ہنر بھری کمر میں اٹھنا اور اس سے پہلے کہ اس کا گھیرا کھل پانا، سرواڑوں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے ایک جگہ سے پڑ گئے تھے اپنی طرف کھینچ لیا جیسے جی کو بھٹکا دے کر کانٹے میں پھنس ہوئی گھلی کو کھینچا جاتا ہے۔

میں سیدھی اس کے چنے سے جا کھائی لیکن اس نے میرا گریبان پکڑ کر مجھے اپنے سے چند انچ کے فاصلے پر دھک لیا۔ ہنر کو چھوڑ کر اس نے میرے گل پر دھنکے کا پتھر دھیر کیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ سرواڑوں کا ہاتھ گویا لوبے کا ایک دلی بند تھا۔ پھر اس نے گریبان کو نہایت مشاقانہ ہٹکا دیا اور میرا چہرہ نیچے تک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

سرواڑوں نے کھنکھے سے میرے ہونٹ پر ضرب لگائی اور ہونٹوں میں اپنائی سی لے کر آگے دھکیلی اس کی کتنی میری گدلی پر پڑی۔ اس نے پاؤں سے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور دور چھینک دیا۔ نواب کی گواہ ایک بار پھر گونجی۔ ہنر شاید میرے ہی جسم پر پڑا تھا مگر میری حسیات اب جواب دے چکی تھیں۔ اچھا ہی تھا کہ ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اب میں ایک کوشہ عالیات تھا میرے لیے۔

مجھے نہیں معلوم کہ بے خبری کا یہ وقت کتنا طویل تھا۔ جب آگے کھل تو جسم پھولے کی طرح دکھ رہا تھا۔ جہاں تک لگاؤ تھی میں نے اپنے آپ کو خراش خراش پایا۔ یوں محسوس ہوا تھا کہ میں ملاحت کی ایک دھل سے غل ہوں جس میں ہزاروں ساپ، چھوڑوں نے

مجھے اُسا ہے اور فن گنت جو کھیلنے میرا لوجہ سا ہے۔

نورجی اور سوہی میری مسیروں پر دائیں بائیں موجود تھیں اور ایک بار پھر خوشبودار پتے سیلاب سے میری باتش کر رہی تھیں۔ میں نے کچھ دیر دنگرے فن دنگرے طرف دیکھا۔ دونوں نے نظریں جھکا لیں اور اپنی مسیروں میں مصروف رہیں۔ میرے دل میں ایک بے نام ستا چھا چکا تھا۔ کچھ کہتے "سننے یا جاننے کی خواہش مرگئی تھی بلکہ اندازہ تھا کہ میں خود بھی مر چکی تھیں۔ آہنگی سے میں نے کھوت لے لی۔ بستر کی چادر ہلکا کر رکھی۔ میں نے ایک والد بھیا کر چھو چھپا لیا اور آنکھیں سوجھ لیں۔ میرے حلق سے سسکی نہ نکلی، جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ بس خاموشی سے آنکھوں سے آنسو بہہ کر میں جذب ہونے لگے، حتیٰ کہ میرے رخسار کے نیچے کلیہ بھج گیا۔ شاید میرا وجود ہی بن گیا تھا۔ تسک اور گھٹ کا آنسو!

دونوں غور میں خاموشی سے میری علامہ داری میں مصروف رہیں۔ وہ کچھ سنے پہلے پتوں جوڑ رہی تھیں۔ نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے نورجی کی کواڑ سنی۔ "نورجی! جس میں خود ہی کرنا چاہ رہی تھی، فن دونوں کا سارا لے کر اٹھ بیٹھی۔ جس سے تنگ حلقے میں بھی مجھے ان کے سارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

جس کھیلنے لود سے کپڑے پہنے کے بعد فن کی دھانگی تو دور ہوئی، من کا چہرہ بھلا ہوا کا توں رہا۔ ایک سیر کھانا لے کر آئی تھی۔ نورجی نے تقریباً اسی جتنی چوڑائی سے میرے حلق میں فہرے "خاموشی" کا لہجہ اور گالا سا کوئی شہرت مجھے پلا لیا اور آرام کرنے کی تلقین کر کے چلی گئی۔

تیسرے دن پائل رشتہ پر اپنی فتح کا جھنڈا گاڑنے نواب صاحب پھر آئے۔ زمین کو اپنے مقدمہ معلوم ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کی کوکھ سے کوئی ڈنڈہ نہ پھوٹا۔ نواب صاحب نے جب مزاحمت کے کوئی آثار نہ دیکھے تو بے حس دھڑکی پر ان کے جھگڑتے قدم کچھ جھڑکے۔ مصلحت کی لاش پر فتح کا جشن رات بھر جاری رہا۔

اس کے بعد زندگی اس صاحب پر بھی۔ فلاکتوں کی دلدل میں ہاتھ پاؤں مارنے کی جگہ میں نہ رہی۔ نواب صاحب پہلے پہلے تو ہر دوسرے تیسرے دن آتے تھے۔ پھر یہ وہ طویل ہوا گیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں نے پورے ایک مہینے بعد ان کی دیکھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ فلاکت کی دلدل میں میں کتنی گمراہی تک جا چکی تھی لیکن دل میں انہریت کی چنگاری اب بھی روشن تھی۔ اس شخص سے مجھے آج بھی دودھ لول ہی چھوٹتی تھی لیکن یہ ایک مجبور غرت تھی جسے اپنے دودھ لول کے انحصار کا موقع نہیں ملتا جو اندازہ ہی اندازہ نہیں گھولتی رہتی ہے۔ انسان کے اعصاب کو ریڑھ دین کرنا رہتی ہے مگر کوئی راستہ

نہیں بچتی۔

تقریباً پانچ ماہ بعد میں نے آئینے میں بغور اپنی شکل دیکھی۔ میری آنکھوں کے گرد جلتے لہو دار ہو چکے تھے۔ سرخ و سفید رنگت پیلاہٹ میں بدل چکی تھی اور ہاتھ پاؤں ہر وقت سوئے سوئے رہتے تھے حالانکہ انہی لوہی دیواروں والے اس شاہانہ قہر خانی میں میرے لیے آسانشوں اور خدمت گاہوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میرے لیے الزام و القام کے کھانے پکے تھے اور میں اب انہیں کھا ہی نہیں تھی۔

میرے کمرے کی اداکاراں ایک سے ایک الوبکے اور تین بیویات سے بھری ہوئی تھیں۔ میری نگہار میر پر تیرے موتیوں کے زیورات کے کئی لہجے موجود تھے۔ مجھے اب حل کے اس مخصوص حصے میں باہر نکلتے اور بارگ میں جانے کی بھی آزادی تھی لیکن ایسے موقعوں پر کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی کی آنکھیں میری طرف بھڑکی رہتی تھیں۔ کوئی نہ کوئی طواغیت سرا کوئی نہ کوئی کثیر میرے پاس موجود رہتی تھی۔

میں چاہتی تو اس صورتحال کو اپنی گھٹ کا حرف آخر سمجھ کر سب کچھ سوچتا پھوڑ دیتی۔ جسم کے پائل کھڑ کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی مگر میرے سینے میں کوئی دھم تھا جو اندر سے مجھے مرنے نہیں دیتا تھا اور اس زندگی سے مجھے کوئی سمجھوتا بھی نہیں کرنے دیتا تھا۔ میں سوچتی رہتی تھی حتیٰ کہ ذہن شل ہو جاتا اور خیالوں کی بھول حلیوں میں پھنسنے پھنسنے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔

کبھی کبھی میں تھیں کہنے کی کوشش کرتی کہ میں کیا سوچتی ہوں؟ کیا میں اس پر قبضہ قہر خانی سے لگتا چاہتی ہوں؟ لیکن فرار ہو کر میں کس کے پاس جاؤں گی؟ بے سارا عورت کے لیے تو باہر کی دنیا بھی بھیرنوں سے بھرا جھل ہوئی ہے۔ ایک بھیڑیے سے بھاگ کر میں کہیں لن گنت بھیڑیوں کے ترسے میں تو نہیں گھر جاؤں گی؟ لیکن لن تمام اعلیٰ حلقوں کے پلچود ہرمال میں اس فیصلے پر پہنچی کہ میں قرار ہونا چاہتی ہوں اور صرف قرار ہونا ہی نہیں چاہتی بلکہ اس بھیڑیے کا سر بھی لکھنا چاہتی ہوں جس نے مجھے بھری پری دنیا سے یوں آسانی سے الٹا کر اپنی طواغیتوں کے کھونٹے سے باندھ دیا تھا اور کسی نے اس کی طرف اٹلی تک نہیں اٹھائی تھی۔ کیا میں کسی بھیڑیہ کی جتنی وقت بھی نہیں رکھتی تھی؟ اگر میرا کیا جرم تھا؟

اپنی طواغیت انعام کبھی کبھی مجھے ایک ہوائی قلعہ لگتی اور میں سوچا کرتی کہ وہ سب عورتیں جو اس عشرت کدے میں زندہ وطن ہیں ان سب نے یا ان سب میں سے پھرتے بھی شروع شروع میں میری ہی طرح سوچا ہوگا۔ نفس کی دیواروں سے ہمہ سر گر لیا ہوگا لیکن رفت رفتہ دل دہانچے گئے ہوں گے۔ خواہش ہواز مرگئی ہوگی اور اکتیں اس آگلی ہوں گی لیکن نہیں۔ میں لڑ کر سوچتی۔ میں تو اس ذکر پر زندگی کی شام ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔

میں بھی اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن میں ابھی فوارے کے
پانی سے نہ تھوکی تھی کہ میں ہائیں سل کا ایک خوش فہل سا لڑکا اچانک ہی سامنے آگیا۔
بکیر کی گھٹائی میں ہاتھ ڈالے وہ یوں ہل رہا تھا گویا تھوڑے کی اس میں سکھ نہ ہو۔
پھوٹی سی مخصوص بکری تھی اور گلے میں موٹے موٹے گھٹلائے موتیوں کی مالا تھی۔
یہ اس کی ٹانگوں پر جم گئی تھی۔ اس کے نیچے فہل میں ہاپ کی ہٹک قطعاً نہیں

کمرے میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے میں احتیاج کے طور پر استعمال کر سکتی۔ نہ ہر جگہ
جس سے مل نہیں سکتا تھا۔ ہر ایک خیال نگار کی طرح مجھے لگتا تھا کہ میں کوئی نہ ایک امید
کے ساتھ میں بہتر سے اٹھی۔ منہ ہاتھ دھو کر اور کمرے سے نکل گئی۔ یہ بھی لگتا تھا کہ
ایک آدمی نے مجھے کمرے کا رخ نہیں کیا تھا ورنہ اسے اندر آنے سے شاید کوئی نہ
رکھ سکتا۔ دروازے میں اندر کی طرف کوئی کتبہ، غصہ، خشم، غصہ، صرف ہاتھ سے ہر جگہ

ہوئی پانی کی جھکی کے نیچے اٹھیں دھوئے چلی گئی۔ میں ہندی سے دیوار کے نیچے قریب اس طرح کھڑی ہو گئی کہ دیوار پر مٹی ہوئی نوسہ کی کئی کھنچے دار پٹیاں میرے پیچھے چسپ تھیں۔

وہ عورت چال دھولے گئی تو میں نے ہاتھ باندھ کر کہا "اگر وہ دیکھو چال کر رہے ہیں۔" حالانکہ جہاں میں کھڑی تھی وہاں سے چالوں کا قہقہہ مجھے نظری نہیں آ رہا تھا۔ غیر اراداً طور پر پانی دو طرفوں عورتیں بھی اس طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے اندازے سے اپنی مطلوبہ جگہ کی طرف پیچھے ہاتھ بڑھایا۔ میری انگلیوں نے اس کے پھل کا لمس محسوس کیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اسے کھانچے سے باہر کھینچ لیا۔ اس سے پہلے کہ عورتیں میری طرف متوجہ ہو تیں، میں نے چھری اپنے کرتے تلے لپیٹ لی۔

"چال دھولے ہوئے پتہ دانے تو مگر ہی جاتے ہیں خالہ!" چال دھولے والی عورت نے لڑش کا جائزہ لینے کے بعد پلٹ کر ایک نظر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں کبھی تھی لڑاؤ کر گئے ہیں۔" میں نے اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ پھر ہندو بیگم اور ادھر کی انکے کے بعد میں باورچی خانے سے نکل آئی۔

اپنے کمرے میں آکر میں سیدھی غسل خانے میں پہنچی اور دروازہ بند کر کے چھری نکل کر اس کا جائزہ لیا۔ خاصی ٹوکی اور جڑ تھی۔ اس کا کھڑی کا دست چھوٹا تھا۔ اچھی طرح گرفت میں نہیں آتا تھا۔ چال بھی لڑاؤ لبا نہیں تھا۔ نواب صاحب جیسے سائز کو ختم کرنے کے لیے نکلی تھا۔ وہ میرے کمرے میں آئے تھے تو قہقہوں کا ایک مرحلہ تو ایسا ضرور ہوتا تھا جب ان کا بیڑا اس چھری کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا تھا۔

کمرے میں آکر چھری میں نے مسوئی کے گدے تلے پٹی کے قریب چمپا دی اور ایک خاص زاویے سے لیٹ کر کئی بار مشق کر کے دیکھا کہ ضرورت کے وقت میں غیر محسوس طریقے سے اسے نکل سکوں۔ مطمئن ہو کر میں آرام سے لیٹ گئی "اب مجھے صرف انتظار کرنا تھا۔"

گیارہ دن گزر گئے اور نواب صاحب نہیں آئے۔ پہنے ان کی آمد کے تصور سے ہی میرا دل چلنے لگا تھا لیکن اب مجھے بے تابی سے ان کا انتظار تھا اور دن گویا صدیوں کے برابر ہو گئے تھے۔ بارہویں دن آئے۔ بڑے ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ موقع آیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میرا ہاتھ رہنما ہوا گدے کے نیچے پہنچا۔ نواب صاحب اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ میرے ہاتھ کی یہ حرکت دیکھ سکتے۔

چھری ہاتھ میں آتے ہی میرا جسم سر ہڈا گیا۔ میں نے دستے پر گرفت مضبوط کی اور دھشت کے اس متحرک پہاڑ کے پسو میں انار دی اور چھری پر سے میری گرفت ہٹ گئی۔ اب اسے نواب صاحب کی پالیوں سے نکل کر اپنے سچے میں گھونپا چاہتی تھی لیکن اس

تھا اور جب بھی نواب صاحب آتے تھے، ایک خواہ سرا ہلا تاخیر اسے باہر سے بند کر دیتا تھا۔

مصلحتی مصلحتی میں کھانے کے کمرے میں پہنچی اور اس سے گزر کر پھوڑے میں داخل باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ میں پہلی مرتبہ باورچی خانے میں گئی تھی۔ یہاں تین باورچیاں ابھی سے رات کے کھانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا کر انداز میں اٹھ کھڑی ہو گئیں۔

"بھئی رو! بھئی رو۔" میں نے دستزد لیے میں کہا۔ "میں تو بس ویسے ہی وقت گزاری کی خاطر یہ دیکھنے آئی تھی کہ رات کے کھانے میں تم کیا کچھ تیار کر رہی ہو۔" میں ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ وہ مجھے ان پکوانوں کے نام گنوانے لگیں جن کی وہ تیاری کر رہی تھیں۔

ان کے الفاظ پر میرا تھکا دھیمان نہیں تھا۔ غسل کے دوران غیر محسوس طور پر میری نظریں دستزد عریض باورچی خانے کے مختلف گوشوں پر بھٹک رہی تھیں۔ ایک دیوار پر مجھے لوہے کے نوسہ کی کئی کھانچے دار پٹیاں سی نظر آئیں۔ ان پٹیاں پر پچاسوں چھوٹے بڑے چھچھے اور کٹیر دھبہ لگے ہوئے تھے اور انہی فہوں میں سے ایک پر مجھے اپنے مطلب کی چیز نظر آئی۔ یہ سبزی کاٹنے کی ایک جیسی چار چھڑیاں تھیں۔ ان میں سے صرف ایک چھری مجھے درکار تھی جو سب سے نیاں پتیلی لود میز دھار معلوم ہوئی تھی۔ چھری لڑاؤ والی اور مضبوط نہیں تھی لیکن اگر صحیح جگہ اور صحیح طریقے سے وار کیا جاتا تو مسلک ثابت ہو سکتی تھی۔ اب مسئلہ اسے دیوار سے اتارنے کا تھا۔

تینوں عورتیں ایک میز پر اپنے سامنے کی قہقہہ رکھے بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک اچھا اسی دیوار کی طرف تھا جس پر میرا گویا حلوہ آویزاں تھا۔ ظاہر تو تینوں ہی عورتیں سر جھکائے اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں لیکن مجھے احساس تھا کہ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد وہ کن اکھیلیں سے میری طرف ضرور دیکھ لیتی تھیں۔

میں ٹھیکے ٹھیکے دیوار تک جاتی تو میری آن کی طرف پشت ہو جاتی، ان کی طرف پشت کیے میں دیوار سے چھری اتارنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ میں سنسن تھا کہ اس لمحے ان میں سے کوئی ہا شاید تینوں کی تینوں ہی میری طرف دیکھ رہی ہوں۔ کئی صوف تک ادھر ادھر ٹھیکے کے بعد مجھ پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ ویسے بھی میری موجودگی اس جگہ جواز ہی گنتے گنتی تھی۔ میں خیا لخواہ مختلف چیزوں میں مسوئی دیکھی ظاہر کر کے وقت گزاری رہی تھی۔

دند "میرے لیے امید کی کرن پیدا ہوئی۔ وہ عورت جو میری مطلوبہ دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھی تھی، چالوں کا تھان لے کر اٹھی اور کونے میں اپنے پیچھے کافی فاصلے پر

رقی نہ ملنے کی سی چٹک نور ہاتھ میں دے دیا تھا۔ چوہ اس وقت بھی ہر ماتر سے غاری تھا۔ نہایت پر سکون انداز میں اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کنبوں کے بھرمت میں "ہائے ہائے" کرتے خواب صاحب کی نظر اس پر پڑی تو قدرے کمزور آواز میں بولے "سرواراں! لے لے چوہ اس۔ کوہ۔"

سرواراں نے بھی انداز میں سر کو نہایت اٹکی سی جھنک دی۔ اس کے پتلے پتلے مانوے ہوئے تختی سے ایک دوسرے پر بٹے ہوئے تھے۔ پھر وہ بھگ پر بھگی "اس کی مٹی مٹی اٹکیوں والا پھیلا ہوا ہاتھ میرے سر کی طرف بڑھا۔ یہ ہاتھ کسی دیو جیکر خطاب کا بیڑہ معلوم ہوتا تھا۔

میرے بالوں کو مٹی میں جکڑ کر ایک جھکے سے اس نے مجھے فرش سے اٹھایا اور تختی ہوتی کمرے سے باہر لے چلی۔ ہل سے نکلنے کے بعد وہ مجھے ایک ایسی سمت لے چلی بدھر جانے کی اس سے پہلے مجھے اجازت نہیں تھی۔ میں رکنے کی کوشش کرتی تو وہ مٹی میں جکڑے ہوئے بالوں سے گردن کو ایسا جھکا دیتی کہ مجھے گردن لوثی ہوئی محسوس ہوتی۔ ساتھ ہی وہ اپنے بھاری "مردانہ بوت سے میرے نچنے پر ایسی ٹھوکر رسید کرتی کہ میں ہلکا اٹھتی۔

ایک عظیم الشان اور آرامت و بھراست ہال سے گزرنے کے بعد ہم ایک دروازے پر پہنچے جس پر بھاری ٹالا لگا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ سے اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر سرواراں نے ٹالا کھولا۔ یہ ایک چھوٹا سا خلی کمرہ تھا جس کے کونے میں کنبوں نے جانے کت رکھے تھے۔ سرواراں نے دروازہ کھولنے کے بعد میری کمرے کھتا مار کر مجھے ایک طرف دھکیلا اور تب میں نے دیکھا "اس طرف فرش میں چوکور غلام تھا۔ یہاں سے بیڑھیاں چنے ۴ دیا تھیں۔ گمرانی میں بدھراج تار کی گمری ہو رہی تھی۔

سرواراں نے دیوار پر موجود ایک سوکے دیلا اور بیڑھیوں میں مدھن ہو گئی۔ بیڑھیاں خاص گمرانی تک چلی گئی تھیں اور اس کے اختتام پر لوہے کی مٹی مٹی سلاخوں والا ایک دروازہ تھا۔ سرواراں نے مجھے بیڑھیوں کی طرف دھکیلا۔

"نہیں۔" پہلی مرتبہ میرے حلق سے دھشت بھری چیخ نکلی۔ میں نے پاؤں مضبوطی سے فرش پر جما لیے۔ میرے نچنے پر ایسی ٹھوکر پڑی کہ ٹوکڑا کر پھیل بیڑھی پر جا گئی۔ اگر محسوس ہوتا اس کی مٹی میں نہ ہوتے تو لپٹتا میں غلام بالیاں کھاتی چنے بیچ چکی ہوتی۔

"خدا کے لیے مجھے پھوڑ دے۔" سنا کر وہ۔۔۔ "میں ملک اٹھی۔ اس نے میری ریڑھ ن ڈبی پر ٹھٹھا رسید کیا۔ میری چیخ نکلی اور پاؤں اٹکی بیڑھی پر جا گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اور جسم لرز رہا تھا۔

مجھے پہنچ کر اس نے ایک ہاتھ سے سلاخوں والے دروازے کا ٹالا کھولا اور مجھے اپنے

خلی خلی کرتے جسم میں یک لخت مگرایا پارہ بھر گیا تھا۔ مٹھنوں کے ہل کھڑے ہو کر اسوں نے سب سے پہلے دیوار کے ساتھ اٹکی ہوئی اوردی کھینچی "پھر میرا وہ ہاتھ پکڑ لیا جسے میں چھری کے دتے تک پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دتے کے ارد گرد انہوں نے وہ سرا ہاتھ تختی سے جمارکھا تھا جس سے خون کا جھاڑو رکا ہوا تھا۔

وہ اس بکمرے کی طرح چچ رہے تھے جسے بالکل طور پر لٹا کر کے چھوڑ دیا گیا ہو۔ یہ دہمگی اور موت کی شکش تھی جس میں مجھے زندگی نہیں "موت چاہیے۔ خلی لن کی بھی اور اپنی بھی۔ پھل کی طرح ٹپ کر میں اٹھی اور اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑی۔ وہ پشت کے ہل ہستر پر گرے لیکن میں اسی لمحے انہوں نے میرے پیٹ میں لانت رسید کی۔ میں مسمی سے کچھ دور فرش پر جا گری۔

اس سے پہلے کہ میں پیٹ پر پڑنے والی ضرب کی لانت کو پی کر اٹھتی اور دوبارہ ان پر جھپٹتی "دروازہ کھلا۔ ایک خواجہ سرا لے اندر جھانک کر پہلے تو پٹی پٹی آنکھوں سے مجھے فرش سے اٹھتے دیکھا "پھر اس کی نظر چھتے توپے خواب صاحب پر پڑی اور اچانک اسے گھرا صورتحال کا اندازہ ہوا۔ لپک کر اس نے ٹانگ پھنسا کر مجھے دوبارہ فرش پر گرایا اور میری گردی پر گھونسا رسید کیا۔ میری آنکھوں سے اندھیرا چھا گیا۔ دوسرے ہی لمحے اندھیرا چھٹا تو میں نے بمشکل گردن موڑ کر دیکھا "وہ میری کمرے پر اپنا گھٹنا رکھے "اپنی پگڑی کھول کر میرے ہاتھ پشت پر پاندھ چکا تھا۔ پھر وہ مجھے پھوڑ کر خواب صاحب کی طرف لپکا۔

"واکٹر کو ہائی۔۔۔ اور حکیم کو بھی۔۔۔ جلدی۔۔۔" وہ شرعائی آواز میں بولے۔ "اور سرواراں کو بھی۔۔۔ بھیک۔۔۔ اسے کہنا۔۔۔ اس طبیعت اور ناشی لڑکی کو خاص سرا دے۔۔۔ کچ سے اس پر۔۔۔ ہمارا خطاب ہے۔"

خواجہ سرا باہر کو دوڑ گیا۔ میں نے اوندھے پڑے پڑے فرش سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ میری حالت فیر ہو چکی تھی۔ بمشکل تمام میں کھوت لے کر سیدھی ہوئی لیکن میرے والد اس طرح میرے پیچھے دب گئے کہ کندھوں میں شدید ٹھنسن اٹھنے لگیں۔ انہی میں اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ خواجہ سرا اور کئی کنبیں دوڑتی ہوئی کمرے میں آئیں۔ خواجہ سرا خواب کی طرف۔ حوجہ ہاتھ اور کنبیں میری طرف۔

ایک خواجہ سرا نے خواب صاحب کے پہلو سے چھری نکالی اور زخم پر تختی سے ہاتھ رکھا دیا۔ دوسرے نے ایک چادر کی کٹی تھیں کر کے اسے زخم پر جمایا۔ روزہ طون بننے نہیں پاتا تھا۔ وہ عفریت ابھی اوش میں تھا۔ مجھے لپٹ لگایاں بھی دے رہا تھا۔ چھری کی ٹوک پھٹا خواب صاحب کے ہل تک نہیں پہنچی تھی۔ ان کے مجرب جسم نے انہیں پچا لیا تھا "پھر شاید میں صبح واری نہیں کر سکی تھی۔

پھر سرواراں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے جسم پر دھن مخصوص لباس "آنکھوں میں

سواراں نے ہاتھوں سے پکڑ کر مجھے اٹھایا میں نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں لات دیکھ کر دی۔ میرا پاؤں جیسے لہجے کے کسی ستون سے ٹکرایا اور جھنجھٹا کر رہ گیا۔ فوراً ہی میں نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھوں سے گھونٹے دیکھ کر اس نے اپنی جگہ سے ہنہنہ نہ کی اور نہ ہی اس کے حلق سے کوئی آواز خارج ہوئی۔

میں نے سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے تلج رہے تھے۔ میرا جسم ایک بار پھر لرز اٹھا۔ وہ غیر معمولی نہیں شاید مافوق الفطرت عورت تھی۔

"تمہاری حملہ کرنے کی عادت کتنی نہیں۔" وہ زخمی شیریں کی طرح فرخڑائی۔ "بہر حال ٹر نہ کرو۔ میں بڑے بڑے سواراں میں سے یہ حالت نکال دینے میں مشغور ہوں۔" ایک لمحوں میں اس نے میرے سر پہان میں ہاتھ ڈالا اور پھر کی تواز کے ساتھ میری قبض ہو اس وقت میرا کل لہجہ تھی میرے جسم سے طبعاً ہو گئی۔

آگے اندر دھکیلنے کے بعد اندر کی طرف تھانگ لیا اور سڑکر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ یہ دم میں سترائیت اپنی طرف نکلتی تھی کہ میرے جسم کی لرزش کچھ اور بڑھ گئی۔ یہ ایک طویل و عریض جسم تھا۔ فرش دیواریں اور پست پتھر کی سلوں کی تھیں۔ اس کے پانچویں پہلوں تھیں۔

پست کے وسط میں تار کے سرے پر بلب بھول رہا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ کوفیوں کی قطار تھی۔ کوفیوں کیا بڑے بڑے بگڑے تھے۔ ہتھکڑیاں چار فٹ اونچے دروازے لہجے کی سلاخوں والے ہی تھے۔ بگڑے ہوئے تمام کوفیوں میں خالی تھیں لیکن انہیں دیکھ کر وحشت آتی تھی شاید اس تصور سے کہ ان میں انسانوں کو بند رکھا جاتا رہا ہوگا کیونکہ ہر بگڑے میں ایک ایک مڑا اور ایک ایک نہیں کاوی۔ موجود۔ شاید غلامت کے لیے۔

سواراں نے ہاتھوں کو جھٹکا دے کر مجھے دور دھکیل دیا۔ میں پھر پٹے فرش پر جا گری۔ "ہڑاہ" پتھر کی آواز گونجی لیکن یہ میرے جسم پر نہیں پڑا تھا۔ سواراں نے ہوا ہی میں گھمایا تھا۔ جھیلیاں لٹھڑے فرش پر جھڑکیں تھیں نے اپنے کپکپاتے جسم کو سنبھالا دینے کی کوشش کی اور اٹھنے ہی لگی تھی کہ ہڑاہ کی آواز کے ساتھ پتھر کھر پڑا۔ میں ہلکا کر فرش پر لوٹ گئی۔ اپنا محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے کند چھری سے پشت کا گوشت کھینچ دیا ہو۔

"خدا کے لیے سواراں! مجھے صاف کر دے۔ مجھے پرم کدے میں تھوڑے پاؤں پڑتی ہوں۔" میں نے ہتھکڑیاں سر اٹھا کر آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ بڑی آہستگی سے وہ ایک ایک قدم اٹھاتی میری طرف بڑھی۔ میرے قریب پہنچ کر دونوں کی ٹھک ٹھک رک گئی۔ میں اونہی پڑی تھی۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ہتھکڑیوں میں نے گردن کچھ اوپر اٹھ کر دیکھا۔ سواراں میرے سر پر ٹانگیں چڑھی کچھ تھی کھڑی تھی۔ دھنکنا وہ پتھر لگے میں لٹکا کر جھکی اور میرے ہاتھ کھولنے لگی شاید اسے مجھ پر دم آگیا تھا لیکن نہیں۔ یہ میری خوش فہمی تھی۔

ہاتھ کھول کر اس نے ایک بار پھر ہاتھوں سے پکڑ لیا اور ایک ٹکٹے سے مجھے سیدھا کھڑا کر دیا۔ میری لرزتی ہوئی ٹانگیں جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں لیکن سواراں کی طرف سے دم کی توقع نے کچھ سارا دیا۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور وہ سرے ہی لہجے اٹھے ہاتھ کا پھینچ میرے منہ پر دھند کر دیا۔ میں ایک بار پھر فرش پر جا گری۔

لہجے کی تپش میرے سینے میں تمام تر قوت کے ساتھ جاگ اٹھی۔ سواراں سے دم کی توقع مٹ گئی۔ مجھے اپنے دفاع کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ میرے ہاتھ اب کھلے تھے اور سواراں بے شک کھلی کھلی غیر معمولی تھی لیکن بہر حال ایک عورت تھی۔ میں نے اپنی پچی پچی لڑائی کو بھینچ کیا اور اس بار جیسے توا۔

کروڑے کپڑے کا موٹا اور اسیلا اٹھا لہذا تھا۔ اسے اسٹ پٹ کر میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ میری حالت اس لوگوشتی سے مطابقت تھی جسے کئی شکری کتے منہم لہنے کے بعد اس نے اپنے چہرہ پر آگے بڑھ گئے ہوں کہ وہ پہلے ہی سے حکم سیر تھے۔ جسم پر جا بجا جوسے ہائے دھواں کے نشان نیلے پڑ چکے تھے اور ان سے خون دس دس کر کھڑکی طرح برکھا تھا۔

میں رونا چاہتی تھی لیکن آنسوؤں کے سوتے شاہ خشک ہو چکے تھے۔ حلق سے صرف تھنی تھنی چھپیں یا اذیت بھری سسکاریاں نکلتی تھیں۔ قہقہہ ہی نکلی کی ایک ٹسے پڑی تھی جس میں وہ محدودی مدھماں جو محض دیکھنے سے ہی نکلی کی طرح اٹھی ہوئی تھی تھیں اور اس کا ایک پالہ رکھا تھا۔ نہ جانے میں کتنی دیر بے ہوش رہی تھی اور یہ ٹسے کب سے میرے پاس رہی تھی اور مجھے کچھ کھائے ہوئے بھی نہ چلے کتہ وقت گزر چکا تھا لیکن جوت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ بے پناہ سردی اور مدھماں سے اچھتی ہوئی ٹیسس ہر حواس پر حاوی تھیں۔

جانے کتنی دیر تک میں سائیکس جتنی سلاطوں کو گھورتی رہی۔ ایک مہموم سی لہر کے سر سے کہ یہ سب کچھ شاید ایک بھیانک خواب ہے اور ابھی منظر بدل جائے گا لیکن کچھ ہی نہ بدلا۔ سلاطین ہر دستور الیساں رہیں، سامنے پیلا ہوا طویل و عریض ہال اور اس کا بڑا فرش اور دیواریں جنوں کی توں رہیں۔ چھت کے وسط میں لٹکا ہوا دھندلا دھندلا سا بلب بھی دہریں سوچو رہا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ منظر بدلنے والا نہیں تو میں سلاطوں کو قیام کر چھو مشکل اندھ کھڑی ہوئی۔ جسم پر گویا پھر ان گنت زخموں کے منہ کھل گئے مگر اب یہ اذیت شاید جسم کی ایک حصہ بن چکی تھی۔ میں نے سلاطوں پر مشکل دوازے کو بلائے کی کوشش کی لیکن وہ صرف ذرا سا کھڑکڑا کر رہ گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ باہر مٹی سی کھڑی میں ایک جنگ جھوٹا جھول رہا تھا۔ میرے ہاتھ بے جان سے اس کے سلاطوں پر نیچے کو گھسٹنے چلے گئے اور میں ایک بار پھر دھپ سے تکی فرش پر ڈنڈ گئی۔

اب مجھ پر ٹیم بے ہوشی کی طاری تھی۔ ایک دھندلا سا احساس تھا کہ شاید قہقہہ ہی نے کسی لہر کے دوازے کی کھڑکڑاہٹ سنی تھی، پھر جیسے کسی نے میرا سر تھوڑا سا اوپر کر اٹھا کر کسی گداز چتر پر دکھ دیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، ایک اجنبی عورت کچھ پر جھکی ہوئی تھی اور میرا سر اس کے زانو پر تھا۔

"معنہ خانم! میری آواز سن رہی ہو۔" اس نے سرگوشی کی اور نہایت آہستہ سے میرا کھنکا ہلایا۔ میں نے ہولے سے اٹھت میں سر ہلانے کی کوشش کی تو سر پھوڑے کی طرح ٹھٹھا۔ اس عورت نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے مٹی کے پالے سے تھوڑا سا پانی میرے

ایک جھکے سے اس نے مجھے نیچے گرا دیا اور مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ اب وہ مجھے پیٹ نہیں رہی تھی بلکہ دانتوں سے میرے جسم کے مختلف حصوں کو چبا رہی تھی۔ میں اس کھسے کی طرح فرش پر ٹسے لگی تھی ہاتھ سے بغیر قہقہہ کیا جا رہا ہو۔ ٹسے ٹسے میں نہ جانے کہاں سے کہاں جا چکی لیکن سرداریاں بدستور آسیب لڑا طرح مجھ سے چپنی ہوئی تھی۔

کئی بار میں نے تکیپ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی کھٹی میرے حلق پر سختی سے آجی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے زندہ چبا جانا چاہتی تھی لیکن نہیں۔ جسم کے ہر حصے کو دانتوں سے تھوڑا سا مکھل کر پھوڑ دیتی تھی اور پھر کسی اور حصے پر دانت گاڑ دیتی۔

بالآخر اذیت میری برداشت سے باہر ہو گئی اور چپنے چپنے میں بے ہوش ہو گئی۔ اذیت کا مدھم مدھم سا احساس اب بھی ہتی تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ ان پر چھائی ہوئی تاریکی گھٹی ہوئی گئی۔ "فری احساس مجھے یہی ہوا کہ شاید میں موت کی آغوش میں اتر رہی ہوں۔

پھر مجھے کتنی دیر بعد حسیات بیدار ہوئیں لیکن کئی مرحلے آنکھیں بھیچنے کے باوجود نظر کچھ نہ آیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی بے ہوش سمندر کی تہ میں پڑی ہوں۔ جسم میں تھا اور جاموں طرف تاریکی ہی تاریکی۔ احساس اور بیدار ہوا تو یہ تاریکی دھیرے دھیرے چھٹنے لگی اور اس کے ساتھ ہی گویا جسم میں ہزاروں پھونسل کی دھکن ابھر آئی۔ جسم کا ہر ریشہ گویا دھم دھم ہوا تھا۔

دھیرے دھیرے میری آنکھیں اس درد روشنی کو محسوس کرنے کے قابل ہوئیں اور مجھے وہ سلاطین نظر آئیں جو میرے جھولنے کے قہقہہ سے چار فٹ اونچی چھت تک پہنچ رہی تھیں۔ میری آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں حرکت دینے کی کوشش کی تو اذیت ناک ٹیسوں کے ساتھ وہ سرا احساس یہ ہوا کہ میں انہی بلیوں نما کوفروں میں سے ایک میں بند ہوں جنہیں میں کچھ دیر تک دیکھ چکی تھی۔ اس کوٹھری کی ساخت ایسی تھی کہ انسان نہ تو سیدھا لیٹ سکتا تھا اور نہ ہی سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا۔

کئی منٹ کی جدوجہد کے بعد میں اچھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوئی اور اس عمل کے دوران غیر ارادی طور پر میرے حلق سے نہ جانے کتنی تھنی تھنی چھپیں نکلیں۔ سانس تھکے معمول پر آئی تو میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میرے جسم پر اب بوری کی طرح مونے اور

دی ہر چھوٹے سے بلب کی کمزور سی روشنی کی نڈ سے دور تھا۔
اس صدمہ خاں میں زندگی کی رفتار کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وقت گویا اپنی جگہ جمنا رہتا تھا۔ دن یا رات کا کوئی پتا نہ چلتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کبلی دیر بعد صبح میں اٹھنے والی نہیں سے مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ میں نے سوچی مدنی کو وال میں بیگو کر کھانے کی کوشش کی۔ چند لمحے تو پیٹ میں چلے ہی گئے جس سے مجھے اپنی فکرت میں کچھ کی محسوس ہوئی۔

اب میں نے مریم کی ڈیبا کھولی۔ یہ سنیدی مائل بے رنگ سی چیز تھی۔ میں نے دھوئیں کا جاتو لیا تو ان کا گویا کوئی شری نہ تھا۔ پورا جسم ہی دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور مریم ان کے لیے کافی تھا۔ بھرپور میں نے ہر دھم سے تھوڑا تھوڑا لگایا شروع کیا۔ اگلے کے اس سے ہر دھم میں اتھک کی ایک ہی لہر دوڑ جاتی تھی۔

اس کام سے فارغ ہو کر مجھے ایک گوندہ سکون کا احساس ہوا۔ مریم واقعی جلد اثر تھا کہ دھوئیں کی اذیت یک لخت ہی معدوم سی ہو گئی تھی۔ میں دیوار سے ٹک لگا کر بیٹھ گئی۔ سوچنے کیلئے کی صلاحیتیں گویا معلق ہو گئی تھیں۔ شاید یہ فکرت کی عادت تھی۔ جب تک میری مدد نے اختیار نہیں ڈالے تھے میں کچھ نہ کچھ سوچتی رہتی تھی۔ لہذا کا کوئی طریقہ بہتوت کا کوئی اندازہ چھٹکارے کی کوئی تدبیر لیکن اب طے میں محض ایک بے نام مٹا طاری تھا۔ اندیشے، امیدیں، خواہش اور حرات سب کچھ ہی غم ہو چکا تھا۔

دھواں اس خلی الذہنی کے عالم میں پہلی مرحلہ میں نے محسوس کیا کہ صدمہ خاں ہی کے کسی دور اللہ اور فکر نہ کرنے والے صدمہ سے وقفے وقفے سے کچھ گواہی سنائی دیتی تھی۔ کبھی یہ آوازیں درمحوں کی غراہٹ سے ملتی جلتی محسوس ہوتی تھیں اور کبھی انسانوں کی پیڑاہٹ سے۔ کبھی کبھی کوئی کراہ سنائی دیتی تھی اور کبھی کوئی کھل کھلی اور بہت سی غم سی چیخ۔

احساس تنہائی نے اتنا طویل نہیں کیا تھا جتنا ان آوازوں نے۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر اس سمت دیکھا ہر صدمہ سے یہ آوازیں آتی تھیں۔ ہاتھیں طرف جہاں صدمہ خاند ہر غم ہوتا دکھائی دیتا تھا وہاں دیوار میں لوسے کا ایک بڑا سا چلی دار دروازہ تھا۔ اس دروازے کے عقب میں اندھیرا تھا لیکن دیکھنے پر احساس ہوتا تھا کہ شاید صدمہ خاں کا ایسا ہی ایک حصہ اس طرف بھی ہے جہاں مجھے اپنی جگہ سے نظر نہیں آتا تھا۔

اگلی صبح سیر دی دال مدنی پر مشغول کھانا لے کر نکلی تو میری حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے چھپکتے ہوئے بتایا کہ دروازے والی دیوار کے پری طرف واقعی صدمہ خاں کا دوسرا حصہ ہے اور اس طرف آمد و رفت کا راستہ دوسرا ہے وہاں سو نہ جیروں کو رکھا جاتا ہے۔

محل میں پکایا۔ محل کچھ تر ہوا تو میں نے اشارے سے اور پانی مانگا۔ اس نے پکایا مہر ہونٹوں سے لگا کر احساس ہوا کہ میرے ہونٹ بھی کسے چنے اور سوسے ہوئے تھے۔ ہر گھونٹ پیچے کے بعد میری تھلوں کی دھندلاہٹ کچھ کم ہوئی اور جسم میں زندگی کی دھم محسوس ہوئی۔

"میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتی۔" عورت نے سرگوشی کی۔ "پہلے بھی میں کھا لے کر آئی تھی تو تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔" اس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر میں کی ایک گول ڈیبا نکلی۔

"یہ نورجہاں نے بھیجی ہے۔" اس نے ڈیبا میرے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک خاص مریم ہے۔ نورجہاں نے کسی زمانے سے بڑے حکیم سے حاصل کیا ہے۔ اسے لہجہ دھوئیں پر ضرور لگاتا۔ نورجہاں کہہ رہی تھی کہ انسانی دماغ کے دھڑکتے زہریلے طبقہ ہوتے ہیں۔"

"کیا نورجہاں یہاں تک تھی؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں۔ اسے تو یہاں آنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے کیونکہ سرداراں یہاں کھتی ہیں کہ وہ تم پر کچھ نہ کچھ مہمان ہے۔" عورت نے جواب دیا۔

"تو پھر اسے میرا حال کیسے معلوم ہوا؟" میں نے لیف آواز میں پوچھا۔
"اسے ٹوبہ اچھی طرح اندازہ تھا کہ سرداراں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہوا اور کچھ میں دیکھ کر گئی تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا۔" عورت بولی۔

"اور تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔
"میں؟ میں بھی کئی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ آپ سے میرا سامنا صرف ایک مرتبہ ہی ہوا ہے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ اس نے میرا سر دانو سے ہٹا کر پٹی احتیاط سے پھریلے فرش پر لگا دیا۔

"میں مروت۔" فحیش۔ "نواب کا کیا حال ہے؟ کیا وہ زندہ بچ گیا؟" میں نے اپنی چھوٹی سانسوں پر قویہ پالے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے سپاٹ لیجے میں جواب دیا۔ خون کافی بہا ہے لیکن نواب صاحب کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ بڑے حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ وہ چند دنوں تک باقی ٹھیک ہو جائیں گے۔

ٹھیک کو غری میں بہتکل سٹ سٹا کر وہ اٹھی اور جلی جلی سی آہنی دھواڑ کھول کر اٹھ گئی۔ آٹا لگا کر اس نے ملاخوں کے درمیان سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "میرے تو کچھ کھانے کی کوشش کرنا۔ مجھے احساس ہے کہ فی الحال میں تمہیں اس سے بہتر کھانا فراہم نہیں کر سکتی۔ مگر بلی بہت سخت ہے۔" پھر وہ مڑی اور چھری سے ہال کے بڑے گیت کی طرف نکلتی گئی۔

اس کی نہانی جگہ یہ سن کر کوئی خاص حیرت نہ ہوئی کہ ان مولوں میں سے بعض چھو
چند برس سے وہاں قید تھے اور ان میں سے اگر کسی کے واقفین موجود تھے تو انہیں ان
کے بارے میں کچھ کوئی علم نہ تھا۔ وہ ان سے چاندی پر مبر کر چکے تھے۔ یہ قیدی لوہے
صاحب یا ان کے خاندان کے کسی نہ کسی قید کے مقرب تھے اور انہیں ان مویشی خانے یا
زندان میں ڈالنے کے بعد کسی کو ان کا نام تک یاد نہیں رہا تھا۔ جگہ یہ سن کر اس نے
حیرانی نہیں ہوئی کہ جگہ تو بہت پہلے ہی احساس ہو چکا تھا کہ اندر مگر میں کچھ بھی نہیں
تھیں۔ خدا کی دھرتی پر یہ ایک عجیب ہی خدائی تھی۔

اس خبر سے میرے اندازے کے مطابق جگہ یا سات دن گزر چکے تھے۔ جب
سواروں کی کمرہ صورت ایک بار پھر جگہ دکھائی دی۔ میرا دل لوب سا گیا۔ اس عورت
سے جگہ واقعی خوف آنے لگا تھا۔ ایک ایسا خوف جو ہڈیوں تک میں اتر جاتا ہے۔ اتنا خوف
میں نے کبھی لوب صاحب کی صورت دیکھ کر بھی محسوس نہیں کیا تھا یا شاید اس کی نوعیت
مختلف تھی۔

کوٹھری کا دروازہ اس نے پورا کھول دیا اور دونوں ہاتھ کولوں پر رکھا کرتن کر میرے
سامنے کھڑی ہو گئی۔ بغیر اس بھی اس کے ہاتھ میں دیا ہوا تھا۔ سرخ سرخ آنکھوں سے وہ
جگہ ایک تک گھور رہی تھی اور اس کی نظریں گویا میرے جسم کے پار ہوئی جا رہی تھیں۔
میں اس خطرناک کوٹھری میں اور سٹ سٹ کر گئی۔ سواروں کے چہرے سے جگہ اندازہ ہو رہا
تھا کہ وہ یہاں بلا مقصد یا محض جگہ دیکھنے نہیں آئی بلکہ میرے خیال میں تو وہ بلا مقصد یا
پہولے سونے کام سے تو کہیں بھی نہیں آئی تھی۔ وہ عورت نہیں بلکہ شاید خاص کاموں
کے لیے مدعیا ہوا درندہ تھی۔

کڑے کڑے یک لخت وہ جگہ اور میرے الجھے الجھے ہاتھوں کو اپنے خاص انداز میں
مٹھی میں جکڑ کر اس نے جگہ سے جگہ کوٹھری سے باہر نکال دیا۔ میرے ہاتھوں کی جھلکا
میں گویا نیگنوں لہجوں کے منہ کھل گئے تھے۔ سواروں نے پیچھے ہٹتی مرتبہ یوں جگہ ہاتھوں
سے پکڑ کے اٹھایا تھا۔ ابھی اس کی دھن ختم نہیں ہوئی تھی۔

"لوب بھی خاصی تر تارہ نظر آ رہی ہے۔" میرا چہرہ اسے چہرے کے قریب لانے
ہوئے وہ سانپ کی طرح پھٹا رہی۔ "میں تجھے کھلی اور سلی ہوئی دیکھنا چاہتی ہوں۔ جیسا میں
تجھے پہچان کر چکی تھی۔"

"سواروں!" میں نے لرزئی آواز میں کہا۔ "کیا تجھے مجھ پر رحم نہیں آتا؟ آخر تو بھی
ایک عورت ہے۔ جگہ معاف کر دے۔" میں نے جھک کر اس کے پیروں کو چھونا چاہا لیکن
اس کا وہ ہاتھ ساکت رہا جس سے اس نے میرے ہاتھ جکڑے ہوئے تھے۔ اس لیے میں
جھک نہ سکی۔ کراہ کر رہ گئی۔

"صورت۔" اس کی پستار کچھ اور زہریل ہو گئی۔ "تجھے کس نے کہا کہ میں
عورت ہوں۔۔۔؟" جگہ کبھی عورت نہیں سمجھا گیا۔۔۔ اور جگہ غرت ہے اس لفظ
سے۔۔۔ عورت ہو نہ۔۔۔ عورت تو ہے، کنویر، بے بس، رحم کی بھکاری!"

"لیکن اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں سواروں!" میں نے گڑگڑا کر کہا۔ "میں تو تجھے
عورت ہی سمجھتی ہوں اور تجھے کنویر، بے بس تو عزت نے بنا دیا ہے۔"

"قصور؟" اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر بے حد مدھم مگر نہایت سفاک مسکراہٹ
اُبھری۔ "میرا قصور یہ ہے کہ تو کنویر اور بے بس ہو کر اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی
ہے، او کی بیٹی!" اس نے غرت سے جگہ فرش پر دے مارا۔ میرا سر ہل کر رہ گیا۔ کوشش
کے باوجود میں فوری طور پر اٹھ نہ سکی۔

"آج لوب صاحب کی طبیعت کچھ سنبھلی ہے۔" سواروں نے گویا جگہ اطلاع دی۔
"دور انہوں نے پہلی بات جگہ سے کیا پوچھی تھی کہ میں نے تجھے کچھ سبق دے دیا ہے کہ
نہیں۔ تب جگہ یاد آیا کہ میں تو اپنا کام اوجھڑا چھوڑ کر گئی تھی۔"

"نہیں۔ نہیں۔" میں بے اختیار چلا اٹھی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں کے عقب
سے جھانکتے ہوئے نوپتے سے داخل کی جھلک دیکھ کر میرے جسم میں سوئی ہوئی الٹی
جٹ اٹھیں لیکن جگہ مطمئن نہیں تھا کہ اس بار سواروں اپنی مٹھی ستم دہرانے کا ارادہ
نہیں رکھتی بلکہ درندگی کا ایک نیا ہی باب رقم کرنے آئی ہے۔ اس نے ایک بار پھر میرے
بال مٹھی میں جکڑے اور جگہ تمسکین ہوئی ایک طرف کو لے کر چلی۔

میں نے مزاحمت کی، فرش پر ہاتھ پاؤں مارے مگر ہاتھ پیرے فرش پر کوئی لہی چڑ نہ
تھی جسے میں قہم سکتی۔ جب وہ رکی تو میں نے دیکھا کہ وہ قہم خانے کے وسط میں حد وصل
کا کام دینے والے دروازے پر کھڑے تھی۔ میرے ہاتھ چھوڑ کر اس نے پھرتی سے یوں
میرے زرخیز پر پاؤں رکھ دیا گویا کوئی بھیلا اپنے غم جاں غدار کو تڑپتے پڑکتے دیکھ کر
ٹھوٹا ہو رہا ہو۔ میری گردن اس نے جگہ اس انداز سے بھاری بوٹ تلے دھکی لی تھی کہ
ہوشی میں نے اس کے پیچھے سے نکلنے کی کوشش کی، جگہ فوراً محسوس ہو گیا کہ اگر میں نے
زرا بھی مزید حرکت کی تو میری گردن ٹوٹ جائے گی یا ترخہ پھٹے سے سانس کی تہ رفت
موقوف ہو جائے گی۔

اسی عالم میں اس نے نہایت اطمینان سے چابیوں کا کچھا ٹکڑا کر آگنی دروازے کا تالا
کھولا اور جگہ ایک بار پھر ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھیا اور اندر کی طرف سے دوبارہ تالا لگا چکی
تھی۔ میں نے اور گرد دیکھا، یہاں اتنا اندھیرا نہیں تھا جتنا دور سے نظر آتا تھا۔ میرے
مقب میں کافی فاصلے پر اس طرح ایک دھندلا سا بلب چھت میں لٹکا ہوا تھا جس طرح اس
جگہ میں تھا جہاں میں مقید تھی۔ یہی نہیں بلکہ قہم خانے کا یہ حصہ وہاں دیکھا ہی تھا۔ فرق

صرف یہ تھا کہ اپنے جسے میں قیدی صرف میں ہی تھی اور یہاں شاید کوئی بیہوش خالی نہیں تھا۔

سرداروں نے اچانک میرے پیٹ پر لات رسید کی اور میں ہلکا کر لڑھکتی ہوئی مدد میں پڑی گئی۔ میرے دائیں طرف بیروں کی قطار تھی۔ ہر بیروں میں کوئی نہ کوئی قیدی یا تو انگوٹھ پہنا تھا یا سلاطون کو تھامے کھڑا کھڑا تھا اور مجلس انداز میں سلاطون کے درمیان سے جھانک رہا تھا۔ ان میں ہر عمر کے بوجھے لود سب کی داڑھیاں اور سر کے بال جھاڑ جھکاڑ کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ آنکھیں دھنسی ہوئیں اور دھماکوں کی ہڈیاں مڑوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ ان کے غلیظ جسموں پر چھترے بھول رہے تھے۔ وہ زندہ غار کے انسان معلوم ہوتے تھے۔ لافرجیوں سے قطع نظر ان کے چوہوں پر وہی حیوانیت اور آنکھوں میں وہی وحشت تھی جس کا تصور زندہ غار کے انسان کے حوالے سے کیا جاسکتا ہے۔

"کیا حال ہے گیدو! سرداروں نے بنکر ہوا میں جھکا دے کر کہا۔ "تم سب زندہ ہو؟ کوئی مرا تو نہیں؟"

کسی بیروں سے کوئی جواب نہ آیا۔ سب سسکی سسکی نظروں سے سرداروں کی طرف دیکھ رہے تھے گیدو کوئی معلومت ہو اور وہ اس کی زبان کھٹے سے کاٹ رہا ہو۔
"میں لمبے کھولے گئی ہوں۔ تم سب باہر آکر قطار میں کھڑے ہو چلو۔" سرداروں نے ہنر لپیٹ کر نیچے میں اڑس لیا اور ڈھیلے ڈھیلے لہوے کی جیب سے لمبی ہل کا ایک خوفناک دیوار لٹل لیا۔

دائیں ہاتھ میں دیوار منہل کر اس نے بائیں ہاتھ میں موجود چابیوں کے کھٹے سے صرف ایک چابی منتخب کر کے سارے تالے کھول دیے۔ چوہ بیروں میں قیدی تھے صرف ایک بیہوش خالی تھا۔ لمبے کھولے کے بعد سرداروں پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ قطار پر لٹے ہوئے چپتے کی طرح چپک نظر آ رہی تھی۔

"اب باہر آؤ۔" اس نے حکم دیا۔ تمام قیدی فریادیں اور غلاموں کی طرح باہر آئے اور بیروں کے سامنے ہی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ میں ان کے سامنے تھی اور سرداروں میرے عقب میں دیوار منہل کھڑی تھی۔ "آج تمہاری دعوت شیراز ہے۔" سرداروں نے قیدیوں کو قاطب کیا اور تب میرے ذہن میں چمٹا سا ہوا۔ اسکا مطلب سمجھ کر میں سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گئی۔ میرے طلق سے کھنٹی کھنٹی چیخ نکلی۔ میں نے راہ قرار کی تلاش میں لوحہ لوحہ نظر دوڑائی۔ میرے دائیں بائیں بندے بندے آہنی دروازے تھے۔ عقب میں بلند والا دیوار تھی اور سامنے بیروں کی قطار۔

دہشت کے ان لمحوں میں بھی ایک لمحے کے لیے مجھے ان مڑوں پر حیرت ہوئی جو

بیروں سے باہر آکر بھی ہوئی نظروں سے ایک تک صرف مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اس خیال کا شاید گزر نہ تھا کہ وہ کوشش کریں تو اس آہنی عورت سرداروں کو قابو کر سکتے ہیں اور اپنی رہائی کی تدبیر کر سکتے ہیں۔ شاید انہیں یاد ہی نہیں رہا تھا کہ آزادی بھی کوئی چیز ہے شاید سرداروں کی حیرت مجھ سے زیادہ ان پر تھی۔

کوئی راہ قرار نہ پانے کے ہاتھوں میں دوڑ پڑی۔ جیسے دیواروں یا کوئی آہنی دروازہ خود ہر گھمے راست دے دے گا۔ اپنے عقب میں سرداروں کا بھانک ٹھنڈے سن کر میرے ہلکتے اصحاب جھنجھٹا اٹھے۔ پھر میں نے اس کی بلند کواز سنی جس میں ایک عجیب سی کھٹک شامل ہو چکی تھی۔ گیدو! وہ نکھوسے فرگشتی بھاگ رہی ہے۔ کھڑے نہ کیا تک رہے۔

پھر جیسے تھوڑے لمحوں میں غیر انسانی فریادوں، مسرت بھری اور دیوانگی آمیز سی چیخوں کا طوفان مچ گیا اور بیروں کا ایک غل غل میرے تعاقب میں دوڑ چلا۔ میں زیادہ دیر تک نہیں بڑھ سکی۔ انہوں نے چاروں طرف سے مجھے گھیر لیا اور بھوکے کتوں کی طرح مجھ پر لوٹ پڑے۔ پیچھے پیچھے میری آواز مسموم ہو گئی اور ہوش و حواس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ آخری کواز جو میں نے سنی وہ سرداروں کے دیوانہ وار قہقہوں کی تھی۔

اس بار جب میری آنکھوں میں روشنی لوٹ کر آئی تو میں اپنی کوششوں میں تھکی لیگیں میرا دھند شاید بڑا ہوا تھا۔ میں نے پس کر رہنا دینا ہو چکا تھا۔ ان گھٹ آریوں سے کٹ کر اسے ریشہ ریشہ کر دیا گیا تھا۔ جب مجھے صحیح طور پر احساس ہوا کہ میں زندہ ہوں تو اس زندگی پر بہت عوامت ہوئی۔ نہ جانے کیوں قدرت نے میرے اندر اتنی قوت برداشت رکھ دی تھی۔ کمال میں مری جی ہوئی۔

اپنے آپ سے عوامت اور فطرت کے ان جوں مسلسل لحاظ میں اپنے دریا بدن اور شہنہ دل کی نیوٹوں کو جھپٹتے ہوئے میں نے صرف ایک ہی بات سوچی کہ آج جب بھی میرا سرداروں سے سامنا ہوا تو غلوں میرا حال کچھ بھی ہو، میں اس پر لوٹ پڑوں گی اور اسے گھور کر دوں گی کہ وہ عقل مار بیٹ کر مجھے ایک بار پھر ہم جوں کر کے نہ چھوڑ جائے بلکہ موت کے گھاٹ اتار دے۔ دل میں یہ محکم ارادہ کر کے مجھے قرار ملا گیا۔

لیکن اس کے بعد دن پر دن گزرتے گئے اور سرداروں نے خلتے میں دوبارہ دکھائی نہ دی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے میرا احساس ٹپا ہو گیا۔ مجھے شاید صحیح طور پر یاد بھی نہ رہا تھا کہ میں کون تھی اور کس طرح یہاں تک پہنچی تھی۔ ہاتھوں سے بھی لیوہ قلیظ اور کھراہ لگائی گویا میرے وجود میں سچا بس گئی۔ میرا ذہن شاید میرے تن سے جدا ہو کر کہیں پیچھے نہ گیا تھا یا شاید اس بدی طرح شل ہو چکا تھا کہ سوچتے محسوس کرنا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ مجھے زندہ صرف اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ میرے جسم میں سانسوں کی تہ

درخت چاری تھی ورنہ معنوی اعتبار سے شاید میں مر چکی تھی۔

میرے ہاتھوں کی ٹیکوں میں میل بس طرح بھی تھی کہ اب بے خواہ میرے ہونے نالوں سے بھی نہیں نکلتی تھی۔ اگر ٹیکوں سے غلام کا واقعی کوئی تعلق ہوتا ہے تو پھر اس میل میں دلن ہو چکا تھا۔ میری جلد کی اصل رنگت بھی میل کے نیچے چھپ چکی تھی اور گھب بات یہ تھی کہ مجھے اب اپنے آپ سے گھن بھی نہیں آتی تھی۔ میں نے کر ہے تاکہ معنوی اعتبار سے شاید میں مر چکی تھی۔ کھانا لےنے والی کپڑے ایک بار نکلا کر مجھے اس قید میں اترے دو سال گزر چکے ہیں تب بھی مجھے کوئی خاص حیرت نہ ہوئی۔

اس کے چند دن بعد ایک عورت ہد حواسی کے سے عالم میں تھ خلتے میں آئی۔ کالج ہاتھوں سے اس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ چلیوں کا گچھا اس کے ہاتھ سے گر کر چاروا تھا۔ میں آڑی زخمی لپٹی لافطی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی شکل مجھے کچھ شباسی محسوس ہو رہی تھی۔

”عزیز! اٹھ۔ جلدی سے باہر آؤ۔“ اس نے دروازہ کھول کر گھبراہٹ ہوئی سی آواز میں کہا۔ ایک لمبے کے لیے تو کھولا مجھے یاد ہی نہ آتا کہ میری میرا ہی نام ہے۔ پھر میں سست سے انداز میں اٹھ بیٹھی۔

خانہ میری آنکھوں میں لافطی کی ہنک دیکھ کر وہ چیز سے اندر آئی اور کھنوں کے بل میرے قریب بیٹھ کر مجھے ہاند سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے مجھے پہچانیں؟“ اور اس سوال کے ساتھ میرا سر پکڑا ہاتھ لیے ہوئے اس کی آنکھیں پھر آئیں۔

”میں نورجہاں ہوں۔“ اس نے گلوگیر آواز میں کہا اور تب جیسے کچھ بھول میری کا پچھانیں میرے ذہن میں روشن ہو گئیں ”بادشاہت کا کوئی تم شدہ حصہ جیسے وٹ آتا۔“

”آج کھانے کی میز پر لو اب صاحب اور ان کے بیٹے بیٹے کے درمیان بگڑا ہو گیا۔“

نورجہاں نے ہلچتے ہوئے بتایا۔ ”بیٹے نے باپ پر گولہ چلا دی۔ گل میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ افراتفری میں سرداران سے جانچنا کا گچھا کر گیا۔ میرے دل میں پہلا خیال یہی نکلا کہ شاید قدرتی نے مجھے تسمانی مد کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس سے پہلے کہ سرداروں کو چلیوں کے مجھے کی عدم موجودگی کا احساس ہو، میں جیسے گل سے نکلتا چلتی ہوں لیکن تم بھی کچھ بہت کرو۔ یوں بہت بن کر نہ بنو۔“

اس نے ہاند سے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور ساتھ لے کر تھ خلتے کے بڑے دروازے کی طرف دوڑی لیکن میں دوڑنے کے بجائے اس کے ساتھ تقریباً گھس رہی تھی۔ میرے پاؤں چلتا بھول چکے تھے اور میں یوں لڑکھڑا رہی تھی گویا ہموار فرش کے بجائے پتھوں کے ڈھیر دوڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کوٹھری سے گل نے کے باوجود میری کمر کھولنے کی طرح ہنک ہوئی تھی۔ دو سال میں نے اس کوٹھری میں گزارے تھے جہاں میرے ہونے کی

گھبراہٹ ہی نہیں تھی اور سر جھکائے بیٹھ بیٹھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں مستقل لم چڑھ گیا تھا۔ شاید میں چھاپا بن گئی تھی۔

نورجہاں نے تھ خلتے سے نیچے وقت کوٹھری اور بڑے دروازے کا تھ دروازہ لگا دیا تھا۔ بیڑیوں کے دروازے سے گل کر ہم طویل راہداری میں کسے جہاں گچھا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ نورجہاں اندھا دھند دوڑ رہی تھی۔ کلفتی دیر تک اس کے ساتھ گھسے کے بعد میرے قدم سیدھے چڑنے لگے تھے لیکن کمر کو اب بھی سہرا کرنے کی کوشش کرتی تو ریڑھ کی ہڈی میں درد محسوس ہوتا۔ اب ہم پارل میں دوڑ رہے تھے جو طعم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ میں یہی طرح ہاتھ رہی تھی لیکن نورجہاں مجھے سانس درست کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔

خدا خدا کر کے ہم ایک دیوار تک پہنچے۔ نورجہاں نے رک کر چھ گری سانسیں لیں اور اپنا بیٹا سا دھڑا آواز کرکے دپتے ہوئے بولی۔ ”پہ رکھ لو۔ تن اچانچے کے کام آئے گا۔ یہ نشت کی تم آگے سے بالکل نکلی ہے۔“

پھر وہ مجھے راستہ سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ دیوار پچھو کر تم جس سڑک پر پہنچو گی۔ اسے پار کر کے میدان میں بھاگی جانا۔ آگے سر آئے گی اس کا پل عبور کر کے جنگل شروع ہو جائے گا۔ پل کی سیدھ میں جنگل کو عبور کرنا۔ آگے چند فرسٹک پر ایک ہتی ہے۔ کسی طرح وہاں تک پہنچ جانا اس کے بعد کیا ہوگا یا تمہیں کیا کرنا ہوگا میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اب جلد خدا جاننا!“

پھر وہ چاروں ہاتھ چوڑوں پر ہنک گئی۔ ”میری کمر پر چڑھ کر دیوار پھلانگ لو جلدی کرو۔“ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

میں اس کی بات سمجھنے کے باوجود چھ لمبے تک تو عمل کرنے سے قاصر رہی۔ اس نے میری پٹلی پر ندر سے گھون مارا تو میں گویا کسی تیزی سی کیفیت سے چھٹک اٹھی اور اس کی کمر پر چڑھ گئی۔ دیوار سے پہلی طرف زمین خالصے عجیب میں نظر آ رہی تھی، تاہم میں نے خالی لڑائی کے سے عالم میں نہ میرے میں چھلانگ لگا دی۔

ایک لمبے کے لیے تو گویا میرا تھمد دلخالی کر رہ گیا۔ سمجھ کر میں نے ارد گرد دیکھا۔ چاروں طرف درہلی کا راج تھا۔ سامنے پل سی سڑک اندھیرے میں نہ ظم نظر آ رہی تھی۔ یہ سڑک پار کر کے میں ریتیم میدان میں بھاگنے لگی۔ بھاگتے بھاگتے میں دو سڑک سے ہم ہو کر گری ٹین کل ہوا کے نس نے گویا جسم میں آزادی کی مودہ طلب کوئی زندگی سے دی تھی۔ اس لیے میں تھک پار کر پڑی رہنے کی بجائے ہر مرتبہ ایک نئے نئے سے اٹھ کر دوڑنے لگی۔ میری تمام حیانت ایک طویل مدت تک خوابدہ رہنے کے بعد بیدار ہو چکی تھیں۔

میدان ختم ہوا تو میرے سامنے سر آگئی۔ اس وقت تک اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ پل پر کھینچنے کے لیے مجھے دائیں ہانا چاہیے یا بائیں؟ خوش قسمتی سے تھوڑے ہی لمحوں پر مجھے پل نظر آگیا۔ پل عبور کرنے کے بعد میں جنگل میں داخل ہوئی۔ شہر میں درختوں کا سلسلہ گھٹان نہیں تھا۔ گھٹان حصہ شہر میں ہوا تو ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔

کئی مرتبہ میں درختوں سے گرائی اور مجھے یہ بھی اندازہ نہیں رہا کہ میں سیدھی جا رہی ہوں یا میرے سر کی سمت تھریل ہو گئی ہے۔ حسرت بھرا ہوا ہوں تھیں تو اندر کا خوف بھی جاگ اٹھا تھا۔ اب جنگ جھل کی چڑچڑاہٹ یا کبھی کبھی کبھی دور دراز سے سنائی دینے والی کسی جالور کی ہلکی سی کوا سے دل دہل جاتا تھا۔

پھر مجھے یہ احساس بھی نہ رہا کہ جنگل میں بھٹکتے ہوئے مجھے کتنی دیر ہو چکی ہے۔ میرے پاؤں شدید زخمی ہو چکے تھے کیونکہ اب ہر قدم پر پاؤں میں نہیں سی ابھرتی تھیں۔ اس تصور سے مجھے ہول آ رہا تھا کہ اس طرح نہ چلنے کب تک میں بھٹکتی رہوں۔ ایک جگہ میں نہ چلنے کس جڑ سے ٹھوکر کھا کر گری۔ درختوں کی کچھ ٹنگ ٹھنیاں میرے پیچھے تلے چڑھ گئیں۔ میں اسی لمحے کاروں کے پردے چاڑھ دینے والا دھماکہ ہوا اور ایک انکارہ سا سنسناتا ہوا میری ناک سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گیا۔ بے اختیار میرے حلق سے ایک ٹھٹھک جھجھک اور میں اپنی جگہ پڑے پڑے تھر تھر کانپنے لگی۔ پھر کہیں بائیں سے مدھن کی ایک فواد سا پھوٹا۔ اس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ میری آنکھیں چہرہ کر رہ گئیں۔

چند سیکنڈ تک مدھن کا یہ دائی دھیرے دھیرے حرکت کرتا رہا پھر غائب ہو گیا۔ گرد و غبار ایک بار پھر وہی گھٹا لپ اندھیرا اور سنسناتا چھا گیا۔ میرا جی چاہا کہ اٹھ کر ہلک لپٹ لیکن جسم میں گھبراہٹ سی نہ رہی تھی۔ چند لمحے بعد دھب کی سی کوا سنائی دی گویا کوئی بائیں سے کودا ہو۔ پھر جنگل سے لور ٹھنیاں چڑھ آئے تھیں۔ کوئی میری طرف آ رہا تھا طرف سے میری گھٹکی بندھ گئی۔

مدھن کا سیلاب ایک بار پھر اٹھا اور میں اس میں نہا گئی۔ میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ چند لمحے سکوت طاری رہا تو میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا اور اب مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک طاقتور ٹانگہ تھی جس کی مدھن مجھ پر مرکوز تھی لیکن جس شخص نے اسے تمام رکھا تھا اس نے چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف ٹانگہ پر ہوا ہوا اس کا ہاتھ لور نیچے دے رہے تھم جوتوں کی جھلک دھنکی دی۔

"تو کیا کھول ہو بہی۔" دلاختر اس شخص کی بھاری لور پارکب کواڑ ابھری۔ "چل" دائیں یا بائیں؟

میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ "بے اختیار میرے حلق سے لڑائی سی کواڑ گئی۔" "میں نے اس نے ایک گہری سانس لی۔ "کس کی طرف؟" پھر وہ خود کلائی کے سے انداز میں بولا۔ "جھکی لور سنیا سی تو بہت دیکھتے تھے لیکن تنہا سن آج کلائی سرچہ دیکھی ہے۔" پھر وہ اپٹ کر بولا۔ "مگر تم کچھ اسی طرح ہو تو کچھ کچھ کچھ تم کوئی ہو؟" "میں ایک۔ مصیبت زدہ عورت ہوں۔" میری کواڑ خود بخود ابھرا گئی۔ "خدا کے لیے میری مدد کرو۔" میں نے اس کے سامنے ہاتھ ہول دیا۔

"میں نے ابھی جس شیرینی کے دھوکے میں تم پر گویا چلائی تھی اگر وہ نکلتے پر لگ گئی ہوتی تو تمہاری ساری مصیبتیں کا خاتمہ ہو جاتا اور میں تھیں ہے کہ وہ شیرینی اب بھی اس طرف آئے تھے اور تمہارے ساتھ ساتھ میری مصیبتیں کا بھی خاتمہ ہو چلتے۔" اس شخص نے اب قدرے بدلتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دیکھ پائی دی دے میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

اس سوال کا مجھے کوئی جواب نہ سوجھا۔ حقیقتاً مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ مجھے کس قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں خالی خالی نظروں سے چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اندھ کی مدھن کے عقب میں اب مجھے اس کے دھنکے دھنکے خود بخود نظر آنے لگے تھے۔ وہ چوڑے کندھوں والا ایک دراز قد لور جسم آدمی تھا۔ سر لور نقوش کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کیونکہ اس کے سر پر بیٹھ موجود تھا تاہم اس کی گھٹی موچوں کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

میں نے اپنے رنگ آلود زانوں پر بہت زور دیا کہ مجھے اس کے سوال کا کیا جواب دینا چاہیے۔ دلاختر میرے منہ سے نکلا۔ "مجھے چند لمحوں کے لیے پتا دے دو۔ کس چمپا لو۔" اس نے اندھ کی مدھن کا زونچ دلا اور غالباً ایک بار پھر میرا سر ٹپکا جانکہ لپٹا اور ہٹکارا ما بھرتے ہوئے کہا۔ "کہاں سے بھاگ کر آئی ہو؟"

میں غصہ سے اتنے ہی گئی تھی کہ میں کہاں سے اور کس طرح آئی ہوں کہ ایک لپٹ میرے لپٹدار زانوں نے مجھے شہوار کیا کہ یہ شخص مجھے پکڑ کر دوبارہ گل میں نہ پچھا ہے۔ ایک لمحے کے لیے میں گڑبڑ سی گئی پھر سنبھل کر بولی۔ "میں میں دراصل ایک بے سارا عورت ہوں اور اپنے کچھ منہوں کے غم و غم سے تک اگر قرار ہو گئی ہوں تو جنگل کر اوپر آئی ہوں۔ تم دیکھ رہے ہو انہوں نے مجھے کس حال کو پہنچا دیا ہے۔"

"بھائی" اس نے بار پھر ہٹکارا بھرا گویا سوچ میں پڑ گیا ہو۔ پھر اس نے ٹانگہ بجا دی۔ پھر وہ ایک بار پھر بحر ظلمات میں ادب گیا۔۔۔ کھل چند لمحوں تک حیر مدھن کا سامنا کرنے سے میری آنکھوں میں درد سا ہونے لگا تھا۔ اندھیرے میں اس شخص کے گہری گہری ہانسی لینے کی کواڑ مجھے سنائی دے رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہوا میں کچھ سوچنے کی

کلیف وہ محسوس ہوا۔

"تم اسے کیوں مارنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ اس نے ایک بار پھر یوں میری طرف دیکھا تو اسے ایسے احمقانہ سوال کی قطعاً توقع نہ رہی ہو۔

"اس لیے کہ میں ایک شکاری ہوں۔" ایک گہری سانس لے کر اس نے گویا سمجھاتے ہوئے کہا۔ "شوق شکاری۔ گو کہ میں کوئی نوابزادہ نہیں ہوں لیکن بس اس شوق میں پڑ گیا ہوں اور اس سے بچنے میں نے کوئی شیر یا شیرنی نہیں ماری۔ ویسے بھڑکے تو مجھ سے یہ سوال کرنے کے بجائے اس شیرنی کو ڈھونڈ کر اس سے پوچھیں کہ وہ گڑھی خراب کے تمام نوابزادوں کو ہڑپ کرنے پر کیوں تکی ہوئی ہے۔"

پھر اس نے چلتے چلتے ہندوئی کدھرے سے لٹا کر ایک لمبے کے لیے بیٹ لٹھا کر سر اٹھایا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ہال بھروسے اور لمبے تھے اور کھنڈرے لڑکوں کی طرح بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بیٹ لٹھا کر سر پر رکھ کر گہری گہری گھول سے میری طرف دیکھا۔ پھر راستے کی طرف حوجہ ہوتے ہوئے ایک لمبے کے وقف کے بعد اچانک پوچھا۔ "تو پاگل تو نہیں ہو گیا؟"

میں سمجھ نہیں سکی کہ اس نے یہ سوال چھپکلی سے کیا تھا یا یہ بھی اس کے مخصوص انداز گفتار کا ایک حصہ تھا۔

"جیسے یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" میں نے پوچھا۔

"ویسے ہی۔۔۔ احتیاطاً پوچھ رہا تھا۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ پھر اپنی محنتی بوچھل کو مل دیتے ہوئے بولا۔ "دراصل مجھے پاگل عورتوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

"جیسے پاگل نہیں ہوں۔" میں نے کہا "البتہ کچھ عرصہ اور مجھے قرار کا سوچ نہ ملتا تو شاید ہو جاتی۔"

"ہم ہندوستانی بہت پرساندہ ہیں۔" اس نے مدھم سی توال میں گویا اپنے آپ سے کہا۔ "مخالفے ہیں عورت پر بہت ظلم ہوتا ہے۔ تمہاری حالت دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا کہ تم کی جگہ سے آئی ہو جہاں سے انسانوں کا بھی مکرر تھا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ فی الحالہ میں اس مقام اور ان حالات کا تصور ذہن میں نہیں لانا چاہتی تھی جن سے میں گزر کر آ رہی تھی ورنہ میں شاید پھوٹ کر رو پڑتی۔ نہ خاموشی سے چلتے رہے۔

ایک موڑ پر اگر اس نے پگڑھی پھوڑ دی اور دائیں ہاتھ چل دیا۔ اب ہم ایک کچھ میدان میں چل رہے تھے۔ ہوا ساکت تھی اور قالینا اوس پڑ رہی تھی۔ زخمی بھول کے نرم نرم، خشک اور نرم اور مٹی کا لیس مجھے اچھا محسوس ہونے لگا۔ کلنی دہ میدان میں بچے رہنے کے بعد جیسے اچانک ہی ہم درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچ گئے۔ اس جھنڈ

کو شل کر رہا تھا۔

"اٹھو میرا ہاتھ پکڑ لو۔" بالاخر اندھیرے کی آغوش سے اس کی گونجی آواز ابھری مگر اس کا ہاتھ ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ٹوہی جبک کر مجھے ہاند سے پکڑ کر اٹھایا پھر مضبوطی سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ چلتی آؤ۔"

اس کی رہنمائی میں میرا سفر شروع ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ چلتے رہنے کے بعد پھر دوسرے درختوں کا سلسلہ شروع ہوا اور تب مجھے معلوم ہوا کہ آسمان پر پورا چاند لگا ہوا تھا۔ پھر دوسرے درختوں کا سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا اور ہم ایک پگڑھی پر آ گئے جس کے دونوں طرف کہیں جھاڑوں، کہیں بوڑے اور کہیں اکا واکا درخت تھے۔ اب اس نے میرا ہاتھ چھو لیا اور میں اس کے برابر چلتے گئی۔

ایک دو ذرہم نے غل غل ٹھکوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے اپنے دھیان میں چلتے گئے۔ بالاخر وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا لیکن نہ جانے کیوں بڑا چمکنا اور گرد و پیش سے باخبر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمر تیس اور پچیس کے درمیان ہوگی۔ رنگت کسے جیسی تھی۔ آنکھیں بھوری تھیں اور دھندلی دھندلی سی چاندنی میں بھی ہلا کی چمکی نظر آتی تھیں۔ وہ خیالے سے رنگ کی ایک کھردری، چسبٹ پتلون اور بند گئے کا چلوسے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے محض سکوت ڈالنے کے لیے پوچھا۔

اس نے گردن کھنکھائی یوں میری طرف دیکھا جیسے میرا سوال اسے نہایت احمقانہ لگا ہو۔ پھر مدھم آواز میں کہا۔ "جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔" پھر ایک لمبے کے وقف سے بولا۔ "یہاں سے تقریباً ایک گھنٹہ کے واسطے پر غلی ریاست کا گھٹا گڑھی خراب ہے۔ اس سے تقریباً ایک فرائنگ پہلے وہ مکان آتا ہے جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اس سے پہلے کہ تم میری سوالات کو میں تمہیں خود ہی بتا دوں۔ میرا نام شوکت محمد ہے اور میں اصل رہنے والا کلکتہ کا ہوں۔ ایک کوبہ نور شیرنی کا چرچا سن کر تقریباً ایک ماہ پہلے یہاں آیا تھا تب سے اب تک میرا خیال ہے کہ میں جنگل کے سارے جانوروں کو مار چکا ہوں، سوائے اس شیرنی کے۔ پہلے تو مجھے اس کے وجود کا یقین ہی نہیں تھا کیونکہ اس علاقے میں شیر نہیں پائے جاتے لیکن یہ شیرنی تمہاری طرح نہ جانے کہاں سے بھکتی ہوئی آ گئی ہے۔ بہرحال اب مجھے اس کے وجود کا یقین آ گیا ہے کیونکہ پر سوس میں نے اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میری گولی سے شاید اس کی ایک ٹانگی ٹٹک بھی زخمی ہوئی ہے لیکن اس کے ہاتھ کا سے وہ قاتل ہو گئی ہے۔ کوئی سرنگ نہیں مل رہا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ زیادہ زخمی ہو گیا ہو اور کسی کھو میں پڑی موت کا انتظار کر رہی ہو۔"

اس کا انداز گفتار خاصا قلقلہ آور، مستند تھا لیکن اس کا آواز، "کہ نہ جانے کیوں مجھے

"تمہی مدد کیوں نہ ہو گی نندو؟ یہ شریف تو نہیں ہے۔" شوکت نے اسے ایک طرف ہٹایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ نندو سر جھکائے پیچھے آ رہا تھا۔

میں عبور کر کے ہم ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئے جہاں طاق میں ایک اونچا سا نیو سین لیمپ روشن تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک لمبے چوڑے دیوان پر بستر لگا ہوا تھا۔ وسط میں ایک گول تپائی کے گرد موٹے موٹے تختوں سے بنی ہوئی چار کرسیاں پڑی تھیں۔

"نندو! شوکت نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جلدی سے کنویں سے پانی لال کر پائیاں بھر لو اور اس دیکھواری لڑکی کے نسلے دھوئے کا بندوبست کر۔ پینے کے لیے اسے میرے شب خرابی کے کپڑے دے دے اور پھر اس کے لیے کھانے اور چائے کا بندوبست کر۔" نندو سخوت مندی سے سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد جب میں غسل خانے سے نکل تو ڈھیلی ڈھال صرف سٹری بیٹ ٹرٹ اور پاجامے میں مجھے اپنا وجود روئی کے گالے کی طرح سبک لگ رہا تھا۔ کنویں کا پانی نہایت فرحت بخش تھا اور خوشبودار صابن کے ڈھیروں جھاگ کے ساتھ میرے جسم سے ہٹتی ہوئی روئی کی لہا لہاتیں بہہ نکلی تھیں۔ نندو نے مجھے ایک دوسرے کمرے میں پہچا دیا جس کا فرش کچا گر صاف ستھرا تھا۔ ایک طرف بیٹی کی چارپائی تھی جس پر سلیپے سے بستر لگا ہوا تھا۔

"آپ سٹھی وغیرہ کر لیں بی بی جی! میں اتنی دیر میں کھانا لاتا ہوں۔" نندو نے ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا جس پر ایک لمبا سا آئینہ آویزاں تھا اور قہقہے ہی ایک طاق میں ٹکھن رکھا ہوا تھا۔ درجن بعد میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کچھ دیر پہلے تک میں کیسی لگ رہی تھی۔ پھر اکی اپنا آپ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی صورت نے اپنی بھولیا بھری "نئی بیٹی" گرد سمود تصویر کو جھانپ کر مجھے کر کے رنگوں سے اس کے خدا خال اسرنا بھارے ہوں۔

سٹھی کر کے میں بالوں کا جوڑا بنا کر پیش تو شوکت کو دروازے میں کھڑا پایا۔ وہ کپڑے بدل چکا تھا اور کمرے پاجامے میں پہلے سے ٹکٹ لگ رہا تھا پلٹے اور جہاں وہ رہتا تھا۔ جیسے اس کی عمر میں چند برس کا اضافہ ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں محنت بھی تھی اور بے

کے درمیان ایک نیم پلٹہ مکان کی چار دیواری نظر آ رہی تھی۔

دروازے پر پہنچ کر شوکت حسن نے دستک دی۔ تیسری دستک کے بعد اندر ٹھہرتے ہوئے وہی اور خودی سے پوچھل مودانہ سوال میں پوچھا گیا۔ "کون ہے؟"

"میرے والد بزرگوار! شوکت نے یہ آواز بلند کرنا۔ "مہلادی سے دروازہ کھول۔"

کنڈی گرسنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھولتے والا واسکٹ اور دھوئی میں بیوس گئے ہوئے جسم کا ایک اوجیز عمر کا سٹولا سا آدمی تھا۔ کھڑی سی دائی "چند سی چند سی آنکھیں اور موٹے موٹے ہونٹ مگر اس کے چہرے پر مصویت کا پتہ تھا" وہ ایک ہاتھ میں لائٹیں اور دوسرے میں لالھی لٹائے ہوئے تھا۔

"نشیرونی ماہی صاحب؟" دروازہ کھولتے ہی اس نے پوچھا اور اسی لیے اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ ہنسا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔



اس نے چٹکی چوسنے سے اتارتے ہوئے جواب دیا۔ "کہ میں گاؤں سے لے آیا ہوں۔" وہ
اتھ کر پیسے کمرے کی طرف گیا اور چند لمبے بعد کھد کا تھیلا اٹھائے باہر آؤ۔
"اس میں دو لٹاں بوڑے ہیں۔" اس نے تھیلا میری طرف بوجھتے ہوئے کہا۔ "میں
وہ بوڑے سے استعائن شدہ لیکن ایسے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ کو پورے بھی آئیں
گے۔"

میں نے کپڑے چیلے سے نکال کر دیکھے، پھر ہمارے دھننی شلوار اور قمیض تھی۔ ایک
دوہ لور ہی لٹاں چھپیں بھی تھیں۔ فساد کو کر نہیں لے لی میں سے ایک جوڑا پٹا۔ اس
میں اگر کوئی غالی تھی بھی تو کم از کم اس وقت مجھے محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے تو گویا ایک
نیا جنم لیا تھا اور ہر چیز میرے لیے نعمت سے کم نہیں تھی۔ ناشتہ کر کے جو دراصل دھیر
کا کھانا تھا، میں ایک بار پھر سو گئی۔ نہ جانے کیوں مجھے بے تحاشہ نیند آئے جا رہی تھی۔
دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ صحن میں مجھے کوئی
نقیرت آیا تو میں پیسے کمرے میں چلی گئی اور دیکھا شوکت صحن بولن کو سامنے رکھے جام
نبھال بیٹھا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی جو شیلے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔
"تمہارے قدم بہت مبارک ہیں۔" وہ تقریباً چلا اٹھا۔ "آج میں نے شیرینی مار لی۔ یہ
بٹکا رہا بھی۔" قصوریں کھینچیں گاؤں میں باقاعدہ میرا جلوس اگلا گیا، بار پٹائے گئے،
یہاں بھی لوگ مبارکباد دینے آ رہے ہیں۔ لمبوار بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا، ابھی کہا
ہے۔"

"ملاش کہاں ہے؟ میں نے کہا۔"

"کھال میں نے اتار کر مخلوط کر لی ہے۔ لڑی ناظم جنگلات کو بھیج دی گئی۔ وہاں سے
باقاعدہ رپورٹ تیار ہو کر کلکٹر صاحب کو جائے گی۔" اس نے پیسے مسرور اور غمور لہجے
میں بتایا۔ پھر چونکے ہوئے بولا۔ "میرے تم کھڑی کیوں ہو؟ تو بچو نا۔ آج میں بہت خوش
ہوں۔"

اس نے گلاس میں پی پی ہوئی شراب ایک ہی گھونٹ میں حلق میں اڑھلی اور دوسرا جام
تیار کرنے گا۔ میں بیٹھ گئی تو اس نے سر تپا میرا جائزہ لیا اور جب اس کا ہوش و غروش درا
تم ہوا تو ذرا گھبرائے گھرے لہجے میں بولا۔ "تمہارا کیا پروگرام ہے؟ میں تو شیعہ پرسوں تک
یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔"

میرا دل ڈوب سا گیا۔ "کہیں جا رہے ہو؟" میں نے بہتکل پرچھا۔ "یہاں سے تو گھر
ہاؤں گا۔ چھ دن آرام کر کے آئندہ کا پروگرام ہاؤں گا۔" اس نے جواب دیا۔ میں
ظاہرشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ میں اسے کیا بتاتی کہ میرا پروگرام کیا تھا۔ ابھی تو میں
آزادی کے احساس سے بھی پوری طرف لطف اندوز نہیں ہو چکی تھی۔

چھٹی بھی۔

"تم ہی ہو۔" کیا نام بتایا تھا نے اپنا؟ اس نے تجزی سے چلیں بھپکاتے ہوئے
کہا۔

"عزیزو!" میں نے سر جھکا کر آہستگی سے جواب دیا۔

"ہلن۔ عزیزو تمہاری تو جان ہی بدل گئی۔" اس نے چوکھٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
میں خاموش رہی۔ دلتا اس کے پیچھے نذر نمودار ہوا۔

"میں نے پیسے کمرے میں کھانا لگا دیا ہے پی پی جی!" اس نے اطلاع دی۔ شوکت کے
پیچھے غالی ہوئی میں دوبارہ اس کمرے میں پہلی پہلی کر سہاؤں ولیدہ پڑی تھیں۔ پہلی پر ایک
قلب میں بہتا ہوا گوشت اور چمچیر میں پڑی روٹیوں رکھی تھیں۔ میں نے حتی الامکان
میرا لور شائستگی سے کھانے کی کوشش کی لیکن اپنے نمونے پن پر قابو نہ رکھ سکی۔ شوکت
باہر جانے سے پہلے کھانا کھا چکا تھا۔ اب صرف چائے کی چمکیاں لپتے ہوئے مجھے دیکھی سے
کھاتے دیکھ رہا تھا۔

کھانے اور چائے سے فارغ ہوتے ہی مجھ پر ایک عجیب مسرور آمیز غم کی جاری ہونے
لگی، جیسے ایک مدت تک صحراؤں میں آبلہ پا سفر کرنے کے بعد کوئی مسافر یک لخت
آسمان کیوں کے گلستان میں پہنچ کر اوتھنے لگے۔

شوکت کی آواز نے مجھے چھوٹا دیا۔ "آپ تم اسی چھوٹے کمرے میں جا کر سو جاؤ، باقی
ہاتھیں کل ہوں گی۔" وہ کہہ رہا تھا۔

چوں میں شوکت کی ذہنی و حلی چلیوں کو کشمکش میں چھوٹے کمرے میں آتی اور
کھڑی لگا کر بستر پر لیٹ رہی تھی۔ مام سا بستر اس وقت مجھے پھولوں کی سچ سے زیادہ آرام دہ
اور غفل کے گدوں سے لونا دہر محسوس ہو رہا تھا۔ سب سے زیادہ فرحت مجھے اس بات
میں محسوس ہو رہی تھی کہ اس پر میں ناخنیں پوری طرح پیاد کر لیٹ سکتی تھی۔ اس لذت
و لرعت کا اندازہ وہی نہ نصیب کر سکتا ہے جو دو سال تک سودا چھوٹے لڑش پر چار ٹٹ سے
بھی کم جگہ میں سکر سٹ کر سوتا رہا ہو۔ چند لمبے بعد میں دنیا دہانیا سے بے خبر ہو گئی۔

اگلے روز میں کمرے سے لگی تو وسیع صحن میں تیز چمکیل دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چھ
لمبے تک تو اس دھوپ میں میری آنکھیں ہی نہ کھلیں، پھر جب تک آنکھیں باز ہوئیں تو
میں نے دیکھا نذر ایک گوشے میں پچھرتے بیٹھا ہے لمبے پر دھند گرم کر رہا تھا۔ یہ گوشہ
قائما مکان کا بالورہی خانہ تھا۔ نذر نے بتایا کہ صاحب چھ تو میوں کے ساتھ جنگل کی طرف
گئے ہیں البتہ وہ اسے ایک کام کہہ گئے تھے جو اس نے کر دیا ہے۔

"کیا کام نذر؟" میں نے پرچھا۔

"صاحب کہہ گئے تھے کہ میں سہ کے لئے ایک بوڑے کپڑوں کا بندوبست کر دوں۔"

"شوکت۔" میں ہلکا اٹھی۔ "مجھے معاف کر دو۔ مجھ میں اب کسی کی ہوس کا نشہ بننے کی شکت نہیں ہے۔ شوکت۔" پھر میری آواز گھٹ کر رہ گئی۔ اس کے منہ سے ایسے ہونے شراب کے جھپکے میرے حواس کو گھٹ کر رہے تھے۔ میں نے بہت مزاحمت کی۔ اس کی دست درازوں کا سیلاب رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بہت طاقتور تھا۔ دھلتا میرے گھٹے کسی طرح اس کے پیٹ سے نکلنے اور وہ دیوان سے نیچے جا گرا۔ میں اٹھی تو میری پشت دیوار سے جڑ کر رہی اور کوئی بھاری سی چیز دیوار سے میرے کندھے سے نکل رہی ہوئی دیوار کے قریب آگئی۔ میں نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔ یہ شوکت کی راتل تھی۔

میں نے راتل سیدھی ہی کی تھی کہ شوکت دیوار پر چڑھ کر دیوانہ وار بھڑک پڑا۔ ایک جھپکے سے اٹھ بیٹھ گئی۔ دل دھلانے والے دھماکے کے ساتھ ہی مجھے زبردست دھچکا لگا اور میں دیوار کے ساتھ ٹکرا کر دیوان پر گر گئی۔ میرا کندھا گویا جسم سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ میں ایسا کھلی کہ گول مجھے لگ گئی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھتا تو میں نے دیکھا شوکت فرش پر چاندی شانے چپ پڑا تھا اور اس کی آدمی کھوپڑی ایک آنکھ اور ناک کا تھوڑا حصہ غائب تھا۔ بھل بھل پستے خون اور بھیاک زخم کے رشتہ اس کا اوہورا چوہ نہایت خوفناک لگ رہا تھا۔

راتل اب بھی میرے ہاتھ میں تھی اور مجھ میں گویا افسوس کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ پھر جیسے میں کسی ارادے کے خلاف سے جاگی اور اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ کھڑکی کھول کر میں نے صحن میں قدم رکھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے رک جانا پڑا۔ خدو میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس کے پیرے کی مصیبت کس جانب ہو چکی تھی اور وہ ہونٹ بچھنے اپنی چاندی چاندی آنکھوں سے ایک تک مجھے غور رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے تو ہم آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سانس کھڑے رہے۔ پھر وہ مجھ پر بھڑکا۔ دھلتا میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور خدو کی اصل شکل گویا میرے سامنے سے غائب ہو گئی۔ وہ مجھے دھڑا شوکت نظر آیا۔ اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ راتل میرے ہاتھ میں ہے۔

میرے بازو پوری قوت سے میرے اور راتل کا کندھا خدو کی کھینچی اور رخسار پر چڑھا۔ وہ ایک ہاتھ کھینچی پر رکھ کر بری طرح ٹکڑیا۔ اب مجھ میں اپنے دفاع کی حس اور احمق بیدار ہو چکا تھا۔ اب تک میں نے غیر ارادی سے انداز میں ہاتھ پاؤں چلانے تھے۔ اب میں نے باقاعدہ ہوش و حواس سے کام لیتے ہوئے راتل کو تل کی طرف سے پکڑا اور اس کے کندھے سے کھال کی طرح خدو کے سر پر وار کیا۔ اس مرتبہ اس کے حلق سے گھل گئی کرلو سی نکل گئی۔ سر قاتلے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے لیکن یہ ہاتھ سر تک

"تمہارا کوئی ایسا عزیز رشتے دار نہیں جس کے پاس تم جانا جاؤ۔" چند پھولے پھوٹے گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے پوچھا
میں نے خاموشی سے لگی میں سر ہلایا۔

"مزید!" دھلتا اس نے سرگوشی سی کی۔ "تمہارے ترے مجھے بہت اچھی لگی ہو۔ میرے بس میں ہو۔ تو میں تم سے شادی کر جاتا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میرے تین بچے ہیں جن میں سے دو سینے ہو چکے ہیں اور میری بڑی بیٹی پھنے خان کی بیٹی ہے۔ وہ یہ تو ہدایت کر سکتی ہے کہ مجھے کوئی آدم خود شیر کھا جائے لیکن یہ ہدایت نہیں کر سکتی کہ میں دوسری شادی کر لوں۔"

"اگر تم شادی شدہ ہو تو حالات خواہ کتنے ہی موافق ہوتے" میں بھی تم سے شادی نہ کر لی۔" میں نے دم پچھے میں کما اور جانے کے لیے اٹھنے لگی تو اس نے بے تابی سے ہاتھ ہل کر مجھے پھینکے کا اشارہ کیا۔

"نہو! نہو! مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو شاید میرے ذہن میں کوئی تدبیر آجائے۔" اس نے کہا۔

میں بیٹھ گئی۔ وہ جام پر جام خان کرنے لگا اور ایک تک مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کی رنگت کچھ اور گہری ہو گئی تھی اور آنکھوں میں سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں شکر نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ بہت وقت گزر گیا۔ بوقت آدمی سے زیادہ خالی ہو گئی تھی لیکن اس کا سکوت نہ ٹوٹا۔

اس کی آنکھوں میں پچھلے سینے سامنے تھے کہ اس کے اندر نہ جانے کون کون جڑیوں کا کار دار گرم ہے۔ تھک کر میں نے جھپکے سے پلو ہلنے لگی تو وہ گس رکھ کر اٹھا جیسے اچانک کسی فیصلے پر پہنچ گیا ہو۔ غیر متوازن سے قدموں سے دروازے تک چکر اس نے کھڑکی پر چڑھا دی۔ میری دھڑکنیں ایک لخت تیز ہو گئیں اور گلیوں میں دھماکے سے ہونے لگے۔

وہ داییں آکر میری کرسی کے عقب میں کھڑا ہو گیا اور اچانک اس نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے میرے کندھوں پر رکھ دیے۔ "مزید!" اس نے میرے گلے کے قریب سرگوشی کی۔ اس کی زبان حرکت رہی تھی اور آواز کی قسم میں کوئی درد مند بول رہا تھا۔ یک یک ہی اس میں کوئی تبدیلی آگئی تھی۔

"یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" میں نے سخت لمحے میں کہا اور اس کے ہاتھ کندھوں سے ہٹانے کی کوشش کی مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

"تم نے مجھے چمک کر دیا ہے مزید۔ اب مجھے نہ ترساؤ۔" ایک لخت اس نے نہ جانے کس طرح مجھے اٹھا کر دیوان پر لے جا پٹا۔ پھر وہ عقب کی طرح مجھ پر بھڑکا۔

نہ پہنچ سکے اور وہ لڑکھڑا کر چیت ہو گیا۔ خون کی ایک کھیر اس کے ہاتھوں کی جڑوں سے ہوتی ہوئی کلن کی ٹوٹک پر بہ آئی تھی۔ میں نے راکٹل وہیں پھینکی اور اس کا بے حس حرکت جسم پھلانگ کر دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

مکان سے کافی دور نکل آئے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ارد گرد تو دور تک سناٹا ظاہری تھا۔ میں چاہتی تو مکان میں ہی رہ سکتی تھی اور دن لگنے کے بعد کہیں کا رخ کر سکتی تھی لیکن پھر مجھے شکست کی لاش کا خیال آیا۔ ادھر سے اور بھی ایک چرے والی اس لاش کی موجودگی میں مجھے اس مکان میں رات گزارنے کا تصور بھی ناممکن محسوس ہوا اور پھر غمزدگی کے بارے میں مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی مر گیا ہے یا صرف بے ہوش ہوا ہے۔ رات کو صبح ہی صبح اگر کوئی مکان کی طرف "D" تو میرے لیے کوئی راہ قرار نہ رہتی اس لیے میں نے مکان کی طرف واپس چلنے کا خیال ہی منہ سے نکل دیا اور سیدھی چلتی رہی۔ کچھ دیر بعد میں سڑک پر پہنچ گئی۔ اتنا مجھے اندازہ تھا کہ شوکت کے ساتھ میں کس سمت سے آئی تھی۔ میں نے اس سے مخالف سمت میں چلتا شروع کر دیا۔

کچھ دیر بعد اپنے عقب میں ٹھونڈوں کے تاپوں کی آواز سنائی دی۔ فوری طور پر میں مسم کر پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر سڑک سے سچے میں اتر کر خلیب میں بھاگنے ہی والی تھی کہ غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھ لیا۔ دھندل چاہتی تھی میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑا آبی چال سے آ رہا تھا گویا اس کے کوچہ ان کو کوئی خاص جگہ نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے وحشیت ہی ہوئی کہ گاڑی پر کوچہ ان اکیلا ہی تھا۔

میں نے بھاگنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنے آپ کو جتنی الامکان پر سکون ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سڑک کے کنارے کندھے پر بیٹھ گئی۔ گھوڑا گاڑی بالکل قریب آ پہنچی تو میں رک گئی اور اس کی طرف مڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کوچہ ان ایک وہ پتلا اویڑ عمر آؤں تھا۔ معمولی جسم اور کمرے میں بایں تھا "سر پر مختصری بگڑی تھی۔ اس کی مونچھیں سفیدی بالکل اور رنگت گہری سائیل تھی۔ قہقہہ پیچنے ہی اس نے گھوڑا گاڑی کی رفتار بچھ اور کم کر دی اور جھٹنے پر کمرے کمرے شک آلود سی نظموں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"کھلیں جا رہے ہو چاہا؟" میں نے ہی کرا کر کے جتنی الامکان سرسری لہجے میں کہا۔

"رجیم آپد کیوں؟" کوچہ ان نے ٹھوڑے کی لکڑی سمجھ لی تھیں۔

"ہاں رخصتے سنیشن ہے؟" میں نے پوچھا اور فوراً ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ یہ سوال مجھے اس علاقے میں قلعی طور پر انہی چہیت کر رہا تھا۔ مرحوم اب تو الفاظ منہ سے نکل چکے تھے۔

"ہاں ہے تو سہی۔" گاڑی والے نے الجھن زدہ سے لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میں سنیشن نہیں، غلہ منڈی جا رہا ہوں۔ دونوں کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔"

"بڑا تم مجھے سنیشن پھوڑا دو تو تمہاری بہت سہولت ہوگی چاہا!" میں نے متعجبانہ سے لہجے میں کہا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا "پھر سر کے اشارے سے گاڑی پر چڑھنے کی ہدایت دے دی۔ میں گاڑی پر چڑھ کر پوروں کے قریب سکر سٹ کر بیٹھ گئی۔ گاڑی ایک بار پھر چل چلی رات کے سٹائے میں صرف گھوڑوں کے تاپوں کی آواز گونج رہی تھی۔

"گھر سے بھاگ کر آئی ہو؟" چند لمحے بعد گاڑی والے نے مڑ کر میری طرف دیکھے بغیر احتیاطی سنجیدگی سے پوچھا۔ اس نے کچھ یوں اچانک یہ سوال کیا تھا کہ میں اچھل پڑی۔

"نہیں تو۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ "میں۔۔۔ میں دراصل ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں اور بھگ کر اس علاقے میں آ گئی ہوں۔ میری کٹائی بہت لمبی ہے۔"

"بڑا تم مصیبت زدہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔ مجھ سے جو ہو سکا میں تمہاری مدد کروں گا۔ میری نعلنی بھی منہ کی بہت اچھی ہے۔" وہ بظاہر مٹکی سا آدمی تھا لیکن اس کی آواز خاص پارسہ تھی۔

"نہیں، نہیں۔" اظہارِ روی طور پر میں تقریباً چلا اٹھی اور جب گاڑی والے نے مڑ کر بپ سی نظموں سے میری طرف دیکھا تو میں نے قدرے خفت سے نظریں جھکا دیں۔

نما۔ "میں کسی کے گھر نہیں جا سکتی۔ میں اب بس اپنے گھر چلتا چاہتی ہوں۔"

"تمہاری مرضی۔" اس نے لاپرواہی سے کہا اور ٹھوڑے کو شوکا دے کر اس کی رفتار کچھ تیز کر دی۔ دھندل چاندنی میں ویران رستے پر "مراجاری تھا۔ اسی دوران سڑک سے کافی بہت کر ٹھنڈوں میں گھرے ہوئے وہ ایک آدمی بھی نظر آئے۔ گاڑی والا اب گویا میرے وجود سے بالکل بے خبر لگا جس کی وجہ سے پھوڑے ایک پوری سے ٹھک لگائے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے یہ آواز بند پورلی میں رخصتی کا ایک گیت گانا شروع کر دیا۔ ایک آدمی بول گا کر ہی غانا اپنی آواز کے بے سرے پہنا ڈ شاید گیت کی نامزدیت کو محسوس کرتے ہوئے وہ چپ ہو گیا۔

مگر تقریباً ایک گھنٹہ چندی رہا ہو گا اور ساتھ آٹھ میل کا فاصلہ طے ہوا ہوگا جب ہم ایک تباہی میں داخل ہوئے۔ یہ ایک اچھا خاصا شہر تھا۔ مکانات بلند اور سڑکیں چوڑی تھیں۔ یہاں بھی چاروں طرف سناٹا تھا۔ رات خاصی بیت چکی تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے گاڑی والے سے پوچھا۔ "غلہ منڈی تو اس وقت بند ہو چکی ہوگی" ترکس کے پاس لے جاؤ گے غلہ؟"

"میرا دراصل کام یہی ہے۔ میں تو بیٹ صبح سے ایک گاڑی سے غلہ لے رہا ہوں۔ یہ میرا آخری پھیلا ہے۔ میں یہیں رجیم آباد کا رہنے والا ہوں۔" اس نے بھی میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

ہوں اور یہ نہیں بھی ملے گی بھی یا نہیں؟ پھر مجھے یہ احساس ہوا کہ زمین کے کسی اندھیرے گوشے میں یہ طواغیت چھڑیں ہے کہ میں اس طاعنے سے بہت دور نہیں نکل جاؤں۔ کسی ایسی جگہ جہاں کوئی یہ نہ جان سکے کہ میں ثواب شرافت کے بندی خانے میں قید تھی یا عسکری شوکت اور اس کا لازم میرے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں۔

بیٹھے بیٹھے جب میری قوت برداشت جواب دے گئی اور میں اترنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ سٹی کی آواز نے مجھے چوکا دو۔ میں تعجب کے عالم میں دیکھا سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سٹی کے جواب میں انجن نے دسل دی۔ سٹی ایک بار بھر گئی اور تھوڑے سے وقفے سے انجن کی دسل بھی گونجی اور پھر ٹرین نے رینگنا شروع کر دیا۔

ٹرین نے رفتار بکلائی تو مجھے قدرے اطمینان سا محسوس ہونے لگا۔ مجھے اس سے فرض نہیں تھی کہ یہ اطمینان دیکھا ثابت ہو گا یا نہیں۔ لب کھڑکیوں سے تیز ہوا آنے لگی تھی۔ میں نے ان کے مٹتے گرائے اور لشت پر شہ دروازہ ہو گئی۔ میں کچھ سوچنا چاہتی تھی لیکن ایسا معلوم ہوا تھا کہ مجھ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ کھوپڑی میں داغ کی جگہ محض ایک قلاع رہ گیا ہے، حواس قتل ہو چکے ہیں۔

میں اس وقت جبکہ میرے حواس پر جی ہوئی ہدف دھیرے دھیرے ہتھ کھینچنے لگی تھی، میرے سامنے ہاتھ دوم کا دروازہ آہستگی سے کھلا اور دوسرے ہی لمحے میری پیچ لکل گئی۔ جب میں نے ایک لڑکا ان کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔

”دش!“ اس نے ہوتلوں پر انگلی دکھ کر مضطرب لہجے میں کہا۔ ”بیچ و پکار جانے کی ضرورت نہیں درندہ دونوں ہی مارے جائیں گے۔ میں نہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“ اس کے الفاظ پر غور کرتے ہوئے میں سنبھل کر لشت پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی وہ کسکی جسم اور لہجے قد کا ایک دلچسپ لڑکا تھا۔ بے ترتیبی سے اکبرے ہوئے لہجے گفتگو کرتے ہاں، باریک ترشی ہوئی موچیں ہماری یاد دہانی، آنکھیں جن کی گہرائی میں اس وقت بھی شہر کی مگر اہٹ چل رہی تھی۔ اس کی رنگت سرخی مائل تھی، دھماکوں پر ہنسے ہوئے شہ کی پلاہٹ وہ سفید کرتے پاجامے، واسٹ لڑیا کوٹ پہنے ہوئے تھا جس کے جن اس وقت کھلے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں کیشن تھے۔

اس کے لباس پر کئی جگہ مٹی کے دھبے تھے۔ دفعتاً اس نے ہاتھوں میں ہاتھ بھیرا اور میں نے دیکھا، اس کے ہاتھ کی پشت پر کراٹھیں تھیں۔ ہر حال اس ایک آدمہ ملوک سی شبلی سے قطع نظر وہ کسی بھی اعتبار سے کوئی چور اچکا یا ڈاکو نظر نہیں آتا تھا۔ میری کچھ بہت بندھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت مجھے اپنے آپ کو ہر حال ظاہر کرنے کی ضرورت ہے۔

”دونوں ہی مارے جائیں گے سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں نے قدرے سخت لہجے

کچھ دیر بعد اس نے ایک پالی سی جگہ دار خدمات کے سامنے گاڑی روک دی اور ٹانگ کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے ہولا۔ ”سو شیشن آگیا۔“

ایک بار پھر مجھ پر تعجبناک سی طاری ہو گئی اور اس مگر اہٹ میں اس کا شکریہ ادا کرتا بھی بھول ہو گئی۔ گاڑی سے اتر کر میں جگہ کے نیچے سے گزر کر گیٹ کی طرف بڑھی۔ تین چار میزوں پر چڑھنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ گاڑی والا گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے مزے دیکھ کر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی اور اسے گھما کر سبے گاڑی سے واپس چل دیا۔

گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ گیٹ سے ذرا پہلے بائیں ہاتھ پر کھنکوں کی کڑی تھی۔ اس کے عقب میں ایک کھٹ کلرک کرسی پر نیم دراز سٹول پر پاؤں رکھے کوئی کتب پڑھ رہا تھا۔ آگے بڑھ کر میں نے پینٹ لارم پر نظر دوڑائی۔ دائیں طرف تین کابست پڑا شیڈ تھا جس کے نیچے پنوں پر چند افراد سکرے سینے پڑے سو رہے تھے یا نیم غنودگی میں تھے۔ دائیں طرف پینٹ لارم کا طویل حصہ دیران پڑا تھا۔ کافی دور ایک ٹھیکڑا نظر آ رہا تھا جس پر چلیو کس بسپ روشن تھا۔

سامنے ایک ٹرین کڑی تھی جس کا پشتر حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ چند ایک کڑکیوں میں دھندل دھندل سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ان ذہنوں میں مسائل کڑی کے گھنٹوں دلی سینوں یا فرش پر بستر بچائے سو رہے تھے۔ ایک کڑکی میں ایک عورت اپنے بچے کو کڑکی سے لٹکائے پیٹھپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ گاڑی کی پری طرف دور دور تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ماحول پر اس قدر سکوت جاری تھا کہ بے اختیار جی چاہنے لگا کہ کھلی چیز حرکت کرے، کوئی آواز پیدا ہو۔ ٹرین بھی یوں سامت اور خاموش کڑی تھی گویا اس نے برسوں سے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی ہو۔

کئی دلیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے میں بھولنے سے اپنے کے ایک دروازے پر پہنچی جو کھلا تھا اور اندر وہ لمبی سیدھے دار نہایت ہی آرام دہ فشتیں نظر آ رہی تھیں۔ ہا سوپے کچے میں نے اس فشر سے اپنے میں تھیں گرد دروازہ بند کر لیا اور اندر سے کھڑکی بھی لگا لی۔ کافی دیر تک تو میں پل لشت پر اکڑی انڑی سی بیٹھی رہی کہ ابھی کوئی درمہائی دروازے سے آئے گا اور مجھے کھائی سے بچ کر آ کر دیا جائے گا یا مجھ سے اگلے سیدھے سے شمار سادات کرے گا۔ جب میں کوئی تلی بخش جواب نہ دے پاؤں گی تو مجھے پولیس والوں کے حوالے کر دے گا جو مجھے نبھائے گمان سے جائیں گے۔ شہ دیکھ ہی کسی قید خانے میں جہاں سے میں فرار ہوئی تھی لیکن دیر تک نہ تو درمہائی دروازے سے کوئی آیا اور نہ قلعہ چوڑی دروازے پر کسی نے دستک دی۔

میرے جسم کا جگا، جگا، جگا ہو گیا لیکن ابھیں چڑھنے لگی کہ آخر میں یہاں توں بیٹھی

دبا میرے لیے ایک ٹکارگاہ کی طرح تھی جس میں قدم قدم پر پھدے لگے ہوئے تھے۔ مجھے کسی کے مضبوط لیکن گھس گھسے کی ضرورت تھی۔ کوئی ایسا شخص جو آگے ہل کر شوکت طاہر نہ ہو، تاہم اس اجنبی کے سامنے حقیقت کو تسلیم کرنے سے پہلے میں نے اسے کریدنا بھر سمجھا۔ یہ بھی نصیحت تھا کہ اس وقت میری عقل اور ہوش و حواس میرا رفیق رہے رہے تھے۔

"تم کس سے جان بچا کر بھاگ رہے ہو؟" طاہر نے پوچھا۔
"تم نے مجھ پر اچھو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔" وہ مسکرایا اور میری طرف رخ کر کے ہنسا۔

"یہ میں نے کب کہا؟ میں نے تو تم سے ایک سوال کیا ہے۔" میں نے کہا۔
"پولیس سے؟" اس نے لہجہ سلوکی سے کہا۔ "یہ تو تھا تمہارے سوال کا جواب اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے پولیس سے اتنا خوف نہیں۔ میرا اصل دشمن کوئی اور ہے جو پولیس سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ رحم، خفاک اور مکروہ انسان ہے۔"
"وہ کون ہے؟" میں اپنے لیے کی دلچسپی نہ چھپا سکی۔

اس نے ایک بار پھر میرا سر تپا جوتہ لیا "پھر خودکشی کے سے انداز میں بیویا۔" میرا خیال ہے جنہیں قتلے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" پھر قدم سے بلند توازن میں بولا۔ "طوابع شرافت علی۔"

مجھے یقین تھا کہ وہ چھپکا سا لگا۔ شاید میرے چہرے پر ایسا لکیر گیا تھا کہ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر وہ سنہل کر چنہ گیا اور بھابھات سے مجھے میں بولا۔ "کیا تم اسے جانتے ہو؟" لیکن اس لیے کے عتب میں ہزاروں ٹھوک کے سائے رنگ رہے تھے۔
"ہاں؟" میرے من سے سرسراہٹ ہوئی توازن ٹل۔ "میری بہادیوں کا ذمہ دار بھی وہی شخص ہے۔" اب میرے لیے مزہ مصنوع کوئی سے کام لینا ممکن نہیں رہا تھا۔ القاد فیہ خود میرے ہوشوں سے گھسٹنے چلے گئے۔ "اس نے میرے باپ کو قتل کرایا" مجھے بے آہود کیا "خبر سے بے گھر کیا" میرے اطمینان روکنے کی وجہ سے وہ سال تک مجھے اپنے ذاتی بندی خانے میں ڈالے رکھا۔ گزشتہ رات ہی میں وہاں سے فرار ہوئی ہوں۔"

وہ ہلکی ہچکائے بغیر میری طرف دیکھا رہا۔ اس کا چہرہ یقیناً سہاٹ نظر آنے لگا تھا لیکن آنکھوں میں شے سے جل بھ رہے تھے جیسے کہیں دور اللہ کھڑوں میں آگ لگی ہو۔

"ہماری کہانی ایک ہی ہے۔" طاہر اس کے ہوشوں نے حرکت کی۔ آواز سرگوشی سے نکل رہی تھی۔ "شاید میں بھی ایک ہو۔"

"کیا ہے تمہاری کہانی؟" میں نے ادنیٰ آواز میں پوچھا اور فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ

میں کہتا۔ "مجھے کیوں اپنے ساتھ شامل کر لیا تم نے؟"

"اس لیے کہ تم بھی میری ہی طرح جان بچا کر بھاگتی نظر آ رہی ہو۔" اس نے سر ہلایا میرا چہرہ لپٹا اور آگے بڑھ کر نشست کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ میں اپنی جگہ کچھ اور سکرسمٹ مٹی ملا کر اس کے اور میرے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ لیکن تم کل سے اچھائی ہوئی نظر آ رہی ہو، بدحواسی تمہارے دونوں دونوں سے نہیں رہی ہے۔ اس طرح تم جلد ہی پکڑی جاؤ گی اور اگر میرا ساتھ دے گی تو خود بھی پکڑی جاؤ گی اور مجھے بھی قاتلہ پہلے لگا۔"

فوری طور پر میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ وہ بڑے اطمینان سے نشست سے ٹھنک کر اپنی ٹانگ کی سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے دلچسپی سے اٹھنا جانتا لیا۔ میرا نگاہیں جلد لڑنا برا نہیں تھا اس میں وہ بڑے غافل تھے۔ ایک تو اس وقت میرے پاؤں میں صرف ایک ہی ٹپل تھی اور پاؤں بڑی طرح گرو گرو تھے۔ دوسرے میرے سر پر وہ پتہ نہیں تھا۔ ملا کر ہاتھ کی متانت سے میں ایک گھریلے لڑکی نظر آ رہی تھی۔

"تم فراتھو اپنے ساتھ مجھے لپیٹے جا رہے ہو۔" میں نے معنوی غلطی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ "میں ہلا کیوں پکڑی جاؤں گی؟ کون پکڑے گا مجھے؟ میں تو ایک کار کے سلیٹ میں جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟" اس نے فوراً میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا اور میں گزیرا گئی۔ یہ تو واقعی مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہی تھی یا جانا چاہتی تھی۔

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے ایک فطری سانس لی اور دوبار ٹانگ کی سیدھ میں دیکھنے ہوئے بڑھا۔ "ضروری نہیں کہ خوبصورت لوگ جھوٹ بھی خوبصورت ہوں۔" سچے مجھے اس سے کیا۔ میں جنہیں جگ بولے پر مجبور نہیں کر سکتی گا۔ بس جنہیں اتنی تکلیف ضرور دلاں گا کہ چند گھنٹوں کے لیے مجھے اپنا ہم سفر سمجھ کر بے اشت کر لو۔ مجھ سے جنہیں کئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ جہاں تمہارا ہی چاہے، اتر چنا اور جہاں میں مناسب سمجھوں گا اتر چلاؤں گا۔" یک لخت اس کے لیے میں اتنی سنجیدگی محسوس کرتی کہ مجھے حیرت ہی ہونے لگی۔

میں نے تھک کوٹنے میں ہم دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ انجن کی چٹک چٹک اور ہڑکی پر پہلوں کی گڑگڑاہٹ کے علاوہ مجھے اپنے اور گرد گھرا سکوت محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دو جہاں یقیناً یوں لا تعلق ہو کر اپنے خیالوں میں کھو گیا تھا جیسے میری موجودگی سے بالکل بے خبر ہو۔ اس کے اس انداز سے مجھے یقین سا ہونے لگا کہ وہ مجھے نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور اس کا ساتھ میرے لیے سود مند ہی ہو سکتا تھا۔ صورتحال پر غور کرتے ہوئے مجھے یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ اپنے طور پر شاید مجھ میں چند قدم چلنے کی بھی صلاحیت نہیں تھی۔

میری توانا بھرانے لگی تھی۔

مکمل تو بسہ طویل ہے۔ ”وہ گویا کسی خواب سے جاگتے ہوئے ہوں“ غفلت کا نام لے کر۔
نواب شرافت کی زمینوں سے حق داری بھی توڑی سی زمین تھی جسے میرے والد نے
سنبھالا ہوا تھا۔ میں نکلنے کا رخ میں پڑھتا تھا۔ آخری سال میں میں نے سیاست میں حصہ لیا
شروع کیا اور ہم چند لڑکے اپنی ایک تنظیم بنا کر ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کرنے
واہوں کا ساتھ دیتے تھے۔ تعلیم ختم کر کے میں گھوڑوں کی توہاں بھی ہم نے کام جاری رکھا۔
نواب شرافت سے ابھی ہم نے نور اس کا تعلق طلب کیا۔ اس نے ہمیں بڑی صفائی سے
بل دیا لیکن اس کے بعد سے ہمارے اور اس کے مزارعوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے
جھگڑے پڑنے لگے۔ پھر دونوں طرف کے چند قوی بھی مارے گئے۔ مقدمے جاری کیے
دوران مجھے معلوم ہوا کہ نواب اگر بڑوں کا کتنا بڑا پھر تھا۔ پھر میں نے اپنے لوہاؤں کی
تعلیم کو اس بیچ بے والا کہ حریک آزادی سے پہلے دراصل انگریزوں کے پھوڑوں کی سرکوب
ضوری ہے۔ ہماری تنظیم صحیح معنوں میں کوئی سیاسی تنظیم نہیں تھی۔ بس چند جوہر
نوجوانوں کا ایک گروہ تھا۔ چلائی سازشیں اور لٹریے دلف سے چالیں چلتا ہمیں نہیں آتا
تھا۔ نواب شرافت کی حالات کا بھی ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ اپنی دانست میں جوے مسلحی فوج
اور ہم پندلہ انداز میں ہم نے نواب سے تصادم بھی مول لے لیا۔ کچھ عرصے بعد میرے
دوست نکھر گئے۔ کچھ نے نوکریاں کر لیں، کچھ کی شادیاں ہو گئیں، کچھ اور طرح سے غلام
زندگی میں پھنس چکا ہے اور رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے بے خبر ہو گئے۔ نواب کی
آنکھوں میں نکلنے کے لیے صرف میں رہ گیا۔ ایک مرتبہ میں کسی کام سے دلی گیا ہوا تھا
واپس آتا تو میری دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ مزارعوں کے درمیان بھڑا ایک مرتبہ پھر ہوا تھا
اور اس مرتبہ نواب کے آدمیوں نے میرے والد کا سینہ چھلنی کر دیا تھا حالانکہ وہ چلنے
تازہ پر موجود نہیں تھے۔ انہیں وہاں سے کافی فاصلہ پر ایک دوسرے کھیت میں جا کر ہاگ
گیا تھا۔ مقدمہ چل رہا اور اس مقدمے میں ہماری غفرتی زمین کا نصف سے زیادہ حصہ
ہب گیا اور نتیجہ کیا رہا؟ میں خواب کو عدالت میں بلواتا تھا۔ عدالت کے فیصلے کے
مطابق یہ مزارعوں کا باہمی تنازع تھا جس کی لپیٹ میں میرے والد آگئے تھے۔ نواب کے
مزارعوں میں سے کچھ ”ساتھ سال کے ایک آدمی نے قتل کا اعتراف کر لیا۔ اسے عمر قید
کی سزا ہو گئی اور دوسرے مزارعوں کو چند سزاں دیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اصل مجرم نواب
تھا لیکن میں یہ ثابت نہیں کر سکا تھا۔ وہ تو اپنی جگہ بیٹھا صرف میرے ہاتھ آتا تھا۔ میں
میں بے آسرا رہ گیا تھا۔ باپ کے بعد دنیا میں مجھے میرا کوئی نہ رہا تھا۔ وہ تو پہلے ہی مر گیا
تھی، چند ایک عزیز واقارب تھے۔ انہوں نے جب سنا کہ نواب سے میری دلچسپی چل رہی
ہے تو انہوں نے ویسے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ میں زمین کے معاملات میں اتاری تھا۔

کی بھی زمین میں نے مزارعوں ہی کے سپرد کر دی اور ان سے لئے والے حصے پر مگر
دقت کرنے لگا لیکن رہا تپائی مکان ہی میں۔ دن رات میں پڑا نواب سے اقامت لینے کے
نفاذی طریقے سوچتا رہتا لیکن حقیقت یہ تھی کہ دلی میں اس شخص سے مجھے خوف
آئے تھا۔ ابھی میں کسی واضح فیصلے پر نہیں پہنچا تھا کہ نواب کے گل میں ایک اہم
واقعہ رونما ہوا۔ غشت کی میز پر اس کے ایک بیٹے نے اس پر گولی چلا دی۔ پہل گولی پیچھے
گزرتے ہوئے ایک مصاحب کو گئی، دوسری نواب صاحب۔ ہتھکڑی پہنچتے مصاحب تو مر
گیا، نواب بچ گیا۔ سٹے میں آیا ہے کہ لڑکے نے ہتھیار کے کسی جھڑے پر باپ پر گولی
چلائی تھی۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اصل وجہ یہ تھی کہ نواب نے بیٹے کی بیوی پر ہاتھ
رہا تھا یعنی ہو کہ بھی نہیں بٹھاتا تھا۔

جھڑے کی وجہ سے مر رہا جو کچھ بھی رہی ہے۔ ہوا یہ کہ پولیس دو دن تک صرف ہتھکڑی
کے پکر لائی رہی، اسے گل کی طرف سے اور انصران والا کی طرف سے رپورٹ درج
رانے کی اجازت دی نہیں ل سکی۔ ہوش میں آتے ہی نواب نے خاندان کے چند افراد کا
جنس طلب کیا۔ باپ بیٹے اور بیگمات کے درمیان صلح صفائی ہو گئی۔ واقعے کے چند چشم
بند گواہوں کو بنا کر پڑاوت دی گئیں کہ انہیں درحقیقت کیا طاقت دیتے ہیں اور سارا ملہ
مجھ پر ڈال دینے کا نہایت چا ہندوست کر لیا گیا۔

نواب نے ایک لہا چوڑا جان گھبراہٹ کرایا جس میں گوشت واقعات اور دلائل سے ثابت
کيا گیا کہ میں کتنے عرصے سے اس کے خون کا پیاسا چلا آ رہا تھا اور قتل کے روز میں
اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گل میں گھس آیا تھا۔ کاٹنا حملہ میں نے ہی کیا تھا وہی
دلیو۔ نواب شرافت کا خاص گل ہمارے گھر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہے۔ گل
سے میرے ایک پرانے دوست نے بروقت مجھے اطلاع دے دی کہ کیا ڈرامہ تو رہا ہے اور
کن کاروں کے ساتھ پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لیے آنے والی ہے۔ مجھے یقین نہ آیا
کہ اس دھڑلے پر اتنا اندھیر بھی بھا ہو سکتا ہے، ان لمے میں گھر پر ہی موجود رہا البتہ دل کو
ایک کھلا سا گگ کیا تھا۔ کچھ نقدی وغیرہ سمیٹ کر گوگ کے عالم میں بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ
یہ کرا جائیے، کڑک کے راستے میں نے دیکھا ایک گاڑی گھر کے سامنے آکر رکی ہے۔
گاڑی سے ظاہر کئی شراب اترتے نظر آئے لیکن میں سمجھ گیا کہ سہ لہاس میں یہ پولیس
والے ہیں۔ وہ اس وقت مکان کو گھیرے میں سے رہے تھے، جب میں پھٹوں پر سے پھاگتا
ہوا وہاں سے بھاگ لگا۔

ان حالات کو شاید ہی کوئی مجھ سے بہتر جانتا ہو، میں نے سیدھا ریلوے سٹیشن کا رخ
لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت ایک انجمن زمین ادھر سے گزرتی ہے۔ خوش قسمتی سے میں
نہیں اس وقت سٹیشن پر پہنچا جب یہ وہاں سے گئی تھی لیکن پھر رحیم آباد گریہ ایسی

رہی کہ چلے گا ہم ی نہیں لے رہی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ اگر پولیس کا ذہن اس طرف چلا گیا کہ میں نے یہ نہیں بکڑی ہوگی تو اتنی دیر میں تو وہ رحیم آباد بھی آجاتے ہیں۔ بحرہل میں کڑکی سے جھانک کر دیکھتا رہا۔ پھر میں نے تمہیں اس ڈبہ کی طرف آ کر دیکھا تو اچھ کر دھچک دم میں محسوس کیا۔ یہ ہے کل ملال۔"

یہ بیل رہا تھا مجھے کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ خاموشی بہ اتنا ترسناک
 مگر گھبراہٹ سنائی دینے لگی۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بالوں میں انگلیاں پھیر
 کر بے مقصد سے انداز میں مسکرایا۔ میں ایک لمحہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
 ”بہ کبھی جاؤ گے؟“ میں نے پوچھا۔

”نی اٹھائی تو میں یہاں سے بہت دور نکل جانا چاہتا ہوں“ غلبا، بسنئی کی طرف، جہاں میں
نے آپ کو گم کر لوں۔“ وہ آہستگی سے ہولا لیکن ایک روز میں واپس آؤں گا۔ پہلے میں
اب سے دُور تھا لیکن اب یک لخت ہی میرے دل سے اس کا دور نکل گیا ہے مگر ساتھ ہی
میں بھی سمجھ میں آگیا ہے کہ اس سے انتقام لینے کے جو افسانوی طریقے میں سہیتہ تھا، یہ
میں دیکھ گئے۔“

اس کی سترہاٹ مٹی ہو گئی اور وہ میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر کسی غیر مٹی چیز کو دھرتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں نواب شرافت علی کی موت کا دن لے کر واپس آؤں گا۔"

ایک لمحے کے لیے گویا موت کا سا سکوت چھ گیا۔ اس کے اہل گھر میں کوئی ایسا ہلت
نہی جس نے میرے خوں کی گردش حیرت زدہ کی۔ ایک لمحے کے وقفے کے بعد اس نے میری
طرف دیکھ کر۔ "اور تم کہاں جاؤ گی؟"

”میں بھی بہت دور نکل جانا چاہتی ہوں۔“ میں نے پہلو ہینا کر کہا۔
”میں نے کہا تھا میں... یہ کہ شاید امارتی حوصلہ بھی ایک ہو۔“ وہ مسکرایا۔ ”میرا ساتھ

مجھے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ قلبی اضطرابی طور پر میں نے اثبات میں لکھا دیا۔ "ملاؤ ہاتھ۔" مسکرا کر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ مجھے ہنسنے سے روک دیا۔ میں نے کہا ہاتھ جوھا دیا اور ایک برت بعد میرے ہاتھ نے زندگی کا لمس محسوس کیا۔ اس کا مضبوط ہاتھ اس ہاتھ اٹلی گرفت میں ایک وعدہ لیے ہوئے تھا۔

”اگر اسٹیشن تکمیل حالت گزر جائے۔“ اس نے اہٹکی سے میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے

جہاد کو پسند یا ناپسند کرنے سے کیا ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے گھل میں تو نام و شخصیت کے درمیان بوجے لٹکے ہوتے ہیں۔ اب اسی نواب شرافت علی کو لے لو۔ نام و شرافت میں شرف شرافت شاید سات پشتوں میں بھی اس کے آہل اہل کو چھو کر نہیں ٹوڑے۔"

"اس خبیث کا نام نہ دے میرے سامنے۔" اس کے چہرے پر یقین سرخی کی جھلک آئی لیکن دوسرے ہی لمحے گویا وہ خود پر قابو پاتے ہوئے ہر سکون لیے میں ہلا "میرا نام پوچھتے ہیں؟ ات کدوں سے کہاں بھی گئی مجھے اہلب میں کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ آنکھیں بند کر کے برقع پر لیٹ گیا۔ توڑی دیر بعد اس کے فرائض کی آواز آئی تھی۔ میں بھی لیٹ گئی اور سینے کی کوشش کرنے لگی لیکن کالی دیر تک دل کو کھٹکا سا لگا رہا۔ بار بار میں ہنسی دارا ہی تھوڑ کر دیکھتی رہی کہ اہلب برقع سے اتر تو نہیں رہا لیکن میرا یہ غرض علی غرض ہی رہا۔

بھئی پہنچ کر دو دن ہم ایک ہوٹل میں رہے تیسرے دن اہلب کرائے کا ایک مکان میں ٹرنے میں کامیاب ہو گیا۔ فطرت سے اس مکان کے ارد گرد آبادی تو تھی پھر بھی اپنی غارتگی وجہ سے یہ بالکل الگ تھلک سا لگا تھا اور اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ارد گرد خانہ بھی تھا۔ اگلے روز اہلب ضرورت کا مختصر سا مسلمان ایک گاڑی میں لا کر لے گیا۔ اس کے پاس پیسے تھری سے ختم ہو رہے تھے مگر وہ کچھ خاص فکر مند نہیں تھا۔

مکان میں رہتے ہوئے ہمیں پوچھا دن تھا اہلب نے مجھ سے کہا۔ "آخر میں لیکن ہوں۔" میں نے اس کا تمہید جملے پر حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تو میں نے کب تم سے انسان ہونے پر شک کیا ہے؟"

"وقت تو نہیں کیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک انسان کا اس حد تک خون لینا بھی کہاں کا اہلب ہے۔ کتنے دن گزر گئے ہیں کہ تم چوہے میں گھٹنے میری رسی میں لٹکے ہوئے ہو، مگر میں تمہاری طرف زیادہ دیر دیکھنے سے بھی اپنے آپ کو باز رکھتا ہوں۔ اندر ہی اندر اپنے آپ سے لڑتا رہتا ہوں اور میں نے اپنے آپ کو توڑ پھوڑ لیا ہے مگر میں زیادہ دیر نہیں کر رہا تھا۔" آخری الفاظ اس نے قہقہہ کن لہجے میں کہے۔

"تو پھر کیا کرنا چاہیے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہمیں نکاح کر لینا چاہیے اور کچھ ہمیں کی زندگی بسر کرنی چاہیے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا کہ یہ جو ہم چندوں کی طرح ایک دوسرے سے ہڈے ہڈے جڑے ہیں یہ غلط فہم ہو جائے اور ہم ایک طرف سے نیکو ہو کر دلی معاملات کے بارے میں اپنی

سے۔ اس کے بعد لاہور تک لی تین کر سکیں گے۔ کہ تہا اس زمین کا ریل سے۔ وہاں سے ہم کوئی سیل ٹرین پکڑ لیں گے۔"

"اگر اسٹیشن تو بخیر و آہستہ ہی گزر گیا لیکن وہ ابھی لی تین کر سولے کے لیے لوہا کی برقعہ پر چڑھا ہی تھا کہ کوپے کے دروازے پر دھک ہوئی۔ اس نے اتر کر دروازہ کھولا۔ سامنے کٹ چکر کھڑا تھا۔ "معاذ کہتے ہیں نے آپ کی خیمہ میں ظل والا۔" چکر نے دندیلہ نظروں سے کوپے میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میری ڈیوٹی ختم ہو رہی ہے اور اگلے اسٹیشن پر اترنے سے پہلے مجھے آخری مرتبہ کٹ چکر کر کے ہیں۔"

"جوانا میں بھی آپ سے سختی ہی چاہوں گا کٹ چکر صاحب۔" اس نے مسکراتے ہوئے نہایت اطمینان سے کہا۔ "میں لوہہ پتھر اتنی ہڑونگ اور ہنگام دوڑ میں ٹرین میں سوار ہوئے ہیں کہ کٹ چکر کیا لینا تھا؟ پاؤں کی جوتیوں اور تن کے کپڑے سنبھالنے کی بھی حوصلہ نہیں مل سکتی۔" اس نے کوٹ کی اندر مٹی جیب سے دو نوٹ نکالے۔ "کٹ بنا دیجئے۔" میں نے پہلے ایک نوٹ چکر کو چھایا۔ "یہ تو کٹ کے پیسے۔" پھر دوسرا نوٹ چھاتے ہوئے بولا۔ "لوہہ یہ آپ کے لیے۔"

"کٹ بیکر گارڈ تو ٹرین کے ساتھ نہیں ہے؟" چکر نے نوٹ دیکھتے ہوئے نہایت شہر میں کہا۔ "بہرحال میں اگلے اسٹیشن پر اتروں گا تو کٹ آپ کو پہچان جائوں گا۔ کوئی فکر نہ کیجئے آرام لے لیا ہے۔"

میں نے آسودگی کی گہری سانس لی۔ اگر قدرت نے اس اجنبی کو نہ پہچانا ہوتا تو جو اس وقت میرے لیے سب سے بڑا آئینہ تھا تو شاید میں اس مرحلے پر کسی بڑی مصیبت میں پھنس چکی ہوتی۔ میری جیب میں تو پھولی کوڑی بھی نہیں تھی اور پھر ہولن اور خفا ہونا میرا سب سے بڑا عیب تھا جس کی شاید قدم قدم پر مجھے سزا ملتی۔

کٹ چکر کے جانے کے بعد وہ دروازہ بند کر کے مڑا تو میں نے مسترا کر پوچھا۔ "یہی اپنے زبردستی کے شوہر کا نام پوچھ سکتی ہے؟"

"کیا اذہل کرم اس بھارے کو زبردستی کے شوہر کے بجائے مستحق کا شوہر نہیں جانتا؟" اس نے سیدھی سے کہا۔

"فی الحال تو نہیں۔" میں نے بظاہر سیدھی سے کہا۔ "ابتہ خود کیا جاسکتا ہے۔" میں اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ تنکرات اور خطرات سے بے نیاز۔ جیسے ہکا بھکا ہو گیا تھا۔

"میرا نام کچھ اکھڑ سا ہے۔" ادا میں کو عموماً پسند نہیں آتا۔" اس نے زیادہ برقعہ پہنچتے ہوئے کہا۔

"بڑی طرحی کی بات ہے برخوردار! پلاخر انہوں نے سنبھال کر کہا۔ "لیکن ہارائی کہاں ہیں؟ گواہ کون ہوں گے اور قہارے والدین کہاں ہیں؟"

"سب لوگ تو میرے نہیں ہیں مولوی صاحب! ادیب کے چہرے پر ہنسنا متکراہت سمجھی جاتی تھی اور اس کا لہجہ بھی انتہائی بوجھ لے ہوئے تھا۔ "لیکن اگر لڑکا اور لڑکی پلٹ ہوں اور شادی کے لیے آئیں ہوں تو کیا نکاح نہیں ہو سکتا؟"

"ہو تو سکتا ہے برخوردار! مولوی صاحب نے قدرے الجھن زدہ سے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں احتیاطاً اس قسم کے نکاح نہیں چھانتا کیا معلوم کیا پھر ہو۔ لڑکی درغل کر یا بھاگ کر لائی گئی ہو، پیچھے مقدمہ کا بہت درج ہو۔"

"مولوی صاحب! قصہ مختصر یہ ہے۔" ادیب نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ہم دونوں زمیندار گھرانوں کی اولاد ہیں اور ایک تیسرے زمیندار سے دلچسپی میں ہمارے گھرانے بچے ہیں۔ والدین مر چکے ہیں۔ ہم بھٹکل جانے پھا کر بھاگے ہیں ورنہ ہم بھی طرہ تھوڑی کی برکت بازی میں جان سے ہاتھ دعو بیٹھتے۔ ہم کئی دن سے ساتھ ہیں۔ ہم چاہتے تو ایک دوسرے کی رضا و رغبت سے گواہ کی زندگی بھی گزار سکتے تھے لیکن ہمارے طبعیت نے یہ گوارا نہیں کیا اور ہم آپ کے پاس آئے۔ ہم اس اجنبی شہر میں امن و آسوشی کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ اگر عالم ہوتے ہوئے بھی طوف کا شکار ہیں اور غارے لیے نئی زندگی کے دروازے کھولنے پر تیار نہیں ہیں تو ہم کوئی اور راستہ ڈھونڈیں گے۔"

"مولوی صاحب نے چہرے پر غور کیا۔ باری باری ہم دونوں کا سر ہلکا جارتا لیا۔ میں نے غریب جھکا لیں البتہ ادیب پر اسید نظروں سے مولوی صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ "میں مغفرت خواہ ہوں۔" پلاخر مولوی صاحب نے آہستگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ادیب نے پرسودہ سے لہجے میں کہا۔ "ہم چہر ایک جگہ اور کوشش کر لیتے ہیں ورنہ پھر جوش آف ہمیں سے اجازت نامہ لے کر کہائیں گے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مولوی صاحب تعذیب کے عالم میں چہرے پر کھڑے تھے۔ ہم ابھی مسجد کے بندے دروازے تک پہنچے تھے کہ انہوں نے عقب سے گواڑ دی۔ "مسلمہ صاحبزادے!"

ہم واپس پلٹے تو انہوں نے قبضہ کن لہجے میں کہا۔ "میرے خیال میں ایک مسلمان غارے کو شادی کے لیے انگریز حاکم سے اجازت نامہ لینے کی ضرورت نہیں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "لڑکی کیا تم حلیہ اور تحریری بیان دے سکتی ہو کہ تم اپنے والدین یا دیگر سرستوں کی مرضی کے خلاف اس لوجوان کے ساتھ فرار ہو کر نہیں آئی ہو؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم سوچ لو۔ ایک تو زندگی کے کسی سوڑ پر مجھ بھگتا نہ دینا دوسرے مجھے باطنی کے کسی واقع کا طعنہ نہ دینا۔"

"نزدہ کوان کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اس لہجے میں کہا۔ "مجھے تم جیسی ہی عورت کی ضرورت ہے، خصوصاً موجود حالات میں۔ ایسی شریک حیات جس کی مدد پر کھد نور ظلم کے چر کے ٹک بکے ہوں تاکہ وہ انتقام کے راستے میں جہد قادی سے میرا ساتھ دے سکے۔ صحتوں سے گھبرا کر منہ نہ موڑ جائے۔ جس کے اندر سکتی ہوئی زخمی ہائی کی چنگاری کسی وقت بھی بجڑ کر شعلہ بننے کے لیے تیار ہو۔ ایک عام عورت میری ایسی زندگی میں میرا ساتھ نہ دے سکے گی۔ فی الحال تم ایک عام عورت نظر آتی ہو مگر میں جب بھی تمہیں یاد دیکھتا ہوں کوئی ایسی قوت میرے کان میں سرگوشیاں کرتی ہے کہ تم ایک عام عورت نہیں ہو۔"

"چچا! تقریباً بند کرو اور کام کی بات کرو۔" میں نے کہا۔ "چلو تم تیار ہو جاؤ، ہم نکاح پڑھوانے چلتے ہیں۔" اس نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"تقریباً اتنے آرام سے کہ رہے ہو جیسے ہم بازار سے دو تھکے کی مصالحی خریدنے جا رہے ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم اور کیا دھوم دھڑکے سے کہوں تاکہ وہ پڑوسی اٹھتے ہو جائیں جو ہمیں پہلے ہی مہال دی سیکھتے ہیں اور وہ مالک مکان بھی آجائے جس نے ہمیں لویا ہوتا ہوا کچھ کر مٹھا کرائے پر دیا تھا اور جو جی الجھنی سے ہمارے ہی گھر کی طرف کان لگائے بیٹھا ہے کہ کب ہمارے بل سے کسی چن منہ کی نیاں نیاں سنائی دیتی ہے۔" ادیب میری طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرایا۔ "اگر ان سب کو معلوم ہو گیا کہ ابھی ہمارا نکاح ہی نہیں ہوا تو طرہ شرافت اور صبر و قناعت پر کوئی چین نہیں کرے گا اور سب لوگ مار مار کر ہمارا بھر مار نکال دیں گے۔ چنانچہ فی الحال صبر و قناعت کے ساتھ چپ چاپ اپنے ہی نکاح ٹھیک ہے۔ چلو اب تیار ہو جاؤ۔"

شام کو اپنے گھر سے آگے دو تین گلیاں چھوڑ کر ہم نے ایک مسجد تلاش کی جس کے ساتھ ہی ایک مجرے پر نکاح رجسٹرار کا چھوٹا سا پورڈا اوڑھنا تھا۔ مجرے کا دروازہ مسجد کے اندر ہی تھا۔ جوتے اتار کر ہم نے اندر ج کر مجرے کے دروازے پر دستک دی۔ اسی لمحہ کے ایک بزرگ نے دروازہ کھولا۔ داڑھی کے ساتھ ساتھ ان کی ہمنویوں تک کے بال سیاہ ہو چکے تھے مگر چہرہ جوانوں سے زیادہ روشن اور آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی۔

"ہم نکاح پڑھوانا چاہتے ہیں۔" ادیب نے نہایت سادگی اور بغیر کسی تمہید کے اس طرح یہ جملہ ادا کیا کہ مولوی صاحب ہکا بکا رہ گئے۔

سے کہا۔ اس کا منگو کرنے کا یہ انداز نہایت عجیب تھا۔ کبھی نہایت خطرناک اور کبھی نہایت پر مزاح، کبھی بے حد چبھتی ہوئی اور کبھی نہایت لادستی ہوتی۔ وہ اسی سرسری اور ملو سے لہجے میں اچھلتی بھولپن سے بات کر جاتا تھا جیسے اسے اپنے الفاظ کے معنی و مضمون کا صحیح اندازہ نہ ہو۔ اس کی یہ لڑائی جیسے بہت اچھی لگتی تھی۔

ارباب کے پاس پیسے بالکل ہی ختم ہونے لگے تو وہ ڈگری کی تلاش میں جانے لگا۔ ڈگری اسے بہت جلد مل سکتی تھی کیونکہ اس کے پاس فن تعمیر کی ڈگری تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ یہ ڈگری پیش کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اپنا اصل نام ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اپنا حلیہ بھی اس نے بہت دل لبا تھا۔ کلمیں شو، پھولے پھولے ہل، چھ ترین انگریزی لباس۔ اب یہ اس کی شخصیت کے نمایاں جزو تھے۔ وہ بظاہر کوئی کھلڈر اور مصروفیت لہ سا نوجوان نظر آتا تھا جو کسی وجہ سے رائل آرمی میں کیٹن حاصل کرنے میں ناکام رہ گیا ہو مگر شوقی بہر حال ابھی تک اس کے سر پر سوار ہو۔

اس سے پہلے کہ گھر میں قاتلہ کٹی کی نوبت آئی، ارباب کو ایک تعمیراتی کمپنی میں سائٹ سپروائزر کی نوکری مل گئی۔ تین ماہ اس نے ہمدے لگے ہمدے معنی کے مطابق گزارے۔ اب میں امید سے تھی اور ارباب نے جب یہ سنا تھا تو خوشی سے پھولا نہیں سہا تھا لیکن تب چند دن سے میں یہ محسوس کر رہی تھی جیسے وہ کسی اوجیز میں مصروف رہتا ہو۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا سیاسی ذہن کسی ہول توڑ میں لگا ہوا ہے۔ ایک دو بار میں نے پرچھا بھی تو ٹال گیا۔ "ابھی قاتلے والی کوئی بات نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے اس کے طرز عمل کی وجہ کام کی لڑائی بھی کیونکہ اب وہ نئی طور پر کچھ جھوٹے سونے لٹے جانے کا کام گھرا لے لگا تھا۔ اس زمانے میں خرابیے اچھے سخت نہیں تھے۔ نئی پرائیکٹس میں کام کا سہارہ دیکھا جاتا تھا، نام اور ڈگریاں نہیں۔ اس طرح کے نئی کاموں سے ارباب کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔

پھر گاہے بہ گاہے اسے کچھ وگ ملنے آئے۔ اس نے بتایا کہ یہ اس کے دفتر کے ساتھی ہیں۔ وہ لوگ تھوڑی دیر تک بیٹھک میں گپ شپ کرتے پھر تمہ خانے میں پہنچ جاتے۔ ارباب نے ذرا تنگ و غیو کے کام کا بندوبست بھی تمہ خانے میں کیا ہوا تھا۔ اس کی ذرا تنگ کی مخصوص میز اور ایل و فیو کے علاوہ تمہ خانے کے ہاں میں اس نے ایک بہت لمبی سی میز اور چائیں کرسیاں بھی ڈالوا دی تھیں۔

رفتہ رفتہ ہر پہلے کی شام کو اس سے ملنے کے لیے آنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ان میں ایک نوجوان سے ارباب کے خصوصی طور پر بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ نرم و نازک اور شوا شوا کر بات کرنے والے اس عیس طبع سے نوجوان کا نام نصیر ویک تھا۔ نام

میں نے اہمیت میں سر ہلایا تو وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ "تمہیک ہے" اندر آہلو۔
عصام کی ازلہ سے پہلے ہمارا نکاح ہو گیا۔ سونڈ اور متنی گولہ سہ۔ ارباب نے اس خوالی کا بدیہ اور نمازیوں کے لیے ہمارے منگوا کر ہانٹنے کی غرض سے کچھ رقم مولی صاحب کے سپرد کی اور ہم گھر آ گئے۔

یہ ایک عجیب شادی تھی۔ میرے ہاتھوں میں مندی رہتی تھی نہ دھو تک پر دھتی کے گیت گائے گئے تھے۔ میں نے عروسی جوڑا پہنا تھا نہ کسی نے اپنی دعاؤں کے ساتھ مجھے رخصت کیا تھا۔ کسی نے میرا سنگھار کیا تھا نہ میرے در پر شہنائیاں بجی تھیں۔

احوالی سب پہلے جب میری نام نماد منگل ہونے لگی تھی تو پڑوسیوں نے دھو تک کی قہاپ پر گیت اپنے شروع کر دیے تھے مگر اس وقت ہر روز برہمن کی طرح چنے میں اترتا تھا۔ آج میرے کان دھو تک کی قہاپ نور منگلے گیت سننا چاہتے تھے مگر سنا تے وہ کوئی نہ تھا۔

کبھی محل سرا کا پر آسائش اور شاندار رہائش گاہ۔ میرا تھا تو خلوتوں کا وطن ایک غیر ایک کمرہ عریض تھا۔ آج من کا میت سامنے تھا تو خلوت گاہ کو سہالے کے لیے پاد پھل بھی بھرد تھے۔ دیر تک ہم دونوں آنے سامنے چارپائی پر بیٹھے ایک تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر خود بخود آنکھیں بھر آئیں۔

"مہلی! میری نظیر اس طرح کیوں لگتی ہے؟" میں نے بہ زبون خاموش سوال کیا اور آنسو میرے رخساروں پر اتر آئے۔

ارباب نے مجھے اپنی مضبوط پانسوں کے ملنے میں سمیٹ لیا۔ "مست رو پل! میں تمہارا کچھ ماہوں مگر یہ سب پھولی پھولی باتیں ہیں۔" وہ اپنا لہجہ گفت و شنید کی کوشش کر رہا تھا۔ "مجھے گتا ہے کہ ہم دونوں ان سے کہیں زیادہ جڑی باتوں پر دھیانا دینے کے لیے پڑا کیے گئے ہیں۔ ہائی آکر تجھے روکے پچکے طریقے سے شادی ہونے کا دکھ ہے تو فی الحال اس دکھ کو دل سے نکال دے۔ ہم اس وقت اپنی شادی کا جشن منائیں گے جب حالات اہل حق میں ہوں گے۔ ہم ساری دیکھیں لڑا کر میں گے۔ سارے ارمان نکال لیں گے! اس پلا کچھ لے کہ جشن اوجھار بہا۔ جس لب پس دے۔ منہ بسورتی اچھی نہیں لگتی۔ مل نہیں۔" اس نے میرے زور سے گدگدائی کی۔ میں نہیں پڑی! اس کا دل رکھنے کے لیے نہیں کچھ۔

"اور اگر اس وقت ہمارے منہ میں دانت اور جھٹ میں آنت نہ رہی تو؟" میں نے ہنس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا۔ جشن تو داعیوں اور آنکھوں کے بغیر بھی منا جا سکتا ہے۔" اس نے سادگی

ہے چاہیں۔ بات بھی محدود رہے گی۔ اتنی ہی اس میں سلامتی ہوتی ہے۔
 میں اب سلامتی اور عدم سلامتی کی فکر سے لگ چکا ہوں۔ ادیب نے چٹ لٹ کر
 کئی باتوں پر کھینچے ہوئے کیا۔ "میرے ہاں تک تمہارے شک و شبہ کا تعلق ہے تو میں بھی
 یہ سب کی بات ہاں ہوں کہ اکیلا چنا ہوا نہیں ہو سکتا۔" وہ جھلی لینے لگا۔
 "لیکن مجھے تو تمہاری سلامتی کی فکر ہے۔" میں نے ہولے سے کہا۔ "شاید کوکھ میں
 جی ہوئی ان مسموم دھول کی وجہ سے۔ مجھے دانی نے بتایا ہے کہ میرے ہاں جڑواں بچے
 ہوں گے۔"

میں نے تم سے شادی اس لیے کی تھی کہ تمہارے بچے میں برکت ہو انعام کا شعلہ
 مجھے بھی حرارت پہنچائے گا۔" ادیب نے چمت کو گھورتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے معلوم
 نہیں تھا کہ تمہارے جذبے اس قدر جلد سرد ہو جائیں گے اور تم بھی مجھے بھول جانے کی
 کوشش کر دو گی۔ میرے یوں میں بیڑیاں ڈالنی چاہو گی۔"

میں کئی لمحے خاموش رہی۔ وہ میری بات میں سمجھ رہا تھا اور مجھے سمجھانا نہیں آرہا
 تھا۔ "میں نے سنا ہے عورت بہت جذباتی ہوتی ہے۔" میں نے بھوج سے لیے میں کہا۔
 شاید یہ درست ہو مگر مجھے اس فکری عمر میں تجربہ ہوا ہے کہ اس جذباتیت پر وہ اگلے
 دیکھ میں بھی عورت کا کوئی غلطی نہیں۔ ادیب اب میرے بچے میں آئیں لگاں چل رہا ہے مگر
 اس کی پیش گوئی میں بھی محسوس نہیں کر سکتے۔ میں نے اس پر میرے جذبہ کی بجائے لنگی کے اتنے
 پردے ڈال رکھے ہیں۔ میں میں ادب وار کرتا نہیں چاہتی۔ چاہے مجھے برسوں انتظار
 مانا جائے۔"

"میرے خواہ اس درد من و خشن قبر میں سو جائے اور اس کی بیڑیاں تک گل جائیں۔"
 ادیب نے طعنے لیے میں کہا اور کھیل بچے تک کھینچ لیا۔

"بچوں کو جلد موت نہیں آتی۔ عموماً ایسے انسانوں کو خدا جلد اپنے پاس بلا لیتا ہے۔
 شاید اس میں بھی خدا کی مصلحت ہو کہ وہ ظالموں کی رسی دراز کرنا ہے حتیٰ کہ وہ خود کو
 لالہ لکھنے لگتے ہیں۔ مجھے یقین ہے۔" غیر ارادی طور پر میری آواز خود کلامی کی سی
 سرگوشی میں ڈھل گئی۔ "میرے ادیب جلد میں مرے گا۔ کیسے کیسے کاغذات حلوں سے تو وہ
 بھر رہا ہے۔"

ادیب نے شاید میری سرگوشی میں سنی تھی۔ "میں تمہاری باتوں پر غور کرنے کی
 کوشش کر رہا ہوں۔" اس نے رسی سے لیے میں کہا اور میری طرف کھٹکھٹ کر آئیں
 مگر نہیں۔ مجھے ابھی طرح معلوم تھا کہ کل اسے یہ بات یاد بھی نہیں رہے گی کیونکہ وہ یاد
 رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

کام شروع ہو جائے گا۔ میرے جاننا دل نے مرتب کر رکھی ہے۔
 "گھوٹا تم ایک پڑھے لکھے اور ذہین قوی سے ڈاکو بننے چاہیے ہو۔" میں نے غلی سے
 کہا۔ "اصل تو کوئی لہجہ نہیں کہ اس طرح تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے اور اگر ہو
 بھی سکتے۔ تو وہی بچوں کو حالات کے رحم و کرم پر بھروسہ کرنا ہی زندگی قتل میں سڑنے
 گزار دے۔"

"میں ڈاکو بننے نہیں چاہتا۔" اس نے قدرے برہمی سے کہا۔ "میں نہایت سادہ فطرت
 انسان ہوں۔ یہ عظیم قائم کر رہا ہوں۔ کوئی داری گرد کو بھی نہیں پائے گا۔ تمہیں کیا معلوم
 کہ میں نے ان زخم خوردہ لوگوں کے زخموں کے کس کس زخم کو پھیر کر انہیں اپنا ہم خیال
 بنا دیا ہے اور اپنا لاکھ عمل مرتب کرنے سے پہلے گورنمنٹ لڑائیوں کی کئی طویل تاریخ
 پڑھی ہے۔"

"میں نے زیادہ کتابیں نہیں پڑھیں۔ زندگی نے مجھے مصلحت ہی نہیں دی۔" میں نے
 نہایت قہر منان سے کہا۔ "ابنہ مجھے اپنے ابا جی کی کوئی ہوتی بات میں بھولتی کہ سائنسی
 فارمولے تو عملی طور پر درست ثابت کیے جاسکتے ہیں مگر زندگی کے ہائی معاملات میں کتابی
 علم شاید ناکام رہتا ہے۔ ضروری نہیں کہ جس طریق کار کے تحت ایک کوئی نے
 کامیابی حاصل کی ہو۔ دوسرا بھی اسی فارمولے کو اپنا کر کامیاب ہو جائے۔ اگر ایسا ہونے لگے
 تو دنیا کا ہر فرد کامیاب ہو جائے۔ اس کے علاوہ میری سمجھ میں ہے بھی نہیں آرہا کہ جس
 طریق کار کے تحت تم قدم اٹھا رہے ہو۔ اس کے اہم ترین مرحلے کیسے سر ہوں گے؟
 دماغ کماں سے آئیں گے؟ اسلحہ کہاں سے آئے گا؟"

"یہ سب کچھ میں نے سوچ رکھا ہے۔" ادیب کے لیے میں رنج مندی کی سی ہنک
 آئی۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"
 "تو چلے کیوں میرا دل نہیں مارتا۔" میں نے کہا۔ "میں بدھگنی کرنا نہیں چاہتی لیکن
 نہ جانے کیوں مجھے وہم سا ہے کہ یہ طریقہ درست نہیں۔"

"تو پھر تم کیا طریقہ تجویز کرتی ہو؟" ادیب بظاہر سکون لیے میں بولا مگر مجھے اندازہ ہوا
 کیا کہ اس کی تہ میں وہی جھنجھلاہٹ چلی تھی جو پڑھا لکھ اور جہاد شہر اس وقت
 محسوس کرتا ہے جب اس کی کم پڑھی لکھی اور کم تجربہ کار قیدی اس کے معاملات میں ناگہ
 اڑاتی ہے۔

"میں تو سمجھتی ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "کہ میرے ذہن میں کوئی قابل
 طریقہ یا تجویز نہیں ہے۔ میری عقل کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن میں ایک سبلی سی بات چاہتی
 ہوں۔ انسان کو اپنی زندگی کے نازک ترین معاملات صرف اپنی ہی ذات کی مدد سے انجام

ہو جاتا ہے۔ پہلے انہیں انتظار ہوتا ہے کہ بچہ نہ جانے کب گھٹوں کے بل چٹنا شروع کرے گا۔ پھر اسے اپنے یوں پر چلنے دیکھنے کے لیے ایک ایک دن گن کر گزارتے ہیں۔ پھر وہ تو قی لیان میں باقی شروع کرتا ہے تو اس کا ہر لفظ سن کر وادین یوں خوشی سے لہلہ ہو جاتے ہیں گویا اس نے کوئی نئی دنیا دریافت کر لی ہے۔

فرض یہ کہ محبت "مصفوئیت" انتظار اور چاہتی آنکھوں خواب دیکھنے کا ایک دور شروع ہو جاتا ہے۔ جس میں دنیا و باہر کا کوئی عاقل نہیں رہتا۔ ہر بات گھوم پھر کسی نہ کسی طرح بچوں پر ہی اگر مقرر ہوتی ہے۔ میں بھی اس عمل میں گن گئی اور پھر میری توجہ ہذب کرنے کے لیے ایک عینیں دو دو نعلی ہستیاں موجود تھیں۔ دیکھتے دیکھتے تم اور مریم لڑیچہ مل کے ہو گئے۔

تم دونوں لب گندے گنڈا کی طرح گھر کے قطرے سخن میں دوڑتے بھرتے تھے۔ تم دونوں کی فطرتیں بھی بہت ملتی تھیں۔ بھروسے "چلیے ہل" سہری مائل نیکیوں آنکھیں "گھٹائی رنگت" تپتی اونٹنی ناک اور ترشے ہوئے ہونٹ "فرق بس یہ تھا کہ مریم کے نقوش میں ایک بھری نزاکت تھی جو کہ ہوتی ہی چاہیے تھی۔ آخر کار وہ لڑکی تھی۔

تم دونوں کی ماحولیں بھی بہت ملتی تھیں۔ بڑوں بن بھائیوں میں عموں پیار بھین ہی میں ہوتا ہے لیکن تم دونوں تو اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی غیر معمولی تھے۔ تم آگے کیچھے ایک ہی وقت پر سوئے "ایک ہی وقت پر جاگتے" ایک جیسی جیس کھاتے اور ایک دوسرے سے شاد و غم ہی لڑتے۔ بعض اوقات تو تم دونوں گھٹیں گھر کے کسی کونے کدوے میں ہل نہ موشی سے کیچھے رہتے کہ تمہاری موجودگی کا گمان تک نہ ہوگا۔ ادراپ نے سختی سے حج تر دکھا تھا کہ دوسرے بچوں کی طرح تم دونوں کو گلی میں کیچھے کودنے کے لیے نہ لگے نہ جاتے لیکن تم دونوں نے خود ہی کبھی باہر جانے کی خط نہیں کی۔ باہر سے کوئی بچہ اگر گھر میں آہی جاتا تو تم دونوں شاد و غم ہی اس کے قریب پہنچتے۔

میں تم دونوں کی ذات میں گن گئی ضرور تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے باہمی کے دلم بھر گئے تھے۔ اذیت کم ضرور ہو گئی تھی "فتم نہیں ہوئی تھی۔ ذہر ایک بار سانپوں کی گھٹا جائے "طون کا حصہ بن جانے تو پھر اسے اگ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ باہمی کی ہر یاد کا ابر بھی میری نس نس میں شامل تھا جسے میں فراموش کرنا چاہتی بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی کبھی راتوں کو جب میرے ایک طرف تم اور مریم اور ایک طرف ادراپ ہے سہ سو جاتے تو میں گھٹیں چپ لپٹی اپنی بے خواب آنکھوں سے "دھندلی دھندلی روشنی نہ چست کو گھورتی رہتی جس پر مجھے ان گنت پچھتاہیاں لڑتی دکھائی دیتیں۔ ان پر پچھتاہیاں کا لہجہ اتنا بھٹکا کہ بالآخر میں چادر میں منہ چھپا لیتی لیکن غیر پھر بھی آنکھ سے کتاب کش

زندگی کی وہ رات میری پہلی ناقابل ہون مسرت کی رات تھی جب میں نے دور کے اونٹنی سمندر سے گزر کر آنکھ کوئی تو اپنے آپ کو موت کے ساحل پر پایا۔ میں نے جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا۔

دیسے تو مجھے اس وقت بھی اندازہ تھا کہ ہر ماں کو اپنا بچہ سب سے حسین لگتا ہے لیکن دلی بھی ہر جی ماں کو "چاند سے سچے سچے" کی لوبہ ستائی ہے مگر میرے بچوں کو تو جس سے بھی دیکھا "رنگی تیرے کرنا بھول گئے اور محسوس ہو کر رہ گیا۔

پاس پردوں کی اکا واکا عورتوں ہی کا ہمارے ہاں آنا جانا تھا۔ ان میں سے ایک بہت دیر کی خاموشی کے بعد صرف اتنا کہہ سکی۔ "اٹھ ظہر سے پچائے۔ بچوں کے رجونے کیا پورے گھر میں چاندنی بکھیر دی ہے۔"

ادراپ نے دیکھا تو کیا دیکھی اس کی زبان ٹنگ ہو کر رہ گئی۔ پھر اس کی آنکھوں میں ناشی کے آنسو بھر گئے۔ "میںیں مظلوم ہے۔" اس نے میرے قریب بیٹھ کر نور نور کی طرح شراپے "گھٹتے اور اگتے ہوئے کہا۔ "میں نے سچے یہ سوچ دکھا تھا کہ ہمارے جڑواں بچوں میں ایک لڑکا اور لڑکی ہوگی تو ان کے نام منصور اور مریم رکھیں گے۔ میں نے ایک علی کتاب میں یہ نام پڑھے تھے اور مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ جنہیں پسند ہیں؟"

میں نے نعلت آہنگی سے انہماک میں سر ہل دیا۔ میرا ہاتھ ادراپ کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں بچے میرے پہلو میں تھے اور اس وقت مجھے دنیا کی ہر چیز احتمالی حسین لگ رہی تھی۔ واقعی طور پر میں باہمی کے تمام دلموں کی اذیت اور زندگی کی تمام ناگواریاں بھول گئی۔ ادراپ کی طواشل کے مطابق لڑکے کا نام منصور اور لڑکی کا نام مریم رکھ دیا گیا۔ ہاں منصور! یہ دونوں بچے تم اور تمہاری بہن مریم تھے۔

ماں کی کوکھ میں جب بچے کی بنیاد پڑتی ہے تو گویا اس کی زندگی کے ایک عجیب منحنی فیروز کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ہر مرحلہ پہلے سے زیادہ عجیب اور ناقابل تفریح ہوتا ہے۔ پہلے اپنے اندر اس نئی مدح کو محسوس کرنا۔ پھر اپنے محسوس کرنا۔ اپنی دھڑکنوں کے ساتھ اس کی دھڑکیں سننا۔ پھر پردہ طیب سے اسے ظہور میں آتے دیکھنا۔ لپٹا پہلو میں اس معنی ی جان کا لمس محسوس کرنا۔ اس کے رونے کی آواز یا اس کی تھکاتیاں سننا اور پھر ایک لے سرے سے اس کی پرورش میں منہمک ہو جانا۔ یہ سب ایسے محسوسات ہیں جن کی تحصیل میں ازنا عورت کے بس میں ہو تو نہ جانے کتنی عظیم کتابیں تصنیف ہو چکیں۔ یہ سارا عمل اور اس کے تمام مرحلے شاید دنیا کے عجیب ترین تجربات ہیں۔

کچھ جب چھ ماہ کا ہوتا ہے تو وادین کے لیے امید و لہم اور انتظار کا ایک نیا جنم شروع

رہتی۔

بچوں کے بارے میں ارباب کے محسوسات بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن اس کا وہاں نہ جانے کتنی سببوں میں بنا رہتا۔ اس نے اپنا پیشہ ورانہ اور دیرینہ زمین دونوں ہی کام بہت پیچھا لئے تھے۔ وہ بہت مصروف رہتا تھا۔ اتنا مصروف تھے کسی تک کو رخ کرنے کی تیار کر رہا ہو۔

اوپر کا سبب بھی دیتا تھا۔ اسے ترقی بھی مل گئی تھی اور فی طور پر بھی معیاری کام ملے جاتا تھا۔ دکان میں ہانسی صرف ہتھوڑ کو ہولنی تھی لیکن ارباب وہ دن کاٹتی کرتا اور ان دنوں میں گھر سے تقریباً غائب ہی رہتا۔ کبھی کبھار گھر میں چار گھنٹے سونے کے لیے آتا۔ نہ جانے اب اس کے وہاں ایلیس کی تعداد کیا تھی اور وہ کس حد تک تھی؟ عرصے سے ان لوگوں نے گھر کے قریب خانے میں اجلاس کرنا ترک کر دیا تھا۔ معلوم نہیں اب ان کا حال کیا تھا۔ میں نے ارباب سے اس موضوع پر کچھ کہنا سننا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس معاملے میں ہمارے درمیان ہم آہنگی پیدا ہونا تقریباً ناممکن ہی ہے لیکن میں بہر حال اس کی کوشش کرتی۔ مسخیل کے پردے میں جو کچھ نہیں تھا اس کا سامنا کرنے کے لیے میں نے اسے تھا نہیں ہوا تھا۔ اب جو بھی ہوتا تھا میں بہر حال اس کے ساتھ تھی۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یہ رفاقت مجھے کہاں لے جا رہی تھی۔ لیکن غیب کا حال تو کسی کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔

وہ خانے میں اب اجلاس تو نہیں ہوتے تھے لیکن وہاں کلری کی کئی سیاہ مٹیوں کا بیچ و باریک بینی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ بیٹیاں منتقل تھیں۔ اس پر کسی قسم کا کتا، ضابطہ نہ تھا۔ اب بھی ارباب نے مجھے ان کے حلقے سے بتایا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ ان؟

بہی بھی مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ ارباب یہ سب کچھ کس طرح کر رہا ہے۔ نے اب ہم پر خوش حال آگئی تھی۔ ارباب کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے لیے لی تھی حالانکہ جس محلے میں ہم رہتے تھے اس میں کار رکھنا تو درکنار ان دنوں سے قریب سے دیکھنے کا اتفاق بھی بہت کم لوگوں کو ہی ہوتا تھا مگر پھر بھی جو کچھ تھا رہا تھا وہ اس کی آمدنی میں ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی آمدنی تو گریباور اور وائی کے ساتھ ہی میں لٹکانے لگ جاتی تھی۔ باقی سرگرمیاں کس طرح جاری تھیں؟ اس کے ساتھیوں میں بھی مجھے کوئی صاحب ثروت نظر نہیں آتا تھا۔ عظیم کا تو شاید بنیادی چند بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا کیونکہ جتنے ارکان کو میں نے دیکھا تھا وہ تو مجھے نے یہ چند ہوا کرنے کے قابل بھی نظر نہیں آتے تھے۔ ان میں صرف خیریت ہی کچھ ان حال معلوم ہوتا تھا۔ باقی سب تو شاید فریٹ والا اس کے بارے میں جھپٹے ہوئے اور ارباب کے زخم خوردہ لوگ تھے۔

خیریت اب بھی گھر آتا جاتا تھا اور اس کے گرنے کا کوئی خاص دن یا وقت مقرر نہ تھا۔ وہ اور ارباب ایک ہی کپڑے میں ملازم تھے بلکہ دوسریں حد سے کے لحاظ سے خیریت ارباب کا افسر تھا لیکن عظیم میں میرے اندازے کے مطابق اس کی حیثیت خالوی۔ ذہنا ارباب کے نائب کی حیثیت تھی اس کی۔ وہ جب بھی آتا ارباب اور انکے دوہرے کے ساتھ موجود کر رہتا جاتا یا پھر وہ قریب خانے میں چلے جاتے۔

خوشحالی کے باوجود ارباب نے ممکن نہیں بدلا تھا حالانکہ وہیں سن کے اعتبار سے یہ وہاں سے شایان شان نہیں تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ تو قریب خانہ تھا۔ بہت کم مکانات اسے مہرہ قریب خانے ہوتے ہیں۔ دوسرے اس مکان کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ خواہ کتنے ہی لوگوں کی آمد و رفت رہتی اور گرد رہنے والوں کو بمشکل ہی اس کا احساس ہو سکتا

نہ جن دنوں "ویٹ انجس" کے اجلاس تھے خانے میں ہوتے تھے ان دنوں میں نے
نہیں کو بھی آتے دیکھتا تھا۔ اندر آتے ہی نصیر جگ نے کاپی اٹھیں سے دروازے کی
بلی پڑھا دی۔

"مہمان! کمرے میں پہنچ کر اس نے سرکوشی کی۔ "جلدی سے بچوں کو سنبھالنے اور
برے ساتھ اس گھر سے چلنے یہاں پہنچ پڑنے والا ہے۔"

"مگر کیوں؟" میرا دل دھک سے رہ گیا۔ "اباب کہاں ہے؟"

"میں دلتے ہیں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔" وہ تیزی سے بولا۔ "وقت ضائع نہ
کئے۔ آپ فوراً میرے ساتھ چلیے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"ایک محفوظ جگہ پر۔ پولیس کو ابھی تک اباب کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہے
نہ شادی شدہ تھا لیکن اگر چھاپے کے وقت آپ یہاں موجود ہوئیں تو شاید مرہر گپ
اٹھکارا نہ مل سکے۔" اس نے سہ جہتی سے انگلیاں موڑتے ہوئے کہا۔

میں نے جلدی جلدی مریم کو کھل میں لیتا اور جیسے جیسے پھرتے ہوئے مریم سو رہی
تھی اسے عہدائے نے اٹھا کر کندھے سے لگا لیا۔ تم جاگ رہے تھے 'جیسے نصیر جگ نے گود
میں اٹھایا۔

"مجھے ضرورت کی چند چیزیں تو لینے دو نصیر!" میں نے جگت میں ادھر ادھر ہاتھ
اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "کم از کم تمہیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کیا کرتا ہوں۔"

"میں آپ کو زیادہ سے زیادہ مدد دے سکتا ہوں۔" نصیر نے دیکھتے ہوئے کہا۔
"آپ کوئی سلمان و فیو اٹھانے کی کوشش نہ کیجئے۔ جہاں آپ جا رہی ہیں وہاں آپ کی
نوروت کی ہرجرج لے گی۔"

وہ مدد ہر ہم گھر سے لے۔ پہلے نصیر نے دروازے سے باہر سرنگھل کر ادھر ادھر
جائے جگہ جگہ پر بھی معلوم تھا کہ اب اباب پہلے کی طرح کنوڑ اور تنہا نہیں تھا۔
مگر نہ جانے کیوں مجھے یہ سب یاد۔ بے وقت سا لگ رہا تھا۔ ہر حال میں نے کوشش
کی کہ سب کچھ لائن سے بچ سکوں۔ میں نے اپنے آپ کو گھر کے کام کاج میں الجھا لیا۔

لیکن ذہن کے کسی گوشے میں اٹھانوں کی گھنٹیں بھٹی رہیں۔

شام کو اباب کے گھر واپس گئے کا کوئی وقت مخصوص نہیں تھا، مگر اندھیرا گھبرا
ہونے سے پہلے وہ ہر حال آ جاتا تھا۔ اس دن اندھیرا گھبرا ہونے پر اس کی جگہ نصیر جگ کا
لوہ اس کا استغواں سا چہرہ دھو دھو ہو رہا تھا۔ ہارک کھلی کی نیچ کے عقب سے
آنکھیں گھبراہٹ میں پڑ رہی تھیں۔ ایک اور شخص بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا نام عہدائے

تھی۔ اس کی گود سے لیتا بھی چلا لیکن اس نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اس طرح میں تیز
نہ چل سکوں گی۔

تھا۔ اس علاقہ میں گو کہ غریب متوسط طبقہ ہی آباد تھا مگر اس طبقے کی روایت کے برعکس
لوگوں کو ایک دوسرے کی فضا میں رہنے کی عادت نہیں تھی۔ اس مکان سے منظر یہ
خصوصیت بلاشبہ اباب کیلئے بہت اہم تھی۔

ایک روز کام پر روانہ ہوتے وقت اباب نے دروازے پر دیکھتے ہوئے اچانک کد
مریم حباب کی ابتدا تو ہونے لگی ہے۔

"ہم تو اب اپنے دیرینہ دوست کے لٹکانے کی طرف کوچ کرنے کا پروگرام بنا رہے
تھے کہ طارے چاسوس نے ہمارے اطلاق بھیج دی ہے کہ آج کل وہ خود یہی کچھ بنا
رہے۔" اباب مسکرا کر بولا۔

"تمہارا مطلب ہے تو اب۔" میری آواز بڑھ ہی گئی۔

"ظاہر ہے اس کے علاوہ میں اس طرح خصوصیت سے کس کا ذکر کر سکتا ہوں؟"
لوگوں مسلسل بڑے مسودہ انداز میں مسکراتے جا رہا تھا۔ "شاید پہلے تمہیں میں نے نہیں بتایا
کہاں تقریباً ہر روز شرمیں اس موڈ کا عشرت کدہ موجود ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ انکار خودی
پھندے کی طرف آ رہا ہے اور بڑے مچھ وقت پر آ رہا ہے۔ میں اپنی تیاریاں مکمل کرچکا
ہوں۔ اب مجھے صرف اس کی آمد کا انتظار تھا۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو اباب؟" میں نے اپنی سبب استدلال دھڑکنوں پر کھوپڑی پانے کی
کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں بھی مجھ سے یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟"

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "کم از کم تمہیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کیا کرتا ہوں۔"

میں خاموش ہو گئی اور اپنی خاموشی کے ساتھ اسے رخصت کر کے دروازے سے
پنٹ کٹ۔ میرا دل ڈوب سا گیا تھا۔ اباب شرافت علی کے چوتھے اڑتے دیکھا شاید بھی

زندگی کی شمع ترین طرائق تھی۔ اس مناسبت سے مجھے اباب کی بات سن کر خوشی ہونا
چاہئے تھی جبکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اب اباب پہلے کی طرح کنوڑ اور تنہا نہیں تھا۔

مگر نہ جانے کیوں مجھے یہ سب یاد۔ بے وقت سا لگ رہا تھا۔ ہر حال میں نے کوشش
کی کہ سب کچھ لائن سے بچ سکوں۔ میں نے اپنے آپ کو گھر کے کام کاج میں الجھا لیا۔

لیکن ذہن کے کسی گوشے میں اٹھانوں کی گھنٹیں بھٹی رہیں۔

شام کو اباب کے گھر واپس گئے کا کوئی وقت مخصوص نہیں تھا، مگر اندھیرا گھبرا
ہونے سے پہلے وہ ہر حال آ جاتا تھا۔ اس دن اندھیرا گھبرا ہونے پر اس کی جگہ نصیر جگ کا
لوہ اس کا استغواں سا چہرہ دھو دھو ہو رہا تھا۔ ہارک کھلی کی نیچ کے عقب سے
آنکھیں گھبراہٹ میں پڑ رہی تھیں۔ ایک اور شخص بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا نام عہدائے

تھی۔ اس کی گود سے لیتا بھی چلا لیکن اس نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اس طرح میں تیز
نہ چل سکوں گی۔

خاصی دیر تک تاریک گلیوں میں چلتے رہے کے بعد ہم قدرے کھلی سڑک پر آ گئے تھے کہ سڑک سے دو بڑی بڑی بیڑ لائسنس اپنی طرف آئی دکھائی دیں۔

"پولیس جیپ" نصیر نے سرگوشی کی اور مجھے ایک ہاتھ سے اٹنے قدموں دیکھائے ہوئے دائیں گلی میں گھس گیا۔ اسی ہاتھ کے دھاگے سے اس نے مجھے دیوار کے ساتھ لگا کر اور دیوار سے چپک گیا۔ میں اس سے تم نے ٹھکانا شروع کر دیا لیکن فوراً زخمی تھوڑی گواہ گھٹ کر رہ گئی۔ شاید نصیر نے سختی سے ہمارے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ عہدہ نگار میں نہیں پلٹ سکا تھا، کیونکہ وہ ہم سے کئی فوٹ آگے تھا اور عہدہ نگار کی روشنی کی روشنی میں بھی آگیا تھا۔

جیپ کی گھر گھر ہٹ ہائلز قریب آ چکی تھی۔ پھر اس گھر گھر ہٹ کے ساتھ عہدہ نگار نے ایک گوجیلی آواز سنائی۔ "رک جاؤ۔"

ہمارے ساتھ سڑک پر بیڑ لائسنس کی روشنی سائت ہو چکی تھی اور اس کے اشارے کی وجہ سے روشنی نظر آنے لگی تھی اور اس روشنی میں میں نے عہدہ نگار کی پرچائی دیکھی۔ وہ احقر انسان مریم کو کندھے سے لگائے اندھا دھند بھاگا جا رہا تھا۔

"رک جاؤ" ورنہ گولی مار دی جائے گی۔" وہ گوجیلی آواز دوبارہ ابھری مگر عہدہ نگار رکا نہیں، پھر میں نے جیپ کو سڑک سے اتر کر عین اس گلی کے دہانے پر پھینچ دیا۔ گھر گھر تھک تھی اس لئے جیپ وہیں رک گئی۔ البتہ اس میں سے پانچ چھ سچے بد وقتیں سنیں۔ کوڑے اور سب کے سب اندھا دھند گلی میں گھس گئے۔ جیپ میں صرف ڈرائیور رہا تھا۔ ایک سچائی نے گلی میں نظر کیا لیکن اس وقت تک عہدہ نگار نہیں قائب ہو چکا تھا۔

نصیر نے میرا ہاتھ پکڑا اور پچھلے اسی طرح کھینکے گا جس طرح سے ہم گئے تھے۔ میرے پاؤں تو اپنی جگہ گڑ گڑ گئے تھے۔ نصیر! بھری پیٹی۔" میں نے کھلی گلی "تواڑ میں کہا۔ میں پوری قوت سے چوڑا چاہتی تھی، مگر نہ جانے کس طرح طو پر جب تک آئے تھے۔

"یہ جذبات میں اچھے کا وقت نہیں ہے بہن! اس نے جینپوٹے ہوئے لمحے میں سرگوشی کی۔ "عہدہ نگار کو معلوم ہے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ اگر وہ سچ ٹھکنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ وہیں بھی جائے گا۔ آئیے۔"

میں اس کے ساتھ کھینچنے لگی۔ کئی بار میں نے سڑک دیکھا لیکن اب کھلی میں جگہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر عہدہ نگار گیا تھا۔ کئی گلیوں میں پھرانے کے بعد ہم دوبارہ قافلہ اس سڑک پر آ گئے تھے، لیکن اس جگہ سے ہم پچھتیا بہت دور نکل آئے تھے جہاں پولیس جیپ سے ہمارا سامنا ہوا تھا۔

کچھ دیر تک ہم مکالموں کی فطرتوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے، پھر سڑک کے کنارے

دور دور تک وہ فطرتیں اور جہازوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک جگہ وہ فطرتوں کے نیچے مجھے ایک کھلی نظر آئی۔ کہو ان اپنی نشست پر بندے اطمینان سے جاگ رہے تھے بیٹھا تھا بیڑی کے گلے سے لے رہا تھا۔ نصیر بھی کے قریب پہنچا تو اس نے بیڑی ایک طرف پھینک دی۔

بہت دیر لگا دی۔" اس نے سرسری لہجے میں کہا اور ہاتھیں منہ میں۔ "مصلحت بہت تھا" اور پھر راستے میں تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی۔ مزید چکر کاٹنا پڑا۔ "نصیر ایک نے جواب دیا اور بھیجا کا ہونہ بنا کر مجھے اندر پھیلنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود بھی میرے برابر بیٹھ کر ہونہ گرا دیا۔" بھیجی کا یہ حصہ جاموں طرف سے بند تھا۔ صرف دائیں طرف ایک جھولی سی جلی دار کھڑکی بنی ہوئی تھی، نور اس کھڑکی میں بن چنی والا ایک چھوٹا سا کیوبیسین لپٹا تھا۔ نصیر نے تمہیں میری گود میں لٹا دیا۔ تم پر اب خودی کی طاری ہونے لگی تھی۔

بھیجی نے چہرے سے لے کر ہر ہواد سڑک پر آ کر دوڑنے لگی۔ ٹھوڑے کے پاؤں کی تیز تواد سڑک کی دیواری کا پچھلے دے دی تھی۔ نصیر نے لمبی نشست کے ایک سرے پر کھٹک کے گدی پلے پٹھے سے ٹیک لگائی اور واسکٹ کی جیب سے قمی کھل کا پچکٹ نکال کر ایک شریعت سٹائی اور گھرے گھرے کش لینے لگا۔ اب وہ خاصا پر سکون نظر آ رہا تھا۔ کئی صوف گزر گئے۔

پلوٹری میں نے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ راستے میں سب کچھ ہٹا دوں گا۔ سب کچھ سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ ایسا کب ہوا ہے؟"

"نہ مرچکا ہے۔" اس نے دھیمے اور سچاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "نہیں۔" میں بھی تھی کہ میرے حلق سے یہ لفظ ایک ٹھٹھک جھج کے ساتھ برآمد ہوا ہے لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے ہونٹ واضح ہوئے تھے لیکن میرے حلق سے کوئی تواد نہیں نکلی تھی۔ یہ لفظ۔ "نہیں" میں نے صرف سوچا تھا اسے تواد نہیں مل سکتی تھی۔

شاید مجھ پر سخت طاری ہو گیا تھا، کیونکہ دوبارہ جب میں احساسات کی دنیا میں داخل ہوئی تو نصیر گھبرائے ہوئے انداز میں میرا کندھا ہلاتا رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا۔ تمہیں گود میں سمیٹ کر تم پر یوں چادر تنان لائی گویا میں تمہارے نچے سے معذرت کے گود ایک حصار تعمیر کر رہی ہوں تاکہ برے لفظوں کی آہٹ، برے وقت کا سایہ نور بری خجوں کا زہر تم تک نہ پہنچ سکے۔ میرا دل یقیناً یوں سن ہو گیا تھا گویا شہزادوں میں لوگوں کے بجائے چھاتی برف کا آبیٹھار اس میں گرے لگا ہو۔

لیکن اسی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ اب اس پس سے کبھی کبھار کسی گاڑی دیکھو

جس سے لڑائی میں سر ہلایا تو ڈیڑھائی آنکھیں چمک پڑیں۔ پہلا آنسو گولا بارش کا پہلا نمونہ تھا۔ ایک بار آنکھیں چمکیں تو گولا سیلاب ہی لڑ گیا، لیکن میں نے لڑائی نہ دہشت سے چادر کا پلہ آنکھوں پر نہ کر اس سیلاب کا مٹا جذب کر لیا اور ایک بار پھر کسی کی طرح اس کی مدد کی پر بندہ باندھ دیا۔

آنسوؤں سے نظری نہیں، "محل و حواس بھی دھندلا جاتے ہیں" اور میں نے زندگی نے اب تک کے مصائب سے ایک ہی تجربہ حاصل کیا تھا کہ سانچوں پر صرف اقم کر کے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، "پھر لوگوں کے لیے سنبھل کر اگر یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ سانچہ پہنچے کیا کچھ لا رہا ہے تو میری موت ہی چہ کارہوں سے بچے میں مدد مل سکتی ہے۔

"مگر میرے علاوہ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ آج کی صبح کا پسینہ کتنا ہے۔" نصیر نے سوچ میں اڑتے ہوئے کہا۔ "ہاں سب نے تو آنکھیں بند کر کے اضطراب کی قبیلہ کر لی۔"

عبداللہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔
"اے تو میں خود بروقت گھر سے نکال کر لایا ہوں۔ چند صبح بعد ہی اس کے ہاں اپنی پہچان پڑا ہے۔" نصیر بیک نے جواب دیا۔ "اور اس کے علاوہ نہیں کے ہمیں آدمیوں میں سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔"

عبداللہ کا خیال آتے ہی میرا حتمہ سا دل گولا دینہ دینہ ہونے لگا۔ پولیس اس کے قریب میں تھی۔ ان کی بندوہوں کی گولیاں سو چائے کیلئے بے قرار تھیں۔ اور۔۔۔ عبداللہ کی گود میں میری بیٹی تھی۔ خدا! اسے محفوظ رکھنا۔ میں تجھ سے کبھی کچھ اور نہیں مانگوں۔۔۔ زندگی نے اب تک مجھ سے جو جو ظلم روا رکھے اس کا ٹکڑا ہی نہیں کھوں گا۔ بس اس کی جان بخشی کر دیتا۔

یہ دعا میں نے بے اختیار طے ہی دل میں مانگ لی تھی، مگر اس کی قبولیت کی امید کم ہی تھی، کچھ لوگ شاید پورا کئی شیوہ بنتے ہیں اور مجھے اب اپنی حیوانیت کا تعین ہو چلا تھا۔ میرے لئے اگر کوئی طرہی تھی تو اس کے عقب میں کلام و کلمات کا ایک جھوم ہوتا تھا۔ میرے لئے تو شاید مناسب ہی تھا کہ کبھی بھول کر بھی۔۔۔ کاتب تقدیر سے کسی سرٹ کی بیک نہ مانگوں۔

کبھی شاید کسی بارونق علاقے سے گزر رہی تھی۔ ٹرک کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور کیو سین لیمپ کے عقب میں پھوٹی سی جلی دار کھڑکی سے روٹیاں پیچھے جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ سبھی کی رفتار کم ہو گئی تھی، لیکن کچھ ہی دیر بعد رفتار پھر بڑھ گئی اور گرد و پیش کے سٹالے کا احساس ایک بار پھر ہونے لگا۔ اب پھر سڑک پر صرف گھوڑے دوڑ رہے تھے۔

کے گزرنے کی تواز سنائی دینے لگی تھی۔ شاید اب بھی کا رخ کسی آباد علاقے کی طرف تھا۔

"جیہ کیسے ہوا؟" پلاٹر میں نے اپنے لہو لہو آنسوؤں کو پگھلایا، مدد کر پڑھا۔ نصیر نے گہری سانس لی۔ گولا مجھے بولتے دیکھ کر اسے اطمینان ہوا ہو۔ وہ ایک بار پھر سے کو ہٹا کر بیٹھ گیا اور جی سگڑت سلگنے لگا۔

"وہ کریم کے علاقے میں ایک پراجیکٹ کی سائٹ کا معائنہ کر کے واپس آ رہا تھا۔" نصیر نے ایک طویل کش لے کر کیو سین لیمپ کو گھومتے ہوئے کہا۔ گولہ بے ہوشی کی چٹا پر ایک بیٹ ڈاک نے بڑے عجیب طریقے سے اس کی کار کو ٹکرا دی۔ کار ٹپک کر اترتی ہوئی لیمپ میں پھول سڑک پر جا گری اور فوراً ہی اس نے آگ پکڑ لی۔ پود گرام کے علاقے میں کچھ دیر بعد سائٹ سے واپس روانہ ہوا تو میں نے راستے میں جھم جھم دھندلانی شہدوں نے مجھے مارنے کی قیصل بتائی۔ ڈاک مارنے کے فوراً بعد ہی عجب ہو گیا۔ میں جس وقت وہاں پہنچا لوگوں نے آگ بجھائی تھی، لیکن کار کچھ نہیں بچا، لوہے کے ٹکڑوں کا ایک اجیرہ گیا تھا۔ صرف ایک ٹیبلٹ ہو لوٹ کر دور جا گری تھی اس سے میں نے کار کو پہچانا۔ اب تو اندازہ کر سکتی ہو کہ لاش کی کیا حالت ہو چکی ہو گی۔ بس یوں سمجھ لو کہ راکھ کا ایک ٹاکھل پٹا تھا۔"

اس نے خاموش ہو کر مضطرب انداز میں سگڑت کے وہ عین کش لے۔ "نہ چلے کیوں میرا ہاتھ ٹپکا۔ آج شام ہماری ایک مہم طے تھی۔ تنظیم کے کئی ارکان کے پاس اختیار تھے۔ میرے لیٹے میں بھی ٹیگر اور ہتھول موجود تھا۔ میں نے موقع پا کر وہ دونوں چھریں دیں گولے مارے میں پھینک دیں اور دفتر واپس چلنے کے بجائے ایک اور جگہ چلا گیا۔ وہاں سے میں نے دفتر اپنے ایک خاص آدمی کو فون کیا۔ میرے اندیشوں کی تصدیق ہو گئی۔ تنظیم کے جو رکن سمجھتی میں حاکم تھے انہیں تو وہیں گرفتار کر لیا گیا اور باقی کو وہ سری جھکوا لیا۔ انہیں اگرچہ سرکار سے خداری اور ذمہ داری سرگرمیوں کے جرم میں پکڑا گیا تھا اور جی کاسیالی سے یہ کارروائی ہوئی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ تنظیم ہی میں سے کسی نے خداری کی ہے، لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ فدار نے اگر صرف پولیس کو مطلع کیا تھا تو وہ ارباب کو بھی ذمہ ہی گرفتار کرتی۔ اسے اسے پر اسرار انداز میں کیوں مارا گیا۔؟"

"فدار نے شاید ایک شخص کو مطلع کیا ہو گا" اور ہائی ساری کارروائی کیلئے اس شخص نے اپنی جگہ پیٹھے پیٹھے لوہیاں ہلائی ہوں گی۔" میں نے مدھم آواز میں گویا اپنے آپ کو تانیا۔

"آپ کا مطلب ہے جواب۔؟" اس نے سنبھل کر میری طرف دیکھا۔ میں نے

قدروں میں ایک گوری ریٹن ہل اس کی کمر اور شانوں پر سے ہوتے ہوئے کانٹن تک پہنچے ہوئے تھی۔ عورت حسین نہیں تھی مگر اس کا جسم نہایت حسین تھا۔ وہ نواب کی بددیانتی پر اپنی گود میں لئے بیٹھی تھی اور ایک خوبصورت لپٹی سے نہایت اٹھاک اور احتیاط کے ساتھ اس کے کانٹن کاٹ رہی تھی۔

نواب نے دھاری اور چکلی سے کپڑے کا گاؤن پہن رکھا تھا جس کے ساتھ اس کی یہ رنگت کا تضاد کچھ زیادہ نمایاں محسوس ہو رہا تھا۔ اسے آخری بار دیکھ ہوئے تھے کوئی بہت طویل مدت تھی مگر اس میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ باہل کی سفیدی بڑھ گئی تھی، جڑوں کا گوشت لٹک گیا تھا چہرے پر شکنیں نمودار ہو چکی تھیں۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس کا سر تپا جاتے لیا اور نصیر بیگ کی طرف مڑی۔

”خود کار تم ہی تھے نصیر بیگ!“ مجھے اپنی آواز دہنی ساپ کی پٹھانہ سے مشابہ معلوم ہوئی۔ اگر محض لفظوں سے کسی کو قتل کرنا ممکن ہوتا تو شاید میرے ہر لفظ سے نصیر بیگ کی مرجھ کر ہو چکا ہوتا۔

نصیر بیگ کے چہرے کے تاثرات گویا بکھرتے ہی ہل جاتے تھے وہ اب ایک شرمیلے اور متنی سے نوجوان کے بجائے ایک شاطر شخص نظر آ رہا تھا۔ اس نے گویا اچانک ہی کچھ بولنا شروع کیا۔ وہ بیٹے پر ہاتھ رکھ کر جھکا اور انتہائی سکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”جی ہاں محترم پہلے میں نے تم پر اسے رابطہ کر کے اپنی قیمت پر بھیجی تھی۔ نداداری کا مطلوبہ چونکہ نہایت شاندار مل رہا تھا اس لئے میں نے ادا کی ظاہر کرنا ہی مناسب سمجھا۔ ایسے مہوتے آدمی میں بار بار تو نہیں آتے ہیں؟“ اس کی شکل مجھے نواب سے بھی زیادہ کھردھ گئے گی تھی۔ میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ نواب آرام کرسی پر سنبھل کر چہچکا تھا۔ پڑوں اس نے عورت کی گود سے کھینچ لئے تھے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھسلنے لگی تھیں۔

”ابھی کو اندھا سوکوس سے احوال پتا ہے۔“ نواب نے گاؤن ہٹا کر اپنا گھٹنا

کھاتے ہوئے کہا۔ ”ارے بد بخت! تجھے وہ مرہود ارباب ہی ملا تھا یاہ رجائے کو۔“

”خبردار کالے شیطان! اگر تو نے میرے شوہر کے متعلق ایک بھی ایک لفظ منہ سے

نکالا تو۔“ میں اس پر ہی طرح چبھی کہ میری آواز پست تھی۔

”تو تم کیا کرو گی جان میں؟“ نواب نے بدستور مسکراتے ہوئے خلاف توقع ہنس

کلیے مگر مجھے لہجے میں پوچھا۔ میرے بیٹے میں بے بسی کا غبار سا اٹھا مگر میں نے آنکھوں

سے آنسو نہ چھینکے دیئے۔ مجھے معلوم تھا کہ ظلم بتاتا ہے پتا چلائے“ صیوان کا لطف

اعدا ہوتا ہے۔

”جس طرح تم نے ہمیں مظلوم کیا ہے شاید اس پر ہم تمہاری زبان گدی سے

بلا خر تھی رک گئی۔ قریب ہی ایسی کمر کمر ہٹ سٹلی دی جیسے لوہے کا کوئی پھللی بھرم گیت کھولا گیا ہو۔ پھر ایک شخص نے یہ وہ اٹھا کر بھیجے کے اندر بھاگا۔ سپاٹ کی ٹھکڑ سے اس نے ہمارا جانچ لیا اور پتہ گرا دیا۔ تبھی آگے بڑھ گئی اور مزید چھوڑا قاصد ملے کر کے رک گئی۔

نصیر بیگ تبھی سے اتر کر پرہا سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اتر آئیے۔“ اس نے مجھے سارا دھپے کیلئے ایک ہاتھ پھلایا۔ تم سوچتے تھے میں تمہیں کدے سے لگائے تبھی سے اتری اور اور اور دیکھتے گی۔ ہم سرخ پتھر کی بنی ہوئی ایک کوٹھی کے وسیع و عریض اسٹے میں کھڑے تھے۔ برآمدے کی بیڑیاں سامنے ہی تھیں اور برآمدے کی پھت میں قالوں اور پھت سے اوپر کوٹھی کی عموالی پیشانی پر بڑے سے بڑے شیشے میں ایک طاقتور بلب روشن تھا۔ ہلی عمارت باہر سے تاریکی کی قیادوں سے کسی دکان پر چھائی کی طرح کھڑی نظر آ رہی تھی۔

نصیر بیگ میرا ہاتھ قلمے برآمدے کی طرف بچھا۔ بیڑیاں عید کر کے اس نے دروازے پر دستک دی۔ ایک طویل القامت لڑکھن نے دروازہ کھولا اور نصیر کو دیکھ کر خاموشی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ہم ایک آرامدہ و پیراستہ نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ ان طویل و عریض کمرے کی آرائش اور شکن و شوکت دیکھ کر مجھے حیرت ہوئے گی کہ اگر یہ وہاں انجلس کی پتلا گود تھی تو پھر وہ واقعی بہت منظم ہو چکے تھے۔

نشست گاہ میں کوئی بھی نہیں تھا۔ نصیر میرا ہاتھ قلمے ایک اور دروازے کی طرف پھرتا چلا گیا۔ اس دروازے سے ہم ایک طویل راباداری میں گئے۔ جس میں دونوں طرف کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ دھم کی روشنی میں یہاں کا فرش سبز آبی کی طرح چمک رہا تھا۔ راباداری کے انتہام پر ایک بڑا دروازہ تھا جس کے قریب سٹول پر ایک شخص دیوار سے لٹک لگائے گرد و پیش سے لافعلی سا بیٹھا تھا۔ اس کی گود میں ایک راکھل رکھی تھی۔ ہمیں دیکھ کر بھی اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی، صرف ہونٹ غیر محسوس طور پر ہلائے۔ ”تمہارا اظہار ہو رہا ہے۔“

نصیر نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک ہاتھ سے دروازہ کھولتے ہی دوسرے ہاتھ سے مجھے نہایت نرمی سے آگے کو دھکیلا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے میں غلغلے کی کھنک سی گئی، لیکن مجھے تاخیر ہو چکی تھی۔ نصیر میرے عقب میں دروازہ بند کر چکا تھا اور خود دروازے سے ٹپک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

ہاں نما اس وسیع کمرے کے وسط میں تین افراد موجود تھے۔ ایک لمبا بڑا سیاہ فام چاٹ ہو تھوڑی جھینے کی طرح ایک طرح الیتہ تھا۔ اس کے سامنے ایک نہایت شاندار خلیں آرام کرسی چھپی ہوئی تھی جس پر نواب شرافت علی خاں نیم دراز تھا۔ اس کے

کھنچوا لیتے۔" نواب نے عارف قریح اپنا ملائم لہجہ برقرار رکھا۔ "لیکن اب ہماری عادیوں بدل گئی ہیں۔ ہم بڑے لٹریٹے دنیا سے سوچتے اور عمل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ شاید یہ بلا متی ہوئی عمر کا تقاضا ہے، یہ مجرد مرتبہ موت کو نہایت قریب سے دیکھ لیتے کا نتیجہ ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ ارباب اور تہذیبی سرخسے کے ہر بھروسے والے تو خود اپنے ہی آدمیوں سے تم دونوں کو اٹھوا لیتے، جس طرح بے وقوفوں کی اس تنظیم کی سب سے پہلی کوشش کو فراہم کی جا چکی تھی ان کے ساتھ ساتھ ہم تم دونوں میاں بیوی کو گرفتار ہونے دیتے، لیکن اس طرح معاملہ بہت لیا ہو جاتا۔ مقدمہ چلتا اور عمارتوں کے ڈھکوں کو نہ جانے کیا سزا ملتی۔ اس لئے ہم نے نہایت عمدگی سے وہ طریقہ اختیار کیا کہ ساتھ ہی مر جانے اور ڈھکی بھی نہ ٹوٹے۔ اب ہم خود کوئی عرصہ عمل نہیں لیتے اور اپنی کارروائیوں کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑتے، کیونکہ آج کل اگرچہ سرکار کو انصاف پسند کہلانے کا بہت شوق پیدا ہو گیا ہے اور وہ رسمی طور پر ہی کسی لیکن بہر حال شہادتوں اور مقدمے کی کارروائیاں پوری کرنے کے عادی ہو گئی ہے۔ اب ہم لاکھ لٹریٹے بارگ کے سہی لیکن اپنے دشمنوں کو انہماک کو پہنچنے دیکھنے کیلئے اتنا طویل انتظار بھی نہیں کر سکتے تھے خصوصاً جب ہمیں ان کا سرخسہ ہی مل چکا تھا۔"

"وہیے جہاں تک ہمیں یاد چتا ہے۔" نواب کے ہاتھ پر شکنیں گھری ہو گئیں۔ "ہم نے جنہیں قید خانے میں ڈالا تھا وہاں سے فرار ہونے میں تم کیسے کامیاب ہو گئے اور ارباب سے کیسے چا گرا تم؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بدستور اسے اپنی جگہ کھڑی تھوڑی سی۔ میرا کچھ بولنے کو ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ باجوسی و گھنگلی کی آخری حیل ہو یا ظلم و غصے کی اعتلا۔ عمارتوں و صورتوں میں انسان کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ جاتی ہے لیکن میں نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں باجوسی و گھنگلی کی آخری حیل پر غصے یا ظلم و غصے کی انتہا پر۔ شاید اس فکر سے وقت میں بے درپے اسے حد مول سے میرے حواس کو جو دھچکے پہنچے تھے انہوں نے مجھے سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

نواب نے چہ لہے تک میری طرف شکر نگاہوں سے دیکھا، لیکن جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو کندھے اچکا کر بولا۔ "بھلا۔۔۔ نہیں جانتا چاہتیں تو نہ سہی۔ ہمیں بھی گزری باتوں سے اب کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔"

باتوں کی گواہ تہذیبی غلطی میں تھا، ہو رہی تھی اور تم نے میرے ہاتھ پر کسسا شروع کر دیا تھا۔ جنہیں اٹھائے دپے بھی میرا ہاتھ ٹھٹھل ہونے لگا تھا۔ دفعتاً تم نے آنکھیں کھول دیں اور مصمم سی جڑائی کے ساتھ چادروں طرف دیکھا۔ اجنبی ماحول اور اجنبی صورتیں دیکھ کر تم روکنے لگے۔ میں نے جنہیں گھٹکوں پر کھڑا کر دیا اور محفلوں کے بل

تمہارے قریب بیٹھ کر جنہیں چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس لئے ایک بار پھر میری نصیر بیگم پر چڑی۔

"عبداللہ بھی تمہارے ساتھ ہی بک گیا تھا کیا؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں اس بے چارے کو کچھ بھی نہیں معلوم۔" نصیر بیگم نے مسکرا کر جواب دیا
کہا میں نے اس کا مزاج پوچھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اگر وہ کچھ بھی کیا تو میری ہڈی کو لے کر یہاں میں پہنچ سکے
تھے۔" میرے مہرچہ میں ایک اور نہیں اٹھی۔

"نہیں! اسے اس جگہ کا قصہ" ظلم نہیں۔ اسے تو میں نے محض تھوڑی سی مدت بعد
کیسے ساتھ لے لیا تھا۔ راستے ہی میں اسے میں نے ٹرغا دیا تھا۔" نصیر بیگم نے احمقائی
سے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر شرمیلی، غجالت یا تفس کی ہلکی سی رفتی تک نہیں تھی۔ ارباب
سے ایک مدت کی دوستی اور اعتدالیوں بے رحمی سے ہوس کی قربان جگہ پر ہیٹ چڑھاتے
ہونے اسے شاید ذرا بھی ہلکا سا محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ارباب کا لیا اس دنیا میں نہیں تھا
اور مرے ہوش کے بارے میں اچھا ہی سوچتا چاہئے۔ خصوصاً جبکہ وہ آپ کی زندگی کا
مائل رہے ہوں۔ لیکن مجھے ارباب پر سخت خصر آ رہا تھا۔ اس شخص نصیر بیگم سے اس کا
دن رات کا ساتھ تھا۔ کیا اسے کبھی شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ اس شخص میں نصیر نام کی کوئی
چیز موجود نہیں ہے؟ اگر ارباب اتنا ہی موم یا شمس تھا تو پھر اس کا انجام کیا ہو سکتا تھا۔

"تم نے مجھے یہاں کیوں بلوایا تھا؟" میں نے نواب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی کر
پوچھا۔ تم نے اب باقاعدہ دونا شروع کر دیا تھا اور میری تمام تر کوشش کے باوجود تم چپ
نہیں ہو رہے تھے۔

"نہا دیں گے۔۔۔ تا دیں گے۔ پہلے اس مدنی صحبت کو تو چپ کراؤ۔" نواب
نے تمہاری طرف اشارہ کیا۔

دفعتاً لمبا ٹٹکا سیاہ لہم ہٹ آگے آیا اور تمہاری طرف دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے
بولا۔ "لہذا اسے میں باہر پھینکا دیتا۔"

تم اس کی ذرا فانی صورت دیکھ کر اور بھی ندر ندر سے مرنے لگے۔ ساتھ ہی تم نے
اپنے تنھے سے ہاتھ سے اس کے بڑے بڑے ہاتھ پرے ہٹانے کی کوشش کی اور مجھ سے
ہٹ مینے۔ جاٹ نے اپنے ہماری جوتے سے تمہاری منھنی منھنی ٹانگوں پر ہلکی سی ضرب
لگائی ضرب تو ہلکی تھی، مگر تم ایک ننھے سے بچے کیلئے تو ناقابل برداشت ہی تھی۔ تم ہلکا
اٹھے اور ہی طرح مجھ سے ہٹ گئے۔

اب تک مجھ پر جو جسمانی اور روحانی آفتیں گزر چکی تھیں۔ ان کا حل میں کبھی ہی

بجلی ہوں لیکن بھی تکلیف مجھے تسمیری اس پٹلی سے ضرب کے پڑنے اور تسمارے بلبل کر دینے سے پہلی تھی اتنی اب تک کسی بھی فلم اور تھوڑے سے نہیں پہلی تھی۔

میرے سینے میں پھٹا آتش لاشاں گویا پھٹ پڑا۔ میں نے حمیس ایک طرف ہٹا دیا اور اس سیاہ قابہ دندے پر بیٹھ پڑی نہ جلتے مجھ میں اتنی ہمت کہیں سے آگئی تھی کہ دونوں ہاتھ ہونڈ کر جب میں نے اس کے چہرے پر ضرب لگائی تو وہ ڈکرا کر پیچھے کو ٹوکڑیا۔ ساتھ ہی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چبا ڈالا۔ اس کے حلق سے فراہت تراخ سی گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے سنبھل کر میرے پیٹ میں گھونسا رسید کیا۔ مجھے یہی محسوس ہوا جیسے لوہے کا بڑا سا ہتھوڑا میرے پیٹ پر پڑا ہو۔ آنتیں یک لخت گویا ایک ہی نقطے پر مسد کر رہ گئیں اور میں پکرا کر تھلین ہا ڈھیر ہو گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے پھیلتا اندھیرا تو دوسرے ہی لمحے غائب ہو گیا تھا۔ لیکن کوشش کے باوجود میں اندھ کر نہیں بیٹھ سکی۔

"ایسے اور ہاتھ مار!" میں نے لواب کی کواڑ سن کر اس کی طرف دیکھا۔ بظاہر اس نے بڑی سنجیدگی سے ڈالنے کے سے انداز میں جاٹ کو مخاطب کیا لیکن اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے مسکراہٹ پھوٹی پڑ رہی تھی۔ "ہے ان کو مت مار مجھے معلوم نہیں یہ نیچے میاں ایک بہت بڑی تنظیم وائٹ انجلس کے سربراہ کے صاحب زادے ہیں۔۔۔ اور یہ ان مرحوم سربراہ کی بیوی ہیں۔ کچھ تو ان کا احترام کر۔"

اس کے لہجے میں پیچھے ہونے طنز کی کاٹ پر میں ٹپنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ تم دوتے ہوئے میرے قریب آ بیٹھے تھے۔ بمشکل تمام میں ایک کہنی کے بل انھی اور حمیس سینے سے پٹنے کی کوشش کرنے لگی۔

دلچسپ" میں نے ان عورت کو اپنی طرف پھرتے دیکھا جو اب تک نہایت لاشعلی سے ایک طرف کو بیٹھی تھی۔ قریب آ کر اس نے حمیس گود میں اٹھایا اور والمان انداز میں چوسنے اور پکارتے لگی۔ پھر اس نے جبکہ کر میری طرف دیکھا اس کا چہواپ بھی اتنی سا ساٹ ہی تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ہڈیوں کی فراہت اور آنسوؤں کا ظہار سا اثر کیا تھا۔

"میں اسے ایک دوسرے کمرے میں لے جا رہی ہوں۔" اس نے نہایت ہی نرم اور مدغم کواڑ سن کر کہا جسے شاید میں ہی سن سکی تھی۔ "مطمئن رہنا۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔" اس کے لہجے میں صداقت کی خوشبو تھی۔ میرے دل کو قدرے اطمینان سا محسوس ہوا۔ وہ حمیس ہمسائی پکارتی کمرے سے لے گئی اور چند لمحوں بعد بالائے تسمارے رونے کی آواز معدوم ہو گئی۔

"لے آؤ کن سکے!" لواب نے دوبارہ سیاہ قابہ جات کو مخاطب کیا اور تب میں نے دھیمان سے دیکھا اس دزد دار کا دیول کان والوں آدھے سے زیادہ کٹا ہوا تھا۔ وہ لواب کی

طرف دیکھ کر مسکرایا تو لواب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہے! مرحوم و محترم سربراہ کی بیوی کو کرسی ٹوٹ کر۔۔۔ کوئی میزبانی کا طریقہ تو نہیں۔"

اس طریت زادے نے دونوں ہاتھ بالوں میں دے کر مجھے اٹھایا اور ایک کرسی پر قریب لٹکا دیا۔ میری لقمہ نصیر بیگ پر چڑی جو کمرے کے وسط میں آچکا تھا۔ "لواب صاحبہ!" اس نے مٹھانہ لہجے میں کہا۔ "اب میرا باقی حساب بھی صاف کر دیجئے مجھے ملک سے باہر جانے کا اہتمام بھی کرنا ہے۔"

"نہیں نہیں بھئی۔" لواب نے احتمالی شفقت سے کہا۔ "تم نے اپنا کام نہایت عمدگی سے کیا اور عظیم مرحوم سربراہ کی بیوی کو شہ یک نہیں ہونے دیا کہ اسے کہاں لے جایا جائے۔" پھر تو تسمارہ کٹا ہوا بیٹھ پڑی ہے۔"

"دولاکہ۔" نصیر نے جبکہ کر لہجہ فاکساری سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"رگم لائی جائے۔" لواب نے کن کٹے سیاہ قابہ کو اشارہ کیا۔ وہ احتیاطاً جھکا اور دروازے کی طرف بڑھل۔ اس کا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے گھوا اور نصیر بیگ کی کچلی پر پڑا۔ وہ اچھل کر دور چلا گیا۔ اس کی ٹیک نہ جلتے کہیں غائب ہو گئی۔ میرے اندازے کے مطابق اس ضرب سے اس کو کئی دن تک کے لئے بے ہوش ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر اس وقت بھی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ اندھے منہ کرتے ہی ناقص چھین پھرتی سے اندھ کھڑا ہوا اور جب وہ پلٹا تو اس کے ہاتھ میں دو دھاری چمکیا مٹھرا تھا۔ جسے اس نے لوک کی طرف سے اگوتھے اور اٹلی کے درمیان سے پکڑا ہوا تھا۔

"میری طرف مت پھرتا۔" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے اور ایک تک کن کٹے کو گھورتے ہوئے سانپ کی طرح پھٹکرا۔

دلچسپ" نصیر بیگ کے ہاتھوں نے عجیب و غریب انداز میں جھکا کھنڈ اور اس کے ساتھ ہی میں نے خبر اس رفتار سے اس کے ہاتھ سے کل کر کن کٹے کی طرف پھرتے ہوئے دیکھا کہ ایک لمحے کیلئے وہ بس لمبی سی تانیلی لکیری طرح دکھائی دیا۔ کن کٹے نے آپ بار بھی پک نہیں چھین سکی۔ وہ صرف معمولی سا ظم کٹا کر پھرتی لپک سے لڑوہ پھرتی کے ساتھ ایک طرف کو ہوا اور پھر اس کے قریب سے گزر کر پیچھے دیوار سے جا گرایا۔ اس کی لوک سے پستردیوار سے پھرتی گئی۔ نصیر بیگ اب آپ کوٹے میں پھس چکا تھا۔ بیگ کے بغیر اس کی آنکھیں کچھ بھی بڑی بڑی اور ابھری ہوئی سی لگ رہی تھیں۔

"اسے دو کو لواب شرافت ملی۔" نصیر بیگ چلاؤ۔ اس کی نظریں بدستور کن کٹے پر لگی ہوئی تھیں۔ گو کہ مخاطب اس نے لواب کو کیا تھا۔

"ہم ابھی عزم کو جتا رہے تھے ہیں!" لواب کی نہایت پر سکون آواز ابھری میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ لب بھی اس طرح کرسی پر نیم دراز تھا۔ "مگر اب ہم ہر کام نہایت

لحظے مل سے سوچ سمجھ کر کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور اب ہم اپنی کارروائیاں کوئی ثبوت نہیں پہنچاتے۔ تو جہاں شرارت! ہم جنہیں یقینی ایک چلتے پھرتے ثبوت کو کر طرح پہنچا سکتے ہیں۔ خود ہی انصاف کرو اور دیکھو۔ اسی؟ تم نے اپنے اس دوست کو اس نہیں بلٹا جس کے گھر کا تم نے تنگ کیا تھا اور جس نے تم پر اٹھو کرتے ہوئے گویا اپنے دے دگ تمہارے ہاتھ میں وہ رکھی تھی تو ہم کونسا تمہارے دل چاہتے ہیں جو کل کو تمہیں بخش دے؟

یعنی اسی لئے نصیر بیگ نے ہوا میں قلہاڑی کھا کر کن کچے کے سینے پر فلائنگ گلی داری کر کے فلائنگ گلی گویا ایک سیڑھی چلنے پر پڑی تھی۔ جو دھیرے دھیرے آگے کو کھینچی رہی تھی۔ نصیر بیگ جب سنبھل کر اٹھ تو اسے سیدھا ہونے کی سہلت نہیں ملی۔ کن کے لئے اس کی کھوپڑی پر ٹھوٹا رسید کیا تو نصیر کی ٹانگیں مٹی انداز میں مڑ گئیں اور وہ سرے ہی لئے وہ ٹھنوں کے بل کھڑا اور دھڑک دھڑک کر جھولنے لگا۔

اس سے پہلے کہ وہ قلعین پر دھیر ہو آ کن کے لئے نہایت پھرتی سے اپنے لہان کے کسی حصے سے ریشم کی تختی چلی مگر انتہائی مضبوط ڈوری کا ایک ٹکڑا نکلا اور نصیر بیگ کی گردن میں پھنسا ڈال کر اسے ایک جھکے سے دوبارہ اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ چندی لمحوں بعد ڈوری کا پھنسا اتنا سخت ہو گیا کہ وہ گردن کی کھال اور عضلات میں دھنسن کر تقریباً قائب ہو گئی۔

○

نصیر بیگ کی نہ صرف گردن کی رگیں طرف ٹاک مد تک پھیل گئیں بلکہ اس کی جوشانی پر بھی رگیں ابھر آئیں۔ انہیں اٹل چہرہ۔ وہ صرف ایک لمحے کیلئے لڑھی پر غصے کی طرح پھڑکا پھر اس کے بازو اچھے ہو کر اس کے ہاتھ میں جھول گئے اور سر بھی ایک طرف کو اٹھ گیا۔

کن کے لئے نہایت آہستگی سے اسے قلعین پر لٹا دیا اور ڈوری اس کی گردن ہی میں بوسہ چھوڑ کر دوبارہ انداز میں لوہے کی کڑی کے قریب چوں آکھڑا ہوا گویا مسدود در سے نیلی ہی کھڑا تھا اور اس نے اپنی جگہ سے جھٹک نہ کی تھی۔

”برکت بیگ کو یاد۔“ لوہے نے اسے حکم دیا۔ وہ دروازے تک گیا اور ایک پٹ خوردا سا کھول کر باہر جھانک کر دھبی آواز میں کچھ کہا اور واپس آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے وقتاً فوقتاً دروازہ کھول کر اندر کیا جسے میں نے دروازے کے قریب سٹول پر بیٹھے دیکھا تھا۔ راتقل لب اس نے کندھے سے نظارہ کی تھی۔

”برکت! یہ دل پارسل کرنا ہے۔“ لوہے نے نصیر بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے اپنے ہی گھر کے اندر نہیں ہے۔ آثار ایسے ہی نظر آتے جاتے ہیں جیسے تھیم کے کسی رکن کو ملے ہو گیا تھا کہ جبری اس نے کی ہے اور اسی رکن نے اسے لٹکائے گا دیا۔ سمجھ گئے؟“

برکت بیگ نے انتہت میں سر ہلایا اور لاش کندھے پر اٹھا کر لیے لیے ڈگ بھرتا کرے سے باہر چلا گیا۔

”کام چل رہا ہے۔“ لوہے نے میری طرف حوجہ ہو کر سمجھانے والے انداز میں بولا۔ صبر و سکون اور صفائی سے۔ ارہاب جیسے جذباتی اور جاتی آنکھوں نے خواب دیکھنے والوں کا اجماع بھی اچھا نہیں ہوتا۔ خصوصاً جبکہ وہ بڑے بڑے معاملوں میں ہاتھ ڈالنے لگتے۔

اپنی دانشمندی میں وہ میری مدد کو چر کے لٹکائے کیسے ایسی باتیں کر رہا تھا لیکن یہ اس کی آخری بات تھی یا کل گج محسوس ہوئی۔ جو کلام ارہاب تھیں گوپیوں کا گردن کا کر نہیں سکا تھا اسے وہ اکیلا کر سکا تھا بشرطیکہ وہ صبر و سکون سے کلم لیا اور جتنی توانائی اس نے نہیں آدمیوں کی تربیت دینے میں صرف کی تھی اتنی توانائی صرف اپنے آپ کو تربیت دینے

میں صرف کرتا۔

زندگی کے اہم ترین معاملات میں کامیابی انہی کو ملتی ہے جو ان معاملات میں صرف اپنی ہی ذات کو مشیر اپنا شریک کار اور اپنا محافظ بناتے ہیں۔ اشاروں پر چلتے والے دھڑلے نظام صرف انہی کو بھرتے ہیں جو لواب شرافت کی طرح پشت در پشت حکمرانی کرتے آئے ہوں اور زمین کے نیچے میں جن کی جڑیں بہت گہری ہوں۔ جن کے پاس ہر طرح کے انسانوں کو غصے نے کیلئے بے اندازہ دولت ہو۔ یہ باتیں صحیح طور پر دیکھ کر شاید ایک کونہ گھٹنے ہی میں سمجھ سکیں۔

”میں یہ جانتا چاہتی ہوں کہ تم مجھ پر اب کون سا نیا ستم ڈھاندا چاہتے ہو؟“ میں نے دہریلے لہجے میں پوچھا۔

”اب۔۔۔“ لواب نے آنکھیں میچ کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ”اب تو تمہارا انداز گفتگو اور طور طریقہ واقعی بہت بدل گئے ہیں۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے تم ایک نرم و نازک، شرمیلی اور ڈرپوک گھڑیا سی ہوا کرتی تھیں۔ تمہوڑے ہی عرصے میں تمہارے اندر بہت تبدیلی آگئی ہے۔“

”میں نے ہمیں اپنی ذات کی تبدیلیاں پر تبصرا کرتے کیلئے نہیں کہا تھا۔ پوچھ رہا تھا“ میں نے نفرت سے کہا۔ ”میں نے کچھ پوچھا تھا۔“

”ہائے ہائے۔“ لواب نے مستطرد انداز میں سر ہلایا۔ ”تجربات و عوارض نے تم میں کتنی قوت برداشت پیدا کر دی ہے۔ پہلے ہم ایسے انداز خطاب پر لوگوں کی لڑائیں کھینچا دیا کرتے تھے۔ چہ چہ۔۔۔ دیکھتے تم اگر ہمیں صرف رعب کہہ دو تو زیادہ مناسب ہو گا۔ پورے ہم ابھی نہیں ہوئے۔ دیکھ کے دیکھ لیں۔ جیسا تم دیکھ چکی ہو“ باقی جہاں تک تمہارے سوال کا تعلق ہے تو بے فکر رہو، تم پر کوئی قسم و قسم نہیں ٹوٹے گا۔ پہلے بھی ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا وہ تمہاری سرکشی اور ناشکرے پن کی وجہ سے ہوا اور اب جو کچھ ہوا وہ محض ابواب کی وجہ سے ہوا ہے۔ تم تو صرف اس کی لہری ہونے کی وجہ سے لپیٹ میں آئی ہو اگر کسی اور حیثیت سے لی ہوئیں تو شاید ہم باہمی کی تمام نزاکتوں کے باوجود ہمیں معاف کر دیتے۔ اب بھی ہم تمہارے ساتھ کوئی ظلم نہیں کریں گے۔ بس تمہاری فہم پر ہم نے ایک ہموار سا سورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے آثار نے آج رات آنا تھا، مگر کچھ دیر پہلے اس کا پیغام آیا تھا کہ وہ اب ہمیں آنے کا صحیح آئے گا۔“ وہ بھی خالم ہمارے ہی ہائے کا تاج ہے۔“

”نیک ہے لواب شرافت علی!“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”یہ تمہارا وقت ہے جو جی چاہے کہہ لو کہ جی چاہے کہو“ اگر آج تم دوبارہ میرے لپٹن پر بجلی بن کر نہ ٹوٹے ہوتے تو شاید میں بھی تمہیں معاف کر دیتی۔ رات رات وہ لڑتیں فراموش کر دیتی جو تم نے

میں مجھے پہچانی تھیں۔ میں اپنا اور تمہارا معاملہ لدا پر پھوڑ دیتی ہوں لیکن اب میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گی“ کیونکہ اس وقت شاید تم نے مجھے اس طرح بھاد نہیں کیا تھا جس طرح اب اجاڑا ہے۔ تمہاری یہ کلمہ مسکراہٹ ایک گھڑی کی طرح میرے دل پر نقش ہے اور آج میں حد کر رہی ہوں کہ اگر زندگی نے مجھے سلسلے دی تو تم دیکھو گے اور یہ دیتا بھی کہ حوریت اگر نظام لینے پر اتر آئے تو ایسی مثالیں پھوڑ جاتی ہے جنہیں مدیوں نہ دہرایا جاتا ہے۔“

”تھڑا۔۔۔“ لواب کہہ رہا تھا۔ ”نی اللہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تم آج رات آرام کرو، صبح ہو کچھ ہو گا تمہارے سامنے آ جائے گا۔“

”تمہیں اپنی لامنت سے باتیں کرتے دیکھ کر واقعی چین نہیں آ رہا ہے کہ تم وہی لواب شرافت علی ہو۔“ میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”بالکل اسی طرح جیسے ہمیں چین نہیں آ رہا ہے کہ تم وہی عرصہ ہو۔“ اس نے لڑکھا۔ ”در اصل وقت کے ساتھ ساتھ ہر انسان میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ کسی میں میزری سے اور کسی میں آگاہی سے۔ ہم نے گزشتہ تین سال سے دوسرے تجربات کے ساتھ ایک تجربہ یہ بھی حاصل کیا ہے کہ انسان جس چیز کو دولت کے غی پر حاصل نہ کر سکے، مکاری سے نہ جیت سکے اور طاقت سے بھی حاصل نہ کر سکے اس کا خیال دل سے نکال دینا ہوتا ہے۔ اس سے بالکل ناقص ہو جاتا چاہئے۔ ورنہ انسان کیلئے بے شمار مشکلات اٹھ کر پڑتی ہیں۔“

”مجھے تمہیں بہت بخیر سے ہوا ہے کالے لکڑو! میں نے دل ہی دل میں سوچا“ جبکہ وہ نہ اپنے لئے نہ غمت مسیحتوں کے بیچ بولے ہیں۔ آج نہ کسی کل نہ کسی پر سوا ہر حال وہ وقت ضرور آئے گا جب میرے بولے ہوئے ٹھہرے سے میرے لئے مصائب کا ایک جگمگ آئے گا اور تو اس میں بھگ بھگ کر جہت کی موت مر جائے گا۔“

”جھاڑ۔۔۔“ اب کونے کے کمرے میں جا کر کچھ کھانی لو۔ اس کے بعد ظہر ہمیں اندر آ کر دیکھا دے گی اور خدا را! کوئی ایسی سیدھی حرکت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ برا یہاں کا عملہ کچھ زیادہ ہی مسخ ہے۔ آدمی کی گردن پہلے توڑنا ہے“ اجازت بعد میں قہر کرتا ہے۔“ لواب نے بڑے سرسری لہجے میں کہا اور کن کٹے کو اشارہ کیا۔ وہ میری دہریلی کیلئے آگے بڑھا۔

”میرا کچھ کہنا ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”اسے بھی تمہارے پاس پہنچا دینا جائے گا۔“ لواب نے جواب دیا۔

”مگر تم انہی ہی نرم غلی کا اظہار کرنے پر تلے ہوئے ہو تو میں تمہیں بتا دوں کہ کون سی راستے میں مجھ سے گھڑ گئی ہے۔۔۔“ میں نے اسے سارا واقعہ بتایا اور آخر میں

اس سے کہا۔ ”مجھے اپنی بیوی دانیس چاہیے۔“

”میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔“ نواب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر وہ دانیس کو صرف اپنی ہی زندگی پر نہیں کو ہاتھ آگئی تو تمہیں مل جائے گی۔“ اگر وہ اپنی سمیت فرار ہوئے میں کامیاب ہو گیا تو پھر میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرا قیام ویسے بھی بمبئی میں لگایا ہی نہیں ہے۔ چند دن کیسے میں ریاست واپس جاؤں گا اور اس کے بعد شاید طالع اور تبدیلی سب دھوا کی غرض سے کچھ عرصے کیلئے لندن چلا جاؤں۔ ہر حال تم خاطر مخرج رکھو۔“

میں کن کن کے کی رہنمائی میں ایک شاندار اور انگ بل میں بیٹھی۔ مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر کن کتا واپس چلا گیا۔ لیکن وہ بڑی لاشعری سے ایک کرسی پر بیٹھا تھا لی رہا تھا اور اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ نہ تو وہ گردوغبار سے ہی لاشعری سے اور نہ ہی نشتا۔ چند لمحوں بعد ایک مائل سی لڑکی بھانسلوں والا پھولا پھولا سا سکرٹ پہنے ہوئی ٹیبل کی بجائے کھڑکی بل میں آئی۔

”کیا کھانا پیو فرمائیں گی؟“ میرے قریب پہنچ کر اس نے سوہانہ انداز میں ایک بار سر جھکانے کے بعد سیدھی کھڑے ہونے پر چھا۔

”نواب شرافت ہی کا کیوبہ بنے۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ تو اس وقت اشیائے طومر دلوں کے اخیرے میں موجود نہیں ہے۔ آپ کسی چیز کا حکم فرمائیے۔“ اس نے اس قدر سنجیدگی سے کہا کہ میں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

”تو پھر کوئی بھی ایسی چیز لے لو جسے ایک ایسا انسان کھا سکتے جس کا کھانا کچھ کھانے کو دل نہ چاہ رہا ہو۔“ میں نے کہا۔

لڑکی چند لمحوں جھکائے پر خیال انداز میں ٹھوڑی کھوڑی رہی۔ پھر چکی بھا کر کھٹ کھٹ کرتی پادری قلعے کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ آہستہ آہستہ ایک چھوٹی سی ترے اٹھنے لگنے سے نکل۔ اس نے چتیلوں اور مصالحوں کی کچی پھولی پھولی چالیاں لٹکائیں اور چھری کھانے میرے سامنے سجایا۔ اور پچ میں ایک پلیٹ رکھ دی جس میں کھجور کا جمل کے سرخ سرخ کباب سجے ہوئے تھے جن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ان کی طو شیروانی قدر اشتہا انگیز تھی کہ میں جو ان حالات میں سامنے دہر کے کھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی ہے ساختہ چھوٹے چھوٹے پر بھجور ہو گئی۔

میں نے پیٹ نکالی کر دی تو لڑکی نے پوچھا کہ میں مزید کھانا تو پھر نہیں کروں گی۔ میں نے نگیں میں جواب دیا۔ وہ گرم پانی میں بھیجا ہوا تلیے لے کر نکلی اور میرے ہاتھ اور ہونٹ پر پھینکے گئی۔ کیونکہ میں نے کباب ہاتھوں ہی سے کھائے تھے۔ پھر لڑکی نے چائے کا کافی تینے پر چھا۔ میں نے اس سے بھی انکار کر دیا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آئیے! میں آپ کو آپ کے کمرے میں پہنچا دوں۔“ وہ مجھے راستہ دکھاتے ہوئے

ہلا۔

میں راجدھانی میں آئی تو محبت سے ایک سرواڑہ اور پادگار کی عورت ایک خوبصورت سی بچہ گاڑی کو دھکیلتی نظر آئی۔ اس نے ہاتھوں کا لونچا جوڑا ہوا رکھا تھا اور لہجے میں لیت سا لہجہ بھلائی شاگل سے ہانسی ہوئی تھی۔ وہ کسی امیر گھرانے کی معزز خاتون نظر آئی۔ غرض کہ جب وہ قریب آئی تو میں نے اسے پہچانا۔ یہ وہی تھی جسے میں نے نواب کے پاؤں کو دھو کر رکھے اس کے ہاتھوں تراشتے دیکھا تھا۔ بچہ گاڑی میں تم گھڑیوں سے ٹپک گائے روتے سے روتے ہوئے تھے۔ تمہارے اوپر مجھے کھوئے کھوئے ہوئے تھے۔ ایک بھلو تو ہاتھ میں بھی تمہاری بیٹی میں رہا تھا۔

قریب آ کر اس عورت نے بچہ گاڑی میرے ہاتھ میں تھام دی۔ میں نے ”کھنگھنے“ کے طور پر پوچھا۔ ”آپ اسی گھر میں رہتی ہیں؟“ اس کے چہرے پر بھی کھسک بیدارگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس نے گویا میری کواڑ سنی ہی نہیں تھی۔

”شب بخیر۔“ اس نے سرگوشی لیا لیجے میں کہا اور واپسی کیلئے سڑکی۔ سکرٹ والی لڑکی آگے میرے انظار میں کھڑی تھی اور سڑ سڑ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں بچہ گاڑی کو دھکیلتی اس کے پیچھے چلی دی۔ وہ مجھے جس کمرے میں لے گئی وہاں وہ تیس برسوں مسیحاں بھیجی ہوئی تھیں۔ آئینہ طرف سیاہ نکلی کی خوبصورت سنگھار میز رکھی تھی۔ فرنیچر جس کی تھا لیکن وسیع کمرہ اپنی تمام تر سادگی کے باوجود دکھائی گھرے سبز رنگ کے پتھر کاٹن لود لیسے ہی رنگ کے ہارکے چھری پر پھل کی وجہ سے بہت بھلا اور پر سکون سا رہا تھا۔

آپ کے سولے سو گے پورے پورے سفید بنی گے ہوا ہے۔“ لڑکی نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے دیا دیجئے گا۔“

اس کے چلنے کے بعد میں نے دروازہ بند کر کے ہالٹ چڑھایا۔ میں بچہ گاڑی سے نکلی کر بستر پر لیٹا اور خود بھی تمہارے قریب لیٹ گئی۔ جی بھانے کی میری ہمت نہیں چاہتی تھی حالانکہ فی اوقت میرے ساتھ معزز مسالوں ہی کا سا برتنہ ہو رہا تھا۔ اس برتنہ کی آہ بھی میری جگہ سے باہر تھی۔

بستر پر لیٹ کر مجھے قدرے سکون کا احساس ہوا اور میں نے شام سے لکھراپ تک سناؤں گاتوں پر سے سرے سے غور کرنا شروع کیا۔ سویم سے جدائی اور ادیب کے دردناک قصور سے میرا کلیجہ حق ہونے لگا۔ دلتا میرے شعور کے کسی گوشے سے گزرتی ابھری۔ ادیب کی موت کی خبر ابھی تک تو گھس ایک سنی سنائی بات ہے۔ تم نے اگر یہ اتنی جلدی کھلا چھین کر لیا؟ خیر یک جیسے غدار کا کیا بھروسہ۔ شاید اس نے بھوت

سے اجڑھن کر کے پچھتے ہیں کہ رات کو بھر تو ابھی آئی۔ میں اسے ہٹا نہیں پا رہی تھی کہ میرے شعور کے کسی گوشے میں امید کی کرن بقی ہے کہ ارباب ابھی مرا نہیں لوہا اسی امید کے سارے میں گزشتہ رات سو گئی تھی۔

میں نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس خیال سے کہ کہیں غیر ارادی طور پر میں پلٹ اٹھا کر اس کے منہ پر نہ کھینچتا ہوں میں نے نظریں جھکا لیں۔ حالات کو اپنے حق میں بد سے بدتر بنانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"کیسے یہ ہو گئی؟" میں نے کہا "اچانک عورت نے لوہا سے پوچھا اس کے لیے میں نہیں ہوتی تشویش پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے یہ سوال اس طرح مضطرب انداز میں کیا تھا گویا میرا گری ہونا اس کیلئے کسی نقصان کا باعث بن سکتا ہو۔"

"میرے نہیں گھر جان؟" لوہا نے بے ہنگم قہقہہ لگایا اس کے منہ میں تو پوری ہنسنے کی زبان ہے لیکن شاید یہ لفظوں کی کفایت شعاری کر رہی ہے۔ حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ "جیسے تو میں نے سب کچھ ہی بتا دیا ہے۔" پھر اس نے ایک لمبے کیلئے خاموش ہو کر عورت کو گھورا۔ "لیکن تمہیں یہ سوال پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا تمہیں اندازہ نہیں؟"

"انتہا ہے جسے تو کئی ہوں درد صرف ہتھوڑی کا پیغام بھجوا رہی۔" عورت نے کہا اور سرگرمی سے اس کے منہ میں صبر کر لوہا کی طرف دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں میں آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر وہ میری طرف دیکھے ابھر رہے تھے۔ وہ رخصت ہو گئے گویا میں اب وہاں موجود ہی نہیں تھی۔ وہاں میں قہقہے ہو چکی تھی۔

وہی لڑکی جس نے مجھے ناشتہ دیا تھا میرے قہقہے تلے لوہا سوچتا ہوا انداز میں بولی۔ "اگر آپ کو مزہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے۔"

میں نے ٹہنی میں سر ہلایا اور دوستانہ لہجے میں پوچھا۔ "یہ عورت کون تھی؟" لڑکی نے خالی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر سبقت لیا تو انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں کیا بتا سکتی ہوں میڈم! میرا کام مہمانوں کے آرام اور طعام کا خیال رکھنا ہے ان کے بارے میں معلومات رکھنا نہیں۔"

"تمہیں اپنے بارے میں بھی معلوم ہے یا نہیں؟" میں نے ہل کر پوچھا۔ "مختار ہے کہ تم کون ہو؟ کس کی اولاد ہو؟ انسان ہی کی؟ یا کسی اور کی؟"

"میں لہ غری وار اپنے باپ کو اس وقت دیکھا تھا جب میری عمر پانچ سال تھی۔" لڑکی نے اچھائی سچائی سے غرضی فیروزہ بولی لہجے میں کہا۔ "وہ شراب کے نشے میں میری من کو کپڑے دھونے والی موگر کی سے بھٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ مجھے عجیب طور پر یاد نہیں

لیکن پھر مجھے یاد آتا کہ لوہا نے بھی مجھے "میرے" کے نام سے مخاطب کیا تھا اور کم از کم آج لوہا مجھے بھوت کے موڈ میں نہیں دکھائی دے رہا تھا لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ اسے بھی غلطی اطلاع ملی ہو۔ اس احساس سے مجھے کچھ دھارس سی ہنسی دھیرے دھیرے میرے آنسو غم گئے اور پانا کر مجھے نیند بھی آئی۔

صبح ناشتے کی میز پر میرا لوہا سے سامنا ہوا۔ اس وقت اس کے برابر والی کرسی پر ایک اور عورت پر اجماع تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ نہ جانے کیوں مجھے عجیب سی لگی۔ وہ عمر کی اس عورت پر تھی جہاں جہاں اسے اللہ عزوجل نے دی تھی مگر یوں لگتا تھا کہ وہ دور تک جوتی کا پچھا کرنا چاہتی ہے۔ اس نے نہایت گہرا اور آنکھوں کو چپنے والا ایک اپ کیا ہوا تھا۔ ہاتھ کے جوڑے پر قیمتی موتیوں کی ٹوپی لیٹ رکھی تھی۔ شمع رنگوں کی بھاری ساڑھی نے اس کے لمبی جسم کو نہایت مہرگی سے سنبھال رکھا تھا۔ اس کے کانوں میں میرے کے آریزے تھے۔ وہ کرسی کے پیچھے سے ٹھیک لگائے ایک لمبے سے سفید ہولڈر میں سرسٹ پھنسائے دھیرے دھیرے کش لے رہی تھی۔ وہ ہم بار آنکھوں سے یوں ایک سے دوسری چیز کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے دنیا اس کی نظروں میں بالکل اظلال ہو۔

ایک لمبے کیلئے مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ لوہا کی "کچے اور کچاٹ" نہ ہو۔ میں نے لوہا کے اثرات سے لپٹ کے ہاتھ تعلق کے بارے میں کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن لوہا کے چہرے پر سرے سے کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ سر جھکائے دنیا جہاں سے لاٹھ کے ساتھ جھٹک رہی تھی مصروف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں جب ڈانٹک ہل رہی تھی داخل ہوئی تو اس نے سر تپ میرا جان لیا تھا اور جب میں نے جھٹک شروع کیا تب بھی وہ بدستور مہرگی نظروں سے میری ہی طرف دیکھتی رہی۔ میں نے اس کی طرف نظر اٹھائی تو فوراً کسی اور چیز کو دیکھنے لگی۔

میں جیسے دوہہ چلا کر لائی تھی لیکن ناشتے کی میز پر میں نے اپنے گھر کے مہمان کے مطابق جیسے مختلف چیزوں کے چند چھوٹے چھوٹے لوہوں اور ہاتھوں کی کچھ کاشیا کھانے کی کوشش کرنے لگی۔ عورت میرے اس عمل کو بھی بغور دیکھ رہی تھی۔

لوہا نے ناشتہ یوں ختم کیا گویا دنیا کا سب سے ضروری کام ہی تھا پھر اس نے ایک طویل ڈکار لے کر چنگے کے ہونچے سے سفید تھکن سے اٹھ کر لے چسے سیاہ ہونچے پوچھتے ہوئے کرسی کے پیچھے سے ٹھیک لگا کر میری طرف دیکھا پھر لیکن ایک طرف دیکھ کر خواہ خواہ دانت ٹکاتے ہوئے بوز۔ "جیسے یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ رات ابھی آئی؟"

واقعی اس دھڑلے پر تو جیسے مثالی حیثیت بھی کبھی کہا ہی پڑا ہوتا ہے شرافت کا میں نے دل ہی دل میں سوچا جو ایک عورت کا ساگ اٹھا کر اس کی زندگی کو ہر لمحہ

وہ اب بھی اپنی لاشعلی سے سر جھکائے گویا اپنی رول جمل رہا تھا، لیکن مجھے معلوم تھا کہ ان دانت کی جیب میں رو اور کا دست جھانکن دکھائی دینے کا مطلب یہی تھا کہ میں تم کو خوش نہ کروں۔

برآمدے کی میزوں کے قریب پرچ میں ایک سیاہ کار کھڑی تھی۔ لڑکی نے بڑے دم سے جھک کر مجھے کار کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میں بیڑیاں اتر کر نیچے چلی تو پھر نے کار سے اتر کر میرے لئے پچھلا دروازہ کھولا اور تب میں نے دیکھا کہ کچھل ات پر وہی عورت گھر جان موجود تھی۔ جسے میں ٹشٹے کی میز پر دیکھ چکی تھی۔

میں کار کے قریب چلی تو گھر جان نے اندر بیٹھے ہی بیٹھے ہالہ پھیلانے لگاؤ نے پھر گود میں دے دو۔" آپ میں نے محسوس کیا کہ اس کی گواہ غیر معمولی طور پر حرم

تم اب بھی سو رہے تھے تمہیں گھر جان کی گود میں تاک میں اس کے برابر بیٹھ گئی اور انہیں اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ ڈرائیور کے قریب ہی ایک اور شخص بہت کی طرح سائت تھا۔ اس کی گردن نہایت کونہ اور پیچھے کی طرح موٹی تھی۔ میں نے برآمدے کی دیکھا وہ لڑکی اور میرے پیچھے آئے والا آدمی دروازے پر کھڑے تھے۔ گاڑی صدر دروازے کی طرف بڑھی تو لڑکی نے ہواوائی انداز میں ہاتھ ہلایا اور تیزی سے گوم کر دروازہ بند کر اندر چلی گئی۔

لوہے کا گینٹ کھلا تھا۔ گاڑی سوک پر آ کر دائیں طرف مٹھی اور چند لمبے بعد اٹھنے لگے۔ یہ سوک نہایت چوڑی تھی مگر اس پر ٹریک برائے نام تھی۔ البتہ ان کا سلسلہ گھٹان ہونے لگا کہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ مصلقات سے اندرون شہر کی ل جا رہے تھے۔

"چشم بد دور۔ بہت ہی پیارا بچہ ہے۔" گھر جان نے تمہی اپنی گود میں جکے جکے لے لے دیتے ہوئے کہا۔ "پاکس مای کی طرح خوبصورت ہے۔"

"اس کا باپ بھی کم خوبصورت نہیں ہے۔" میں نے کلیلیے لیے میں کہا۔ "ملا تو تمہیں اس سے ضرور ملوؤں گی۔"

"میرے ہونوں سے ملنا ممکن ہوتا تو اس دنیا کے دک آدھے نہ رہ جاتے۔" اسٹائل اور اندر داخل

میں نے اسے گھورا لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ گویا اسے میرے۔ ایک لمبے نہ کچھ معلوم تھا، لیکن مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ درحقیقت کون تھی؟ اس نے پچھتے ہوئے ایک تو مجھے احساس کھڑی سا ہو رہا تھا دوسرے مجھے اندیشہ تھا کہ میں ان کی لڑکی کی طرح قلند بگڑ رہا شروع نہ کر دے

لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بظاہر انسان ہی تھا، کیونکہ اس کی دو ٹانگیں دو ہاتھ اور ایک سر تھا۔ بالکل انسانوں جیسا۔ لہذا میں کسی اور مخلوق کی اولاد نہیں ہو سکتی۔"

"کیا اس کے بعد تم اپنے باپ سے ملکر گئی تھیں۔" اس بار میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ اس لڑکی نے غیر جذباتی ہونے کی انتہا کر دی تھی۔ چل ہے جو اس کی گفتگو میں اس کے لیے میں کوئی آثار چھانڈا تھا۔

"جی سمجھ لیں۔" اس نے بدستور پٹ لیے میں کہا۔ "کیونکہ اس رات میری ماں نے اسے سوئے میں گل کر دیا تھا۔ گلیاں چرنے والی کھال سے میری ماں نے اس کی کھوپڑی و حصوں میں تعبیر کر دی تھی۔ ہاں برس تک اس نے اپنی ماں کھال تھی کہ میرے خیال میں اس کے جسم کی تقریباً ہر ہڈی ایک ہار نوٹ کر جڑ چکی تھی۔ اگر آپ کچھ غم کر چکی ہیں تو اپنے کمرے میں شہرے لے جائیے۔" آخری جملہ بھی اس نے اپنی بالی گنگو کے ساتھ اس روال سے کہا تھا کہ ایک لمبے کیلئے تو مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ اس نے مجھے اٹھنے کیلئے کہا تھا۔ جب دوبارہ اس نے اپنی درخواست کی تو میں اٹھی۔

کمرے میں آکر میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کس طرح وقت گزارنا چاہیے لیکن میری یہ مشکل تم نے حل کر دی۔ تم نے میری انگلی پھوڑی اور دوڑ کر کمرے کے ایک گوشے میں کھڑی پچ گاڑی سے کھوٹے لٹلے گئے۔ تمہارے ساتھ میں بھی کھولوں سے کھینچے گئے۔ تمہیں بہلانے لگی۔

تقریباً دو گھنٹے کی اچھل کود اور وقتی زبان میں گفتگو کے چند الفاظ دہراتے ہوا حرم جھک کر سو گئی۔ تمہیں مسنی پر لگا کر میں بھی ہی تھی کہ دروازے پر کئی سی دھک ہوئی اور ساتھ ہی اس لڑکی نے اندر جھانکا۔

"شہرے لے چلے میڈم! گاڑی تیار ہے۔" اس نے کہا۔

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے تو معلوم نہیں میڈم!" اس نے اپنے مخصوص مطوت خواہانہ انداز میں کہا۔ "مجھے صرف اتنا کہا گیا ہے کہ میں آپ کو صدر دروازے تک پہنچا دوں۔"

"میں لو اب سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ تو چند منٹ پہلے ہی کسی کام کے سلسلے میں روانہ ہو چکے ہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے نواب کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ چند لمبے تک میں اپنی جگہ ساکت کھڑی سوچتی رہی پھر میں نے تمہیں اٹھا کر کندھے سے لگایا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

لڑکی کی رہنمائی میں چلتے ہوئے میں نے اپنے عقب میں بالی سی تہمت سن کر دیکھا تو وہ شخص پیچھے آتا دکھائی دے جسے میں خواب گاہ کے دروازے پر بیٹھے دیکھ چکی تھی۔

یہ تو ادھر آسمان کا صرب ایک بڑا سا گول گولا دکھائی دیتا تھا۔ یہ حقیقت مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ یہ مکان واقعی ایک ایسا مکان تھا جس میں گرنے کے بعد کوئی باہر نہیں جاسکتا۔

میں نے اس میں آنے والے دو جہازوں سے بیڑیاں اڑا کر دیں تھیں۔ گوہر جان کی رہنمائی میں میں دوسری منزل کی ہالوں میں پہنچی۔ بائیں ہاتھ پر کمرے کی قطار اور دائیں طرف ہالوں کا بیگ تھا۔

پیشتر کمرے کے دروازے کھلے تھے اور ہر کمرے میں ایک یا دو لڑکیاں موجود تھیں۔ کوئی اپنے آپ کو حارہ رانچوں کی طرح بستر پر کھیرے پڑی تھی۔ کوئی سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے کمرے کے دروازے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوئی لباس سے بے نیاز پیسے میں شریور و دراز میں مصروف تھی۔

میں نے دیکھ کر کئی لڑکیاں لپک کر دواڑے میں آگئیں۔ یہ سب جوان اور حسین تھیں مگر ان کے چہرے چمکے چمکے ہوئے تھے۔ وہ اس اور آنکھیں کھڑکھڑاتی تھیں۔ گویا کوئی خون کشم سوئے میں ان کے سارے وجود کی تازگی اور چہرے سے تب و تاب چوس گیا ہو۔ میں نے اپنے عجب میں ان کے دروازے کھلے۔

"تو گرفتار قفس میری خدا خیر کرے۔"

"ہائے ہائے چل تو دیکھو کمرے شائع گل کی طرح چمک رہی ہے وہ قدم میں نرت ہاتھ دالے۔"

"بچے دالے ہے۔"

"ملا کر ابھی خود بھی ہے۔"

"مگر بی بی، تو اللہ بڑا نے بنا دیا ہے فرصت میں بیٹھ کر۔"

"اس آواز پر بڑے اور کا قہقہہ پڑا۔ گوہر جان چلتے چلتے رک گئی اور اس نے دروازوں میں کڑی لڑکھن پر ایک تھوڑا سا منہ سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کی نظری میں یہ اثر تھا کہ تمام لڑکیاں ہیکل بیچوں کی طرح اپنے کمرے میں گھس گئیں۔

چند قدم آگے چل کر گولڈی میں پہنچی ہوئی کمرے کی قطار میں ایک خلا سا آیا جس سے آگے اس منزل کا ایک تھک حصہ تھا۔ یہ حصہ دیکھ کمرے کی نسبت پر تہاش اور وسیع معلوم ہوتا تھا۔ اس حصے میں ایک کمرے کا خوبصورت پردہ بنا کر گوہر جان اندر داخل ہو گئیں اور پردہ ایک طرف کو سمیٹ کر مجھے راستہ دیا۔ اندر پہلی سی روشنی تھی۔ ایک لمبے لمبے لٹے ہوئے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ گوہر جان نے لائٹ آن کر دی۔

یہ ایک شاہانہ قسم کا کمرہ لاشٹ تھا۔ فرش پر دھڑا پرانی قالین تھا جس میں پیسے سے بھرے تھے۔ کمرے کے مختلف حصوں میں شائع طرز کی اونچی کرسیاں جن پر مختلف

چند لمبے خاموشی دی میں کھڑی سے باہر دیکھتے ہوئے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم جس علاقے سے گزر رہے ہیں اور اگر دوبارہ لوہے کے عسکریت کمرے کی طرف آنا چاہے تو کن کن شخصوں کی مدد سے راستہ ملے کیا جائے، لیکن میں کوئی اندازہ نہ کر سکی۔ ایک تو شہر کی طرح میرا دیکھا بھلا نہیں تھا اور دوسرے بھی بہت سی لڑکیاں وہاں تھیں۔ مجھے کیوں نہتی جلتی لگتی تھیں۔

راستوں کی کچھ نشانیاں متعین کرنا بھی میری نظر آ رہا تھا کیونکہ کار خلاف وضع خاصی چیز رفتار سے چل رہی تھی۔ مگر اس کے باوجود مجھے سے تو یہی گنا تھا کہ چلتے کی بجائے دیکھتی ہوئی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ دیکھ بہت ابھی ابھی کاموں کے مقابلے میں برائے ہم "واؤ پیڈا کر رہی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" پھر میں نے گوہر جان سے پوچھ ہی لیا۔

"میرے گھر۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"تھوڑا مگر تیسرے علاقے میں تو معلوم نہیں ہو گا۔" میں نے کا کھانے والے لمبے میں کہا۔ "میں نے کچھ کا نام پوچھا تھا۔"

اس نے ناپسندیدگی کی نظر سے میری طرف دیکھا۔ "تھوڑے لمبے انکا کافی نہیں ہے۔ کہ لی فلوٹ میں تھیں ایک بھیاک تھوڑے لمبے سے چھڑا کر لے آئی ہوں۔"

"تھیں میری اتنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے جان بوجھ کر اپنے لمبے کی کٹ بہ منظور برقرار رکھی۔ "میں نے اس سے بھی نہیں پوچھا بھیاک تھوڑے لمبے دیکھ رکھا ہے۔ میرے لئے تو ساری دنیا ہی ایک بہت بڑا لیدر ہے۔"

اس نے برا سا منہ بنا کر گویا کوئی کڑی گولی نگلی ہو۔ "تو ایک تو ساری زندگی عاتق مزاج مردوں اور ستم رسیدہ عورتوں سے لگے لگے سنتے سنتے میں تھک آگئی ہوں۔" وہ ناگوار سے بولی۔ "لی افال تم خاموشی سے بیٹھو۔ وقت آنے پر ہمیں سب کچھ معلوم ہونا پڑے گا۔"

خاموشی طویل سفر کے بعد کارنگ سی گلیوں کی بھول حلیوں میں داخل ہوئی۔ چند لمبے صرف بحر اور چکرانے کے بعد پہلے چھوٹے سے بنے ہوئے بلند دیوار مکان کے سامنے ہمارے مکان کا دروازہ کھلی گئی تھی۔ اور اس کے دونوں طرف دو چھوٹے پر پتھر سے بنے دو شیر نصب تھے۔ کار سے اتر کر اس نے ہمیں میری گود میں دے دیا اور اپنے ہاتھ اس کے اشارے کیا۔

سائٹ کھڑا کر کے یہ مکان بہت بڑے کمرے سے مشابہ تھا جسے سطح زمین سے چھوٹے کے بجائے زمین سے بلند کر دیا گیا تھا۔ مکان کی چھین سطحوں کی باگھیاں لڑکی کی شکل میں تھیں۔ جن سے لمبے کچھ محنت میں بچا لیا جاسکتا تھا۔ محنت میں کھڑے دیکھا تو وہ

گدے بھلا رہے تھے۔ انگریزی طرز کے کٹوج بلورین پائیاں اور ایک چھوٹا سا آرام و دیوان بچھا ہوا تھا۔ چھت میں دو قالنس لگے رہے تھے۔ دیواروں پر جمادی ساز کی فریم شدہ رنگین تصویریں آویزاں تھیں۔ یہ تصویریں غالباً انگریز ایکٹریوں کی تھیں۔

ایک کونے پر میز پر بیٹا سا گراسفون رکھا تھا جس کے لڑائی بھونڈ پھل نظر میں چاندی کا ایک بست بیٹا لگتا تھا۔ گراسفون کے قریب ہی اوپر نیچے بڑے بڑے دیکھا دل کا انبار تھا۔ اس کے قریب ہی دیوار میں ایک لوہی سی اندازی میں رنگ رنگ و طبعی عکاسی پوری گھس ایک خانے میں پیش قیمت کرائی چھریں اور سب سے نیچے خانے میں کچھ کتابیں بھری ہوئی تھیں۔

اس کے متعلق دیوار میں آتش دان تھا جس کے سامنے قالین پر چیتے کی کھال بچی ہوئی تھی۔ آتش دان کی کارنس پر مختلف العر عورتوں کے بڑے بڑے فریم شدہ رنگین پورٹریٹس سجے ہوئے تھے۔ جنہیں غالباً مختلف گھراہرقن مصوروں نے بنایا تھا۔ ان میں ایک تصویر گورہن کی بھی تھی۔ جو اس کی جوائن تھی۔ اس تصویر سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کی بھالی نے کیا کیا نہیں نہ ڈھکی ہوئی گی۔

دلچسپ ایک ملحقہ کمرے کا پردہ بنا اور ایک کمرہ صورت سی جوہیاں اندر آگئی۔ صورت کے برعکس اس کا لباس اچھا تھا اور سب وہ یونی تو اس کے لیے کی سائیکلی اور آواز کی مٹھاس نے اس کی بد صورتی کا ناگوار اثر ختم کر دیا۔

”کیا تم سے بی بی گوہر“ وہ گویا گورہن کے قدموں میں بھی جا رہی تھی۔
”اس لڑکی کو مٹھنی والے کمرے میں بچھا دو۔“ گورہن نے گھٹے گھٹے لیے میں کہا۔ اس کا اور اس کے بچے کی ہر ضرورت کا خیال رکھو۔“
”کمپ ہانگل گھر نہ کیجئے بی بی گوہر۔“ بدھیا نے سرلم کر کے کہا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

وہ سری شام تک میں خواب لگا کر ایک کمرے میں رہی بدھیا تمام وقت برابر والے کمرے میں رہی جس کا ایک مشترک دروازہ درمیان دیوار میں تھا۔ مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں اس پر ہولے سے دستک دیتی اور بدھیاں دوڑی آتی۔ ہر حال میرے کمرے کا آمدرفت والا دروازہ مشغل تھا۔ بدھیا جب بھی آتی جاتی سے تلا کھول کر آتی اور باہر جاتے وقت بھی دروازہ مشغل کر جاتی۔

کمرہ نہایت کشادہ روشن اور ہواوار تھا۔ اس لئے اس میں احساس نہیں ہوا کہ میں یہاں قید ہوں۔ ابھی دوپہر کو تم روئے گئے تو بدھیا جھپٹ بھانے کیلئے باہر لے گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آئی تو ہمارے لئے کھانے پینے کی ہمت سی چھریں اور کھونے کے ٹکٹ اٹھالائی تھی۔

مجھے اب تک معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ گورہن کو مجھ سے کیا مطلب ہے؟ اور مجھے یہاں قید ہوں کی طرح کیوں رکھا جا رہا ہے؟ مگر کہ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں تھی لیکن مشغل کمرے میں رہنا بجائے خود ایک بہت بڑی تکلیف تھی۔ شام کو گورہن آئی تو اس کے ساتھ ایک مٹھنی سا بوڑھا آدمی بھی تھا۔ وہ نہیں اپنا اور بٹے کا ٹاپ دو۔ وہ زمین دوز میں تمہارے کپڑے وغیرہ بیچا ہو کر آ جائیں گے۔ گورہن نے ملامت سے کہا۔

”بوڑھا ٹاپ لے کر جا چکا تو میں نے گورہن کی طرف دیکھا وہ اسی لیے سے ہنڈر میں سرکٹ لگائے“ ٹاپ پہ ٹاپ رکھے ٹاپی تھی اور کمرے کش لے رہی تھی۔ میری موجودگی کا اسے کچھ احساس ہی نہیں تھا۔

”یہ کیا سلسلہ ہے؟“ بلاخر میں نے کھٹار کر کہا اور تب وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔
”کیا اب مجھے یہاں رہنا ہو گا؟“

”ظاہری کیا بات ہے۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

”لیکن کیوں؟ اور یہ کوئی جگہ ہے؟“ میں نے تندہی میں کہا۔

”ہیہ ابھی تک تمہاری کچھ میں نہیں آتا؟“ اس نے ابھی سی حیرت سے کہا۔

”نہیں!“ میں نے تیزی سے جواب دیا۔

”بہت بھولی ہو“ جو عورتیں بھولہن کے عالم میں اس دشا میں داخل ہوئی ہیں آگے چل کر بڑی قسمت چاتی ہیں۔“ اس نے بڑا سائنس کیا اور بخور مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہیہا تو اب نے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا؟“

”کس سلسلے میں؟“ میں تقریباً ہلا اٹھی۔

”واہ! اس مرود تو اب سے کی امیہ تھی۔ ہر حال میں تمہیں مارا قصہ سنائی ہوں۔“ کچھ سوچ کر اس نے گویا وضاحت کی۔ ”سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ بتاؤں کہ اس وقت تم فارس رفا کے علاقے میں ہو۔“

”ایک لمحے کیلئے تو میں نے کوئی خاص بات محسوس نہیں کی۔ دلچسپ“ میرے ذہن میں چھٹکا سا ہوا۔ ایک مرتبہ ادھاپ نے باتوں باتوں میں سرسری طور پر بتایا تھا کہ بہنی کا مدرس رفا کا علاقہ بعدستان کا سب سے بڑا بازار حسن ہے۔

میرے ذہن میں بازار حسن کا تصور نہایت طویل تھا۔ یہ تصور ذہن میں ابھرتے ہی میرے ہاتھ پاؤں لٹپٹے پڑ گئے اور ساری ساری و تیزی رخصت ہو گئی۔

”لیکن مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“ میں نے سرسرائی آواز میں پوچھا۔ ”ہیہا تو اب نے مجھے تمہارے ہاتھ فراغت کر دیا ہے؟“

”نہیں۔ ابھی وہ الجس اتنا قریب نہیں ہوا کہ بازاری عورتوں کے ہاتھ لڑکیاں

فروخت کرنے لگے۔ اس نے تو پے سے ایک لاکھ روپے بھی دیا ہے۔
 میں ایک تک اسے ٹھوکر دی تھی۔ دھڑکیں کے مرچوں میں اس کا مسخ و سپرد ہوا
 مجھے وحشت دینا سا لگ رہا تھا۔ نیم وا آنکھوں سے ہوا میں کسی غیر ملکی چیز کو دیکھتے ہوئے
 وہ دیر سے دیر سے کھلے رہی تھی۔ اس کی حیرانی چٹائی پر گلیں ابھر آئی تھیں گویا وہ
 الجھن میں ہو کہ بات کس سے شروع کرے۔
 میں اس کے لب بٹنے کی منتظر تھی۔

○

”یہ تقریباً بیس سال پہلے کی بات ہے“ ہار گوہر جان نے کہا۔ ”یعنی اس وقت
 کی جب نواب شرافت علی جوہر تھا اور اس کوٹھے پر ہاتھ دگی سے آتا تھا۔ میں بھی
 اس کی شہسوار تھی اور اس کی طرف سے اس زمانے میں مجھے ہانچ ہزار روپے مہینہ ملتا تھا۔
 ہانچ ہزار روپے تو اس زمانے میں بھی بڑی چیز ہے۔ اس زمانے کی تو بات ہی مست پوچھو۔
 نے مٹھی ساٹس لے کر سگریٹ کا ایک کش لیا۔ میں ایک تک اس کی صورت دیکھ
 رہی تھی۔“

”وہ جب بھی بھی آتا اور بیٹے دن بھی ٹھہرتا۔ مجھے اس کے ساتھ اس کی کوٹھی میں
 چڑھنا تھا۔“ ایک لمحے کے توقف سے گوہر جان نے بات جاری رکھی۔ اس تعلق کے
 میں تمام تر احتیاطی کوششوں کے باوجود میرے ہاں ایک بچی پیدا ہو گئی۔ بچی خاصی
 اورت تھی یا دوسرے لفظوں میں تم کہہ سکتی ہو کہ بالکل باپ کی تھی۔ ”نواب اور
 ہے مہاراجے تھا۔“ ہم جیسی عورتوں کے ہاں اپنی لڑکیاں رہتے نہیں دیتے۔ نواب نے
 لی کئی مہینہ بچی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے مجھ سے مانگا مگر میں بل مٹول کر لی
 ہی۔ چنانچہ تک مجھے یاد چتا ہے۔ اس کی بدولت تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس وقت بچی
 نے لئے میرے دل میں ماحول کو نہیں لے رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ میرے ذہن کے کسی
 گوشے میں نواب کے خلاف کینہ سمجھوتا تھا اور وہ اس لئے کہ اس نے ابتداء میں مجھے
 ملوی کا بھانسا دیا تھا اور میں اپنی قزم تر چالاکی کے باوجود اس کے بھانسنے میں آگئی تھی۔
 حکم بننے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ کللی عرصے کے انتظار کے بعد جب میں نے اس کا وعدہ
 ذرا دلایا تو وہ عجیب سے انداز میں ہنس پڑا۔ کہنے لگا وہ چار لوہوں نے جوش جذبات میں اگر
 بازار عورتوں سے شادیوں کر لی ہیں۔ اب ایسی ہر خوش شکل عورت رانی سارانی اور بیکم
 بننے کے خواب دیکھنے لگی ہے۔ لیکن ہم چو کہ بہت دور کی سوچتے ہیں اس لئے کسی بازاری
 عورت کو کل سراسر میں لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے“ اس کے بعد نواب نے میرا چنگ
 ہزار روپے مہینہ نامہ دیا۔ میرے دل کو چھیں سی گئی۔ مگر سرحاں میں خاندانی قسم کی
 بازار عورت تھی، مصلحت کوئی اور عدم جذباتیت ہماری گھنٹی میں پڑی ہوئی ہے اس لئے
 خاموشی سے اس چوٹ کو سہہ گئی۔

"ظاہر ہے کہ بچی کی یہ انٹل تک میں اس چوٹ کو بھولی نہیں تھی۔ چنانچہ میں بچے کو اب کو دینے کے سلسلے میں ہال محل سے کام لیتی رہی۔ حتیٰ کہ کچھ عرصے بعد نواب دھانے کو بھی چکروں میں اپنا جاگیدار بن گیا اور ایک طویل مدت تک بھی دھانے میں رہا۔"

"ابھی سال بعد اس کی بہتی تندرست شہرہ ہوئی تو میرے بھائی نے کسی نہ کسی طرح اس لڑکی سے تعلق استوار کر لیا۔ مجھے بھی اب اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ مگر اس عرصے میں نہ چلنے نہ سہانے سے کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ میں جنہیں "ظہرا" کہتا تھا، اسے وہ رہی ہوں۔ انہی حالات میں بلاآخر میرے بھائی سے جنم لینے والی نواب کی پیدائش ہو گئی۔"

"میں نے اس کی پرورش اور تربیت اسی طرح کی تھی جس طرح ابھی ایک بچی کی ہو سکتی ہے۔ اس کے جوان ہوتے ہی میں نے اس سے بھرا کرانا شروع کر دیا۔ لڑکی کی اصل صورت بڑھتی کے رنگ روپ کے پدید ہونے کی خاص نہیں تھی اور کونٹے پر پڑے پائے کے حسن پرستوں کا آنا جانا تھا۔ اس لئے دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں اسے کوئی خاص توجہ نہیں ملتی تھی۔ لیکن جب میں جان بوجھ کر باتوں باتوں میں انہیں بتاتی تھی کہ یہ نواب شرافت علی کی بیٹی ہے تو تلاش چیزوں کو اس سے کچھ دلچسپی محسوس ہونے لگتی تھی۔"

"تلاش چیزوں میں نواب کے ہم عصر بھی ہوتے تھے اس کا کوئی شکا سا بھی ہوتا تھا۔ اس سے حسد رکھنے والا بھی ہوتا تھا۔ یہ بات نواب کے کانوں تک بھی پہنچنے لگی کہ بھول لوگ اس کے تذکرے پر ناگ بھول ہوتا کرتے ہیں، اچھا وہی نواب شرافت علی خان جس کی ایک لڑکی لارڈ رول کے ایک کونٹے پر ناچتی ہے، تم اندازہ کر سکتی ہو کہ نواب کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ وہ اولین فرصت میں میرے پاس دھڑا آ گیا۔"

"لڑکی لینے کے لئے اس نے شرافت، دھولس دھنکی، لالچ سارے ہی اختلاف آوازے مگر میں بھی نہ چلنے کیوں کچھ زیادہ دل خند پر اڑی رہی۔ میں نے لڑکی اس کے حوالے نہیں کی۔ بلاآخر اس نے وہی جاگیدارانہ صہہ استعمال کیا یعنی آٹھ دس سو روپے بھیجے اور لڑکی کو اٹھوا لیا۔ انگریزوں سے اس کے بہت ہی گہرے تعلقات ہیں لیکن اس سے تعلقات ہمارے بھی کچھ برے نہیں اور پھر انگریز میں جہاں بہت سی برائیاں ہیں وہاں بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے عام آدمی کا تجربہ شاید مختلف ہو مگر میں نے دیکھا ہے کہ انگریز اس طرح کی کھلم کھلا فتنہ گردی کو پسند نہیں کرتا، خواہ اس کا مظاہرہ اس کے دوستوں اور ہمدستان کے غداؤں کی طرف سے ہی ہو۔ بس تو پھر ہم نے بھی کچھ دودھیاں ہلائیں۔ چھتے دن لڑکی نواب کی جائے سے برآمد ہو گئی اور وہاں پہنچ گئی۔"

"اس کے بعد نواب کافی عرصے کے لئے ٹھنڈا پڑ گیا لیکن کل لہجہ تک نواب کا پیغام"

کہ وہ لڑکی کے سلسلے میں مجھ سے ایک نہایت عہدہ سوار کرنا چاہتا ہے اور میں کم سے کم اس سے طوں ضرور۔ اسے یقین ہے کہ میرے منہ میں پانی آہلے گاہ مجھے تجسس ہوا کہ کم از کم مل کر تو کچھ ہی لڑی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس دوران میں اس لڑکی سے خاصی ہزار ہو چکی تھی۔ کیونکہ ایک تو اس کی وجہ سے مجھے کوئی خاص ملال لگا نہیں ہوا، دوسرے وہ خود یہاں آکڑی اکڑی سی رہنے لگی تھی۔ جب سے وہ باپ کی جاگیر ہو کر آئی تھی۔ طود کہ اس کی دماغ مانگ مجھے لگی تھی۔"

"میں نے اسے سمجھایا کہ لڑکیوں اور جاگیداروں کی ہم جنسی عورتوں سے جو اولادیں ہوتی ہیں انہیں وہ محض اپنی ذات رکھنے کے لئے اپنی حویلوں میں لے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً انہیں اس اولاد سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ انہیں اپنی دولت و ہائپر میں سے کوئی حصہ دیتے ہیں۔ یہ بچے ان کی کل سرائوں میں چھپوں کی طرح پرورش پاتے ہیں۔ لیکن میرے اس سمجھانے بجائے کاخری پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح ہم دونوں کے درمیان غلطی سی ماحول ہو چکی تھی۔ چنانچہ میں نواب سے ملنے چلی گئی۔"

"ملاقات کی میز پر نواب نے مجھے نہایت صورت دکھائی بعد میں نہایت کمالی مٹائی اور دھولس کی کہ اگر میں جنہیں اپنے کونٹے کے لئے اس کی بیٹی کے تھوڑے کے طور پر قبول کر لوں تو وہ ہے حد احسان منہ ہوگا اور ساتھ ایک لاکھ روپیہ بھی دے گا۔ شاید یہ میری عمر کا قضا تھا یا پھر نواب کی بیٹی سے بیزاری کا نتیجہ تھا کہ میں اس دھولس کے بارے میں دلچسپی سے سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ اور پھر یہی بات تو یہ ہے کہ ہمارے حسن نے میری آنکھیں خیر کر کے رکھ دی تھیں۔ اس گور جان کی آنکھیں جس نے خود اپنے لڑانے میں نہ چلنے لگی آنکھوں کو پھر کیا تھا۔ کتنے دنوں کو دھڑکا ہوا تھا کتنی مگر بیٹھائیوں کو اپنی دلچسپی چھوڑا تھا۔ اس گور جان کی آنکھیں جو برسوں اس بازار کی سہ تلخ لکھ رہی جہاں پورے ہندوستان سے بہترین ترشے ہوتے میرے کسی نہ کسی طریقے سے لا کر جمع کئے جاتے ہیں۔ اس گور جان کی آنکھیں جنہیں دیکھ کر چند لمحوں کے لئے بھینکا بھول گئی تھیں۔"

"ظہرا میں تم سے بڑی سہ نیا دہی بہت رہی تھی لیکن اب میں تمہارے سامنے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی کہ اس وقت درحقیقت میری دھڑکیں ایک خفہ چیز ہو چکی تھیں۔ چشم قصور میں میں نے دیکھا کہ یہ بیکر کرب تریش تراش تراش کے بعد میرے بالا خانے کی لخت بنے گا تو کیا قیامتیں چاہوں گی۔ نواب نے بڑی دولت داری سے تقابلاً تھا کہ تم وہ بچوں کی ماں ہو لیکن اب بھی تم اس بازار کی تمام لڑکیوں سے بہتر ہو۔ گور جان کی جھگڑی ہے کہ تم اس بازار کی تاریخ کا ایک اہم باب رقم کرد گی۔ امید ہے اب تم سب کچھ سمجھ گئی ہو گی یا کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی ہے؟"

"میں اب تک گویا سماعت کا سمندر بنی بیٹھی تھی جس میں گور جان کی مٹھنہ کا ..

لے لے کر ضم ہوتا جا رہا تھا۔ اور جیسے میں یہ لذت انسانی کاسب میں آگئی۔ اس کے باوجود کئی لمبے تک میں کچھ نہ بول پائی۔ میری مٹھلیں پہنچ گئی تھیں، پچلا ہونٹ دانتوں کے دبا ہوا تھا اور جسم کا تمام ٹون گویا کپیلیوں میں جمع ہو گیا تھا۔

"گوہر جان!" بالا فر میرے حلق سے نواز غلے اور مجھے اس پر کسی دشمنی و عداوت کی فراہمیت کا گمان ہوا۔ "تم وہ انسانوں کے پھولے کا ذکر یوں کر رہی ہو جیسے لعلی سے تم کوئی غراب ہوتی غریب لائی تھیں اور اب وہ تم وکلاء کو واپس کر کے اچھی ہوئی لے آئی ہو۔ نواب کی لڑکی ہے کبک چہاڑ تھی لیکن اس نے جہم تو تمہاری کوکھ سے ہا تھا۔ اسے ہال پوس کر یوں ایک جنس ناقص کی طرح نواب کے حوالے کرتے وقت تمہارا دل ذرا بھی نہیں دکھا تھا؟"

"اگر ہم جیسی عورتیں اس قسم کے دکھ چنے میں پالنے لگیں تو ہم اور عام عورتوں میں فرق رفتہ رفتہ مٹ جائے گا۔" گوہر جان نے پر سکون لہجے میں کہا اور ہولڈر میں دوسرا سگریٹ لگاتے لگی۔ سگریٹ سلا کر اس نے صوفے پر پہلو دلا اور ایک گھبراہٹ لے کر بولی۔ "ہندوئیت ہماری سب سے بڑی دشمن ہے۔"

دوسری بات یہ میں نے پہلے سے ہی لہجے میں کہا کہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ میں وہی کچھ بن جاؤں گی جو تم مجھے بنانا چاہو گی؟

"جیسے بننا پڑے گا میری جان" اس نے قدم سے اضطراب سے پہلو ہل کر کہا۔ سگریٹ ہولڈر اس نے دو تین مرتبہ ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں پر سکون ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "اس لئے کہ تمہارے سامنے کوئی دوسرا راستہ تو کیا" واپس جانے کی بھی کوئی راہ نہیں ہے؟" اس نے نیم وا آنکھوں سے براہ راست میری آنکھوں میں جھانک۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پلکیں ہچکچاتے بغیر اسے گھورتی رہی۔

"میں بہت مہمان عورت ہوں" چند لمبے کے توقف کے بعد اس نے دیکھ سے لہجے میں کہا۔ "مگر اور زندگی کی میں قاکل نہیں" میں عموماً انسانوں سے کوئی ایسے کام صرف دیکھ کے سارے کھوا لیتی ہوں جن کے لئے بعض لوگ طلاق استعمال کرتے ہیں، جبر و تشدد کرتے ہیں اور پھر باہم رہتے ہیں۔ بہر حال۔"

وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اس موضوع پر بات کرنے کی مجھے کوئی جلدی نہیں" کوئی بے مہربانی نہیں۔ اور تم بھی ابھی سے اپنے ذہن کو صاف تھکاو۔ اعصاب پر بوجھ مت آئے۔ آرام سے رہو۔ صاف ہی اپنی مرضی سے سوتا اپنی مرضی سے جاگو، ذہن سے ماضی کی غرائشیں مٹنے دو، ہر مسئلے کے بارے میں سوچنے کا ایک وقت ہوتا ہے اور میرے خیال میں اس موضوع پر سرکھانے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ خدا حافظ۔" دوسرے ہی لمحے وہ کمرے سے باہر گئی، صاف اس کے نڈیاں نہ ہوتی خوشبو کا ہلکا سا اثر پھر اس کے سگریٹ کے

کے دھوئیں کے ہتھکڑیے کمرے میں پکراتے رہ گئے۔ میں اپنی جگہ سن بیٹھی رہ گئی۔ تقدیر کی اس مسلسل حکم عمری پر میرا ہنسنے کو بھی جی نہ پھٹتا تھا کہ گڑھے سے لگتی تھی۔ تو کھائی میں پھر گئی تھی، اور کھائی سے جوں توں کر کے نپٹی تھی تو دلفن میری منتظر ہوتی تھی۔ میں یہ سمجھنے سے کامرتھی کہ آخر میں کس مسئلہ کی پاداش میں مسلسل تقدیر کی خاموش گرفت میں تھی۔

مجھے اب جس تازہ صورت حال کا سامنا تھا اس کے بارے میں جتنا زیادہ سوچتی تو اتنا ہی دل لوثتا تھا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہاں کوئی میری دھارس پر جانے تو نہیں گئے گا، تجھے راد بھانے نہیں آئے گا تو خود ہی اپنی مشیر ہے اور تجھے جو کچھ کرنا ہے، صرف اپنے ہی ذہن کی مدد سے کرنا ہے تو پھر اپنے آپ کو بدحواس کرنے اور اٹھ پاؤں پھولنے کا کیا فائدہ؟ تجھے کوئی راد قرار عطا کرنا ہوگی۔ میں سوچتی رہی۔ رات بے تک سوچتی رہی۔

کوئی رات کے قہقہہ جبکہ میرے کمرے پر موت کا سکوت طاری تھا اور چھینا۔ ہر کی دنیا بھی اسی طرح سنانے میں ڈوبی ہوئی تھی، میں ہنگ سے اٹھی اور اس دروازے پر پہنچی جس پر دستک دینے سے بوڑھی خادمہ کن حاضر ہوئی تھی۔ میں نے دروازے پر محض ایک انگلی سے اہلیت آہٹھی سے کک کک کی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ رات کے اس پھر توجہ ہم سی دستک وہ پوچھا سن سکے گی لیکن اس سے زیادہ بلند دستک دینے کا فطری مول نہیں لے سکتی تھی۔

پوچھا کے جسم میں شاید کوئی شیطانی مدد ہوتی تھی جو ہر وقت بیدار رہتی تھی۔ اتنی خف سی دستک کے باوجود مجھے باہر کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ دوسرے ہی لمحے کمرے میں لپیٹوں کی کھسکھس کی آواز سنائی دی اور میں سنبھل کر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ میرے ہاتھوں میں دھپٹ تھا جسے میں نے پھندے کی شکل دے رکھی تھی۔

دروازہ کھلا اور پوچھا اپنی جھونک میں تیزی سے اندر آئی۔ ہو کام میں کرنے جا رہی تھی اس قسم کے کام کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن اس وقت میرے سینے میں اس پنجھی کی دھپٹ پھڑپھڑ رہی تھی جو جیل کو اپنے سر پر اٹھا کر اڑ چکا چاہتا ہو۔ اسی دھچک کا تھان تھا کہ تب میں نے پوچھا کی طرف پھٹا اچھلا تو وہ سیدھا اس کی گردن میں جا پڑا۔ دوسرے ہی لمحے وہ فرش پر چٹ ہو چکی تھی۔ میں نے اس کے سینے پر گھٹنے رکھ کر سب سے پہلے اس کے سینے کا کچھ حصہ اس کے منہ میں ٹھونسا اور اسے گردے کر پانی مجھ سے اس کے ہاتھ پشت پر ہاتھ دینے۔ پوچھا بظاہر سوکھی سی تھی لیکن تھیں تخت جان۔ میری طرح فرش پر گرنے اور کھیر ہونے کے باوجود میری طرح لڑتیں چل رہی تھیں۔

مجھرا میں نے بہتر کی موٹی سی دسی بنا کر پوچھا کی "میں بھی ہاتھ دیتی۔ اب میں

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ مہلوں انداز میں مسکرایا اور ایک تاریک گلی میں مزید
 "جلدی آؤ۔" میں نے "تیرگی سے ایک بار پھر اس کی ٹیلی ٹیلی سی آواز سنی۔ ٹھیک
 ہمارے حلقہ میں نہ آئے۔"

ایک لمحے کے لئے میں نے تاریک گلی کے مول پر رک کر کچھ سوچنے کی کوشش کی
 لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اسی وقت میرے ذہن میں کچھ سوچنے کی سکت نہیں ہے۔ میں
 چپ چاپ اس کے پیچھے گلی میں داخل ہو گئی۔ اپنے سفید کرتے چامچے کی وجہ سے وہ اگر
 صاف نہیں تو کم از کم ایک بیولے کی طرح مجھے ضرور نظر آ رہا تھا۔

کئی دیر تک ہم یوں ہی تاریک گلیوں میں پھرتے رہے۔ ہمیں اتھا کر چلنے چلنے میں
 اپنے گلی تھی۔ شاید تم سمجھ گئی ہو؟ اس نے غالباً میرے اپنے کی آواز سن کر پلٹ کر
 کہا۔ "ہر حال وہ سڑک اب ڈنڈہ دور نہیں جس پر ہمیں پھوڑ کر میں لوٹ آؤں گا۔" وہ
 اب بھی پہلے ہی کی طرح ٹیلی ٹیلی آواز میں بول رہا تھا۔

بلآخر ہم ایک ایسی گلی میں پہنچے جس کے انتہا پر ایک بلند و بالا دیوار تھی۔ دیوار
 میں اتنا پھونسا سا دھواں تھا اسے چھوٹ کھول کر بھی ایک صحت مند انسان قدرے مشکل سے
 سے گزر سکتا تھا اس دھواں سے میں کہیں تالا نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس شخص نے ایک
 بار پھر اپنا چلیوں کا گچھا نکالا اور ایک چابی دھواں سے میں موجود ایک نچھے سے سوراخ میں
 داخل کر دی دوسرے ہی لمحے دھواں کھل گیا۔ شاید یہ گلی قسم کا چور دھواں تھا اور لہذا
 نگ کی ایک گلی میں کھلتا تھا۔ جو غالباً قدرے فراخ سڑک پر ٹھکی تھی کیونکہ چند گز لمبی
 اس نگ و تاریک گلی کے انتہا پر ابھی سی دھواں سرخ رہی تھی۔

"مہلو ٹاک کی سیدھ میں چلتی جانا۔" اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دیا۔
 میری سڑک پر پہنچ جاؤ گی۔"

دھڑکتے دہ سے میں نے اس نگ اور تاریک گلی میں قدم رکھا۔ اندھیرے میں
 دونوں طرف کی دیواریں تک دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ لیکن چند قدم چل کر جب میں
 کھلی نگ میں پہنچی جس روشنی تھی تو یہ دیکھ کر میرے پاؤں پھر ہو گئے کہ میں اسی کواں لبا
 مکان کے گول صحن میں کھڑی تھی۔ میرے عقب میں کئی کئی کی آواز ابھری۔ سڑک دیکھا
 تو وہ شخص بیٹ پکڑے بس بس کر دہرا ہو رہا تھا۔ اس کی لمبی کی آواز بھی ٹیلی ٹیلی ہی
 تھی چہ لئے تب میں ساکت کھڑی چلیں چھپکے بغیر اسے گھورتی رہی۔

سب بس ساخص میری شرانوں میں دوڑنے لہ کے ساتھ سمٹ کر بیٹنے میں جمع ہونا
 رہا۔ پھر ایک لمٹ میں نے اس کے گھٹنے پر پوری طاقت سے لہو کر رسید کی۔ میرے دھواں
 میں گوہر جان کے دہے ہوئے نہایت مضبوط اور سخت تلے کے سینڈل تھے اور میرا خیال تھا
 کہ میری ٹھوکر سے وہ طبیعت کئی دن کے لئے ٹھکانے پر مجبور ہو جائے گا مگر اس نے اللہ

تک نہ کی البتہ میرا پاؤں ضرور بھینچا کر رو گیا۔ عام سی جسامت کا مالک ہونے کے باوجود
 اس کی قوت برداشت غیر معمولی تھی۔

ہر حال اس کی "کئی کئی" ضرور ختم گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے کرتے کے نیچے
 ہٹ لے جا کر نہ جانے کہاں سے اٹلی برابر چوڑا اور پلشت ہمر سے لہوا لہیا چم چم کرتا ایک
 ٹختر نکالا۔ اور میری گردن پر رتہ دیا۔ میں ہڑپا کر پیچھے ہٹی لیکن ٹختر کی ٹوک بدستور میرے
 زخموں پر لگی رہی۔ دھیرے دھیرے شہ رگ پر اس کا دھواں پھٹتا جا رہا تھا۔

کئی کئی حراف۔۔۔۔۔ اس کی ٹیلی ٹیلی سی آواز میرے کان کے قریب گونجی۔
 اب یہ آواز کسی دلی سانپ کی پھٹار سے مطالبہ تھی "تو نے میں بادشاہ کے جسم کو ٹھوکر
 ماری ہے۔۔۔۔۔ میں میرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دوں گا۔"

چل اب زیادہ شیریں نہ بھاب۔" اچانک ادھر ہمیں خاصی جلدی سے آواز تکی۔
 اس آواز میں بلا کا قصراؤ و کار اور حکم تھا۔ اور میں اس آواز کو ہزاروں آوازوں میں بھی
 پہچان سکتی تھی۔ گو کہ یہ پل پل بدلتی تھی کئی کئی اس میں غضب کا ترم ہوتا تھا کبھی کھل کی
 جھٹکار کبھی تپش کبھی لہذا کبھی قصراؤ کبھی بھلا میں نے کتنی کی فطرتی ملاکاتوں میں اس
 آواز کے ان گنت تخیب و فراز محسوس کئے تھے گو کہ جان کی آواز تھی۔ گزشتہ روز ہی
 خدمت گار بدھیا نے مجھے بتایا کہ گوہر جان نے برسوں راجوں مہاراجوں اور نوابوں کے دل
 و دماغ پر جو راج کیا اس میں اس کی بے پناہ خوبصورتی ہی نہیں اس کی بے مثل آواز کو
 بھی دخل تھا۔ اور مجھے بدھیا کی اس بات پر کوئی شک نہیں تھا۔

"ٹختر بتا اس کے گلے سے" یہاں اس کا دم شک کر رہا ہے۔ ایک تو میری ص
 مزاح بڑی جھلکات ہے اور سے ٹختر پھول بھی ٹھل کر کھڑا ہو جاتا ہے گوہر جان کہہ رہی
 تھی ٹختر خورا" ہی میری شہ رگ سے ہٹ گیا۔ میں نے سر اٹھا کر ادھر دیکھا۔ تیسری منزل کی
 دائرہ صورت بالکل میں گوہر جان نگے پر کینیاں نکالتے قدرے بھی کڑی تھی۔ بلب گو کہ
 اس کے عقب میں قدرے جلدی پر دیوار میں قوت تھا۔ لیکن میں آنکھوں کے سوا اس کے
 چہرے کا ہر فعل دیکھ سکتی تھی۔ اس کی انگلیوں میں اس کا مخصوص سگریٹ ہونڈ رہا ہوا
 تھا۔ اور اس میں موجود کتنی سگریٹ سے دھوئیں کی ایک پتی سی کثیر ہوا میں بلند ہو کر ادھر
 تاریکی میں مدغم ہوتی جا رہی تھی۔

"میں بادشاہ؟" گوہر جان نے اس سرجہ لگا سانس لے کر کہا۔ "عزیز خانم کو
 نہایت احترام سے اوپر لے آؤ۔" یہ کہہ کر وہ بالکونی سے ہٹ کر پیچھے کمرے میں داخل
 ہو گئی۔

"چلو۔" میں بادشاہ نے ٹختر کہنے کے نیچے کہیں چھپا کر سوداگر انداز میں ٹھکتے
 ہوئے پیڑھوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا لہجہ یکسر بدل چکا تھا۔

کے مختصر جسم سے ہرگز میل نہیں کھاتی تھی۔ میرا ہے میرا گویا ہی۔ اس نے سیدھے ہو کر گویا جان کو خطاب کیا پھر مہری سانس لے کر کہہ "تج تک تم نے اتنی شکریں کو چلا لیکن تمہارے ہاتھ کچھ معذرت میں آج کھلے ہیں۔"

گوہر جان غمانیت اور خاکساری سے شکرانی گویا اسے بھی مہری کسی ریاضت کا صلہ مل گیا ہو۔ لہذا بھول غصہ میرے پڑ کے قریب سے ہٹ کر طویل و عریض کمرے کے ایک حصے میں بچے ہوئے اور چاندنی سے ڈنکے ہوئے فرش کی طرف بھاگ گیا۔ چاندنی پر دیوار کے ساتھ کئی کھوکھلے بھی لگے ہوئے تھے اس نے بڑی نزاکت سے اپنی سیاہ نعل کی سلیم شلی جوتی اتاری اور ایک گاؤں کے سے ٹپک لگا کر پلٹے ہوئے اپنا ہونہ لگائی سے انکار۔ اس کے چند نے نہایت غصہ سے یوں سوڑے گویا کپڑا کر کر رہا ہو۔ پھر ہونے کو اپنے قریب رکھ کر دواؤں ہو کر بیٹھ گیا۔

میں اپنی جوت کو چپائے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہی تھی گوہر جان بھی آج معمول سے کچھ لونا ہار سنگھار کئے ہوئے تھی گویا کسی تقریب میں جانے کی تیاری کر کے آئی ہو۔ وہ پلٹ کر دواؤں سے تک آئی اور نہ جانے کس کو کوئی اشارہ کر کے لوٹ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی وہ ملازم کمرے میں داخل ہوئے ایک نے بڑا مشتعل قسم کا ہارمونیوم اٹھا رکھا تھا اور دوسرا لودوں سے بھرا ہوا ایک لڑکی قہقہہ لگاتے ہوئے تھا۔ لودوں کے ارد گرد گلاب اور چنبیلی کی پتیوں کا ایک سوا سا دائرہ تھا۔

ملازموں نے یہ دواؤں چیزیں اس بھولے شخص کے سامنے رکھ دیں اور خود خاموشی سے اپنے قدموں لوٹ گئے۔ بھون شخص نے اپنے انگر کے کی جیب سے ایک ریٹھی ریشم نکالا اور اپنی محبت سے ہارمونیوم سے کوئی لیر مٹی گرد صاف کرنے لگا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کے رخسار پر ہاتھ دیتی ہو۔

"بہت کم ایسا ہوتا ہے۔" گوہر جان نے میرے قریب پہنچے ہوئے یوں خطاب کیا گویا وہ بہت دیر سے مجھ سے مصروف گفتگو تھی۔ درمیان کسی وجہ سے ذرا دیر کو سلسلہ کلام لوٹ گیا تھا اور اب وہ اسے وہیں سے جوڑ رہی ہے۔ "مگر کوئی شخص رکھیں اور ہوسکتی دواؤں میں بیک وقت کماں حاصل کرے اور استوا کے درجے کو پہنچے۔ حالانکہ دواؤں کا چل دامن کا ساتھ ہے مگر رکاس کو صرف سوا کا علم ہوتا ہے وہ خود گا نہیں سکتا اور لگنے کے استوا نرت بھاؤ سمجھتے ہیں مگر خود نرت بھاؤ جانتا نہیں سکتے۔ لیکن جو اپنے استوا ج باب خان اتھالے والے ہیں۔ انہوں نے دواؤں خون میں کٹل حاصل کیا ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" میں نے اکثرے اکثرے لہجے میں کہا۔

تم اپنی خوش نصیبی پر فخر کرو کہ تمہیں ان کی شانگروں میں دے دی ہو۔ "گوہر جان نے نہایت اطمینان سے کہا اور میرا ہاتھ قہقہہ کر اٹھاتے ہوئے یوں "مگر تم چند سال

"لا حول ولا سے لا حول ولا۔" استوا محترم بیٹھائے اور دواؤں سے منہ صاف کرنے لگے۔ انہوں نے مہر و سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔ منہ صاف کرتے ہی دواؤں پر سر ملانے لگے گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میرا ارادہ ہارمونیوم کو بھی لات مارنے کا تھا۔ لیکن وہ خلاصہ دینی نظر آ رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ میں اپنا پاؤں نہ تھوڑا بیٹھوں اس لئے اپنے تپ پر منہ کر کے گوہر جان کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر روتے کے سے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

"استوا لڑکی!" اس کے حلق سے جو آواز نکل اسے سن کر میری عمر کی عورت شاید قہقہہ بھر پڑا۔ اس نے مجھ پر بھی مسکرائی نہ اٹھائی ہو تھی۔ وہ نہ جانے کس ارادے سے محالیاں بھیج کر میری طرف بڑھی لیکن اس کے ساتھ تک پہنچنے سے پہلے وہ مجھوں شخص "استوا" تنہا خانہ ناقل چمپن بھائی سے گویا رکھ کا کوئی دواؤں ملانے ہوئے اٹھا اور اس نے انگر کے کی ریٹھی "ستین میں ملول لہذا سا استوائی پاؤں ہم دواؤں کے درمیان حاصل کر دو۔" "دھیوت گوہر جان۔" دھیوت "وہ تنگنائے کے سے انداز میں بولا۔ "میں لیل کی کھڑی اور مستقبل کی اعلیٰ بازاری عورت شروع شروع میں بی بی منہ لود ہوئی ہے۔ تمہیں یاد نہیں صلیب نے کیا طوفان چلایا تھا؟ ہارمونیوم کے کھلے کر دیئے تھے۔ ہر دے پھاڑ دیئے تھے اور حتیٰ کے مسوی بھی نہ جانے کس طرح توڑ دی تھی۔ بعد میں کیسی سلیپ میں ڈھلی تھی؟ جیسے یوں میں پتی۔۔۔ اور تیر کا معاملہ یاد ہے؟ وہ شیر کی بیٹی تو چار چار کڑیوں دواؤں کے قابو میں نہیں آئی تھی اور نعبہ خاتون اور تنفس النساء تو کئی عموں میں آئی تھیں لود اپنی مرضی سے آئی تھیں مگر تنگھروں ہتھ دتے وقت انہوں نے بھی اڑی کی تھی گو کہ باقی سب کچھ رساں سے سیکھ لیا تھا۔ گوہر جان! ہم تو سمجھتے تھے اب تمہاری بہداری کی عمر شروع ہو گئی ہے مگر لگتا ہے ابھی خون لٹھا نہیں پڑا۔

گوہر جان نے اپنی جگہ رک کر ایک طویل سانس لی اور جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے اثرات یک لخت معمول پر آ گئے۔ "خون لٹھا ہی تو پڑ گیا ہے۔ استوا محترم! مجھے تو لوب سے سوا کر لیا تھا۔ اور مجھے نہیں یہ لڑکی یہاں اس عالم میں نظر آ رہی ہے کہ کسی نے اسے اولیٰ آواز میں پکارا تک نہیں حالانکہ یہ ایک مرتبہ بھاننے کی کوشش بھی کر چکی

پہلے مجھے مل گئی ہوئی تو اب تک تسمیری تراش غراش کا عمل مکمل ہو چکا ہوتا اور تم دنیائے فن کا ایک انمول ہیرا بن چکی ہو گئیں۔ ہر حال اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ استاد محترم جب کسی پر صواب ہوتے ہیں تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کی کاپی لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ میں اس کے ساتھ اٹھ کر چاندنی تک پہنچ چکی تھی جہاں استاد محترم خاموشی سے لب ہلاتے ہوئے ایک ہاتھ ہوا میں بند کر کے شاید کسی سر کی دل ہی دل میں مٹھ کر رکھتے ہوئے انگلیوں کو غش دے رہے تھے۔

مجھے قریب آتے دیکھ کر وہ آنکھیں پوری طرح کھول کر سمجھل کر چند لمحوں اور بار موشم کو اپنے کچھ اور قریب پہنچ لیا۔ چاندنی کے قریب پہنچ کر میں رک گئی۔ گوہر جان جو اب خاصی مطمئن نظر آ رہی تھی جلدی سے ہاتھ کا اشارہ دیتے ہوئے بنگارنے کے سے انداز میں بدل۔ "ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ شاہش چلو دو! وہ ہو کر استاد محترم کے سامنے بیٹھو تاکہ شاگردی کی رسم نوا کی جاسکے۔" "ہاں میں گئی تسمیری دنیا فن اور چلے میں گئے تسمارے استاد محترم۔ جس اچانک اس بری طرح چلائی کہ گوہر جان ہڑپا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے لڑکھائی کے تھاں کو ایک نمک کر دسید کی۔ کچھ تھوڑا جھپ کر استاد محترم کے منہ پر پڑے اور ہاتھی ان کے عقب میں دیوار سے ٹکرا کر چاندنی پر ابھر ہو گئے۔



ڈاٹ

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" استاد نے بار بار ہمارے درمیان سے ہٹا دیا۔ پھر اپنے بھرکی لباس اپنے لیے میں سمیٹتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "کوئی بات نہیں۔ اگر اس وقت تمہارا بی نہیں چاہ رہا تو پھر کسی دن سہی۔" اس نے اپنی لپٹی دوست کی ہنوا اٹھا کر بازو پر لٹکایا اور اپنی مخصوص چمک مکھ کے ساتھ دروازے کی طرف چل دیا۔ گوہر جان بھی سر جھکائے اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔

میں بیڈ کی طرف پٹ آئی۔ تم بے کا سارا لئے کھڑے تھے اور حیرانی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے قمیص اٹھا کر سینے سے چٹایا اور کمرے میں ٹھٹھکی گئی۔ ان حالات میں میرا ذہن تقریباً "آؤف ہو چکا تھا۔ میں نے کچھ بھی کرنا نہیں۔ اچانک ہی فیصلہ کر کے کرتی تھی۔ میں اپنے حواس کو حتیٰ الامکان مستعد رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن پھر بھی کچھ مجھ میں نہیں آتا تھا۔ کوئی راستہ بھانپ نہیں رہا تھا اور نہ ہی یہ اندازہ ہو پاتا تھا کہ میرا مستقبل کیا ہے۔

میرے لئے امید کی ایک موشم سی کرن بس تم تھے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کرن کب تک اور کیسے میری زندگی میں اچلتا کرے گی۔ میں میں لاشعوری طور پر ایک کوشش شروع کر کے جا رہی تھی کہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ دن بے مقصد انداز میں گزرتے چلے جائیں گو کہ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ مجھے اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ کب تک یہ سلسلہ چل سکتا تھا؟ اور یہ بے مقصد دن گزارنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سارا دن بطور کسی معمولیت کے کمرے میں پڑے رہنا۔ وقت پر اپنی پنہ کا کھانا کھانا پینا یا کبھی کبھی چھپا کی صحبت میں بالکونی کا چکر لگانا اور یوں کچھ دیر کے لئے دھوپ یا قدرتی روشنی سے محروم ہو لینا۔ قمیص البتہ پڑھیا دن میں دو تین مرتبہ میر کرانے اور کھانے پینے یا کھینے کی چیزیں دلوالے لے جاتی تھی اس لئے تم بٹلے رہتے تھے۔

چند دن اور اسی طرح گزر گئے۔ حالات پر ایک پراسرار سی یکسانیت طاری تھی۔ "خیر ایک شام گوہر جان پھر میرے کمرے میں آئی۔ آج اس کا چھوٹا سا سنگمار سے بے نیاز تھا۔ ہل بھی سکتے تھے اور نہایت ڈونہوئی سے کمر پر چھلپے ہوئے تھے۔ اس نے انگریز بورڈوں والا ایک لمبا سا ڈھینڈا ڈھلا بھالدار لڑاکا پہن رکھا تھا۔ اس سادگی کے عالم میں وہ معمول سے زیادہ تر و تازہ کم عمر اور حسین لگ رہی تھی۔ اس کی مانگ میں سفید اور سیاہ بنس یوں ایک دوسرے میں مرقم تھے نیمبہ اعلیٰ شب کی سیاہی اور ابھرتی صبح کا اجلا گئے مل رہا ہو۔

"آخر تم بھی اپنے موقف پران کرنا۔" اس نے اپنی پسندیدہ آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں اب اس کی عادت سمجھ گئی تھی۔ وہ اسی طرح یا تمہید اچانک منقطع شروع کر

کرتا ہے۔ مقصد یہ کہ ایسی عورت اپنے کو طے پا رہی ہے۔ ظاہر نکاح نہ کرنے کا
مناظرہ کرتی ہے۔ لیکن درحقیقت مجرا کرتی رہتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ جب بے کورہ
ابیر زادہ آتا ہے تو اس کی خدمت میں حاضر رہتی ہے۔۔۔ جب تک وہ چاہے۔
چونکہ ہمیں اس پابندی سے بھی آزاد رکھنے کا وعدہ کرتی ہوں۔ یعنی تمہارے لئے
نہی کی ملازمہ بنانا یا نہ بننا تمہاری اپنی مرضی پر منحصر ہوگا۔ میں تمہیں صرف مجھے کا پسند
کروں گی اور اس کے عوض دنیا کی ہر آسائش سہا کروں گی۔ اب تمہیں ملن لینے چاہئے کہ
میں نہایت مہمان اور نرم دل عورت ہوں ورنہ تمہارے جیسے حالات میں جو لڑکیاں یہاں
پہنچتی ہیں اور تمہارے جیسے لڑکیاں بن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ انہیں ہانپتے چکی بجاتے ہیں
بہد جا کر دیتی ہے اور ایسے کارگر کے میرے پاس ہر ٹانگہ سے زیادہ موجود ہو۔ لیکن نہ
جئے کیوں میں انہیں استعمال کرنا نہیں چاہتی۔ خصوصاً تم پر۔۔۔

وہ کرسی پر نیم دراز ہو گئی جیسے بولتے بولتے تھک گئی ہو۔ پھر ہانپیں ہاتھ کی انگلیوں
سے اپنے کھلے بالوں میں تنگی کرنے لگی۔ اس کی سرکھٹ فٹم ہو رہی تھی۔ اس نے ہولند
میں وہ سری سرکھٹ پینا کر سٹکی اور وہ تین کھل لپٹنے کے بعد جواب طلب نظروں سے
میری طرف دیکھنے لگی۔

میں اب بھی بت نہی بیٹھی تھی۔ اس کی باتوں نے مزید دل کی شکایت دین زرم کر
دی تھی لیکن میں اب بھی نہ صرف ظاہری طور پر بلکہ باطنی طور پر بھی مزاحمت کی پوری
کوشش کر رہی تھی۔ اپنے احساس بے بسی کو مدافعتی تھی۔ میں اپنی رضامندی سے کسی بھی
نارک رکھنے پر قدم رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ بے فکر میں خانماں بھاد تھی۔ میرے دامن
میں تاریکیاں بھی تھیں ان تاریکیوں کو سینے میں میری اپنی رضا تو کبھی بھی شام نہیں رہی
تھی۔

”میرا جواب کبھی ہاں نہیں ہو گا گوہر جان! تم بلاوجہ وقت ضائع کر رہی ہو۔“ میں
نے بے تپے لہجے میں کہا۔ ”البتہ فہم و تشدد کے چٹکڑے استعمال کرنا چاہو تو کر کے دیکھ
لو۔ شاید کسی مقام پر میری قوت برداشت جواب دے جائے۔“

گوہر جان کا چہرہ ایک لمحے کے لئے سپٹ ہو کر رہ گیا۔ جیسے طاق پر رکھا چراغ بجھ
گیا ہو اور پوری دیوار میں تاریکی کا حصہ نظر آنے لگی ہو۔ تبم اس کے طرز عمل میں کوئی
تبدیلی نہ آئی۔ وہ اس صبر سکون سے ڈھکی سرکھٹ کے کھل لیتی رہی البتہ اب اس کی
نقریں میرے چہرے کے بجائے کمرے کی ایک دیوار پر مرکوز ہو گئیں۔ سرکھٹ فٹم کر کے
اس نے ٹوٹا ہولند سے اٹھ کر تپتی سے جھٹکے سلا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تمہارا انکار اقرار میں بدل جائے گا میری جان!“ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں
الان کر مسکرائی۔ ”اور بہت جلد۔“ اس نے جاتے ہوئے بولے سے میرا گان چھپتے پایا۔ اور

کہ تم سوچ بھی نہیں سکتی۔ باغرض کالوں نے۔ تمہیں بخش بھی دیا تو تمہاری صورت اور
گورے صاحبوں کی کھوپڑی بھی ہلک سے اڑانے کے لئے کافی ہے۔ اس طرح باہر جا کر
تمہیں جو حالات پیش آئیں گے ان سے سڑیل کا صحیح معلوم تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔
فرض کرو تم کسی خوشحال گھرانے تک پہنچ بھی نہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کسی
روز تنگم کی غیر موجودگی میں صلاب کی بہت تم پر غراب نہیں ہوگا؟

پلو ہم مزید فرض کر لیتے ہیں کہ تم جس گھرانے میں پانچوگی وہاں کے سب الزام
نہایت قیہ، شریک النفس اور خدا ترس ہوں گے لیکن تمہیں معلوم ہے کہ اس قسم کے
گھروں میں چوری پکاری ہو جائے تو کیا ہوتا ہے؟ انگریزوں نے ہندوستان کی پولیس کو تعینات
کا ایک سٹرا اصول بنا رکھا ہے جس پر وہ آنکھیں بند کر کے عمل پیرا ہیں اور وہ اصول یہ
ہے کہ اگر کسی طرح گھرانے میں چوری ہو جائے تو سب سے پہلے اس کے نوکریوں کو کار
کے اٹا کا دہان کی چوڑی اور پیر۔

اب تم خود ہی سوچو۔ اگر ایسے ہی کسی اٹا کا کے تحت تم بھی نعمت غیر مقررہ
بھوکے اور ترسے ہوئے ہندوستانی پولیس والوں کے ہتھے چڑھ گئی تو اس کا کیا حشر ہوگا؟
ذرا سوچو۔۔۔ چتر قصور سے کابلینے کی کوشش کرو کہ تھیل کے صحیح معانی تمہاری سمجھ
میں آئیں۔ اس نے خاموش ہو کر تیزی سے سرکھٹ کے دو تین کھل لئے اور لپٹ بھری
نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بازاری کھانا ایک سڑیل سی لیکن اس کے بعد
عورت سے شہر والوں سے بچ جاتی ہے۔“

”تم ہٹنا مرضی ہو گوہر جان!“ میں نے اٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ مگر یہ میرا
”خفی فیصلہ ہے کہ میں ہر روز ایک نئے شیطان کی ہوس کا نشانہ بننے کے لئے یہاں نہیں
رہوں گی۔“

”اے۔۔۔“ وہ غصہ سے کھل لپٹے ہوئے رک گئی۔ ”اب میں کجی۔۔۔ دراصل
تمہارے دامن میں بازار حسن کا اور خصوصاً میرے ہلا خانے کا بڑا قلعہ قصور ہے۔ گوہر جان
کا ہلا خانہ کسی سستی قسم کی جسم فروش جھینپی یا اومش کی اندھیر کنیا نہیں۔ جہاں ہر ایرا خیرا
اور سزا بیا آدی جیب میں چند کٹے ڈال کر چلا آئے اور میوہوں کی طرح اپنا مطلب نکال
کر چلا جئے۔

یہاں ایک نہیں کسی ہلا خانے چلتے ہیں۔ ایک کو تو میری بیٹی ہی چلاتی ہے۔ میں پر
صرف مجرای ہوتا ہے۔ بازار حسن کے بھی کچھ قوانین اصول اور اخلاقی ضابطے ہوتے ہیں
جن کا تفصیلی ہم تمہیں رفت رفتہ ہوا جائے گا۔ بہر حال جو تم سمجھ رہی ہو وہ ہرگز نہیں ہوگا۔
البتہ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ تم جیسے میرے پر کسی امیر زادے کا دل آجائے وہ اسے ملازم
رکھ لیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اسے گھر لے جاتا ہے اور اس سے بھانڈا برتن

ہوئے نہایت محبت سے تمہارے پھولے پھولے سرخ و پیید رخسار پر بوسہ دیا اور یوں نہیں گود میں اٹھا لیا گویا حسین اور ہارک پھولوں کے دھیر کو سمیٹا ہو۔ اس کی گود میں رہتے تھے کوئی مزاحمت نہ کی۔ ذرا سا کسمسے پھر مجھے پیچھے آتے دیکھ کر مطمئن ہو گئے۔ کمرہ نور پر آمدوں سے گزرتے جب ہم گولائی میں پھیلی ہوئی ہالکونی میں پہنچے تو میں نے دیکھا کہ اس حلقے کے قریب تمام کمرہوں کے دروازے منقل تھے۔ گوہر جان کھٹ کھٹ کرتی تھی سے پتہ قدم آگے چلی جا رہی تھی۔

دلستا مجھے اپنے عقب سے ملازم کی آواز ملتی دی۔ "بی بی! آپ کا مدلل گر آیا ہے۔" میں نے رک کر پلٹ کر دیکھا۔ ایک نفیس سا گلابی قرعہ شدہ مدلل قرش پر پڑا فاکریہ میرا نہیں تھا۔ میرے پاس کوئی بھی مدلل نہیں تھا۔

"یہ میرا نہیں ہے۔" میں نے ملازم کو بتایا اور چلنے کے لئے چلی تو دیکھا کہ گوہر جان کی قدم آگے جا چکی تھی۔ میں نے تیز چلنے کے ارادے سے قدم بڑھا دی تھا کہ اچانک میرے بازو پیچھے مثالی انداز میں خود بخود میری پشت کی طرف مڑ گئے اور پھر پیچھے وہ کسی فزادی قہقہے میں جکڑے گئے۔ میں ٹوٹ کر گرے گی مگر اس قہقہے نے گویا مجھے کھڑا رکھا۔ ایک لمحے کے لئے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا پھر احساس ہوا کہ دراصل اس ملازم نے عقب سے میرے بازو ہڑ کر اس طرح اٹھیں اپنے تحت ہانڈوں کے قہقہے میں جکڑ لیا تھا کہ میں اپنی جگہ بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔

"یہ کیا ہے ہو گیا۔" میں چلائی لیکن جلد میرے ہوشوں پر ادھورا رہ گیا۔ میری نظر گوہر جان پر پڑی تھی جو چلے چلے رک چکی تھی۔ میری طرف رخ کر کے اس نے اچانک نہیں دونوں ہانڈوں سے پکڑا اور پیچھے کی جگہ کر جنہیں جھولے دینے لگی۔ تمہارا نکاح سا دھو اب بہت بڑے کونوں سے مٹا رہی تھی۔ لیکن میں لٹکا ہوا تھا۔ عین حلقے چلے رکے برگی۔ نیلوں والا صحن کا فرش چمک رہا تھا۔ صحن کے وسط میں مجھے وہی شخص جن ہارشاہ بھی کھڑا نظر آیا جو ایک بار میری بے بسی پر دل کھول کر ہنس چکا تھا۔

جنہیں خوف زدہ سے انداز میں ٹھٹھکی ٹھٹھکی سی لائیں ہوا میں چلائے دیکھ کر اور تہرے رونے کی تواسن کر جیسے میرے دل کی دھڑکنیں رکنے لگیں۔ "یہ کیا کر رہی ہو گوہر جان؟" میں دہشت زدہ سی آواز میں چلائی۔

"اسے نیچے پیچنگ رہی ہوں۔" اس کی بے رحم آواز میرے کانوں سے ٹکر لی۔ اس کی آواز میں کسی بھی جذبے کا شعور نہ تھا۔ صرف موت کی سی ریخ بھگی تھی۔ نین دن پہنے میں نے جنہیں ہو ویکٹل کی تھی اگر وہ اب بھی تم نے گول نہیں کی تو میں حضور کو نیچے پیچنگ دلاؤ گی۔"

تمہارے رونے کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی اور اس میں دہشت کا عنصر تھ اور بیوہ

اپنا فراک سنبھالتی رخصت ہو گئی۔

ہر بار وہ ایک نیا شوشا چھوڑ کر میرے اصرار میں پھل سی چاکر چند دن کے لئے غائب ہو جاتی تھی۔ صورت بھی نہیں دکھائی تھی۔ اس بار بھی وہ عین دن غائب رہی۔ چوتھے دن وہ آئی تو اس کے ساتھ مجھے ہوئے جسم کا ایک پتہ نہ ملازم بھی تھا۔ جسے میں وہ ایک مرتبہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ گوہر جان آج خوب ہی شغی تھی اور اس کی حرکات و سکنات سے ایک دایا سا اثر جھلک رہا تھا جیسے کچھ وہ کسی خاص مہم پر تھی ہو۔

"کو آج جنہیں ایک تہشا دکھاؤں۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھاتے ہوئے پہلے میں اس وقت جنہیں سب کی پتہ منگی منگی کلا کر بیٹھی ہی تھی۔ تم کھانچے کو گھوڑا جیسے اس پر چڑھے بیٹھے تھے اور خوب اچھل کود کر رہے تھے۔

"کیا تہشا؟" میں نے مشکوک سی نظروں سے اسے گھورا۔

"کو تو سنی چہا! ایسی گھبرانے والی کیا بات ہے۔" اس نے بچوں کی طرح مجھے چکارا۔ "جنہیں ارا پیچھے تک تھل رہے ہیں۔ جنہیں کچھ میرا دل۔ شاید جنہیں میری راہد حلی پند آجائے اور تم بھی اس کی ایک شزاوی بننا پسند کرو۔" اس نے کھینچ کر مجھے الجھایا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ مجھے تمہاری راہد حلی دیکھ کر تم سے اور بھی زیادہ نفرت ہو جائے۔" میرے ارادے اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائیں۔ "میں نے جارحانہ لہجے میں کہا۔ میں اس کے عین مقابل کھڑی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ وہ نہ کالھ میں میرے ہی برابر تھی بلکہ اس کے کندھے کچھ زیادہ چوڑے تھے اور کسی حد تک مواد سی سہاست کے تھے مگر نہایت طور سے دیکھنے پر ہی اس امر کا احساس ہوتا تھا ورنہ جسم سے دھیرے دھیرے پھوٹی فری اور داخلی عمر کے باوجود اس عورت کا جسم سر سے پاؤں تک متناسب اور قیامت خیز تھا۔ ارباب نے ایک مرتبہ مجھے تاپا تھا کہ بیٹھ ریاض جاری رکھتے والی رگھوناتوں کے جسم سدا بہار ہوتے ہیں۔

"تو تم مجھ سے نفرت کرتی ہو عزیزہ خانم!" وہ ایک انگلی سے میری نوزی چھوتے ہوئے میری آنکھوں میں "جنہیں ڈان کر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ کو میں کوئی معنی نہ دے سکی۔ "ایسا مت کرو عزیزہ خانم! گوہر جان سے آج تک کسی نے بھی نفرت نہیں کی۔" میں نے سرگوشی سی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

ملازم نے جنہیں گود میں اٹھانے کی کوشش کی تو تم نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ جھٹک دیے اور پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ جنہیں منہ پھلانے جسے سے ملازم کو گھورنے دیکھ کر گوہر جان بے اختیار ہنس دی اور میرا ہاتھ چھوڑ کر تمہاری طرف بڑھی۔

"لو بھئی!۔۔۔ اپنے شزاوے کو تو ہم خود اٹھ نہیں سکتے۔" اس نے ہانڈ پھیلائے۔

انہیں لمبے میں کیا۔

”تمہیں ابھی مزید آرام کی ضرورت ہے۔“ اس نے مہرے سانس لے کر کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”بپ میں چلتی ہوں۔ تمہارے سرہانے ٹیشی میں دوا رکھی ہے۔ ہونے کے چھ قطرے پانی میں ملا کر رات کو پی لیتا۔“

”ہاں سنو گوہر جان!“ دفترا میں لے آئے پکارا۔ وہ چلتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ”بجب ہتھکڑیاں تمہارے تم کئی بلا خالوں کی بانگ ہو اور ہر بلا خالے پر ٹاپنے والی کئی لڑکیوں کی آمدنی تمہیں ہی آتی ہے تو تم مجھے بھی پھلنے پر ان کی مصرکیوں ہو؟ مجھ اکیلی کے نہ ہونے سے تمہاری دنیا میں کون سی کی واقع ہو جائے گی؟“ وہ مہمانہ انداز میں مسکرائی۔ ”کبھی تم نے کسی جوہری سے پوچھا کہ بپ اس کے پاس پہلے ہی ٹیکھوں میرے موٹی موجود ہوتے ہیں تو وہ مزید بھول کی خرید و بیکشت میں کیوں جان کیا کرتا ہے؟ کوئی اور اچھا بیڑا دیکھ کر کیوں اس کی راتوں کی نیچہ حرم ہو جاتی ہے۔ کبھی تم نے کسی کارخانے دار سے پوچھا کہ جب اسے دنیا کی ہر سائنس میں مہارت ہے تو وہ کیوں مزید کارخانے لگانے کی بجائے دوزخ میں پھانسا رہتا ہے؟“

میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ شاید میری حسابات صحیح طور پر بیچارہ نہیں ہوئی تھیں۔ تاہم میں نے گوہر سے ایک اور سوال کر دیا۔ ”قرض کر دو میں اپنے وعدے سے باز چلوں؟“ سوال کرتے ہی مجھے خود بھی اس کے کچھ پن کا احساس ہوا اگر اب تو اتفاق سے لگن ہی چکے تھے۔

گوہر جان کی مسکراہٹ کچھ پھیل گئی۔ ”تم بھی نہیں ہو۔ تمہارا بچہ بھی نہیں ہے۔ اس مرتبہ تم تک لگتی کی نسبت بھی نہیں آئے گی۔ اس نے نہایت سرسری سے لمبے میں جواب دیا اور ساتھ ہی کہا۔ میں وعدہ خلافوں کی بڑی مخالف ہوں۔ اور تم پر مجھے رحم نہیں آتا۔“

میں انداز لگانے کی کوشش کرتے لگی کہ اگر رحم دلی کا دعویٰ کرتے ہوئے اس صورت کا یہ عالم تھا تو جب بے رحمی پر اترتی ہوگی تو نہ جانے کیا توہمیں ڈھاتی ہوگی۔ چند لمبے وہ پشت پر ہاتھ رکھے کھڑے میری آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ پھر تمہیں سے انداز میں سہلا کر باہر کو بل دیا۔ آج اس کی چٹن کچھ بدلی بدلی سی تھی۔ ہزل دلوں کی اس تھکتی چٹنی چال میں۔ اور اپنی مرتبہ میں اسے سرگرمی کے بغیر دیکھ رہی تھی ورنہ تو ہوش نہ سرگرمی کے کش لے رہی ہوئی تھی یا کم از کم ہولند اس کی انگلیوں میں ضرور دبا ہوتا تھا۔ چند دن بعد میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ مجھے استاد فتح باب خان کی شامروئی میں دیکھنے کی رسم پڑے انتہام سے ادا کی گئی۔ پورے مکان میں چراغیں لگائی گئی تھیں۔ مرتبہ چوکنہ گوہر جان کو میری طرف سے کسی مزاحمت کا غلطہ نہیں تھا اس لئے مجھے ایک

سے جسے ہل کو اس تقریب کے لئے آرامتہ کیا گیا تھا اور عمارت میں رہنے والی تقریباً ۱۵۰ لڑکیاں نئی سنوئی وہاں جمع تھیں۔ جیسے شادی کی رسومات میں شرکت کے لئے آئی ہیں۔ ان میں سے بیشتر لڑکیاں گوہر جان ہی کے بلا خالوں پر تاجی تھیں اور ہاتی اس ہرج میں اس کی کرایہ وادوں کی حیثیت سے رہتی تھیں۔ ان کی ٹاپیکائیں بھی ان کے ہاتھ ہی رہتی تھیں جو عموماً ان کی مائیں ہی ہوتی تھیں۔ ان میں سے کوئی گھرانہ جب کچھ اندر داخل ہوتا تھا تو کہیں ایک مکان لے لیتا تھا۔ گویا یہ ایک طرح سے بازاری عورتوں کا محل تھا۔

استاد فتح باب کی بیوی میں بپ اپنی مرتبہ میں لے سا۔۔۔ دے۔۔۔ گا۔۔۔ ا کی صدا بلند کی تو میرا جسم گویا چھرا سا گیا۔ چہرہ طرف سے مجھ پر پھولوں کی پتیوں سے لگیں۔ ایک گوشے میں بیٹھے سائنسوں نے سائنس شروع کر دیا اور لڑکیوں نے جو ہٹ کر میں ہانچ کر لڑکیوں کی فٹل میں رقص کرنا شروع کیا تو گویا راجہ اندر کے کڑے کا ساں بندھ گیا۔ لڑکیوں نے استاد فتح باب کو بھی کھینچ کر اٹھایا اور اس گھول سے نہن کو رقص کرتے دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ یوں تو اس کا جسم ہڈیوں ہی کا مجموعہ تھا مگر رقص کرتے دیکھ کر کتنا شکل تھا کہ اس کے جسم میں ایک بھی ہڈی پائی جاتی ہے۔ اس کے اعضاء پانی کی طرح بہہ رہے تھے۔

میں دم بخود بیٹھی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ گوہر جان میرے پاس ہی بیٹھی تھی جو فٹل سے گھٹ کر نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس میں کا سا ظاہر تھا جو اپنے جوان بچے کے سر پر سہا سہا کے اسے چاہنے لگی ہو۔ لڑکیوں کی لڑکیوں رقص کرتے کرتے ہمارے گرد طواف بھی کرتی جا رہی تھیں۔ اس طرح اس دوزخ حقیقت صرف رسم ہی ادا کی گئی اور میرا سبق صرف ”سا۔۔۔ دے۔۔۔ گا۔۔۔“ تک ہی محدود رہا۔ رات کو انواع و اقسام کے کھانوں سے بہت پیادہ ستر خوں سہا اور نہایت پر تلف خیاالت رہی۔

رات کو جب مجھے تھمائی ہمسرائی اور میں تمہیں لے کر سونے کے لئے لیٹی تو نہ ہونے کیوں تمہیں پیچھے سے چٹا کر بے فحاشا رو دی۔ آنسو یوں لڑے چلے آ رہے تھے جیسے برسوں سے تنگ پڑے درد کے سونے لٹل پڑے ہوں۔ مجھے دوتے دیکھ کر تم نے بھی منہ نورہ شروع کر دیا اور تمہاری آنکھوں سے آنسوؤں کو دور رکھنے کے لئے میں نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لئے۔

میری اصل تربیت دوسرے دن شروع ہوئی۔ استاد نے بتایا کہ مجھے اس کے لئے نڈان کم از کم پانچ گھنٹے وقت دینا ہوگا۔ میرے پاس وقت کے سوا تھا ہی کیا؟ اور فی الحال بھی تقریب اس کی کوئی وقت نہیں تھی۔

دن گزرتے گئے۔ ایک ہفتہ ایک طویل برس گزر گیا۔ مجھے یہ بتانے میں عار نہیں

تھا۔ زمانے کے قریبے مجھ پر بہت جرح پکے تھے اور مجھے یہ سب چکانے تھے۔ بوجھ اتنا
 بڑھ گیا تھا کہ اسے ساتھ لے کر مجھے خدا کے حضور میں پیش ہوتے ہوئے بھی شرم
 تھا۔ کیونکہ اس نے مجھے اشرف المخلوقات بنا کر زمین پر بھیجا تھا۔
 جو کچھ میں سوچ رہی تھی اس کا سارا دار و مدار اب صرف تم پر تھا اس لئے میری
 آنکھیں تمہاری جانب بڑھ گیا وہی مگر اس تھیں۔

○

کہ رفتہ رفتہ میں نے اس وحیل سے سمجھ کر لیا تھا۔ میرے لئے اس کے سوا کوئی چار
 نہیں رہا تھا۔ میں نے سردیوں کی طویل اور سولی راتوں میں یاد اپنے بند پر لپٹے لپٹے چھو
 ۶ فکرتیں بھائے اپنی مرتبہ کئی کئی گھنٹے کے لئے صورت حال کے بارے میں سوچا تھا کہ
 میری کہنیاں دیکھنے لگ جاتی تھیں۔ مگر مجھے کوئی تہلہ راستہ نہ ملا۔ زمانے کی ٹھوکر میں
 رہنے والا تجربے کی اس بات میں واقعی سکت نہیں تھی اور پھر میرے ذہن میں جو ایک
 وحید اور حیدر سا منصوبہ پڑا۔ پھر یہ تھا اس لئے بھی میں نے بالادری صورت بنانا چاہا کہ
 تھا۔ مجھے اب کچھ طاقت اور مضبوطی درکار تھی۔ محض وہاں اور وہاں پر کھینچ کر کے
 میں نے دیکھ لیا تھا۔

مستقل کے لئے اب میں ایک نئے نام سے اپنے وجود کو پہنچ رہا تھا۔
 مجھے یاد تھا کہ عقلی مرحلہ کس کس انداز میں مجھے اجازت دیا تھا اور مجھے یہ بھی یاد تھا کہ
 ادب کے قتل کے بعد نواب شرافت میں کا سامنا ہونے پر میں نے سوچا تھا۔ "نیک ہے
 نواب! یہ تمہارا وقت ہے۔ جو جی چاہے کہہ دو اور جو جی چاہے کہو۔ اگر آج تم دوبارہ میرے
 نشیمن پر کھلی بن کر نہ نہ لے ہو تو شاید میں تمہیں سبک کر دیتی۔ رفتہ رفتہ وہ لائق
 فراموش کر دیتی جو تم نے مجھے پہچانی تھیں۔ میں اپنا اور تمہارا معاملہ خدا پر چھوڑ دیتی۔
 لیکن اب میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گی کیونکہ پہلے تم نے مجھے اس طرح بھڑکایا
 کہ تھا جس طرح اب اجازت ہے۔ تمہاری یہ سکر۔ مسکراہٹ ایک گھبراہٹ کی طرح میرے دل پر
 نقش ہے۔ اور آج میں جہد کر رہی ہوں کہ اگر زندگی نے مجھے مسرت دی تو تم بھی دیکھو
 گے اور یہ دنیا بھی۔ کہ عورت اگر ایک بار انعام لینے پر اتر آئے تو ایسی مثالیں چھوڑ
 جاتی ہے۔ جنہیں صدیوں تک دہرایا جاتا ہے۔

مجھے اپنا یہ عہد یاد تھا۔ کیونکہ میرے ذہن میں اپنے بے گناہ باپ کی بے گورہ
 کنش دوش کی یاد بھی نقش تھی۔ مجھے اپنے کنوارے خواہوں کی دنیا اجڑنے کا سہل بھی یاد
 تھا۔ مجھے سردیوں کی ذہریلے دھنوں کی آواز بھی نہیں بھولی تھی۔ مجھے نواب کے بڑی
 خانے کا وہ بڑا پتھر قرض بھی نہیں بھولا تھا۔ جس پر مجھے اس طرح وحشی قیدیوں کے
 سامنے پھینک دیا تھا جس طرح دامن بادشاہ اپنے مستحب کو بھوکے شیروں کے آگے
 پھکوا دیتے تھے۔

ادب کو قتل ہوتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ تین جب بھی
 میں اس کے حقیقی سہیلی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے لو کی ایک چادر سی لگی جاتی
 تھی۔ مجھے اپنی بیٹی کا چھڑنا بھی یاد تھا۔ مجھے وہ ٹھوکر بھی یاد تھی جو نواب کے بلائی گاڑ اس
 سیاہ قام جات نے تمہاری ٹانگہ کی پٹیل پر رسید کی تھی۔ مجھے گورہ چن کے ہاتھ میں ایک
 بے وقعت چادر کی طرح تین حیل کی بلندی پر تمہارا جھولنا اور وہشت لہو ہو کر رونا بھی

یہ ان سحلات میں میں کسی دوسرے فرد سے چلوہ خیال تو درکنار کسی کو لن اراول کی باہمی تینے دنا نہیں چاہتی تھی۔

اسی سال کے وسط میں ایک عجیب حادثہ ہوا۔ آج بھی اس کے بارے میں سوچتی ہیں تو کوئی توجیہ ذہن میں نہیں آتی۔ وہی کتوں نما مکان جہاں ہم سب رہتے تھے اور اس کا ہم گوہر جان نے اپنی ماں کے نام پر "کاشانہ عشرت" رکھا ہوا تھا اس کی تیسری دفن کی ہالکونی میں کھڑی ایک دودھ گورہ جان سگریٹ پیا رہی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہم باہر تھے وہ پہلے سو کر اٹھے تھے۔

میں طبیعت کی کسلندی اور سستی دور کرنے کے لئے اپنے رہائشی پر رشن کے لانے ہالکونی ہی میں تھمارے ساتھ تھیں رہی تھی۔ دودھ گورہ جان کو میں صاف طور پر دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اس کی طرف سے مدہ موڑا ہی تھا کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا۔ میں نے ہڑیا کر پلٹ کے دیکھا میں اس مقام سے ہالکونی کا دو اعلانی گز کا نوا تائب تھا جہاں گوہر جان کھڑی تھی۔ اس جگہ ہالکونی کے فرش میں ایک عکس رہ گیا تھا۔ اس اب فرش کے کناروں سے لوسہ کی ان سلاخوں کے مڑے ہوئے سرے نظر آ رہے تھے جو قبیر میں استعمال ہوتی ہیں۔

ان سلاخوں کے جوڑ بھی نہ جانے کس طرح طیارہ ہو گئے تھے۔ انہی کناروں سے اس وقت بھی سینٹ اور بجری کا آمیزہ خشک بھر بھری مٹی کی طرح بچے کر رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے یہ آمیزہ گرنا بند ہو گیا اور فکرت فرش کے نامہوار کنارے میری آنکھوں کے سامنے تازہ دھم کی طرح چمکے رہ گئے۔

ایک لمحے کے لئے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ ہوا کیا ہے۔ پھر اضطراری طور پر نو کر میں نے ہنگے پر سے نیچے بھاگا۔ ہالکونی کے فرش کا منوں دہنی وہ حصہ لوٹ کر چلی۔ اصل کی ہالکونی کو بھی معطلی سا نقصان پہنچے ہوئے پیدا حاکم میں جا کر گرا تھا اور اس کے ساتھ ہی گوہر جان بھی۔

فرش کے اس کھڑے کے مزید کسی کھوہ ہو سکے تھے اور اس کی پھیٹ میں آیا ہوا گوہر جان کا کوسے سے زیادہ پھلا دھڑ پھلا جا چکا تھا اور لٹوہے میں تہلہ ہو چکا تھا۔ اوہی دھڑ بھی مسخ شدہ سی حالت میں ترچہ پڑا تھا۔ پہلے مجھے یہی گمان گزرا کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔

کوئی ہستی جس پر لوال آتا تھا ملتا ہوا یوں کسی لمبی طاقت کے ہاتھوں نازک کی کلی کی طرح سسلی جاتے تو یہ بات حواس کو کچھ ابلوئی سی لگتی ہے اور فوری طور پر اس یقین نہیں آتا۔ اور یہ تو کوئی ابلوئی سی ابلوئی تھی ا پوری ہالکونی سلامت تھی اور

فرش اناں

ایک برس میں میں کچھ سے کچھ بن گئی تھی۔ بلاشبہ مجھ پر بہت محنت کی گئی تھی اور اس سے زیادہ قابل ذکر بات یہ تھی کہ اندر کی مزاحمت نے دم توڑا تو میچوں کے لالچے دلوں میں طے ہونے لگے۔ میں نے تربیت کے تقریباً دسویں مہینے مجرا شروع کیا اور دوا کے اندر اندر امیر زادوں کے طبقے میں کھلی کا دی۔ گوہر جان دلوں انہوں سے دولت سمیٹ رہی تھی اور میری دیکھیں لیتے نہ تھکتی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے دھڑے پر بھی قائم تھی۔ ابھی تک اس نے مجھے جسم لودھی پر مجبور نہیں کیا تھا۔ حالانکہ "ملازمت" کی کئی سڑی ٹپٹیں کٹیں آچکی تھیں۔ مگر شاید وہ لٹوہوں کی آمد رکھنا چاہتی تھی۔ یہ آمید عورت ہوتے ہوئے بھی!

اب مجھ پر ہر طرح سے اعتبار کیا جانے لگا تھا۔ مجھے کسی غلام دغیر کو ساتھ لے کر کہیں بھی آنے جانے کی آزادی تھی۔ وہ چڑچاہتی مٹکا سکتی تھی۔ دل کی افسوگی اگر بہت ہی بلاقی تو کسی دن رقص کرنے سے انار بھی کر دیتی تھی اور کوئی مجھے مجبور نہیں کرتا تھا۔ مجھے پھینک بھی آجاتی تو کسی کئی حکیم اور واکٹر بلائے جاتے تھے۔ زیورات اور دھیرے دھیرے میرے سامنے رہتا تھا۔

میں اکثر مرشام اپنے ہا خلع کی ہالکونی میں کھڑے ہو کر تھی تھی آنکھوں سے گرمی بازار کا تماشا دیکھا کرتی اور نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی۔ میرے سامنے اب ایک مسئلہ دھیرے دھیرے سر اٹھا رہا تھا اور وہ نہایت اہم تھا۔ تم ہوش مند ہوتے جا رہے تھے اور دن بدن وہ مرقوبہ آدی تھی جب گرد پیش اور ماحول کے نقوش ذہن پر ثبت ہونے لگتے ہیں۔ مگرے نہیں تو ہنگے ہی سی۔ یہ خشک تم گھر پر ہی رہتے تھے۔ لیکن پھر میں نے تمہیں ضمیمہ و تربیت اور اپنی چاقی آنکھوں سے دیکھے ہوئے خوابوں کی تکمیل کے لئے باہر تو بھیجا ہی تھا۔ اور ایک بار تم گھر سے نکلے تو تھمارے ذہن پر ماحول کے نقوش ثبت ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔

اس عمر سے بہت پہلے میں تمہیں یہاں سے کہیں دور بھیج دنا چاہتی تھی لیکن مجھ کچھ میں سوچتی تھی اس کے لئے فی الحال کوئی واضح طریق کار میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

اس کا تعاقب کیا تھا۔ مجھے اس پولیس رپورٹ کی نقل تک مل سکی تھی جو انسپکٹر نے کوہاٹ پر اپنے دوڑنے میں درج کی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق عیدانہ توڑے گھٹے کے خاقب کے بعد بلاخر گولیوں کی بوچھاڑ کی زد میں آگیا تھا اور ایک برساتی ٹالے کے قریب دھیرے دھیرے رپورٹ میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ زندہ یا مردہ حالت میں کوئی ہائی بھی پائی گئی تھی۔ میرے ایجنٹ نے اس انسپکٹر سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ جو رپورٹ اس نے دوڑنے میں درج کی تھی 'واقعاتی اہتمام سے سولہ دوسرے تھی۔ تو پھر آخر مریم کیس کی تھی؟ اس سوال نے کئی راتوں تک میری نیند اڑائے رکھی تھی۔ بار بار میں نے رپورٹ کو پڑھا اور بلاخر میری نظر ان الفاظ پر اکتب کر رہ گئی تھی جن میں اس جگہ کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ جہاں عیدانہ دھیرے دھیرے برساتی ٹالے اس لاش میں سب سے اہم تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ مریم اس کے ہاتھوں سے پھوٹ کر ٹالے میں جا گری ہو۔ میں نے ایک بار پھر پانی کی طرح بہا۔ کئی کارندوں کو ایک اہم کام پر نیندات کیا۔

برساتی ٹالے کے دونوں کناروں پر جانے وقوعہ سے لے کر اس کے برآمد کے رخ پر آخر تک جھٹی بھی آباد تھی۔ اس کے ایک ایک ٹکڑے کو کپڑا ایک معلوم ہی ہوا کہ یہ کون سے تاروں میں یا اس کے بعد بھی یہاں اتنی کم عمری کی لاش کبھی نہیں پائی گئی تھی۔

غریبہ میں نے اپنی کوششوں میں کوئی کی نہ چھوڑی تھی اور جب سے میرے ہاتھ میں آنا شروع ہوا تھا۔ میں نے اس کا بیشتر حصہ اسی کام پر صرف کیا تھا مگر مجھے وہی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ مریم کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ ارباب کے حلق بھی کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ البتہ اس کے حلق یہ بات چینی طور پر معلوم ہو گئی تھی کہ پولیس کو جو لاش ملی تھی وہ بری طرح جھلس ہوئی تھی۔ اس کی کوئی شناخت باقی نہیں تھی۔ پولیس نے صرف سونے کے ایک لاکھ کی موجودگی کی وجہ سے اسے ارباب کی لاش قرار دیا تھا۔ ان کی تحقیق کے مطابق یہ لاکھ دہانت انجوس عظیم کے سربراہ کی واحد شناخت تھا۔

لیکن محض اس ایک لاکھ کی وجہ سے میرا یہ تسلیم کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ لاش ارباب ہی کی تھی۔ میری یہ بے چینی اس واقعہ پرست روی کی آخری پس بھی ہو سکتی تھی جسے وہ آخری سانس تک سچے سے لگائے رہی ہے۔ یہ ایک حقیقت بھی ہو سکتی تھی اور محض ایک طوطی بھی۔

اس رات نہ چلنے کیوں ہوا شدت سے ہی چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد چاند طرف سکوت طاری ہو جائے۔ کائنات پر موت کا سنا چھا جائے۔ معمول کے مطابق دھیرے دھیرے سکوت پھیلنا شروع ہوا۔ چار بجے کے قریب بلاخر سنا چھا گیا۔ کبھی کبھی

سانے والی دونوں بڑی بڑی جیروں میں دو کتے بھی ٹھہری ہوئی تھیں۔

وفا نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے صرف اتنا بتایا کہ اس کا نام الیزبیت ہے۔ وفا نے اسے میرے کمرہ لکھتے میں بٹھایا۔ وہ بیٹھتی ہی اپنی پیش سے انگریزی کا ادب لال کر اس کے مطالعے میں غرق ہو گیا اور وفا میرے ساتھ اندر بیٹھ دوام میں آگئی۔

"میری! میں آپ کو ایک راز کی بات بتانے گئی ہوں۔" اس نے اسی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا جس پر عموماً اس کی ماں آکر بیٹھا کرتی تھی۔ جیسا کہ میں بتاتی ہوں کہ وفا مجھ سے پہلے چھ سال بڑی تھی اور دیکھنے میں بھی بڑی نظر آتی تھی مگر میرا لہجہ احرام کرتی تھی اور مجھ پر بھروسہ بھی کرتی تھی۔

"کیسی راز کی بات؟" میں نے اس کی آنکھوں میں بھاٹکا۔

"میں گرج دانت الیزبیت کے ساتھ گزار رہی ہوں۔" اس نے سرگوشی کی۔ مکمل ہم شادی کر لیں گے اور سنیچر کو ایک بڑی جماعت میں سے انگلستان روانہ ہو رہا ہے۔ اس میں ہماری نشستیں ریڑھوں پر ہیں۔ میں ہندوستان کو الوداع کہہ کر جا رہی ہوں میرے اہل اور الیزبیت اب انگلستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں بھٹ جہاں میں اس کے آبائی گھر میں ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ میں یہ اطلاع دینے کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ بھی دینا چاہتی تھی کہ میرے ہلا خانے کا انتظام سنبھال لیجئے گا۔ وہاں بھروسے کی کسی بات نہ ملے مگر کہہ دیجئے گا دورہ وہاں "کام" کرنے والی دونوں لڑکیاں بے شمار ہو جائیں گی۔ میں نقدی اور زور و غیرہ سب لے جا رہی ہوں۔"

پھر وہ الوداعی انداز میں مجھ سے ملے لی۔ میں کمرہ لکھتے تک اس کے ساتھ گئی۔ تو جہاں الیزبیت اخبار کے مطالعے میں غرق تھا وفا کے حلق کرتے پر وہ چڑھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ من کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ لی اور وہ تک خیالوں کی دنیا میں بہنے لگی۔

دھیرے دھیرے وہ چو اندھیرے میں گھل گیا۔ شاید میرے قصور کی گرفت تھوڑی اس لئے جھمکتی تھی کہ مجھے اب تک کامل یقین نہیں تھا کہ ارباب یہ واقعی مرگے ہے۔ اس لئے میں اپنے قصور میں اسے ہمیشہ زندہ دیکھتی تھی۔ ارباب کے قصور کے ساتھ ہی مریم کا یاد کا ذکر بھی ہر اتوار جاتا تھا۔ کچھلے ایک سال میں زہرا کی خیر ذرا بچ سے میں نے اس کا سراغ لگانے کی کوشش کی تھی۔ خود سامنے آنے کا خطرہ تو میں مول نہیں لے سکتی تھی کہ کہیں ارباب کی "مناصم" یہ "کی حیثیت سے میری شناخت عمل میں نہ آجائے۔

اس شخص کے لہجے میں نے اس انسپکٹر تک کا سراغ لگایا تھا جو قیامت کی اس رات کو اس پولیس پارتی کی قیادت کر رہا تھا۔ جس نے عیدانہ پر گولیاں برساتی تھیں۔

”اور کس وقت پر لکھے ہوئے کسی سیاح کی دہل سٹائی دے جاؤی تھی اور ہں۔ غیر یہی
”کھوں سے کوسوں دور تھی۔ تم اب دوسرے کمرے میں غلام کے ساتھ سونے لگے تھے
میں تھا اپنے بہتر پر سناٹ لیٹی ہوں چست کو گھور رہی تھی جیسے مہرے جتے ہی کوئی دھماکا
ہو جائے گا۔“

اور پھر میرے لیے بطوری دعا کہ ہو گیا۔

ایک نہیں۔ ”..... تم۔ چار۔ اور پھر وہی لاقصدی سکوت ہر دھڑکنے پر میرے جسم میں جیسے کوئی نرس کھینچتی رہی۔ ابو اندر ہی اندر پیہتا رہا۔ زندگی اندر ہی اندر سنکتی رہی۔

پھر راحہ "میری خواب گاہ کے دروازے پر کسی نے انگلی سے نصیحت نہیں کی دھک دی۔" "ہاں لی بی۔" "تپ جاگ رہی ہیں؟" یہ میری خاموشی خاص تھی۔
بہشتی تمام میں نے اپنے آپ کو ہستر سے اٹھایا۔ ایک بار جسم حرکت میں کیا تو مجھے یوں لگا کہ میں نے ہلکے سے وہ دروازہ کھولا۔

سہیلی بی بی! آپ نے کوااا سن؟ کہیں گولی چلی ہے۔۔۔ " غلام نے کہا۔

میں نے کوئی خواہش نہ کی اور اسے وکیل کر بیڑیوں کی طرف دوڑی ہے موان
خانے کے تمام کمرے خالی تھے۔ جن بادشاہ بھی اپنے کمرے میں نہیں تھا۔

میں نے دودانہ کھولا اور ایک طرف کو دوڑ پڑی۔ میں نے عقیلی گلی کی طرف سے
دکان کی دیواریں کا رخ کیا۔ میرا اندیشہ درست ہی نکلا۔ عقیلی محنت کا دودانہ نکلا تھا۔ الیگزینڈر
کی لاش چوکھٹ سے باہر کی طرف پڑی تھی۔۔۔ اور دکان کی لاش چوکھٹ سے اندر۔ دونوں
کے ہاتھ عالم فطرت میں قفلہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے تھے مگر چوکھٹ تک پہنچنے پہنچنے
ساکت ہو گئے تھے۔ مگر سے نکلتے وقت پیچھے الیگزینڈر آگے آگے تھا۔ اور دکان پہنچے۔ گولیاں
کھا کر الیگزینڈر پیچھے کافی آگے جا کر گرنا تھا اور اس نے پلٹ کر دکان تک ہاتھ پہنچانے کی
کوشش کی تھی کیونکہ گلی کی گرد آلود پتھروں تک سڑک پر اس کے ٹھیسے کا طون تھا
نہیں تھا۔ دکان گولی کھا کر لوندھی مری تھی اور وہ الیگزینڈر کی طرف ہاتھ بھی پوری طرح
بڑھا نہیں پائی تھی اس کی انگلیاں چوکھٹ کی لکڑی پر ٹھیک کی طرح جم چکی تھیں۔

دلوں کو وہ دو گولیاں ماریں گلی تھیں اور ایک سی جھول پر۔ اسٹینڈر کی بھی پالیوں اور سینے میں سوراخ تھا اور دلا کے بھی۔ کچھ مرد آپکے تھے اور شاہ مجذوب کے عالم میں کھڑے تھے کہ کیا کیا جاسے؟ تین لڑکیاں اور گیلری میں دہشت کے مارے سبکت کھڑی تھیں۔ صرف ایک بڑھیا سینے پر دو ہتھ مار کر تین کر رہی تھی۔ اگر وہ خاموش ہو جاتی تو ماحول پر شاہ ایک سبکت تصور کا گمان ہوتا۔

میرے آنے پر ہاتھوں کی جھنجھاوٹ شروع ہوئی اور شاید کسی نے مجھے غائب بھی کہہ لیکن میں نے کسی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ میں ان چار مستحقوں کی طرف بڑھی بلا تعلق سے انداز میں کھلے دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے۔ ان میں سے دو کے کمرے تو بالکل صحن کے رخ پر تھے۔ یعنی اگر ان کے کمرے کے دروازے دوا سے بھی کھلے ہوتے تو یہ اوپر سے آنے والے ہر انسان پر نظر رکھ سکتے تھے۔ میں ان کے ۴۴ میں جا چکی تھی۔ مگر صورتوں سے انہیں پہچانتی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک کو گریبان سے نکالا۔

ہم نے نقل کیا ہے ان دونوں کو؟ میرے لفظوں میں میری روح کا سارا تھکاؤ و
 نصب شاہنشاہ تھا مگر پھر بھی میری گواہ ایک مرکوشن سے زیادہ بلند نہیں ہو سکتی تھی۔ سوال
 کے ساتھ ہی میں نے باری باری چاروں کی شکل خور سے دیکھی۔

”ہم کو کیا معلوم؟ ہم تو سوچا پڑا تھا۔“ اس نے جواب دیا جس کا دل نے گھبراہٹ
 بکھیر رکھا تھا۔

تو تمہیں یہاں اس لئے رکھا جاتا ہے کہ پڑے سوتے رہو؟ خواہ کوئی یہاں لاشوں کے اقدار لگا جائے۔ میں نے اس کے منہ پر لٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ اس نے سر کو یوں جھکا دیا جیسے ایک لمبے کے لئے اس کی نظر و عند لاگتی ہو پھر وہ رخسار پر ہاتھ بھانکر کہنے لگا تو زنجیروں سے مجھے گھومنے لگا۔ اس کے ہاتھوں کے گوشے سے خون کی ایک تہی سی کثیر ٹھری پر پڑنے لگی تھی۔

جہاں ان میں سے کوئی بھی ہو سکا تھا اور وہ بھی میں ممکن تھا کہ وہ ان کا کوئی ساتھی رہا ہو جو اب تک بچائے گئے تھے۔ کہاں پہنچ چکا ہو۔ ساتھ نکل چکا تھا اور کھیر چنے کا کام میں پولیس کے لئے پھوڑ دینا چاہتی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اپنی بدلتی کی مشق کو کام میں لانے کی کوشش کی اور ذہن میں ہر کسی آگ کو بھٹکل تمام سر دے دیا۔

اس کا گریبان چھوڑ کر میں دھاک لاش کی طرف چلی۔ اس کا ایک رخسار مہن کے فرش پر تھا، اقلہ ملائم رہی بال دوسرے رخسار پر سے ہوتے ہوئے خون تھوڑا قرش سے چپ کر رہ گئے تھے لیکن خون میں تھوڑے کے پانچو ان کا ملنا پن اب بھی طبعہ ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی کھلی تھیں اور ان میں آن کا وہ رنگ اب بھی نمود تھا جو نہ پہلے گھر سے رخصت ہوتے وقت لے کر چلی تھی۔

موت کی حالت اور تشییع کے بعد ہر انسان کے لئے جو کچھ ہے اس کا مقصد ہی
 سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کے لئے جو کچھ ہے وہ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کے لئے جو کچھ ہے

راہ پر پہنا قدم رکھتا ہے۔۔۔ اور مجھے یاد آیا کہ اس نے کتنے مسودہ انداز میں میرے بلکے میں بائیس دان کرکٹا تھا۔۔۔ عین اسی ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہی ہوں۔ یہ گزشتہ شام ہی کی تو بات تھی۔ ابھی تو ان افلاک کی ہازگشت بھی میرے ذہن میں مدغم تھی۔

نئی زندگی کی لوبہ مجھے سٹلے والی وہ پارہ صفت لڑکی خاک و غرت میں تھری ایک مسئلہ ہوئی تھی کہ طرح میرے قدموں میں پڑی تھی۔ جسے اس نے بڑے چاؤ اور امید سے اپنا ہم سفر چنا تھا کہ وہ اس کی حفاظت کرے گا۔ اسے اپنی مضبوط ہاتھوں کے چلتے میں سمیٹ کر دور بہت دور طوفانوں کے ان دیکھے اور انجانے دہس میں لے جائے گا۔ وہ اس کی تو کیا خود اپنی بھی حفاظت نہیں کرے گا اور ایک بار پھر مجھے نہ جانے کیوں وہی احساس ہوا کہ ادھب کی سوت پر ہوا تھا۔ ان دونوں نے بھی کچھ ہی قدم اٹھایا تھا۔ انسانوی راستہ اختیار کیا تھا۔

ایک بار پھر اس فکر پر پیرا تھیں پتہ ہو گیا۔ "کسی چیز کی طلب ہے تو پہلے اپنے اندر سے اسے پھینک دینا پڑتا ہے۔ جو عقل کی طرح پھپھکا کر رونے لگے وہاں کو حوصلے نہیں ملا کر تھیں۔

پھر میں نے انگریزوں کی لاش پر نظر ڈالی۔ اس کی ٹیک سچ سالم لیکن اس سے کافی دور پڑی تھی۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا جو میں شام کو دیکھ چکی تھی۔ جینٹ کی بڑی بڑی جھول میں دو کتابیں بھی اسی طرح منسج ہوئی تھیں۔ انکے دھڑکی کو آواز ایک ہار پھر میرے ذہن میں گونج اٹھی۔ "میں کیوں کے ایک چھوٹے سے قہیلے میں صرف زبرد اور فحش رکھ کر تیار رہوں گی۔۔۔"

لاشوں کے آس پاس نہیں بھی اس قسم کا کوئی تھیلا نظر نہیں آیا تھا۔ میرے دل میں افسردگی کی ایک اور لہری اٹھی۔ وہاں اور انگریزوں کی مدعوں کی طرح تھیلا بھی چھپا ہوا تھا۔ میں دور جا چکا تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ مجھے اپنے آپ کو حالات سے بالکل ناظر نہ کرنا تھا۔ اس لئے میں قہیلے کے حوصلے بھی نہ تھیں پوچھ سکتی تھی۔

"نہیں۔۔۔" بالآخر میں نے اپنے توم تر تھکن کے باوجود یہ آواز بلند سب کو مخاطب کیا۔ "میں مہرجا رہی ہوں۔۔۔" پاس آئے تو جس کو جو تھہ بھی معلوم ہو "بازنگر و کاسے کا ہے۔۔۔" مجھے مجھے قدمین سے میں گھروٹ لگی۔

جیسا کہ مجھے توقع تھی کہ ایک انگریز کے قتل سے خاص تھیلی بچے گی۔۔۔ تو ایسا نہ ہوا۔ اگلی صبح میں مائتہ دہر بار کرنے فارغ ہوئی تھی کہ خادمہ نے بڑے حوصلے انداز میں اطلاع دی کہ ریڈیٹنٹ صاحب بنور تشریف لائے ہیں اور مجھ سے بات کرنا چاہتے

"نہیں بھئی اور ان کا پسندیدہ مشروب وغیرہ پیش کرو۔ میں ابھی آئی ہوں۔"

میرے اندر ایک ٹیک بلا کا اٹھو اور سکون آیا تھا۔ ریڈیٹنٹ صاحب بے لور چاہتے تو مجھے اپنے دفتر میں بھی طلب کر سکتے تھے لیکن اگر وہ شخص خود چل کر آیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اسے ابھی طرح معلوم تھا کہ میں چار پانچ ہزار انرو کی تھانگی کرتی ہوں۔ خواہ یہ افراد بازاری عورتیں "لالل اور بیٹیکا نہیں ہی تھیں۔ معاشرے کے دھکارے ہوئے۔ ناپسندیدہ۔ بے عزت و بے حیثیت بے ناموس لوگ۔

اس کا ہم گھبرٹ تھا۔ وہ اویلا عمر کا آیت رب اندام "مہمانہ قد اور نرم طومنا آدمی تھا اور خاص اچھی اور پول لیتا تھا۔ جہاں انکے قہاروں انگریزی کا لفظ ڈانگ لیتا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں چھری تھماتے ہوئے بات کرتے تھا اور کہیں کہیں افسرانہ رحمت بہرحال بھٹک جاتی تھی۔

"۔۔۔" ہنی سب باتیں تو معلوم ہوئی جائیں گی۔ عین غافل! "اپنی مٹنگ کی طرح اس نے یہ الحظ بھی بگڑے ہوئے لفظ کے ساتھ ہی کہہ تھہ تاہم میں درست لفظ کے ساتھ لکھ رہی ہوں۔۔۔" اور قاتل بھی پکڑا جائے گا۔ فی الحال مجھے صرف یہ جاننے سے دلچسپی ہے کہ ایک انگریز لہوان رات کے اس پردہ جان کے مکان کے پچھلے حصے میں کیا کر رہا تھا۔ کیا آپ کو کوئی ایسی بات معلوم ہے جو اس گھٹی کو سمجھانے میں پولیس کی مدد کرے؟ میں نے سوچا کہ ایسی ہی صاحب سے پہلے کہہ سے میں خود لوں۔

"مسٹر ریڈیٹنٹ" میں نے حتی الامکان پر وقار لہجے میں کہا۔ "کہ آپ وجہ کا تذکرہ اس طرح کر رہے ہیں گویا قاتل صرف اس انگریز لہوان کا ہوا ہے۔ مت بھولنے کہ یہ لہوان لڑکی وفا جان بھی قتل ہوئی ہے۔ باقی رہے آپ کے سوالات تو ان کے جوابات مجھے خود بھی درکار ہیں اور میں آپ کی انتظامیہ سے ان کے جوابات کی توقع کر رہی ہوں۔ میں اس بار اور ان سے متعلقہ الزام کی انجمن کی صدر ضرور ہوں لیکن یہاں کا ہر فرد اپنا ہر دماغ مجھ بنا کر ہر قدم نہیں اٹھاتا۔ اس کی اپنی ایک نئی زندگی بھی ہوتی ہے۔"

"بہت خوب!" اس نے بریاری سے سہلایا گویا میں نے اس کا مطلوب جواب دیا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے ایسا ہرگز نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنا ہیبت آثار کر برادر ہی پائی پر رکھ دیا۔ جس پر تینوں کی بوتل اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ گلاس ہلکے رنگ اور شفاف تھہر آ رہے تھے۔

"کمپ نے شوق نہیں فرمایا؟" میں نے تپائی کی طرف اشارہ کیا۔

"ار آپ کچھ دیر نہ آئیں تو شاید میں ایک تودہ جوتہ بی نینا سین اب میں جلد

از جلد بات فتح کر کے جانا چاہوں گا۔"

اس نے چھری اپنی گود میں رکھ لی اور سر پر نمودار ہوتے ہوئے مختصر سے منہج پر ہاتھ پھیرا۔ جس پر پیسے کی اکاؤنٹ پر چمک رہی تھی۔ "میں آپ سے ضرور ایک رائے لینا چاہوں گا۔ آپ کے خیال میں پولیس کو اپنی تحقیق کا آغاز کہاں سے کرنا چاہیے؟"

"ان چار سہولتوں کی گرفتاری سے جو مکان کے پچیسے کمروں میں رہتے ہیں۔ ان میں سے دو کے کمروں کا رخ میں مگن کی سمت ہے۔ انہیں چھینا" کچھ نہ کچھ معلوم ہونا چاہئے۔" میں نے غصے سے لہجے میں جواب دیا۔

"تپ کو یہ سن کر طوٹ ہوئی۔" ریزیڈنٹ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مگر ہم نے ان چاندیوں کو گرفتار کر لیا ہے اور ہم میں سے آئیف وکلیور ایگزیکٹو کے قتل کا اعتراف بھی کر چکا ہے۔ اس کی شناختی ہر تھک قتل بھی تلاش کر لیا گیا ہے۔ یہ رہا اور اس نے چار گولیاں چلانے کے بعد مگن میں سہولتوں میں پھینک دیا تھا جس میں سے چند پمپ کے درجے پر سے مکان کو پلٹ سنبھالی ہوتا ہے۔ اس کمروں پر فرش کے رنگ سے ملتا جلتا ایسا آگلی ڈمکن سہولت ہے جو بھی نظر میں دھنکی بھی نہیں دیتا۔"

"قاتل ان چاندیوں میں کون ہے؟" میں نے سرسراہٹ ہوئی سی توار میں پوچھا اور تنوکی کی کیفیت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ریزیڈنٹ نے ہلکا سا حیرت لہ کر دیا تھا۔

"ہم کمال ہم سے ان کا۔۔۔ وہی جو ان میں سب سے کم عمر ہے۔" ریزیڈنٹ نے چھری تھماتے ہوئے جواب دیا۔

قتل کی کوئی وجہ تھی اس نے؟ میں نے پوچھا۔ اپنے لیے ہر میں اب قابو پائیں تھی۔

"ہاں۔۔۔ وہ کتاب تھا اس کی بھیجہ تھی اور ایگزیکٹو اسے لے کر ہنگامے والا تھا۔" ریزیڈنٹ ووالے کی طرف مڑ گیا۔ "اور یہ بات اس لئے گنج معلوم ہوئی ہے کہ ایگزیکٹو کی بیب سے سہولت روانہ ہونے والے ایک عمری جلا کی ڈمکنس ویکسٹروم کی کلٹ سی ہے۔ جس پر منہج وکلیور کے ناموں کا اندراج ہے۔ اب صرف ایک چھوٹی سی ایجنس آئی ہے کہ باقی تمام پوچھنی اور روایات قاتل ہیں جن کی مالیت ایک فلاور کے انداز سے کے مویشی کم از کم تین لاکھ ہے۔ تین لاکھ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔"

ریزیڈنٹ میری طرف دیکھ کر زبردستی مسکرا کر گویا میری رائے طلب کر رہا ہو۔

"ہاں! کم از کم اتنی ہی ضرور ہے کہ اس کے لئے کوئی دو افراد کو قتل کر سکتا ہے۔ پھر قتل کا الزام لگایا گیا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

ریزیڈنٹ نے ہلکا سا مسکراہٹ دیا۔ "ہم اس پہلو پر بھی سمجھ رہے ہیں۔" اس نے ہلکا سا ہنسنے سے ہر گل کیا۔

اس کے کچھ عرصے بعد ایک اور اہم واقعہ پیش آیا۔ میں اپنے ہلا خالے کی بالکونی میں کھڑی تھی۔ میں بالکونی میں کبھی سمجھاری کھڑی ہوتی تھی اور وہ بھی اس وقت جب کبھی دل اداس ہوتا تھا تو دھیان بنانے کے لئے کسی ستون دلیہ کی اوٹ میں آتے جاتے چہلوں پر مکمل غفلت تحریریں پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔

میرے ہلا خالے کے سامنے والے چند ہلا خالے پھولا کر دائیں طرف دودھ 'بہی' مشروبات 'کھیر' اور نہ ہلے کن کن چھوڑنے کی بہت بڑی دکان تھی۔ اسے پانچ بھائی چلاتے تھے۔ پانچوں پہلوان تھے۔ لیکن سب اکھاڑے کو انداز کر کے چکے تھے حالانکہ پورے ان پانچوں میں سے کوئی نہیں تھا مگر عمر کے اس دور میں مارے ہی بھائی پہنچ چکے تھے۔ جب ششی لڑنا بس کی بات نہیں رہتی۔ بازار میں اب بھی لہجہ کا پورا رعب تھا۔

اسی دکان کی طرف سے گھرار کی اونچی لوہا آوازیں سن کر میں بری طرح چہکتی تھی۔

اپنی کے ذریعہ... وہ کہہ رہا تھا۔

اس نے ہاتھ اپنا دیے تھا ہاتھ چھو کر ایک انگلی سے حسرتانہ انداز میں بڑے پتلوان صاحب کا چہرہ پھولا گل چھوا۔ اس کی پات دار آواز میں یارہا لہجے کی جھلک تھی وہ اپنے آپ کو پایا کہہ رہا تھا مگر اس کی عمر چھیڑا تیس تیس سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ اس کا چہرہ تو کہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ اس کی پشت میری طرف تھی تاہم اس کی کھڑے کھڑے ہاتھوں میں مجھے کیس سلید کی ڈھل نظر نہیں آئی۔

وہ مجھے کا کھڑا پاچندہ لور لہا سا کر رہے تھے تھا جس کی آستین چھ می ہوتی تھیں اور اچھے خاصے غاسٹے سے بھی اس کے ہاتھ کی ہر پھلی پھرتی نظر آ رہی تھی۔ اس کے کھڑے بے حاشا چہرے اور گردن سادہ کی طرح نکلی ہوئی تھی۔ قد اتنا اونچا تھا کہ اگر وہ اندر بلند کرنا تو اپنے سر پر گھوٹے چھت میں لگے ہوئے اس چھتے کو چھو سکتا تھا جس کا درمیانی حصہ کسی مینڈ سے مشابہ تھا۔

میری رنگت کا یہ نامعلوم شخص دیکھ رہا تھا مگر اس کا بڑا بڑا بڑا گوشت کا انداز معلوم نہیں ہوتا تھا محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص بیک وقت چھری طرح محسوس بھی ہے اور ریز کی طرح چھینا بھی۔ اس کے جسم نے چھیڑا بڑوں سے پہلے مشقوں یا پھر درختوں کی سختی برداشت کی تھی۔

اس نے انگلی سے بڑے پتلوان صاحب کا گل چھوا تو ان کی مونچھیں بری طرح پھڑکنے لگیں تھیں پھر لہجے پچھنے لگے لیکن وہ اس شخص چھن ہاتھ کے چہرے کی طرف نہیں دیکھتا اور نظروں سے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھ رہے تھے جو سلید چھوتے پر ٹکا ہوا تھا۔ اسی کیفیت میں پتلوان صاحب کے حلق سے اچانک یوں توار برآمد ہوئی جیسے شیر کو کسی نے آستے میں پھیر چھو دیا ہو۔

”اے رالو سائے کہہ دیکھ کیا رہے ہو۔“ وہ دھارے۔ ”میں اس کے گلے میں دلچرہ ڈال کر اسے کتے کی جگہ باندھوں گا۔“

دائیں ہاتھ سے دکان کے کسی کھڑے کھڑے سے ملازم اس شخص پر لوٹ پڑے جس نے اپنے آپ کو چھن ہاتھ کا تھا ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لے لوہے کا وہ لہا سا فخرناک کھڑا بھی دیکھا جس کی ایک طرف چھن ہاتھ کے تیز ہاتھ سر کے وہ کھڑے بھی کر نکلی تھی۔ اس نے اپنے پتلوان لور چھن ہاتھ پر بستے گھولوں اور لاتوں کی قطعاً پروا نہیں کی سب سے پہلے ہاتھ سے اس طرح کھینچنے کا دار مدد کا کہ وہ سرے ہی لہجے کھینچا اس کے ہاتھ میں تھا۔

سادہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص کھڑے ہی لڑائی کا تہہ کر کے آیا تھا اور اس سرے سے بڑا محفوظ ہو رہا تھا۔ اس کی گویا پشت پر بھی آنکھیں تھیں۔ اس نے کھینچا یوں پکڑ لیا

بازار حسن میں عرصہ خاتم کے ہاتھ خانے کے بھر پتلوانوں کی دکان ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں کبھی کسی کو اونچی آواز میں بولنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ فٹے میں دست شریک بھی دہلی بچی کر اپنے پرانے حواس کو جمع کر لیتے تھے ورنہ کسی قسم کی ہاتھ ہو شروع کرنے سے پہلے ہی اٹھا کر دکان سے خاصی دور پھینک دیئے جاتے تھے۔ اور اس کارروائی میں یہ اتنا زخمیں رکھا جاتا تھا کہ نہ کوئی شخص کون ہے؟ کس حیثیت کا مالک ہے؟ بد معاش ہے یا شریک البتہ پچھنے سے پہلے دکان کے نوکر چاکر اس شخص کی جیب سے اس چیز کے پیچے ضرور نکال لیتے تھے جو اس نے کھائی ہوئی تھی لیکن قیمت سے زیادہ ایک دھپلا بھی نہیں دلا جاتا تھا۔

لور جو کچھ میں اس وقت اس دکان پر دیکھ رہی تھی لور جو آواز میں سن رہی تھی وہ مجھے حیران کر دینے کے لئے کافی تھیں۔ دکان میں باہر کی طرف ایک بڑا سا سفید چھوڑا تھا۔ اس کی سلید ٹانگیں لور ہی سے چھکی نظر آتی تھیں۔ اس پر سب سے بڑے پتلوان صاحب ایک موٹے سے گدی پر اپنی پاتی ماری بیٹھے ہوتے تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ پر شطرنج شوکیں ہوتا تھا جس میں چند ایک خاص خاص مھاتیوں کے قاتل نہایت خوبصورتی سے سجے ہوتے تھے۔ دائیں ہاتھ پر بیک کی سل ہوئی تھی جس پر کھیر کی ٹھوکیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سائے دیوی کا قاتل ہوتا تھا اور ان کے تہہ بڑا سا آہلی کیش بکس ہوتا تھا جسے گلا کھا جاتا ہے۔

بڑے پتلوان صاحب اپنے حلقے اپنی بہت بڑی پکڑی اور نہایت مہلی مہلی لہار اور چاہا موم سے آرائشی مٹی مونچھوں کی وجہ سے ان تمام چیزوں کے درمیان نہایت نمایاں نظر آتے تھے۔

اس وقت ایک شخص بوٹ سمیت اس سلید چھوتے پر پاؤں رکھے کھڑا تھا جسے بڑے پتلوان صاحب کسی ایسے شخص کی انگلی لگتے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے جو اچھی طرح سادہ سمجھتا نظر نہ آ رہا ہو۔ ”اب کہہ تو دیا۔ اب ہزار بار کہوں کیا کہ چھن ہاتھ نے آج تک کسی دکان پر کھڑے ہونے کے بعد پیسے نہیں دیئے۔ لیکن تو صرف ”میرا دھڑا“ ہے۔“ چھن ہاتھ اور مولدہ پانچ میرا دھڑا پینے سے گا اور کوئی دھڑا نہیں دے گا۔ کچھ پیام بھی

کہ کسی کو ضرب لگائے تو پھل کی طرف سے نہ لگے۔ صرف سلاخ کی طرف سے لگے۔ یہ سلاخ اس نے ایک ہی وار میں یوں گھمائی کہ کسرتی جسموں والے تین ملازم تو ایک ساتھ ہی دھڑے ہو کر فرش پر ڈھیر ہو گئے اور یوں تڑپے لگے گویا ان کی کمرس ٹوٹ گئی ہوں حالانکہ چدن ہلانے اس وار میں شاید تو وحی طاقت بھی استعمال نہیں کی تھی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ صحت کے کسی اسکول ٹیچر نے لڑکوں کو سرزنش کرنے کے لئے یہ دھمکیا ہو۔ آخر وہ پوری طاقت استعمال کرتا تو شاید سلاخ ان کے جسموں سے کسی دھار دار چیز کی طرح گزر جاتی۔

دوسرے وار میں ہتی و خوں بھی اوندھے ہو گئے اور چند لمبے بعد ان سب نے اپنی اپنی جگہ سانسٹ ہو جانے کا اظہار فیصلہ کیا۔ چدن ہلانے سرجنا نہایت اطمینان سے چہرے سے ٹکا کر کھڑا کر دیا۔

”ان بالکوں کو کیوں اس نوجوانی میں ہڈی بننے کا کوئی روگ لگواؤ گے میرے بھٹے“ چدن نے ایک بار پھر پیسے ہی کی طرح انگلی سے بڑے پهلوان کے گل کو پھیرا۔ بڑے پهلوان اب براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پتکار رہے تھے۔ بلاشبہ ابھی ان کی آنکھوں میں سرخسیت کا کوئی نشان نہیں تھا بلکہ ان کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ چوری طرح اپنے آپ کو اشتعال میں لانے کی کوشش کر رہے تھے ابھی شاید کچھ کسرتی تھی۔

لیکن میرا یہ خیال لگا طبعیت ہوا۔ دراصل ان سے پہلے ان کے چاروں چھوٹے بھائیوں کی باری تھی اور شاید یہ ان کے احوالے کا اصول تھا جسے وہ یہاں بھی توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ چاروں بھائی بھی بڑی بڑی پگڑیوں پہنچتے تھے مگر اس وقت جب میں نے انہیں دھن دھن کے اندر بھٹیوں سے لگتے دیکھا تو ان کے سروں پر پگڑیاں نہیں تھیں اور آستین چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے سے آئے تھے اور ایک طرح سے انہوں نے چدن ہلانے کو دھوکے سے پکڑا تھا۔

ان میں سے دو نے چدن کی گردن پر ہاتھ ڈالا اور وہ نے جھک کر اس کی ٹانگیں پکڑنے کی کوشش کی تھی انداز یہی تھا کہ وہ ایک بھاری برتن کی طرح چدن ہلانے کو اٹھا کر گے اور فرش پر مار کر چور کر دیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ چدن تڑپ کر ان کی گرفت سے لگا وہ کے سر آستین میں ٹکرائے اور ایک کو اٹھا کر ہتی تھیں پر یوں سے مارا کہ چاروں بھائی بوریوں کی طرح اوپر نیچے ڈھیر ہو گئے تاہم وہ چاروں ہی اٹھے اور پہلے سے زیادہ جوش و خروش اور طغیانی سے چدن ہلانے پہنچے۔

لڑتے لڑتے وہ سڑک پر آگئے تھے اور لوگ جمع ہونے لگے تاہم میں بندھی پر ہونے کی وجہ سے ہر راہ صاف طور پر دیکھ رہی تھی اور میری دیکھوں میں خون کی گردش اتنی تیز ہو چکی تھی کہ مجھے سانس لینے میں بھی دشواری پیش آرہی تھی۔ مجھے چند ایک سانس

بچنے کا اتفاق ہوا تھا کیونکہ ان دونوں کشتی حملی طور پر ہندوستانی تہذیب کا ایک حصہ تھی مگر بڑے بڑے مای پهلوانوں میں میں نے ایسی بھاری طاقت اور واہ کا ایک وقت ایسا عجیب و غریب نہیں دیکھا تھا جو یہ شخص چدن ہلانے کی سڑک پر ایک محدود جگہ میں چار گھیر خیم پهلوانوں سے لڑتے ہوئے پیش کر رہا تھا۔ بے شک یہ پهلوان سابق ہی سی مگر انہیں آٹھ ڈا چھوڑے ہوئے زیادہ مدت تو نہیں ہوئی تھی اور طاقت اور واہ تھیں میں ہر حال وہ بہت سے طاقت ور انسانوں سے کہیں برتر تھے۔

مگر یہ کم بخت چدن ہلانے شاید نوپے سے بڑا ہوا تھا جس میں بجلی دوڑ رہی تھی وہ ان چاروں کو یوں اٹھا کر پھاڑ رہا تھا جیسے وہ مادی کے بورے ہوں چاروں ان میں سے وہ تو ہت سڑک سے ٹکرا کر اسات ہو گئے تھے اور ان کے سروں سے اور شاید چھوٹے کے بعض حصوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ ہتی وہ اب بھی چدن ہلانے کو گانہ کرنے کے لئے اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ وقت چدن ہلانے ہاتھ ترچھا کر کے کھڑکی کی طرح بے جھ دیکرے دونوں بھائیوں کی کٹھنوں پر رسید کیا اور دونوں طوقان سے آگزرے ہوئے درخت کی طرح بھگوانہ کر اپنے بے ہوش بھائیوں کے قریب ہی ڈھیر ہو گئے۔

چدن ہلانے پلٹ کر بڑے پهلوان کی طرف دیکھا جو اب بھی چہرے پر سانسٹ بیٹھا تھا۔ اس کا سپید چہرہ بچے ہوئے لمبے کی طرح سرخ ہو چکا تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کہ وہ اب بھی سراپہ نہیں ہوا تھا پھر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز طور پر میں نے اسے ہر اٹھ کر ہوا میں چھٹا لگا کر چدن ہلانے کی طرف لگے دیکھا جیسے کسی بہت بڑے اور طاقت ور اسپرنگ نے اسے اس کی جگہ سے اچھلایا ہو۔ اس کے بے تحاشا پھیلے ہوئے ن و خوش اور بھاری بھر کم لڑتے ہوئے اس کا یوں خطاب کی سی اڑان کے ساتھ بچھٹا بلاشبہ ایک فلسفی سا کارنامہ تھا۔

چند منٹ کی اس معرکہ آرائی میں پہلی مرتبہ میں نے چدن ہلانے کو گرتے دیکھا۔ بڑا پهلوان اس پر سوار تھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ بہت بڑے گولے کی طرح ہوا میں کٹی ٹوٹ اچھلا اور دھپ سے سڑک پر اُترا کیونکہ چدن اس کے نیچے سے ٹکل چکا تھا اب چدن کو تباہ قصہ آگیا تھا کیونکہ میں نے اس کے انداز میں وحشت انگیزی محسوس کی۔

اس نے بڑے پهلوان کو سلجھتے نہیں دیا۔ اس کی پگڑی ایک طرف تو لڑکھ بجلی تھی۔ چدن نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سر پر لکھی جس نے بڑے پهلوان کو اٹھ کر کھڑا ہونے سے باز رکھا۔ چدن نے اب واہ بچ کی لہجے میں مومنوں کی جہاں اور کھن کے واروں سے بڑے پهلوان کو نیم بے ہوش سا کر کے رکھ دیا۔ وہ کھنوں کے چاروں طرف بھول رہا تھا جیسے اس کی جانی جواب دے گا۔ ہر بار ہاتھ آئینہ آئینہ میں ہر کوئی دیکھ رہا تھا۔

اس کے چہرے سے بھی خون پھوٹ پڑا تھا اور سوچیں دھک مٹی جسے چندن دیا ہے اسے مارنا بند کر دیا تھا اور کھڑا اپنے کپڑے بھڑا رہا تھا۔ دلہہ "بھیل کو جیتے ہوئے سو پتی آگے آگے اپنے المیہ نے حیرت سے بے ہوش اور بے ہوش پهلوانوں کی طرف دیکھا پھر سمجھتے ہوئے یوں چندن ہلکا کی طرف دیکھا جیسے یوں قلب جیتار کو دیکھ رہے ہوں۔ ایک نے تہ ہاتھ عورتوں کی طرح دائیں میں انگلی دے لی۔

"تم نے ان کو مارا ہے؟" ایک نے اپنی ہنسی سے پهلوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چندن سے پوچھا۔

"ان کو ہوش میں لا کر انہی سے پوچھ لو۔" چندن یلپا نے اپنی آستین درست کرتے ہوئے کارروائی سے جواب دیا۔

"بلوہ کرتے ہو بد مویشی دکھاتے ہو؟" ایک سپاہی نے اپنا کواڑ میں کڑک پیدا کرنے کی کوشش کی مگر انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی بچہ قلب لگا کر ہلپ کو ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو۔ دونوں سپاہیوں نے چندن ہلکا کا ایک ایک ہاتھ پکڑ لیا ان کے سر چندن ہلکا کے کھمبوں سے بھی لپکے تھے۔

"پهلوانے!" دوسرے نے بھی ہمت کر کے کہا۔

اس اثناء میں ہلکا پهلوان منجھل کر اٹھ کھڑا ہوا خاص سے پہلے اس نے پکڑی تلاش کر کے سر پہ رکھی۔ پکڑی کا ایک سرا اس کے چپے پر ڈھلک آیا جس کی اس نے اپنا چہرہ پونچھا اور چندن کے سامنے آکر بھڑاس کا چہرہ دیکھنے لگا وہ دیکھ رہا تھا چندن کو مگر قاطب سپاہیوں کو نہیں۔ "اسے چھوڑ دیجئے سنتری جی غلطی ہو رہی ہے۔" "اس کی پاٹ دار آواز بھرا گئی۔

"آپ کی؟" سپاہی بھونچکا رہ گئے۔ "آپ کی کیا غلطی تھی۔" پهلوان جی "آپ نے پوچھا۔

"ہیں کہہ دو لاکہ غلطی ہو رہی تھی۔" بڑے پهلوان کی آواز کچھ اور بلند ہوئی مگر پہلے سے زیادہ بھرا گئی وہ سر جھکا کر پکڑی کے بل سے آنکھیں پونچھنے لگا۔

"آخر کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے کہ غلطی کیا تھی؟" ایک سپاہی نے کہا اس کے منہ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہلکا ہے۔ "آخر ہمیں پتہ چلا ہے۔"

"کوئی پتہ درجہ میں کسے گا سنتری جی!" ہلکا پهلوان یکتا ہی ہلکا ہی کواڑ میں غرلا کر فوراً ہی پکڑی کے بل سے دوبارہ آنکھیں پونچھنے لگا اور پسے جیسے ہی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "غلطی ہو رہی تھی کہ ہر پهلوانی چھوڑ کر تجارت میں پڑ گئے۔" یہ جیسے اس نے نود کڑی کے سے بچے میں ادا کیے تھے۔ پھر وہ قدرے ہلکا آواز میں بولا۔ "اس جوان نے کہا تھا کہ وہ اچھا نہیں ہے۔" اس کی بات پر دھیان دیتے ہی بجائے اس سے بھڑکا

شروع کر دیا۔ اسے جانے دو سنتری ہلکا پہ شیر آدمی ہے اسے چھوڑ دو چھوڑ دو اسے۔" ہلکا ہلکا ہلکا سے منہ چھپا کر دکان کی طرف دوڑ گیا اور دروازہ بند کرتے لگا۔ سامان ہلکا کا ہلکا پڑا تھا۔

"کوئی تم اس شخص کے خلاف کوئی شکایت درج کرنا نہیں چاہتے؟" ایک سپاہی نے اپنا خدیش کی خاطر اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"نہیں۔ نہیں۔" ہلکا پهلوان بدستور بھونچا نہ بچے میں بولا۔ "شکایت درج کر لی ہے تو ہمارے خلاف کر لو۔"

"اب تمہارے خلاف کیا شکایت لکھیں پهلوان جی تم شریف لوگ ہو۔" دوسرے سپاہی نے ہلکا اور چندن ہلکا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

پهلوان نے دکان بند کر کے جیسا تھا اٹال دیا اور اپنے ہاتھوں کو جھنجھوڑ کر چنگا لے کر دکان کیوں بند کر دی؟ تیس جا رہے ہو؟ ایک سپاہی نے جھک کر کہا۔

"ہیں جی! جہاں ایک دلہہ عزت خراب ہو جائے وہاں کیا رہنا کیا کاروبار کرنا۔" پهلوان جی نے اپنے ہونٹوں پر زہدتی ایک مسکراہٹ پیدا کی جو مسکراہٹ کم اور کسی

ندرونی نہیں کا کھپاؤ زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ ایک ایک کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

چندن ہلکا ایک طرف کھڑا اثناء سکون سے سوچوں کو مل دے رہا تھا۔ ہلکا پهلوان اور اس کے بھائی دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کس طرف کو غائب ہو گئے۔ ہلکا جیسے اپنے دل میں بڑے پهلوان کے لئے بے پناہ احترام محسوس ہوا۔

دلہہ "چندن" نے جھوم کو قاطب کہا۔ "ہلکا! دکان دو عین دن بعد پھر کھلے گی ہر مالک ہلکا جانے گا۔" جی نہیں تب کو ملے گی لٹس کی ہاتھ لگ کر نہ کریں۔" یہ کہہ کر وہ اطمینان سے ایک طرف کو ہلکا دیا گویا کوئی سی سی لیڈر قوم سے یہ وعدہ کر کے تفرق ختم کر کے اسٹیج سے اتر کر اپنی نشست کی طرف جا رہا ہو۔

میں جو اب تک گویا توبی سی سخت میں کھڑی تھی جھک کر بیٹھی۔ ایک بڑی خلوص اور ہلاخانے کی دوسری دکانیں میرے آس پاس ہی کھڑی تھیں۔ میں خادمہ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئی اور سرگوشی میں اس سے کہا۔ "یہ جو شخص جا رہا ہے اسے ہلکا کر دو۔" ہلکا دروازے سے لگا۔ اسے کہنا میری ماگن تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتی تھی۔ اور بات تمہارے قاعدے کی ہے۔"

کچھ دیر بعد میں نے بڑھیا کی رہنمائی میں چندن ہلکا کو ہلاخانے کی بیڑیاں چڑھنے دیکھا۔ وہ چپے کی طرح چکنا چکر رہا تھا اور ہلکا کو دیکھتے ہوئے بیڑیاں چڑھ رہا تھا

اس کی جیب سے برآمد ہونے والی رقم کو کہ میرے اندازے کے مطابق چھ سو تیار
زیادہ نہیں تھی لیکن اس جیسے جیسے کے انسان کی مناسبت سے یہ بہت بڑی رقم تھی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "بھی ہم اس مقام کو نہیں پہنچے کہ اتنی معمولی سی رقم
جیتنے کے لئے لوگوں کو بولنا دعوت دے کر بلائے پھرے۔ ابھی تو بڑے بڑے مل والے
نہ رونا دے رہے ہیں اور اپنی مرضی سے اس سے بھی کہیں بڑی رقمیں لانے کے
ئے تیار رہتے ہیں۔ ویسے یہ سبیل تذکرہ یہ رقم ہے کس کی؟"

چھ نمبر کے لئے وہ سوچ میں پڑ گیا پھر گویا کسی فیصلے پر پہنچے ہوئے خود کلامی کے سے
راز میں بیٹھ گیا۔ "میرا خیال ہے تمہیں بتا دینے میں کوئی حرج نہیں تم بکاڑھی کہا کرتی ہو۔
پھر قدرے بلند آواز میں بولا: "یہ رقم میں سیلہ ارشد لال سے وصول کر کے لایا ہوں
رہاں کو پہنچانے جا رہا ہوں۔"

"پاس کون ہے؟" میں نے قدرے چمک کر پوچھا۔

"پاس۔" وہ ہلکے گڑبڑا سا گہ: "پاس میں ہیں ہے۔۔۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون
ہے میں نے تو اس کی شکل تک نہیں دیکھی اور نہ ہی کبھی اس سے ملا ہوں۔"
مگر پھر رقم کیسے پہنچو گئے؟" میں نے کہا۔

"میں میں رات کو جا کر آرام سے اپنے کمرے میں سو جاؤں گا صبح مجھے دوا دے کے
پانچ پٹ پیسے دیئے گئے گی کہ پارسل لائز ہنگہ کوڑے دہن میں پھینک دو گا لہذا ہائیڈرو کی
کی جگہ رکھ دو اور فوراً کھٹک جاؤں اس روایت پر عمل کروں گا مال خود ہی دس تک
نیچے جائے گا۔" اس نے قدرے اطمینان سے ناگھیں پھیلا کر بیٹھے ہوئے جواب دیا۔ اب
میں نے چہرے پر اس داستان گوئی کی طمانیت نمودار ہوئی تھی مدت بعد کوئی سامع میرا تپا

"وہ یہ تو بڑی جاسوسی قسم کی کہانی بنا رہے ہو تم۔۔۔ جیسی انگریزی فلموں میں ہوتی
ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے یہ بتاؤ کہ کیا تم پڑھے ہوئے بھی ہو؟"

"نہیں نہیں۔" اس نے قدرے فخریہ لہجے میں کہا۔ "پانچویں جماعت پاس ہوں: چھٹی
کلی انگریزی میں پڑھ لیتا ہوں لیکن بس ذرا ظاہری جملے سے کچھ چلن سائی گتا ہوں۔
ہے نا۔۔۔" اس نے تعریف طلب نظروں سے میری طرف دیکھ اور خاموش مسکراہٹ
کے سوا کوئی جواب نہ پا کر بڑی مصیبت سے اپنے سر پر نظر دوڑائی۔ میں بظور اس کی
طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی اب تک کی صحبت کو تو لے کر خوش کر رہی تھی۔ اس کی
بات کی دہر کا سرا پھینکا کسی پر اسرار مقام تک پہنچا ہوا تھا اور شاید الجھا ہوا بھی تھا۔

اس سے کوئی بات کرنے سے پہلے اس کے حلقوں زیادہ سے زیادہ جان بڑھ ضروری تھا
اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں گفتگو کرنے میں زیادہ حیل و جست سے کام

لیجے اسے اندیشہ ہو کہ اوپر سے اس پر کوئی بڑا نہ پھینک دے۔ پڑھوں کے اتمام پر
نے اس کا استقبال کیا۔

"کیا بات ہے بائی بی؟" اس نے اڑیل بیٹنے کی طرح رک کر اکڑے اکڑے لہجے
میں پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں تجسس بھی تھا اور شک و شبہات کی پچھائیاں بھی
اشتقاق کی ہلک بھی تھی اور احتیاط کی جھلک بھی۔

اس کا لہجہ مجھے پسند نہیں آیا تاہم میں نے اپنی ناگواری کو مکمل طور پر چھپانے ہوئے
مسکرا کر شائستگی سے کہا: "شکریہ تو تانے چاہئے! ہم عورت ذات ہیں۔ آپ کو کھانا نہیں
چاہیے۔"

"ہمیں کوئی کھانا کھانے گا۔" اس کا زور دھڑکا۔ "اور اگر کوئی مانی کا مال کھا بھی گیا
تو ہمیں کیسے کرے گا۔ ہم تو گھر کے بیٹے ہیں بھی جسکے پادریں گے۔" بازار کی عقلی تو
میں بھی تھی لیکن بازار میں اس کے لیے میں تھا ہر حال وہ میرے پیچھے پیچھے آئے لگا میں
اسے کہہ خاص میں لے آئی جہاں ہم دوگ خاص اٹھیں افراد سے اہم و بنگالی تانت و شہ
کرنے کے لئے نشست رکھا کرتے تھے۔

چند منٹوں کے بعد اس کی جیروانی سے کمرے کی آرائش کا جائزہ لینے نیکن ساتھ ہی وہ
چالاک شہروں کی طرح مرحوب نہ نظر آنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔ کیا پتہ
فرمانیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"مطلب کی بات کرو بائی بی؟" اس کا لہجہ بدستور اکڑا اکڑا سا تھا۔ "مجھے معلوم ہے
اس بازار کی مورچیں اور خصوصاً تمہارے جیسے نمٹ بات والی عورتیں بلاوجہ کسی سے اتنی
مصلحتی سے پیش نہیں آتیں۔"

"تو میں نے کب کہا کہ میں بلاوجہ تو پر فہم ہو رہی ہوں۔" میں نے پہلے ہی کی
طرح نرمی سے کہا۔ "مجھے تم سے کام ہے۔"

"مولدہ" اس نے واسکٹ کی کسی اندرونی جیب سے لوٹوں کی چند گنتیاں نکال کر پائی پر
رکھ دیں۔ "تمہاری فکر کسی طرح اس رقم پر تو نہیں چمک جائی گی؟" اس نے پچھتے ہوئے
لہجے میں پوچھا۔ "اگر ایسی ہی کوئی بات ہے تو میں تمہیں پیسے ہی بتا دوں کہ یہ میری رقم
نہیں ہے اس لئے میں اسے کوٹھے پر لٹانے کا کوئی اور بہ فیصلہ رکھتا۔ ارادہ کر ہی لوں تو
اس پر عمل کرتا میرے بس کی بات نہیں۔"

میں نے اب بھی اس کے انداز گفتگو پر کوئی ناگواری ظاہر نہ کی۔ اس میں اس کا کوئی
قصور نہ تھا مگر حلال ہی کچھ ایسی تھی کہ اس کا شک وہ نہ کرے جانے تھا اور پھر وہ نہ
جلنے کس ماحول کی پیداوار تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس سے شائستگی اور معاملہ فہمی کی توقع
رکھی جاتی۔

"اور میں امرتسر کے قریب ایک گھوڑوں حضور پر کاربنے والا ہوں یہ گھوڑوں مسلمانوں کا ہے اور زمینداروں کی وہاں مسلمانوں کی قائم ہے۔ زمین تقریباً ساری کی ساری چھدری مائل نامی ایک شخصیت کی ملکیت ہے۔ میرا مطلب ہے کہ سات سال پہلے جب میں وہاں سے بھاگا تھا تب تک تو اسی کی ملکیت تھی۔ کچ کل کا پتا نہیں۔" اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر گہری سانس لی اور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"کچھ لوگ امیر زادے ہوتے ہیں کچھ نواب زادے کہلاتے ہیں کسی کو لوگ مولانا شریف زادہ اور کسی کو اجڑا۔" صاحبزادہ کہہ کر بد چلتے ہیں لیکن میں اپنے گھوڑوں میں بھار راہ مشہور قلعہ وجہ یہ تھی کہ قلعہ کی زبانے میں میرے باپ نے کچھ عرصے کا شکاری پھول کر ہونے کا شعلے کا کام کیا تھا۔ لیکن یہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی بات تھی۔

"جب میں نے ہوش سنبھالا تو میرا باپ پہلے ہی کی طرح چھدری مائل کا مزارع تھا لیکن اس کے باپ کے ساتھ لفظ بھار مستقل طور پر نکلی ہو چکا تھا۔ وہ بے چارہ شریف تھی تو ایک دو مرتبہ اس نے دل دلی زبان سے احتجاج کیا تو پھر وہ بھی پھول اویا۔

"میرے جوان ہونے تک میرا باپ سادہ کے گالے سے مرچکا تھا مگر رشتے میں مجھے بھار زادے کا خطاب دے گیا تھا جوان ہونے سے پہلے ہی میں چھدری کے مزارعوں کی صف میں شامل ہو چکا تھا۔ باپ کی موت کے بعد بھی انہی زمینوں پر خون پیونہ ایک کرتا رہا۔ ماں میری پسینے ہی مرچکی تھی۔ اس لئے بس ایک عجیب خالی خالی اور بیکاری زندگی تھی جو میں گزار رہا تھا۔

"ہاں یہ تو میں تمہیں بتا ہی بھول گیا کہ میرا قد کاٹھ بچپن ہی سے غیر معمولی تھا مگر میں مدیہ کپڑا کرتا تھا مگر کھالے پیتے کی چیزوں کی کن نہیں تھی۔ بیٹس بھی تھی میں رٹ کر کھانا تھا اور رات کر کام کرتا تھا۔ دن بھر کھیتوں میں کام کرتے اور جان توڑنے کے باوجود جسم میں کوئی نگیں نہ لگی رہتی ہے جتن کئے رکھتی چٹانچ میں آٹھارے چلا جاتا اور اپنی عمر سے بڑے بڑے اور پختہ کار گھوڑوں سے کھیتوں زور آزمائی کرتا۔

"اپنی غیر معمولی طاقت کا احساس مجھے اس دن ہوا جس دن ایک آوارہ نکل نہ جانے کس ترکہ میں آکر پھنسا رہا اور فصلوں کو روکنا پگڈنڈی پر میرے سامنے آگیا بلکہ میرے سامنے نہیں ہوں کہنے کہ اس نام مرادہ نوخیز لاشی کی لڑکی کے سامنے آیا جو میرے آگے آگے جا رہی تھی اور میں اس کی پیچھے کر رہا نظر گالے عکس کے غلام کی طرح اس کے پیچھے چلا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کی پیچھے کر کے غلام سے دل بھرے تو حیرتزدہ ہوں سے آگے نکل کر اس کا چہرہ دیکھوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کون تھی اس کا لباس ہرمل امیرانہ تھا اور اس قسم کے رنگ رکھنے کی لڑکی تو میں نے پہلی ہی مرتبہ اس پگڈنڈی پر دیکھا تھا۔

میں نے گا خصوصاً میرے سامنے

"چندن ہا۔" میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے میری بات کٹ کر پچھا۔
"تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"یاد رہے انور کی دکان پر دھینگا مٹھی کرنے سے پہلے تم نے خود ہی میری تصویر کراچیا ہم لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نہ صرف سب کچھ دیکھ رہی تھی بلکہ من بھی رہی تھی۔"

"اوہ۔" اس نے اطمینان کی سانس لی۔ "ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں؟"
"میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اپنے حلق کچھ تفصیل سے بتاؤ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو یاں وغیرہ کا کیا پتہ ہے میں تمہارے حلق سب کچھ جانتا چاہتی ہوں۔" میرے لہجے میں جو اشتیاق بھٹک رہا تھا وہ منسوی نہیں تھا۔

"لیکن تم سب کچھ کیوں جانتا چاہتی ہو؟" اس کے لہجے میں ایک ہار بھر شک و دہش تھی۔
"میں نے یہ کہ شاید ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔" میں نے گہری سانس سے کہا۔

میں تم سے ایک اہم معاملہ کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ تمہیں ایک پیش کش کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مجھے تمہارے متعلق سب کچھ معلوم ہو کیونکہ معاملہ بڑا نازک ہے ہرمان اگر تمہارے متعلق سب کچھ جان لینے کے بعد میں عسوس کروں گی کہ تم میرے مطلب کے آدی نہیں ہو تو ہم ہمایت و انتہاری سے سب کچھ بھول جائیں گے۔ یہ بھی بھول جائیں گے کہ اس کمرے میں ہماری کوئی ملاقات بھی ہوئی تھی ٹھیک؟

"وہ تو ٹھیک ہے۔" اس نے بھی ہمایت و ہمیدی سے کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "تم کہہ رہی ہو کہ معاملہ نازک ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ میری کہانی میں تو کئی معاملے نازک ہیں کئی راز کی باتیں ہیں۔ میں اپنا ٹیٹھا تمہارے ہاتھ میں کیسے دے دوں؟"

"رازوں کے چاڑھے ہی کے لئے تو میں نے تمہیں بدو ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور پھر میں کہہ تو چکی ہوں کہ اگر بات نہ بنی تو ہم اس ملاقات کو بھول جائیں گے تم فالو" بدعاش ہو اور میں ہزاری عورت۔ اگر ہم ہی عہد کی پاسداری نہیں کریں گے تو کون کرے؟ شرف دے تو یہ کام کب کا پھول رہا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" اس نے ایک گونج دار سا قہقہہ لگا کر کہا چند لمحے کے لئے وہ سوچ میں ڈوب گیا چہنچہنی پر فتنیں ابھرتی تھیں گویا فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ پھر اچانک ہی بولا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے کہ تفصیل سے سب کچھ بتاؤں۔ ویسے بھی میں موبلے دماغ کا آدمی ہوں پرانی باتوں کی تفصیل مجھے یاد نہیں رہتی۔"

اس نے ایک گہری سی سانس لے کر صوفے پر پہلو بٹھایا اور ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔
"میرا اصل نام غوث بخش ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے یک لخت کہا۔

پھر اس نے ہاتھ چھو کر میرے ہاتھوں سے جھری نے لی اور میں نے بالکل اس طرح ہموار کر دیا جیسے میرے ہاتھوں میں جان ہی نہیں رہ گئی تھی۔ تب آپ کے لئے مجھے سوجنا پڑا کہ شاید یہ خواب نہیں ہے۔ میں نے اپنی انگلی دائیں میں دھالی اور کچھ لمبا وہی دور سے دیا کہ خون چھٹنے لگا۔ اپنے آپ کو مزید یقین دلانے کے لئے میں نے اس سے کہہ "میری جھری داہن کر دو۔"

اس نے جھری میری طرف پھٹائی لیکن ساتھ ہی کہا۔ "آپ اور ست پہلا اتنی درد ناک دھن من کر میرا کلیجہ شق ہونے لگا ہے۔"

اب مجھے اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ یہ خواب نہیں تھا لہذا یہ نگر نہیں تھا حقیقت تھی۔ وہی کنگ دار آواز جیسے چاندی کے برتن آپس میں کھرا گئے ہوں وہی شکل آپس میں جو قدموں تلے زمین شق کر رہی تھیں۔

وہ میرے قریب ہی اس پتھر پر بیٹھ گئی جس پر دن میں مورچیں کپڑے دھوئی تھیں۔ میں نے سنا تھا جھری کی گواہ میں جلد ہوتا ہے۔ اس نے سرگوشی کی مگر اس سرگوشی میں بھی ترخم تھا۔ "لیکن یقین تمہاری جھری من کر آیا ہے میں نے بیٹنگوں مرچ یہ دھن سنی ہے اور ہر بار بے چین ہو کر بستر پر کودتے ہوئے لگی ہوں لیکن ساتھ ہی میرا یہ بھی دل ہلاتا ہے کہ جھری خاموش نہ ہو، شق رہے۔"

"میں اب پوری طرح ہوش و حواس میں آچکا تھا۔ وہ میرے اچھے قریب چلی تھی کہ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے وجود سے مٹا بیست کی لہریں یا پھر شاید کسی غیر ملکی سورج کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں اور میرے جسم میں جذب ہو رہی ہیں۔ کافی دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے اس نے کہانیاں گود میں نکالی تھیں اور پتیلیوں کے صفے میں چرے کو تصور کئے لہر کے پانی کو تک رہی تھی جو چاندی میں سیال چاندی کی طرح جھللا رہا تھا۔

"جھیں معلوم ہے میں کون ہوں؟" دھن "اس کی سرگوشی ایک بار پھر ابھری۔ میں نے غصے سے تھوک نکالا اور قہقہے میں سر جلا تا تب اس نے ایک لفظی سانس لے کر گون اپنے آپ سے کہہ "اس کا مطلب ہے میرے عشق کی تپش تم غیور نہیں ہوگی۔ میں تو تمہارے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تم کہاں رہتے ہو کیا کرتے ہو؟" جھیں نے سختی سے مزید رہی جتنی ہے "فصل کٹنے، کتنا غلہ مٹا ہے؟" تم نے کھنکی میں کن کن کو ہریا۔ مجھے تمہارے حلق سب کچھ معلوم ہے۔ اس دن سے جب تم نے مجھے بننے کے بیچے کچے جانے سے بچا یا تھا اس دن سے بعد سے مجھے تمہارے بارے میں ہر بات معلوم ہے مگر تم مجھے بھونکے ہو گے۔

میں نے جلدی سے تردید کی۔ "نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں ہر گز نہیں بھولا مگر میں نے تمہارے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کس سے پوچھوں۔"

اس نے اپنی زدی کی جوتی کی لوک سے میرے کنارے کی قم اکا دھلی پر تھیں بچھنے

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ قز اچانک ہی منہ سے جھاگ اڑا، اس کے سامنے آگیا وہ دہشت زدہ ہو کر چلی اور اسے قدموں ہلانے کی کوشش میں چپٹ کر پڑی۔ قریب تھا کہ کل اسے تھل دتا کہ میں نے گویا کسی خواب سے بیدار ہو کر لمبی جھانگ لگی اور کل جو صرا۔ ایک ٹکڑے کے لئے ہی ٹھٹھا تھا کہ وہ لوں بیٹگوں سے بکڑا لیا۔

غیب اگر یہ کہوں گا کہ میں نے اس توانا اور پھرے ہوئے تھل کے پاؤں زمین سے اٹھا دیئے تھے تو تر شاہ گپ سمجھو گی۔ اس لئے اس بات کو میں نہیں بھولتا۔ ہوں اور پھر جھیں لڑکی کے بارے میں بتاتا ہوں۔

"حقیقت تلے کے بعد وہ کپڑے جو زکری ہوئی تو میں نے دیکھا وہ سو کے پونے کی طرح سیدھی اور بھیڑی تھی مگر سو کی طرح سپات ہر حال نہیں تھی اس کی آنکھیں بن کابل کے کالی اور لگی تھیں جیسی تصویروں میں ہوئی ہیں کہ وہ پوری کی پوری سر سے پاؤں تک تصویر ہی تھی جس میں اللہ نے جان وال دی تھی۔"

"سیاہ رنگی لگی، سفید پوستی کا کرہ اور اس کی پشت پر پھیلے ہوئے کواہوں سے بچے تک پہلے ہوئے سیاہ ریشمی پاجامے کی گٹائیں اور کلاں میں سوتے کے پڑے پڑے جھکے عیوں میں ندی کی جوتیاں اس کی طرف ایک بار دیکھ کر نظریں ہٹا لیا بہت ہی مشکل تھا۔

اس کے وجود پر جو تھوڑی بہت گرد پائی گئی رہ گئی تھی اسے بھی نہایت فضا سے صاف کرنے کے بعد اس نے اپنے وجود کو چادر میں لپیٹا نظریں بھر کر میری طرف دیکھا اور میرے عیوں سے کوا لٹن کھینچ لیا۔ میں ہوا میں جھولنے لگا اس نے صرف ایک لفظ شریہ کہا اور آگے چھ لگی اس کے بعد ایک عرصے تک میں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا۔

میں جھیں یہ بھی بتاتا چلوں کہ نور آندل اور نت سے جسنی کرتب سیکھنے کے ساتھ ساتھ مجھے وہ شوق اور تھ ایک جھری بھانا دوسرے میرے گال چاندی راتوں میں یہ شوق کچھ زیادہ ہی خود کر آئے اور میں ندی کے کنارے درخت سے لٹک لگا کر آنکھیں بند کئے جھری بھانا رہتا یا پھر اچھے سوال میں میرے گاتا۔

میری عمر ان دنوں چھبیس برس تھی۔ میں پہاڑ ہو چکا تھا اور پہاڑ بھی ایسا جسے خواہشوں نے آتش فشاں بنا رکھا تھا۔ آنکھیں بند کر کے میرے گاتے وقت میں اپنے آپ کو رانچا محسوس کرتا۔ جو اپنی میر کا انتظار کر رہا تھا مگر میری میر نہیں آتی تھی۔ ہوتی تو آتی۔ میر کا تصور کرتے وقت میری بند آنکھوں میں ایک دھندلی دھندلی تصویر اتر آتی۔ سو قد آنکھیں بن کابل کے کالی اور بن پنے لگی، سیاہ ریشمی لگی، سفید پوستی کا کرہ، سیاہ ریشمی پاجامے کی گٹائیں اور۔۔۔ اور وہ مترنم گواہ میں ایک لفظ شریہ۔

"پھر ایک روز جھری بجائے وقت یہ۔۔۔ ایک خواب دیکھا کہ میں سو قدر لڑکی چاندی میں نمائی، زلفوں کی گٹائیں اپنے کندھوں پر پھیرے میرے ساتھ کھڑی ہے۔ اس کی ناک میں میرے کالونگ ٹن ٹن چمک رہا ہے۔

عائشہ اس وقت میری گود میں سر رکھ لی تھی اور ہمارے قدموں میں کفنہ میرا پی خصوصی سبک مدی سے بند رہی تھی۔ ان سب نے جب ہمارے گرد گھیرا والا تو ایک لمحے کے لئے جیسے صرا پائی، ہماری سانسیں اور کائنات کی حرکت سب کچھ رک گئی۔ ایک لمحے کے لئے ان میں سے بھی کوئی کچھ نہ ہوا پھر عائشہ کے دادا نے "کھوں ہی آنکھوں میں عائشہ کے باپ کو اشارہ کیا۔ اس کے بعد کا منظر آج بھی میری آنکھوں میں تازہ ہے جیسے آج کے پہلے کی بات ہو۔

عائشہ کے باپ نے عائشہ کو باہوں سے پکڑ کر زمین پر گرایا، اس کے سینے پر ٹھٹھکا رہا اور اس سے پہلے کہ میں سمجھ سکتا کہ کیا ہو رہا ہے اس نے یوں عائشہ کے گلے پر چھری پھیر دی جیسے کسی بھیڑ بکری کو قلع کیا ہو۔ پھر اس نے اٹھ کر ہاتھوں سے پکڑ کر توتلی پڑتی لاش کو گھسیٹا اور سر میں پھینک دیا۔ عائشہ کی توحی سے نودا گردن کٹی ہوئی تھی اور اس سے کھل کھل ٹون بہہ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے جب اس کے باپ نے اسے زمین پر گر لیا تو اس کے حلق سے ایک نہایت طعنے، گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی تھی جیسے اس نے عدو کے لئے مجھے بلایا ہو مگر میں بے بس دم بخود کھڑا رہ گیا۔

میرے دیکھنے ہی دیکھتے عائشہ کی لاش نے پانی میں دو تین غوطے کھائے۔ پانی میں کچھ دور تک سرخیا بھیگی۔ پھر جوں جوں پانی کے بہاؤ کے ساتھ لاش دور ہوتی چلی گئی، سرخی بھی غائب ہو گئی۔ تب میں نے اس خالی چوڑے کی طرف دیکھا جہاں چند لمحے پہلے عائشہ میرے زانو پر سر رکھ لی تھی۔ اسی لمحے میرے اندر جیسے پنجو سا کھل گیا اور دسیوں درد سے باہر آئے۔ جھپٹ کر میں نے عائشہ کے باپ کی گردن دنگی اور اس سے پہلے کہ وہ چھری میرے پسو میں گھونچا، اس کی گردن پٹ سے قوت چکی تھی۔ اس کے گرنے سے پہلے میں نے چھری اس کے ہاتھ سے نکال اور وہ بھی قریب فخر آگیا ان کے پیٹ میں گھونپ دی اور ان کا گھیرا توڑ کر کھل آگیا۔

ان میں سے کوئی ٹاڑ نہیں کہ وہ قہر دو تین آدمی مجھ پر منڈاسوں سے وار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید ۱۰ اس کا دروازہ کی کسی کو خبر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ ان میں نے ایک کامنڈاسا میرے ہاتھ آگیا۔ پھر نہ جانے کتنی لاشیں گر گئیں۔ میں اٹنے قدموں

ہوئے کہا۔ "مجھ ہی کیا تم نے جو کسی سے نہیں پوچھا پوچھنے کا بھی ایسا احتک ہوتا ہے۔"

"تم کون ہو۔ کس رہتی ہو؟" میں نے اشیاق سے پوچھا۔

"میں جاگیردار عاتق کی پوتی ہوں اور حویلی میں رہتی ہوں۔"

اس نے تمکنت سے جواب دیا۔

"ایک لخت میرے ہاتھ پاؤں لٹھے پڑ گئے حلق کا آتش فشاں برف ہو گیا۔ طلب کی بخش غائب ہو گئی، ہڈیے خواہشیں سب اڑ پھو ہو گئیں۔" ریسے تو میں بیلوں کو قلاباؤں کھلاتا تھا، شیر کو لٹار سکتا تھا مگر جاگیرداروں کے گھر کا پارہ سال کا بیٹل سا لڑکا بھی مجھے ہمارا زاد کہہ کر بلا سکتا تھا اور وہ جوتے مار کر اپنے قتل میں بٹھا سکتا تھا مجھ سے ہوتے پڑا سکتا تھا۔

میں نے فوراً اس کے آگے ہاتھ بوڑ دیئے اور مڑ گرا کر کہا۔ "متم اپنے گھر واپس چلی جاؤ۔" کسی نے ہمیں یہاں دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔"

"وہ تھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی جیسے کسی نے اس کی منہ پر طمانچہ رسید کر دیا ہو اور دھیر میں مجھے لیے میں بولی۔ آخر کی نادبی ہماروں والی بات۔ اتنا بڑا ہاتھی جیسے ذیل ڈول لئے پھیرتا ہے اور سینے میں دل چڑھا سے بھی چھوڑتا ہے۔"

"زندگی میں پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ ذمہ تو ہیں یا بے عزتی کیا ہوتی ہے۔ اس سے پہلے جاگیرداروں نے کھیتوں میں کام کے دوران بات سے بات مجھے قسم کرین بھی ماری تھیں اور پتھر اور لائیں بھی برسائی تھیں مگر مجھے کبھی بے عزتی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

"ایک لخت میرے اندر جیسے کسی زخمی شیر کی مدح چوٹ اٹھی میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کے رخسار پر اسنے زور کا پھڑ رسید کیا کہ وہ زور جاگری لیکن فوراً ہی وہ اٹھی اور مجھ سے اٹھی۔ خوشی سے منسوب لیے میں بولی۔ "میں تجھے ایسا ہی مرد دیکھتا چاہتی ہوں جو صرف آواز سے ہی میں اپنی دہشت نہ پھیلائے بلکہ نام زندگی میں بھی اپنی بے عزتی کرنے والوں کو پھٹی کا دودھ یاد دلا دے۔"

"میں نے اس کی چہ فرمائش کرہ سے ہاتھ لیا اور ایک نیا ہی انسان بن گیا لیکن یہ نئی زندگی مجھے کچھ زیادہ راز نہ آئی۔ عائشہ جس نے مجھے نیا انسان بنایا تھا مجھ سے ملنے آئی رہی۔ ایک روز وہ ملنے آئی تو جیسے جیسے اس کا تقریباً سارا خاندان بھی چلا آیا۔ اس کا باپ، بھائی، کئی بھائی، کئی ماموں دادا اور نہ جانے کون کون تھا اور سب کے ہاتھوں میں نہ اسے ہندو قیں یا پتھر تھے۔

ہوں گا۔ میں نے اگر ادھر رہنا ہوتا تو کرایہ دے دیتا۔"
اب اس شخص کے صبر کا پیمانہ گویا لہجہ ہو گیا۔ چلا کر بولا ابے تین دن سے تو ہم تجھے
ہاں دیکھ رہے ہیں۔ اب کرایہ ادا کرنا تھا پر مازم ہو گیا ہے۔ ہماری طرف سے تو یہی گھر
بنا شادی کر کے پیڑا کرنا جو مرضی کرنا نہیں کرایہ ضرور ادا کر۔

میں نے گویا ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا۔ "مگر بھائی صاحب! سڑکیں اور
نشتہ چھ تو سرکار کے ہوتے ہیں۔ کیا تم سرکار کی طرف سے کرایہ لینے آئے ہو؟"
اس نے مجھے میں پیسے سے زیادہ زور سے مجھے ایک ٹھوکر رسید کی اور پہلے سے زور
بند ڈال میں بولا۔ "سرکار کی ایسی نیکی اور ہم خود سرکار ہیں۔"

اب بس ہو چکی تھی میں ٹھوکر میں بھی کھا چکا تھا اور مجھے یہ تسلی بھی ہو چکی تھی کہ
"سرکاری آدمی نہیں ہیں۔ چنانچہ میں نے اٹھ کر انہیں تریا لیا کرنا شروع کر دیا۔
گھونٹوں پھینکوں اور لڑائی کی شکل میں۔"

وہ زیادہ دیر نہیں گئے ابھی میں نے سختی بھی شروع نہیں کی تھی کہ بھاگ گئے۔ ان
میں سے ایک نے چاقو بھی نکال دیا اور دھپ پڑا رہ گیا۔ میں بھی وہاں سے صحت ہو۔ اسی
شرم میں ایک فٹ پاتھ ہوئی کے چھپرے بیٹھ تھا کہ ایک خوش پوش آدمی سر پر ہیٹ
اور آنکھوں پر رنگین شیشوں کی عینک لگائے میرے قریب ہی بیٹھ کر آبیٹا اور سرگوشی میں
مجھ سے بولا۔ "کوئی چاہئے؟ لہجے ہی پیسے نہیں گے۔"

میں نے اہمیت میں سر ہلا کر فوراً اس کی طرف دیکھا۔ ظاہر وہ شریف آدمی ہی
محمود ہوتا تھا۔ اس نے بدستور سرگوشی میں کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ کسی شریفانہ جگہ پر
پل کر بات کر رہے ہیں۔"

میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو گیا۔ کار میں بیٹھ کر وہ مجھے کسی شریفانہ جگہ پر لے گیا۔
وہ اس کا اپنا فلیٹ تھا جہاں وہ سائنس کی لڑکیاں ابتدائی شرحہ لہاس میں سوسائٹی کے ایک
ریکارڈ کی دھن پر حرکت رہی تھیں۔

یہ شخص "اس" کا خاص آدمی تھا۔ اس کے توسط سے میں پاس کے گروہ میں شامل
ہوا۔ اس نے مجھے ضروری تربیت دی، شہری زندگی گزارنا سکھائی۔ تاہم پاس کے مطلق
اسے بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ میری تربیت مکمل ہو گئی اور اپنے گھر میں نے غیر معمولی
کامیابی سے انجام دینا شروع کر دیا تو پاس کا یہ خاص آدمی اپنا فلیٹ میرے حوالے کر کے
غائب ہو گیا۔ ساری چیزیں جون کی قوت چھوڑ گیا، سوائے ان دو لڑکیوں کے انہیں وہ ساتھ
ی لے گیا چھوڑا ہی جاتا تو میرے کس کام کی تھیں؟ میری طرف تو عورت مسکرا کر بھی
دیکھ لے تو میری آنکھوں میں فوراً ایک گردن کٹی داش ابھر آتی ہے جس کے زخموں سے
بھل بھل خون ابل رہا ہوتا ہے اور اس کی دہشت سے پھلی پھلی ساکت آنکھیں میری

پچھے بھی جتا جا رہا تھا اور گناہ اسامی تھمے جا رہا تھا۔ "لحد" میں نے بدھوں کا رخ اپنی
طرف ہوتے دیکھا اور گناہ اسامی چھوڑ کر سر میں چھلانگ لگا دی۔ اپنے اس پاس مجھے پانی میں
کئی گلیوں کی شپاشپ، شانی وی تاہم میں پانی کے نیچے ہی تھرتا "دوسرے کنارے کی طرف
پر جتنا تھکا ہوا تھا پانی چاہتا تھا۔ اندازاً آج میں پہنچ کر میں نے سر نکال کر پیچھے دیکھا۔ چار
پانچ تو ہی میرے پیچھے تھرتے آرہے تھے۔ کچھ پانی کی سطح سے نیچے بھی ہوں گے۔ بہر حال جو
مجھے نظر آ رہا ہے ان میں سے تین کے ہاتھ میں بدھ تھیں اور گلیوں کی پٹیاں تھیں اور
بدھوں والے ہاتھ انہوں نے پانی کی سطح سے بلند رکھے تھے کہ بدھ تھیں اور گلیوں پیچھے
سے مٹھو رہیں۔

دوسرے کنارے پر پہنچ کر میں جنگل میں گھس گیا۔ گولیاں اب بھی میرے حلق میں
تھیں اور لاکھوں کے دھماکوں سے چرند پرند بدحواس ہو کر اپنے ٹھکانوں سے نکل کر ادھر
ادھر دوڑنے یا اڑنے لگے تھے۔ پھر میں اونچی اونچی گھاس کے ایک ایسے سلسلے میں گھس گیا
جہاں انہیں میرے حلق کے سلسلے میں مست کا اندازہ نہ رہا۔

پھر قازنگ کے درمیان وقفہ میں میں نے مائیک کے بھائی کی لٹار سنی۔ "خوفنا چار کے
سچے۔! اب چاہے زندگی بھر بھاگتے رہنا میں پاتل تک تیرا پیچہ کون گے۔"

میں آ پھر قند نظریہ کہ میں بھاگتا رہا۔ تین سال بھاگتا رہا۔ ایک شہر سے "دوسرے شہر
"دوسرے سے تیسرے۔ کبھی کسی سمت میں کبھی کسی سمت میں اور بدھ رہی پہنچی پہنچی گیا۔ اسی
دور آکر بھی کافی دن تک مجھے خوف رہا کہ کوئی میرا حلق نہ کر رہا ہو" پیچھے سے مجھے گولی
نہ مار دے۔ اس سے بھی زیادہ خوف مجھے پولیس سے آتا تھا۔ پولیس کے سختی سے سپاہی کو
دیکھ کر بھی میرے پیچھے چھوٹے جتنے تھے اور میں ادھر ادھر گلیوں میں گھس جاتا تھا۔ مگر
جب کافی عرصے تک کچھ نہ ہوا تو مجھے اطمینان ہو گیا۔

ایک روز میں فٹ پاتھ پر سوا ہوا تھا کہ صبح ہی صبح چار ٹھوکرے ٹھوکرے اچھے سے
آگئے۔ ایک نے ٹھوکر مار کر مجھے اٹھایا اور بولا۔ "کرایہ نکالو۔"

میں نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔ "کس چیز کا کرایہ؟"
بڑا۔ "فٹ پاتھ پر رہنے کا۔ ادھر رہنا ہے تو ایک مہینے کا پیشی کرایہ نکالو۔ چورہ
رہیے۔"

میں نے مزید حیران ہو کر پوچھا۔ "فٹ پاتھ پر رہنے کا بھی کرایہ لگتا ہے؟"
اس نے میرے منہ کی ہڈا کے لہجے مجھے ایک اور ٹھوکر رسید کی اور ٹھوکر بولا۔ "عام
کھولی کھنڈ کرنا ہے۔ تم کو معلوم نہیں یہ جو پھر دایوں کی طرف کے کپڑے کی چادر
رہا مڑاں لگا کر ادھر فٹ پاتھوں پر بڑاؤں خاندان آباد ہیں۔ سب کرایہ دیتے ہیں۔
میں نے لوب سے کہا۔ "مگر بھائی! میں تو چرزا ہوں۔ تیرے پاس ہوں، کل کہیں اور

طرف ایک سوال لئے دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ مجھے پتا نہیں تھے اور خود اندہ بھر رہے ہو یہ غیرت۔

اس کے ساتھ ہی میرا جسم لٹھا اڑ جاتا ہے اور میرے اندر کا آدلی مر جاتا ہے۔ چندن ہلانے خاموش ہو کر گہری سانس لی اور گونگنی خواب سے جوتکتے ہوئے بولا۔
"پہلی مرتبہ اپنی کمائی کسی کو سنائی ہے کیونکہ پہلی مرتبہ ہی کسی نے اتنی اہمیت سے فرمائش کی ہے۔ اب تم بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"

"تم نے یہ وضاحت تو کی ہے نہیں کہ تمہارے کام کیا ہے؟" میں نے طاقت سے پوچھا۔

"اس سے پہلے میں ایک وضاحت اور کر دوں کہ یہ میرا اپنا ہی خیال ہے کہ "اس" کا کوئی گروہ موجود ہے۔ ورنہ میں نے آج تک دو تین افراد کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔ ایک توڑکا سا ہی ہے جو عموماً "میرے لئے پیغام لے کر آتا ہے۔ زیادہ تر بیانات مجھے ٹیلی فون پر ہی ملتے ہیں۔ دوسرا وہی پاس کا خاص آدمی تھا جو بعد میں منتخب ہو گیا۔ تیسرا ایک اور خاص مدد تک میری ہی طرح بھڑا آدمی ہے جس نے مجھے لیٹر پستول کے تحت سے واؤ تھام اور کار لائیو وغیرہ چلائے کھڑا تھی۔ وہ بھی مجھے شوق و ہور ہی نظر آتا ہے۔ باقی میرے کام کی بات تو یہ بدلنا پھر ہے۔ میرے کئی طرح کے کام ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر میں وصف کرنے والا آدمی ہوں مجھے حکم ملتا ہے کہ فلاں سینہ کے پاس چلے جاؤ یا فلاں بڑے آدمی کے پاس پہنچ جاؤ۔ وہ اپنی رقم لئے بیٹھا ہو گا اس سے نہ کر لائے گا۔ پچھو دو۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میں رقم لینے پہنچ تو لیٹر پستول سے مسلح کسی آدمی مجھے اپنے گھر لے دیاں مجھے اپنی صاف اور طاقت دکھانی پڑی۔

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تم رقم لینے پہنچے تو مختلف آدمی کے بجائے جنس وہاں چلیں والے بیٹھے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جنسیں رقم کی وصف کے دوران کبھی ایسا نہیں ہوا۔ ابتدا دیکھیں چلیں سے اکثر سامان ہوتا رہتا ہے بلکہ جتنا گھیر نام کا ایک ایسا ہی ہے کہ وہ تو اکثر میری خود میں رہتا ہے۔ اسے پاس اس کے نامعلوم گروہ اور میری سرگرمیوں کی کچھ سن گئی ہوئی ہے۔ اس نے ایک بار مجھے بلوے کے ازام میں پکڑ بھی لیا تھا لیکن اگلے ہی روز دانت چیتے ہوئے نہ جانے کہاں ہوا کر دیا۔ تاہم اس نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ ضرور کہا تھا۔ "چندن! کچھ دن اور پیش کر لو۔ میں کوشش میں لگا ہوا ہوں جلد ہی جنس اور تمہارے پالنے والوں کو ایسی جگہ دلوں کروں گا جہاں سے تم کبھی سر نہیں لکان سکو گے۔" اس شخص سے "جینینا" مجھے خول آتا ہے جب بھی میں اس کے ہتھکے میں آگیا اور ساتھ ہی اگر میرے ماضی میں کئے ہوئے قتل بھی سامنے آئے تو میں سیدھا پھانسی کے تختے پر پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اس سے

میں نے جب بھی فون پر اس سلسلے میں بات کی تو اس نے اپنی دسے کے موبیوں جیسی آہنی تے درمیان ادا دی ہے اور لاپرواہی سے کہتا ہے کہ ایسے پی جاسکیر جیسے نہ جانے کتنے اس کی نو میں گئے رہتے ہیں اور اسے پانے کے بجائے خود اچانے سماں کھلی جاتے ہیں۔

"وصول کے علاوہ تمہارا کوئی کام نہیں؟" میں نے پوچھا۔
"میں نے کہا جس کہ لہو پھر ہے۔ کبھی کبھی میں کسی لالچ پر ماں کے ساتھ ہلور کاٹھ بھی جاتا ہوں اور پیش و ضمن کر کے لانا میری ذمہ داری ہوتا ہے۔ کبھی مجھے کسی کارخانے یا سیاسی جلسہ میں تصادم شروع کرانے کا کام بھی انجام دینا پڑتا ہے اور وہ بھی اس طرح کے تصادم شروع ہوتے ہی میں خود کھنکھ جڑوں اور کوئی یہ نہ جان سکتے کہ لٹا کی اصل وجہ کون تھا۔ کبھی مجھے حکم ملتا ہے کہ پاس فلاں جگہ پر واقع فلاں دکان کو بند دیکھا جاتا ہے یا فلاں جگہ کوئی دکان یا مارکیٹ بند پڑی ہے اور فلاں پڑی اس کے کھلنے کے سلسلے میں مزاحمت کر رہی ہے اسے کھلوانا ہے اور فلاں پارٹی کے حوالے کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"اور اس کے عوض جنسیں ملتا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"سب کچھ ملتا ہے۔" اس نے گڑ بڑا کر کہ۔ "میرا مطلب ہے میری ہر ضرورت پوری ہوتی ہے۔ رائج گھر میں فلیٹ ہے جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ گاڑی ہے۔ ٹوٹر ہے۔ دکاندار کے ہاں سے سوار ملتا آتا ہے جس کا بل مجھے نہیں معلوم کون ادا کرتا ہے اور اس کے علاوہ چاہے سو روپے نقد ہر مہینے خرچے پانی کے لئے مل جاتے ہیں۔ وہ بھی میرے لئے زیادہ ہی رہتے ہیں کیونکہ شراب یا سرگرمی میں نہیں جتا کسی کے کونے پر میں نہیں جاتا۔ عورت کے قریب پہنچنے کی مجھ میں ہر بات جنسیں رہی۔"

"اپنی جان کو سول پر لٹکائے رکھنے کا جنسیں ہی اڈا سہولت ملتا ہے کہ گزر ہر اچھی ہوتی ہے۔ تم ویرا اصل بہت سیدھے ہو چندن ہلا! اور بے وقوف بن رہے ہو۔" میں نے گہری سانس لے کر کہ۔ "تمہارے اس نام خلد "اس" کا درحقیقت کوئی گروہ وغیرہ نہیں۔ گروہ تو خود ہی ہو۔ وہ صرف کوئی اعلیٰ درجے کا بلک میلر یا فیل میں ہے جو پارٹیوں سے دسے دسے کاموں کے معاہدے کرتا ہے۔ خود بھی دیکھیں کچھتا ہے اور آخر سے کھل کھڑا داری میں مارا کام لیتا ہے اور خود ہی منظر میں ہی رہتا ہے کہ کل کو برا وقت آئے تو خود غائب ہو جائے اور تم پھنس جاؤ گے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" چندن نے اپنے طرہ و پاس کی دلالت کرتے ہوئے کہا۔ "میں کئی بار پھنسا ہوں لیکن کسی عاتقہ ہاتھ نے ہی مجھے چھایا ہے۔ جو ظاہر ہوا ہی کا تھا۔" "یہ تو پھولے سونے سطلوں میں پھنسنے کی بات ہے ناں۔ کبھی کسی بے پھر میں پھنسو گئے تب دیکھا۔" میں نے کہا۔

"لیکن جہاں تک روپے پیسے کا معاملہ ہے تو اب بھی ایک طرح سے میں ہاں کا ایک

اپنی کسی گاڑی سے ٹکر مارتا ہے۔ عمارتیں گرنے یا آتشزدگی کے حادثوں میں کتنے انسان مرنے لگے ہیں۔ موت تو ایک دن آتی ہی ہے۔ چندن نے فلسفہ پیش کیا۔

"احتمال کی بات ہے۔" میں نے یاد دلایا کہ "اگر سب تمہاری طرح سوچنے لگیں تو سب چور ڈاکو اور قاتل بن جائیں گے کہ موت تو ایک دن آتی ہی ہے کھانا نہ بنی ہر کے پہچان چالیں لیکن یہ جو دنیا کے نکلنے والے فیصلہ المراء پر سکون اور بے خطر زندگی کے لئے بٹلن سوچے ہیں کیا یہ سب پاگل ہیں؟ حادثوں میں مر جاتا اور بات ہے لیکن حادثے کی موت میں بھی انسان کی موت اور کتنے کی موت میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ آپ بے ایک حادثاتی طور پر مر جائیں لیکن کوئی تو آپ کو ایسے نقصان میں ڈال کر دیتا ہے جیسا کہ کوئی تو ہو کر آپ کا ذکر احترام سے کرے کوئی تو ہو جسے آپ کی موت کا دکھ ہو۔ یہ تو ایک بہت ہی انسانی ضرورت ہے لیکن عمارتیں اس کا احساس بخیر سے ہوتا ہے۔ اپنی وقت ایسا ضرور آئے گا جب ہمیں میری باتیں یاد آئیں گی لیکن اس وقت شاید تاخیر ہو چکی ہو اور ہمیں میرے جیسی چٹکھٹکھٹ کرنے والا کوئی نہ ملے۔"

"تو جلد تو سنی آخر چاہتی کیا ہو؟ اللہ یا اقرار تو بعد کی بات ہے سوچ کر بھی جواب دیا جاسکتا ہے۔" چندن ہلانے لگا۔

"میرا ایک بیٹا ہے ابھی چھوٹا ہے تاکہ ہے۔" میں نے سر جھکا کر دیکھ لے کر کہا شروع کیا۔ "میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں اس ماحول میں ہوش سنبھالے بلکہ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ اسے معلوم ہو سکے کہ وہ ایک بازاری عورت کا بیٹا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اسے ہر اعتبار سے ایک طاقتور انسان بنانا چاہتی ہوں۔ میرے ذہن میں تجویز یہ ہے کہ میں اسے بہت سی دوسری شہر میں منتقل کر دوں۔ اس کے کام کاج اور نگہداشت کے لئے ایک گورنر مقرر ہو گا۔ اس کے علاوہ مجھے اس کی تربیت اور حفاظت کے لئے تم جیسے ایک شخص اور کی ضرورت ہو گی جو بچپن سے ہی اسے ایک خاص رُخ پر تربیت دے اور اس کے دل سے اپنی نگرانی میں اس کی پرورش کرے۔ اپنی اولاد کی طرح نکلن اور محبت سے اپنی شہزادی کا سارا اٹھان اس میں منتقل کر دوں۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟ اس مقصد کے لئے ہمیں میری چٹکھٹکھٹ بھی ہے کہ میں تم لوگوں کو یعنی اپنے بیٹے گورنر اور تمہارے لئے کسی اور شہر میں پناہ میں کسی خوب صورت اور پرسکون علاقے میں بلالے دوں گی۔ اگر اصرار ہے میرے لئے ہوں گے۔ جب خرچ کے لئے ہمیں اب پانچ سو ماہانہ ملتا ہے تو اسے چھ سو لے لینا اور اصل اہمیت ان چیزوں کی نہیں ہے بلکہ بات تو یہ ہے کہ وہ ایک پرسکون اور شہزادہ زندگی ہو گی۔ ہمیں روز روز لوگوں سے لڑنے بھگڑنے اور خطرناک امور میں ہاتھ ڈالنے کے لئے نہیں جانا پڑے گا کوئی پولیس والا تمہاری ٹوہ میں نہیں ہے گا۔ اپنی فیملی سوا گے اور اپنی مرضی سے جاوے گا۔ کوئی تم پر حکم چلائے والا نہیں ہو

لکھ روپے کا مقروض ہوں۔ میں ایک بار ایک پارٹی سے ایک لاکھ روپے نے کر آ رہا تھا کہ رات کے وقت کچھ لوگوں نے دھوکے سے مجھے روک کر میرے سر پر کوئی چیز مار کر مجھے بے ہوش کر دیا اور مجھے لے اڑے۔ ہاس کو میں نے یہ بات بتائی تو اس نے صرف ایک لمحے کے لئے فون پر خاموشی اختیار کی پھر کہنے لگا روپے کی کوئی بات نہیں۔ قیمت یہ ہے کہ تمہاری جان بچاؤ گئی۔ پھر اس نے جتنے ہوئے جتنے۔ دیکھے اب تم میرے ایک لاکھ کے مقروض ہو گئے ہو کیونکہ یہ رقم تمہاری سب روپائی اور سب احتیاطی سے ضائع ہوئی ہے۔ ہر حال اب تم میرا ساتھ چھوڑنے کا خیال بھی نہ میں نہ لانا ورنہ میں نے تمہارے بعض کارناموں کے جو قصوری ثبوت محفوظ رکھے ہوئے ہیں ان کی بدولت تمہاری زندگی جیل میں ہی گزار دو گے۔ بات چلتا ہاں نے اس لئے جنگی جی کہ کچھ عرصہ پہلے میں کسی بات پر روٹھ کر کہہ چکا تھا کہ یہ دھندے میرے بس کی بات نہیں اور میں اب انہیں ترک کر کے کوئی شہزادہ کام کروں گا۔"

"میں اب بھی یہی کہوں گی چندن ہلا کہ تم بے حد سیدھے انسان ہو۔ اور ہاس جیسے شاطر آدمی کو تمہاری رفاقت میرا آجانا بلاشبہ اس کی غرض قسم کی دلیل ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں ملتا ہے شہر تک نہیں گزرا ہو گا کہ تمہارے بعد سے وہ یہ چھینا جاتا دراصل ہاس ہی کی چال بھی ہو سکتی ہے۔ ہمیں اپنا معدن احسن کر کے بیٹھ کے لئے زیر دامن رکھنے کی غرض ہے۔"

اس کی چوڑی پیشانی پر ٹھیکیں ابھر گئیں۔ یہ بھی فحشیت تھا کہ وہ نہ از کم ذہن پر زور دینے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ "ہو سکتا ہے۔" چند لمحے بعد پھر اس نے غصہ لے لیا۔ "مگر تم یہ ساری باتیں کیوں کر رہتی ہو؟"

"میں نہیں اس سے بہتر زندگی کی چٹکھٹکھٹ کرنا چاہتی ہوں جس میں تمہارا بھی لانا ہے اور میرا بھی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آخر تم سب تک اس غیر فحش اور خطرناک انداز سے زندگی گزارتے رہو گے؟ کب تک طرف و ہراس اور ہنگاموں سے الجھتے رہو گے؟ کبھی ہمیں کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا ہے۔ کسی تصادم میں ہمیں بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ انسان تمام عمر بچتا ہی نہیں رہتا۔ باہر سے تم اپنے کسی عضو سے محروم ہو جاؤ اور لڑنا بھڑنا تو درکنار روزمرہ کے معمولات میں ہی دوسروں کے حلقے ہو جاؤ تو کیا ہمیں یقین ہے کہ تب بھی تمہاری گزر بسر اسی طرح ہوتی رہے گی؟ ہمیں اسی طرح آگھوں پر بٹھایا جاتا رہے گا اور تمہارے ہاتھوں ذک افغانے وطن میں سے کوئی تم سے حساب براہ کرنے نہیں آئے گا؟"

"یہ سارے خطرات تو بچاؤ ہیں لیکن ہر حال انسان کو کسی نہ کسی طرح زندگی گزارنا ہی ہوتی ہے اور خطرات سے تو کوئی بھی محفوظ نہیں۔ اچھا بھلا شریف اور امن پسند انسان راہ

مگر البتہ تمہارے ہر آڑے وقت میں کام آنے کے لئے میں موجود ہوں گی۔ اس تجویز کی مزید تفصیلات بھی ہم طے کر میں گئے۔ ہر حال تم صرف یہ جانتا کہ بات تمہارے دل کو گھتی ہے یا نہیں۔؟

"دل کو تو گھتی ہے۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "لیکن میں ابھی کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ مجھے اس پر کچھ غور کرنے کی صلت دو حالانکہ میں غور و فکر کرنے والا تو ہی نہیں ہوں لیکن یوں اچانک تم سے ملاقات ہونے اور اس طرح سے سلسلہ یہ ساری باتیں ہونے کے بعد میری عقل کچھ الجھ کر رہ گئی ہے۔ دوسرے جس طرح کی زندگی گزار رہا ہوں شاید یہ مجھے اس آگاہی سے نہیں اس میں سوچ نہیں آیا ہوں۔ اس سے مجھے کچھ سوچنے ہوئے گئے ہیں۔

"میرے تعلق ہونے والے سے زندگی گزارنے کے تو کچھ دن بعد تمہیں وہ ایسی باتیں آئے گی کہ بعد میں آج کل کے زمانے کی باتیں سوچنے کے تو کراہت آئے گی جب تم ایک نئے اور معصوم بچے کی صحبت میں رہو گے اور اپنے اس سے اس کی پرورش اور تربیت کرو گے تو تمہیں محسوس ہو گا کہ تمہاری زندگی کا کچھ حصہ ہے۔ تم کچھ تخلیق کر رہے ہو۔ تمہیں پہلے سے زیادہ حق آئے گا۔"

"تمہاری باتیں مجھے بڑی درست اور اچھی لگ رہی ہیں قانون۔ لیکن ہر حال مجھے کچھ صلت دو۔ اسے انہی معاملات دو انہیوں کے درمیان اتنی جلدی تو طے نہیں پڑے۔ گو کہ تو مجھے اتنی اچھی نہیں لگ رہی۔ تمہاری شخصیت میں کوئی حیرت بھی نہیں ہے یوں بلا جیل و جمت تمہیں اپنی ساری زندگی کی کمائی سنا ڈالو۔ ہر حال یہی کی شری زندگی میں میں نے جہاں اور بہت کچھ سیکھا ہے وہاں یہ بھی سیکھا ہے کہ جب کسی معاملے میں انسان ابھرنے میں پڑ جائے تو اسے فوری طور پر فیصلہ کرنے کے بجائے بات کسی اور وقت پر حل دینا چاہیے۔ چنانچہ میں کسی اور وقت آکر جواب دوں گا۔ اب میں چلا ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا میں نے مزید کچھ نہ کہا اور اس کے ساتھ میزبوں تک آئی۔ پہلی میز پر قدم رکھنے سے پہلے وہ مڑا اور گہری سچوگی سے پوچھا۔ "تم سے ملنے کی جیتھنیا بہت خوشی ہوئی ہے۔ دت بعد ایک شریف عورت سے ملاقات ہوئی بھی تو کہاں بالو حسن میں۔" پھر وہ بڑی ملامت سے مسکرایا۔ اب وہ ایک قفل بدلا بدلا سا آری لگ رہا تھا۔ صلب شاکستہ اور نرم طو۔

"اچھی گہری سمجھو ہونے کے باوجود مجھے تمہارا نام اب تک معصوم نہیں ہو سکا قانون!۔" اس نے ایک میز پر اتر کر کہا۔ اب بھی اسی کا قد مجھ سے اونچا لگ رہا تھا جب کہ میں خود بھی اس قدر قامت کی عورت نہیں تھی۔

"مجھے عزیزہ خانم کہتے ہیں۔" میں نے اسے بتایا۔

"میں اس بازار میں کچھ روزہ آمدرفت تو نہیں اس لئے مجھے یہاں کے معاملات میں کچھ زیادہ غور نہیں۔" اس نے میرے ٹھہرے لیے میں کہا۔ "لیکن میں جین سے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تم اس بازار کی مخلوق نہیں گلیں۔ عزیزہ خانم! تمہاری ذات کے بچے بھی چھینا کوئی طویل نور انوکھی داستان ہو گی۔ میں جب دوبارہ آؤں گا تو تم سے اس کمائی کے سونے کی فراہم کر دوں گا۔ خدا حافظ۔" وہ رخصت ہو گیا۔

مجھے تو یقین تھی کہ وہ چند روزہ آئے گا۔ اقرار کرنے کے لئے نہ سہی، انکار ہی کرنے۔ اس نے وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر وہ نہ آیا۔ اعلیٰ بلا مقرر ہوئے۔

میں اس کی طرف سے بالوس ہو گئی اور اس کی تھ کی اس چھوڑ بیٹھی اور اس کا امید میں میری تشویش، اضطراب اور بے چینی ابھنا کو پہنچے گئی۔ باتیں اپنے لوگوں کو ہوش سنبھالتے اور چھتے دیکھ کر خوشی سے پھولی نہیں سامنے لیکن میں انکڑی اس طرح دزدیدہ نظروں سے دیکھا کرتی تھی جیسے تم میری وہ بچی ہو جس کی جوانی باطنی جا رہی ہے اور کوئی رشہ نہیں آ رہا۔ میرا دل بٹھ سا رہا تھا۔

پھر ایک روز جبکہ بازار کی رونق دم توڑ چکی تھی۔ لڑکیوں اپنی اقامت گاہوں میں جا چکی تھیں اور سب سے آخر میں رات کے پچھلے پہر میں بالاخانے کی کھڑکیوں اتر رہی تھی کہ جگہ روشن میں ایک چوڑا چمکا بیولا سا لہو، آتا دکھائی دیا۔ وہ کمبل میں لپٹا ہوا بھاری ہار کم آری تھا جس نے اپنے چہرے کا بیشتر حصہ بھی بظاہر لاپرواہی سے مگر در حقیقت غماض سے چھپے طریقے سے چھپا رکھا تھا۔ کوئی اسے پہچان نہ پڑے۔ مگر میں نے اسے دور سے ہی پہچان لیا تھا اس لئے مجھے کوئی طرف محسوس نہ ہوا۔ یونہی غلام میرے ساتھ تھی میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ گھر چل جائے۔ میں اس شخص سے بات کر کے آؤں گی۔

میرے قریب پہنچ کر چہرہ ہلکا ہوا نے چہرے سے کبل ہٹا لیا۔ "تمہارے مجھے پہچان لیا نا؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"دور سے ہی پہچان لیا تھا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "مگر یہ صحبت پڑی ہے بھی آئے ہو غلام۔ اپنے بعد سے پر تو نہیں آئے۔"

"میں تم سے شرمناک ہوں۔ میں بہت الجھا ہوا تھا۔" وہ ایک بار پھر گویا کسی ابھرنے والے سے جھجکتے ہوئے مسکرایا۔ "گویا تم نے کیسے جانا کہ میرے سر پر مصیبت پڑی ہے؟"

"میں تو پھر بھی ایک جہانگیرہ عورت ہوں چہرہ ہلکا میں نے کہا۔ اس وقت تمہیں دیکھ کر کوئی غصہ کا اندھا بھی کہہ سکتا ہے۔ تم کسی پریشانی میں مبتلا ہو۔"

"بہت بڑی پریشانی میں۔ اس نے تنبیہ کیا۔ "کیا ہم یہاں میزبوں ہی میں کھڑے نہیں رہتے رہیں گے؟"

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اسے گھر لے جاؤں پھر بہتر کی سمجھ کہ پہلے یہیں

دارخانے پر ہات کر لوں۔ میں نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور حذر سیزمیں چلے گئی۔

اوپر کمرہ نشست میں آکر چمن ہال میں پہلے پالی کے دو گلاس پینے پھر چند گہری سانس لے کر کہا۔ "کنس پی جاگیر میرے خون کا پاسا ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے کوئی قصور کی تکمیل کے لئے مجھے گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ کوئی ذاتی پرغاش ہے کوئی پرانا حساب ہے جسے وہ برابر کرنا چاہتا ہے۔ آج میں اس کے حکم پر ایک سی سی بڈر کے پاس سے کچھ رقم لینے پہنچا۔ اس نے مجھے رقم تو ادا کر دی لیکن کچھ بدحواس سا لگ رہا تھا اس کی حالت دیکھ کر میں چونکا سا رہا۔ رقم لے کر چلے گا تو برابر کے کمرے سے ایس پی جاگیر نکل آئے۔ وہ سادہ لباس میں تھا اور اس کے ہاتھ میں سرکاری روٹ اور کے بجائے سائبر والا ایک نیا پستول تھا۔ اس نے مجھے لٹکارا لیکن ہر حال میں پیچھے ہٹ کر وہاں سے نکل آیا جاگیر اگر سرکاری طور پر مجھے قابو میں کرنے آیا ہوتا تو مکان کے گرد پولیس کا حاصو بھی ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ میں بڑی آسانی سے مکان سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ کر چل دیا۔ کسی نے مجھے نہیں روک رکھا راستے میں رقم میں لے ایک چٹک بونری میں رکھی جیسا کہ مجھے حکم ملا تھا اور گھر جا پہنچا۔ گھر میں بیٹھے ہی جیسے بھیزوں کا غل کا غل مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ نہ جانے کتنے قوی پہلے ہی سے اندر گھات لگائے بیٹھے تھے۔ میں تو میں بیٹھے بیٹھے بگڑے ہوں کہو کہ مرتے مرتے ہی پھل ایک نچر تو یوں سمجھو کہ میری شہ رگ کو پھو کر ہی پٹھان خیر جو توں جان بچا کر وہاں سے بھاگ بیچے آؤ تو گاڑی کے چاروں پیسوں کی ہوا اٹل ہوئی تھی۔ پیدل ہی دوڑ لگا پڑی۔ اس دوران بہت دور تک تعاقب ہوا لیکن کوئی ہر حال نہیں چلائی گئی۔

تب سے پتہ چلتا پھر رہا ہوں۔ کئی مقامات سے دھیسوں مرتبہ اس نمبر پر پاس کو قتل کرتا رہا ہوں جو ہمارے رابطہ کا واحد ذریعہ ہے لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا پھر میں نے مجبوراً آپریشن سے پھٹا کہ یہ فون خراب تو نہیں حالانکہ پاس نے فون سے حکم دے رکھا تھا کہ یہ نمبر میرے خاؤ کسی کے ہم میں نہ آنے پاس۔ تمہارے کسی صحت بعد ہالا ٹریڈی حیرت سے مجھے بتایا کہ یہ نمبر تو ایک چٹک کل آفس کا تھا جو عرصہ پہلے بند کر دیا گیا تھا۔

تب تک ایک ہی میں تھک سا گیا۔ اس سارے پکر سے ایک وقت ہی بڈر سا ہو گیا۔ میں جو سمجھتا تھا کہ میں اس زندگی میں سچ بس گیا ہوں۔ اچانک ہی مجھے اپنا یہ خیال غلطی لفظ محسوس ہونے لگا۔ واقعی طور پر غائب اب بھی میں ایک سیدھا سادا رسائی ہوں مگر راست بھول کر کسی اور سمت میں چلا گیا تھا اور مراد کو گھٹن سمجھ کر بھگتے لگا تھا۔ ہوں اچانک یہ سب کچھ میرے دس سے اتر گیا کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔

میں نے سوچا ہلو زندگی سے مرے سے شروع کرتے ہیں۔ بس میں بیٹھ کر محنت مزدوری کرنے کے ارادے سے بندرگاہ کی طرف چل دیا کہ وہاں منزل کی مدد کی گئی کر رہا تھے اور پھیلوں کی ہستی میں رہا نہیں گئے۔ راستے میں ذہن نے اچانک پلٹا کھایا اور تھمسا خیاں آگیا۔ تم نے جو تکلیف کی تھی یہ بہت بھلی تھی۔ دوسری باتیں تو اپنی جگہ سب سے اچھا پلو مجھے یہ لگا کہ جہاں تم مجھے رکھو گی وہاں ایک کچھ میرے ساتھ ہو گا اور کچھ تمہارا ہو گا تو ظاہر ہے پیارا بھی ہو گا۔ کسی پادے سے بچے کے ساتھ رہنا کتنا بھلا لگتا ہے۔ کم از کم زندگی کچھ ہمت و محسوس ہونے لگے گی۔ اسے پران چڑھانا اور اپنا تجربہ لا بنر اس میں منتقل کرنا چاہیے۔ ایک دلچسپ عمل ہو گا۔" یہ سوچ کر میں راستے میں بس سے اتر گیا۔ رات کافی بیت چکی تھی واپسی میں مجھے کوئی بس نہیں ملی میرے پاس لودہ پیسے بھی نہیں تھے، ٹولٹی جھڑے میں گر چکے تھے۔ محل چننے کے ہوتے تھے اس لئے پیدل واپس آنا پڑا اور وہ بھی تنگ و تنار یک نکل کوچوں کے راستے اپنے ملے تھکے سے پہنچے بھاگتے۔ "اس نے بے مقصد سے انداز میں اپنے اچھے ہوئے ہاتھوں میں انگلیں پھیریں اور طویل سانس لے کر پوچھا۔ "اب تم کیا چاہتی ہو۔" سسٹمس فون 03036360959 "میں کیا کہوں گی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "میری جھٹک اس میں برقرار ہے کہ صرف یہ ہے کہ میں اپنی کل متاع حیات تمہارے حوالے کر دوں گی۔ اپنی جان سے بڑھ کر اس کی حفاظت کرنا۔ اپنے بچے سے زیادہ اس دنیا میں مجھے کچھ عزیز نہیں۔"

"یہ سب کچھ مجھے سمجھنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے قدرے بڑاری سے کہا۔ "مگر توجہ تم مجھ پر لگا ہو کہ وہی ہو مجھ کرتے ہوئے کو قابو دی ہو تو میں بھی آخری سانس تک اس معاملے کو نبھالوں گا۔"

اس کے بعد مجھے انتظامات وغیرہ کرنے میں چند دن لگ گئے۔ اس دوران چند دن ہالا بازار حسن ہی میں چھپا رہا۔ انتظامات مکمل ہوتے ہی میں نے جنہیں ایک گورنس اور چند ہالا کے ساتھ پناہ منتقل کر دیا۔ حالانکہ تم پہلے بھی چوہیں مجھے میرے ساتھ نہیں رہتے تھے لیکن یوں علیحدہ مکان میں وہ اجنبی انسانوں کے ساتھ منتقل ہونے پر شروع شروع میں تم نے بہت دوا دیا تھا اور کئی راتوں تک میری بھی کئی کیفیت رہی کہ خادمہ کے کمرے میں تمہارا خلی بستر دیکھتی تھی تو کلیہ شوق ہونے لگتا تھا۔ پھر میں اپنے آپ کو سمجھانے لگتی تھی کہ زندگی میں بے مقصد اور بے وجہ بھی تو اتنی اذیتیں برداشت کی ہیں اپنے مقصد حیات سے کی خاطر ایک اذیت اور کسی سے پہلے۔

میرا مقصد حیات اب بھی تو وہ رہ گیا تھا کہ اپنی بیوادی اور تہذیب سے ڈسے دلوں کا وہ مشرکوں کہ آئندہ جو شہر محل اس لئے کسی کو کچلے سے تائب ہو جائے کہ وہ کمزور ہے عزم حقیقی کی سزا مرگ مقامات نہ رہے۔

اپنے اس متحد حیات کی تکمیل کے لئے میں نے جو کچھ سوچ رکھا تھا اس پر ملندہ آمد کا آغاز ہو چکا تھا۔ چند دن بعد تمہارا محسوس سا ذہن بھی لئے ماحول سے باتوں پر گیا اور میری بے قراری کو بھی قرار آگیا۔ چہنچہن ہوا بھروسے کا کوئی ثابت ہوا تمہاری پرورش پائل اس انداز میں ہو رہی تھی جس طرح میں چاہتی تھی۔

ہوش نہ ہونے کے بعد کی باتیں تو تمہیں بھی یاد ہوں گی منصور! جن دنوں میں یہ واقعات گھبرائے ہوئے تھے، تم دس سال کے ہو چکے ہو۔ تمہاری اہلیان دیکھ کر میرا مدھن رواں سورت سے نال ہو جاتا ہے لیکن گزرتے ہوئے ان آٹھ دس برسوں نے اندر ہی اندر نہ جانے کیا حتم اہل ہے کہ اپنا وجود مجھے کھوکھلا کھوکھلا سا محسوس ہونے لگا ہے۔ سینے میں درد کی شکایت رہنے لگی ہے رقص بھی میں نے ترک کر دیا ہے ویسے بھی اس بازار میں عورت کا شہاب پانچ سات سال سے لڑاؤ نہیں رہتا۔

اب نہ جانے کیوں کچھ دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ خبر نہیں زندگی کسی موڑ پر وہ دے جانے کوئی حادثہ پیش آجائے۔

انی لئے میں نے محض مقدم کے طور پر اپنی یہ داستان کھینچی شروع کر دی تھی ورنہ یہ سب کچھ ایک خاص وقت میں میں نے بہ زبان طوطی تمہیں سنانا تھا لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی خیال ظاہر کر چکی ہوں کہ ایک لحاظ سے اسے لکھنا ہی زیادہ بہتر تھا زبان شاید میں یہ سب کچھ اس طرح سن و سمن نہ کر پاتی اور اس کے کئی پہلوؤں کی سمجھنی کو تم صحیح طور پر محسوس نہ کر پاتے اور یوں تمہاری شدت انتہام میں کچھ کمی آجاتی۔

بھوئے ذہن میں تمہارے مستقبل کا نقشہ یہ ہے کہ تم ہر اختیار سے ایک غیر معمولی انسان ہو اور تمہاری طبیعت مجموعہ اخلاقیات ہو۔ تم میں شیر کی سی طاقت اور لطیفیت بھی ہو اور وحشی کی سی مکاری اور مکاری بھی۔ تمہارا اشتہار اور فیز و غضب پھانسل کا سیدھا چاک کر کے رکھ دے اور جہاں مصلحت کا قہر ہو وہاں تمہاری سرد مزاجی جلیب کی برف پوش چٹھوں کی رخ بنگلی کو بھی مات کر دے۔ تم انتہائی حکمت و ذہانت سے بھی مالا مال ہو اور مثال ہے خفی و شہادت سے بھی۔ تمہارے اندر پتھروں کی سی سختی اور کھڑا پن بھی ہو رہن کی سی چٹک بھی تاکہ ہر طرح کے حالات میں اصل جہاز ثابت جاوے ہر آزمائش سے گزر جاوے۔

اس طرح کی چند متضاد خصوصیات اگر ایک انسان میں جمع ہو جائیں تو اس کے سامنے بڑے بڑے فکر بھی پچھ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں خود ایک بہت بڑا فکرت ہوتا ہے۔ اس طرح کا انسان قدرت ہی چاہے تو پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن اگر قدرت کے کچھ اصولوں کو مد نظر رکھا جائے تو خود انسان کی کوشش بھی بڑے بڑے کرشمے دکھا سکتی ہے۔ میں تمہیں ایسا ہی بے مثال انسان بنانا چاہتی ہوں منصور! اور اگر میں زندہ رہی تو اس ماحول کو ممکن

نہ رکھوں گی۔

میں تمہیں کسی بھی اقتدار سے کمزور نہیں رہنے دوں گی جب تم تربیت کی اس خطی پر پہنچو گے جو میری نظر میں ہے تو میں ایک اور طاقت بھی تمہیں مہیا کروں گی۔ جس کے بل پر دنیا میں طاقتور کھلانے کا تصور مکمل نہیں ہوتا اور یہ طاقت ہے دولت! میں تمہیں بے اندازہ دولتیں لیکن اتنی دولت ضرور مہیا کروں گی کہ ضرورت پڑنے پر تم بہت سے انسانوں کے خمیر بھی خرید سکو گے اور اس کے بعد بھی تمہارا ہاتھ کچھ نہیں ہو گا۔ اپنی رہائش میں میں نے تمہارے لئے ایک چھوٹا سا خزانہ محفوظ کر دیا ہے اور وقت گزرتے گئے ساتھ ساتھ اس خزانے میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا اس لئے میں نے اب تک بازاری بے رہتا قبول کر لیا ہے لیکن یہ سب کچھ تو میری اپنی منصوبہ بندی ہے تاہم ممکن ہے کہ میرے بے عنوان سے اندیشہ درست ثابت ہو جائے۔ کوئی حادثہ پیش آجائے تمہیں مکمل اداقت میری حقیقت کا علم ہو جائے اور تمہارا درد من نہ جانے کیا ہو ممکن ہے جس وقت تم اپنی آنکھوں میں ہینکڑوں سول لئے میرے سامنے آکرے ہو اس وقت ہاتھ کرنے کی صلت ہی نہ رہے۔ حالات یا زندگی اتنا موقع ہی نہ دے تب تم الزام میں اپنے سینے کا یہ بوجھ خیر نہ گل میں تمہیں سونپ تو سکوں گی۔

سچ! میں ممکن ہے کہ میں تمہیں وہ نہ بتا سکوں جو میں چاہتی ہوں میرا مشن لوہورا رہ جائے تمہاری ذات کی تکمیل نہ ہو سکے۔ میرا ترشادہ جاسکے۔ سونا کھن نہ بن سکے لیکن اس صورت میں بھی اسے میری اچھا سمجھو! میرا تمہیں سمجھو! اپنا فریضہ کہ تم میری پروازوں کا انتظام ضرور کر گے۔ میں تمہاری ماں ہوں اور میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میں نے بلا تم و کامت تمہیں بتا دیا۔ اب یہ لپٹے میں تم پر بھونٹتی ہوں کہ جو سب کچھ جاننے کے بعد تمہارے انتظام کی حدیں نکال تک پہنچتی چاہئیں۔ اس کا آغاز مکالمے سے ہونا چاہیے اور انجام کی صورت کیا بنی چاہیے۔

میں لقا ضرور کروں گی کہ ہوش سے لڑاؤ ہوش سے کام لیتا۔ ہاپ کی طرح پہلی پرواز میں ہی پتہ نہ کھوا لیتا اور تمہارے انتظام کی صورت خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس کمال کو دنیا میں ایک مثال بنا جانا کہ آئندہ کوئی بھی طاقتور کسی کمزور کو پاؤں تلے کچلتے وقت ایک بار ضرور یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ شاید کل اسے اسی دنیا میں اپنی خبیثت کا حساب دینا پڑ جائے۔ اس کے سامنے تمہارے انتظام کی کمالی کی ایسی مثال ضرور موجود ہو کہ اس کی مدح کاف اٹھے۔

اس کے علاوہ مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا، کچھ نہیں، آئنا میں نے اپنی زندگی میں تمام تلخیاں اپنی جان پر سکی ہیں اور تم پر کبھی کوئی آج نہیں آنے دی لیکن اب جو کام تمہارے لئے لگا رہی ہوں اس میں شاید تمہیں بے شمار صحبتیں اٹھانی پڑیں۔ اب یہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹھکانہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ہر ای کتاب کا فائزیکٹ اور ریڈیو اسٹیشن لنک
- ڈاؤن لوڈنگ سے پہلے ای کتاب کا پرنٹ پر ویو
- ہر بک سٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی جینٹل اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تیار ملی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر سب کچھ کا الگ سیکشن
- ایب سائنٹ کی آسان براؤزنگ
- سائنٹ پر کوئی بھی لنک ویڈیو نہیں

We Are And Waiting WebSite

واحد ایب سائنٹ جہاں ہر کتاب نو رٹ سے مکمل ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے

• ڈاؤن لوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

• ڈاؤن لوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کتاب سے کتاب ڈاؤن لوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



http://www.paksociety.com

ہماری مرضی ہے کہ صوفیوں کی یہ راہ اختیار کر کے دوسری دنیا میں مل کے سامنے سرور پہنچے یا آرام و تسکین کی زندگی گزار دیکھو یہ غیرت کھلاؤ۔

آخر میں وہ اہم باتیں اور باتیں چلوں۔ میں نے اپنی جس حج پرچی کا ذکر کیا ہے وہ پتا میں تمہارے مکان ہی میں موجود ہے۔ بارخ میں فوارے کے لئے جو چھوٹا سا آلاب بنایا گیا ہے اسے جان بوجھ کر اوڑھا چھوڑ دیا گیا ہے اور اس میں پانی پھیلنے کا بندوبست بھی نہیں کیا گیا۔ اس میں گئے ہوئے فوارے کو گھما کر لالو گے تو نیچے ایک خانہ نکل آئے گا اس میں وہ سوچا موجود ہے جسے دبانے سے نیچے موجود فولادی چادر سرک جائے گی اور وائر پردہ تجوری نکل آئے گا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں نہیں :-

• ہر ای ٹیک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
• ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای ٹیک کا پرنٹ پر پریو
• ہر پوسٹ کے ساتھ
• پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے
• ساتھ ساتھ

• مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
• ہر کتاب کا الگ تیلیٹن
• ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
• سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

• واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

• ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تیسرے ضرور کریں

• ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب
ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



mailther.com/paksociety1

پہلے کا موقع دینے بغیر ہرپ کر سکتا ہے۔ ان مگر مچھوں پر غائب آتا ہے تو بائیں برابر فاصلہ ملے کرتے وقت بھی آنکھیں کھلی رکھو اور جذباتیت کا خاتمہ اپنے دل سے نکال دو۔
جب میں نے اس فارمولے پر عمل کرتے ہوئے سوچا تو مجھے روپا سے اپنی کچھ دیر پہلے کی گفتگو پڑی بے جواز سی محسوس ہوئی۔ آخر میں یوں منہ اتھا کر کہاں جانا چاہتا تھا اور کیا کرنا چاہتا تھا؟ میں نے سوچا مجھے کوئی لائحہ عمل بنا کر چلنا چاہئے اور اس کے لئے وقت درکار تھا۔ اس دوران روپا سے وابستہ رہنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اور اسی دوران کسی غصہ سے اگر جلد از جلد روپا کے دشمنوں پر بھی ہاتھ ڈالا جاسکتا تو اور بھی بہتر تھا۔
ان سے نمٹنے کے بعد ہر حال میں روپا کی طرف سے بے فکر ہو کر کہیں بھی جاسکتا تھا اور اس کے لئے ہر حال میرے دل میں نرم گوشہ موجود تھا، خواہ میں کتنا ہی غیر جذباتی ہو کر سوچتا۔ اسے میں تم از کبر نامہانی اور دوسروں کی مسئلہ کردہ موت میں گرفتار چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو بے حد پر سکون اور پر اعتماد محسوس کیا۔ حتیٰ کہ اسٹوڈیو میں پہنچنے کے بعد دوسرے کو کھانے کے وقتے میں جب روپا سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی اور ہم پروڈکشن کے دوسرے آدمیوں کی ساتھ ذرا سستانے کے لئے بیٹھے تو میرا موڈ اس حد تک خوشگوار ہو چکا تھا کہ میں نے انہیں کئی لطیفے بھی سنائے۔
کسی کو نہیں معلوم تھا کہ میں نے کتنے ہی ایک شعلوں کو ہنسی کے اشارے تلے دفن کر دیا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ میرا ایک نیا جنم شروع ہو گیا ہے۔ ایک اصلاح شدہ جنم جس میں میں اپنی بہت سی خامیوں اور فطری قصاقل پر غالب آچکا تھا یا پھر میری شخصیت پر ایک اور ہی شخصیت کا قول چڑھ چکا تھا۔ پرانا منصور اس میں مقید ہو چکا تھا اور اس کی سلیبی مدح کا دھواں اندر ہی اندر مل کھا رہا تھا، شعلے طاقت پکڑ رہے تھے اور آگ کا ایک سمندر تخلیق کر رہے تھے جو ایک حقیر سے کوزہ جہاں میں بند تھا۔

روپا میری گفتگو پر سب سے زیادہ خوش تھی۔ بات بات پر ہنسی سے اس کی آنکھوں میں پانی آنے لگا رہا تھا۔ میری صبح کی گفتگو کو غالباً اس نے میری نوجوانی کے کسی ناہنٹہ جذباتی تغیر کا مظاہرہ سمجھ کر بھلا دیا تھا اور پہلے سے تعلق خاطر کی فضا میں گہری گہری سانسیں لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسٹوڈیو سے واپسی پر ہمیں کافی تاخیر ہو گئی۔ کشمیر میں پکچرائز کئے گئے چند مناظر میں روپا کا ڈنک کا کام باقی تھا وہ کچھ طویل سمجھ گیا۔ اور ہم ٹائٹ شفٹ کے اختتام سے ذرا پہلے ساڑھے بار بجے کے قریب اسٹوڈیو کے ریکارڈنگ روم سے نکلے۔

کار میں بیٹھ کر انجین اشارت کرنے سے پہلے میں نے لیور دبا کر کنورٹر نھیل شیور لیٹ کی کیٹوں کی چھت کھول دی۔ حالانکہ موسم میں ابھی نکلی تھی۔

انہیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرے خیال میں وہ ہرگز میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی مگر نہ جانے کیونکر اس نے میری دذیبہ نگاہی کو محسوس کر لیا اور دھیرے سے بولی۔ ”اگے چو رہا آ رہا ہے اور وہاں سے اس وقت دودھ کے ٹرک گزرتے ہیں۔۔۔ اگر مارنا ہی ہے تو کسی اچھی سی چیز سے ٹکرا کر مارتا۔۔۔ دودھ کے ٹرک سے ٹکرا کر مرنا تو نہایت غیر روحانی سی حرکت ہو گی۔“

میں مختار ہو کر ڈرائیو کرنے لگا۔

اس رات بلکہ اس کے کئی دنوں بعد تک کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ اب مجھے آگاہی ہی ہونے لگی۔ اس سے پہلے مجھے رہنما کے ساتھ رہتے ہوئے شب و روز کی یکسانیت کا اس بری طرح احساس نہیں ہوا تھا اس دوران کوئی آؤٹ ڈور شوٹنگ بھی نہیں آئی تھی کہ کچھ تبدیلی کا احساس ہوتا۔

ایک روز ہم اسٹوڈیو سے واپس آئے تو ہال میں ٹیلی فون کے پاس رکھی ہوئی پیغامات کی کتاب میں ملازمہ کا نوٹ کیا ہوا ایک پیغام نظر آیا جو ضروری پیغامات کے خانے میں تھا۔ ”چار بج کر تیس منٹ پر کنور میسوری آف نیپال کا فون آیا تھا وہ اسی سڈر ہوٹل ڈی کلس سویٹ نمبر چار سو دس میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ جیسے ہی آپ آئیں انہیں فون کر لیں۔“

پیغام دن کی ملازمہ کا نوٹ کیا ہوا تھا اور وہ جا چکی تھی۔ رہنا نے باقی پیغامات پر بھی سرسری سی نظر ڈالی اور کہا۔ ”میں کپڑے بدل لوں پھر دیکھتے ہیں یہ کنور میسوری آف نیپال کون ذات شریف ہیں۔“

یہ ہمارا معمول تھا کہ اسٹوڈیو سے واپسی پر ایڑی ہونے کے بعد پہلے ہال میں بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ اس دوران روپ ضروری ٹیلی فون کرتی تھی۔ میں تازہ دم ہو کر بیٹھ آیا تو رہنا مجھ سے پہلے ہال میں پہنچ چکی تھی۔ وہ فون کے قریب ایڑی چیر پر بیٹھی تھی اور اس کے سامنے تپائی پر چائے رکھی تھی۔ وہ گود میں کچھ کاغذات رکھے انہیں الٹ پلٹ کر دیکھ ہی تھی۔ ”ایک تو اس شیل کی بیٹی نے ابھی تک مجھے نئے معاہدوں کی فائل ہی بنا کر نہیں دی۔“ وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر ہڑبائی۔ ”مجھے تو بیکریٹری رکھنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔“

”تمہیں اس نام نماد منیجر کو رکھنے کا اب تک کیا فائدہ ہوا ہے۔“ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ دوسری ایڑی چیر پر بیٹھ گیا۔ اس نے کاغذات سمیٹ کر تپائی پر رکھے اور ایک نظر میری طرف دیکھ کر چائے کی ٹرے اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو کوئی میرے دل سے پوچھے۔“

چائے پینے کے بعد میں نے کپ تپائی پر رکھا تو رہنا بولی۔

”اسے کیوں کھول دیا تم؟“ رہنا نے غیر ارادی سے انداز میں اسے جھار وار لیے سے لہاڑے کو زیادہ احتیاط سے جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے سردی لگے گی۔“

”کوئی بات نہیں“ میں نے انکیشن میں چابی گھماتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہاری گاڑی کے تو گلو و کپارٹمنٹ میں بھی دہسکی اور برانڈی کے پوسے موجود رہتے ہیں۔ ایسی صورت سے ٹیپنے کے لئے۔۔۔ دیسے آگاہی کی بات ہے۔۔۔ سردی کچھ ایسی زیادہ بھی نہیں۔ یہ بہی ہے شملہ مسوری یا کشمیر تو نہیں۔“

گاڑی گیٹ سے نکل کر پرائیویٹ روڈ عبور کر کے بڑی سڑک پر آئی تو رہنا نے بچوں کی طرح بظلمتوں میں ہاتھ دے لئے۔ ”دیسے تمہارا کوئی نہ کوئی مقصد ہے ضرور چھت کھول رہے چلے گا۔ تم مجھے بتاؤ یا نہ بتاؤ۔“ چند لمحوں بعد اس نے مضافاتی سڑک پر ادھر ادھر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ جنہیں تمہاری جان کی ورت ہے انہیں راہ چلتے بھی تمہاری شناخت میں دشواری پیش نہ آئے۔“ میری خواہش کہ یہ قصہ جلد از جلد ختم ہو۔ چوسہ ملی کا یہ کھیل آخر کب تک جاری رہے گا؟

”مگر کیا اب تمہاری کوشش یہ ہے کہ وہ لوگ مجھے دیکھیں اور جلد از جلد یہ قصہ پاک ہو جائے تاکہ تمہاری جان چھوٹے؟“ اس نے مجھ کی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں وہ نہیں کر سکا کہ اس کا یہ انداز ادکاری کا کمال تھا یا حقیقت کا مظہر۔

”نہیں۔“ میں نے قدرے ترمیم سے کہا۔ ”میری کوشش ہے کہ وہ لوگ جلد از جلد ان کہیں دیکھ کر سامنے آئیں تاکہ میں جلد از جلد ان کا قصہ پاک کروں۔“ آخری الفاظ رتے وقت نہ جانے کیوں میرے دانت بھیج کر رہ گئے۔

”اوہ منصور! تم یکایک کتنے بدلے بدلے لگے ہو اور اپنی عمر سے کچھ بڑے بھی۔“ میں رہنا کی حیرت بھری آواز سن کر اس کی طرف دیکھا وہ قدرے پھیلی پھیلی آنکھوں سے طرف دیکھ رہی تھی۔ اس عالم میں وہ بہت معصوم دکھائی دیتے مگر میں نے ان کی کوشش کی تاکہ میرے جبروں کے سنے ہوئے عضلات معمول پر آجائیں۔ میری نش عابا ”کامیاب رہی۔ کیونکہ میں نے رہنا کو اطمینان کی ایک گھڑی سانس لیتے سنا۔ چرو اس وقت تک تاریکی کی زد میں آچکا تھا۔ کیونکہ ہم ایک الیکٹرک پول کی روشنی مانی سے نکل چکے تھے۔۔۔ اور دوسرے کی روشنی کی حدود میں داخل ہوتے والے

ایک لمحے کی تاریکی گزر جانے کے بعد میں نے دوبارہ رہنا کی طرف دیکھا۔ وہ اب سے ٹپک لگائے بیٹھی تھی اور اس کے کھلے سیاہ بال دور تک ہوا میں لہا رہے تھے۔ مسلسل پھر پڑا ہٹ سے نکل کر اس نے انہیں سمیٹ کر جوڑا بنا لیا۔ میں کن

”ذرا فون کر کے دیکھو تو مسی یہ کنور میسوری کون ہے اور کیا چاہتا ہے میں نے تو اس سے پہلے کبھی یہ نام نہیں سنا۔“

میں نے ڈائریکٹری میں اسیسٹر کا نمبر دیکھا اور سوئٹ نمبر چار سو دس سے رابطہ قائم کیا۔ ایک کھردری سی مردانہ آواز نے ہیلو کہتے ہی پوچھا۔ ”آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“

”کنور میسوری سے۔“ میں نے پروکار لیے میں کہا۔

”آپ کا اسم گرامی؟“ دوسری طرف بولنے والا کچھ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”میں میڈم روپا کا منیجر ہوں۔۔۔ میرے خیال میں آپ کے لئے اتنا ہی جان لینا کافی ہے۔۔۔ آپ کی تعریف؟“ میں نے پوچھا۔

”میں کنور میسوری کا سیکرٹری ہوں۔۔۔ میں ابھی ان سے آپ کی بات کراتا ہوں۔ ایک منٹ ہولڈ کیجئے۔“ میں نے اس کے لیے میں دبا دھا سا جوش محسوس کیا۔ دوسری طرف سکوت چھا گیا۔ پھر غاصے فاصلے پر جیسے کوئی دروازہ کھلا اور بند ہوا۔ چند لمحوں بعد ایک بھاری بھر کم آواز ابھری۔

”ہیلو۔۔۔ منیجر! کنور میسوری نے بغیر کسی تعارف اور تمہید کے کہا۔

”کیا یہ ممکن نہیں کہ میڈم روپا سے میری براہ راست بات ہو سکے؟“

”جیس کنور میسوری! میں نے رکھائی سے کہا۔“ آپ کا مقصد معلوم ہوئے بغیر یہ

نہیں ہے۔“

”ایک بہت بڑی فلم کا سلسلہ ہے جسے ہم جی ایم فلمز والوں کے اشتراک سے پلان کر رہے ہیں۔۔۔ اس میں میڈم روپا کو کاسٹ کرنے کی بات کہنی ہے۔۔۔ یہ تو خیر ابتدائی معاملہ ہے۔ ہماری اصل دلچسپی ایک دوسرے پروڈیکٹ میں ہے جو بین الاقوامی نوعیت کا ہے۔ ہم میں بعض مصلحتوں کی بناء پر میڈم روپا کو پارٹنر شپ آفر کرنا چاہتے ہیں۔“ کنور دی نے بتایا۔

”چند سیکنڈ ہولڈ کیجئے میں میڈم سے بات کرتا ہوں۔“ میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھتے ہوئے کو تنگ ماری اور وہ بھی آواز میں اسے بتایا کہ کنور میسوری کیا کہہ رہا ہے۔

”میں بات کر کے دیکھ لیتا ہوں۔“ روپا نے سرگوشی میں کہا۔ ”ویسے تم بھی سننے لگو۔ اس نے ٹیلی فون کے اسٹیشن کی طرف اشارہ کیا۔ اس نمبر کی ایک اسٹیشن روپا بگھ میں تھی اور دوسری اسی سیٹ کے قریب روپا نے ہال میں رکھوائی تھی کیونکہ فراڈ سے متنبہ کرتے وقت وہ کبھی شرارت اور کبھی مصلحت مجھے سنوائی تھی۔ میں ان کا ریسیور اٹھا چکا تو روپا نے ہیلو کیا۔

گند ایوننگ میڈم! کنور کا لہجہ پہلے سے زیادہ شائستہ ہو گیا۔

”مجھے کنور میسوری تلف نیپال کہتے ہیں۔۔۔ شاید آپ نے کبھی میرا نام سنا ہو۔“

”جی نہیں۔“ قدرے توقف کے بعد روپا نے صاف گوئی سے کہا۔ میں نے کبھی نہیں سنا۔“

”بڑا افسوس ناگ انڈیا ہے۔۔۔ خادم کا تعلق نیپال کی بڑی امیر ترین فیملی سے ہے۔۔۔ بہر حال اسے چھوڑیے۔۔۔ اسے گویا انکساری ظاہر کرنے کا خیال آگیا۔“ اصل بات یہ ہے کہ فیملی کا واحد وارث ہونے کی بناء پر میں نے محض خاندانی دولت پر نگاہ کر کے بھڑ جانے کی بجائے ہاتھ پاؤں بلائے کی کوشش کی ہے۔ پچھلے ایک سال سے میں نے ایک کثیر الا مقاصد قسم کا تجارتی ادارہ بنا رکھا ہے۔ کوئی نسل کارپوریشن کے نام سے کینیڈا، انگلینڈ، ہانگ کانگ وغیرہ میں اس کے دفاتر ہیں۔ حال ہی میں فلم سازی کو بھی میں نے اپنے تجارتی منصوبوں میں شامل کیا ہے اور جی ایم فلمز کے ساتھ اشتراک کا معاہدہ کیا ہے۔ انہوں نے ہمیں پہلے تو صرف ہندوستان کی مارکیٹ کے لئے ایک بڑی کاسٹ کی فلم کا منصوبہ دیا ہے۔ اس کے بعد بین الاقوامی مارکیٹ کے لئے ایک وقت چار فلموں کا پلان تیار کیا ہے۔“ وہ سانس لینے کے لئے ایک لمبے کو خاموش ہوا۔

”ہمارا ادارہ آپ کو اپنی مستقل اشار رکھتا چاہتا ہے۔ ہندوستانی فلم کے لئے تو ہم آپ کو دفاتر معاوضہ دیں گے جو آپ طلب کریں گی۔“ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”انہی بین الاقوامی فلموں میں ہم آپ سے پارٹنر شپ کرنا چاہیں گے۔ آپ چاہیں تو نفع نقصان میں شریک ہوں یا کچھ سرکے لے لیں۔۔۔ ویسے ہمارے منصوبوں کے بارے میں آپ غالباً کچھ نہ سمجھتے تو اخباروں میں پڑھ ہی چکی ہوں گی۔“

”ویسے میں تو روپا کو آتی ہی نہیں تھی۔ ایسے موقعوں پر اس کا جواب فلمی عورت کی روایات کے خلاف ہوا کرتا تھا۔“ جی نہیں۔“ اس نے بلا تامل کہا۔ ”میں اخبار وغیرہ پڑھتی ہی بہت کم ہوں۔ ہم جیسے لوگوں کے بارے میں ان میں جانے کیا کچھ لکھا ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ پڑھ کر دل دکھتا ہے۔ ویسے جتنا میں پڑھتی ہوں اس میں کبھی اس قسم کی کوئی خبر نظر سے نہیں گزرتی۔“

”اوہ خیر۔۔۔“ کنور میسوری نے ایک گہری سانس لی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ سب ہمارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں۔ بہر حال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہن کے میرے موجودہ دورے کا سب سے اہم مقصد آپ سے معاملات طے کرنا ہی ہے میں جلد از جلد آپ سے شرف ملاقات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

روپا نے ایک لمبے توقف کیا پھر ثنات متانت سے بولی۔ ”میں اپنی سیکرٹری سے اپنی مصروفیات کا شیڈول معلوم کرنے کے بعد ہی آپ کو کوئی وقت دے سکتی ہوں اور سیکرٹری اس وقت موجود نہیں ہے۔“

”لیکن پلیز مجھے کوئی یقینی جواب ضرور دیجئے۔۔۔ میرا یہاں قیام صرف کل شام تک کا ہے۔“ کنور میسوری کے لیے میں ایک وقار آمیز التجا تھی۔ ”کل شام مجھے ہر حال میں لندن کی پرواز پکڑنی ہے میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“

”اچھا ٹھہریجئے۔۔۔ میں اپنی ڈائری دیکھ کر کچھ بتاتی ہوں۔“ روپا نے متعجب لہجے میں کہا اور ریسیور پر ہاتھ رکھ کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔۔۔ میں نے اشارہ دیا کہ وہ ملاقات کا وقت دے۔

اس نے مزید چند لمحے توقف کیا پھر ہاتھ پیس سے ہاتھ بناتے ہوئے کہا۔ ”کل تو میں اسٹوڈیو جانے سے پہلے ہی وقت نکال سکتی ہوں۔ آپ صبح نو بجے آجائیں۔ ہم ایک مختصر گفتگو کر سکتے ہیں یا پھر آپ اٹھائی بجے اسٹوڈیو آجائیں، دو شوٹنگوں کے درمیان میرے پاس اٹھائی گھنٹے کا بریک ہے۔ بشرطیکہ شوٹنگیں وقت پر ہوں۔ جو کہ عموماً وقت پر نہیں ہوتی۔“

”گھر پر ہی گفتگو ٹھیک رہے گی۔ لیکن کیا آپ واقعی صبح اتنی جلدی تیار ہو جاتی ہیں؟“

”جی ہاں! کیونکہ میں شوٹنگ کے لئے کبھی رات کا وقت نہیں دیتی۔“ روپا نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

”لمبی دنیا کے ہاتھ میں نے صرف اپنے دن فروخت کئے ہیں۔ راتیں اپنے ہی قہرے میں رکھی ہیں۔“

”بہت خوب بہت خوب میڈم!“ کنور میسوری کا لہجہ کچھ خوشامدانہ سا ہو گیا۔ ”مجھے کسی نے بتایا تھا اور ٹھیک ہی بتایا تھا کہ آپ روایتی فلمی عورتوں سے بہت مختلف ہیں۔ آپ سے ملاقات یقیناً میرے لئے ایک خوشگوار تجربہ ہو گی۔“

”شاید۔“ روپا نے خشک لہجے میں کہا۔ ”خدا حافظ“ اس نے ریسیور رکھ دیا لیکن دوسری طرف سے میں نے کئی سیکنڈ بعد سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سنی۔۔۔ تب میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ روپا اپنی آرام ڈاکری پر جا بیٹھی تھی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے دھیرے دھیرے ایک پاؤں ہڈا رہی تھی۔

”کیا بات ہے ملاقات کے لئے وقت دینے میں تم بہت ہنگامہ رہی تھیں؟“ میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ابھن میں پڑ گئی تھی مضمون!“ اس نے ہاتھوں کی مرمریں اور مخروطی اٹھلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آج تک کوئی ایسا نپاتی نہیں دیکھا جو میسوری کی طرح اتنی صاف اردو بولتا ہو۔“

”ہو سکتا ہے اس نے ہندوستان ہی میں پرورش پائی ہو۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

دیپے بھی امراء میں شمار ہونے والے ”گگ“ عموماً کئی کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ ”بہر حال ہمیں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔“ روپا نے کہا۔۔۔ ”دوسے گگ، کٹر کیوں کے مراسم بڑھانے کے لئے عجیب عجیب روپ دھار لیتے ہیں۔۔۔ کوئی نواب ہے گا جس کی پامرار کسی راجے مہاراجے کا وارث بن بیٹھتا ہے اور کوئی کسی ایسے بزنس مہرہ مختلف فلموں کر۔۔۔ اٹھاتا ہے جس کی شانیں پوری دنیا میں پھیلی ہوتی ہیں۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ موصوف کسی دہقان کے صاحبزادے ہیں جو حال ہی میں دس بیس ایکڑ زمین چھوڑ کر مرا ہے اور یہ اس زمین کو بیچ کر دس بیس دس بیس غنات کی زندگی بسر کر کے دل کی حسرتیں نکال رہے ہیں۔ گلزار بالو سے تم واقف ہو؟“

میں نے ذہن پر زور دیا کہ یہ گلزار بالو کون تھی؟ نام تو کچھ مانوس لگ رہا تھا۔

”نیکن پلیز مجھے کو مہم ہے۔“
 ”کنور میسوری کے گھر پر
 لندن کی پرواز پکڑنی ہے بس پر
 ”اچھا ٹھیک ہے
 کیا... یہ

کنور میسوری کے گھر پر
 لندن کی پرواز پکڑنی ہے بس پر
 ”اچھا ٹھیک ہے
 کیا... یہ

دوسرے ہی لمحے مجھے یاد آگیا کہ گلزار بانو کون تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا گلزار بانو کسی زمانے میں صف اول کی ہیروئن تھی۔ آج کل اس کے عروج کا ستارہ کچھ ماند پڑ چکا تھا۔

”گلزار بانو تو اس قسم کے ایک نوجوان کے چکر میں کچھ زیادہ ہی پھنس چکی تھی۔“ رنو نے بتایا۔ ”اور تقریباً“ وہ سناں پہلے اس سے شادی بھی کر بیٹھی تھی۔ اس کا زوال تو درحقیقت اسی وقت سے شروع ہوا ہے بلاخرے شمار بیسہ وقت اور ساکھ برباد کر کے طلاق لے کر ہی جان چھوٹی تھی۔“

”تمہیں کوئی اس طرح کا چکر نہیں دے سکتا۔“ میں نے مسترا کر کہا۔ ”تمہارے پاس تو کالے جاوے سے زیادہ خطرناک علم موجود ہے۔۔۔ انسان کو پردہ لینے کا علم۔“

”وہی علم تو مجھے اب تک بچائے ہوئے ہے۔ وہ بھی مسکرائی۔“ ”ورنہ تمہیں کیا معلوم ہماری لائن میں کیسے کیسے جاوے گا۔“ اسکرین پر چہرہ نو نظر آتے ہیں اس سے کہیں زیادہ فکار۔ تو پس پردہ پڑے ہوئے ہیں۔ انسان کو پس پردہ میں کوہ قاف لے جانے والے۔“

”میں نے اسی لئے تو تمہیں کنور میسوری سے ملاقات کر لینے کا مشورہ دیا تھا کہ دل میں جو خنجر ہو وہ اُگل جائے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ کھنک نہ رہے کہ شاید وہ کام ہی کا آدمی تھا جس سے ہم نے ملاقات نہیں کی۔“

”مجھے اب اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ وہ کون ہے کیا چاہتا ہے اور نہ ہی اس بات کی کوئی پروا ہے کہ اس سے مل کر مجھے فائدہ ہو گا یا نقصان۔ بس تم قریب موجود رہو تو میں جنوں کے سردار سے بھی ملاقات کے لئے تیار ہوں۔“ اس نے مسکرا کر خوبیاں سے لمحے میں کہا اور ایک طویل انگڑائی لے کر ایک سخت جسم ڈھیر چھوڑ دیا۔ پھر ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”اپنا تو موسیقی سننے کو ہی چاہ رہا ہے تمہارا سوا بے تو تم بھی میرے کمرے میں آجنا۔“

”شکریہ!“ میں نے آداب بتا لانے والے لمحے میں کہا۔ ”بہو بغیر موسیقی کے ہی نیک ہے۔“ پھر میں نے سٹیج پر ہو کر ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ ”دراصل میں آج کل

کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کر رہا ہوں۔“

مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی خوابگاہ میں جا کر تمام روشنیاں بجھا دے گی، کھڑکیوں کے پردے کھینچ دے گی۔ ایک گوشے میں صرف ایک تنہا سابل روشنی رہے گا جس کی پراسرار سی برائے نام روشنی میں ہر چیز پھیلے ہوئے سائے کی طرح نظر آئے گی۔ پھر وہ مختلف فلموں کے، جن میں اس کی اپنی فلمیں بھی شامل ہوں گی، البتہ لغزوں کے ریکارڈ گراموفون پر لگائی رہے گی اور دنیا مافیہا سے بے خبر ہو کر چھت پر نظر گاڑ کر سنتی رہے گی۔ پھر کسی لمحے پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گی اور دنیا کی کوئی طاقت اسے چپ نہیں کرا سکے گی۔ حتیٰ کہ وہ یونہی روتے روتے تکیے میں منہ چھپائے سو جائے گی اور ریکارڈ ختم ہو جانے کے بعد بھی صبح تک اسی طرح سوئی تلے سرسرا رہے گا۔

جن دنوں میں بنیایا تھا اسے موسیقی سننے کے یہ دورے اکثر پڑتے تھے اب ان میں بہت کمی آچکی تھی۔ پینے پلانے کی رفتار بھی بہت کم ہو چکی تھی۔ بقول اس کے اپنے ”وہ سینے میں بکھری ہوئی کرچیوں کو جمع کرنے میں کامیاب ہوئی جا رہی تھی۔“

میں نے اس سے پڑھنے لکھنے کے کام کا درحقیقت بہانہ ہی لیا تھا روپا سے جدا ہونے کے بعد آج کل ایک ہی مشغلہ ہوتا تھا جسے میں فریضے کی طرح انجام دیتا تھا اور یہ کام تھا سوچنا۔۔۔ صرف سوچنا۔

میں گھنٹوں اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا رہتا اور ملقبی، امریکی میں نظریں گاڑے سوچتا رہتا۔ پانگ پر لپکتا تب بھی یہ سوچیں میرے ذہن کی لہر میں سنگرزوں کی طرح چھتی رہیں۔ حتیٰ کہ خواب بھی مجھے کچھ ملتے جلتے سے ہی نظر آتے میری سوچوں کا عنوان بھی ایک ہی تھا ذہن خواہ کیسے بھی بیکراں جزیروں میں بھٹکتا رہتا مگر سوچ کا بیج ایک ہی رہتی۔ ذہن جیسے قلب نما کی سوئی بن گیا تھا۔

سوچ بچار کی یہ ریاضت بے سود نہیں تھی۔ میں اپنے آپ کو یا سیت کے سمندر میں نہیں ڈبو رہا تھا۔ میرے ذہن میں تو بہت بڑی ہسٹل تھی اور میں دھیرے دھیرے اس پر مرت سجا رہا تھا۔ میں اپنی ذات کے لئے خود ہی استاد بنا ہوا تھا اپنی تربیت کر رہا تھا۔ بڑی عمر کے اپنی ذہنی تراش فراش کا کام انجام دے رہا تھا۔ مئی کی ڈائری کو میں نے جلد دیا تھا۔ مجھے اب ان کی ضرورت نہیں تھی اس کا ایک ایک لفظ میرے ذہن پر نقش تھا۔

دوسرے روز ہم ناشتے سے ”تقریباً“ فارغ ہو کر کافی پی رہے تھے جب پٹھان چوکیدار اعجاز خان نے ایک سنہری وزینٹ کارڈ پیش کیا۔ میں نے سن اٹھیوں سے دیکھا۔ سنہری کارڈ پر نہایت نفیس اور باریک حروف میں صرف ”کنور میسوری آف نیپل“ چھپا ہوا تھا۔ کوئی ایڈریس یا فون نمبر وغیرہ نہیں تھا جیسا کہ عموماً ”نہایت اہم اور بڑی

پڑھی لکھی تھی، عمر زندگی نے جہاں اسے اور بہت سچے سکھایا تھا لباس کا سلیقہ بھی غضب کا دیا تھا۔ وہ بیسویں دوسری عورتوں سے الگ نظر آتی تھی، اور پارٹیوں میں منے دیکھا تھا کہ وہ سماجی یا مالی اعتبار سے اپنے سے کہیں بڑی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کلچرڈ عورتوں پر بھی چھا رہی تھی۔

میرے تاثرات سے اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا اور مطمئن ہو کر دوبارہ ٹھٹھکے گئی۔ پانچ منٹ بعد اس نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا اور ہم ڈرائنگ روم کی طرف چل دیے۔
روپائے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کے لئے پر وہ ایک طرف کو ہٹایا تو میری نظر آرامتہ و پیرامتہ اور طویل و عریض ڈرائنگ روم میں سامنے ہی صوفے پر بندے با رعب انداز میں بیٹھے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے کوئی منگول شہزادہ دکھائی دیا اس کے لمبے لمبے بھورے بالوں کی تکیوں اس کے کندھوں کو چھو رہی تھیں.... چھٹی ٹاک تکیے تکیے پکی پکی طرز کی مونچھیں ڈھیلے ڈھالے انداز میں لٹکی ہوئی تھیں.... آنکھوں پر طلائی فریم کی تاریک شیشوں والی عینک تھی، چہرہ خاصا چوڑا اور رنگت سچے ہوئے تانبے سے مشابہ تھی۔ رخساروں پر جیسے گوشت میں گرہیں سی پڑی ہوئی تھیں۔

وہ سفید چکیں ساٹن نما کسی کپڑے کا چھین طرز کا بند گلے کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کوٹ کے ساتھ اس نے چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ چروں میں مٹلیں جوتے تھے جن پر سفید موتی لکے ہوئے تھے۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے سبز پتھروں کی مالا تھی ان پتھروں میں بڑی مدھم قسم کی چمک تھی۔

مجموعی طور پر وہ ہماری تن و توش کا آدمی تھا اور کچھ اس انداز سے بیٹھ ہوا تھا جیسے زمانہ قدیم کا کوئی بادشاہ اپنے درباریوں سے خطاب کرنے لگا ہو۔۔۔ روپا کو دیکھتے ہی وہ اٹھا اور کورنش بجا لانے کے سے انداز میں جھک کر اس نے گویا اسے خوش آمدید کہا۔ اس کی ... آنکھوں پر گو کہ تاریک شیشوں کی عینک تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ سیدھا کھڑا ہوتے وقت اس نے مہری نظروں سے روپا کا سر تا پا جائزہ لیا تھا اور اسی وقت مہری نظر ایک اور شخص پر پڑی ہو غالباً "حد ادب کے طور پر کنور میسوری سے کافی فاصلے پر ایک اور کرسی پر بیٹھ تھا۔

روپا کو دیکھ کر وہ بھی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور احراما بھٹکا تھا۔ اس کے پیروں کے قریب چمڑے کا ایک نفیس بریف کیس رکھا تھا یہ شخص نہایت دبلا پٹلا تھا مگر اس کے بازو، ٹانگیں اور ہاتھوں کی انگلیوں غیر معمولی طور پر لمبی تھیں۔ اس کے چہرے کے عضلات کھینچ کھینچ سے متھے اور آنکھیں مینڈک کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ تاہم اس کے بال اچھے تھے اور سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ وہ سوٹ میں لمبوس تھا اور سوٹ کی عمدہ تراش خواہش کی وجہ سے اس کی شخصیت پر غیر نفیست نظر آرہی تھی۔ یقیناً ”وڈ کلوڈ تیموری“ کا سیکرٹری

شخصیتوں کے کارڈ پر ہوتا ہے کہ صرف ان کا نام کافی سمجھا جاتا ہے۔
 ”انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھاؤں میں آ رہی ہوں۔“ روپا نے دنیہنگ کارڈ پر نظر ڈال کر
 کافی کا مگھونٹ بھر کر کہا۔

میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا جس میں نیلے رنگ کا شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس سے باہر کا منظر نظر آتا تھا اندر کا نہیں۔ اس کھڑکی سے گیٹ دکھائی دیتا تھا۔۔۔ میں نے اسحاق خان کو گیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ اندر آتے وقت وہ گیٹ کو تالا لگا کر آیا تھا۔۔۔ تانا کھولنے کے بعد اس نے چوڑے پچکے گیٹ کے دونوں پٹ کھولے ساتھ ہی چھیلے سیاہ رنگ کی ایک کیڈلک بے آواز غصہ کی طرح اندر پھسل آئی۔ اس کے شیشے بھی گہرے رنگ کے تھے۔۔۔ اور کار کی جو سائیڈ مجھے نظر آ رہی تھی اس طرف کی کھڑکیوں میں عمل طور پر شیشے چڑھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ کار برآمدے کے قریب آ کر رکی ہو گئی۔۔۔۔۔ اور برآمدہ چونکہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا اس لئے میں کار سے اترنے والوں کو بھی نہیں دیکھ سکا۔

میں نے پلٹ کر روپا کی طرف دیکھا وہ کافی ختم کر چکی تھی مگر بدستور اپنی جگہ بیٹھی تھی مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ ”نہو بیج کر دو منٹ یہ کنور میسوری وقت کا تو بڑا پابند معلوم ہوتا ہے۔ یہ صحیح معنوں میں بزنس مین ہونے کی نشانی ہوتی ہے۔“

”چلو پھر اس سے مل آئییں.... دیکھیں اس کا بزنس کیا ہے ٹھنٹ بات تو بڑے نظر آ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اسے چند منٹ انتظار کرنے دو۔۔۔ ابھی تو وہ ڈرائنگ روم میں اپنے لئے نشست کا انتخاب بھی نہیں کر پایا ہو گا۔“ روپ نے ایک چھوٹے سے میک اپ مرمر میں اپنے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”انتظار کرنا بھی حسینوں کی ایک اور رائے دلیہ ہوئی ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”حسینوں کی اوائی دلیری نہیں۔“ اس نے دلکشی سے منکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ اپنی ہیئت بڑھانے کا ایک حربہ ہوتا ہے۔“

میں ایک کرسی پر بیٹھا تو وہ اٹھ کر ٹھٹھکی گئی۔۔۔ ساتھ ہی بیڑی لاپرواہی سے وہ کچھ ٹٹکا بھی رہی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے میری طرف مڑ کر بچوں کی سی معصومیت سے چھا۔ ”میرے پیڑھے تو اچھے ہیں نا؟“

میں اسے بتا نہ پایا کہ اس وقت بڑے بڑے کاغذی پھولوں والی رنگین اسٹرائپس کی سڑھی
 و اسی طرز کے بڑے بڑے چاندی کے زیورات میں وہ کس قدر خوبصورت لگ رہی
 تھی۔ کہنے کو یہ زیور چاندی کے تھے مگر ان میں کئی ہیرے جڑے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ روپا معمولی

تھا۔

تہ رفت کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کیونکہ ہم چاروں ہی ایک دوسرے کو جان چکے تھے۔۔۔۔۔ روپا نے سر کی حقیقت ہی جنہیں سے ان کے ساموں کا جواب دیا اور انہیں بیٹھنے کے لئے کہہ کر مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئی۔

”آپ کیا چنا چاہتے ہیں؟“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”مکھنٹ کی ضرورت نہیں میڈم!“ یہ جملہ اس نے نہایت شستہ انگریزی میں ادا کیا تھا اور گویا میرے اس خیال کی تصدیق کر دی تھی کہ غیر معمولی طور پر اونچے خاندانوں کے لوگ عموماً کئی کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ اس کی توجہ خاصی گونج دار تھی۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ کا تم سے تم وقت لوں۔“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ اس مسکراہٹ کے دوران اس کی لہجی ہوئی چٹگری مونچھوں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔

”آپ اطمینان سے بات کریں۔۔۔۔۔ میرے پاس ایک مہمند فاضل ہے۔“ روپا نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اس سے بھی زیادہ شستہ انگریزی میں کہا۔ اسے انگریزی بولتے من کر بھی کوئی اس کی اصلی قسمی استعداد کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔

”سب سے پہلے تو آپ یہ جانیں کہ کیا آپ ہماری اس فلم میں کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جو ہم نے ایم والوں کے اشتراک سے ہندوستانی مارکیٹ کے لئے بنا رہے ہیں؟“ کنور میسوری نے اب اردو میں بات شروع کر دی۔

روپا کی پریشانی پر ہلکی سی ہنسنے لگا ہوا روپا نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں پیسے اسکرپٹ پر تھی ہوں اس میں اپنا رول دیکھتی ہوں باقی کاسٹ دیکھتی ہوں پھر معاوضے کی بات کرتی ہوں اور جب یہ سب چیزیں طے ہو جائیں تب حالی بھرتی ہوں۔“

”بتایا تھا۔۔۔۔۔ میں اسکرپٹ ساتھ لے آیا ہوں۔ ملک کے یہ نانو مصنف رہبر بلانی نے اب یہ لکھا ہے۔“ تھمہ انگریزی ٹائل سے ہے۔“

پھر کنور نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”وہ میں ابھی آپ کی خدمت میں پیش کروں گا میں آپ سے صرف یہ یقین دہانی چاہتا تھا کہ اگر اسکرپٹ آپ کے رول کاسٹ اور معاوضے وغیرہ کی طرف سے آپ کا اطمینان ہو گیا تو آپ ہمارے ساتھ آئیں گی یا نہیں آپ کا شیڈول بہت زیادہ ٹائٹ ہے؟“

اب اگر روپا کی جگہ کوئی اور بیرونی ہوتی تو خواہ اس کی صرف ایک فلم سیت پر ہوئی مگر کاروباری مصلحت کے تحت اس کا جواب کچھ اس قسم کا ہوتا۔ ”وہ جی شیڈول میں تو بالکل گنجائش نہیں ہے لیکن اب آپ یہی کہتے ہیں اور پھر آپ کالی نیم والوں سے بھی سوال ہے۔۔۔۔۔ ان کا حال تو کرنا ہی ہے۔۔۔۔۔ گا میں کہیں نہ کسی طرح تمہاری سائنس نکال دلاؤں گی۔“

اس کی بجائے روپا نے نہایت دیوانداروں سے کہا۔ ”تو سچ اور ہے۔“

سائنس کرتی ہوں۔ اس لئے میں مشین کی طرح دن رات مصروف کچھ اور ہے۔“

بھی نہیں۔ اس پورے سال میں میرے پاس بہت کم ڈشیں ہیں۔“

تھی لیکن بہت معمولی خد تک۔

”خیر۔۔۔۔۔ یہ باتیں تو طے ہو ہی جائیں گی۔“ کنور میسوری نے کہا۔ ”پہلے آپ کو فلم اسکرپٹ اور متعدد منصوبوں کی رپورٹ پیش کرتا ہوں۔۔۔۔۔ آپ نظر ڈال کر ہی شاید کسی فیصلے پر پہنچ سکیں۔ اس نے اپنے ٹیکریٹری کو اشارہ کیا۔۔۔۔۔ ٹیکریٹری نے بریف کیس اٹھا کر نہایت ادب سے اس کے سامنے جا کر پیش کیا۔

”گاڑی سے بڑی فائل بھی نکال لاؤ۔“ کنور میسوری نے اسے حکم دیا۔۔۔۔۔ وہ سوہانہ مستعدی سے گھبرا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا میرے قریب سے گزر کر دروازے کی طرف چلا گیا۔۔۔۔۔ ڈرائنگ روم میں تو نہایت دیکھ ایرانی قلمیں بچھا ہوا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ نئے فرش پر چلتے وقت ہی اس شخص کے قدموں کی آہٹ پیدا نہیں ہوئی تھی۔۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چلتے وقت اس کے جوتے فرش کو چھوتے ہی نہیں تھے۔

کنور میسوری نے بریف کیس کھنڈوں پر رکھا اور کوئی ٹیبل دیا کر کھٹکے سے اس کا تالا کھولا اور اس پر جھک گیا۔۔۔۔۔ چند لمبے بعد اس نے بریف کیس میں ہاتھ ڈال کر جو چیز نکالی وہ خوف ناک سی ساخت کا ایک دیوانی دیوانہ تھا جس پر سلیس بھی لگا ہوا تھا اور جس کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ اس سانپ نے اس وقت بھی نکالا تھا جب میں اس پر سانپ ہونے کا شبہ تک نہیں رہا تھا۔ تاہم میں نے اپنی حیرت ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ البتہ ایک نظر روپا کی طرف ضرور دیکھ لیا۔ اس کا چہرہ یک لخت سپید پڑ گیا تھا۔ مگر پھر شاید میری موجودگی کے احساس سے وہ کچھ سنبھل گئی۔

”جی ایک ایسا اسکرپٹ ہے میڈم روپا۔“ کنور میسوری نے دیوانہ کو جنہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کوئی سی بھی زبان بولنے والے با آسانی سمجھ سکتے ہیں غالباً“ آپ بھی سمجھ گئی ہوں گی کہ میں آپ کو بیٹھے آیا ہوں۔“

میرا ہاتھ وہ گود میں نکالا ہوا تھا۔۔۔۔۔ غیر محسوس طور پر میری ٹیکٹ کی پیسہ کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں میرا مشین بائسل موجود تھا۔ کنور ہم سے اتنا فاصلے پر بیٹھا تھا کہ ڈر میں انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھی چھلانگ نہ لگتا تھا۔ اب بھی زیادہ امکان ہی تھا کہ اس کے دیوانہ سے نکلنے والی گویاں مجھے بچ راستے ہی میں ڈھیر کر دیتی اور یہ شخص کنور میسوری یا جو بھی اس کا اصل نام تھا۔۔۔۔۔ دیوانہ کو کھنڈے ہی کی طرح استعمال کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

تھا۔

تعارف کی ضرورت مع خطرناک اور سخت جان شخص تھا مجھے معلوم تھا کہ بینک کے تھے۔۔۔۔۔ روپائے سر پہنے چھپی ہوئی اس کی آنکھیں روپا کو کم اور مجھے زیادہ دیکھ رہی ہیں۔ کسی لمبے میں بہت ہی آہستگی سے جیب کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا کنور میسوری بھی جگلت میں کوئی قدم اٹھانے کا عادی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کا انداز کسی بھاری بھر کم اور مست الوجود اڈر سے مشابہ تھا جو بڑی قابل سے رہتا ہے مگر جب کسی جاندار کے جسم کے گرد لپٹ جاتا ہی تو چند سیکنڈ میں اس کی ہڈیاں چور کر کے رکھ دیتا ہے۔۔۔۔۔ اس کا انداز کوبرا جیسا نہیں تھا جو بھلی کی سی تیزی سے اُستا ہے۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں بخود۔۔۔۔۔“ دفعتاً اس کی غراہٹ سن کر میرا دل کچھ زیادہ خیزی سے دھڑک اٹھا۔ ”ہاتھ اپنی جگہ ساکت رکھو ورنہ یہ جسم سے الگ بھی ہو سکتا ہے اس ریوالور کی گولی بڑی ظالم ہے اور ذرا ایک نظر پیچھے بھی دیکھ لو۔“

میں نے گردن ترچھی کر کے دیکھا کنور کا سیکرٹری جو گاڑی سے بڑی فائل نکالنے گیا تھا اور اس کے ہاتھ میں بھی ویسا ہی ریوالور تھا جس کا رخ میری گدی کی طرف تھا۔ مینڈک کی آنکھوں سے مشابہ اس کی آنکھیں بالکل ساکت تھیں اور ان میں بے رحم موت اپنے خوفناک پر پھیلے بیٹھے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ محض ایک ریوالور کے اٹھانے سے وہ بچوں سا شخص کس قدر سفاک نظر آنے لگا تھا۔

”رشی!“ کنور نے اپنے نام نما سیکرٹری کو مخاطب کیا۔ ”برخودار کو غیر ضروری وزن سے نجات دلا دو۔“ میں نے پیچھے دیکھے بغیر محسوس کر لیا کہ وہ عقب میں میرے قریب پہنچا ہے۔ پھر اس کا استخوانی ہاتھ مجھے اپنی مینڈک کی جیب کی طرف بڑھتا نظر آیا اور دوسرے ہی لمحے میرا مشین ہاسٹل اس کی غیر معمولی طور پر لمبی انگلیوں کی گرفت میں تھا۔

”بڑی عمدہ چیز ہے۔“ ساتھ ہی اس کا ہنسنے لگا ہوا۔ اس کی آواز کچھ ایسی ہی تھی جیسے مینڈک کا گھا بٹھ گیا ہو۔ مجھے حیرت تھی کہ اس کی شخصیت میں مینڈک سے اتنی مشابہت کیوں تھی۔

مشین ہاسٹل اس نے غالباً اپنی جیب میں رکھ لیا اور اسی ہاتھ سے میری دوسری ہڈیوں کو تھپتھپایا۔ بغلیں ٹوٹ کر دیکھیں کہ کیسی ہواسٹرو موجود نہیں، پھر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے غالباً کنور میسوری کو کوئی اشارہ کیا کیونکہ وہ ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں ریوالور سنبھالے اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلے میٹھا! کنور نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس مرجہ میڈم اس نے نذرانیے لیے میں مانتا تھا۔

”کہاں لے جاتا ہے؟“ روپا نے سرسراہٹ آواز میں پوچھا۔

”میرا میں چھتہ میں آپ کو جاندار لے آؤں۔“ کنور نے مکرات انداز میں مسکراتے

ہوئے کہا پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”لیکن افسوس کہ میرا معاہدہ کچھ اور ہے۔“

”کس سے ہے تمہارا معاہدہ؟“ یہ سوال میں نے کیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ چس۔۔۔۔۔ چس۔“ اس نے گویا کسی دودھ پیتے بچے کو پکارتا۔ ”لوکے ہائے!۔۔۔“

قسم کا سوال نہیں کیا کرتے۔“ پھر وہ روپا سے مخاطب ہوا۔ ”مجھے اطلاع ملی ہے کہ مینجر آڈ میں تم نے کثیر المقاصد قسم کا یہ لونڈا رکھا ہوا ہے۔ یہ کافی خطرناک ہے محض اس کی شہرت سن کر ہی میں آپ کے ساتھ اسے بھی لپیٹے لئے چل رہا ہوں ورنہ اس کی کوہ ضرورت نہیں تھی۔“

اس کے اس تھپتھکی انداز پر بھی میں نے معمولی سا بھی رد عمل ظاہر نہیں کیا اور نہایت پر سکون لمبے میں کہا۔ ”یہ آپ کی نوازش ہے سو رہی! دیئے آپ یہ زحمت نہ کر۔ تب بھی میں آپ کے ساتھ چلنے کی درخواست سہرور کرتا آپ جیسے بزرگوں کی صحبت روز تو نصیب نہیں ہوتی۔“

ضرور۔۔۔۔۔ ضرور چلو برخودار!“ اس نے خلاف مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”جھیں بھو پتا تو ہے کہ کنور میسوری درحقیقت ہے اس چیز کا نام۔“ پھر ایک لمبے لمحے میں کرختگی آئی۔ ”اب اٹھ بھی چلو۔“ ساتھ ہی اس نے ریوالور کو حرکت دی۔

اس وقت میرا ارادہ تھا کہ کوئی ہاتھ دکھاؤں لیکن ایک تو روپا کی وجہ سے باز رہا میں اپنا بھاؤ کر سکتا تھا لیکن اسے نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ دوسرے میں نے یہ سوچ کر ارادہ تبدیل کر دیا تھا کہ اب دور ہاتھ آئی ہے تو سرا بھی طش کر ہی لیا جائے۔

میرے چہرے پر سرور مری دیکھ کر روپا نے نظر پھیر لی۔ اور گویا صرف اپنے آپ پر غور تک کرتے ہوئے قدم سے سختی سے کنور کو مخاطب کیا۔ ”ویسے تم ہو کون؟“

”میں بس آپ جیسے کچھ بڑے بڑے لوگوں کا خادم ہوں۔۔۔ آؤسے وقت میں ان کے کام آتا ہوں۔ ان کے چھوٹے موٹے کام جڑ کے سلسلے میں وہ خواہ مخواہ ادھر ادھر جھک مارتے رہتے ہیں مختصر سے وقت میں انجام دیتا ہوں اور اپنی راہ لیتا ہوں۔ مسافر ہوں آج یہاں کل وہاں۔“ کنور نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

”کرائے کے قائل ہو۔“ روپا نے اپنے لہجے میں حقارت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں اس سے کافی اونچے درجے کا فنکار ہوں۔“ اس کا لہجہ تھوڑا سا ہوا گیا۔ ”اب تم دونوں دروازے کی طرف گھوم جاؤ اور شانہ بٹان پورچ کی طرف چلو۔“ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا ایک لمحے کی ہتھیاریت کے بعد روپا بھی میرے ساتھ قدم اٹھانے لگی۔ رشی دروازے سے ہٹ کر ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ ریوالور کا رخ ہماری طرف تھا۔ ہم اس کے قریب پہنچے تو وہ ریوالور کوٹ کی جیب میں اس طرح رکھ کر کہ اس کی ٹال کا ابھار نظر آتا رہے۔ میرے ساتھ چلنے لگا۔ کنور میسوری ہمارے پیچھے تھا۔

چوکیدار گیٹ سے باہر بیٹھ تھا اس لئے وہ ہمیں کار میں سوار ہوتے نہیں دیکھ سکا۔ اسٹیزنگ پر ڈرائیور موجود تھا کتور نے پہلے روپ کو پھیل سیٹ پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی رشی اس کے پہلو سے روپ اور ٹکائے بیٹھ گیا۔

کتور نے مجھے دوسرے دروازے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ میں پھلکی ہی سیٹ پر روپ کے برابر بیٹھ گیا تو کتور میری پسلیوں پر روپ اور رکھے میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ گاڑی کی پھلکی سیٹ اتنی کشادہ تھی کہ ہم چاروں بغیر کسی تکلیف کے بیٹھے تھے۔ حالانکہ ہم میں سے دو افراد عام تن و قوتش کے مالک نہیں تھے یعنی میں اور کتور میسوری۔

کتور کا لمس محسوس کر کے مجھے ایک اور حقیقت کا احساس ہوا بظاہر وہ قفل قفل کرتے پہلے جسم کا مالک محسوس ہوتا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ اتنا ہی ٹھوس اور مضبوط تھا جتنی اس کے ریو اور کی ٹال جو میری پسلیوں میں چبھ رہی تھی۔

ڈرائیور صورت حال سے قفل طور پر لا تعلق نظر آ رہا تھا۔ اس نے نہ تو پیچھے مڑ کر دیکھا اور نہ ہی کچھ پوچھا خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور تھما کر گیٹ پر لے آیا۔ ہارن سن کر چوکیدار نے گیٹ کھول دیا اور تقریباً بے آواز الجھن والی گاڑی اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی اس نے نہ صرف ہمارے لئے گیٹ کھولا تھا بلکہ کرالوداعی انداز میں ہمیں سلام بھی کیا تھا۔ وہ دیکھ ہی نہیں سکا کہ میری اور روپ کی پسلیوں پر ریو اور ٹکے ہوئے ہیں۔

گاڑی پر سکون رہائشی علاقے سے نکل آئی اور شہر کی بھری پری سڑکوں پر فرار لے بھرے گئی۔

کئی میل کا فاصلہ یاد دہانی خاموشی سے طے ہوا۔ دفعتاً میرے دائیں ہاتھ پر روپا گویا پرک کر اچھلی۔ رشی جو اس کے کندھے سے کندھا جوڑے بیٹھ تھا نے یقیناً "کوئی حرکت کی تھی۔" "نہیں۔۔۔ کتور کے سچے۔۔۔" وہ کھلی کھلی روپائی آواز میں چینی۔

میری کھپلیوں میں ایک ہار پھر شرارے سے پھرنے لگیں میں نے انہیں پیچنے نہ دیا اور ٹھہرے ٹھہرے لمبے میں کتور سے کہا۔ "اس کہنے سے کہو کہ اپنے غلط خیالوں کو قابو میں رکھو ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم دونوں کے پاس ریو اور موجود ہیں۔ مرنے سے پہلے میں تم کو اس کا بیٹھا غرور نکال ہٹاؤں گا۔"

"کیونکی نہیں تم رشی۔" کتور نے مریدانہ سب سے اپنے ساتھ ہی سے کہا۔ اس نے قدرے آگے جھک کر مستراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ اس کی مینڈک جیسی آنکھوں میں مستراہٹ کی روشنی تھی صرف پتلے پتلے ہونٹ عجیب سے انداز میں کھینچ کر رہ گئے تھے۔ وہ کوئی جواب دینے بغیر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

کار میں اتنی خاموشی چھ گئی تھی کہ چپے سسہ سسہ ہو گئے ہوں۔ الجھن کی مدھم مدھم

سربراہٹ کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں مچکین منٹ کے مزید سفر کے بعد جب کار ایک تنگ اور نیم پختہ گلی میں رکی تو وہ علاقہ مجھے اجنبی ہی دکھائی دیا۔ تاہم کار سے اتر کر یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ ہم شہر کے کسی اچھے علاقے میں تھے۔ ہمارے دونوں طرف متوسط درجے کی کوٹھیوں کی قطاریں تھیں لیکن یہ درحقیقت ان کوٹھیوں کی عقبی گلی تھی کہیں کہیں لوگوں نے کوڑا کرکت بھی پھینک رکھا تھا۔

کتور نے جیب سے چابیوں کا ایک بڑا سا گچھا نکال کر ڈرائیور کی طرف اچھالا اور اس نے آگے بڑھ کر ایک کوٹھی کا پچھلا گیٹ کھول دیا۔ یہ ایک خاص کشادہ دو منزلہ کوٹھی تھی جس کے عقبی حصے میں بھی لائن تھا۔ تالا گیٹ میں لٹکانے کے بعد کتور نے چابیوں کا گچھا جیب میں ڈالا اور ہمیں اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ اب رشی ہمارے پیچھے تھا اور کتور میرے پہلو پر پہلو چل رہا تھا۔ ڈرائیور نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا گھاس کے درمیان ایک پختہ روش پر چڑھتے ہوئے ہم قدرے اونچائی پر بنی ہوئی اصل عمارت تک پہنچے مگر کتور کئی دروازوں کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ عمارت کے ایک کونے پر پہنچ کر سیٹ ہی کی کشادہ سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں۔

ہم سیڑھیاں اترنے لگے چاروں طرف مگر اسانا پھایا ہوا تھا کوٹھی میں یقیناً "کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔" سیڑھیوں کے اختتام پر لکڑی کا دروازہ تھا کتور نے ایک یار پھر چابیوں کا گچھا نکال کر ایک چابی تختہ کی نور دروازہ کھول کر اندر قدم رکھتے ہی پایاں ہاتھ بڑھا کر روپ اور سے کھلی سوچ دہایا اور تاریک ترہ خانہ یکایک بنگلہ کا اٹھا۔

یہ نہایت طویل و عریض "گاہا" بالائی عمارت ہی جتنا ترہ خانہ تھا۔ دائیں طرف دیوار کے ساتھ سنے اور صاف ستھرے گتے کے کارٹن بہت بڑی تعداد میں دیوار کے ساتھ چنے ہوئے تھے۔ ان پر مختلف تصایروں اور ٹاسٹ کے دیگر سامان کے بڑے بڑے لیبل نظر آ رہے تھے۔

ایک گوشے میں ایک ساف ستھری آفس ٹیبل لگی ہوئی تھی جس پر فیکل یسپ سبکی فائلیں اور دیگر دفتری سامان بھی موجود تھا میز کے گرد چند کرسیاں بھی موجود تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ترہ خانے کو گودام اور دفتر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا چھت میں تین ٹکے بھی موجود تھے اور نوپے کے ایک قاتو کڈت میں ایک لمبا سا ٹوکیا بہت بڑا ایک بک لٹکا ہوا تھا جیسے عموماً "قصاب گوشت کے نہایت دلی پارچے لٹکانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔" پھر اس بک کی موجودگی کی وجہ بھی میری سمجھ میں آگئی۔ گتے کے بڑے بڑے کارٹنوں کی قطار کے ساتھ ہی ایک بہت بڑی لوسے کی ترازد اور مختلف اوزان کے ہاٹ پڑے تھے۔ غائبانہ یہاں ایسا مال بھی آتا تھا جسے تولنے کی ضرورت پڑتی تھی اور اس منصہ

کے لئے تراؤ اس بڑے سے بک میں لٹکا دیا جاتا ہو گا۔

رشی ہمارے عقب میں موجود رہا اور کنور میز پر جا بیٹھا۔ ریوالور اب اس نے میز پر بکا لیا تھا تاہم بل اب بھی ہماری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ میں اور روپا میز سے کچھ دور کنور کے سامنے یوں کھڑے تھے گویا کسی جوڑے کو کسی جھوٹے الزام میں گرفتار کر کے نشانے دار کے سامنے پیش کیا گیا ہو۔ رشی اس سچی کی طرح ہمارے عقب میں تہ کھڑا تھا جس نے یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔

میں نے کارتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو تم دکھاؤ کے لئے کوئی کاروبار بھی کرتے ہو؟“

”ارے نہیں۔“ اس نے گویا کسی اور خیال سے چونک کر قدرے آرام سے بیٹھنے ہوئے کہا۔ ”یہ تو کسی شریف اور معزز قسم کے ہلکنے ناجر کا گھر اور خفیہ گودام ہے جو اپنی نیک کمائی سے اپنے بیوی بچوں کو سائز لینے کی سیر کراتے گیا ہے۔ ہم اس طرح کی دو تین ماہ کے لئے خالی رہنے والی محفوظ قسم کی کونٹیوں کی آگ میں رہتے ہیں اور ان میں اپنا کمپ بگاڑتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کینٹینوں نے سب آتا ہے۔ اس سے دو ایک دن پیسے ہی ہم اپنا مختصر سا سامان سمیٹ کر کوچ کر جاتے ہیں اگر کبھی کبھار ہمارے کسی معرکے کے سلسلے میں سراغ لگاتی ہوئی پولیس اس کو بھی تک آگئی پہنچتی ہے تو گردن بے چارے مالک کی پھنسی جیسے۔ جسے کچھ پتا نہیں ہوتا۔۔۔ کیا ہے؟“ وہ دار طلب لہجے میں بولا اور جواب کا انتظار کئے بغیر بے آواز سے طریقے سے ہنسنے لگا۔ اسی لمبی میں کئی بار بھیڑیے کی غراہٹ سی در آئی۔ اس کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دی۔

”ویسے مجھے اپنے اب تک کے کیپوں میں یہ کیپ سب سے زیادہ پسند آیا ہے۔ معلوم ہے کیوں؟“ اس نے اپنی چند ہی چندھی لیکن خون آشام آنکھوں کو ایک بار بھی جھپکایا نہیں تھا۔ ”مضی اس ایک بک کی وجہ سے۔“ اس نے چھت میں لٹکے ہوئے بڑے سے نوکیلے آہنی بک کی طرف اشارہ کیا اور اس کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص حیوانی سی مسکراہٹ ایک بار پھر رنگ آئی۔

”اس بک کی وجہ سے مجھے ایک نیا تجربہ کرنے کا موقع ملا۔“ اس نے گویا چٹکارے لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ کیا منظر تھا۔۔۔ اپنے سابقہ شکار کو جو تمساری ہی طرح بڑی اکڑ فوں والا آدمی تھا میں نے نہاس کے کٹلف سے نجات دلائی۔ ہاتھ پاؤں باندھے اور اس کا حلقوم اس بک پر لٹکا کر لٹکا دیا۔ پھر ایک سوئی لے کر میں اس کے جسم کے بازو حصوں پر چھوٹے لگا۔۔۔ ہر مرتبہ سوئی چھوٹے پر وہ ترپتا تھا اور بک اس کی حلق میں اور گھرا اتر جاتا تھا۔ بڑی دیر میں جا کر بک میں لٹکا ہوا اس کا جسم ساکت ہوا۔“

چند لمبے کی خاموشی کے بعد اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور ہمارے پیچھے کھڑے رشی

سے مخاطب ہوا۔ ”ابھی تو صرف پونے بارہ ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ وکرم کے آنے میں پورا سوا گھنٹہ باقی ہے تب تک کیا ہو رہے یہ حسین مہمان یونٹی کھڑے رہیں گے؟“

رشی نے کوئی جواب نہ دیا۔۔۔ وہ گویا صرف اذکلمات پر عملدرآمد کرنے کی مشین تھا۔ کنور میز پر چند لمبے پر خیال نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے سر پر ہاتھ پھیرا اور دوسرے ہی لمحے وہ مجھے گنجا نظر آیا۔۔۔۔۔ بڑے سے بلب کی تیز روشنی میں اس کی چند یا چمک رہی تھی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اب تک وہ دگ پہنے ہوئے تھا۔ دگ اب اس کے ہاتھ میں تھی جسے اس نے بڑی احتیاط سے میز پر رکھ دیا۔ سرگنجا نظر آنے سے اس کی شخصیت کا تاثر بہت بدل چکا تھا۔ وہ کچھ اور زیادہ خوفناک نظر آنے لگا تھا۔ گردن بھی گویا بیسنے کی طرح گھٹی ہوئی اور مضبوط دکھائی دینے لگی تھی۔

بڑے آسودہ سے انداز میں کئی مرتبہ چندیا پر ہاتھ پھیرنے کے بعد وہ ایک بار پھر رشی سے مخاطب ہوا۔ ”ایسا کر کہ ہماری سے لوہے کی تار کا وہ لمبا ٹکڑا لاؤ اور اس لوہے کے تو ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک طرف ڈال دو اور اس سپر اسٹار حسینہ کو ذرا میرے پاس بھیجو۔ میں اس کے آلو گراف لیتا ہوں۔ آخری الفاظ ادا کرتے وقت اس کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص شیطانی مسکراہٹ رنگ آئی جس میں ایک خوفناک قسم کی بھوک بھی شامل ہو چکی تھی۔ غیر محسوس طور پر اس نے چٹکارہ سالے کربات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”وکرم نے تو اس مال کو ایک پورٹ کر ہی دیتا ہے ہم ذرا نمونہ ہی دیکھ لیں۔“

میں نے اپنے عقب میں رشی کی آہٹ نہیں سنی لیکن سن انکھوں سے دیکھ لیا۔ وہ ایک دیوار گیر الماری سے لوہے کے باریک اور نرم تار کا لچھا لے کر میری پشت پر پہنچ چکا تھا۔ فیصلہ کن لمحہ آپہنچا تھا مجھے معلوم تھا کہ وہ ہے کی یہ نرم اور باریک تار ایک مرتبہ میری کلائیوں اور ٹانگوں کے گرد کس دی گئی تو پھر میں اپنی نسیں اور گوشت تو کٹوا سکوں گا لیکن اس بندش سے ہاتھ پاؤں آزاد نہیں کر سکیں گا۔

”ہاتھ پشت پر لے جاؤ۔“ کنور نے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے مجھے حکم دیا۔

میں نے ہاتھ پیچھے کئے اور جیسے ہی۔۔۔ رشی نے میرے ہاتھوں کو چھوا میں اس کی استخوانی کلائیوں کو گرفت میں لیتے ہوئے گھٹنوں کے من بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے رشی پرندے کی طرح میرے سر پر سے گزرتا ہوا کنور کی طرف جا رہا تھا۔ اسے ہوا میں اچھالتے ہی میں نے روپا کی ٹانگ پکڑ کر اسے ایک طرف کو تھپیٹ کر فرش پر گرا دیا تھا اور اس کی طرف دیکھے بغیر چلا کر اسے ہدایت دی تھی کہ وہ فرش سے ہرگز نہ اٹھے۔

یہ عمل گو کہ دو یا تین سیکنڈ کے وقفے پر محیط تھا مگر کنور اس دوران ساکت بیٹھا تراشا نہیں اٹھتا رہا تھا اور نہ ہی اس نے بوکھلاہٹ میں اندھا دھند فائرنگ شروع کی تھی۔ وہ یقیناً ایک بے مثال ہندو باڑ تھا۔ میرے حرکت میں آنے ہی اس نے گولی چلا دی تھی

لیکن اس وقت وہ یہ نہیں جان سکتا تھا کہ میری حرکت کس سمت میں ہوگی۔ اس نے یقیناً میری پیشانی کا نشانہ لیا تھا لیکن میرے بکلی کی سی تیزی سے ہتھکڑوں کے بل بٹھنے کی وجہ سے وہ تانی دیو اور کی گولیاں میرے بالوں کو چھوٹی ہوئی گزریں اور غالباً رشتی کے جسم سے پار ہو گئیں۔ کیونکہ اس کی کرناک چٹخ کوئی تھی، مگر دوسرے ہی لمحے چونک وہ اڑتے پرندے کی طرح میز پر پھسلتا ہوا کنور سے جا کھرایا تھا۔ اس لئے وہ چٹخ ادھوری ہی رہ گئی۔

فائر کی آواز محض ایک بلکی سی "ٹنگ" تک محدود رہی تھی جیسے کسی انٹر نائٹ ہونٹ کا کارڈ کھونا گیا ہو۔ کنور نے ایک ہی فائر پر اکتفا نہیں کیا تھا اس نے مزید کئی فائر کیے تھے۔ مگر اس دوران چونکہ وہ کرسی سمیت الٹ گیا تھا اس لئے گولیاں چھت سے گرائیں اور بہت سا پلاسٹر اوہڑ کر نیچے گرا۔

میں نے کنور کی طرف جھپٹنے میں دیر نہیں کی تھی مگر وہ میرے انداز سے نہیں زیادہ بھرتی سے رشتی کو ایک طرف اچھال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے جیسے ہی میز کے عقب سے اس کا سر ابھرتے دیکھا، میز اس پر الٹ دی مجھے اس تک پہنچنے میں تاخیر ہو چکی تھی لیکن میز اٹھنے سے میرا مقصد مل ہو گیا۔ مجھے چند لمحے کی مہلت مل گئی میز بہت دقتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کنور اس کے تلے دب کر کچھ دیر کے لئے ضرور بے بس ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا، ہم اس کا دیو اور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ضرور کچھ دور جا گرا میز کو اس نے کھلنے کے طرح ہوا میں اچھال دیا۔ وہ ایک دھماکے سے کچھ دور جا گری اور اس کے ساتھ ہی جیسے میرے اور کنور کے درمیان سے کوئی فیصل ہٹ گئی۔

اب ہم ایک دوسرے کے سامنے تھے کنور فرش پر چپ تھا اور میں ہتھکڑوں کے بل کھڑا تھا میں نے اس کے سینے پر کراٹے کے وار کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ناقابل یقین پھرتی سے اس نے میرے سینے میں الٹ رسید کر دی۔ میں اسٹ کر پیچھے جا گرا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ غام آدمی کی شاید پسپاں دہری ہو جائیں۔ ایک لمحے کے لئے تو میں بھی چکرا گیا۔ دل جیسے اچھل کر حلق میں غمگیا تھا لیکن مجھے فوراً "سنبھلنا پڑا۔ کنور چپتے کی سی بھرتی سے دیو اور پر جھپٹا تھا۔ اس بار میں نے اس کے جیزے پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ اٹلتے اٹتے سنبھل گیا۔ اس دوران میں نے دوسری ٹھوکر سے دیو اور کو کافی دور پھینکا دیا۔

کنور نے دیو اور کا خیال پھوڑ دیا اور اٹھ کر بھوکے درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ گوشت کے ابھادوں میں گھری ہوئی اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس کی پیشانی اور باجھوں سے خون بہنے لگا تھا، مگر اس کے ہونٹ مسکراہٹ کے سے انداز میں کھینچے ہوئے تھے اور اس غام میں اسے دیکھ کر۔۔۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس ہتھکڑوں کی فطرت میں فون کی بیاس رہی ہوئی ہے۔

وہ بھڑکے ہوئے سائڈ کی طرح مجھ سے ٹکرایا اور دھکیلتا ہوا مجھے دور تک لے گیا۔

دیوار کے ساتھ چپکا کر اس نے پوری قوت سے میری پسلیوں کے نیچے گھونسہ رسید کرنا چاہا مگر میں اس کی گرفت سے پھسل گیا اور اس کا گھونسہ ہتھوڑے کی طرح دیوار سے ٹکرایا۔ یہ چوت اچھے بھلے مضبوط آدمی کا ہاتھ بیکار کر دینے کے لئے کافی تھی۔۔۔ مگر اس نے ایک بلکی سی غراہٹ کے بعد پہلے سے زیادہ مشتعل ہو کر اس ہاتھ سے میرے منہ پر گھونسہ رسید کرنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ بھی میں جھٹکی دے گیا۔ یہ سب کچھ وہ اتنی پھرتی سے کر رہا تھا کہ مجھے اپنی تمار ملامتوں کے ہر وجود اس پر حملہ کرنے کی مہلت نہیں مل رہی تھی۔ اچانک اس نے مجھے فلائنگ کنگ رسید کی جو میرے لئے بالکل ہی غیر متوقع چیز تھی۔ میں گرا اور گرتے گرتے دیوار سے جا کھرایا۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پختہ فرش پر لڑتے ہوئے فلائنگ کنگ برداشت کرنا اور لگا دو نوں ہی آسان کام نہیں ہیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ میری آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کے لئے چھلانے والا اندھیرا دور ہونے تک کنور ایک بار پھر مجھ پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور غالباً سر سے اونچا اٹھا کر فرش پر پٹختا چاہتا تھا جب میں نے یا۔۔۔ او۔۔۔ کی زور دار چٹخ کے ساتھ اس کی ہتھکڑوں کی ہڈی پر کراٹے کا ایک ہاتھ رسید کیا۔ اس مرتبہ اس کے حلق سے الٹ بھری کراہ خارج ہوئی جو اس بات کی نشانی تھی کہ ہتھکڑوں کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے اس سے کم تکلیف پر تو کنور جیسا آدمی نہیں کراہ سکتا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لئے لڑکھڑایا اور سنبھل گیا اور ایک بار پھر اس نے فلائنگ کنگ لگانے کی کوشش کی۔ اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ جوڑو کی شد بد رکھتا ہے کیونکہ اس کی فلائنگ دراصل "چاپ سوئی" کی ایک کوشش تھی۔ میرا غم و غصہ اور اشتعال اب میرے قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ ہر بات کی مصلحت میرے ذہن سے نکل چکی تھی۔ صرف اس شخص کو سبق سکھانے اور سزا دینے کا تصور رہ گیا تھا۔

فلائنگ کنگ کے لئے جو وہ ہوا میں بلند ہوا تو میں نے اس کے نشانے سے ہٹ کر اس کی پنڈلی پر کراٹے کا ایک ہاتھ مارا اس وار نے یقیناً اس کی پنڈلی کا گوشت دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہو گا۔ وہ فرش پر گرا تو فوری طور پر اٹھ نہیں سکا۔ اسی دوران میں نے اس کی کینچی پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ ہلپٹا ہوا اٹھا مگر اس کی ٹانگ میں لنگراہٹ تھی۔ اس کے حلق سے اب جو آوازیں نکلی رہی تھیں وہ کئی درندوں کی غراہٹ سے مشابہہ تھیں۔

اس کا چرو خون سے تھڑچکا تھا۔ میں نے اس کی چنڑیا کے عین وسط میں چاپ لگائی۔ وہ ہتھکڑوں کے بل بیٹھ گیا ایک لمحے کے لئے اس کا سر ادھر ادھر کو ڈولا مگر دوسرے ہی لمحے وہ اچھل کر مجھ پر جھپٹا۔ میں نے اس کے چہرے پر اتنی طاقت سے گھونسہ رسید کیا کہ اس کی چھوٹی سی ٹانگ بالکل ہی چپٹی ہو گئی اور اس کے چہرے پر خون کی تہ گہری ہو گئی۔

اس بار وہ میری طرف آیا تو میری آنکھوں کے ایک ہلکے سے وار نے اس کی ایک

میں نے مناسب سمجھا کہ کنور میسوری سے پوچھ کر شروع کرنے سے پہلے روپا کو گھر بھیج دوں۔ یہاں کسی وقت بھی کوئی نیا خطرہ نازل ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے اس کینڈلک کی چابیاں دے دیں جس میں وہ لوگ ہمیں یہاں لائے تھے۔

”تم فوراً اس گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو جاؤ۔ چاہو تو راستے میں کہیں یہ گاڑی چھوڑ دینا اور ٹیکسی لے لیتا۔“ میں نے ہدایت کی۔

روپا مجھے وہاں چھوڑ کر جاتے ہوئے ہتکپائی لیکن میرے سمجھانے پر رخصت ہو گئی۔

تب میں دوبارہ کنور میسوری کی طرف متوجہ ہوا۔ مجھے وہیں اناماری سے ایک چھوٹی سی کلماڑی بھی مل گئی تھی جو اب میرے ہاتھ میں تھی۔ کنور میسوری بالکل بڑھال اور سبے دم تھا۔

”سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کنور میسوری کہ تم کون ہو؟ تمہارا اصل نام کیا ہے؟“ میں نے اس کا بازو کھینچ کر اس کے ہاتھ کی انگلیاں فرش پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔ ”یاد رکھو کہ اگر تم نے میرے سوالوں کا جواب دینے میں حیل و جھٹ کی تو میں پہلے ایک ایک کر کے کلماڑی کی طرح تمہاری انگلیاں کاٹنی شروع کروں گا۔ پھر ہاتھ..... پھر پاؤں.....“

”میرا اصل نام نشیعل ہے۔“ وہ تیزی سے بول اٹھا۔ ”قومیت کے اعتبار سے نیپالی ہوں۔ لیکن پلا بڑھا ہمیں یہی میں ہوں.....“ چند لمحے تک بانپے کے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”لوہواری کے زمانے سے ہی مجھے اونچے درجے کے بد معاشوں کی صحبت میسر آئی تھی اور زیر زمین سرگرمیوں میں میں نے بڑی تیزی سے ترقی کی لیکن میری اپنی ایک انگ سی لائن بن گئی اور وہ یہ کہ میں صرف ایسے معروف اور ممتاز افراد کے محل یا اغواء کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا جن پر عام بد معاش یا تو ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے تھے یا وہاں تک ان کی رسائی ہی نہیں تھی۔“

وہ ایک بار پھر بانپے لگا اور چند لمحے تک کچھ نہ بولا تو میں نے پوچھا۔ ”روپا کو تم کس کے لئے انوا کر رہے تھے؟“

”ذکر م کے لئے۔“ وہ سانس کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذکر م بھی یہ کام کسی اور کے لئے کر رہا تھا۔ پھر یہ ہے کہ ہماری زیر زمین

آنکھ کو ملو بے میں تہریں کر کے رکھ دیا۔ ایک لمحے پہلے جہاں آنکھ نظر آرہی تھی وہاں اب محض خون اور شفاف جیلی نما مادے کا مطلوبہ نظر آ رہا تھا۔

میں نے اس کے سنبھلنے سے پہلے اسے اٹھایا اور پختہ فرش پر شیخ دیا اور ساتھ ہی نرخرے پر پاؤں رکھ دیا۔ اس مرتبہ وہ سناکت پڑا رہ گیا اور اپنی اکلاتی رہ جانے والی آنکھ کو تیزی سی چمکاتے ہوئے یوں خاموشی سے چست کر دیکھنے لگا جیسے اس آنکھ کی بنائی بھی تیزی سے غائب ہو رہی ہو..... اس کی نظر میں شکست خوردگی جھلک آئی تھی۔

”اٹھو۔“ میں نے اس کے کولے پر ٹھوکر رسید کی۔ ”ابھی تو تمہیں مجھ لوٹنے کو کلماڑی کی طرح بیچ میں سے بڑھا ہے۔ اٹھو میرے شیر خوان میرے رستم زماں!“ میں نے اسے ایک اور ٹھوکر رسید کی وہ ٹیٹف سے انداز میں بلبلایا اور اس نے رحم طلب سے انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ پھر اس کا بازو دوبارہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں فرش پر جا ٹکا۔ میں نے اسے ایک بار پھر گریبان سے پکڑ کر کھڑا کرنے کی کوشش کی اس سے صحیح طور پر کھڑا نہیں ہوا چاہا رہا تھا۔

”جس شخص کو تم نے اس کپ پر لٹکا کر اس کے جسم کے نازک حصوں پر سوئیاں چھو چھو کر اسے لذت کی موت مارا تھا اس کا جرم کیا تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو اس کو ٹھکانے لگانے کے ایک لاکھ روپے ملے تھے اور ساتھ ہی ہدایت کی گئی تھی کہ اسے جلدی مگر حتی الامکان تکلیف دہ طریقے سے مارا جائے۔“

”اب میں تمہیں اسی کپ پر لٹکانے لگا ہوں۔“ میں نے اسے کپ کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ”اور میں تمہارے ہاتھ بھی نہیں باندھوں گا کیونکہ تمہارا وزن اتنا ہے کہ کپ پر لٹکتے ہی تمہاری یہ موٹی گردن اتنی گرائی تک کپ میں پھنس جی ہو گی کہ تم میں جٹنے کی سکت ہی نہ رہے گی..... اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ میں یہ خدمت بلا معاوضہ انجام دوں گا۔“

تمہاری طرح کسی سے ایک لاکھ تو کیا ایک روپیہ بھی نہیں لوں گا۔“

چند قدم تو وہ ٹھٹھٹا چلا گیا مگر کپ کے قریب پہنچ کر اڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ تب میں نے پوچھا۔ ”مرنا نہیں چاہتے..... خصوصاً“ کپ پر لٹک کر؟“ اس نے لگی میں سر ہلایا اور ہنسی کی ہڈی ٹوٹی ہونے کی وجہ سے بری طرح کراہ اٹھا۔

”تو پھر جو کچھ میں پوچھوں وہ جانا پڑے گا۔ بتاؤ بگے؟“ میں نے اسے دوبارہ اپنے قریب کھینچتے ہوئے کہا۔

”بتاؤں گا۔“ اس نے خرخراتی سی آواز میں جواب دیا۔

دنیا میں مشہور آدمیوں کے قتل یا اغوا کے بھی ٹھیکے چلتے ہیں۔ روپا کے قتل کا ٹھیکہ وکرم کو کافی عرصہ سے ملا ہوا ہے۔ کام کرانے والی پارٹی کون ہے یہ مجھے بھی معلوم نہیں۔ وکرم نے اپنے کئی گرگے آزمائے لیکن روپا کی یا تو قسمت اچھی تھی یا جملے غلط وقت اور غلط جگہوں پر ہوتے رہے کہ ہر مرتبہ وہ بچ گئی۔ پھر سننے میں آیا کہ اس نے ایک کام کا آدمی رکھ لیا ہے۔ وہ آدمی تم تھے۔ ٹھیکہ "ٹیکل کو" یہ بچنے کا۔ حالانکہ وکرم اینڈوائس کے طور پر ایک بیڑی رقم لے کر خرچ بھی کر چکا تھا۔ اس دوران حالات میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ وکرم کو پتہ چلا کہ ایک افریقی ریاست کا شہزادہ لندن میں کہیں روپا کی ایک فلم دیکھ بیٹھا ہے اور اس پر ہانگ پان کی حد تک عاشق ہو گیا ہے۔ اس نے چند ایک نہایت اونچے درجے کے ایجنٹوں سے بات کی کہ اگر روپا کو اس کے شہستان کی رہت بنا دیا جائے تو وہ روپا کو پہنچ لاکھ پاؤنڈ اور ایجنٹوں کو معقول کمیشن ادا کر سکتا ہے۔ ایجنٹوں نے نوہ لگا کی اور حتمی طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ روپا ان فلمی اداکاروں میں سے نہیں ہے جو غیر ملکی والیان ریاست یا شہزادوں وغیرہ کی اس قسم کی پیشکش قبول کر لیتی ہیں۔ تم چاہو تو روپا سے تصدیق بھی کر سکتے ہو۔ کہ ایک مرتبہ افریقی شہزادے شوہن کی طرف سے اسے ابروچ کرنے کی کوشش کی گئی تھی یا نہیں۔ مختصراً یہ کہ وکرم کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس قسم کا کوئی موقع موجود ہے اور کوئی اس سے فائدہ نہیں اٹھایا رہا ہے تو اس نے ایک تیر سے دو ہزار کرسے کی تھائی کہ روپا کو مارنے کی بجائے اغوا کر کے مالٹی مندر پانچا رے جہاں سے افریقی شہزادہ شوہن اسے خود ہی اپنی ریاست نکار گویا لے جائے گا۔"

میں نے تقیبی انداز میں سر ہلایا۔ مالٹی مندر ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ ماہم کریک کی طرف سے سمندر میں مالٹی مندر تک کا سفر تقریباً آٹھ میل کا تھا۔ میں کہیں اس طرف گیا نہیں تھا لیکن میں نے سنا تھا کہ جزیرے کا کچھ حصہ کسی افریقی شہزادے کی ملکیت ہے۔ جس نے وہاں تقریباً پچاس ایکڑ پر ایک خوبصورت محل بنا رکھا ہے اور ہندوستان میں قیام کے دوران وہیں ٹھہرتا ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کوئی افریقی ریاست کا شہزادہ ہے اور اس کا نام کیا ہے۔

"اچھا تو وکرم نے روپا کو فروخت کرنے کا پروگرام بنا رکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

نشہ نے اثبات میں اشارہ کیا۔ جواب دینے کی کوشش کی اور ایک بار پھر کراہ کر رہ گیا۔ "وہ دونوں پارٹیوں سے پیسے کھرے کرنا چاہتا تھا۔ جس پارٹی نے روپا کو مروانے کا ٹھیکہ یا تھا اس سے وکرم نے پچاس ہزار اینڈوائس لے رکھا ہے اور کام مکمل ہونے پر دو لاکھ کا رہے۔ اگر اس نے شوہن سے بھی پیسے کھرے کر لئے ہوتے تو اس کی کئی ٹسلوں کے در دور ہو جاتے بشرطیکہ اس کی ٹسلیں اس دنیا میں آنے میں کامیاب ہو جاتیں۔ آج کل کہ وہ سختی سے پولیس اور سی آئی ڈی کی نظر میں ہے۔ اس لئے خود کسی کام میں ہاتھ

نہیں ڈال رہا۔ ٹھیکہ در ٹھیکہ والے سسٹم سے کام چلا رہا ہے اور اس میں بھی لمبے لوٹ کا رہا ہے۔ دنیا کے ہر ملک کی کرنسی اس کی بریف کیس میں موجود ہوتی ہے۔ شملہ کے ایک شراب خانے میں میری جب اس سے ملاقات ہوئی اور اس نے مجھے اس ٹھیکے کی پیشکش کی تو کم از کم ایک لاکھ روپے کی تو اس نے دونوں ہاتھوں میں بیروں کی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں پچیس ہزار کا ٹکے میں لاسٹ ہو گا۔ فرانس کا سلا ہوا سوت تھا اور"

"بس کرو۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اس کے سارے زیورات وغیرہ کی تفصیلی رپورٹ بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ مر رہے یا کوئی ٹویٹا دسین۔"

"یہ تو تمہیں تب معلوم ہو گا جب اس سے سامنا ہو گا۔" نشہ نے قدرے مرموعیت زدہ لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھ بند ہوئی جا رہی تھی اور وہ بعد کوشش اسے کھلی رکھ رہا تھا۔ دھننا وہ نہایت نحیف لہجے میں بولا۔ "مجھ پر بے ہوشی طاری ہو رہی ہے۔ تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ مجھے جلد ایسی جگہ پہنچا دو جہاں میں ادا دل سکے۔"

"طبی امداد لینے کا اتنا ہی شوق تھا تو لڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر قدرے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ "بے فکر رہو میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ یہ رشتی کون تھا؟"

اس نے گردن بڑھتی سر کے ایک فخر اوندھے پڑے رشتی کو دیکھنے کی کوشش کی جس کے منہ سے سو ایک تہی سی لکیر کی شکل میں برسہ کراہ خشک ہو چلا تھا۔

"تھا تو یہ میرا ہی آدمی لیکن بہت دن سے اس کے دل میں آواز ادا کام کرنے کی خواہش چل رہی تھی۔" اس کے کچلے ہوئے ہاتھوں میں حرکت سی ہوئی۔ میں نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ "وکرم ایک بجے آئے گا نا؟"

"ہوں۔" اس کا جواب اثبات میں تھا۔ مگر فقاہت کے مارے صرف ہنکارا سا بھر کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھ اب بند ہوتی جا رہی تھی اور اسے کھلی رکھنے کی اب اس میں سکت نہیں رہی تھی۔

"وہ تنہا ہی ہو گا؟ میں نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے پوچھا اس کا جسم اب بالکل ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ ہتھیلی ہوئی مدنی کی طرح۔

"میں نے پہلے سے مدغم ہنکارا ابھرا۔

"میں آگیا ہوں دوست" دھننا میرے عقب سے ایسی مردانہ آواز سنائی دی جس میں حد سے زیادہ مضامین تھے۔ میرے اعصاب ایک لمحے کے لئے جھنجھٹا کر رہ گئے مگر میں نے اپنے آپ کو کوئی رد عمل ظاہر کرنے سے باز رکھا اور فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ یہ وکرم آہنچی ہے۔ نشہ نے کم از کم دو یا تیس تو غلط ہی بتائی تھیں۔ ایک تو وکرم کی آمد کے وقت کے بارے میں

رہا تھا۔
 ”ہاشاء اللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔“ وکرم نے گویا کسی نوموود کی بلاتیں لینے ہوئے کہا۔ ”تو آخر تم نے یہاں بھی یازی پلٹ ہی دی۔ روپا کہاں ہے؟“

میں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر قدرے جھنجھلاہٹ کے آثار دکھائی دیے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ پہلے کی طرح نارمل نظر آنے لگا۔ بڑے مطمئن انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ میری طرف بڑھا۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ جیسے ہی وہ تلخی کے لئے مجھے چھوئے گا میں اس لمحے اپنی کارروائی شروع کر دوں گا۔ بعد میں بات بگڑ بھی سکتی تھی۔ وکرم اور اس کے دونوں ساتھی مجھے عام بد معاش نظر آرہے تھے۔ وہ ہاتھ پائی کے عادی مظلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان کا انحصار اسے پر محسوس ہوتا تھا۔

میں نکھر ہی رہ گیا کہ وکرم قریب آکر میری تلخی لے گا لیکن وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر ہی رک گیا اور پھر اس کی لات اتنی تیزی سے چلی کہ میں محض اس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔۔۔ میری آنکھیں گویا ایک لخت ایک گولے کی سی شکل میں سمت کر میرے حلق میں آ پھنسیں اور میں مزاحمت کی تمام تر کوشش کے باوجود شبثیر کی طرح دیوار سے جا ٹکرایا۔ غلیظت تھا کہ میرا سر دیوار سے نہیں ٹکرایا ورنہ شاید میں چکرا کر گر پڑتا۔ اس تکلیف کے عالم میں بھی میں اس بات پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا کہ تقریباً عام سی جسامت کے اس انسان میں اتنی طاقت کیونکر تھی کہ اس کی ٹانگ کی ضرب نے میری آنکھیں الٹ کر رکھ دی تھیں بلکہ مجھے اتنی قوت سے کئی گز پیچھے دیوار سے اس طرح کھرا دیا تھا کہ میری کمر مفلوج سی ہو کر رہ گئی تھی۔

وکرم نے اسی پر بس نہیں کی۔ میں ہیٹ پکڑے دیوار سے ٹکا ابھی سیدھا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اس نے میرے سر کے پیچھے ٹھونسا رسید کیا۔ پہلے مجھے یہ شہ گزرا کہ شاید اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا۔ جس سے اس نے ضرب لگائی ہے مگر جب میں سنبھل کر سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ مجھے خالی نظر آئے۔

میری حالت دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مشکبرانہ مسکراہٹ ابھرتی تھی۔ اور وہ شہی میں آکر شاید مجھے سنبھلنے کا موقع دے رہا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر کئی مرتبہ آنکھیں جھپکائیں تو اس کی مشکبرانہ مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

اس نے کسی باکس کی سی تیزی اور مشاقی سے میری ٹانگ پر ٹھونسا رسید کرنے کی کوشش کی جو میری پیشانی پر پڑا۔ اس شخص کے ہاتھ پیروں میں واقعی فولاد کی سی سختی تھی۔

اب بہت ہو چکی تھی۔ اتنی مار میں نے کاپی مرتبہ کھائی تھی لیکن ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان چند ضربوں نے جس مجھے تکلیف پہنچائی تھی وہاں جیسے میری جان کی نامعلوم گمراہوں میں سوتی ہوئی کچھ عجیب سی قوتوں کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ اندر ہی اندر جیسے

کیونکہ ابھی ساڑھے بارہ بجے تھے۔ دوسرے اس کے تنہا آنے والی بات بھی غلط تھی کیونکہ میں نے غیر محسوس انداز میں گردن ترچھی کرتے ہوئے کن آنکھوں سے اپنے پیچھے کم از کم تین آدمیوں کی جھلک تو دیکھی تھی، میں ممکن تھا کہ وہ اس سے بھی زیادہ ہوں۔

”تمہیں میرا ہی انتظار تھا ناں؟“ وہی شیریں آواز ایک لمحے کے توقف کے بعد ہی دی۔ ”اب بالکل اسی طرح باتھوں کو ساکت رکھتے ہوئے سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی ہتھیار وغیرہ نکالنے کی کوشش نہ کرنا زندگی اور بچھڑ ہو جائے گی۔“ پھر اس کے ایک طویل سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ شاید اس کی نظر اب نشجول پر پڑی تھی کیونکہ اس نے متاسفانہ لمحے میں کہا۔ ”نشجول زندہ۔۔۔ ہے یا مر گیا؟“

میں کوئی جواب دینے بغیر آہستگی سے سیدھا کھڑا ہو گیا تب اس نے خود نشجول کو پکارا مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

”نشجول کا یہ مشرتم نے ہی کیا ہے؟“ مجھ سے پوچھا گیا۔ سبے میں قہر یا بے چینی کی جھلک نہیں تھی۔ یہ محض ایک سیدھا سا سوال تھا۔

میں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا تو اس کے لمحے کی شیرینی قدرے کم ہو گئی۔ ”کیا بندہ کو بھی کی طرح منہ پھلائے کھڑے ہو۔ ذرا ابھر مچھوم جاؤ۔ میں بھی تو تمہارے ورثہ کروں۔ ہاتھ ہی ہاتھیں سنی ہیں۔“

میں ابھی تک دل ہی دل میں اپنے آپ کو اس بات پر کوس رہا تھا کہ نشجول سے پوچھ چھ کرنے میں اتنا منہمک ہو گیا تھا کہ تین افراد کی آمد کا مجھے احساس تک نہ ہو سکا۔ اگر اپنے حواس سے کام لینے میں میری مستعدی کا یہی عالم تھا تو پھر میرا اللہ ہی حافظ تھا۔ آہستہ آہستہ میں ان لوگوں کی طرف گھوما۔ تعداد میں وہ تین ہی تھے وکرم ایک گہرے رنگ کے سوٹ میں بندوس تھا۔ بالی ہیٹ حتیٰ کہ کوٹ کی سامنے والی جیب سے بھاگتے ہوئے رومال تک کے لوازمات مکمل تھے۔ اپنے صاف ستھری، خاہری حلقے کی بدولت وہ پڑھے لکھے خوشحال تاجر نظر آتے تھے۔ خالی بس یہی تھی کہ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں بد صورت قسم کے ریوالور تھے۔ ایک کی ٹال میرے ہیٹ کی سیدھ میں تھی اور دوسرے کی میرے سینے کی سیدھ میں۔

درمیان والے کے ہاتھ میں ریوالور کے بجائے نہایت نفیس قسم کا بریف کیس تھا۔ یہ شخص یقیناً وکرم تھا۔ اسے میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں چسپائی ہوئی چار برے بڑی انگلیوں کی مدد سے پہچانا۔ وہ قد میں اپنے دائیں بائیں کھڑے ریوالور بدست دونوں ساتھیوں سے اونچا تھا۔ تلخ شہوستانی چہرہ باریک، بھنوس، نیلی آنکھیں اور گوری محبتہ حلقے اور قد کاٹھ کے اعتبار سے وہ ایک دھالی پسے کی قسموں کا ہیرو نظر آتا تھا۔ صرف اس کی کشادہ پیشانی پر زخم کے ایک بڑے سے نشان نے اس کی شخصیت کو گہرا بنایا

صم نہ ہو اس لئے چاروں کہ گردن فوٹے کے بعد آدمی مرجاتا ہے۔
انہوں نے مشورہ طلب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو میں نے وکرم کی گردن کو اسی مخصوص انداز میں ایک ہلکا سا جھٹکا اور دے دیا۔ اس مرتبہ ہڈیاں کڑکڑانے کی آواز کے ساتھ مجھے وکرم کے جسم میں ہلکا سا تھکا بھی محسوس ہوا اور مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ اس کے دماغ کو اتنی چوٹ نہیں پہنچی تھی کہ وہ مرجاتا۔ ابھی وہ زندہ تھا مگر نہ جانے کتنی دیر کے لئے دنیا بائینما سے بے خبر ہو چکا تھا۔

ان دونوں کے ہاتھوں میں ریو الوور کا رخ فرش کی طرف ہو گیا۔ "تورا آگے کو پھینک میرے قریب۔" میں نے فوراً ہدایت دی۔ ان کے چہروں کو دیکھتے ہوئے میں شبہ بھی نہیں کر سکتا ہے۔ مگر یہ میری خام خیالی تھی کہ موت کے منہ میں پھنسا ہوا انسان بھی اپنی سی کوشش تو کرتا ہے۔ ان میں سے ایک نے بظاہر نہایت مایوسی کے عالم میں ریو الوور میری طرف پھینکتے پھینکتے اچانک قہر کر دیا جبکہ دوسرے کا رخ انور میرے قدموں میں آگن گرا تھا۔ شاید میری قسمت ہی اچھی تھی کہ میں نے بروقت اس کی انگلی ٹریگر پر پکڑنے دیکھ لی تھی اور میں گھٹنے کے بل ایک طرف کو گر گیا تھا۔ اس نے اندھا دھند اسی سمت میں دو قار اور کر دیئے تھے۔ میں بغیر کسی اندازے کے ہی ایک طرف کو گرا تھا۔ بہر حال اس کوشش نے مجھے بچا لیا ورنہ شاید میرے آدھے جسم کے پرچے اڑ گئے ہوتے۔ قار کرنے والا کچھ نروس سا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ریو الوور کا رخ درست کر سکتا میں نے اس پر دوسرے ریو الوور سے قار کر دیا۔ وہ ہوا میں تقریباً "ایک فٹ اچھلا اور کوئی آواز نکالے بغیر اسٹ کر کافی پیچھے جا پڑا۔

میں نے اس کے ساتھی کا جائزہ لیا۔ وہ مجھے کی طرح ساکت کھڑا تھا اور لاش کی بجائے ہوا میں کسی غیر مرنی چیز کو ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ زندگی سے محروم نظر آ رہا تھا۔ یک لخت ہی جیسے کسی نے اس کا سارا خون چوس لیا تھا۔

میں نے ایک ریو الوور جیب میں رکھ کر وکرم کا بریف کیس اٹھایا اور ریو الوور سے وکرم کے ساتھی کو اس طرف چلنے کا اشارہ کیا جدھر چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ اس نے خاموشی سے میرے اشارے کے مطابق عمل کیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی لاش کسی خانہ کی طاقت کے اشارے پر اٹھ کھڑی ہوئی ہو اور اس کے احکامات کی پابندی کر رہی ہو۔ وہ ایک کرسی پا جا بیٹھا۔ اب اس کے اور میرے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ میں نے مطمئن ہو کر بریف کیس کا جائزہ لیا۔ وہ منتقل تھا۔ میں نے وکرم کی جیبوں کی تلاشی لی تو کوٹ کی ایک جھوٹی سی جیب میں مجھے ایک ننھی سی چابی مل گئی۔

میں نے بریف کیس کھولا اس میں صرف دو ہی چیزیں تھیں۔ ایک اسٹین گن جس کے مختلف حصے علیحدہ کر کے رکھے گئے تھے۔ بریف کیس میں ہر حصے کے لئے باقاعدہ ایک خانہ

کسی آتش فشاں کا دہانہ کھل گیا تھا۔
وکرم میری آنکھوں میں طرفان کی آمد کے آثار نہیں دیکھ سکا کیونکہ اس کی آنکھوں پر اس وقت تکبر کی پٹی چڑھی ہوئی تھی۔ میرے بازو کی حرکت بھی وہ نہیں دیکھ سکا ہو گا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار شاید اتنی قوت سے کراتے کا وار کیا تھا۔ میرا ہاتھ نیچے کی طرح اس کی پیشانی کے وسط میں پڑا اور یہ دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ اس ایک وار نے ہی کم از کم وکرم کی حد تک متحرک آرائی کا فیصلہ کر دیا۔ کچھ لوگ صرف مارنے کی حد تک طاقتور ہوتے ہیں برواشت کی طاقت ان میں کم ہی ہوتی ہے۔ وکرم شاید اسی قبیل کے شاہ زوروں میں سے تھا۔

پھر پیشانی پر ہاتھ پڑتے ہی وہ بے بنیاد دیوار کی طرح آگے کو جھک آیا اور قریب تھا کہ میرے اوپر آگرتا۔ میں نے اسے گھما کر گردن کے گرد پادوکتے ہوئے اس طرح روک لیا کہ اس کا چہرہ اس کے ساتھیوں کی طرف ہو گیا اس کی پیشانی کی کھل پھٹ چکی تھی اور اس کا جسم جس دھیلے ڈھالے انداز میں میری گرفت میں تقریباً "بھول رہا تھا اس سے مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی کی ہڈی زیادہ نہ پختہ تھی ہو۔

اس کے ساتھیوں کو شاید صحیح معنوں میں اندازہ ہی نہ ہو پایا تھا کہ ان کے پاس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ غالباً "اسی خیال سے قدرے مطمئن کھڑے تھے کہ پاس کے ہاتھوں مار کھاتے کھاتے وہ مجھے چند لمحوں پر فرش پر ڈھیر ہوتے دیکھیں گے لیکن جب انہوں نے پاس کو بے بسی کے عالم میں میری گرفت میں دیکھا اور اس کا خون آلود چہرہ ان کے سامنے آیا تو وہ جیسے کسی خواب سے بڑبڑا کر بیدار ہوئے۔

ان میں سے ایک نے نہایت پھرتی سے اپنے ریو الوور والے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور دائیں ٹانگ کو ذرا خم دے کر وہ قار کرتے ہی لگا تھا کہ اس کے ساتھی نے اس کے ریو الوور کی ٹال پر ہاتھ رکھ کر اسے جھکا دیا اور تب اسے احساس ہوا کہ اگر وہ قار کر دیتا تو کوئی پہلے اس کے پاس کے جسم میں پیوست ہوتی۔ میں نے مکمل طور پر اسے اپنی ذہنالت بنا رکھا تھا۔ ان ریو الوور برداروں کی غلطی یہ تھی کہ وہ دونوں قریب ہی کھڑے تھے۔ اگر وہ ایک دوسرے سے کچھ ہٹ کر کھڑے ہوتے تو ان میں سے کوئی ایک تو مجھ پر کسی پہلو سے قار کر سکتا تھا۔ "ریو الوور پھینک دو۔" میں نے اپنی سانس کے بلکے سے ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ چڑی کے اس غلام کی گردن ٹوٹ جائے گی۔ غیر ارادی طور پر میرے لیچے میں ایک لوفرانہ سی شوشی مچنی تھی۔

میں نے دونوں ریو الوور برداروں کے چہروں پر الجھن کے آثار دیکھے تو وکرم کی گردن کو ایک خاص انداز میں ہلکا سا جھٹکا دیا۔ ہڈی کی کڑکڑاہٹ انہوں نے بھی سن لی۔ "اس کی گردن ٹوٹنے لگی ہے۔" میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "اور شاید ہمیں

خدمات کس نے حاصل کر رکھی تھیں؟

”وہ ایک امیر کبیر اور فیشن ایبل بڑھیا ہے۔ اس کا نام..... پورا نام تو معلوم نہیں کیا ہے سب لوگ اسے متور کا کہہ کر بلاتے ہیں۔ اس کے ہوش کُل پر زوں کی طرح ہیں رفقار سے مل رہے تھے اور بہت ہی مدھم سی آواز برآمد ہو رہی تھی۔ مجھے کان لگا کر سنتا پڑ رہا تھا۔ جس بے ساختگی سے وہ بول رہا تھا اس سے مجھے یقین ہو رہا تھا کہ وہ بھوٹ نہیں بول رہا۔

”میں نے وکرم کے ساتھ صرف ایک ہی مرتبہ اسے اس کے گھر پر قریب سے دیکھا ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”جب ہم ایڈوائس کی رقم لینے گئے تھے۔“

”گھر کا پتا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تھرٹین کشمیر لیم روڈ۔“ اس نے رٹے رٹائے سبق کو دہرایا۔

ایڈوائس سے مختصر اور آسانی سے یاد رہنے والا تھا کشمیر لمیورڈ اور اس سے ملحقہ علاقہ اس لحاظ سے منفرد تھا کہ یہاں صرف ایسی کوٹھیں تھیں جن کا رقبہ فلوں یا گزروں میں نہیں انکڑوں میں تھا۔ اونچے اونچے درختوں میں گہری ہوئی ان کوٹھیوں کی اصل عمارات یوں چھپی رہتی تھیں کہ سڑک سے گزرنے والوں کو یہ علاقہ محض ایک خوبصورت جنگل معلوم ہوتا تھا جس میں بہت سی طویل و عریض چار دیواریاں تنہی دی گئی تھیں۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب تمہارا کیا کردار؟“ میں درشن رام کی طرف دیکھتے ہوئے خود نکلائی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

”تم مجھے بھی ماری ڈالو۔ اس نے اب اپنی سی نظر مجھ پر ڈال کر اپنے مرہ ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کرشن رام کے بغیر جینے کا کیا فائدہ۔“

”بڑا پیار تھا تمہیں اپنے ساتھی سے؟“ میں نے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی ویرانی کو قدرے حیرت سے دیکھا۔

”وہ میرا ساتھی نہیں مگا بھائی تھا۔ دفعتاً جیسے وہ بہت پڑا۔۔۔“ بچپن سے اب تک ہم ہمیشہ اکٹھے رہے تھے۔ ہر اچھا برا کام ہم نے مل کر ہی انجام دیا تھا اور ہمارا عہد تھا کہ ساتھ جنس کے ساتھ مرس گئے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح ہلک ہلک کر رونے لگا۔

”ادھ۔“ میرے ہونٹوں سے سہلی کی سی آواز نکل گئی۔ میں اس کی ہچکیوں کے ساتھ لرزتے ہوئے جنم کو دیکھ رہا تھا۔ مگر میرے دل میں اس کے لئے کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

”پھر تو مجھے بھی بڑا الوس ہے کہ میں نے ایسی عدم الشان جوڑی توڑ دی۔ میں جینے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”تم دونوں کا شمار تو شاید عنقریب دنیا کے آنکھوں بجوبے کے طور پر

بنا ہوا تھا۔ دوسری چیز نقدی تھی۔ سو سو کے نوٹوں کی چند گزیاں اس کے علاوہ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔

بریف کیس بند کر کے میں نے ایک طرف رکھ دیا۔ اسے میں نے استعمال کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ سیدھے کھڑے ہو کر میں نے تہ خانے کا جائزہ لیا۔ طویل و عریض تہ خانہ اس وقت میدان کارزار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ایک طرف میزالتی پڑی تھی۔ ایک کرسی کی دو ٹانگیں لوٹی ہوئی تھیں دیوار کے ساتھ چنے ہوئے کئی کارٹن گر چکے تھے۔ دیواروں اور چھت میں سے متعدد جگہوں سے پلستر اکڑ کر فرش پر پکھرا ہوا تھا اور ان جگہوں پر گتوں کے گہرے گہرے نشانات نہایت بد نما لگ رہے تھے۔

ایک طرف نصف چاروں خانے چت پڑا تھا۔ لو میں تھڑے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ کوئی مرہ درندہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا سینہ نہایت آہستگی سے پھول اور پچک رہا تھا۔ لگا تھا کہ سانسوں کی آمدورفت بہت سست پڑ چکی ہے۔ اس سے کچھ دور رشی اونڈھا پڑا تھا۔

ایک طرف وکرم پڑا تھا۔ پیشانی کی کھال پھٹنے کے باعث اس کا چہرہ بھی خون میں تر تھا۔ اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ سانس ایک ایک کر آ رہی تھی۔ جب اس شخص نے لگا تار تین چار وار کر کے میرے حواس قفل کر دیئے تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ کرائے کا ایک ہاتھ کھا کر قریب المگ ہو جائے گا۔

دروازے سے کچھ اوجھ وکرم کا ساتھی تھا۔ وہ بھی اس طرح چت پڑا تھا کہ ایک ٹانگ مڑ کر اس کے اپنے ہی جسم تلے دبئی ہوئی تھی۔ اس کی اور گردن خون کا تلاب سا پھیلا جا رہا تھا۔ ان مرہ یا نیم مرہ انسان غائبیوں کے لئے میرے دل میں تاسف رحم یا پشیمانی کی کوئی رشتہ نہیں تھی۔

دیوار کو ایک انگلی پر ٹکھاتے ہوئے میں اس شخص کے قریب پہنچا جو اب تک کی شکل میں نہ صرف زندہ تھا بلکہ اس کے سوٹ پر شکن تک نہیں آئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے کرسی پر بیٹھا ایک دیوار کو گھور رہا تھا۔ اس کی ہلکی شاید مستقل طور پر جھپکنا بھول گئی تھیں۔ اس کی حالت میں یہ تبدیلی مجھے کچھ حیرت انگیز سی لگ رہی تھی۔ میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ شب بھی اس نے آنکھ نہ جھپکی۔

”تمہارا نام؟“ میں نے پوچھا۔

”درشن رام“ اس کے ہونٹ مشینی انداز میں ہے۔ میری طرف اس نے اب بھی دیکھا تھا۔

”درشن رام۔“ میں نے ہوتے کی نوک اس کی کرسی پر نکالتے ہوئے کہا۔ ”مجھے نہ تو نواہ کچھ جانتے سے دلچسپی ہے اور نہ ہی میرے پاس بہت سے سوالات کرنے کے لئے وقت ہے۔ مجھے صرف یہ جانتے سے دلچسپی ہے کہ وہاں کو ہلاک کرنے کے لئے وکرم کی

ہوئے گنتا۔ کم از کم میں نے تو آج تک دو بھائیوں میں اتنی یکاگت نہیں دیکھی۔" پھر میں نے جیت کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "بہرحال اگر تمہیں اتنا ہی دکھ ہے تو میں تمہاری ایک مدد کر سکتا ہوں۔ یہ لو ریو اور خود کشی کر لو۔ بقول تمہارے اب چینیہ کا کیا فائدہ۔"

میں نے جیب سے ریو اور جو ڈالیا۔ اس کا اپنا ہی تھا نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ ریو اور ملتے ہی وہ بھی اپنے بھائی کی طرح زندگی اور موت کی کشمکش میں ایک آخری اور فیصلہ کن کوشش ضرور کرے گا۔ یعنی مجھ پر گولی ضرور چلائے گا اور میں اس کے لئے بھی تیار تھا۔ اسے ریو اور دیتے وقت میں اپنے بچاؤ کے لئے پوری طرح تیار تھا اور اس کی انگلی ٹریگر تک پہنچنے سے پہلے میں اس کے سینے میں گولی اتار دیتے کی پوزیشن میں بھی تھا۔

مگر میں اس کے بچاؤ کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس لئے وہ اپنا کام کر گزرا۔ اس نے واقعی ریو اور کی ٹانگ کھینچی پر رکھ کر جلا تامل ٹریگر دبا دیا۔ اس مرتبہ قار کا دھماکا پسے سے بھی کم تھا اور جو تھا اس سے بھی زیادہ آواز اس کی کھوپڑی کی ہڈی کے پاش پاش ہونے کی تھی۔

دوسرے ہی لمحے وہ کرسی سے نیچے میرے سامنے اس عالم میں ساکت پڑا تھا کہ اس کی کھوپڑی کا آدھا بالائی حصہ غائب تھا اور باقی ٹکڑے جسے سے یوں بھل بھل خون اگل رہا تھا جیسے لاکھوں شریانوں کے منہ کھل گئے ہوں۔

اپنا حلیہ کافی حد تک درست کرنے کے بعد میں نے سرہ خانے پر ایک الوداعی نظروں والی اور وہاں سے نکل آیا۔

دکرم کی جیبوں سے مجھے برفیہ کیس کی منی سی چالی کے علاوہ کار کی چابیوں کا ایک کچھا بھی ملا تھا۔ میری توقع کے مطابق کار کھلی میں کھڑی تھی۔ یہ ایک سلور گرے بیسٹون تھی۔ نمائند شانداز اور باوقار گاڑی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بڑی سرچ لائٹس سے مشابہ تھیں۔

گاڑی میں بیٹھ کر اسے اشارت کر کے میں سڑک پر لایا۔ یہ علاقہ میرے لئے اجنبی تھا۔ میں نے اندازاً "گاڑی بائیں طرف موڑ لی کہ کسی بڑی سڑک پر پہنچ سکوں۔ کچھ دیر ادھر لاکھ بھٹکنے کے بعد بالآخر میں ٹھیڈا جی روڈ پر نکل آیا۔ شہر کے عجیبان آباد علاقوں سے گزرتے وقت میں نے دیکھا عروس شب دھیرے دھیرے انگریزیاں ملتی بیدار ہو رہی تھی۔ کلبوں، ہوٹلوں اور بڑی بڑی دکانوں کے نئون سائن جھلکانے لگے تھے۔

میرے کشمیر بلورڈ پہنچتے تک رات اپنا رنگ جماتی تھی۔ یہ سڑک تقریباً تین میل لمبی تھی اور اس کے دونوں طرف پھیلی ہوئی بعض کوٹھیوں کی حدود تو اب سڑک سے ہی شروع ہو جاتی تھیں اور اپنی کوٹھیوں کے درمیان کہیں کہیں سے چھوٹی چھوٹی نجی سڑکیں

ان کوٹھیوں تک جا رہی تھیں جو پچھلی طرف واقع تھیں۔

بالآخر وہ کوٹھیوں کی چار دیواری کے درمیان مڑتی ہوئی ایک کھج سی سڑک پر مجھے نزدیک کے نشانات کی طرح وہاں کا ایک چھوٹا سا سائن پورے نظر آیا۔ جس پر سرخ رنگ سے لکھا تھا "ہندسہ اور تیر کا نشان نظر آ رہا تھا۔ میں نے گاڑی اس سڑک پر موڑ دی۔ انگریز عموماً تیرہ کے ہندسے کو منحوس خیال کرتے ہیں لیکن ابھی میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ہندسہ کس کے لئے منحوس ثابت ہونے والا تھا۔ میرے لئے یا اس کوٹھی کے کنبوں کے لئے؟

کھلے آسمان تلے مزید کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے اپنے سامنے ایک کھلا میٹ نظر آیا جس کی سلاخوں میں تاری مد سے ٹھن کی ایک چھوٹی سی پیٹ جھول رہی تھی جس پر تیرہ کا ہندسہ چمک رہا تھا۔ اس کوٹھی کی چار دیواری نسبتاً کافی اونچی تھی اور اسی مناسبت سے گیٹ بھی اونچا اور نشاۃ تھا مگر اس کی سلاخوں پر رنگ کی موٹی موٹی مسمیں جی ہوئی تھیں اور ظاہریکی ہوتا تھا کہ ایک مدت سی یہ یونٹ کھلا ہے۔ اس کو بند کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ چار دیواری پر بھی نہ جانے کس زمانے میں زرد چونا پھیرا پایا تھا جس کی قسم جگہ جگہ سے آٹھ پچاس تھی اور وہاں سیاہ کافی کی سی مسمیں جم چکی تھیں۔ طویل و عریض ڈرائیو دسے میں درختوں سے جھڑے ہوئے ان گنت زرد زرد پتے بکھرے پڑے تھے۔

عمارت بدروحوں کا ممکن معلوم ہوتی تھی۔ ماحول پر وہی پراسراریت اور ہیبت ناک سا سکوت طاری تھا جس کی منظر کشی میں نے انگریزی کی خوفناک کہانیوں میں بار بار پڑھی تھی۔ دلچسپا مجھے احساس ہوا کہ درختوں تلے تاریکی میں دونوں طرف آئے پیچھے مختلف رنگوں اور مختلف ماڈلوں کی گاڑیاں بھی کھڑی ہیں ان کی طرف میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

میں گاڑی سے اترا اور تین سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچا۔ سامنے بلند و بالا چوٹی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ابھی میں اس تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ دائیں طرف سے ایک شخص اندھیرے کی آغوش سے نکل کر اچانک ہی سامنے آیا۔ وہ چھوٹے جسم کا ایک طویل القامت اور بظاہر بہت سادہ انسان تھا۔ اس کے چہرے پر علامت اور شایستگی خفیف مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی مگر اس کی آنکھوں کا گویا اس کے چہرے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ وہ محض بلور کی دو گویا معلوم ہوئی تھیں۔ ٹھوس سرد اور ہر تاثر سے عاری۔ وہ سوت میں ملبوس تھا۔

"کہاں سے تشریف لائے ہیں اور کس سے ملنا ہے؟" اس نے اہمائی شائستگی سے لہجے میں پوچھا۔ آواز سرگوشی سے کچھ ہی بلند تھی۔

"مجھے دکرم نے بھیجا ہے۔" میں نے آواز کو قدرے بھاری بنانے کی کوشش کرتے

ہوئے دھیسے لیجے میں کہا اور یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ مجھے کس سے ملنا ہے۔
 "اوہ۔۔۔۔۔" اس نے ایک گہری اور آسودہ سی سانس لے کر ایک نظر اس گاڑی کی طرف دیکھا جس میں میں آیا تھا۔ "میں بھی سوچ رہا تھا کہ۔۔۔۔۔" وہ جملہ اوجھڑا چھوڑ کر مسکرایا اور راستے سے ہٹ کر گردن کو قدرے خم دیتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا اور پھر جیب سے ایک چابی نکال کر اس نے چوبی دروازے کے ایک ایسے سوراخ میں داخل کی جسے شاید میں اس تختے پر کندہ کئے گئے تیل بوٹوں میں کبھی تلاش نہ کر پاتا۔

"میڈم دوسری منزل پر اپنے پارلر میں ہیں۔" اس نے چابی گھماتے ہوئے کہا۔ چابی کو اس نے کچی پکڑ دیئے جیسے وہ چابی نہیں اسکرپو ڈرائیور ہو۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے دروازے پر ہلکا سا دھاک ڈالا اور خود ایک طرف کو ہٹ گیا۔ الوداعی انداز میں گردن ہلا کر وہ دہلیز کھڑا رہا۔ میں نے اندر قدم رکھا اور دروازہ نہایت ہی ہلکی سی کلک کے ساتھ میرے عقب میں بند ہو گیا۔

میں اب ٹیلیفون بوتھ نما لیکن اس سے خاصی بڑی کوٹھری میں کھڑا تھا۔ میرے سامنے دھندلے شیشے کا دروازہ تھا جس کے پار کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اتنا ضرور معلوم ہو رہا تھا کہ اوپر تیز روشنی ہے۔

تب مجھے احساس ہوا کہ دہرے دروازوں کا یہ سسٹم دراصل ساؤنڈ پروفنگ اور ایئر کنڈیشننگ کے لئے تھا۔

میں نے جیسے ہی شیشے کا دروازہ کھولا میرے ارد گرد جیسے۔۔۔۔۔ خوشبوؤں آوازوں اور روشنیوں کا ایک سیلاب اندر بڑا۔ دو دروازے پار کرتے ہی جیسے میں کسی اور دنیا میں آ گیا تھا۔ باہر موت کا سا سکوت تاریکی اور سوتا پین تھا اور اندر کی تمام تر رنگینی، روشنی و رعنائی کے ساتھ ہنگامہ حیات شباب پر تھا۔ شیشے کے دروازے سے نکل کر چند لمحوں کے لئے تو میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

یہ ایک طویل و عریض ہال تھا جس میں فرش پر بھڑکیلے سرخ رنگ کا دیر قالمین بچھا ہوا تھا جس میں پاؤں دھسنے جا رہے تھے۔ چھت کے وسط میں ایک بہت بڑا اور اس کے ارد گرد کئی چھوٹے چھوٹے فالوئس آویزاں تھے جن کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔۔۔۔۔ چھت اور فرش کے درمیان قوس قزح کی رنگینیاں بکھری ہوئی تھیں۔

ہال کے وسط میں قدیم رومن طرز کی ایک بہت بڑی ڈائمنڈ ٹیبل تھی جس کے ارد گرد کرسیاں نہیں تھیں۔ اس پر انواع و اقسام کے کھانے بچے ہوئے تھے۔ دھات کی ڈشوں کے پیچھے اسپرٹ لیپ روشن تھے کہ کھانے ٹھنڈے نہ ہوں۔ ایک خاص اور اوجھڑی سی یونیفارم میں ملبوس تراشیدہ سے جسم کی مالک دو لڑکیاں اس میز سے خالی پلیٹیں اٹھاتے اور مزید ڈشیں رکھنے میں مصروف تھیں۔

میز کے گرد چند جوڑے کھڑے تھے۔ مردوں کے لباس اعلیٰ اور بیش قیمت چروں پر خوشحال آسودگی کی چمک مگر آنکھوں میں شمار کی دھندلاہٹ تھی۔ بات بات پر اوپر اوپر کو جھومتے تھے۔ جیسے توازن پر قرار رکھنا مشکل ہو رہا ہو۔ ان کی ساتھی لڑکیاں خود بھی شمار کے علاؤں میں ہلکورے لے رہی تھیں مگر انہیں سہرا دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان میں سے کئی کے ہاتھوں میں اب بھی جام تھے۔۔۔۔۔ نہایت شوخ بھڑکیلے اور بیش قیمت مگر ناکافی لباس والی کوئی لڑکی سر پیچھے کو جھٹک کر ہنسنے والی کا پورا زور لگا کر کوئی بات کرتی تو اس کی گردن کی مرمریں جلد پر نیلی نیلی رنگیں ابھر آتیں۔ آواز تو ماحول کے شور میں مدغم ہو کر معلوم نہیں اپنے مخاطب تک پہنچ پاتی تھی۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی اپنا گلاس بلند کر کے چلا کر کچھ کہتا تو سامعین قہقہے لگاتے لگاتے دہرے ہو جاتے ایک دوسرے پر گر جاتے۔ لڑکیاں اپنے اپنے ساتھیوں کو سنبھالنے کی کوششیں تیز کر دیتیں۔

ہال کے اختتام پر فرش کا کچھ حصہ اونچا تھا جس پر قالمین نہیں تھا۔ یہ حصہ اتنا صاف چمکیلا اور چمکتا تھا کہ اس کی جھلکاہٹ دور ہی سے واضح تھی۔ اس حصے پر چند جوڑے نیم بھونٹانے سے انداز میں خود نقص تھے۔ پس منظر میں چیز موسیقی گونج رہی تھی۔

یہ گویا ایک ہی طرز کا بانٹ قلب تھا جس میں ڈانکس ڈانکس اور ڈنر سب ایک ہی فلو پر کھجا کر دیا گیا تھا۔ ایک اور عجیب بات میں نے یہ محسوس کی کہ ہال پار اور ڈانکس طور پر موجود تقریباً تمام ہی جوڑوں میں بیشتر مرد ہندوستانی اور بڑے العربیہ بہت سے تو اوسط عمر تھے۔ البتہ لڑکیاں مختلف انٹنس اور سب کی سب نوجوان تھیں۔ ان کے طرز عمل سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ ان مردوں کی بیویاں نہیں تھیں۔

ماحول کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں آگے بڑھا۔ کسی نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ میں نہایت اطمینان سے سیڑھیوں کی تلاش میں نظر دوڑاتے ہوئے ہال کو عبور کرنے لگا۔ ہال کے اختتام پر پہنچ کر ڈانکس فلو پر بائیں جانب مجھے سیڑھیاں نظر آئیں۔

آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی مجھے لاؤنج کے پار ایک بڑے دروازے پر پتیل کے حروف میں لفظ "پرائیویٹ" چمکتا نظر آیا۔ اس کے نیچے قدرے چھوٹے حروف میں "میڈم منورما" کی نیم پلٹ نظر آ رہی تھی۔ یقیناً یہی میڈم منورما کا پارلر تھا۔

دروازے پر پہنچ کر میں نے ایک انگلی سے دستک دی۔

"دروازہ کھلا ہے؟" ایک ہلکی سی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور ایک لمحوں کے لئے وہیں رک گیا۔ یہاں روشنی زیادہ نہیں تھی منظر بہر حال آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا مگر ترتیب و آرائش کے اعتبار سے یہ ایک عجیب جگہ تھی۔ فرش پر یہاں بھی دیر قالمین تھا مگر اس کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ کھڑکیوں پر اسی رنگ کے نہایت خوبصورت پردے لگے رہے تھے ایک طرف دیوار کے

ساتھ نہایت شاندار بیضوی ڈبل بیڈ لگا ہوا تھا۔ جس پر حسین ٹائیلوں کا چھرو سا قبا ہوا تھا۔ اس کی ڈوریاں چھت سے منسلک تھیں۔

جہاں میں کھڑا تھا اس سے کچھ ہی دور دائیں ہاتھ پر ایک گوشے میں خاصی بڑی اور بیش قیمت آئینہ نیل اور سیاہ اسٹیل کی فائلنگ کینٹ ڈٹ تھی۔ میز کے ساتھ صرف ایک مگر بے حد خوبصورت چمڑے کے گدیلوں والی ریوانوٹک چھتر بھی موجود تھی۔ میز پر کئی فائبر کتاہیں اور کچھ کھلے کاغذات قدرے بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ کھلی فائل پر کسی کے موئے موئے عدسوں والی نظر کی عینک بھی پڑی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی کھینے پڑھنے کا کام کرتے کرتے ابھی ابھی اٹھ کر گیا ہے۔ گویا یہ طویل و عریض کمرہ یک وقت خوابگاہ ڈرائنگ روم اور ہفٹس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے میری نظر کمرے کے وسط میں لگی جہاں ایک عورت آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ اس کے سر میں پاؤں پانی سے بھرے ایک بلوریں برتن میں نکلے ہوئے تھے۔ اس کے پیروں اور ڈھیلے اُجالے گاؤں سے ہوئی ہوئی میری نظر اس کے چہرے پر پڑا۔



اس کی عمر شاید پچیس سے اوپر ہی تھی مگر رکھ رکھاؤ غضب کا تھا۔ اس کی رنگت حد سے زیادہ سپید تھی اور زندگی سے خالی نظر آتی تھی۔ چہرے پر گہری گہری ٹینیں اور ہونٹ مرچائے ہوئے تھے مگر بڑھاپے کی ان نشانیوں کو نہایت ماہرانہ میک اپ نے بڑی حد تک دبا رکھا تھا۔ چہرے کی مناسبت سے اس کے بال بھی تقریباً سارے سفید ہونے چاہیے تھے مگر وہ گہرے سیاہ اور نہایت چمکیے تھے۔ یہ کسی بہت ہی ٹینیں اور بیش قیمت ڈانکی کا کمال تھا۔

”اجنبی نظر آتے ہو؟“ دھت ”بڑھیا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کی آواز میں بڑھاپے کی لرزش کی بجائے اب بھی ایک عجیب سی کھٹک اور لوج تھا۔ ”مگر اجنبی یوں بلا اطلاع مجھ تک تو نہیں پہنچ پڑے۔“ اس نے ایک نظر اپنے دائیں طرف ایک تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف دیکھا اور پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کمرے کی ٹٹک فضا میں ایک گہری سانس لی اور رکھی سے انداز میں سسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے وکرم نے بھیجا ہے۔“

میرا خیال تھا کہ یہ سن کر وہ خوشی سے کھن اٹھے گی اور نہایت ہی شیریں لہجے میں بیٹھنے کی دعوت دے گی۔ پھر پوچھے گی کہ میں کیا کھانا اور کیا پینا پیوند کروں گا اور میں اس سلسلے میں قطعاً کسی تکلف سے کام نہیں لوں گا اور کیونکہ مجھے بھوک بھی شدت سے لگ رہی تھی اور پیاس بھی۔

میر میری توقعات کے برعکس اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک سخت برہمی اور سرد مہری در آئی۔ پتے پتے ہونٹ ایک لمحے کے لیے بے رحمانہ انداز میں بھیج کر رد ہو گئے۔ پھر ان میں ہلپش ہوئی۔ ”اگر وہ خود آیا ہوتا تو اس بار شاید میں تپائی اٹھا کر اس کے سر پر دے مارتی۔“ پھر اس نے ہونٹ چباتے ہوئے گویا خود پر ضبط کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس دوران کوئی تبصرہ یا معافی پیش کرنا ضروری نہ سمجھا۔

”میں تو اس غیبت کو ایڈوانس دے کر پھنس گئی۔“ بڑھیا نے اب قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”اوپر درجے کا بد معاش بنا پھر ہے، چوہے سے بھی ڈر جانے والی وہ اصحق عورت تو اس سے اب تک مری نہیں۔ وکرم نے اس معاملے کو جتنا لمبا کھینچ دیا ہے اس

سے لگتا ہے کہ اس کی کامیابی کا انتظار کرتے کرتے میں شیشاں پہنچ جاؤں گی اور روپا بوڑھی ہو جائے گی اور تب اسے خود ہی زندہ رہنے کی آرزو نہیں رہے گی۔ اس بار اس نے کوئی نئی کہانی گھڑی ہوگی اور خود آکر وہ کہانی سنانے کی اس میں ہمت نہ ہوگی۔ اس لیے نہیں بھیجا ہوگا۔۔۔۔۔

”روپا مر چکی ہے میڈم!“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”کیا؟“ وہ تقریباً اچھل پڑی۔ پھر اپنے رد عمل کے اس سے ساختہ اظہار پر شرمندہ سی ہو گئی گویا اس کے نزدیک اپنے محسوسات پر قابو نہ رکھنا باعث شرم عادت ہو۔ وہ ایک سخت عی نداشت پر جوش نظر آنے لگی تھی مگر اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ اس نے چپکی بجا کر اس لڑکے کو جانے کا اشارہ کیا جو اس کے بال بٹا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے باہر چلا گیا۔

”دھڑ آؤ۔۔۔۔۔“ منہ جڑ ناں۔۔۔۔۔“ منور مانے اپنے دائیں ہاتھ پر پڑی ایک اور آرام دہ کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ سر پر اس کے روئیں روئیں سے پھولی پڑ رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں سب سے بڑی تھی۔

میں آرام دہ کرسی کے ایک سرے پر تک چکا تو اس نے سب سے تالی سے آگے کو جھکے ہوئے کہا۔ ”کیا کہہ رہے تھے تم؟ کیا واقعی روپا مر چکی ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔“

”خیر۔۔۔۔۔ بالآخر میرے من کی یہ پھانس نکل ہی گئی۔“ اس نے جہم دھیلا چھوڑ کر آرام دہ کرسی کے پشتے کو ایک لیور کی مدد سے قدرے سیدھا کر کے اس سے ٹیک لگائی۔ اس کی نظریہ ستور مجھ پر مرکوز تھی۔

”اب مت کس لیے آئے ہو؟ ہنی رقم لینے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”رقم اب اطمینان ہونے کے بعد وکرم ہی کو ادا کیجئے گا۔ میں تو صرف آپ کو اطلاع دینے آیا تھا۔“

پھر میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ ”ویسے کرائے کے قائل سوالات تو نہیں کیا کرتے لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو میں پوچھوں کہ روپا سے آپ کی اس حد تک نفرت کی وجہ کیا تھی کہ آپ نے اسے مروانے کے لیے اتنا تردد کیا؟“

”بظاہر تو کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔“ اس نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

میرے دل میں پتہ نہ تھا۔ میں نے اسے اس وقت سہارا دیا جب وہ ایک وقت کی روٹی کی محتاج تھی۔ میں نے اسے تراش کر پتھر سے اسیڑا بنایا اور جب وہ کسی قائل ہوئی تو مجھے ٹھوکر مار کر چلی گئی۔۔۔۔۔ اور وہ بھی عین اس وقت جب میں اسے ایک سیٹھ کی ساتھی بنانے کے

لیے کچھ رقم بھی لے چکی تھی اور اسے خرچ بھی کر چکی تھی۔ اس وقت ہماری مالی حالت کچھ اتنی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے کتنی ذلت اٹھانی پڑی تھی۔ میری کتنی بے عزتی ہوئی تھی۔۔۔۔۔“ وہ خاموش ہو کر چھت کو گھورنے لگی جیسے اس کی نگاہیں ماضی کی بھول حلیوں میں بھٹک رہی ہوں۔

”گویا آپ کو صرف اس بات کا اتنا غصہ تھا کہ روپا اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے بسر کرتا تھا؟“ میں نے سرسری لیجے میں کہا۔

”اس دنیا میں بہت کم لوگ اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے بسر کرتے ہیں۔“ یوہیا نے ٹھوس لیجے میں کہا۔ ”مخصوصاً روپا جیسی کنور عورت کو تو یہ حق ہرگز نہیں مانگنا چاہیے تھا جبکہ اسے طاقتور بنانے کی ابتداء بھی میں نے ہی کی تھی۔ اسے زندگی بھر میرے سامنے سر نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔“ دانتا اس کی چپکلی آنکھوں میں شک و شبہ کی ہلکی سی پرچھائیں رینگ کر آئی۔ اس نے قدرے چٹک کر آنکھیں میکیئر کر میری طرف دیکھا۔

”لڑکے! مجھے تمہارے لیجے سے روپا کے قرب کی خوشبو آرہی ہے۔ تم نے اس کو مار دیا ہے یا کہیں چھپا لیا ہے؟“ دانتا اس نے سخت لیجے میں کہا۔

میں نے ایک مصنوعی تفسیر لگایا اور قدرے خوشامدات لیجے میں کہا۔

”یہ تو آپ کو کل کے اخبارات سے معلوم ہو گا میڈم! ویسے آپ کے قیام کی میں داد دیتا ہوں۔ گئی بات یہ ہے کہ روپا میری زندگی کی وہ ہلکی عورت تھی جسے ہلاک کرتے وقت میرا دل بیچتا اور اس کے لیے مجھے کچھ بدردی سی محسوس ہوئی۔ میرا اس سے مراسم استوار کرنے کو جی چاہا مگر پھر پیشہ وارانہ تربیت غالب آگئی اور ساتھ وہ بے ہودہ سا بخاور بھی یہ دیکھ گیا کہ گھوڑا گھاس سے محبت کرے گا تو کھائے گا کیا؟ قصائی مویشیوں پر رحم کھانا شروع کر دے گا تو کھائے گا کہاں سے؟ بس یہی سوچتے سوچتے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔ یہ آپ کا کمال ہے کہ ان سوچوں کا پرتو بھی آپ نے محسوس کر لیا۔“

وہ انتہائی جھانڈیدہ اور منکار ہونے کے وجود اس مدح سرائی کے اثرات سے نہ بچ سکی۔ بڑے فخریہ انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ”اگر تمہارا ایک رات کے لیے دنیا جہاں کے نظرات کو بھول جانے کا ارادہ ہو تو میں تمہیں اعزازی وزیر کے طور پر یہاں ایک رات قیام کی دعوت دیتی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔ ”تم میرے لیے اتنی اچھی خبر لائے ہو کہ میرا بی بی تمہاری خاطر مہارت کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”شکریہ! فی الحال میرا دنیا جہاں کے نظرات کو بھول جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے تمام مسائل اس وقت تک میرے سر پر سوار رہیں جب تک میں ان سے نمٹ نہ لوں۔۔۔۔۔ اور پھر ابھی میں نے دوسری خبر تو تمہیں سنائی ہی نہیں جسے من کر بلاشبہ تم اچھل پڑو گی۔۔۔۔۔“



میں آپ سے تم پر اترا آیا تھا۔

"تو کیا؟" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "وہ یہ کہ روپا درحقیقت زندہ ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اور میری خدمات ایک نئی عاقبت نے دراصل تمہیں نکالنے لگائے کے لیے حاصل کی ہیں۔"

وہ خوفزدہ ہونے کی بجائے کچھ چڑھی گئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ آنکھیں میچھڑے مجھے گھور رہی تھی۔

"میرے خیال میں ابھی بہت سے درمیان اتنی بے تکلفی پیدا نہیں ہوئی کہ تم اس قسم کا مذاق کرنے لگو۔" وہ ناگوار سے بولی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا ناچار بوجھا۔" میں نے دانت میں کر کہا۔ "یہ بتاؤ کہ اپنے لیے موت کا کونسا طریقہ پسند کرو گی؟ گولی کا کرنا چاہتی ہو یا ٹینو ادا کرنا؟ کھڑکی سے گر کر مرنے کو ترجیح دو گی یا گردن تڑوا کر مرنے کو؟ یہ چاروں طریقے نہایت کم تکلیف دو ہیں۔ تمہارے جرائم کی فہرست چونکہ زیادہ طویل نہیں، اس لیے میں تمہیں کم سے کم تکلیف دہ موت کا طریقہ منتخب کرنے کی اجازت دے رہا ہوں۔ جلدی پولو۔"

"کیوں اس مت کرو۔" اس بار وہ ناگن کی طرح پھٹکاری۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی اور غالباً اسے میری بات کا یقین نہیں تھا کہ تک اس کا ہاتھ دھیرے دھیرے اپنی کرسی کے پاس میں لگے ہوئے ایک سرخ بٹن کی طرف بڑھ رہا تھا مگر وہ ظاہر کیا کر رہی تھی کہ وہ میرے اندھ کو محض ایک اس سمجھ رہی ہے۔

میں نے اس کے ہاتھ کو سرخ بٹن کے نین قریب پہنچنے کا سوچ دیا اور میں اس وقت بیک اس کی انگلی بٹن کو چھونے والی تھی، میں نے اس کے بازو پر کراٹے کا وار کیا اور ساتھ ہی اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ بھی رکھ دیا۔ گوکہ کمرہ مجھے ساؤنڈ پروف معلوم ہو رہا تھا، تاہم میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس کی کلائی گویا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور بازو بے جان انداز میں پہلو میں بھول گیا۔ وہ مرے ہاتھ کے دباؤ سے بری طرح جھل رہی تھی۔ میں نے دوسرا ہاتھ پھیلا کر اس کی پیشانی گرفت میں لے لی اور ایک مخصوص جھٹکا دیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی نہ پھٹی اور چہرے کے عضلات تڑپنے لگے۔ چپٹ کی صرف ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ ہٹا لیے تو وہ آرام دہ کرسی کے ایک بازو پر لٹک گئی۔

کمرے میں سناٹا در آیا تھا۔ یہ موت کا سناٹا تھا۔ میڈم منورما کی پھٹی پھٹی آنکھیں گویا اب بھی مجھے دیکھ رہی تھیں اور میں اس کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا کہ بس اتنی سی بات تھی۔ کہاں وہ مسخ آدمیوں کے جیسے، اسٹین منوں سے فائرنگ کنٹر میسوری کی ڈرامہ بازی؟

دکرم کی دہشت گردی اور ان سب چیزوں کی وجہ سے روپا کا جیتنے جی سول پر لٹنے رہتا۔ ان سب کے پیچھے محض اسی باتوں ہی بڑھیا کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ معاملہ کتنا خوفناک اور گھمبیر نظر آتا تھا کیونکہ اس کی اصل جڑ کا پتا نہیں چل رہا تھا ورنہ بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔

بہر حال اسی باتوں ہی بڑھیا تک پہنچنے کے لیے مجھے جن تجربوں سے گزرنا پڑا تھا، انہوں نے میرے حوصلے میں اضافہ کیا تھا۔ جن حالات کا مجھے سامنا ہونے کی توقع تھی، یہ شاید ان کی ریسرسل تھی۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ادھر ادھر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں جس خاموشی سے اوپر آیا تھا، اسی طرح واپس پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرانی ہوئی کہ اب وہاں ایک جوڑا بھی نظر نہیں آ رہا تھا حتیٰ کہ سرو کرنے والی لڑکیاں بھی غائب ہو چکی تھیں۔ تمام جوڑے دراصل کمروں میں جا چکے تھے اور کمرے ساؤنڈ پروف تھے۔

باہر آکر میں نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ لڑکوں مجھے کہیں نظر نہیں آیا جس نے میرے لیے دروازہ کھول تھا۔ چاروں طرف وہی سناٹا اور سکوت طاری تھا جس سے مزر کر میں یہاں پہنچا تھا۔ درختوں تلے تلخ اندھیرے میں رنگ برنگی کاریں اسی طرح کھڑی تھیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سکوت اور دھندلاہٹ میں لپٹی ہوئی اس غارت کی دیواروں کے پیچھے کیسی دنیا آباد تھی؟ کیا جنگامہ بچا تھا اور اس کے ہر کمرے میں ٹیبلٹ و طرب اور بے راہ روی کی کیسی کتنی داستانیں رقم کی جا رہی تھیں؟

کار میں بیٹھ کر میں روپا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری اتنی دیر کی غیر حاضری سے وہ بے حد پریشان ہو گی۔ اندیشہ یہ بھی تھا کہ اس گھبراہٹ میں وہ کوئی غیر ضروری قدم نہ اٹھا بیٹھے، اسی لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پہلے جا کر اسے تسلی دے دوں۔ اس کے بعد اس تہ خانے کا ایک چکر لگا کر توں گا جہاں میں نسیم اور دکرم کو شہر مردہ چھوڑ آیا تھا۔

یوں گھٹنے کی ڈرائیو کے بعد جب میں نے گاڑی اس ہالک کی طرف موڑی جہاں بیغوی ہے گراؤنڈ کے قریب روپا کا گھر تھا تو مجھے سڑک پر ٹپٹل اور غیر معمولی آمد و رفت نظر آئی۔ روت عام حالات میں اس پرش رہائشی علاقے کی سڑکوں پر کم ہی آتا، رفت نظر آتی تھی۔

پے گراؤنڈ کی طرف گاڑی موڑتے ہی میں نے سامنے کا منظر دیکھ کر غیر ارادی طور پر ایک سخت گاڑی روک لی۔ سامنے لوگوں کا بے پناہ جھوم تھا۔ بیسیوں گاڑیاں ادھر ادھر کھڑی نظر آ رہی تھیں جن میں پولیس اور فائر بریگیڈ کی بھی گاڑیاں شامل تھیں۔ بڑی بڑی سرخ دانتیں روشن تھیں لیکن ان کے درمیان کیمروں کی فلیش لائٹوں کے جھمکے الگ ہی نظر آ رہے تھے۔

جو مقام ان سب کی توجہ کا مرکز تھا وہاں روپا کی کوٹھی ہوئی چاہیے تھی جو اب وہاں



نہیں تھی۔ اس کی جگہ اب مٹھن لے کا ایک انبار تھا جس سے کہیں کہیں سے دھوپ کی لکیریں بلند ہو رہی تھیں۔ مخصوص لباس اور ہیلڈ وغیرہ پہنے ہوئے فائر بریگیڈ کا عملہ کئی بجوں سے مستعدی سے لمبے ہٹانے میں مصروف تھا۔ کئی بار دہی اور بے وردی افراد بار بار ہجوم کو ہٹاتے اور ادھر آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ روپا کی کوٹھی لمبے کا ڈھیر کیونکر بن گئی تھی اور کیا روپا بھی اس کے ساتھ ہی...؟ ان سوالات نے گویا مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ میرے ہاتھ پیروں سے گویا جان نکل گئی۔ اب تک کی ساری مار دھماؤں بھاگ دوڑ اور جدوجہد نے مجھے اتنا نہیں تھکاؤ تھا جتنا صرف ایک منظر نے مجھے بے دم کر دیا تھا۔ قریب تھا کہ میں گاڑی سے اتر کر دیوالوں کی طرح دوڑنا ہجوم کے قریب جا پہنچتا اور کسی دردی والے کو جھنجھوڑ کر پوچھتا کہ معاملہ کیا ہے؟ روپا زندہ ہے یا...؟ اسے مرده تصور کرنے پر دل آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا۔

صحیح صورتحال جانے پوچھے بغیر ہی میرا دل دھڑکیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ بہر حال اپنے اعصاب کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے ہجوم سے اتنی دور ہی رہتے ہوئے گاڑی کا انجن بند کیا۔ چالی انٹینشن میں چھوڑی اور گاڑی سے اتر گیا۔ گاڑی اس وقت ایک کوٹھی کی کپاڑوں وال کے قریب تھی اور اس کا بیشتر حصہ اندھیرے ہی میں تھا البتہ اس سے اترتے وقت میں روشنی میں ہی تھا۔ دھماکا میں نے سامنے سے زائدہ سائیکل پر ایک لڑکی کو تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے تراشیدہ بال اور اسکرٹ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ اسٹریٹ ٹافٹ چونکہ اس سے پیچھے تھی اس لیے اس کا چہرہ مجھے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں چونکا ہوا ہوں۔

میرے قریب آکر لڑکی نے سائیکل کی بریک لگائی اور اتر پڑی۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ روپا کی سیکرٹری اوشا تھی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی اور ستواں ٹانگ پر پینے کی مٹھی بھی باندھ چک رہی تھیں۔ وہ سیاہ اسٹیک اور بیٹوس کے جوتے پہنے ہوئے تھی اور اس وقت کانچ کی کوئی ایتھلیٹ ٹگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک گونہ غمازیت کا احساس ہوا۔ میرے کچھ پوچھنے سے پیشتر ہی وہ بول اٹھی۔

”منصور“ اس نے انگریزی میں کہا۔ ”آپ فور میرے ساتھ چلے۔ میں کب سے آپ کی تلاش میں ہیں چہرہ رہی تھیں۔“

”آؤ جلدی سے گاڑی میں بیٹھو۔“ میں نے دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”میری سائیکل...“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”پہنیز اسے ذکی میں رکھ دیں۔“ مجھے چھبیس سال کی اس تندرست و توانا اور خاصی حد تک جوانانہ لڑکی کے انداز میں سکول کی بچیوں جیسی معصومیت تھی۔ شاید میں اس وقت اس کی سائیکل دیں پھینک دیتا اور کہتا۔

”میں بعد میں تمہیں دس سائیکلس لے دوں گا۔“ لیکن شاید اس کے لمبے کا اثر تھا کہ مجھے یہی محسوس ہوا جیسے اس کی عمر بھر کی پونجی ہمیں رہی جا رہی ہے۔ میں نے انٹینشن سے چابیس نکال کر ذکی کھولی اور اس کی سائیکل کو اس میں ٹھوس اور اسٹیزنگ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ”کدھر چلنا ہے؟“

وہ میرے برابر بیٹھ نکل گئی۔ ”گاڑی راہیں موڑ لیجئے۔“ اس نے کہا۔ اوشا کی ہدایت کے مطابق میں گاڑی واکیں بائیں گلیوں میں موڑنے لگا۔ خاموش رہتا میرے پس سے باہر ہو گیا تو میں نے پوچھا۔ ”یہاں کیا ہوا تھا؟“

”میرا گھر تھوڑی ہی دور رہ گیا ہے۔ ابھی آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔“ اوشا نے مبہم سا جواب دیا۔

”روپا تو زندہ ہے ناں؟“ میں نے قدرے بلند آواز میں بے چینی سے پوچھا۔

”جی ہاں!“ اس نے جواب دیا۔

اس لمحے میرا وجود غمازیت کی فٹھدی جھیل میں اتر گیا۔ واقفان کے تاروں کی طرح تھے ہوئے میرے اعصاب کو قرار دیا۔ اس وقت میرے لیے سب سے اہم اور سنگین سوال یہی تھا جس کا مجھے جواب مل گیا تھا باقی باتیں میرے نزدیک بہت کم اہم تھیں۔ ہم ابھی اسی علاقے میں تھے تاہم ایسے حصے میں پہنچ چکے تھے جہاں بچوں اور کوشیوں کی بجائے چھوٹے بڑے قلیوں پر مشتمل کئی منزلیں عمارتیں سر اٹھائے کھڑی تھیں، انہیں سے ایک فٹن پرانی عمارت کے سامنے اس نے گاڑی رکوائی اور اترتے ہوئے مجھے ساتھ آتے کا اشارہ کیا۔

زرد روشنی میں ڈوبی ہوئی میڑھیاں طے کر کے میں اس کی رہنمائی میں دوسری منزل پر ایک فلیٹ تک پہنچا جس کے سینٹی دروازے پر ایک دائرے میں سیاہ پینٹ سے آٹھ کا نمونہ سا ہندسہ لکھا نظر آ رہا تھا۔ اوشا کی دستک کے جواب میں ایک پتلی دلی سی بڑھیا نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر ہستے کیا۔ بڑھیا، اوشا کے مستقبل کی پرچھاکیں معلوم ہوتی تھی۔ یقیناً وہ اوشا کی ماں تھی۔ اب مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہ رہی کہ یہ کس کا گھر ہے۔ ظاہری بات تھی کہ اوشا کا گھر تھا۔

پہلا کمرہ خالص کٹروہ تھا اور اس کی آرائش اوسط درجے کی تھی۔ قالین کا رنگ اڑا اڑا سا تھا اور صوفہ بھی پرانا تھا مگر اس کے گدیلوں پر صاف ستھرے غلاف چڑھے ہوئے تھے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسی کمرے کے ایک گوشے میں قالین پر روپا آرام سے بیٹھی دو نو عمر لڑکیوں کے ساتھ نوڈا کھیں رہی تھی۔ نو عمر لڑکیاں اوشا کی چھوٹی بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔

”خدا کا شکر ہے منصور!“ روپا مجھے دیکھ کر نوڈا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے آنے



سے پہلے وہ غائبانہ تفکرات کو بھلنے کی کوشش میں خاصی کامیاب ہو چکی تھی اور بڑکیوں کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی مگر مجھے دیکھتے ہی جیسے سارے فراموش کردہ اندیشے اس کی آنکھوں میں اتر آئے۔ "تمہارا انتظار کرتے کرتے میں تو پاگل ہو چلی تھی۔" میں خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ میرے قریب آئی۔

"ہوا کیا تھا؟" بالا فر میں نے پوچھا۔

"صحیح طور پر تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "میں تمہاری ہدایت کے مطابق کنوڑ میسوری کی کینڈلک ایک سڑک پر چھوڑ کر کچھ دیر ٹیکسی تلاش کرتی رہی لیکن ٹیکسی نہیں ملی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ سیاہ فاشے اور عام سے لباس کے ہاؤسڈ کچھ لوگ مجھے پہچان نہ لیں اور جھوم آتھا نہ ہو جائے اس لیے میں گلیوں گلیوں سے ہوتی پھرتی ہی چل دی۔ گھر کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں رہا تھا۔ اس وقت میں بے پرواؤنڈ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ بسبب میں نے زبردست دھماکے کے ساتھ کوٹھی کا مرکزی حصہ مندم ہونے دیکھا۔ بستر اور اینٹوں وغیرہ کے کچھ ٹکڑے تو میں نے شش و خاشاک کی طرح ہوا میں بھی اڑتے دیکھے، پھر باقی دیواروں وغیرہ میں بھی دراڑیں پڑیں اور وہ بھی زمین بوس ہو گئیں۔" وہ نے سسکی سی لی اور قابل رحم سے انداز میں میری طرف دیکھا۔

"میں نے بوسے چاؤ سے فوہ ہوا تھا منصور!" اس نے جیسے شکوہ سا کیا۔ جیسے اس کی تباہی میں میرا بھی ہاتھ رہا ہو۔ "اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ یوں نیست و نابود ہو گیا جیسے ہندوؤں نے کسی پرندے کا آشیانہ اجاڑ دیا ہو۔"

"یہ شکر کرو کہ وہ پرندہ زندہ بچ گیا ہے۔" میں نے جانتے کیوں مسکرا دیا۔ "آشیاں تو پھر بھی بنتے رہیں گے۔" میں نے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ "کوٹھی میں غالباً بے حد طاقتور بم چھپا گیا تھا۔ مجھے تو یہ سوچ کر جھرجھری آ رہی ہے کہ اگر تمہیں ٹیکسی مل جاتی تو یقیناً تم چند منٹ پسے گھر پہنچ چکی ہوتی۔ تب کیا ہوتا؟"

روپا کو واقعتاً جھرجھری سی تھی۔ اس دوران جیسے ہم نے کمرے میں موجود دیگر افراد کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا۔ بڑھیا تو چند لمحے پہلے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اوشا نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھئے" میں آپ کے لیے کافی ہوتی ہوں۔"

"کافی نہیں۔" میں نے فوراً کہا۔ "میرے بچے کچھ کھانے کے لیے آؤ" ہو جائے گا کوئی بندہ دست؟" میں نے احتیاط پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" وہ مسکرائی۔ "چند منٹ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔" وہ غالباً بچن کی طرف چل دی۔ باہر جاتے وقت اس نے شاید اپنی پھوٹی ہنوں کو بھی اشارہ کر دیا تھا کیونکہ اس کے ساتھ ہی کمرے سے وہ بھی رخصت ہو گئیں۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور

روپا کو بھی اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر وہ دیوار سے ٹیک لگا کر میرے پیروں کے قریب ہی کالین پر بیٹھ گئی۔ گھر میں بھی وہ اسی طرح ایزی ہو کر بیٹھنا پسند کرتی تھی۔ اس وقت وہ عام سی ساڑھی میں، بکھرے بکھرے بالوں اور بے نیاز چہرے کے ساتھ بہت مختف لگ رہی تھی۔ بخور دیکھنے پر اسے کوئی عام آدمی شاید ہی تسلیم کر پاتا کہ یہ وہی روپا ہے جسے وہ غلموں میں ایک سے ایک انوکھی صورت میں دیکھتا رہا ہے۔

"...بسبب مجھے اپنی آنکھوں پر یقین آیا۔" روپا کہہ رہی تھی۔ "مگر کوٹھی واقعی زمین بوس ہو چکی تھی اور لوگ ادھر ادھر سے دوڑے گئے تھے تو میں خاموشی سے وہاں سے کھٹک لی۔ صحیح طور پر مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ شاید میں یہ سوچ کر گھبرا گئی تھی کہ پولیس والے اور اخباری رپورٹر وغیرہ بھی پہنچ جائیں گے اور مجھ سے طرح طرح کے سوالات کریں گے۔ میں کیا جواب دوں گی؟ مجھے اس تصور سے ہی وحشت ہونے لگی تھی۔ دوسرے شاید میرے تحت اشعار میں یہ خیالی بھی آتا ہو کہ میرے جن دشمنوں نے کوٹھی میں بم رکھا ہو گا وہ کچھ عرصے کے لیے یہی سمجھ لیں کہ میں واقعی مر چکی ہوں جو کچھ بھی ہو...۔ ہرحال سب سے بڑی گھبراہٹ تھائی کی تھی۔ ویسے تو میرا خیال ہے کہ میں خاصے مضبوط اعصاب کی عورت ہوں لیکن اس قسم کی صورتحال میں میرے حواس مختل اور عقل خبط ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں خوفزدہ ہرحال نہیں ہوتی تھی۔ بس یہ فیصلہ کرنے سے معذور ہو گئی تھی کہ فوری طور پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرے ذہن میں بس اوشا کا نام آیا اور میں اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑی۔ اس کا گھر قریب بھی تھا اور چونکہ میں کئی مرتبہ اسے یہاں ڈراپ کر کے گئی ہوں اس لیے مجھے یاد بھی تھا۔ سبھی سے میں نے اس کو وہاں دوڑا دیا تھا کہ جھوم کے اس پاس ہی پکڑ لگاتی رہے اور تم آتے نظر آؤ تو حمیں بالابالا ہی یہاں لے گئے۔ اب تم جو کہو گے میں وہی کروں گی۔" میری طرف دیکھتے ہوئے وہ اتنی دیر میں پہلی مرتبہ مسکرائی۔ پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی۔

"تم میری ہی سنے جا رہے ہو۔" وہ ہنسی۔ "اپنی تو کچھ سناؤ تم پر کیا ہوتی؟ اتنی دیر کہاں لگا کر آ رہے ہو؟"

میں نے مختصراً اسے تمام واقعات سنا دیے۔ پرس، وہیں کام میں نے کوئی تذکرہ نہیں کیا البتہ اتنا ضرور کہہ دیا۔ "تمہارا اصلی دشمن تو ختم ہو چکا ہے البتہ ایک مختصر باقی ہے جس کی طرف سے شاید کبھی تمہیں کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو جائے۔ آج کل میں ہی میں اس کا بھی ہمدست کر دوں گا۔ اس کے بعد تم بیٹھ کے بے فکر ہو جاؤ گی بشرطیکہ تمہارا کوئی نیا دشمن پیدا نہ ہو جائے۔" میں مڑا جاتا تھا کہ اس وقت ہرحال میں اس کی حفاظت کے لیے موجود نہیں ہوں گا۔ میں اسے الوداع کہہ کر جا چکا ہوں گا...۔ لیکن میری اسے یہ بتانے کی امت نہ پڑی۔



کوشش کی تو پولیس والے نے دھم دے کر مجھے روک دیا اور مستعدی سے ہماری طرف بڑھا۔ اسی لمحے روپا گاڑی سے اتر گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے لمبے کے ڈھیرکے دیکھنے لگی۔ پولیس کا تشیل اسے پہچان کو دوڑا دوڑا گیا اور نجانے کہاں سے ایس پی کو بلا لیا۔ اس دوران وہاں موجود تماشائی دیکھنے والوں میں بڑی تیزی سے خبر پھیل چکی تھی کہ میڈم روپا زندہ ہے اور ابھی ابھی کہیں سے آئی ہے۔ لوگ ہمارے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ ایس پی نے آکر سب کو ڈانٹا اور کانسٹیبلوں وغیرہ کو ہدایت کی کہ انہیں پیچھے ہٹائیں۔ اس دوران وہیں سڑک کے کنارے پہلے گراؤنڈ کے قریب چند کرسیاں بھی پولیس والوں نے لا کر بچھا دی تھیں۔

”تشریف رکھیں میڈم!“ ایس پی نے روپا کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن وہ بڑی کامیابی سے سکتے کی سی کیفیت کا اظہار کر رہی تھی اور بت بنی کھڑی تھی۔ ایس پی کے تیسری مرتبہ مخاطب کرنے پر وہ چوکی وہ کہہ رہا تھا ”جیگوان کی بڑی کہا ہے کہ آپ زندہ ہیں.... ہمیں لمبے میں لاش کے کچھ حصے ملے ہیں۔ ان کی بنا پر ہم تو تصدیق کرنے والے تھے کہ آپ بھی...“ اس نے بلند آواز پر چھوڑ دیا اور ایک لمحے کے توقف سے پوچھا۔ ”ویسے آپ تھیں کہاں؟ ہم نے تمام سنوویور سے پتا کر لیا تھا۔“

”میں ایک عزیز کی بیمار پرستی کے لیے پونا گئی ہوئی تھی۔“ روپا نے جھرمجھری سی لے کر پوچھنے کے انداز میں کہا۔ ”لیکن یہ ہوا کیا ہے؟ کیسے ہوا ہے؟“ صدے سے گویا اس کی آواز ٹپٹھی جا رہی تھی۔ ”میں نے تو ریڈیو پر خبر سنی اور دوڑی چلی آئی... میرے ملازمین کا کیا ہوا؟“

”آپ کا چوکیدار تو بچ گیا ہے، بہرحال اسے کافی زخم آئے ہیں۔ وہ اسپتال میں ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک عورت اور ایک اوجڑ عمر سڑک کی لاش ملی ہے اور تیسری لاش کے چند حصے ملے ہیں۔ شاید وہ عورت اس جگہ کے بست قریب تھی جہاں ہم رکھا گیا تھا۔“

”چوکیدار کے علاوہ دو ملازمین اور ایک ماں گھر تھا۔ گویا ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔“ روپا بڑبڑاتی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ اوفاری نہیں کر رہی تھی۔ دکھ واقعی اس پر غلبہ پانے لگا تھا۔ یوں بھی وہ عجیب ہی سی عورت تھی۔ اس کے مزاج کا کوئی پتا نہیں تھا کہ کب کس سمت سے سدھے کی کوئی لہر آئے اور اس کی تمام سوچوں کو بھا کر لے جائے۔

”آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے؟“ ایس پی نے گویا اس کا دھیان ہٹانے کے لئے پوچھا۔

”یہ تو آپ کو معلوم کرنا ہے ایس پی صاحب!“ روپا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت باوقار لمبے میں کہا ”میری تو کسی سے ہمتی نہیں لیکن نہ جانے کون میرے خون کا

”فی الحال ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے پوچھا۔

”فی الحال تو سب سے پہلے اوشا جو کچھ پکا کر لائے گی اسے ہم دونوں چٹ کریں گے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے بعد کچھ سوچیں گے کیونکہ میں نے سنا ہے سوچ بچار میں مدد بھی کافی اہم کردار ادا کرتا ہے۔“

اسی لمحے اوشا واپس آگئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں نے ٹینا اور وکی کو سینڈویچ تیار کرنے پر لگا دیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اتنی دیر میں ہم ٹہریں ہی سن لیتے ہیں۔ مقدی خبروں کا وقت ہو رہا ہے۔“

اس نے دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ لگی پٹائی پر رکھا بجلی کا ایک ریڈیو آن کر دیا۔ سٹیشن ٹیون کرنے کے بعد وہ روپا کے قریب ہی کچین پر آ بیٹھی۔ نیو ریڈر غالباً سرخیاں پڑھ چکی تھی اور اب لگے بندھے اور گھسے پٹے لفٹوں میں انتظامیہ کے کسی اعلیٰ کا ایک روایتی سا وعدہ پڑھ کر منا رہی تھی کہ آنے والے اسٹے برسوں میں فلاں جامع منصوبہ کے تحت فلاں مسئلہ جڑ سے ختم کر دیا جائے گا۔

چند منٹ ہم خاموشی سے بیٹھے اسی قسم کی نیکو اس اور کھوکھلی خبریں سنتے رہے جو مجھے زہر لگتی تھیں۔ پھر اس نے نئی خبر شروع کی۔

آج سہ پہر پالی مل کے علاقے میں معروف و مقبول فلمی اداکارہ میڈم روپا کی کوٹھی ایک ذہراست دھماکے سے زمین بوس ہو گئی۔ دھماکہ اس قدر شدید تھا کہ آس پاس کی دو کوٹھوں کی چار دیواری کو بھی نقصان پہنچا۔ باور کیا جاتا ہے کہ کوٹھی میں موجود افراد میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکا۔ ایک ملازم اور ایک ملازم کی لاش لمبے سے نکالی جا چکی ہے۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق میڈم روپا آج شوٹنگ کے لیے کسی بھی سٹوڈیو نہیں پہنچی تھیں جس کی بنا پر اندیشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ شاید گھر میں موجود رہنے کی وجہ سے وہ بھی حادثے کا شکار ہو چکی ہوں۔

ماہرین نے دھماکے کی وجہ طاقتور بم کا پھٹنا بیان کی ہے۔ لمبے بنانے اور تحقیقات وغیرہ کا کام جاری ہے۔ مزید تفصیلات شاید ہم آپ کو صبح کے لمبوں میں سنا سکیں۔ مقامی خبریں ختم ہوئیں۔

میں نے چٹکی بجاتے ہوئے روپا سے کہا۔ ”لو... یہ مسئلہ تو حل ہو گیا کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ میرے ساتھ اب تم اپنے گھر... بلکہ یوں کہو کہ اپنے کھنڈر کی طرف چلو گی اور اپنی تمام تر اداکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے یوں ظاہر کرو گی جیسے تم پر حیرت و رعبہ کا شدید حملہ ہوا ہے۔“

جب ہم جانے وقوعہ پر پہنچے تو ہجوم کافی کم ہو چکا تھا۔ فائر بریگیڈ اور پولیس والوں کے علاوہ کچھ ہی لوگ نظر آ رہے تھے۔ میں نے لمبے کے ڈھیرکے قریب گاڑی لے جانے کی

حوالے کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "نہیں اب چلتا ہوں۔ کچھ کام اودھورا رہ گیا تھا" اسے غصے کرتا ہے۔ میری والدہ میں اکر تاخیر ہو جانے کو کوئی فکر نہ کرتا۔

بریل کیس اٹھائے میں لفت کے ذریعے نیچے آیا اور کار میں بیٹھ کر اس تہ خانے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں میں نے نشہ اور وکرم کو ان کے ساتھیوں کی لاشوں کے درمیان نیم مرہ چھوڑا تھا۔ وکرم ہی کی گاڑی ابھی تک میرے استھان میں تھی۔

تہ خانے تک واپس نکلتے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اور جب کھڑی کھول کر اندر پہنچا تو منظر تقریباً ویسا ہی نظر آیا جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ صرف ایک فرق پڑا تھا اور وہ یہ کہ نشہ دم توڑ چکا تھا۔ وہ کھستے کھستے دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا اور موت نے اسے راستے میں ہی لے لیا تھا۔ مرنے سے پہلے اسے خون کی تہ بھی آئی تھی۔ وہ احمق اگر دروازے تک پہنچ بھی جاتا تو اسے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ دروازہ تو باہر سے بند تھا۔

وکرم وہیں پڑا اکھڑی اکھڑی سانس لے رہا تھا۔ جہاں میں اسے باندھ کر ڈال گیا تھا۔ میں نے بالوں سے پکڑ کر اسے سیدھا لیا تو اس نے سوئی سوچی سی آنکھیں ہلکے نیم وا کر کے میری طرف دیکھیں۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ کر اس کے چہرے پر جم چکا تھا اور اس کے درمیان اس کی آنکھیں بیوند کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے اسے منہ سے کاغذ کا گولہ نکالا۔

"تمہیں تسمارے... قہر کا واسطہ... مجھے پھونک دو... میں بڑی تکلیف میں ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔ "میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ میں تمہیں بہت سادہ دینے کو تیار ہوں۔ تم اگر کوئی تو میں ہمیشہ کے لیے حک سے باہر چھوڑ دوں گا۔" اس کا لہجہ اس شرابی سے مشابہ تھا جس کا منہ نہ جانے کب سے ٹوٹ رہا ہو اور اب اذیت اس کی ہواشت سے باہر ہو رہی ہو۔

"تم مجھے صرف میرے سوالوں کے جواب دو۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں چھوڑنے پر غور کر سکتا ہوں، وعدہ نہیں کر رہا۔" یہ بتاؤ کہ روپا کی کوٹھی میں ہم کس نے رہا تھا؟

"رشی نے۔" اس نے بلا تاہل جواب دیا۔
"لیکن رشی اور نشہ تو روپا کو اغوا کر کے لا رہے تھے پھر اس میں ہم رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے ان کے بالوں کو ایک جھونکا دیا۔

"یہ بھی نشہ ہی کی تجویز تھی۔" وکرم کراہا۔ "اس نے کہا تھا کہ زیادہ عرصے تک روپا کی گمشدگی سے ملک میں کرنا گرمی کی فضا برقرار رہے گی جو ہمارے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتی ہے" اس لیے روپا کو اغوا کرنے کے بعد اگر ٹائم بم کے ذریعے اس کی کوٹھی کو تباہ کر دیا جائے تو یہی سمجھا جائے گا کہ اس دھماکے میں خود روپا کے بھی پرچے اڑ گئے ہیں اور اگر اس کی تردید کرنے والا کوئی گواہ باقی رہا تو اسے ہم خود ٹھکانے لگا دیں گے۔ ایک بار

بیا سنا بنا ہوا ہے اور کیوں؟ آپ کے علم میں تو ہو گا کہ مجھ پر بارہا قتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیونکر بچتی رہی ہوں۔ یہ اس سلسلے کی سب سے بڑی کوشش تھی۔ اب تو بس یہی کسر رہ گئی ہے کہ یہ نامعلوم لوگ ٹینکوں سے مجھ پر پڑ جائے کر دیں۔" روپا کے لہجے میں طنز جھلک آیا۔

"آپ بالکل چٹا نہ کریں۔" ایس بی۔ "نہ اس کے طنز کو سمجھتے ہوئے کہا۔ "اس بار میں ان نامعلوم بد معاشوں کو پتہ چل سے بھی خود نکالوں گا۔"

"یہی وعدہ کافی عرصہ پہلے ہی آئی جی صاحب بھی مجھ سے کر چکے ہیں۔" روپا نے نہایت سادگی سے کہا۔

"اب فی الحال آپ کا قیام کہاں ہو گا؟" ایس بی نے قدرے کھسیا کر موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"کچھ دن کے لیے کسی ہوٹل میں قیام کروں گی۔" روپا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

مجھے مطلع کر دیتے گا کہ آپ کس ہوٹل میں ہیں۔" ایس بی نے کہا۔ پھر جھپٹاتے ہوئے بولا۔ "اخباری نمائندے بھی کچھ ہی دیر پہلے اپنے اپنے دفتروں کو روانہ ہوئے ہیں۔

ابھی میں دفتر جاؤں گا تو ان کے فون آنے شروع ہو جائیں گے۔" انہیں صرف یہ بتا دیں کہ میں زندہ ہوں۔" روپا نے سرد مری سے کہا۔ "لیکن میں نہ تو کوئی بین دیو کی اور نہ

فی میں کسی سے ہوں گی۔"

"کہاں چلنا چاہیے؟" چند لمحوں بعد میں نے اندھیرے میں پارک کی ہوئی گاڑی کو سڑک پر لاتے ہوئے پوچھا۔ روپا میرے برابر بیٹھی کھولی کھولی نظروں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ اس پر مخصوص اداسی کا دورہ پڑا ہے۔

"تاج چلو۔" اس نے تڑپتی سے کہا۔

تاج محل ہوٹل کی ان دلوں بڑی شہرت تھی۔ راستے میں روپا نے چوتھے ہوئے کہا۔

منظور! مجھے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ صبح پینک کی بھی چھٹی ہے۔ میں وہاں سے فی چیک بک وغیرہ بھی نہیں لے سکیں گی۔"

"پیسوں کی فکر نہ کرو۔" میں نے اس کا سینک کے نیچے پڑے ہوئے برف کیس کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ نوٹس سے بھرا ہوا ہے۔" راہی میں خاصی بڑی رقم چھوڑ آیا ہوں جو

مارے نوٹ کی پراسی بڑھیا ادا کر رہی تھی۔"

"تو کیا تم لڑائی بھڑائی کے علاوہ لوٹ مار بھی کرتے ہو؟" وہ مسکرائی۔ اس کے ذہن سے جلد ہی اداسی کے بالوں پھٹنے لگے تھے۔ اس کا مزاج پناہی مذاقوں کے موسم کی طرح

پل پل ہی کچھ بدل رہا تھا۔

تاج محل میں اسے ایک وی آئی بی سوسائٹ میں پہنچا کر فونوں کی ایک حادی اس نے

جب یہ خبر پھیل جائے گی کہ روپا مر چکی ہے تو پھر رفتہ رفتہ لوگ اسے بھول جائیں گے۔ اس کے مداحوں اور فلم سازوں کو آہستہ آہستہ خبر آجائے گا اور پولیس کی فائلیں بھی بند ہو کر داخل دفتر ہو جائیں گی لیکن اگر معاملہ اس کی گمشدگی کا رہا تو پولیس بھی شور مچاتا رہے گا اور عوامی حلقے بھی شور مچائیں گے۔

”ہوں۔“ میں ہنکارا بھر کر وہ گیا۔ میرے ذہن میں سوچوں کے گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے اور میری رگوں میں لہو کی گردش کچھ تیز ہو چکی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ ”روپا کے بارے میں تمہارا کیا پروگرام تھا؟“ ”میرا کام صرف اتنا تھا کہ آج رات دو بجے روپا کو ہالٹی مندر جزیرے پر پہنچا دوں اور پرنس شومیں سے دو لاکھ پونڈ نقد وصول کر کے واپس آجاؤں۔“ وکرم نے بتایا۔

میں نے گھڑی دیکھی اس وقت پونے بارہ ہو رہے تھے۔

”اور پرنس کا پروگرام کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ روپا کو اپنے ذاتی جہاز میں ڈال کر جزیرے سے پرواز کر کے بھیج کے ہوائی اڈے پر آئے۔ وہاں اپنا فلائٹ پلان دے کر وہ ٹکرا گوجی کی طرف پرواز کر جاتا۔“



میں نے قدرے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا۔ ”یعنی تمہیں روپا کو جزیرے پر جہاز تک پہنچانا تھا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے پوچھا۔ ”کیا جزیرے پر رن دے موجود ہے؟“ ”میں نے صرف سنا ہے کہ جزیرے پر پرنس نے میل ڈیزل میل کے دائرے میں کنکریٹ کی پٹا کھینچوا رکھی ہے جو جزیرے کے لیے رن دے کا کام دیتی ہے لیکن میں نے وہ جگہ دیکھی نہیں۔“ وکرم بولا۔ ”مٹے یہ پایا تھا کہ میں بوٹ میں روپا کو لے کر ڈیزل بجے جزیرے پر پہنچ جاؤں گا اور بوٹ ہاؤس میں داخل ہو کر ٹارچ سے تین سرسبز کنارے کی طرف سٹنل دوں گا۔ کنارے پر ایک کار میں فیوڈیا نامی ایک افریقی میرا انتظار کر رہا ہوگا وہ بوٹ ہاؤس میں آئے گا اور مجھے رن دے تک ساتھ لے جائے گا۔“

”اور بوٹ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میری اپنی بوٹ تو آج کل کوسٹ گارڈز کے قبضے میں ہے۔“ وکرم نے پہلے سے زیادہ کمزور لہجے میں کہا۔ ”آج میں نے اپنے ایک سنگم دوست سے بوٹ مستعار لینے کا بندوبست کرنا تھا۔“ اس نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”میں نے تمہارے ہر سوال کا جواب سچائی اور تفصیل سے دے دیا ہے، کوئی بات نہیں چھپائی۔ اب تو مجھے کھوں دو۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے اور پیشانی پھوڑے کی طرح دکھ رہی ہے۔“ ”تمہاری آنکھوں کے سامنے تو مدتوں سے اندھیرا چھاپا ہوا تھا پو رن دے! اور اس اندھیرے میں تمہیں برے بھلے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا اور جہاں تک تمہاری پیشانی پھوڑے کی طرح دکھنے کا سوال ہے تو حقیقت یہ ہے کہ تم خود معاشرے کی پیشانی پر ایک پھوڑا ہو جس سے سستا اغلاطت ہم رہی ہے۔“ میں نے بے رحمی سے کہا۔ ”مجھے تم بد معاشوں کی اہمیت کے اسی پہلو سے سب سے زیادہ نفرت ہے کہ اپنے سے کمزور پر ظلم دے دینے والے وقت تم اس کی چیخ و پکار اور فریاد سن کر خوشی کے مارے زمین سے دو فٹ اونچے اچھلتے ہو اور جب تمہیں کوئی گردن ٹاپنے والا ملتا ہے تو فوراً ہاتھ جوڑ دیتے ہو، زندگی کی بھینک مانتے لگتے ہو، بد معاشی کرتے ہو تو کم از کم اتنا حوصلہ تو رکھو کہ اپنی جان پر بھی سختی سہہ سکو۔“

میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا سر مضبوطی سے پکڑ کے ایک جھٹکا دیا۔ اس کی گردن گو کہ سناٹہ کی طرح مضبوط تھی مگر اس واؤ کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے منہ کے سرے میں گردن کی مضبوطی کچھ خاص کام نہیں آتی تھی۔ وکرم کو تو کچھ سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور دیرین نفسِ عسری سے پرواز کر گئی لیکن اس عالم میں بھی وہ گویا ایک نلک میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے پوئے بند کیے اور بریف کیس اٹھا کر تہ خانے سے باہر آ گیا۔ دروازہ میں نے ایک بار پھر بولٹ کر دیا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ اگر میں بروقت کوئی بوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو مالی مندر پہنچ کر پرس شو میز سے میری ملاقات ہو سکتی تھی جس کا نام میں نے اپنے نابیدہ دشمنوں کی تازہ ترین فہرست میں درج کر لیا تھا۔

و کرم کے سنگم دوست کا نہ تو میں نے نام پتا پوچھا تھا اور نہ ہی میں اس سے بوٹ
مستعار لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میرے ذہن میں لاشکی باربر کا خیال آیا تھا جس میں مجھیروں کے
مستغفروں جٹ بھی تھے۔ انہ میں سے کئی مجھیروں کے پاس ذاتی لاناچیں بھی تھیں جو مانی
گہری میں استعمال ہوتی تھیں۔ میں نے چند لمحے سوچا پھر گاڑی سٹارٹ کر کے لاشکی باربر
کی طرف روانہ ہو گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں ساحلِ عمان کے علاقے میں پہنچے۔۔۔ فشنگ ہاربر کی حدود سے بہت پسماندہ ہی درود پتھروں کی ایک نیچی ٹھکر بہت چوڑی دیوار بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے گاڑی سڑک سے اتار کر بیٹھ جھے میں دیوار کے قریب کھڑی کی اور دیوار پھاٹک کر پیدل فشنگ ہاربر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا۔ میری جیب کی ایک جیب میں مٹھین پائل اور دوسری میں سائنسبر والا پستول موجود تھا۔

کمزور سی چاندنی میں دور سے پھیپوں کے دُور یوں نظر آ رہے تھے کیسے کسی نے بڑے بڑے سیاہ اور بے ہنگم صندوق بے ترتیبی سے اوپر اوپر پھیلا دیئے ہوں۔ ان سے کافی فاصلے پر بائیں طرف ایک طویل و عریض اور اونچا پلٹ فارم پھینکا ہوا تھا جس پر زرائعاً نوکریاں اور بوریوں کے ڈھیر اور نہ جانے کیا کیا کاٹھ کیا پھیلا نظر آ رہا تھا۔ اسی پیٹ فارم سے متصل بہت بڑا مای خانہ تھا جس کے سامنے بیسیوں رک کھڑے نظر آ رہے تھے۔

یساں سمندر کی بی ایک مخصوص نم آلودی بو پر مچھلیوں کی بو غالب تھی۔ پختہ پیٹ فارم پر میں نے ایک شخص کا ہوا دیکھا جس کے کندھے پر بندوق بھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے کئی بار صحتے صحتے نارج چکا کر اوہر اوہر دیکھا، شاید وہ چوکیدار تھا۔

مچھیروں کے دُش در حقیقت دُش کیا جتنے بھی مکانات تھے ایک مرتبہ ہمیں شوٹنگ کے سلسلے میں یہاں آنے کا اتفاق ہوا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ ان میں سے بیشتر کے اندر جہیز، مکالوں، دہلی سولتیں موجود تھیں۔ مچھیروں میں سے چند ایک سمٹھروں کے آل کار بھی

تھے۔ کسی کھمار جنس میں چلے جاتے تھے اور ٹھات سے رہتے تھے۔
میں ابھی شمس کے درمیان پھیلی ہوئی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں سے ایک میں داخل ہی
ہونے والا تھا کہ عقب سے آتا ہوا ایک شخص میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ غالباً ہنٹ پلیٹ
فارم کی طرف سے آ رہا تھا میں نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ درمیانے قد کا ایک چنٹا ممر کا
سیاہ فام شخص تھا۔ اس کا جسم خوب گھٹا ہوا تھا۔ سر دئی گو کہ خاصی تھنی مگر اس کے جسم پر
صرف بطیر آستینوں کی ایک مٹی سی راست اور ٹخنوں سے اونچی دھوئی تھی۔ پیروں میں ریڑ
کے بوٹ تھے جسکی وجہ سے ریت پر اس کے چلنے سے مدھم سی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی
تھی۔

مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پھیرا ہے۔ میں اس سے سلسلہ کلام شروع کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اس نے خود ہی پوچھ لیا۔ ”کس سے ملنا ہے بابو جی؟“
خلاف توقع اس کے لیے میں نہایت شائستگی اور ملائمت تھی۔

”کسی خاص آدمی سے تو نہیں۔“ میں نے قدم سے ہچکچاہٹ سے کہا اور غیر ارادی طور پر میں کچھ اور آہستہ چلنے لگا۔ میرے ساتھ اس کے قدم بھی ست پڑ گئے۔ قدموں نے توقف سے میں نے کہا۔ ”مجھے دراصل چند گھنٹوں کے لیے ایک بوٹ چاہیے۔“

”یہاں بوٹس کرائے پر تو نہیں ملتیں۔“ اس کے لہجے میں اب واضح طور پر دلچسپی کی جھلک آئی تھی۔

ہیڈکوارٹر میں مقبول ہو تو نہ ہونے والے کام بھی ہو جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مزید گفتگو کرنے سے پہلے یہ جانو کہ تمہارے پاس بوٹ ہے؟“

”کیوں نہیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”چینٹالیس ہاس پارک کی سٹے ماڈل کی بوٹ ہے۔ کیا اب میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ معقول پینٹکس کیا ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے؟“ اس کے کعبے کی شانفکلی پر اب مجھے بجا طور پر حیرت ہونے لگی تھی۔ میرے خیال میں تو پمپھیروں میں سے کسی کو اس حد تک اردو بولتی نہیں آتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شک ہوا کہ خفیہ پولیس کا آدمی تو نہیں لیکن اسی لمحے وہ ایک ہٹ کے سامنے رک گیا۔

”وہ پشیمانی پانچ سو روپے فی گھنٹہ ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”یہ میرا گھر ہے۔“ اس نے ہٹ کی طرف اشارہ کیا، ہاتی ہاتھ اندر چل کر کہتے ہیں،
 تشریف لائے۔“ وہ ہٹ کی طرف مڑا، اسی دوران ایک عورت نے دروازہ کھول دیا۔ قفل
 کی ساڑھی میں سڈول جسم کی وہ عورت کی رنگت کے باوجود بے حد پرکشش نظر آرہی
 تھی۔ اٹھائی تین سال کا ایک بے جھم سا بچہ اس کی ساڑھی پکڑے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

"بس ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تم اندر جاؤ سندی!" بھیرے نے اپنی بیوی کو حکم دیا۔ "میں ذرا بیٹھک میں بیٹھ کر پاؤ صاحب سے بات کروں گا۔"

پھیرا مجھے ساتھ لے بیٹھک میں داخل ہوا۔ یہ ایک اچھا بھلا پختہ دیواروں اور فرش والا کمرہ تھا جس میں معتدل قسم کی کئی کرسیاں اور ایک چائے کی بڑے سلیقے سے رکھی تھی۔

”میرا نام پھنا ہے۔“ اس نے مجھے ایک کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا نام میں نہیں پوچھوں گا، جب آپ مناسب سمجھیں گے تو خود ہی بتا دیجئے گا۔“ پھر جب ہم بیٹھ چکے تو وہ بولا۔ ”البتہ میں یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ کو یوتھس مینڈ کے لیے چاہیے؟ میری یوتھس ایسوسی ایشن اور ایک مرشد بھی ادھر کا مال ادھر کرنے میں استعمال نہیں ہوئی۔“

”کیا میں شکل و صورت سے نہیں سمجھ کر نظر آتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”شکل و صورت سے تو کوئی بھی سمجھ کر نظر نہیں آیا۔“ پھنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کون کہہ سکتا ہے کہ یہ جو شریف شہری امپورٹ ایکسپورٹ کے بڑے بڑے مالیشان دفتر کھولے بیٹھے ہیں، ان کے مال کے ساتھ کیا کچھ جاتا اور کیا کچھ آتا ہے اور تو اور مختلف نوعیت کے وردیوں والوں میں نہ جانے کتنے یہ دھندہ کرنے والوں کے دلی باپ ہیں۔ اس لیے شکل و صورت کی بات تو چھوڑیں۔“

”بہر حال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں اور نہ ہی مجھے اس قسم کا کوئی تجربہ ہے۔“ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ میرے پاس اس وقت اس بریف کیس کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

”اس بریف کیس میں بھی ستر اسی لاکھ کی بیرونی مالاکتی ہے بابو صاحب!“ پھنا مسکرا دیا۔ ”لیکن خیر، ان باتوں کو چھوڑیے، میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ آپ کو اس مقصد کے لیے یوتھس نہیں چاہیے۔ آپ کو جانا کہاں ہے؟“

”ہالٹی مندر۔“ میں نے اسے بتا دینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔

”جواب تو درحقیقت میرا ہاں ہی ہے۔“ وہ سر کھچاتے ہوئے بولا۔ ”یہ ساری بحث و محسوس اس لیے تھی کہ آپ مجھے بھی اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟ اگر آپ مجھ پر بھروسہ کریں تو میں اچھا سا گھنٹی ثابت ہو سکتا ہوں۔ میری بڑے عربی سے خواہش ہے کہ میں کبھی کسی حوصلہ مند آدمی کے ساتھ کسی مہم پر جاؤں۔ معلوم نہیں کیوں یہ شوق اکثر مجھے بے چین رکھتا ہے اور جب سے میں نے نئی بوٹ خریدی ہے تب سے تو یہ بے چینی بہت ہی بڑھ گئی ہے۔ خالی پھیلیوں کی بار برداری کرنے میں مزا نہیں آتا۔ آپ سے گفتگو کر کے نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ درحقیقت مجھے آپ ہی جیسے کسی شخص کا انتظار تھا۔“

”میں نہیں دیا۔“ اس قسم کے مکالمے تو رومانی افسانوں میں ہوتے ہیں۔

میرے تہرے پر کوئی رحمان دیئے بغیر اس نے بات جاری رکھی۔ ”مجھے لگتا ہے کہ میرے اندر کوئی خاص صافیت، کوئی خاص حالت موجود ہے جسے استعمال کرنے کا موقع

نہیں مل رہا۔“ اس کے لمبے میں دبا دبا سا جوش جھلک آیا تھا۔ ”میں نے کیا مجھے اتنی پروا نہیں، ایک بار آپ مجھے اپنے ساتھ کسی بھی کام میں شریک کر کے دیکھیں شاید میں ہمیشہ کے لیے آپ کا اچھا دوست ثابت ہو سکوں۔“

اس کے لمبے میں اخلاص کی جو خوشبو تھی، اس نے مجھے سنجیدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ ”میرے ساتھ چلتے ہوئے اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو اس کے ذمہ دار تم خود ہی ہو گے۔“ میں نے کہا۔

”ارے صاحب اس کی فکر نہ کریں۔“ اس نے ایک نئے جوش سے کہا۔ ”جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں اور آپ سے امید تو نہیں۔۔۔ پھر بھی احتیاط و واضح کردوں کہ مجھے دھوکہ مت دیجئے گا ورنہ میں اتنا بے ضرر بھی نہیں جلتا نظر آتا ہوں۔“

”میں دھوکہ دینا اور دھوکہ کھانا دونوں ہی پسند نہیں کرتا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور میں بھی اتنی سی درخواست ضرور کروں گا کہ مجھے محض لونڈے لہاڑوں میں شمار مت کرنا۔“

”مجھے معلوم ہے صاحب! آپ بڑے گھرے پانی میں ہیں۔ میری آنکھوں نے دنیا دیکھی ہے۔“ اس نے ہلکا سا تھپہ لگایا۔

”تم کیا توقع کر رہے ہو، میں کسی مہم پر جا رہا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”اب مجھے یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں صاحب!“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ ”آپ بے وقت ادھر کا مال ادھر کرنے میں ساتھ لے چلیں، کوئی پروا نہیں۔ بس کچھ ہنگامہ، کچھ بھاگ دوڑ اور کچھ مار دھاڑ ہوئی چاہیے۔۔۔ پھیلیاں ڈھوئے ڈھوئے ان کی مخصوص بدبو سے میرا تو دماغ شل ہو کر رہ گیا ہے اور ہاتھ پیروں کو زنگ لگنے لگا ہے۔“

”میں بہت معمولی سے کام پر جا رہا ہوں پھنا!“ میں نے اس کی دلچسپی اور جوش و خروش کچھ کم کرنے کی کوشش کی۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔ آج آپ کے ساتھ چھوٹے اور معمولی کام پر چلوں گا، کل کو کسی بڑے کام میں بھی دوستی نبھانے کا موقع ملے گا۔۔۔ اسی بات پر ملائیں ہاتھ۔“ اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا، میں نے گرم جوشی سے اس سے مصافحہ کیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس کا ہاتھ اس قدر سخت ہوگا، لوہے کا پنجہ معلوم ہوتا تھا۔ ایک عربی بعد مجھے کسی سے مصافحے کا لطف آیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لو، یہ گھر میں دے دو اور پیوی بچوں سے جو بات کرتی ہے، وہ کر کے باہر آجاؤ، میں باہر کھڑا ہوتا ہوں۔“

اس نے ایک نظر نوٹوں کی طرف دیکھا۔ ”اتنی رقم کی کیا ضرورت ہے، ایک نوٹ کافی

رہے گا۔" اس نے کہا۔

"اب اتنے بھی رضاکار مت بنو۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "جس طرح میں کہہ رہا ہوں، اسی طرح کرتے رہو۔ جیسی میرے ساتھی بن سکو گے۔"

اس نے ٹوٹ لے لیے اور اندر چلا گیا۔ میں ہٹ سے باہر آگیا، چند منٹ بعد ہی وہ بھی آگیا۔ اس کے گلے میں صرف یہ فرق پڑا تھا کہ سر پر ایک لونی لونی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ "تمہیں سردی نہیں لگے گی سمندر میں؟" میں نے پوچھا۔

"آج تک تو کبھی لگی نہیں۔" اس نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا "اور اگر لگی بھی تو بوٹ میں اس کا بندوبست ہے۔"

چند منٹ بعد ہم پختہ پلٹ فارم پر آپہنچے جو کسی بھی بڑے سے بڑے ریلوے اسٹیشن کے پلٹ فارم سے کہیں زیادہ لمبا چوڑا تھا۔ دور سے ہمارے پیوٹے دیکھتے ہی وہاں ٹھٹھا ہوا چونکدار ہمارے قریب آپہنچا۔ اس نے نارنج کی روشنی ہم دونوں کے چہروں پر ڈالی اور چھٹا کو دیکھ کر خوش دلی سے ہاتھ ہلایا اور ایک ایسی زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ سے بالاتر تھی، 'عالمی' چھیدوں کی زبان تھی۔ چھٹا نے بھی اسی زبان میں جواب دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ محض ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کر رہے تھے۔

ہم اس کے قریب سے گزرتے چلے گئے تو میں نے چھٹا سے پوچھا۔ "رات کے اس پہر ہمیں بوٹ میں جاتے دیکھ کر اسے کسی قسم کا شک تو نہیں ہوگا؟" کچھ پوچھے گا تو نہیں؟" چھٹا نے ہلکا سا تھقبہ لگایا۔ "یہ غریب کیا پوچھے گا؟ اس کی ڈیوٹی صرف اتنی ہے کہ کوئی یہاں سے کچھ اٹھا کر نہ لے جانے پائے۔ کوئی کب آ رہا ہے؟ کیا لا رہا ہے؟ کیا لے جا رہا ہے؟ ان باتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ان معاملات میں اسے لب کشائی کی اجازت ہے۔ بعض چھیدے تو ایسے ہیں جن سے کوئٹہ گارڈ والے بھی یہ سوال نہیں کرتے کیونکہ اس قسم کے سوالات کرنے والوں کے ہتھے بند ہو جاتے ہیں۔"

ہم پلٹ فارم کے کنارے تک آپہنچے تھے۔ میں نے دیکھا نیچے چٹاوس موٹر بوٹس قطار در قطار پانی میں دھیرے دھیرے پھولنے کھا رہی تھیں۔ پلٹ فارم کا وہ حصہ جس سے سمندر کا پانی ٹکرا رہا تھا، اس پر قطار میں سینکڑوں بک نصب تھے۔ بوٹس کے رے یا ڈبھروں کے سرے انہی کندوں میں بندھے ہوئے تھے۔ چھٹا مجھے میڑھیوں کی طرف لے گیا اور میڑھیاں اترتے ہوئے بولا۔ "آپ ہمیں کھڑے ہوں، میں بوٹ میںیں لاتا ہوں۔" ایک بوٹ کا رسا وہ بک سے علیحدہ کر چکا تھا، دوسری بوٹس پر چڑھ کر انہیں پھلاتا ہوا وہ اپنی بوٹ تک پہنچا اور اس کے ڈیک ہاؤس میں داخل ہو گیا۔

یہ تقریباً چالیس فٹ لمبی کریم نگر کی ایک خوبصورت موٹر بوٹ تھی جس کے سامنے والے حصے پر دو سکریں کے نیچے ستر کا بندہ اور مونسے مونسے حروف میں اسکا نام "دہانت

شارک" لکھا نظر آ رہا تھا حالانکہ بوٹ کا رنگ کہیں سے بھی دہانت شیم، تھا۔ چند لمحوں بعد میں نے اس کا انجن بیدار ہونے کی آواز سنی۔ آواز کسی درندے کی خرخراہٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی اور محض آواز ہی سے اس کے انجن کی عمرگی کا اندازہ ہوتا تھا۔

بوٹ بڑی صفائی سے دوسری بوٹس کے درمیان سے نکلی اور میڑھیوں کی طرف آگئی۔ چھٹا نے ڈیک ہاؤس کی سب سے اگلی کھڑکی سے سر نکال کر مجھے ایک پرکھنے کا اشارہ کیا اور میں میڑھیوں کے قریب سے گزرتی بوٹ کے ڈیک پر کود گیا۔ جب تک میں ڈیک ہاؤس میں چھٹا کے پاس پہنچا، بوٹ رفتار پکڑ چکی تھی اور دائرے میں گھوم کر سمندر کا سینہ چیرتی گہرے پانیوں کی طرف چل دی۔ میں چھٹا کے قریب جا کھڑا ہوا۔ چھٹا اب کسی آواز نہ بادل کے ٹکڑے کے پیچھے جا چھپا تھا اور جہاں تک بوٹ کی طاقتور ہیڈ لائٹ کی رسائی تھی، صرف وہیں تک سمندر کی لہریں چمکتی نظر آ رہی تھیں۔

"آپ جوتے اتار کر اطمینان سے دیوار گیر بستر پر بیٹھ جائیں۔" چھٹا نے مجھے مشورہ دیا۔ "مابقی سمندر پہنچنے میں ہمیں میںیں مچھلیں منٹ لگیں گے۔"

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ میں واقعی چند منٹ سستائے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد چھٹا بھی واپس کو لوٹ کر کے میرے قریب ہی اس زاویے پر آ بیٹھا کہ وہ سکریں سے اسے سطح سمندر کا منظر دور تک نظر آتا رہے۔

"کوئی بات کریں۔۔۔۔۔ آپ تو بالکل چپ چپ ہیں۔" چھٹا نے دوستانہ سے انداز میں کہا۔

میں اس وقت سوچ بچار میں الجھا ہوا تھا۔ چند لمحوں خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد میں نے کہا۔ "چھٹا! اگر کوئی بے انتہاء دولت مند غیر ملکی شخص جو سرکاری طور پر بھی اہمیت کا مالک ہو، تمہارے ملک کو محض جسم فروشی کا اڈہ سمجھ کر استعفا کرے، صرف دولت کے من پر ہی جسم نہ خریدے بلکہ طاقت کے من پر بھی اپنی من پسند لڑکیوں اور عورتوں کو اتھو لے اور اپنے ساتھیوں سمیت انہیں برصغیر اور زندگی کا نکتہ بنانے کے بعد ان کی لاشیں سڑکوں یا پارکوں میں پھکوا دے اور اس کے بارہو ٹیک نام رہے، اس کے لیے تم کیا سزا تجویز کرتے ہو؟"

اس نے ایک لمحوں کے لیے میری آنکھوں میں جھانکا اور کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں اس کے لیے قتل کی سزا تجویز کروں گا۔"

بڑی گرم جوشی سے مسکراتے ہوئے اس نے دھوٹی کی ڈب میں ہاتھ ڈالا اور چھوٹا سا ایک اسپرنگ دار چاقو نکالا۔ اس پر موجود ایک چھوٹا سا ٹین دباتے ہی سانپ کی زبان کی طرح جھٹکنے سے اس کا چار، پانچ، اچھ لبا دو دھاری پھل دستے سے باہر آگیا۔ چھٹا نے ڈیک ہاؤس کی زرد روشنی میں لڑکی پھل کی جھلملاہٹ کا جائزہ لیتے ہوئے خودکامی کے سے انداز

ہیں کہا۔ "ایک منٹ بھی نہیں گئے محکمہ۔" دفعتاً اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔
"مالتی مندر پر ایک افریقی شہزادے کا محل ہے، جہاں وہ کبھی کبھی آکر قیام کرتا ہے۔ آپ کا اشارہ اس کی طرف تو نہیں؟" اس نے پوچھا اس کی نگاہ سی پیشانی پر شکنیں ابھرتی تھیں۔

"بالفرض میرا اشارہ اسی کی طرف ہو تو کیا تم میرے ساتھ چلنے کا ارادہ ترک کر دو گے؟" میں نے مکرراتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ فوراً بولا۔ "ایک یار دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا، سو بڑھا دیا۔ اب ہاتھ کھینچنے کا کیا سوال۔ اب تو مقابل شہزادہ ہو یا شہنشاہ، جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔"

اس لمحے وہ مجھے ہوا کھرا اور جی دار آدمی معلوم ہوا۔ اس کے لیے میرے دل میں پسندیدگی کی لہر قوی ہو گئی۔ اسی اثناء میں دور کہیں تاریک سمندر کے سینے پر کچھ روشنیاں جھللاتی دکھائی دینے لگی تھیں۔

"یہ روشنیاں کیسی ہیں؟" میں نے پھنسا سے پوچھا۔

"یہ اسی شہزادے کے محل وغیرہ کی روشنیاں ہیں۔" چھنا نے جواب دیا۔ "میں کبھی جزیرے پر گیا تو نہیں لیکن سنا ہے کہ وہاں کئی طاقتور جزیئر پر مشتمل ایک چھوٹا سا پاور ہاؤس بھی موجود ہے جس سے شہزادے نے اپنی ضرورت کی جگہوں پر روشنی کا انتظام کر رکھا ہے۔ درختوں وغیرہ کی اوٹ کی وجہ سے بعض اوقات یہ روشنیاں زیادہ دور سے نظر نہیں آتیں۔"

روشنیاں لمحہ بہ لمحہ واضح تر ہوتی گئیں بالآخر ہم جزیرے تک پہنچے۔ بوٹ ہاؤس کی تلاش میں ہم نے جزیرے کے گرد چکر لگانا شروع ہی کیا تھا کہ ہمیں چند فرلانگ کا فاصلہ طے کرتے ہی وہ نظر آیا۔ یہ دراصل سمندر میں کچھ فاصلے تک بڑھی ہوئی کنکریٹ اور پتھروں کی ایک کشادہ سرنگ سی تھی جس میں اس وقت روشنی تھی۔ چھنا نے بڑی مہارت سے بوٹ اس میں داخل کر کے انجن بند کر دیا اور چند لمحے بعد بوٹ ہلکے سے دھچکے سے رکت گئی۔ بوٹ ہاؤس میں اس جیسی دو تین بوٹیں برابر برابر کھڑی کرنے کی گنجائش تھی اور کنارے پر ان کی رسیاں یا زنجیریں باندھنے کے پھول بھی لٹبے تھے اور ان سے آگے ایک چوٹی دروازہ تھا جس سے گزر کر جزیرے پر پہنچا جاسکتا تھا۔ یہ دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بوٹ ہاؤس میں اس وقت کوئی اور بوٹ موجود نہیں تھی۔

میں نے چھنا سے تارج لی جو ڈیک ہاؤس ہی میں موجود تھی۔ دھرم نے مجھے بتایا تھا کہ تارج سے تین مرتبہ سنٹل دینے پر فیروشیانا نامی ایک شخص "آئے گا جو بوٹ میں آنے والوں کو پرنس شومبی کے جہاز تک لے جائے گا۔ میں نے چھنا کو تکہ مار کر اسے تیار رہنے کا اشارہ کیا اور تارج کا رخ کنارے کی طرف کر کے اسے تین مرتبہ بلایا بھلاؤ۔

تیسری مرتبہ میں نے تارج بھائی ہی تھی کہ ساحل کی تاریکی سے ایک ہیولہ بوٹ پر کود آیا۔ بوٹ کنارے سے کافی فاصلے پر تھی اور ہیولے کی جسامت دیکھتے ہوئے مجھے اس کا بوٹ پر کود آنا کسی حد تک ناقابل یقین لگا کیونکہ وہ پورا ہاتھ کا ہاتھ تھا۔ چالیس فٹ لمبی بوٹ بھی اس کے وزن سے ڈول کر رہ گئی تھی۔

وہ ہیولہ دھپ دھپ کرتا سیدھا ایک ہاؤس میں آگیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اسے دیکھ کر چھنا کا رد عمل کیا ہوا۔ البتہ میں ضرور کئی لمحے کے لیے دم بخود رہ گیا۔ وہ دراصل مرد نہیں عورت تھی اور اتنی نیم نیم عورت میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ اس کا قد کم از کم چھ فٹ، رنگ اٹنے لڑے کی طرح سیاہ، آنکھیں انکارے کی طرح سرخ اور صورت انتہائی بھیاں تھی۔ افریقی معیار حسن سے شاید اس کے عین نقص مراد یہ تھا عاشقان رہے ہوں لیکن کم از کم میں نے خواب میں بھی اتنی بھیاں شکل نہیں دیکھی تھی۔ پہلی نظر میں وہ عورت نہیں کسی الف لیوی جن کی مادہ معلوم ہوتی تھی۔ موٹے موٹے بوٹ جینس کی طرح لبوڑا منہ اور جینس ہی کے دانٹوں جیسے باہر کو جھانکتے ہوئے چوڑے چوڑے دانت، اس کی بھنویں کسی گھوڑ پھان کی پٹی ہوئی مونچھوں سے بھی زیادہ موٹی تھیں اور پلکیں جیسے تھی ہی نہیں۔ پلکوں سے محروم سرخ انکارے کی آنکھیں مینڈک کی آنکھوں کی طرح باہر کو ابھری ہوئی تھیں۔ پیشانی سے کافی اوپر تک ہال نہیں تھے۔ سر کے وسط سے ہال شروع ہوتے تھے اور وہ بھی بھل بھل کی لون کی طرح کھوپڑی سے چپکے ہوئے تھے۔

اس کے بازو شتیر اور ہاتھ ہلچے سے مشابہ تھے۔ اس نے اسکرٹ نما جو ایک ڈھیلا ڈھان لبادہ پن رکھا تھا، وہ محاورہ نہیں جھٹکتا بڑے سائز کے ایک خیمے کے برابر تھا۔ اس کے پیروں میں چوڑے کے بوٹ تھے جو یقیناً کسی کاریگر نے خاص طور پر اس کے لیے تیار کیے ہوں گے۔ کم از کم بعدوستان کی کسی دکان پر اس کے سائز کے ہونے دستیاب نہیں ہوں گے۔

اس کا سر تاج جازہ لے کر میں نے چھنا کی طرف دیکھا، وہ دیوار گیر بستر پر بیٹھا ایک تک اسی عفریت زادی کی طرف دیکھ رہا تھا مگر مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں خوف کی جھلک کی بجائے دلچسپی کی چمک تھی۔

میں ایک بار پھر عورت کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس دوران متلاشی نظروں سے ڈیک ہاؤس کے گوشے گوشے کا جائزہ لے رہی تھی، پھر اس کی نظر مجھ پر موٹکڑ ہو گئی، میں اس سے چند فٹ کے فاصلے پر ہی کھڑا تھا۔

"زنی کہاں ہے؟" دفعتاً ڈیک ہاؤس میں جیسے تقری گھنٹیاں گونج اٹھیں۔ سوال انگریز میں کیا "یا تمہارا اور آواز ایسی ترنر رہی تھی کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اس عفریت

کی جانوں کی کہانی دی اور انگریزوں کا تختہ الٹ کر راتوں رات پرنس شومی کے دادا کو تخت پر بٹھایا اور مشہور کر دیا کہ وہ شہزادے ہیں اور نگارا گوجی کے تخت کے اصل وارث ہیں۔

"تو اسی لیے پرنس شومی تمہاری شوہریت کے بوجھ تلے کرا رہا ہوگا۔" میں بڑبڑایا۔
"اور شاید اسی بے رحمان شادی کے رد عمل میں وہ اتنا بے راہ رو اور انسانی خواہشات کے معاملے میں مطلق العنان ہو گیا ہوگا۔" لیکن فوراً ہی میں نے سوچا کہ اس کے حالات میں ان لڑکیوں کا تو کوئی قصور نہیں تھا جو ۲۱ طرح کسی کے ہاتھ کی بھی نہیں تھیں مگر انہیں بھی نہ صرف اس کی اور اس کے ساتھیوں کی بربریت و حیوانیت کا نشانہ بننا پڑا تھا بلکہ زندگی سے بھی ہاتھ دھوئے پڑے تھے۔

میری بڑبڑاہٹ عفریت زادی کی سمجھ میں نہ آئی تو وہ کچھ اور آگے کو آگئی۔ "کیا کہا تم نے؟" اس نے ایک بار پھر مسکراتے کی کوشش میں اپنی شکل کو اور زیادہ بھیاں بٹھایا۔
"کچھ نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے اتنی باتیں کر ڈالیں اپنے اور پرنس کے متعلق سب کچھ بلا کم و کاست بتا دیا۔ اب تم بھی بتا دو کہ لڑکی کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟" اپنی دانست میں وہ بڑی لگاوت سے مسکرائی۔ "میں صرف اس کا چہرہ تھوڑا سا بگاڑ کر اسے سمجھانا چاہتی ہوں کہ دولت کے عوض اپنا آپ نہیں بچا کرتے۔"

"اور فرض کرو کہ وہ اپنی مرضی سے نہ تھی ہو" اسے اغوا کر کے لایا گیا ہو تو پھر تم کس کا چہرہ بگاڑو گی؟" میں نے نفی سے پوچھا۔

"اغوا کرنے والوں کا۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ "اب تم کو مجھے کہ اصل ذمہ دار تو پرنس ہوتا ہے تو تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ اس کا چہرہ تو میں اکثر بگاڑتی ہی رہتی ہوں۔ آج بھی وہ باہر کہیں اپنے کسی ٹھکانے پر لڑکی کا انتظار کرتے کرتے باغ میں ہو کر جب گھر واپس آئے گا تو میں خوابگاہ میں کھونسوں اور لاتوں سے اس کا استقبال کروں گی۔"

"خیر... یہ تمہارا گھریلو معاملہ ہے کہ تم اس کا استقبال کس طرح کرتی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے حال تمہاری گفتگو سے مجھے یہ سبق ملا ہے کہ شہزادہ بن کر بھی انسان کو بیوی کے معاملہ سے نجات نہیں۔" پھر میں یک لخت بہت زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔
"تاہم تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس بوٹ پر کوئی لڑکی نہیں ہے۔" میں نے ہی ہم کسی پرنس شومی وغیرہ سے ملنے آئے ہیں۔ ہمارا دھندہ تو ادھر کا مال اور اس کے گھر ہم اپنے ایک ساتھی کی تلاش میں ہیں جو لڑکی نے کر کہیں عاتب ہو گیا ہے۔"

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" عفریت زادی کی آواز سے یک لخت ترنم غائب ہو گیا اور تیوری چڑھ گئی۔ "اگر تم وہی آدمی نہ ہوتے جس کا پرنس کو انتظار ہے تو تم

زادی کے طلق سے برآمد ہوئی ہوگی۔ لہجہ اتنا شستہ اور لفظ اتنا بے عیب تھا کہ مجھے کالج کے زمانے کی اپنی پروفیسر موہنی شام رام یاد آئیں جنہوں نے آکسفورڈ میں تعلیم پائی تھی اور اب تک وہاں ٹاپ کرنے والی تین ہندوستانی طالب علموں میں سے ایک تھیں۔

"لڑکی؟" میں نے بے مقصد سے لہجے میں دہرایا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید وکرم نے کسی غلط فہمی کی بنا پر یا پھر ہوش و حواس ٹھکانے نہ ہونے کی وجہ سے مجھے بتا دیا تھا کہ فیروشا کوئی مرد ہے ورنہ درحقیقت وہ یہی عورت ہوگی۔

"تم فیروشا ہو؟" میں نے سنبھل کر پوچھا۔

"فیروشا کو تو میں یاد ہے کہ اس کے کمرے میں ڈال آئی ہوں۔" اس نے ناخوشوار لہجے میں کہا۔ "اس سے یہ معلوم کرنے کے لیے مجھے اس کے دو دانت توڑنے پڑے کہ آج رات پرنس کے لیے کچھ لوگ بوٹ میں ایک نئی لڑکی لے کر آ رہے ہیں جس کے لیے پرنس دیوانہ ہوا پھر رہا ہے۔ مجھے شام ہی سے پرنس اور فیروشا کی پراسرار سی حرکات و سکنات دیکھ کر شک پڑ رہا تھا کہ ایک بار پھر وال میں کچھ کالا ہے۔ اس لیے میں نے پرنس کے گھر سے نکلتے ہی فیروشا کو دیوچ لیا تھا۔"

"مگر خاتون تم ہو کون؟" میں نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔ میرے حواس اب صحیح طور پر کام کرنے لگے تھے۔

"بہائی نس لیڈی سنٹالا آف نگارا گوجی۔" اس نے بڑے وقار سے کہا۔ "پرنس شومی کی بیوی... مجھے بہت عرصے سے خبریں مل رہی تھیں کہ نگارا گوجی کی لڑکیوں سے دل بھر جانے کے بعد پرنس نے ہندوستان کو اپنی عیاشیوں کا مرکز بنا لیا ہے۔ اس لیے اس مرتبہ وہ نگارا گوجی سے آئے گا تو میں بھی اس کے ساتھ چلی آئی۔ میں اب مزید برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ میچوں میری طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھے اور دنیا بھر کی نت نئی لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارتا پھرے۔ مجھے معلوم ہے کہ شہزادوں وغیرہ کی بیویوں کے لیے ان کے شوہروں کی عیاشی کی خبریں کسی خاص اشتعال کا باعث نہیں بنتیں کیونکہ وہ خود بھی اس قسم کی سرگرمیاں شروع کر کے اپنے اشتعال کا کھلمکھٹ لیتی ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں اس قسم کی جوالی کارروائی بھی نہیں کر سکتی۔ اچھے بھلے مرد مجھے دیکھ کر چپکلیں مارتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں۔ شروع شروع میں تو خود پرنس کا یہی حال ہوتا تھا۔"

"پھر اس نے آپ سے شادی کیسے کر لی؟" بے ساختہ میری زبان پر یہ سوال آ گیا۔

"کیونکہ میرے خاندان کی بدولت ہی اس کے خاندان کی بادشاہت قائم ہے۔" لیڈی سنٹالا یعنی مسز شومی نے نخوت سے جواب دیا۔ "اور انہیں شاہی خاندان کا رتبہ بھی میرے ہی آباء اجداد نے دلایا ہے ورنہ یہ لوگ تو معمولی لوہار تھے۔ میرے دادا برٹش آرمی میں کمانڈر جنرل تھے۔ انہوں نے بغاوت کی اپنے خاندان اور وفادار ساتھیوں میں سے سینکڑوں

ابھی بوٹ ہاؤس میں آکر نہ رکھتے، ٹارچ سے تین مرتبہ سٹکل نہ دیتے اور فیوشیا کا نام نہ لیتے۔ غیر۔ تر مت بتاؤ میں خود دیکھ لیتی ہوں۔"

برہائی نس بیڈی مثلاً آف نکارگوچی یک لخت بھری ہوئی ہتھنی بن گئی۔ اس نے وہ دیوار گیر بستر الٹ دیا جس پر چھنا بیٹھا تھا۔ چھنا کچھ دور جاگرا اور ایک کھنی کے من وہیں لیٹ گیا۔ اس کے تاثرات میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ وہ اب بھی اسی طرح عفریت زادی کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی دلچسپ فلم چل رہی ہو۔

مجھے سے پھنکارے ہوئے وہ ہر چیز کو اٹھا کر ادھر سے ادھر پھینکتے لگی۔ چند ہی لمحوں میں اس نے کینن کی ہر چیز کو تھم دیا۔ کر کے رکھ دیا۔ عجیب الٹے دماغ کی عورت تھی۔ بوت میں ٹکی کا کوئی نام و نشان نہ پا کر اس کا غصہ بھڑک اٹھا۔ بونے کے بھائے بھڑکتا جا رہا تھا۔ "برہائی نس!" بالآخر میں نے عقب سے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے طریقہ لیجے میں کہا۔ "ٹکی ہر حال لڑکی ہوتی ہے، ٹکڑی کا کوئی ٹکڑا نہیں ہے کوئی حد رہے میں پھینک کر اوپر سے اس پر کاٹھ کبڑا ڈال دیا جائے اور نہ ہی اسے جیب میں چھپایا جاسکتا ہے۔ اب آپ یہ بڑا ٹنگ ختم کریں اور گھر جا کر آرام سے سوئیں۔"

"کواس مت کرو۔" وہ غرائی اور نہایت غیر متوقع طور پر اس نے غومتے ہوئے مجھے اٹنے ہاتھ کا تمیز رسید کر دیا۔ کچھ دیر پہلے اس کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ان کے لیے پتلوں کی تشبیہ غلط نہیں آتی تھی۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ میرے رخسار اور سبب پر کسی نے تلچہ پوری قوت سے گھما کر مار دیا ہے۔ میں چونچ دیوار سے جا کھرایا اور آنکھوں کے سامنے پھیلنے لگی تارکی سے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اب میں چکرا کر گر جاؤں گا لیکن میں نے فوراً ہی سانس روک کر سر جھٹکا پھر یوگا کے ایک خاص انداز کے تحت کئی گھنٹی مہری سانس لیں۔

وہ گھونٹہ بند کیے میری طرف آ رہی تھی۔ "سچ بچ بتاؤ کہ ٹکی کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟" اس کی آواز اب نہایت کمرہ محسوس ہو رہی تھی۔ "اس بوٹ میں ضرور کہیں کوئی خفیہ خانہ ہے، جلد بتاؤ وہ کہاں ہے۔ دلال کے بچے!" اس نے آکر بائیں ہاتھ سے میرا گریبان پکڑ لیا اور دایاں ہاتھ گھونٹنے کی شکل میں میرے چہرے کے سامنے لڑائے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا ایک ہی گھونٹا آدمی کی شکل بگاڑ سکتا تھا۔

اب میرے اندر مجھے کا اہال اٹھ رہا تھا جو میری کپٹیوں میں موٹکڑا رہا تھا۔ میری پیشانی گھڑی کی طرح ٹک ٹک کرنے لگی تھی۔ شاید اس کے وسط میں کوئی رگ پھڑک رہی تھی۔ اس عفریت زادی نے مجھے خاموش پا کر گھونٹہ بلند کیا اور جیسے ہی اس کا بازو نیچے آنے لگا میں نے اسے ہاتھ پر روک لیا۔ اس کی کلائی پوری طرح تو میری گرفت میں نہ آئی لیکن جتنی آتی تھی اتنی ہی کافی تھی۔ میں نے اسے اس طاقت سے گرفت میں لیا تھا

اس سے ایک بار تو اس عفریت زادی کو بھی گمان گزرا ہو گا کہ اس کی کلائی شاید کسی آنکھ کی تھپتھپ میں پھنس گئی ہے کیونکہ میں نے اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھے تھے۔

دائیں ہاتھ سے میں نے اس کے پیٹ سے ذرا اوپر ایسے مجھے پر پوری طاقت سے گھونٹہ رسید کیا جہاں عام آدمی کو اگر اس طرح گھونٹہ پڑ جاتا تو وہ خون ٹھوکتے ہوئے وہیں پھرت کر رہ جاتا، وہ ہتھنی کی پچی بھی اپنی جگہ سے اچھل پڑی اور اس کے جوتوں کی دھنک کینن میں گونج کر رہ گئی۔ اس نے ابکائی سی ٹی اور پہلے سے زیادہ غصہ تک ہو کر اپنی کلائی چمڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

دوسرا گھونٹہ میں نے اس کی کینٹی پر رسید کیا۔ وہ لڑکھائی مگر فوراً ہی سر جھٹک کر اس طرح سنبھل گئی جیسے میں نے سنبھالا نیا تھا۔ اس عورت کی کلائی قابو میں رکھتے ہوئے مجھے دائیں پیٹ سے آگے لگا تھا۔ اس کا پایاں بازو آزاد تھا۔ میرا گریبان اس کے ہاتھ سے جھوٹ چکا تھا۔ یہی بازو گھما کر اس نے میرے منہ پر پھپھر رسید کرنا چاہا لیکن میں بروقت جھک گیا۔ اس کا ہاتھ چونچ دیوار پر پڑا اور وہ ہبلا کر رہ گئی۔

وہ پیچھے کو لڑکھائی۔ اگر میں نے اس لیے اس کی کلائی نہ پھوڑ دی ہوتی تو میں بھی اس کے اوپر جا کرتا۔ وہ کاٹھ کھاڑ پر اچھڑ ہونے کے بعد بھی اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور اپنا ہوا سا سر بار بار جھٹک رہی تھی مگر پھر وہ بے بسی سے سکت ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی جیسے کائنات بھی سامت ہو گئی۔ اس کی اچھل کود اور زور آزمائی سے جیسے بوٹ پر بھونچال آیا ہوا تھا۔

گوشت کے اس پہاڑ کو غصے میں ایک ٹھوکر رسید کر کے میں مڑا تو درمیانی دروازے میں چھٹا کھڑا نظر آیا۔ وہ حسین آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"واہ صاحب داد!" وہ مسحور سے لہجے میں بولا۔ "جی تو عورت تمہارے زیر کرنا آپ جیسے شہ زوروں ہی کا کام تھا۔ وہ تو قریب آنے کی امت نہیں پڑ رہی تھی۔ ایک بار سوچا کہ پٹیوں میں چاٹو گھونپ کر اس کا کام تمام کر دوں۔ پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ شاید آپ اس کا مارا جانا پسند نہ کریں۔ اگر اسے ہلاک ہی کرنا ہوتا تو غالباً آپ خود ہی کوئی ہتھیار استعمال کر لیتے۔" اس نے یقیناً میری جیکٹ کی جیبوں کے ابھاروں سے ریوالتوں کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا۔

"مل کر اسے کسی نہ کسی طرح ڈیپ کے کنارے تک لے چلتے ہیں۔" چھٹا نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "ڈیک کے کنارے سے ساحل تک میں تھمت لگا دوں گا اور اسے تختے پر لڑھکا دیں گے۔ قسمت اچھی ہوئی تو کنارے پر پہنچ جائے گی ورنہ پانی میں ڈبکیاں کھا کر خود ہی بوش میں آجائے گی اور نکل جائے گی۔"

ہم نے یہی طریقہ استعمال کیا، بمشکل تمام اسے کھینچے ہوئے ڈیک کے کنارے تک

لے، پھر تھکے رکھ کر اس پر لڑھکا دیا۔

میں نے اپنا بریف کیس اور چھانے کا بیج منہال اور ہم بھی تختہ ہی کے ذریعے کنارے پر اتر آئے۔ چھانے بوٹ کو رسی کی مدد سے پل سے باہر دیا تھا۔ جزیرے پر پہنچ کر چند منٹ کی تلاش کے بعد ہی ہمیں وہ گاڑی مل گئی جس میں سزشومی یہاں آئی تھی۔ یہ سفید رنگ کی ایک کھوکھلی آٹر تھی۔ سزشومی ایسی ہی گاڑی میں سفر کر رہی تھی۔ بند بھستروالی گاڑی میں داخل ہونا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

سزشومی کو ہم نے وہیں پرا رہنے دیا اور خود گاڑی لے کر اندازاً اس پختہ پٹی کی تلاش میں چل پڑے جو دن دسے کا کام دیتی تھی۔ میں نے وقت دیکھا پونے دو بج رہے تھے۔ وکرم نے بتایا تھا کہ اسے روکا کو لے کر دو بجے جزیرے پر پہنچنا تھا، گویا ہم وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئے تھے جس کا مطلب تھا کہ ہم اطمینان سے دن دسے تلاش کر سکتے تھے۔

دن دسے تلاش کرنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہم ٹکڑیٹ کی ایک پختہ پٹی پر آپہنچے تھے جو ہمارے دائیں بائیں دور تک پھیلی نظر آرہی تھی۔ میں نے گاڑی روک کر دونوں طرف نظر دوڑائی، طیارے کا کیس نام و نشان نہیں تھا۔ ایبٹ سڑک دونوں طرف سے دائرے میں گھوم رہی تھی اور اس دائرے کے درمیان بھی چونکہ بھاڑیوں اور اونچے اونچے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، اس لیے یہ دیکھنا مشکل تھا کہ سڑک کے گھماؤ سے آگے کیا ہے۔ میں نے بغیر کسی اندازے کے گاڑی دائیں طرف موڑ دی۔ دن دسے کا ٹیم دائرہ طے کرتے ہی مجھے طیارہ نظر آیا۔ تاروں کی مدد ہم روشنی میں اس کے وہ حصے چمک رہے تھے جن پر پینٹ نہیں تھا اور اس کے دونوں طرف سرخ چٹیاں جل بجھ رہی تھیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر فوراً بریک لگا دی کیونکہ طیارے کا رخ ہماری طرف تھا اور ہیڈ لائٹس کی روشنی اس کے پیلوں پر پڑ چکی تھی اور طیارے میں موجود افراد یقینی طور پر ہماری گاڑی کو دیکھ چکے تھے۔

○

قرآنہ لائبریری ڈیولپمنٹ کارڈنگ سٹر

تکونل چٹکے، کتابت، ڈیولپمنٹ

قرآنہ لائبریری ڈیولپمنٹ کارڈنگ سٹر

تکونل چٹکے، کتابت، ڈیولپمنٹ

میرا ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر اور دوسرا جیب میں موجود مشین ہاتل پر تھا۔ چند لمحوں میں گزر گئے۔ پھر میں نے گاڑی دن دسے سے ہٹا کر بھاڑیوں کے قریب جا روکی۔ اس دوران طیارہ بدستور سکوت میں ڈوبا رہا۔ طیارے کے ساتھ المونیم کی ہلکی سیڑھی لگی ہوئی تھی اور میری نظر اسی پر تھی۔ میں نے گاڑی کی لائٹیں بجھا دیں البتہ انجن اسٹارٹ رہنے دیا۔

چند لمحوں بعد میں نے طیارے کی سیڑھی پر ایک ہیولا نمودار ہوتے دیکھا۔ یہ چھوٹے جسم کا کوئی دروازہ کھل گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس بھی نظر آ رہا تھا۔ سیڑھی سے اتر کر وہ بڑے مطمئن اور پروقار انداز میں گاڑی کی طرف آئے گا۔ وہ قریب آگیا تو میں نے دیکھا وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک دلا پتلا اور لمبا افریقی لوجوان تھا۔ اس کے دھاروں کی ہڈیاں بد نمائی کی حد تک ابھری ہوئی تھیں، تاہم موٹی موٹی آنکھیں خاصی دلکش تھیں۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی تاریخ بھی موجود تھی، اس لیے جب اس نے قریب آکر اچانک میرے چہرے پر روشنی ڈالی تو میں گڑبڑا سا یا لیکن ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے زیادہ وہ خود گڑبڑا گیا ہے۔

”وکرم کہاں ہے؟“ اس نے اظہار ہی طور پر پوچھا۔ اس کی انگریزی میں قرآنیشی لب و لہجے کی جھلک تھی۔

”مجھے وکرم نے ہی بھیجا ہے۔“ میں نے سنبھل کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”فیوٹیا کے خیر تم یہاں کیسے آپہنچے؟“ اس نے چھانے کی طرف ایک نظر دیکھ کر گاڑی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ میری بیوی کی گاڑی تمہارے پاس کیسے نظر آ رہی ہے؟“

اب تعارف کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا کہ وہ پرنس شومی ہے۔ یہ تصور کر کے مجھے عجیب سا احساس ہوا کہ بیوی کے ساتھ اس کی جوڑی کیسی نفیسی ہوگی۔ دھول اور چھڑی ہی کی مناسبت تھی ان میں۔ آہ بچاؤ شومی! ایک لمحوں کے لیے مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی لیکن اس کے کراوت یاد کرتے ہی اس ہمدردی کی جگہ غصے نے لے لیا۔

”تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی تھی۔“ میں نے اب نہایت پرسکون لہجے میں کہا۔ ”آپ کی

نیوی نے فیروزیا کو قابو کر کے اس سے معلوم کر لیا تھا کہ آج آپ کے لیے کوئی تحفہ پہنچے والا ہے، اس لیے سانس پر فیروزیا کے بجائے وہ خود ہی ہمارے استقبال کے لیے موجود تھی۔

”اوہ... یہ تو بہت برا ہوا۔“ شوہن کی آواز سے میں نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں ایک لمحے کے لیے کھڑکی بنا آگئی تھی۔ اگر اس کی رنگت اتنی سیاہ نہ ہوتی اور وہاں روشنی کچھ زیادہ ہوتی تو شاید اس کی رنگت کا تخیل بھی نظر آجاتا۔

”مجبوراً ہمیں ان کے ساتھ تھوڑی سی بدتمیزی کرنی پڑی۔“ میں نے معذرت خواہانہ نیچے میں کہا۔

”کیا تم نے اسے گولی مار دی؟“ اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا لیکن اس لہجے کی تہ میں ایک ہلکی سی امید بھی پنہاں تھی۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہم نے انہیں صرف بے ہوش کیا ہے، اسی لیے ان کی گاڑی ہمارے پاس نظر رہی ہے۔“

اس نے سب یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ”تم اسے بے ہوش نہیں کر سکتے، تم نے یقیناً کوئی ہتھوڑا استعمال کیا ہوگا۔“ اس نے خیال ظاہر کیا۔

”اس بحث کو چھوڑیے کہ ہم نے کیا استعمال کیا اور کیا نہیں۔“ میں نے قدرے بڑاری سے کہا۔ ”اور کام کی بات کیجئے۔ کیا آپ اب بھی لڑکی کو لے کر افریقہ کی طرف پرواز کرنے کے لیے تیار ہیں؟“

”اب تو یہ اور بھی ضرور ہی ہو گیا ہے۔“ اس نے خودکلامی کے سے لہجے میں کہا۔ ”جب تک ستمیلا کا ٹھکانہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا، میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا۔ لڑکی کہاں ہے؟“

”بوٹ ہی میں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ رقم لے کر آئے ہیں؟“

”ہاں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سوٹ کیس قدرے بند کر کے مجھے دکھایا۔ ”لیکن تم لڑکی کو بوٹ میں کیوں چھوڑ آئے ہو؟ وہیں آس پاس ستمیلا بھی ہوگی۔“

”ہم نے احتیاطاً ایسا کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اپنی بیوی کی آپ فکر نہ کریں، وہ ساحل سے کافی فاصلے پر ہیں اور کم از کم ایک گھنٹے تک ہوش میں نہیں آئیں گی۔ لڑکی بھی بے ہوش ہے۔ آپ اسے اسی گاڑی میں ڈال کر لے آئیے گا۔ ہم وہیں سے رخصت ہو جائیں گے۔ تشریف رکھئے۔“ میں نے ہاتھ بڑھا کر پھیلا دروازہ کھولا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا، پٹ کر طیارے کی طرف دیکھا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سوٹ کیس اس نے اپنے پیروں کے قریب رکھ لیا۔ میں گاڑی کو رن دے دے پر لے آیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں آنے کا صحیح راستہ کونسا تھا، میں نے گاڑی کو یو ٹرن دے

کر راتوار بڑھا دی۔ پرنس نے راستہ بتانے کی کوشش نہیں کی۔ میں یا تو صحیح راستے کی طرف جا رہا تھا یا پھر پرنس اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا۔

خیارہ عشب میں ہماری نظروں سے اوٹ چلا ہوا تھا۔ ایک جگہ مجھے بھانڈیوں اور درختوں کے درمیان پکڑی نظر آئی۔ میں نے گاڑی رن دے سے اتار کر اسی طرف موڑ دی۔ پرنس اب بھی کچھ نہ بولا۔ میں نے آنکھوں کی آنکھوں میں پھنکا کو اشارہ کیا اور چند لمحے بعد ایک مناسب سی جگہ رکھ کر ایک کیلیمٹر کو خاص انداز میں استعمال کرتے ہوئے گاڑی کو پے در پے کئی جھٹکے دیئے اور پھر انجین بند کر دیا۔

پرنس اب چونک کر میری طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

”شاید انجین میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔“ میں نے ناگواری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول کر اترتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ڈکی میں کچھ ٹوڑ وغیرہ موجود ہیں؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ اس نے جواب دیا۔ میں نے مزید وقت ضائع نہیں کیا اور گاڑی سے اترتے ہی اس کے منہ پر ٹھونسا رسید کیا۔ وہ کچھ سیٹ پر اذیت ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی ”تواڑ نکالتا“ میں نے جھک کر اسے گریبان سے پکڑ کر کھلی چھت کی گاڑی سے باہر کھینچ لیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی تھیں اور نچلا ہونٹ پھٹ چکا تھا۔ اس کے حلق سے گھگھاتی ہوئی سی آوازیں نکلی رہی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ عورتوں کے معاملے میں اتنا درندہ صفت تو جوان اس قدر چھوٹے دل کا مالک تھا۔

اس کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے تھے اور وہ ان کے پیچھے چہرہ چھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ چوٹا بھی چاہتا تھا مگر آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا کہ اس کی پٹکی سی گردن ایک جھٹکے سے توڑ دوں لیکن اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے میں نے اس کی کھینچ پر ہاتھ رسید کیا۔ وہ بے ہوش ہو کر میری گرفت میں جم چکا۔

چھٹا بھی گاڑی سے اتر آیا تھا۔ اس نے پرنس کو دونوں بازوؤں پر سنبھالتے ہوئے کہا۔

”ہنس صاحب جی! آپ کا کام ختم، میرا کام شروع۔“

میرے کہنے سے پہلے ہی وہ پرنس کو دونوں بازوؤں پر اٹھائے بھانڈیوں میں غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے اسے بھانڈیوں سے برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ اپنے بٹن والے چاقو کو دھوٹی پر صاف کر کے بند کر رہا تھا۔ چاقو دھوٹی کی ڈب میں رکھ کر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھا۔ میں اس وقت اسٹیرنگ پر بیٹھا تھا۔

لشنگ ہاربر واپس آکر میں نے چھٹا کو اس کے گھر چھوڑا اور اسے مزید کچھ رقم دینے کی کوشش کی مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا۔ ”آپ پہلے جو کچھ دے چکے ہیں، وہی میری توقعات سے بہت زیادہ ہے۔ اتنے پیسے تو اسمگلر بھی نہیں دیتے، آپ تو پھر بھی ایک نیک کام کر کے واپس آ رہے ہیں۔“

"نیک کام کے الفاظ پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔" رخصت ہوتے وقت میں نے کہا۔ "چھنا! غریب مجھے تمہاری ضرورت پڑے گی۔ میں ایک بڑا منصوبہ بنا رہا ہوں اس میں تم بھی میرے ساتھیوں میں شامل ہو گے، جلد ہی میں تمہیں لینے آؤں گا۔"

"آپ مجھے ہر وقت تیار پائیں گے۔" اس نے خلوص دل سے کہا۔ "میں خود بھی اس دنیا سے لگتا چاہتا ہوں بشرطیکہ کسی آپ جیسے بہادر اور مخلص دوست کا ساتھ میسر ہو۔"

"تم پروا ہی مت کرو۔" میں نے اس کا کندھا تھپکا۔ "میں نے تمہارے اندر چھپا ہوا ہیرا دیکھ لیا ہے۔ جلد ہی مجھے تم جیسے کئی انسانوں کی ضرورت پڑے گی۔"

اسے خدا حافظ کہہ کر میں بریف کیس اور اسٹ کیس اٹھائے اپنی گاڑی تک آیا۔ میں سیدھا تاج محل ہوٹل پہنچا۔ اس وقت صبح کے چار بجے کو تھے۔ میں روپا کے سوٹ میں نہیں گیا۔ اس کے بجائے استقبال پر رک کر میں نے اپنے لیے ایک سنگل کمرہ حاصل کیا۔ یہ کمرہ تیسری منزل پر تھا جبکہ روپا کا سوٹ چوتھی منزل پر تھا۔ پورے میرا سوٹ کیس اور بریف کیس چھوڑ کر جا چکا تو میں نے تیزی سے جوتے پہن کر پچھلے اور سیدھا ہاتھ روم میں گھس گیا۔

نہا دھو کر تازہ دم ہو کر میں نے ہوم سروس کو فون کر کے بے وقت ناشتہ منگوایا۔ ناشتہ کرتے ہی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی لیکن سونے سے پہلے ایک کام کرنا ضروری تھا۔ میں نے فون پر روپا کے سوٹ کا نمبر ڈائل کیا۔

دوسری طرف سے ریسپورڈنسی کی گفتنی پر اٹھا لیا گیا لیکن جب روپا کی آواز آئی تو اس میں غنودگی کا بوجھل پن تھا۔ "ہیلو۔۔۔" اس نے پراشتیاق لہجے میں کہا۔

"منصور! میں نے نہایت مدھم آواز میں کہا۔

"میں تمہارے انتظار میں سو نہیں سکی کہاں ہو تم؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"تم سے بہت دور۔" میں نے بدستور مدھم آواز میں کہا۔ "جو کچھ میں کہوں اسے غور سے سنو اور اس پر عمل بھی کرنا تبھی باقی زندگی سکون سے گزرے گی ورنہ خواہ مخواہ پریشان رہو گی، اپنے زخموں کے ذخیرے میں اضافہ کرتی رہو گی۔۔۔" میں نے ایک طویل سانس لی۔ اس دوران روپا نے بولنے کی کوشش کی لیکن میں نے تیزی سے کہا۔ "صرف میں بولوں گا اور تم سنو گی۔۔۔ تمہارے لیے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ فی الحال تمہارا کوئی دشمن باقی نہیں رہا جو تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکے اور بری خبر یہ ہے کہ میں اب واپس نہیں آؤں گا۔ دو چار دن تم اسی ہوٹل میں ٹھہر کر کسی پراپرٹی ڈیپارٹمنٹ کے توسط سے کوئی کوٹھی یا فلیٹ خرید لیتا اور اس میں منتقل ہو کر یا کہ اسی طرح معمول کے مطابق زندگی گزارنا شروع کر دینا جس طرح میری آمد سے پہلے تمہارے شب و روز گزرتے تھے۔ اب ایک اچھا پہلو یہ ہو گا کہ تمہارے ذہن پر کسی جانی دشمن کا خوف نہیں ہو گا۔ تم آرام سے کام پر جا سکو گی"

آرام سے سو سکو گی اور بے خونی سے زندگی کے معاملات انجام دے سکو گی۔"

"کیا واقعی تمہارے بغیر میں یہ سب کچھ کر سکوں گی؟" اس نے میری تمام تر تیز گوئی کے باوجود یہ کہنے کا موقع ڈھونڈ لیا۔ کہنے کو یہ مھض ایک ساواہ سا سوال تھا مگر لہجہ و آواز کچھ ایسی تھی کہ میں نے اپنے دل پر غیر جذباتیت کا جو خول چڑھایا تھا، چٹختے آگے اور اس سے لوہے کے ٹکڑے نکل کر میں اندر ہی اندر اس لوہے کو پی گئی۔ اگر میں جذبول اور تاحوں کو پیروں کی زنجیر بنائے رکھتا تو میں وہ بھاری قرض نہیں چکا سکتا تھا جو زندگی نے میرے لیے لگا دیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ تم میرے بغیر سب کچھ کر سکو گی۔" میں نے اپنے لہجے میں ارتعاش پیدا نہیں ہونے دیا۔ "اور بہت عرصہ سے کر سکو گی۔ کوشش کرو گی تو بہت جلد بھول جاؤ گی کہ تمہاری زندگی میں منصور نامی کوئی شخص آیا تھا۔۔۔"

"کیا میری زندگی میں پیار کرنے والی جیتیاں صرف اس لیے ہی آتی رہیں گی کہ میرے لوہے میں زہر گھول کر میرے دل کو پارہ پارہ کر کے جاتی رہیں اور میں انہیں بھول جانے کی کوشش کرتی رہوں؟" وہ جیسے پت پت پڑی۔ اس کا لہجہ ہسٹریائی ہو گیا اور آواز آنسوؤں میں بھیک گئی۔ "پہلے میں نے اپنی ماں کو بھلایا، باپ کو بھلایا، آنکھوں سے محروم ہو جانے والے شوہر کو بھلایا، انھوں نے بغیر دوا کے مر جانے والے بچے کو بھلایا۔۔۔۔۔ دل پر لگنے والے ہر زخم کو بھلایا۔۔۔۔۔ اور اب تم کہتے ہو کہ میں تمہیں بھی بھول جاؤں۔۔۔۔۔ مجھے اثر ہے اس لفظ "بھول" سے۔۔۔۔۔" اس کی آواز ہچکیوں میں ڈھل گئی۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔

وہ میرے کمرے سے ایک منزل اوپر اور شاید کمرے کے عین اوپر ہی بلک رہی تھی، آنکھوں سے لوہا رہی تھی۔ مجھ سے ایسے سوال کر رہی تھی جن کے جواب مجھے آتے ہی نہیں تھے۔ میں اپنے اور اس کے درمیان حائل ایک چھت کے فاصلے کو آسمان اور زمین کے درمیان دلدی میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ میری کوشش کو ناکام بنانے کے درپے تھی مگر میں نے تیر کر رکھا تھا کہ مجھے اس آزمائش سے سرخرو نکلنا ہے کیونکہ یہ میری اس تربیت کا پہلا مرحلہ تھا جو مجھے آئندہ کے لیے درکار تھی۔ اگر میں پہلے مرحلے پر ہی کمزور پڑ جاتا تو آئندہ اپنے آپ سے کوئی اچھی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔

"مجبوری ہے روپا!" میں نے اب بھی حتی الامکان ہموار لہجے میں کہا۔ "ہزاروں عفریت میرے تعاقب میں ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم بھی کسی مصیبت میں پڑو۔"

"اتنی پر تکلف گفتگو کرنے سے بہتر ہے کہ تم اپنا منہ بند ہی رکھو۔" یہ کہہ کر اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔ یہ شاید زندگی کے ایک اور پریشانی باب کا اختتام تھا۔ معلوم نہیں زندگی اب کبھی اس باب کے انوارے کی مصلحت دیتی یا نہیں۔"

میں چند لمحے خاموشی سے ریسپورڈنسی میں تھا کہ خالی اندھنی کے سے عالم میں اسے

لندن ہیرو کو کاسٹ کروں گا تو وہ پیسے ہی نہیں لے گا، فلاں ہیروئن کو سائن کرنے جاؤں گا تو وہ میرے گھٹے چھوٹے ٹی اور ساری ڈینس کنسلٹر کے مجھے دے دے گی وغیرہ وغیرہ۔ میں نے شاید اس روز تاڑی پی رکھی تھی اس لیے خوب دائی بتایا جب رہا تھا مگر وہ سب کچھ میں آگیا۔۔۔۔۔

میں طلبہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی کے پاس لے آیا اور ہم دونوں اس سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ "پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا اس بدبخت نے فوراً دو لاکھ روپے میرے قدموں میں رکھ دیئے۔" طلبہ نے یوں ناگواری سے کہا گویا سیٹھ نے روپے اسے نہیں دیئے تھے بلکہ اس سے چھین لیے تھے۔ "اور کتنے لگا کام شروع کرو" میں باقی کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔" طلبہ خاموش ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"بس پھر میں نے کام شروع کر دیا۔" اس نے سادگی سے کہا۔ فلساڑی کے علاوہ ہر کام ایک سال کا ایڈوائس کرایہ دے کر رائج بھون میں دفتر لے لیا۔ قالین اور فرنیچر ڈھایا جس میں اپنی میز سب سے بڑی بنوائی۔۔۔۔۔" اس نے ہات اوچوری چھوڑ کر اچانک پوچھا۔ "یاد نہیں معلوم ہے ہم غریب لوگ غریب ہی کیوں رہتے ہیں؟"

"تمہارا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟" میں نے جواب دینے کے بجائے اسی سے پوچھا۔ "اس لیے کہ ہمارے پاس پیسہ بھی جائے تو ہمیں بھضم نہیں ہوتا۔" اس نے بلا تاہل جواب دیا۔ "دو ناگہ دیکھ کر مجھے یہی گون گزرا کہ یہ رقم جیسے کبھی ختم ہی نہیں ہوگی۔ بیشتر غریبوں اور ترسے ہوئے انسانوں کی طرح میں نے بھی چار چیلوں پر اختیار حاصل ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی وہ حسرتیں پوری کیں جو مدتوں سے دل میں پٹی رہی تھیں۔ دفتر میں روزانہ اسکاچ کی بوتل آنے لگی۔ ٹیکسیوں میں سفر شروع ہو گیا۔ کسی ڈھنگ کے ایکٹریڈ ایکٹریس کے گھر جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس سے پہلے ہی تہام جانتے والی ایکسٹرا لڑکیوں کو بھنگ پڑ گئی کہ طلبہ نے کوئی فنانسر پھانسا ہے۔ شہد کی کھیموں کی طرح وہ سب دفتر میں ان جمع ہونے لگیں۔ اتفاق سے ان میں کسی خوش شکل بھی تھیں۔" طلبہ نے ان میں سے نہ جانے کس کی یاد میں ایک مریجہ پھر ٹھنڈی سانس لی۔ "اب سب ایکسٹرا گرلز کے ساتھ تقدیر کا قلم و ستم یک لخت ہی کچھ زیادہ بڑھ گیا۔" طلبہ نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ "مسی کا ہاپ اچانک ہی بستر مرگ پر پہنچ گیا، کسی کا بھائی جھوٹے مقدسہ میں پھنس کر کسی نامعلوم جیل میں چلا گیا، کسی کی ماں کو یکایک کینسر کے درجے کی کوئی بیماری لاحق ہو گئی، کسی کے مکان کی پھٹ گھر پڑی اور کوئی خود میرے اوپر گر پڑی۔ میرا خیال ہے ان دنوں میں کچھ درجے کا راجہ اندر گمراہی کا مستحق ہو چکا تھا اور جس فیاضی

تھوڑا رہا۔ پھر آہستگی سے اسے کریڈل پر رکھ کر اسی آہستگی سے بستر پر لیٹ گیا۔ صبح اٹھ کر میں عقی دروازے سے ہوٹل سے نکلا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ اشارت کرنے کے بعد میں نے گاڑی سیدھی ہی کی تھی کہ ایک گھٹیا قسم کے چائے خانے سے ایک شخص گویا کرتا پڑنا نکلا اور گاڑی کے سامنے سے گزرتے ہوئے گلی عبور کرنے لگا۔ اس کے لیے اور مجھوں جسم پر ایک اچھا بھلا سوٹ لگا ہوا تھا اور اپنے استعمال پر غالباً کافی شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ سوٹ ایک تو اس شخص کے جسم پر ڈھیلا بہت تھا، دوسرے اس پر لاتعداد ٹکٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شخص کافی دنوں سے سیلیونگ سوٹ کا کام بھی اسی سے لے رہا تھا۔

لیکن اصل بات سوٹ، ٹائی یا جوتوں کی نہیں، اس شخص کی تھی جس کے جسم پر یہ سب چیزیں موجود تھیں۔ یہ شخص عاشق علی عرف طلبہ تھا۔ وہ چائے خانے کے مالک کو کچھ ریڑ گاڑی دے کر نکلا تھا مگر یوں سو اس یافتہ نظر آ رہا تھا جیسے عدم ادائگی کی وجہ سے چائے خانے والے نے اسے دھکے دے کر دکان سے نکالا ہو۔

میں نے گاڑی روکی اور اتر کر اس کے قریب پہنچا۔ "کیا حل ہے طلبہ؟" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اچھل پڑا۔ "اوہ۔۔۔ تم ہو۔" اس نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔ "کیا بات ہے ایک عرصے سے کہیں نظر نہیں آئے۔" میں نے کہا۔ "اسٹوڈیو میں بھی صورت دکھائی نہیں دی۔"

"یہ سالا کبھی شہر ہی ایسا ہے پیارے۔" اس نے پہلے سے بھی زیادہ طویل سانس لی۔ "ایک مرتبہ جس کا ہاتھ چھوت گیا، سو پھوٹ گیا۔ پھر وہ دوبارہ مشکل سے ہی نظر آتا ہے۔ خاص کر یہ اپنی فلمی دنیا میں تو اتنی چکاچند ہے کہ سامنے کھڑے ہوئے آدمی کی شکل بھی پہچانی نہیں جاتی۔"

"ظہر کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "کیا بھی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ اسٹوڈیو میں میں نے تمہیں دیکھا اور پہچانا نہیں؟"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے اپنائیت سے بازو میری کمر میں جا کل کر دیا۔ "میں تو ایسے ہی ذرا فلسفہ بول رہا تھا۔۔۔۔۔ آج کل فلسفہ پر ہی زیادہ گزارہ ہے۔" "نہ کیا رہا ہے؟ کیا سرگرمیاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "تمہارے جسم پر سوٹ دیکھ کر تو شہ گزرتا ہے کہ آج کل تمہیں کچھ زیادہ کام مل رہا ہے۔"

"کام تو اچھا حاصل رہا ہے یہ تو اس نے ایک اور آہ بھری۔ "اور ہم آدمی بھی کام کے تھے لیکن اپنی غرمتیوں سے اپنا بڑا غرق کر لیا۔ پچھلے دنوں ایک پٹھان سیٹھ کو چکر دے بیٹھا تھا کہ آؤ پرنٹر شپ میں فلم بناتے ہیں۔ میرے اندر مشی میں ایسے تعلقات ہیں کہ

سے میں قریبے ہاتھ رہا تھا اس سے میں محمد شاہ رنجیلے کا وزیر مالیات معلوم ہوتا تھا۔ ایک روز بالا خر فلم کا نام طے پا گیا۔ "نشان" نام طے پا جانے کے بعد قدرے فرصت میسر آئی تو سوچا کہ ہیروئن کے طور پر روپ کو ساکن کر لیا جائے لیکن میں اسی روز انکشاف ہوا کہ بینک میں صرف پچانوے روپے باقی ہیں یعنی اتنی رقم بھی باقی نہیں رہی تھی کہ سائننگ اکاؤنٹ کے طور پر کسی ہیروئن کو دی جاسکتی۔ سینچ صاحب حالانکہ تمام فرسٹیوں میں میرے ساتھ برابر کے شریک رہے تھے لیکن بینک میں پچانوے روپے باقی رہ جانے کا سن کر آپے سے باہر ہو گئے۔

میں نے انہیں سمجھایا کہ اگر وہ پچاس ہزار کا بندوبست اور کر دیں تو فلم سیٹ پر چل جائے گی اور اگر کسی ڈسٹری بیوٹر سے بات طے ہو گئی تو قسطیں بھی ملنی شروع ہو جائیں گی مگر سینچ صاحب نہیں مانے اور غصے میں ایک ایکسٹرا روٹی کو بغل میں دیا کر مسوری چپے گئے۔ آج کل وہ نہیں ہیں اور ہسپتال لیے میری تلاش میں گھومتے رہتے ہیں۔ فلم "نشان" کی آخری نشان میرے جسم پر موجود یہ سوٹ ہی ہے۔

"کیا فلم کی کہانی نکھی جا چکی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے قدرے شرمیلے لہجے میں کہا۔ "میں نے خود نکھی تھی۔۔۔۔۔ بلکہ کئی سال سے لکھ کر رکھی ہوئی ہے۔ پہلے میں نے اس کا نام "بہی باقی ناست" رکھا ہوا تھا پھر میں نے دیکھا کہ ہر چھوٹے موٹے شہر سے تعلق رکھنے والے جن لڑکیوں اور نوآموز المانہ نگاروں کے افسانے اخباروں اور رسالوں میں چھپتے ہیں ان میں سے ہر ایک ہی اس عنوان سے طبع آزمائی ضرور کر چکا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی کہانی کا نام بدل کر "نشان" رکھ دیا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ وہ کہاں رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اسی کھولی میں۔" اس نے قدرے فخر سے جواب دیا۔ "دراصل وہ کھولی ہی میرا ایک ایسا ٹھکانہ ہے۔۔۔۔۔" اس نے وضاحت کی۔ "جس کا اس پشمان سینچ کو علم نہیں۔"

"اچھا میں چند دنوں تک وہیں تم سے آکر ملوں گا۔" میں نے کہا۔ "اس سینچ کا معاملہ میں خود ہی نمٹا دوں گا اور۔۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔۔ فلم ضرور بنے گی بلکہ ایک نہیں بہت سی فلمیں بنیں گی۔ ایک بہت بڑی فلم کہنی قائم ہوگی جس کے ڈائریکٹر تم ہو گے۔۔۔۔۔ سمجھے؟"

"تم تم نے بھی تازی لیا رکھی ہے؟" طلبہ نے محکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہو اسی طرح کی باتیں کر رہے ہو جیسے میں نے اس پشمان سینچ سے کی تھیں؟"

"تمہیں معلوم ہے میں پیتا نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور تازی پینے کا میں ساری زندگی تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" اس نے ہنسا سا قہقہہ لگایا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اب میں چلتا ہوں فی الحال میں تاج محل

میں مقیم ہوں اگر اچانک کوئی ضرورت پڑے تو آسکتے ہو۔ ویسے میں بہت جلد خود تم سے رابطہ قائم کروں گا۔۔۔۔۔ اور دیکھو اسٹوڈیو وغیرہ میں کہیں روپا سے سامتا ہو تو میرا ذکر نہ آئے پائے۔"

"بہت بہتر۔" اس نے کہا اور کار سے ہٹ کر ایک طرف کو چل دیا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے ہوم سروس کو فون کر کے کھانا منگوایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے اپنا مشین مائلز اور ساٹنر دانا ریو اور اپنے لباس میں جیوں میں چھپایا۔ گنجر میری کلائی پر بندھے ہوئے ایک ایسے نیام میں رہتا تھا جسے مخصوص انداز میں جھکا دیتے ہی وہ میرے ہاتھ میں آجاتا تھا۔ جھپٹاروں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے چمڑے کی ٹوپی اور رنگین شیشوں کی ٹینک اٹھائی، بریف کیس ایک ہاتھ میں لٹکایا اور کمرے سے نکل آئے۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہوٹل کی پارکنگ لٹ سے نکل کر سڑک پر آگیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی اس سڑک پر فراسٹے بھر رہی تھی جو پونا کو جاتی تھی۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ میں اسی سڑک کے راستے پہنچ گیا تھا۔ اس وقت میں معصوم اور ہونمار طالب علم تھا۔ مختصر سے عرصے میں میں نے جانے کیا بن گیا تھا۔ ماضی کے وہ پرسکون شب و روز اور مستقبل کے معصومانہ خواب جانے کہاں کھو گئے تھے۔

میں جب پونا کی حدود میں داخل ہوا اس وقت رات کے بارہ بجتے کو تھے۔ پہلے پہل مجھے محسوس ہوا کہ یہ شہر میرے لیے اجنبی اور گلی کوپے ٹانوس سے ہیں مگر جوں جوں میں اس مکان کی طرف بڑھتا گیا جہاں میں رہا کرتا تھا توں توں سڑکوں اور گلی کوچوں سے شناسائی اور مالوسیت کی خوشبو پھونتی محسوس ہونے لگی۔

وہ گلی جو کبھی اپنی محسوس ہوتی تھی اس میں داخل ہوتے وقت میری دھڑکنیں کچھ تیز ہوئیں مگر میں نے فوراً ہی سردی کا ہتھیار استعمال کر کے انہیں اعتدال پر لانے کی کوشش کی اور اپنے مکان کے سامنے گاڑی روکنے کے بجائے ست رفٹاری سے گزرتا چلا گیا۔ مکان کے گیٹ پر تالا پڑا تھا اور یا پھر کی گھاس وغیرہ اتنی اونچی ہو چکی تھی کہ چار دیواری سے باہر جھانکنے لگی تھی۔

مکان میرا اپنا تھا مگر می کا فریڈا ہوا تھا مگر میں جتنی دیوار پھلانگ کر چوروں کی طرح اس میں داخل ہوا۔ یہاں ہر طرف وحشت اور دیرانی میری منظر تھی۔ اس مکان کا فرش کبھی شیشے کی طرح چمکتا تھا۔ اس پر مٹی کی تہہ جی ہوئی تھی۔ میں برآمدے ہی میں رک گیا اور خارج بچھا دی۔ کمروں میں سے کسی کا دروازہ کھلا تھا اور کسی کا بند گھران میں جانے کی بہت ہی نہیں پڑی۔ اس گھر کے در و دیوار نے بچپن سے جوانی تک میری زندگی کا تماشا دیکھا تھا اور خاموش رفتی کی طرح میری ہر قہ میرے ہر آنسو اور میرے ہر قہقہے میں شریک رہے

تھے۔

وہ باغیچہ جس کے ایک حصے میں اکھڑا تھا اور جہاں چند دن بیا نے میری اولین جسمانی تربیت گاہ قائم کی تھی، جھاڑ جھنکار کا مجموعہ بن چکا تھا اور وہاں بکھرے ہوئے خشک پتوں نے اس چاندنی کا نقشہ لورے رکھا تھا۔ گلاب اور رات کی دہائی کے پودے پانی نہ ملنے سے سوکھ کر کاٹھ کھڑ اور جھاڑ جھنکار ہی میں مدغم ہو چکے تھے۔

میں نے سوچا کہ احتیاط کو ہالے خالق رکھتے ہوئے برآمدے کی جی جلا لوں کہ شاید وحشت کا احساس کچھ کم ہو سکے لیکن سوچ کے کھٹکے کا کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا، میں نے دوسرا سوچ دہا، پھر تیسرے کو آزمایا مگر کوئی بلب روشن نہ ہوا شاید جی کٹ چکی تھی۔

خشک پتے اور ٹکڑے شبنیاں میرے قدموں تلے چرچا رہی تھیں۔ ان پتوں اور شبنیوں تلے زمین مجھے بے حد نرم محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پاؤں سے ایک جگہ سے کھڑ ہتا کر دیکھا تو انداز ہوا کہ یہاں سے زمین حال ہی میں کھودی گئی ہے۔ پھر اسے برابر کر کے دوبارہ خشک پتے وغیرہ اوپر ڈال دیئے گئے ہیں۔ میں نے کئی جگہ سے کوڑا کرکٹ ہتا کر دیکھا اور خاصی حد تک حیران ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طویل و عریض ہاٹیچے سارے کا سارا ہی کھود ڈالا گیا تھا۔

ایسا کون کر سکتا ہے اور کس کو اس کی ضرورت پیش آسکتی تھی؟ یہ سوچتے ہوئے میں فوارے تک پہنچا تو اس کی چار دیواری مسرور شدہ نظر آئی۔ پختہ فرش کھدا پڑا تھا۔ ایک لمبے کے لیے تو میں ششدر رہ گیا۔ اب مجھے امید نہیں رہی تھی کہ مٹی کا چھپایا ہوا موٹا خزانہ یہاں باقی رہ گیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اس پر ہاتھ کس نے صاف کیا؟ مٹی نے اپنی ڈائری میں جس انداز میں اس کا تذکرہ کیا تھا، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے کسی کو اس بات کی بھٹک نہیں پڑنے دی کہ انہوں نے اپنی عمر بھر کی جمع پونجی سونے اور ہوا ہرات کی شکل میں منتقل کر کے کہاں چھپائی ہے۔ اس راز میں انہوں نے اپنی قریب ترین اور قابل اعتماد ہستیوں میں سے بھی کسی کو شریک نہیں کیا تھا۔ پھر کوئی یہاں تک کیسے پہنچا تھا؟

ویسے تو کچھ رقم مجھے وکرم کے بریف کیس سے مل چکی تھی۔ دو لاکھ پاؤنڈ مجھے پرنس شہمی کی بدولت میسر آ گئے تھے۔ اس دور کے لحاظ سے یہ بہت بڑی رقم تھی اور زر مبادلہ کی صورت میں ہونے کی وجہ سے تو اس کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی لیکن مٹی کا خزانہ شاید اس ساری رقم پر بھاری ہوتا۔

فوارے کی چار دیواری اور فلک فرش کے لمبے کے قریب کھڑے کھڑے دفعتاً مجھے خیال آیا کہ مجھے ایک کوشش تو کر کے دیکھ جی چاہیے۔ اصل فوارہ تو محفوظ ہی تھا۔ کھدا مٹی کرنے والے والوں نے شاید ممکن ہی نہ سمجھا ہو کہ فوارے کے نیچے بھی کچھ ہو سکتا ہے

یا سینکڑوں کا علم نہ ہونے کی وجہ سے خزانے تک ان کی رسائی نہ ہو سکی ہو جس انداز میں سارے باغیچے کو جگہ جگہ سے کھودا گیا تھا، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کھودنے والوں کو درحقیقت مطلوبہ جگہ کا علم نہیں تھا۔

میں لمبے پر پاؤں رکھنا آگے پہنچا۔ فوارے کے گرد بھی خاصا لمبہ جمع تھا۔ میں جھک کر اسے ہٹانے لگا۔ لمبہ ہٹ جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ فوارہ نیچے تک صحیح سالم تھا۔ اس کا سینٹ کا مینار نما حصہ، نوپے کے ایک گول پلیٹ فارم پر الیتاؤ تھا جو دھات ہی کے ایک گنبد نما حصے کے ساتھ بولٹوں کی مدد سے جڑا ہوا تھا۔ گنبد نما حصہ زمین میں بیست معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ڈائری میں پڑھی ہوئی ہدایت کے مطابق فوارے کے ڈسک نما گول پلیٹ فارم کو گھمانے کی کوشش کی۔ بظاہر فوارے کے کسی بھی حصے کو گھمانے کی کوشش احتیاط ہی معلوم ہوتی تھی لیکن جب میں نے غیر معمولی طاقت صرف کی تو پلیٹ فارم کے ساتھ گنبد نما حصہ بھی گھوم گیا اور مزید ایک چکر دیتے پر وہ کئی انچ اوپر آگیا۔ اب اس کے نیچے ایک خانہ نمودار ہو چکا تھا جس میں اب پورا فوارہ لوہے یا کسی اور دھات کی راڈ پر کھڑا تھا۔

میں نے سمجھتے ہوئے اس خانے میں ہاتھ ڈالا۔ خانہ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس میں مجھے ایک کنڈا سا ابھرا محسوس ہوا۔ میں نے اسے کھینچا تو نیچے جیسے کوئی چھوٹا سا دروازہ کھل گیا اور فوارہ مزید اوپر چلا گیا۔ وہ راڈ جس پر فوارہ اب کھڑا تھا، جیسے ایک جھٹکے کے ساتھ زمین سے نکل آئی تھی۔ اب میں خانے میں جھک کر دیکھ سکتا تھا۔ جھانک کر دیکھنے پر مجھے کچھ نظرنہ آیا تو میں نے بائیں جانب کی روشنی ڈالی اور میری دھڑکن ایک لمبے کے لیے بے قابو ہو کر دو گئی۔

خانے کی تہ میں واقعی ایک چھوٹا سا دروازہ کھل چکا تھا اور اس دروازے کے نیچے ایک اور کافی کشادہ پختہ اور صاف ستھرا خانہ نظر آرہا تھا۔ اس خانے میں سیاہ رنگ کا ایک نمائندہ عہدہ اسٹراکٹ بکس رکھا تھا۔ اسٹراکٹ بکس کو اٹھانے کے لیے مجھے گھٹنوں کے بل ہٹکنا پڑا۔

اس محل میں شاید میں اسے متنبہ ہو گیا تھا کہ مجھے کوئی آہٹ و تیر نہ ملے گی مٹی نے بھی یہی کہہ دیا تھا۔ اسٹراکٹ بکس اٹھ کر سیدھا ہوا، ایک دروازے کے نیچے چلا گیا۔

”اس صندوق کو زمین پر ہی رکھ دو اور سیدھے کمرے ہو جاؤ درست“ آواز میں ملاست بھی تھی، قلم اور ایک دہی دہی مسرت بھی۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ اس خزانے کی تلاش میں میں کئی ہفتے سے اس مکان میں چھپا ہوا تھا اور ایڑی چوٹی کا زور لگا چکا تھا لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم یوں میری مدد کو آ پہنچو گے۔ اور ہاں..... دیکھو زیادہ پھرتی دھانے کی کوشش نہ

کرتا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور ہے اور اب خزانہ دریافت ہو جانے کے بعد میں اس بات کی پروا نہیں کروں گا کہ فائر کی آواز کوئی من لے گا۔“

میں نے اسٹرائک بکس زمین پر رکھ دیا۔ اس آواز نے بلاشبہ مجھے حیران کر دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی شخص اس خزانے کی تاک میں بیٹھا ہوگا۔

”اب میری طرف گھوم جاؤ لیکن اپنی جگہ سے قدم نہ بڑھانا۔ میں تمہاری شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ٹاویڈ شخص نے کہا۔

میں آہستگی سے اس کی طرف گھوم گیا۔ دھندلی چاندنی میں میں نے دیکھا کہ وہ ایک میانہ قامت ٹمر مضبوط اور پختہ العمر شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں مکہرانہ چمک تھی اور ہونٹوں پر شاعرانہ مسکراہٹ سمیل رہی تھی۔ وہ بھی مہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔

”اندر چلو۔“ چند لمحوں بعد اس نے ریوالور سے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور خود ایک طرف کو ہٹ گیا تاکہ میں اس کے سامنے سے گزر کر مکان کی طرف جا سکوں۔ میں نے سروسٹ اس کی ہدایت پر عمل کرنے ہی میں مصدقت سمجھی۔

میں برآمدے کی طرف چل دیا۔ وہ مناسب فاصلہ رکھ کر ایک ہاتھ میں اسٹرائک بکس اٹھائے اور دوسرے میں ریوالور سنبھالے میرے پیچھے آ رہا تھا۔ اس طرف سے برآمدے کی بیڑھیاں چڑھ کر سب سے پہلے اس کمرے کا بغلی دروازہ سامنے پڑا تھا جو کبھی میرا بیڈ روم ہوا کرتا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا تو ریوالور بردار نے مجھے منع کرتے ہوئے اس کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے کی ہدایت کی جو کسی زمانے میں میری گورنس کے استعمال میں ہوا کرتا تھا۔ اس کمرے سے کچن ملحق تھا۔

دروازہ بند تھا لیکن مقفل نہیں تھا۔ اسے کھول کر میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے دیکھا کہ کمرے کے ایک گوشے میں کیورین بیسپ روشن تھا جس پر ایسا شیڈ لگایا گیا تھا کہ اس کی روشنی ایک دائرے میں محدود رہے، تاہم قطعی روشنی میں کمرے کے باقی حصے کا بھی جائزہ لینا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ بیڈ پر کالی حد تک صاف ستھرا بستر لگا ہوا تھا اور کمرے کی حالت بھی بتا رہی تھی کہ یہاں کوئی کافی عرصے سے مقیم ہے۔

”روشنی کے دائرے میں بڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“ مجھے حکم ملا۔ میں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ ریوالور بردار کا بیوا تلخ اندھیرے میں مجھے بیڈ کی پٹی پر بیٹھتا دکھائی دیا۔ اسٹرائک بکس اس نے بیڈ کے نیچے کھسکا دیا تھا۔

”اب میں تمہارا نام جانا چاہوں گا۔“ اس نے اب نہایت پرسکون لہجے میں کہا۔

”تمہارے خیال میں میں کون ہو سکتا ہوں؟“ میں نے اس سے سوال کر دیا۔

”مجھے شب پڑتا ہے کہ“ وہ جیسے ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا ”کہ تم عزیزہ خانم

سے لڑکے ہو گو کہ یہ بات صحیح طور پر کسی کو بھی معلوم نہیں کہ اس کی کوئی اولاد تھی یا نہیں۔“

”اور تمہیں یہ علم کیونکر ہوا کہ اس مکان میں کوئی خزانہ بھی سوہو ہے؟“ میں نے نہایت ملائمت سے پوچھا۔

”آپس کی بات ہے۔۔۔“ اس نے قدرے شرمیلے لہجے میں کہا۔ ”کہ اگر تم عزیزہ کے لڑکے ہو تو کچھ زیادہ باعزت آدمی میں بھی نہیں۔ میرا تعلق بھی بازار سے ہے۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”میں نے پوچھا تھا کہ تمہیں اس مکان میں خزانے کی موجودگی کا علم کیونکر ہوا؟“ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

”ایک روز میں بے دھیانی میں بلا اجازت عزیزہ خانم کے رہائشی کمرے میں داخل ہو گیا۔“ اس نے گویا کسی بچے کے اصرار پر کوئی کہانی شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ کمرے میں نہیں تھیں۔“ میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص مکی کا ذکر بڑے احترام سے کر رہا تھا۔ ”ان کے بیڈ کے قریب ہی تپائی پر چڑے کی سیاہ جلد والی ڈائری کھلی لیکن الٹی رکھی تھی۔ قریب ہی قلم پڑا تھا۔ وہ غالباً لکھتے لکھتے اٹھ کر باٹھ روم میں چلی گئی تھیں۔ باٹھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے یونہی بے مقصد سے انداز میں ڈائری اٹھائی اور جو صفحہ میرے سامنے آیا اس پر پونا کے کسی مکان اور خزانے کا تذکرہ تھا۔ عزیزہ خانم کسی کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ لکھ رہی تھیں۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ شاید تم ہی تھے۔“ اس نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر گہری سانس لی۔

بہر حال میں نے جب ڈائری اٹھائی تھی تو مجھے اس قسم کی کوئی تحریر نظر آنے کی توقع نہیں تھی۔“ اس نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا ”اس لیے میں محض اچھتی نظر سے صفحہ کو دیکھ رہا تھا۔ دغہ“ باٹھ روم کے دروازے کی تاب گھومنے کی آواز آئی اور میں نے جڑبڑا کر ڈائری وہیں رکھ دی، تاہم پونا خزانہ فوارہ یا نیچے“ یہ الفاظ میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے۔ اس دن کے بعد کبھی مجھے اس ڈائری کو دوبارہ دیکھنے کا موقع کوشش کے باوجود نہیں مل سکا لیکن میں بہر حال تک و دو میں لگا رہا۔

”مجھے پتا چلا کہ عزیزہ خانم بچتے میں ایک مرتبہ چند گھنٹے کے لیے کہیں جاتی ہیں۔ ڈرائیور ان کا وفادار تھا۔ اسے کریدنے کے باوجود مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بالآخر ایک روز میں ان کا تعاقب کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے انہیں یہاں آتے دیکھا اور میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ رہا نہ خزانے کے سلسلے میں ڈائری میں پونا کے جس مکان کا ذکر تھا“ وہ کہی ہے۔

میں نے بعد میں اس مکان کے کئی پتھر لگائے لیکن مجھے خزانہ تلاش کرتے کا موقع

نہیں ملا۔ اپنے انہی چکروں کے درمیان میں نے یہاں تمہیں بھی دیکھا تھا۔ اس وقت تمہارے وارنٹی نہیں تھی۔ پھر برسرِ اسرار سے انداز میں عزیزہ خانم کی موت واقع ہو گئی اور میں نے سنا کہ ان کی موت سے قبل ایک نوجوان ان کے بارے میں پوچھتا ہوا آیا تھا اور عزیزہ خانم کے کمرے میں دو آدمیوں کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ وہ نوجوان غالباً تم ہی تھے اور تم شاید عزیزہ خانم کے بیٹے ہو لیکن میں نے زبان بند رکھی۔ میں کسی بھی الجھن میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے صرف خزانے کی فکر تھی۔

کچھ عرصے بعد میں نے اس مکان کا چکر لگایا تو یہاں تالا لگا ہوا دیکھا۔ اپنے اطمینان کی خاطر میں نے مزید کچھ انتظار کیا، پھر ایک رات پچھلی دیوار سے اس مکان میں کود گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ باغیچے اور فوارے کے تالاب میں کہیں کھدائی نہیں کی گئی تھی۔ پھر میں نے خزانے کو نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں کچھ ضروری سامان اور خشک خوراک وغیرہ لے کر یہیں آچھپا اور محفوظ اوقات کے دوران خزانے کی تلاش کا کام کرنے لگا۔ مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ خزانہ کس جگہ دفن ہے۔ اس اثنا ہی یہ تھا کہ وہ باغیچے میں اور غالباً فوارے ہی کے آس پاس کہیں مدفون ہے۔ میں نے اندازاً ایک سرے سے کھدائی شروع کی اور اس وقت سے لے کر اب تک کھدائی کرتے کرتے میرا تیل تل چکا تھا مگر خزانہ تو کیا کہیں سے ایک کھوٹا سکہ بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔۔۔۔۔

وہ ایک گہری سانس لے کر مسکرایا اور گویا بات ختم کرتے ہوئے بولا۔ "اور پھر تم فرشتہ رحمت بن کر آگئے۔"

"میں تمہارے لیے فرشتہ اجل بھی تو ثابت ہو سکتا ہوں۔" میں نے سر جھکے میں کہا۔

○

میرے لیے میں موت کی دھمکی تو پوشیدہ تھی لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیسے صورتحال کو پنٹ سکتا تھا۔

"میں اس پہلو پر غور کر رہا ہوں۔" اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ یک لخت غائب ہو گئی اور چہرے پر تناؤ چھا گیا۔ "اس لیے مناسب یہی ہے کہ۔۔۔۔۔" اس نے ریوالتور زیادہ صبح طور پر سنبھال لیا۔ "میں تیس گولی مار کر یہیں باغیچے میں دفن کر جاؤں۔"

"اتنی سی بات کے لیے اتنی لمبی تمہید بامقصد رہے تھے۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ "گولی مار لی ہے تو مار بھی چکو بلکہ میری لاش اگر باغیچے ہی میں دفن کر لی تھی تو وہیں گولی مار دیتے۔ یہاں تک لانے کی زحمت کیوں کی؟ لاش کو کھینچتے ہوئے پھر باغیچے تک لے جاؤ گے؟" میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اپنی نہیں کسی اور کی لاش کی بات کر رہا ہوں۔ وہ کچھ غصہ ہوا سا گیا مگر پھر سنبھل کر بولا۔ "انسان جسے جان سے مارنے لگا ہو، اس سے دو دو باتیں تو کر لینی چاہئیں اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کا نام تو پوچھ لینا چاہیے۔"

"میرا نام بلبل کشمیر ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "خوبصورت نام ہے نا؟"

"میرے بننے کی کوشش کر رہے ہو؟" اس کی آواز میں تلخی در آئی۔

"دراصل مجھے مرنے کی بہت جلدی ہے اور تم دیر کیے جا رہے ہو۔" میں نے گویا شکوہ کیا۔

"یہ ج۔۔۔" اس نے ٹریگر دبا دیا۔

میرا اب تک کا ذاتی تجربہ یہ تھا کہ گولی صرف وہ خطرناک ہوتی ہے جو ناخوشی میں کسی سمت سے آئے۔ اس گولی کے لیے میں بہت دیر سے تیار تھا۔ میں کرسی سے پھسلا اور ساتھ ہی میری لات اس تپائی پر پڑی جس پر کیوبکس لیمپ رکھا تھا۔ لیمپ کہیں دور جا گرا اور مجھ گیا در نہ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ بجھنے کے بجائے کہیں مٹی کا ٹل بکھر جانے کی وجہ سے زیادہ آگ نہ پکڑ لے۔

اس شخص نے دوسرا فائر کرنے میں تاخیر نہیں کی مگر اس وقت تک اندھیرا چھا چکا تھا۔ گولی غالباً اس کرسی میں گئی تھی جس پر ایک سیکنڈ پہلے میں بیٹھا تھا کیونکہ کلری کے پرچے اڑنے کی آواز آئی تھی۔

طلوع ہو گئے۔ دیر سے سہی، سب کچھ یاد تو آگیا۔

جی ہاں۔۔۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں مابتاب رہتی تھی۔

حالات خواہ کچھ بھی تھے، میرے محسوسات میں خواہ کتنی ہی تبدیلیاں آچکی تھیں اور میں نے اپنی ذات کے کنڈر پر بلاشبہ ایک نئی عمارت تعمیر کر لی تھی لیکن آج جب تقدیر نے ایک بار پھر کوہجہ جاننا میں پہنچا دیا تو جیسے سارے زخموں کے منہ کھل گئے۔ ساری مہ فون تمناؤں انگڑائیاں لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تمام بھولے بسے خواب ایک بار پھر آنکھوں میں جھللا اٹھے۔ بے اختیار اس حاصل حیات سے ملنے کو دل چل اٹھا۔

میں گاڑی سے اترا اور اس مکان کی طرف بڑھا ہو کبھی تمام آرزوؤں اور آسکوں کا مسکن ہوا کرتا تھا اور کبھی جس کے دروازے پر پہنچ کر دھڑکنیں اتنی جیز ہو جایا کرتی تھیں کہ دھک کٹھنیوں میں ستانی دینے لگتی تھی۔ آج نجانے کیوں اس کے در پر پہنچ کر جسم سرد سا پڑ گیا۔ پھر یہ دیکھ کر تو جیسے دن دھڑکتا ہی بھول گیا کہ لوہے کے سیٹ پر بڑا سا تالا بھول رہا تھا۔

مجھ پر ایک سخت محضن سی طاری ہو گئی۔ پہلے تو جی چاہا کہ فوراً اپنے راستے پر چل پڑوں اور ایک بار پھر ذہن سے یہ خیال جھٹک دوں کہ اس دنیا میں کوئی مابتاب بھی ہوئی تھی مگر یاد کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر اس طرح سوچتا اپنے بس میں نہ رہا۔ میں نے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھا کہ مجھے کیا کرتا چاہیے۔ پھر اس کے سوا کوئی طریقہ نہ سوچا کہ کسی پڑوسی سے معلوم کرنے کی کوشش کروں۔

میں نے برابر والی کوٹھی کی کال تیل بھائی۔ تین چار مرتبہ طویل طویل وقفوں تک تیل دینے کے باوجود کوئی جواب نہ آیا۔ میں مایوس ہو کر مابتاب کی کوٹھی سے متصل دوسری کوٹھی کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ اندر پختہ روش پر آہٹ خالی دی۔ کوئی سیلر گھسیٹا آ رہا تھا، پھر آہنی گیٹ میں بنی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی ذرا کھلی اور ایک پھولے پھولے سے مردانہ چہرے کا کچھ حصہ نظر آیا۔

”معاف کیجئے گا۔۔۔ میں نے آپ کو بڑی زحمت دی۔“ میں نے نہایت معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”کیا براہ کرم آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے یہ پڑوسی کہاں گئے ہوئے ہیں؟“ میں نے مابتاب کی کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اس شخص کی غٹوگی بھری آنکھوں میں کسی بے عنوان سے جذبے کی پرچھائیاں اترتے دیکھیں۔ شاید یہ خوف تھا لیکن میں اس وقت کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

”تم کون ہو؟“ اس نے کھڑکی مزید دایکے بغیر کھڑے لہجے میں پوچھا۔

میں کہنے لگا تھا کہ کیا یہ جاننا ضروری ہے؟ مگر میں نے حتی الامکان تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”میں ان کا ایک فیملی فرینڈ ہوں۔ کافی عرصے بعد لندن سے واپس آیا ہوں۔“

مجھے احساس ہو رہا تھا جو میری خوش فہمی بھی ثابت ہو سکتا تھا کہ وہ شخص اندھیرے میں مجھ سے بہتر نہیں دیکھ پا رہا تھا حالانکہ وہ کافی دنوں سے کم روشنی میں رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خوفزدہ بھی ہو چکا تھا۔ میں نے تارکی میں اس کی شبیہ کو بیڈ کے نیچے چھتے دیکھا۔ پھر میں نے اسے اسٹرائٹ بکس بیٹے سے لگائے ایک کھنی اور پیٹ کے بل کھینکے ہوئے بیڈ کے دوسری طرف سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔

اپنی دانت میں خوفزدہ کرنے کے لیے اس نے اندھیرے میں ایک فانر اور جھونک دیا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر فرش سے چپکا ہوا تھا اور سائیلنسر والا ریوالور میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔ اس نے دروازے کے قریب رک کر غالباً ایک لمبے کے لیے سوچا کہ دروازہ کھولنے پر اس کا ہونا مجھے نظر آجائے گا۔ اس نے حتی الامکان پھرتی سے کام لیتے ہوئے پہلے دو فانر کیے، پھر تیزی سے دروازہ کھول کر اسٹرائٹ بکس اٹھا کر باہر چھلانگ لگا دی۔

اس کا خیال رہا ہو گا کہ وہ برآمدے کو پھلانگتا ہوا سیدھا باغیچے کی کھنی زمین پر جا گرسے گا اور وہاں سے اٹھ کر بھاگ لے گا۔ وہ باغیچے کی کھنی زمین پر گرا ضرور لیکن مردہ حالت میں کیونکہ چھلانگ لگاتے وقت میرے ریوالور کی دو گولیاں اس کے جسم میں دھنس گئی تھیں۔

میں نے باہر آکر دیکھا وہ خزاں رسیدہ چوں کے بستر پر پڑا تھا اور زندگی سے محروم ہو چکا تھا۔ اس کے جسم سے بہتا ہوا خون زرد تیلوں کو سرخ بنا رہا تھا۔ میں نے دوبارہ کمرے میں جا کر بیڈ کے نیچے سے اسٹرائٹ بکس اٹھایا اور مزید وقت ضائع کیے بغیر مکان سے نکل آیا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس شخص کے ریوالور سے فائرنگ کی آواز یقیناً دور تک سنی گئی ہوگی۔ رات کے سکوت میں تو ویسے بھی معمولی آواز بھی بند محسوس ہوتی ہے۔ میں اپنے مکان میں لاش چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میں نے براہ راست ہالی وے کا رخ نہیں کیا بلکہ مختلف رہائشی علاقوں سے گزرتے ہوئے ادھر جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک گلی میں دھیرے دھیرے کار ڈرائیو کرتے وقت نہ جانے کیوں ذہن میں ایک لحنت عی تکب سی ہونے لگی۔ شاید یہ گردش ایام کی گھڑی تھی جو الٹی چلتی تھی۔ اس گلی سے کوئی مانوس سی خوشبو آ رہی تھی جس نے لاشعور کی گریب سی کھول دی تھیں۔ یادوں کے اجڑے ہوئے صنم خانوں میں گھینٹاں سی بچ اٹھی تھیں۔ اس گلی میں ایسی کیا بات تھی؟ یہاں کی ہوا کیوں دامن گیر ہوئی جا رہی تھی؟ راستہ کیوں زنجیر بنا جا رہا تھا؟ دور و دیوار کیوں سرگوشیاں کر رہے تھے؟ یہ کیا ماجرا تھا؟

میں اپنے آپ سے پوچھتا رہا اور ایکسپلرٹر سے میرا پاؤں بالکل ہی ہرست گیا۔ پھر ڈونڈ ہی بریک پر جرم گیا۔ تب تک لحنت جیسے لاشعور کے اندھیروں میں سینکڑوں نقاب

اس شخص کی آنکھوں سے میں صاف پڑھ سکتا تھا کہ اسے میری بات پر لکھنا یقین نہیں آیا، تاہم اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”وہ لوگ کو بھی سچ گئے ہیں اور نیا مالک ابھی اس میں شغف نہیں ہوا۔ وہ کہیں گیا ہوا ہے۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کافی عرصہ گزر گیا۔“ اس نے مجھ سے جواب دیا۔

”آپ کو ان کے نئے ایڈریس کا کچھ علم ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں۔۔۔ ان کے نئے ایڈریس کا یہاں کسی کو بھی کچھ علم نہیں۔“ اس نے ایک بار پھر کھردرے لہجے میں کہا اور کھڑاک سے کھڑکی بند کر لی۔ وہ مزید کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ میرا جی چاہا کہ گیٹ پھلانگ کر اس شخص کی گردن مروڑ ڈالوں۔ لوگ نہ جانتے کیوں اتنے بے حس، بے حرمت اور روسخ ہوتے جا رہے تھے۔ کسی کی بات کا تسلی بخش جواب بھی نہیں دے سکتے تھے۔ جو کچھ انہیں معلوم ہوتا تھا وہ بھی کسی پریشان حال کو نہیں بنا سکتے تھے۔ بغیر کسی وجہ کے، ہتھاب کے والدین کا یوں کو بھی سچ کر کہیں چلے جانا میری سمجھ سے بالاتر تھا لیکن فی الحال خاموشی سے لوٹ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پیرامائونٹ ٹریڈرز وہ کثیر التعداد کاروباری ادارہ تھا جس نے چھ ماہ کے قلیل عرصے میں صرف بمبئی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے حصے میں پھیلے ہوئے کاروباری حلقوں میں تھمکے بچا دیا تھا۔ بمبئی کے سب سے بڑے کاروباری مرکز ”بدلا چیمبرز“ کے نین قلورز پر اس کے دفاتر پھیل چکے تھے اور نہ صرف بمبئی کے دیگر علاقوں میں بھی ذیلی دفاتر موجود تھے بلکہ کلکتہ، مدراس اور دہلی تک اس کی شاخیں پہنچ چکی تھیں۔ اس ادارے کے کنسٹرکشن کمپنیوں میں بھی شیئرز تھے۔ بنارس ٹیکنالوجی کے نام سے ایک مل بھی اس ادارے نے خریدی تھی جو روایہ ہو کر بند ہونے کو تھی مگر اب نئی انتظامیہ کے تحت اس کے شیئرز کی قیمت میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا۔

پیرامائونٹ ٹریڈرز ہی کے زیر انتظام ایک قلم کمپنی بھی قائم کی گئی تھی جس کے شیڈول پر چار قلمیں تھیں اور دو کا آناز ہو چکا تھا۔ فلموں کی ڈسٹری بیوٹن کا ایک ادارہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ پیرامائونٹ ٹریڈرز ہی کے الحاق سے ایک ادارہ سرمایہ کاری کا بھی قائم کیا گیا تھا۔ اس میں بمبئی کے چار بڑے سینکڑوں نے خاطر خواہ سرمایہ فراہم کیا تھا جو بہترین منافع کی شرح پر دوسرے پرائیکٹس میں لگنا شروع ہو چکا تھا۔ صرف یہی نہیں اس ادارے نے فنانسنگ کے کام میں بھی ہاتھ ڈالا تھا اور پیرامائونٹ فنانس کے نام سے ایک ذیلی کمپنی قائم کی تھی جس نے حکومت کے ساتھ فنانسنگ کے کام میں شراکت کر لی تھی۔

کاروباری ادارے تو انڈیا میں اس سے بھی کہیں بڑے بڑے موجود تھے لیکن پیرامائونٹ ٹریڈرز کی سب سے اہم اور قابل ذکر خصوصیت یہ تھی کہ اس کا شیئنگ ڈائریکٹر میں تھا۔

اس کے اشتر فیصد شیئرز کا میں تخا مالک تھا اور باقی تین فیصد بمبئی کے چار سینکڑوں میں تقسیم تھے جن کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔

میں نے جب کاروبار کی دنیا میں قدم رکھنے اور ایک لخت اتنے پاؤں پھلانے کا فیصلہ کیا تو مجھے پوری طرح یقین نہیں تھا کہ مجھے اتنی جلدی کامیابی نصیب ہوگی۔ بہر حال یہ احساس الاشوری طور پر ضرور تھا کہ یا تو پتنگ ایک دم ہی آسمانوں پر جا چڑھے گی یا پھر ڈور ہاتھ پر سے کٹے گی لیکن داؤ سیدھا ہی پڑا۔ بعد ازاں میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کاروبار میں عقل کا کردار ضمنی ہوتا ہے۔ زیادہ اہم کردار آپ کی قسمت اور پیسے کا ہوتا ہے۔

میں نے جب کاروبار کی منصوبہ بندی کی تو کافذوں پر مجھے یہ سب کچھ شیخ جلی کا خواب محسوس ہوا تھا۔ یوں تو اس وقت میرے پاس دو کروڑ کے قریب رقم موجود تھی لیکن جس پیمانے پر میں سوچ رہا تھا اس مناسبت سے اس رقم کی مثال اونٹ کے منہ میں زیرہ والی تھی اور پھر میں یہ رقم بھی لے کر ایک دم کاروبار کے میدان میں نہیں کود سکتا تھا۔ ٹیکس ڈیپارٹمنٹ والے شیخ جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاتے کہ اتنی بڑی رقم میرے پاس آئی کہاں سے؟

گو کہ انڈیا میں اس وقت بھی بلیک منی کاروبار کرنے میں لگانے پر تیار ہو جانے والوں سے حکومت نرمی برتی تھی لیکن میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ ایک چھوٹے سے سینٹر کی معرقت سب سے پہلے تو میں نے ایک ایجنٹ کو پکڑا جس نے رقم تو خاصی خرچ کرا دی لیکن نہایت کھل اور بے عیب ایسی دستاویزات انتہائی معافی سے تیار کرا دیں جن کی رو سے میں نے لندن میں حال ہی میں فوت ہونے والے اپنے ماموں کی خاصی بڑی جائیداد فروخت کی تھی اور پیسہ ہندوستان میں کاروبار کرنے میں لگانے لیا تھا۔

میں نے دفاتر بہت شاندار قائم کیے۔ منصوبے قطعی بے عیب تیار کیے اور ان کے سلسلے میں ایک انگریز بزنس ایڈوائزر سے بھی مدد حاصل کی۔ یوں ایک مرتبہ تو میں نے کم پونٹی کے باوجود بمبئی کے اونچے کاروباری حلقے میں کھلبلی مچا دی۔ میں نے بینک آف انڈیا کو چار کروڑ روپے قرض کی درخواست پیش کی۔ لون کمیشن نے ڈیڑھ کروڑ روپے قرض منظور کیا۔

میں نے ایک تجربہ یہ بھی حاصل کیا کہ کاروباری دنیا میں ایک چیز اور بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اسے آپ ایک طرح کی ”دہشت“ کہہ سکتے ہیں۔ ایک بار آپ کی دہشت پھیل جائے تو راستے خود بخود آپ کے لیے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ سینٹر لوگ چپک بکس اور ٹولوں سے بھرے بریف کیس لے کر آپ کے دفتر کے پتھر لگاتے لگتے ہیں۔ اس کے بعد ساکھ کا مرحلہ آتا ہے۔ ایک بار آپ کی ساکھ بن جائے پھر چاہے کسی کام میں ہاتھ ڈال دیجئے صرف ذہن حاضر رکھئے۔ بمبئی آپ کو اوپر سے اوپر لے جائے گا۔

تے ذرا پلک جھپکی تو کھر جاؤں گا۔

وہ موتیا رنگ کے ایک عجیب و غریب کپڑے کی ساڑھی میں لمبوں تھی جو پتیلی دھند کی طرح گویا اس کے جسم پر جما ہوا تھا۔ ایسے ہی کپڑے کے کنیوں تک کے دستائے پہن رکھے تھے بالوں کا جڑا بہت ہی خوبصورت تھا۔ اس کے دھود کی مسکور کن خوشبو وسیع کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سدا بار عورت تھی، ہیشہ کی طرح آج بھی بے پناہ حسین، تروتازہ اور خلقت نظر آرہی تھی۔ بس آنکھوں کی گہرائیوں میں خواہیدہ اداسی کے رنگ کچھ اور گہرے ہو چکے تھے۔

میں نے برف کیس دیک پر رکھا اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف مڑا۔
"معاف کیجئے گا سیٹھ صاحب! میں آپ کا قیمتی وقت ضائع کرنے آئی ہوں۔" اس کے ریلے ہونٹوں نے حرکت کی، لہجہ سیات تھا مگر الفاظ سیات نہیں تھے۔
"دیکھو... اب طرہ دوز کرنے کی کوشش نہ کرو۔" میں اس کے قریب جا بیٹھا اور اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "مجھے دوست جب ایک طویل عرصے کی جدائی کے بعد ملتے ہیں تو ایک دوسرے پر زہریلے لفظوں کے تیر نہیں برساتے۔"

"خصوصاً جبکہ ایک ہی شرمین رہ کر جدا رہنے کی سرتوڑ کوشش کی گئی ہو۔" اس کا لہجہ پہلے جیسا ہی رہا۔ "بہنس انداز میں آپ نے الوداع کہا تھا، اس سے آپ کی مراد غالباً یہی تھی کہ میں آئندہ آپ سے ملنے کی کوشش نہ کروں سیٹھ صاحب! مگر افسوس کہ میں نہ جانے کس جذبے سے گفت کھا کر چلی آئی حالانکہ میں بڑی خوددار عورت تھی سیٹھ صاحب! "اوہ... خدا کے لیے سیٹھ صاحب، سیٹھ صاحب کی گردن بند کرو۔" میں نے اپنائیت بھرے غصے سے اس کے ہڈو کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور فوراً ہی انتہائی ملاحت اور انکساری سے کہا۔ "میں آج بھی تمہارا ایک حقیر غلام ہوں، دوست ہوں، رازدار ہوں، خیر خواہ ہوں، پیار کرنے والا ہوں لیکن میں روایتی عاشق نہیں۔ میں محبت کا ثبوت اسے ہی نہیں سمجھتا کہ تمہارے در پر پڑا رہوں یا بلاناغہ تم سے ملتا رہوں۔ میری محبت کو میرے ہی انداز کا اسیر رہنے دو، میں خواہ کہیں بھی رہوں۔ کتنا ہی عرصہ تم سے نہ ملوں لیکن تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گی، محترم رہو گی، محبوب رہو گی... اس سے زیادہ مجھ سے کچھ نہ مانگو۔"

"میں تو تم سے کچھ بھی نہیں مانگتی۔" وہ ایک نکتہ ٹوٹ گئی، اس کی آنکھیں چمک آئیں... گویا سمندر دھلے کو تھا۔ "لیکن تم ہی کہو کہ یہ کوئی انداز ہے تعلق داری کا؟ مجھے یوں خدا حافظ کہہ کر اچانک روپوش ہو گئے جیسے پاتال میں اترنے لگے ہو... اسی شرم میں بڑبڑاتے رہے۔ اتنی باتیں پھیلا لیں، لہم کہتی بھی قائم کر لی لیکن تمہیں کبھی ببول کر بھی میرا خیال تک نہ آیا؟ کبھی ایک فون ہی کر لیا ہوتا۔ تمہاری کہنی کا کوئی نمائندہ مجھے سناٹن کرنے آیا اور باتوں باتوں میں تمہارا ذکر نکل آیا۔ میرے کربہ کرید کر پوچھنے پر وہ

آپ کو شاید یہ جان کر بھی حیرت ہو کہ میری لہم کہنی کا ڈائریکٹر طلبہ تھا مگر کہ اب اس کے دفتر پر اسے اے لاکھائی (عاشق عی لاکھائی) کی نیم پلیٹ آویزاں تھی۔ وہ معمولی تعلیم یافتہ شخص ہو زیادہ سے زیادہ سو روپے روز پر ایکسٹرا کے طور پر فلموں میں کام کرتا تھا اور بعض اوقات ویلیٹ کے طور پر کام کرتے ہوئے جان کو خطرے میں ڈالتا تھا اور جس کے سلام کا کوئی سیدھے منہ جواب نہیں دیتا تھا، لہم کہنی کو بڑے عمدہ طریقے سے چلا رہا تھا۔ میں نے کام اسے سوچتے وقت ایک لپکھ دیا تھا۔ اب اس کا سابقہ تجربات کو دہرانے یا اپنی اوجھری حسرتوں کو پورا کرنے کا کوئی ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس کے دفتر میں اب بھی لڑکیوں کا نمائندہ بندھا ہوا تھا۔ یہ لائن ہی ایسی تھی مگر اب وہ انہیں پچھلے کمرے میں نہیں دلاتا تھا۔ وہ صاف ستھرا سرٹ پہنے اپنی چھوٹی سی گاڑی میں دفتر آتا تھا اور بڑے وقار اور سنجیدگی سے دفتری اور کاروباری معاملات چلاتا تھا۔ چودہ آدمیوں کا مستقل اسٹاف اس کا ماتحت تھا۔

میری لہنگ کہنی کا سربراہ چھتا تھا۔ وہ گو کہ واجبی ما ہی پڑھا لکھا تھا اور اب بھی دھوئی کرتے میں دفتر آتا تھا لیکن اپنا کام نہایت عمدگی سے چلا رہا تھا۔ نہ مانی آؤٹ سے پتا چلا تھا کہ اس کے شیعے نے سب سے کم مدت میں منافع کی شرح سب سے زیادہ دی تھی۔ وہ بڑا سنجیدہ انسان تھا۔ اس کا ماتحت اسٹاف اس سے بڑا مرغوب رہتا تھا۔

میں نے پیرامونٹ ٹریڈرز کے اسی طرح کے کئی شیعے بنا کر ان کا ایک ایک سربراہ مقرر کر دیا تھا اور انہیں تقریباً آڑوانہ طور پر کام کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح مجھ پر کام کا وزن زیادہ نہیں تھا اور میں منصوبہ سازی اور بھاگ دوڑ میں زیادہ وقت صرف کر سکتا تھا۔

تاہم کاروبار کو میں نے اپنے حواس پر سوار نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ تو میرا زاد راہ تھا، منزل کچھ اور تھی۔ کاروبار کو میں نے ایک انجن کی طرح سیٹ کر دیا تھا جو ایک بار اسٹارٹ ہونے کے بعد خود بخود چل رہا تھا۔ میرا کام صرف انجن کی آواز پر دھیان رکھنا تھا کہ کہیں کوئی پر تہ کھڑکھڑاہٹ تو پیدا نہیں کر رہا۔ کہیں کوئی نٹ بوٹ ڈھیلے تو نہیں پڑ رہے؟ کوئی پر تہ تبدیل ہونے والا تو نہیں؟

ایک روز میں دفتر پہنچا تو میری ٹیکرٹری نے بڑے مسرت بھرے لہجے میں بتایا۔ "سر! میڈم روپا... آپ سے ملنے آئی ہیں۔ میں نے انہیں اندر آپ کے دفتر میں بٹھا دیا ہے۔" اپنے سائڈ پر دف ایئر کنڈیشنڈ دفتر کا دروازہ کھول کر میں بیرونی حصہ عبور کر کے اندر پہنچا۔ روپا ٹانگ پر ٹانگ رکھے صوفے پر پڑے سے ٹیک لگائے بیٹھی خوابگاہ کی آنکھوں سے دروازے ہی کی طرف دیکھ رہی تھی، جیسے میری راہ دیکھتی رہی ہو۔ اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی، وہ یوں میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میں ایک خواب ہوں اور اس

توڑ ڈالا لیکن یہ مت سمجھو کہ اس کے ساتھ تعلق خاطر بھی ٹوٹ گیا۔ میں نے کہا ناں کہ یہ میرا اپنا انداز ہے۔۔۔ اور میری محبت کو میرے ہی انداز کا اسیر رہنے دو۔

”تم تو اپنا فلسفہ گھڑ کر سکون سے اپنی دنیا میں گمن ہو گئے۔“ اس کے لہجے میں نکلت خورہ سا لکھو تھا۔ ”دوسرے کی زندگی تمہارا ہونا چاہیے تمہیں اس سے کیا غرض۔“

میز کے قریب جا کر میں نے انٹرکام پر کرشنا کو کافی بھجوانے کے لیے کہا اور دوبارہ روپا کے قریب آ بیٹھا۔ ”اور سناؤ، کیا گھر بٹوایا تمہارے؟“ میں موضوع بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”بٹوایا نہیں۔۔۔ بتا بیٹا لیا تھا، باندھ میں ہے۔ انٹرنس آگنی نے خاصی جیل جھٹ کے بعد ہرحال کلیہ ادا کر دیا تھا۔ میرا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ ذہنی دھچکے سے سنبھلنے میں خاصی دیر لگی اور بہت سے ضروری کاغذات اور ماضی کی کچھ نشانیوں ضائع ہو گئیں۔“ وہ دھیرے دھیرے بتا رہی تھی۔ موضوع بدلنے سے اس کا لہجہ بھی معمول پر آ گیا تھا اور میں بھی چاہتا تھا۔ ذاتیات پر ہر تکلیف وہ موضوع بھی ہے اور بڑا حیرت انگیز بھی۔

”ہرحال۔۔۔ کیا گھر بٹوانے کو جی نہیں چاہا۔“ وہ بتا رہی تھی۔ ”لیکن جو خریدا ہے یہ بھی خاصا خوبصورت ہے۔“

میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ہچکچاہٹ آمیز اور قد سے شرمیلے سے انداز میں مسکرائی۔ ”تم کب آ رہے ہو؟“ اسے اپنے وجود کی روشنی سے جھلکا ہے؟

”روپا! ایک تو تم میری اتنی عزت افزائی کرتی ہو کہ میرا دماغ ساتویں آسمان پر جا پہنچتا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ویسے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ مجھے جلد ہی تمہارے گھر آنا پڑے گا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تمہیں بھی کسی ایسے دھندے سے لگانے کے بارے میں سوچ رہا تھا جس میں الجھ کر زندگی کے بارے میں تمہاری بے دلی اور لاتعلقی ختم ہو جائے گی۔“

”تمہارا خیال ہے کہ میری فلمی مصروفیات کم ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم تین مصروف ترین ہیروئینوں میں سے ایک ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن فلمی مصروفیتیں تھکا دینے والی ہوتی ہیں، میں تمہارے لیے کوئی ایسی مصروفیات پیدا کرنا چاہتا ہوں جو تمہیں تھکانے کے بجائے تمہارا دل جوش و خروش سے بھر دیں اور اس وقت بھی برقرار رہیں جب فلمی دنیا میں تمہاری مصروفیات گھٹ جائیں گی اور جھنڈا ہٹ بیٹھ جائے گی۔ میں دراصل بہت دور کی سوچنے لگا ہوں۔“

”گویا تم شادی کے لیے تیاریاں مریختے جا رہے ہو۔“ وہ ایک ہار پھر شرارت سے

تمہارے متعلق بتاتا رہا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تم ہی ہو۔ تمہارا خیال تھا کہ اسی شہر میں رہ کر اتنا کاروبار پھیل کر اور خصوصاً فلم کے دھندے میں بھی ٹانگ اڑانے کے باوجود تم میری نظروں سے اوجھل رہو گے؟ میں نے کنٹریکٹ تو سائن کر دیا لیکن ایک حسرت سی محسوس ہوئی کہ کاش یہ کنٹریکٹ سائن کروانے تم آئے ہوتے۔۔۔ اس نے موتیا رنگ کے ہی ایک چھوٹے سے نفیس رومال سے آنکھیں میچ کر پونچھیں اور جھرجھری سی بے کاریوں منہل مٹی گویا اپنی اس کیفیت پر شرمندہ ہو۔ اسے ندامت ہو کہ وہ اپنے آپ پر قابو کیوں نہیں رکھ پا رہی۔

”یہ تو ایک غیر اہم چھوٹا سا کاروباری معاملہ تھا جس کے متعلق مجھے علم بھی نہیں کہ کوئی نمائندہ تمہارے پاس گیا تھا۔“ میں نے اس کے گداز ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں حسرت محسوس ہوئی کہ کنٹریکٹ سائن کروانے میں تمہارے پاس آیا ہوتا۔ بالکل بیکار کی بات کی تم نے؟ خدا نہ کرے جو میں کسی کاروباری اور وہ بھی اتنے معمولی کام کے لیے تمہارے پاس آیا ہوتا۔ تم سے میرا تعلق کاروبار کا نہیں، جذلوں کا ہے۔ تم سے میرا معاملہ لین دین کا نہیں، دل کا ہے۔ میں تمہارے پاس آکر آتا تو کسی جذبہ دل کی تجدید کے لیے آتا۔۔۔“

”اور وہ دن شاید کبھی نہ آتا۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔

”چلو میں نہیں آسکا، تم آگئیں۔ تم نے مجھے عزت بخشی، میرا مان بڑھایا۔“ میں نے غلوں سے کہا۔ ”میں پہلے بھی تمہارا زیر بار تھا، اب تمہاری اچھائیوں کے بوجھ تلے کچھ اور دب گیا ہوں۔ اب ان گلے لٹھوؤں کو چھوڑو۔۔۔ یہ بتاؤ کیا بیوی؟ جو کچھ تم بتاتی ہو، وہ بھی یہاں دستیاب ہے۔“

”تمہیں پتہ ہے گھر سے نکلنے کے بعد میں نہیں پیتی۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں صرف کافی چیزوں کی لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ آخر اس ڈرامائی قطع تعلق میں کیا مصلحت تھی؟ اس کی تمہ میں کوئی بھید ہے جو میں کھولنا چاہتی ہوں۔“

”کوئی بھید نہیں۔“ میں نے تیزی سے ہاتھ بدایا۔ ”میں محسوس کر رہا تھا کہ تمہارا میرا تعلق عشق بنتا جا رہا ہے۔ بہت سے کاموں میں عشق ممیز ثابت ہوتا ہے۔ آپ کو تحریک دیتا ہے، تیزی سے آگے بڑھاتا ہے۔ اس کی بدولت انسان سے عجیزے سرزد ہونے لگتے ہیں لیکن بعض کاموں کے راستے میں عشق دیوار بن جاتا ہے۔ انیون کی تاثیر دکھانے لگتا ہے، آدمی کو ست کر دیتا ہے۔ میں زندگی میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں، اس کے سلسلے میں بھی مجھے اندیشہ تھا کہ عشق میرے لیے ممیز ثابت نہیں ہوگا، انیون بن جائے گا۔ عشق کے سوا میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔۔۔ اور تعلق داری کی دور چو نکہ بہت ابھی ہوئی تھی اور اسے بہت آہستہ سمجھانے میں مجھے کامیابی نہیں ہو رہی تھی اس لیے میں نے جھٹکے سے اسے

مسکرائی۔۔۔ "کاش تم مجھے اس وقت سے ہوتے جب میں شادی کی حلاقت کو دہرانے کے سلسلے میں پوری طرح سنبھود ہو رہی تھی مگر قدرت نے بال بال بچا لیا۔"

اور کاش تم اس وقت بھی میرے قریب موجود ہو جب میرے دل میں شادی کی خواہش پیدا ہو جائے۔" میں نے بھی شرارت کیا۔

"وہ دن آئے تک اپنے تو نہ منہ میں دانت ہوگا نہ پیٹ میں کنت۔" اس نے مصنوعی آہ بھر کر کہا۔

"مجھے تم اس وقت بھی جہاں ہے اور بھی ہے" کی بنیاد پر قبول ہو گئی۔" میں نے کہا "ویسے حال اپنا بھی تم سے کچھ مختلف نہیں ہوگا۔"

دو گھنٹہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی 'غالبا کافی آگئی تھی۔

آفس ہوائے کافی کی ٹرائی لیے اندر آیا اور دو گھنٹہ تیار کر کے ہمیں دے کر خاموشی سے واپس چلا گیا۔ کافی پینے کے بعد روپا بھی بادل نخواستہ سے انداز میں رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک اپنی جگہ ساکت بیٹھ گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ میرے اعصاب میں کچھ ارتعاش سا پیدا ہو چکا تھا جو میرے نزدیک کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ میں جذباتی بالکل وغیرہ سے اپنے آپ کو حتی الامکان محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے کام شروع کر دیا پھر چند منٹ بعد کر شینا کو بلا دیا۔

"انگریزی کے دو تین بڑے اخباروں میں صبح کے لیے ایک اشتہار دے دو کر شینا!"

مجھے ایک اسٹینو ٹائپسٹ کی ضرورت ہے جو بطور اسٹینو ٹائپسٹ خواہ اچھی نہ ہو لیکن نہایت خوبصورت، بے عیب اور گرامر کی غلطیوں سے پاک انگریزی لکھ سکتی ہو۔ اسے ہر بات وضاحت سے نہ سمجھانی پڑے، میرا مطلب سمجھ رہی ہو ناں؟"

"جی سر! مجھے بھی تو اسی صلاحیت کی بنا پر آپ نے ترجیح دی تھی۔" اس نے محتاط انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کسی اچھے ادارے کی تعلیم یافتہ ہو۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ جتنی لڑکیاں بھی انگریزوں کے آئیں، ان میں سے دو یا تین لڑکیاں منتخب کر کے انہیں ان کی فائلیں دے کر میرے پاس بھیج دیتا۔ ان میں سے ایک کو میں خود منتخب کروں گا۔ یہ کام پھر کو رکھ لو۔ آج سے ٹھیک پانچ دن بعد۔"

"او کے سر!" اس نے مستعدی سے کہا اور سمجھ گئی کہ اب مجھے مزید کچھ نہیں کہنا ہے، اس لیے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

پھر کو میں دہلی میں ایک میٹنگ میں شرکت کر کے گیارہ بجے کی فلائٹ سے بمبئی واپس پہنچا اور ایئر پورٹ سے سیدھا دفتر چلا گیا۔ ابھی میں بریف کیس رکھ کر بیٹھ ہی تھا کہ انٹرکام پر منگول ملا۔ میں نے ریسپونڈ کیا۔۔۔۔۔ دوسری طرف کر شینا تھی۔

"سر! شیڈول کے مطابق آج آپ کو اپنے لیے اسٹینو ٹائپسٹ کا انتخاب کرنا تھا۔"

کر شینا بولی۔ "میں صبح سے کانفرنس روم میں ان لڑکیوں کے ساتھ معزز کھپ رہی تھی، پولیس چوبیس لڑکیاں آئی تھیں۔"

"تم نے ان میں سے کتنی منتخب کی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"صرف دو۔" کر شینا نے جواب دیا۔ "بلکہ سچ پوچھئے تو میرا ووٹ صرف ایک ہی کے حق میں تھا لیکن میں نے اپنے طور پر اس اکیلی پر انحصار نہیں کیا کہ آپ شاید اس کی صلاحیتوں کے باوجود اسے منتخب کرنے کا فیصلہ نہ کریں، اس لیے میں نے ایک اور بہترین لڑکی کو ساتھ رکھا ہے اور دو لڑکیوں کو ڈسٹنگ لسٹ پر بھی رکھا ہے۔"

"اس لڑکی کے بارے میں تم نے یہ کیوں سوچا کہ میں شاید اس کی صلاحیتوں کے باوجود اسے منتخب نہ کروں؟" میں نے پوچھا۔

"سر!" کر شینا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اس بری طرح برقعے میں لپی ہوئی ہے کہ صرف آنکھیں نظر آتی ہیں، دوسرے یہ کہ مجھے اس کی وجہ بھی اتفاقاً معلوم ہو گئی اس کی شکل اتنی خوفناک ہے کہ شاید آپ اسے سامنے بیٹھے دیکھ کر ڈرتے رہا کریں۔ ویسے اس کا اصرار ہے کہ وہ دفتر میں بھی اسی طرح برقعے پہنے رکھا کرے گی لیکن یہ بھی عجیب لگے گا۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک میں کسی دنیاوی چیز سے نہیں ڈرا۔" میں نے کہا۔ "بہر حال تم پہلے اس لڑکی کو اندر بھیج دو جو بہ صورت نہیں ہے۔" میں نے ریسپونڈ رکھ دیا اور مین دبا کر دروازہ پر سبز بلب روشن کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد جو لڑکی اندر آئی، وہ مجھے پہلی ہی نظر میں بھلی لگی وہ سرخ و سپید اور دراز قد تھی۔ عمدہ تراش خراش کے لباس میں تھی۔ اس نے بہت ہی ہلکا میک اپ کیا ہوا تھا۔ اسے خوبصورت لڑکیوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ وہ دوانی سے انگریزی بول سکتی تھی اور اس کی حرکات و سکنات سے سلیقہ جھلکتا تھا۔ اس میں سستے پن کی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ کسی اچھے گھرانے کی فرد معلوم ہوتی تھی۔ تعلیم بھی اس نے اچھے اور معروف تعلیمی اداروں میں پائی تھی۔

میں نے چند ثکات بنا کر اسے ایک لیٹر ٹائپ کرنے کے لیے کہا، وہ میرے دفتری کے ایک گوشے میں پڑے بی ایم الیکٹرونک ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کرنے لگی اور میں کچھ فائلیں دیکھنے لگا۔

چند ہی منٹ میں ہو خط ٹائپ کر کے لائی، اسے پڑھ کر میں دل ہی دل میں عیش عیش کر اٹھا۔ میں اس کے تقرر کا فیصلہ تقریباً کر ہی چکا تھا۔ جب مجھے یاد آیا کہ کر شینا نے ایک اور لڑکی کا تذکرہ کیا تھا جو حد سے زیادہ بد صورت مگر اس کے خیال میں بہت زیادہ اہلیت کی

”یہ پوچھو کہ خوشی سے مراد نہیں جاؤ گے۔“ میں نے اب قدرے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ”تھکوا میرا مسخ شدہ چہرہ دیکھ کر تمہیں خوشی ہوگی۔“ اس کی سرگوشی میں اس مرتبہ کند ٹھنڈی سی چھین تھی۔

”نہیں... خوشی تو تمہارے دل جانے کی ہوگی، کسی بھی عالم میں سہی، میں تو نہیں۔“ میری آواز اب پر سکون ہو چکی تھی۔ ”سرخ شدہ چہرے پر غور کرنے کا مرحلہ بعد میں آئے گا۔ پہلے ملن کی لذت سے تو حلق انداز ہو لینے دو۔“ میں نرم نرم چڑے کی پوشش والی گودے دار کرسی میں بڑا تو دھنسا جا رہا تھا یا پھر کرسی سمیت فضا میں بلند ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اس موقع پر بھی اپنے محسوسات کو اعتدال پر رکھنے کی کوشش کی۔

میں اٹھ کر اس کی طرف دوڑا نہیں... میں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے وجود کو بازوؤں کے حلقے میں سیٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں قلم کر یہ نہیں کیا کہ جو آنسو انگارے بن کر اسے اندر ہی اندر جھلکا رہے ہیں، انہیں وہ میرے دامن میں ڈال دے، میں موتیوں کی طرح انہیں منہال کر رکھوں گا۔ یہ سب کچھ کرنے اور سننے کو میرا دل چاہا رہا تھا مگر میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔

ماہتاب میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی... پھر دھیرے دھیرے اس نے نقاب چہرے سے ہٹا دیا۔ مجھے نہ تو حیرت کا جھٹکا لگا اور نہ ہی خوف آیا۔ میں نے ایک فوٹو گرافر کی سی باریک بینی سے اس ٹکڑے چہرے کا جائزہ لیا۔ آنکھوں کے سوا اس چہرے پر کچھ بھی سلامت نہیں تھا۔

جلد جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ نہیں سے سیاہی بھانک رہی تھی اور کہیں سے ہڈیوں کی سفیدی۔ وہ رخسار جو کبھی گلاب کو شرباتے تھے، جیسے انگاروں پر جھلس چکے تھے۔ وہ ہونٹ جن سے یاقوت کی سی سرخی پھلکتی تھی، چٹکبوتے ہو چکے تھے اور نچلا ہونٹ تو آدھا غائب ہی تھا۔ اس جگہ ننگے ننگے دانت حسین ہونے کے باوجود ڈراؤنے لگ رہے تھے۔ ستواں ٹاک کے آس پاس گوشت کھینچ چکا تھا جس کی وجہ سے ٹاک قدرے ٹیڑھی لگ رہی تھی۔ ٹاک کی پھٹنگ بھی غائب تھی اور ہاتھی جیسے پر بھی سیاہ داغ تھے۔

یہ وہی ماہتاب تھی جس کے حسن نے کالج میں تسمکہ بچا دیا تھا جسے دیکھ کر نوجوانوں کے دس دھڑکنا بھول جاتے تھے اور بڑے بڑے سنجیدہ اور معمر پروفیسروں کے چہرے پر بھی رونق آجاتی تھی۔

یہ وہی ماہتاب تھی جس کی محبت میری زندگی کا حاصل تھی، جسے میں نے پونے کی حد تک چاہا تھا۔

چند لمحے کے لیے ہم دونوں خاموش رہے اور یہ ہند لمحے گویا صدیوں پر محیط تھے، پھر میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ”اب مجھے سب کچھ بتاؤ کہ یہ کیسے ہوا... کوئی پہلو

ماک تھی۔

میں نے اس لڑکی کو جس کا تحریر کا نمونہ میں دیکھ چکا تھا، یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ کل تک نیلی فون پر اسے حتیٰ فیصلے سے مطلع کر دیا جائے گا، پھر میں نے کرینین کو ہدایت کہ وہ نقاب پوش بد صورت لڑکی کو اندر بھیج دے۔

سر سے پاؤں تک سیاہ برقعے میں لپیٹا ہوئی وہ سرو قد لڑکی اندر آئی۔ اس کی ٹاک اور پیشانی تک نقاب میں چھپی ہوئی تھی۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ساحر آنکھیں، جمیل آنکھیں، غزالی آنکھیں، یہ سب تشبیہات ان آنکھوں کے لیے سچ تھیں۔ وہ شاید دنیا کی حسین ترین آنکھیں تھیں، کم از کم میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ حسین آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔

مگر تمام تر حسن و کشش سے قطع نظر یہ آنکھیں اس قدر سونی تھیں کہ ان میں جھانکتے ہوئے مجھے اندر ہی اندر جھرجھری سی آگئی۔ اس نے اپنے کوائف کی فائل نہایت آہستگی سے میز پر رکھ دی اور سیدھی کھڑی پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتی رہی۔ پلکیں جھپکانے میں مجھے بھی کامیابی نہیں ہو رہی تھی... میرا دواں دواں جیسے پتھر اُٹیا تھا۔

وہ بھی اپنی آنکھوں میں تڑپتے پھڑکتے کسی جذبے کو مدفون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کوشش میں دل اس کا بھی خون ہو رہا ہو گا مگر بڑا حوصلہ تھا اس کا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ شروع ہی سے ایک غیر معمولی لڑکی تھی، اس لیے ابھی تک اپنے ہیروں پر کھڑی تھی۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ میرے سکوت کو دیکھتے ہوئے شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ میں اسے پہچان نہیں، شاید اس سے اس کی انا بھی مجروح ہوئی تھی اور جیسی شاید وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ خود بھی کچھ نہیں کہے گی۔ نوکری کی تلاش میں آئی ہوئی امیدوار ہی بنی رہے گی۔

شاید اس کا خیال تھا کہ جن آنکھوں سے مگر مگر میری طرف دیکھ رہی تھی، انھیں ان کی مدد سے میں اسے نہیں پہچان سکتا۔ کتنی بھولی تھی وہ۔ ان ساحر آنکھوں کو بھٹانا میں جیسے بھول سکتا تھا؟

یہ میری ماہتاب کی آنکھیں تھیں۔

”میرے سامنے بیٹھ جاؤ ماہتاب، اور چہرے سے نقاب ہٹا دو۔“ میرے سینے کی قبر سے یہ آواز اس مردے کی کراہ کی طرح برآمد ہوئی جسے کسی مجبورے کے تحت دھیرے دھیرے زندگی مل رہی ہو۔

اس کی آنکھوں میں زلزلہ سا آیا۔ ”نہوؤں کا ایک سیلاب تھا جسے اس نے روکنے کی کوشش کی تھی۔“ ”ڈر تو نہیں جاؤ گے؟“ اس نے کسی رعب کی طرح سرگوشی کی۔

تشنہ نہ رہنے پائے۔

”کیا کرو گے من کر؟“ اس کے لہجے میں اب بھی ذہر تھا۔ ”سانپ نکل جائے تو نیکر پیٹنے کا فائدہ؟“ میں نے جب تمہیں آوازیں دے کر روکنا چاہا تھا کہ تم مجھے کن خطرات میں گمری ہوئی پھوڑ کر جا رہے ہو؟ اس وقت حد سے زیادہ جذباتی بنے ہوئے تھے اب حد سے زیادہ سرد مزاج بنے ہوئے ہو۔“

”تم مجھ پر ذہر میں بچے ہوئے جتنے بھی تیر برساؤ۔۔۔ بلکہ زندگی بھر برساتی رہو گی تب بھی اس لڑیاں کا حساب پورا نہیں ہوگا جو میری وجہ سے تمہیں پہنچا ہے لیکن جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں خدا کے لیے اس کا جواب ضرور دو۔۔۔ یہ بہت ضروری ہو گیا ہے۔“ میں نے یہ سب کچھ اتنے دھیمے پن سے کہا تھا کہ ایک ایک لفظ اس کے ذہن میں اتر جائے۔

چند لمحے وہ میرے پیچھے کسی چیز پر نظر جمائے بیٹھی رہی۔ پھر میری طرف دیکھے بغیر دھیرے سے بولی۔ ”سب کچھ ایک ڈراؤنا خواب لگتا ہے۔ کتنی جلدی سب کچھ ہو گیا۔ آشیاں بنانے میں بڑا وقت لگتا ہے۔۔۔ نکا نکا چتے چتے عمر بیت جاتی ہے لیکن اچانک میں کچھ دیر نہیں لگتی۔“



وہ چند لمحے خاموش رہی گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ ہات کہاں سے شروع کرے۔ آخر اس نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”تمہارے غائب ہونے کے چند روز بعد ہی ابو کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ وہ دکان کے سامنے اپنی گاڑی پارک کر کے سڑک پار کر رہے تھے کہ ایک تیز رفتار ٹرک اچانک نمودار ہوا اور انہیں پکلتا ہوا گزر گیا۔ ہم نے اسے محض ایک حادثے ہی سمجھ کر جس طرح بن پڑا برداشت کیا لیکن بعد میں کہیں زیادہ اذیت اس وقت ہوئی تھی جب پتا چلا کہ یہ حادثہ نہیں تھا۔۔۔ یہ بتانے کی تو کوئی ضرورت نہیں کہ اس ٹرک کا کوئی سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ ابھی میں اور امی چالیسویں کے بعد ایک دوسرے کے آنسو پونچھنے ہی میں مصروف تھے کہ صراف بازار میں رات کو وحشی پولیس کے کئی سپاہیوں اور صراف بازار کے اپنے چوکیداروں کی موجودگی میں ہماری دکان پر ڈاکہ پڑا اور ڈاکو گویا دکان میں بھاڑو پھیر گئے۔ لاکھوں کے قیمتی زیورات اور ہیرے موتیوں میں سے ایک اور بھی نہیں بھوڑا بلکہ ایک سیف ان سے نہیں ٹوٹا تو سیف ہی دیوار سے اکھاڑ کر لے گئے۔ ہم نے اب بھی یہی سمجھا کہ تقدیر ہمارے خلاف سازش کر رہی ہے اور ہم نے محض اس متوکلے سے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ مصیبت تھا نہیں آئی۔ جواہرات اور زیورات کی دکان میں ابو کی ایک ہندو سیٹھ ارجن داس سے پارٹنرشپ تھی وہ بہت ہی اچھا اور ہمدرد قسم کا آدمی تھا۔ ابو اپنی زندگی میں اس پر بہت اعتماد کرتے تھے اس لیے ظاہر ہے امی کی نظر میں بھی اس کا مقام محترم تھا۔ ڈاکے کے چند روز بعد وہ آدمی امی کے پاس آیا نہایت افسردہ دلوں تھا لیکن اس نے مجھے اور امی کو بہت ڈھارس دی۔ اس کی شیریں بیاہی کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔

سیٹھ ارجن داس نے امی کو بتایا کہ دکان کے حصے کی رقم اور ابو کا بینک بیلنس وغیرہ حاصل کرنے میں انہیں بہت وقت لگے گا اور بہت سے قانونی ٹھانکس کی وجہ سے شاید انہیں کسی ایک یا دونوں چیزوں سے محروم ہونا پڑ جائے اور چونکہ انہیں قانونی معاملات کا اور آگ نہیں ہے اور وہ محض وکیل پر انحصار کر کے سارے معاملات سے نہیں نمٹ سکتیں اس لیے بہتر یہ ہے کہ امی اس کے نام پاور آف اٹارنی لکھ دیں وہ خود ہی سارے کام سنبھال کر لے گا۔

ای کاروباری معاملات میں بالکل انٹری تھیں، سینئر ارجن داس کی شیریں بیانی کے جال سے نہ بچ سکیں۔ انہوں نے نہ صرف پاور آف اتارنی لکھ دی بلکہ وصیت نامہ بھی اسکے حوالے کر دیا کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ پاور آف اتارنی کے کاغذات کے ساتھ وصیت کی ایک مصدقہ نقل بھی منسلک ہوگی۔ مصدقہ نقل تیار کرنے کے بعد وہ اصل وصیت نامہ واپس کر دے گا۔

اس کے بعد سینئر ارجن داس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ ائی کے اکاؤنٹ میں کچھ رقم تھی لیکن وہ کب تک ساتھ دے سکتی تھی؟ ہاتھ تنگ ہونے پر ائی نے انشورنس کمپنی اور بینک وغیرہ سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ سینئر ارجن داس انشورنس کا کیم اور بینک بیلنس وغیرہ سب وصول کر چکا ہے، ائی نے اس کے گھر فون کیا، وہ ریموٹ تھا۔ اس کے دو بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا باپ ڈانگلینڈ چلا گیا ہے اور وہاں کوئی کاروبار سیٹ کرنے کے چکر میں ہے، اس لیے دو سال تک واپس نہیں آئے گا۔

ای نے حواس باختگی کے عالم میں اپنے اور اس کے مشترکہ وکیل سے رابطہ قائم کیا، وہ نہایت رکھائی سے پیش آیا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی ارجن داس سے مل چکا ہے۔ اس نے بتایا کہ ارجن داس کے خلاف مقدمہ قائم کرنے کے لیے کوئی ٹھوس بنیاد موجود نہیں ہے اور اگر مقدمہ کیا بھی گیا تو سالوں چلے گا اور ائی کو کچھ ملنے کے بجائے اپنا مقدمہ کے اخراجات ادا کرنے پڑ جائیں گے۔

ادھر سے مایوس ہو کر ہم ابھی کوئی دوسرا راستہ تلاش بھی نہ کر پائے تھے کہ ایک روز مدن موہن دو بد معاشوں کے ساتھ ہمارے ہاں آیا۔ پہلے اس نے بڑے مہذبانہ انداز میں ہمارے حالات پر اظہارِ ہمدردی کیا۔ پھر ائی سے کہنے لگا کہ اگر وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھامیں تو سارے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔

مجھے شب تو پہلے ہی تھا، اب یقین ہو گیا کہ کم از کم ٹرک والے حادثے اور دکان کی ڈکیتی کے پیچھے اس کا ہاتھ تھا۔ ائی ظاہر ہے، اس کی بات سن کر آگ بگولہ ہو گئیں۔ تب اس کا انداز مخاطب یکسر بد گیا۔ اپنے مخصوص دفرانہ لہجے میں بولا۔ ”بڑھیا! رسی جل گئی مگر مل نہیں گیا۔ میں چاہوں تو ابھی تمہاری بیٹی کو اٹھا کر لے جاؤں لیکن میں تم دونوں کو اپنے قدموں پر جھکا چاہتا ہوں۔ وہ دن دور نہیں جب تم خود اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اسے میری جھولی میں ڈالنے آؤ گی اور یہ خود بھی میری نظر کرم کے لیے سو سو جتن کرے گی۔ میری نوازشات کے لیے ترے گی۔“

ای نے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا۔ تب وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا، اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا اور اس نے پنڈلی پر بندھا ہوا بھجر نکال کر ائی کے سینے میں

اتار دیا۔۔۔۔۔

ماہتاب کی آواز منہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود بھرا مٹی اور آنکھوں کا سونا پن بڑھ گیا۔ چند لمحے تک وہ کہنے بیٹھے ہونٹوں کو پیچھے پیچھی رہی۔ پھر جھجھری سی لے کر ایک طویل سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”تم اس وقت کا تصور نہیں کر سکتے، ایک جوان لڑکی کے گھر میں رات گئے تین درندہ صفت بد معاش گھسے ہوئے ہوں، سامنے خون میں است پت مالا کی لاش پڑی ہو اور پاس پڑوس میں ایسا کوئی بھی نہ ہو جو آپ کی آواز سن کر دیکھنے کے لیے آجائے کہ معاملہ کیا ہے۔ اس لڑکی کا اس وقت کیا عالم ہوگا، یہ تم نہیں جان سکتے۔“

مدن موہن نے قہقہہ لگاتے ہوئے شہادت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں چاہوں تو ابھی تمہیں اٹھا کر لے جاؤں لیکن اب بات اس سے بڑھ مٹی ہے، تم میری خدمت بن گئی ہو۔ اب میں اس وقت کے لیے تھوڑا سا انتظار کر لوں گا جب تم غنیمتوں کے بل ریختی ہوئی آؤ گی اور پالتوی کی طرح میرے قدموں میں لونا کرو گی۔۔۔ میں جب چاہوں گا تمہیں تھکی مفلک گا اور جب چاہوں گا ٹھوکریں ماروں گا۔“

مدن اور اس کے ساتھی بڑے اطمینان سے رخصت ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں دیر تک ائی کا سر ہاتھ تھامے ان کے سر ہانے مگم صم بیٹھی رہی۔ اس امید پر کہ شاید یہ کوئی ذراؤنا خواب ہے، جلد ہی نوٹ جائے گا۔۔۔۔۔ لیکن پھر مجھے یقین کرنا ہی پڑا۔۔۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ہمارے علاقے کا تھانہ کس طرف ہے۔ آدھی رات کے قریب میں پوچھتی پوچھتی گرتی پڑتی تھانے پہنچی۔ وہاں پر موجود ہر پولیس والا اپنے اپنے عہدے کے مطابق میرے جسم کے مختلف حصوں تک رسائی کی کوشش کرنے لگا۔ ہانا خرمش نے جب انگریزی میں انہیں گالیاں دیں تو وہ کچھ کچھ پیچھے ہٹے۔۔۔۔۔ پھر ایس ایچ او نے آکر ڈانٹ ڈپٹ کر سب کو ان کے کاموں پر لگایا۔۔۔۔۔ بڑی توجہ اور ہمدردی سے میری کہانی سنی۔

میرے حواس قفل اور اعصاب منتشر تھے لیکن جیسے بھی مجھ سے بن پڑا، میں نے مدن موہن کے متعلق سب کچھ تفصیل سے بتانے کی کوشش کی، اس نے مجھے بڑی تسلیاں دیں۔ مجھے انصاف بہم پہنچانے کا وعدہ کیا۔ اس قسم کے کئی خلاف ورزیاں بھی بولے جو ہندوستانی فلموں میں عموماً بولے جاتے ہیں۔ قانون کی بالادستی، مظلوم کی داد دے گی اور اس قسم کی دوسری باتیں۔ مھن بکواس۔۔۔۔۔

پولیس آکر میری ائی کی لاش لے گئی۔۔۔۔۔ دو سرے روز پوسٹ مارٹم کے بعد لاش ملی اور تقریباً نوادروں کے سے انداز میں دفن کر دی گئی۔ کانج سے میں فارغ ہو چکی تھی۔ کلاس نیوڈ سب ادھر ادھر بکھر چکے تھے۔

میں شہیں مختصر سب کچھ بتا رہی ہوں۔۔۔۔۔ تھانے پکھری کے درمیان مدن موہن کا کچھ نہیں بگڑا۔۔۔ میں اپنے آپ کو بے حد غیر معمولی لڑکی سمجھتی تھی لیکن ان حالات میں سارا

غیر معمولی پن دھرا رہ گیا تھا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس شہر سے کہیں چلے جانا چاہیے، چپ چاپ نکل لینا چاہیے۔ یہاں زندگی میرے لیے حرام کر دی گئی تھی۔ یہ بات طے تھی کہ میرے لیے حالات اس سے برے ہی ہو سکتے تھے، اچھے نہیں۔ چنانچہ میں نے بہیٹی آنے کا فیصلہ کر لیا۔ دل میں ایک سوہوم کی امید یہ بھی تھی کہ شاید یہاں کہیں زندگی کے موڑ پر تم سے بھی سامنا ہو جائے۔

اس نے اداس سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں کی بے میت کچھ اور بڑھ گئی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”راجہ ثانی ایک پراپرٹی ڈیلر نے مجھے تنہا وادارث دیکھ کر مکان بھی چند ہزار میں مجھ سے ہتھیا لیا۔ اس نے مجھے ایسے پکڑ رکھے کہ میں چند ہزار کی رقم ہی قبول کرنے پر تیار ہو گئی۔ میں نے کوٹھی کی چابی راجہ صاحب کے حوالے کی اور ٹیکسی کر کے سٹیشن پہنچ گئی۔۔۔۔۔ میں ابھی پلیٹ فارم پر قلی کی تلاش میں نظری دوڑا رہی تھی کہ ایک شخص جانے کس سمت سے مجھ سے آکر لیا۔ میں نے صرف اس کا ہاتھ حرکت میں آنے دیکھا جس میں شیشے کا کوئی برتن سا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ شخص دھوم میں غائب ہو گیا۔ مجھے یکن محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے میرے چہرے پر انگارے پھینک دیئے ہیں جو وہیں چپک کر رہ گئے ہیں۔

میرے حلق سے شاید اذیت بھری جھپٹیں نکل رہی تھیں اور میں پلیٹ فارم پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگی تھی۔ میری آنکھیں بند تھیں، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ درحقیقت ہوا کیا ہے۔ بس اذیت کا ایک احساس تھا، میں نے اپنے ارد گرد لوگوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں سنیں لیکن جلد ہی میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ مابتدب نے ایک بار پھر خاموش ہو کر قلعہ میں گھورا گویا اس وقت کے تصور سے اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہو۔ ”مجھے بوش کیا تو۔۔۔۔۔“ اس نے میری منظر نگاہوں کو محسوس کرتے ہوئے ایک بار پھر بونا شروع کیا۔ ”میرے چہرے پر برستی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور گردن تک چہرہ نیچوں میں لپٹا ہوا تھا، صرف آنکھوں پر بیچوں کے درمیان ایک موٹی لکیر جتنا خلا تھا جس سے میں اپنے گرد و پیش کا منظر دیکھ سکتی تھی۔ سب سے پہلے تو اس احساس سے میری روح کو طمانیت ہوئی کہ میں دیکھ سکتی تھی، میری بینائی محفوظ تھی ورنہ جب میں ریلوے پلیٹ فارم پر تری تھی تو مجھے یکن محسوس ہوا تھا کہ میری بینائی بھی جاتی رہی ہے۔

ارد گرد دیکھنے پر احساس ہوا کہ میں کسی ہسپتال میں تھی۔ جلد ہی ایک لیڈی ڈاکٹر مجھے دیکھنے آئی۔ اس نے میرے اشاراتی استفسار پر بتایا کہ کسی نے میرے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا۔ میری آنکھیں معجزانہ طور پر محفوظ رہی تھیں، لوگوں نے مجھے ریلوے کے بعض کارکنوں کی مدد سے ریلوے ہسپتال پہنچا دیا تھا کیونکہ اس وقت قریب وہی تھا۔ میں نے اشاروں ہی اشاروں میں اپنے سامان کے متعلق پوچھا تو پتا چلا کہ میرے قریب

صرف ایک سوٹ کیس پایا گیا تھا جو اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے۔ بیگ کا کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ مجھے اپنی آخری پونجی لٹ جانے کا کوئی خاص دکھ نہیں ہوا، شاید بربادی اور مسلسل تباہی کے راستے پر ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب ہر صعوبت بچ ہو کر رہ جاتی ہے یا پھر شاید انسان کا احسان ہی مر جاتا ہے۔

شام کو ایک اے ایس آئی میرا بیان لینے آیا تاکہ ایف آئی آر درج کیا جاسکے لیکن لیڈی ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ فی الحال میں بولنے سے قاصر ہوں اور ابھی میرے منہ پر پٹی دھلی نہیں کی جاسکتی۔ میں نے اشارے سے اے ایس آئی سے کاغذ اور قلم مانگا اور اسے ایک رقم لکھ کر دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ کس نے میرے چہرے پر تیزاب پھینکا اور کیوں پھینکا۔ میں تو ایک کام کے سلسلے میں چند دن کے لیے بہیٹی جا رہی تھی۔

میں نے اس سے رقم اور قیمتی اشیاء سے بھرے ہوئے بیگ کے متعلق بھی کچھ نہیں پوچھا بلکہ میں نے تو اس سوٹ کیس کے سلسلے میں بھی کوئی سوال نہیں کیا جو اس کی تحویل میں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے چہرے پر تیزاب پھینکنے والا شخص ملن موہن کے گھر کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ جھنڈا ہٹ میں اس نے آخری قدم اٹھایا تھا اور مجھے موت سے زیادہ بھیاں مزا دی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جس وقت میں پونا کو الوداع کہنے کی تیاریاں کرتی پھر رہی تھی، اس کا کوئی نہ کوئی گرگا مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

اب ان سب باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، خصوصاً پولیس کے سامنے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ دولت اور طاقت کے قانون کے سامنے پولیس اور عدالتیں کسی کو کتنا انصاف فراہم کر سکتی ہیں۔

میں ہسپتال میں سولہ دن زیر علاج رہی۔ آخری پٹی کھلنے کے بعد ڈاکٹروں نے مجھے ہمت و استقامت کے موضوع پر ایک اور اجتماعی لیکچر دیا۔ اس کے بعد مجھے آئینہ دکھایا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں جینیں مارنے لگوں گی۔ زار و قطار روؤں گی لیکن ایسا نہیں ہوا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ذہنی طور پر اس سے بھی کسی بدتر صدموں کے لیے تیار ہو چکی تھی یا پھر شاید زندگی سے میری دلچسپی ہی ختم ہو گئی تھی۔ صدموں اور نقصانات کا احساس تو انہیں ہوتا ہے جنہیں زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرنا ہو۔ مجھے تو اب صرف اتنی سانسیں پوری کرنی تھیں جتنی میرے مقدر میں لکھ دی گئی تھیں۔

آئینے میں اپنا چہرہ۔۔۔۔۔! یوں کہو کہ اپنی تقدیر کا چہرہ دیکھ کر میں نے آف تک نہ کی۔ برقعے کا انتظام میں نے پہنے ہی کر لیا تھا۔ اس میں لپٹ کر ہسپتال سے رخصت ہو گئی۔ میرا ارادہ اب بھی بہیٹی ہی جانے کا تھا، تاہم اس بار میں جس کے ذریعے روانہ ہوئی اور خیریت سے پونا کی حدود سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ شاید اب مجھے ایک ایسا شکار سمجھ کر چھوڑ دیا

مکيا تھا جس میں شکاری کے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔

یہاں بہت سی میری ایک شادی شدہ دوست رہتی تھی جو پونا کے کالج میں میرے ساتھ پڑھتی تھی لیکن تعلیم اوصوری چھوڑ کر کم عمری میں بیاہ دی گئی تھی اور تب سے ہمیں ہی میں تھی۔ کبھی کبھار اس سے میرا خطوط کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اس کا ایڈریس مجھے یاد تھا، اس سے اتر کر میں سیدھی اس کے پاس پہنچی۔

ظاہر ہے اس نے مجھے نہیں پہچانا اور میرے اصرار کے باوجود وہ مجھے ماہتاب تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئی اور جب میں نے اسے اپنی چند ایک نشانیاں دکھائیں اور چند ایک ایسی باتیں بتائیں جن کا علم صرف مجھے ہی ہو سکتا تھا، تب اس نے مجھے ماہتاب تسلیم تو کر لیا لیکن اس کی رنگت زرد پڑ گئی اور جب میں نے اس سے کہا کہ مجھے چند دن کے لیے پناہ درکار ہے، اس کے بعد میں اپنا کوئی انتظام کر لوں گی تو اس کی رنگت کچھ اور زیادہ زرد پڑ گئی۔ وہ بالکل مکہ صم سی ہو گئی۔

اسی دوران اس کا شوہر بھی آیا۔ میری دوست نے عیحدگی میں جا کر اس سے کچھ مشورہ کیا اور پھر میرے پاس آکر بولی۔ تم دیکھ رہی ہو، ہمارا فلیٹ کچھ زیادہ بڑا نہیں، بچے بھی سارا دن انہی کمروں میں کھیلتے ہیں۔ اب تم چوتھیں کھٹے تو چرو لپیٹ کر نہیں رکھ سکتیں۔ ظاہر ہے بچوں کی نظر تو پڑے گی۔۔۔ اور اس طرح ان کے ذہن پر برے اثرات مرتب ہوں گے۔۔۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو ناں؟ برا مت ماننا۔۔۔ آج کی رات تو تم یہاں ٹھہرو، صبح میرے میاں لڑکیوں کے ایک بورڈنگ ہاؤس میں تمہارا بندوبست کر دیں گے۔۔۔ وہاں رہائش ذرا صحتی ہے لیکن اتنی جلدی کوئی معقول بندوبست نہیں ہو سکتا۔ بہر حال تم ٹھہرنا نہیں۔۔۔ اگر روپے پیسے کی کوئی کمی پڑی تو ہم کسی نہ کسی طرح کوئی بندوبست کرنے کی کوشش کریں گے۔

میں نے اسے بتایا کہ سربست پیسے کا مسئلہ نہیں۔ مجھے صرف رہنمائی کی ضرورت ہے۔ بہت سی میرے لیے نیا شہر ہے، مجھے اپنی دوست کے رویے سے کوئی دکھ نہیں ہوا۔ میں پسینے ہی کہہ چکی ہوں کہ مجھ میں اب دکھ محسوس کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی تھی۔ میں اس سے زیادہ ہمدردی کی توقع ہی لے کر نہیں آئی تھی۔

دوسرے دن میں بورڈنگ ہاؤس میں منتقل ہو گئی جہاں رفتہ رفتہ میری مختصر سی پوچھی غم ہونے لگی۔ میں نے انہماکوں میں خالی "سامیوں کے اشتہار دیکھ کر دفنوں کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ میں نے ایک ایک دن میں چھ چھ انٹرویو دیے لیکن ہر جگہ سے کچھ اس قسم کا جواب ملتا تھا "آپ کی اہلیت اور قابلیت میں تو کوئی شک نہیں ہے۔۔۔" اس "مگر" سے آگے کچھ نہیں کہا جاتا تھا لیکن میں جانتی تھی کہ "تو" سے الفاظ ان کے حلق میں گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔

کام کی اہمیت ہے، تب ان کی نظروں میں مسلم تھی لیکن کام کرنے والی ان کے خیال میں کم از کم ایسی تو ہونی چاہیے تھی کہ اگر دفتر کی دلکشی میں اضافہ نہ بھی ہو تو کم از کم کارکن اور آنے والے دیکھ کر خوف تو نہ کھائیں یا پھر دفتر کی میز پر بھی ناک منہ نہ رکھ رہے میں لپٹی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر تجسس کے مارے اعلیٰ تلاء کا شکار نہ ہوں۔

آج میری جیب میں آخری پانچ کا نوٹ رہ گیا تھا۔ بورڈنگ ہاؤس کا ایک ماہ کا کرایہ اور بیس کاٹل واجب الادا ہے اور میں معصوم ارادہ کر کے آئی تھی کہ اگر آج بھی ملازمت نہ ملے تو میں بس میں بیٹھ کر سیدھی سمندر پر جاؤنگی۔ سیر کے لیے لانچ میں بیٹھوں گی اور گھر سے سمندر میں پہنچ کر چھلانگ لگا دوں گی اور وہ بھی اتنی خاموشی سے کہ لانچ چلانے والے کو پتا ہی نہ چل سکے۔ وہ جب چکر لگا کر واپس آئے اور کہیں میں مجھے موجود نہ پائے تو گھبراہٹ اور خوف کے مارے میں زبان بند ہی رکھنے میں عافیت سمجھے۔

تم سے ملاقات کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اب تو میں نے یہ امید بھی دل سے نکال دی تھی کہ بہت سی میں شاید کبھی راہ چلتے تمہاری صورت نظر آجائے۔ خصوصاً ان حالات میں تم سے سامنا ہونے کا تو میں خواب میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے آفس کے در در ویاور پر نظر ڈالتے ہوئے کہا لیکن تم اگر اس وقت مجھے پہچانے سے قاصر رہتے تو مجھے کوئی دکھ نہ ہوتا اور نہ ہی میں تمہیں اپنے متعلق کچھ بتانے کی کوشش کرتی لیکن یہاں بھی ملازمت نہ ملنے کا مجھے ضرور دکھ ہوتا۔

اس کے دونوں ہاتھ میز پر رکھے ہوئے تھے اور انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی تھیں۔ میرے ہاتھ غیر ارادی طور پر آگے بڑھے اور میں نے ان شناسا ہاتھوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ ان کے گداز میں آج بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چند لمحے تک وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی، میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے سانس میں ہمدردی تیز ہو رہی ہیں اور جس میں ارتعاش بچہ رہا ہے۔

پھر جیسے مدت سے بانڈھا ہوا ضبط کا بند نوٹ گیا۔ ایک صحن تھنی سی چیخ کے ساتھ وہ ہلک ہلک کر رو دی۔ میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا کہ تیزاب نے صرف اس کے چہرے کو جلایا ہے لیکن یہ سنو اگر اس کے سینے ہی میں رکے رہے تو اس کی روح تک کو خاکستر کر دیں گے۔ بالآخر اس نے میز پر سر پٹخ دیا، ہر سسکتی کے ساتھ اس کا جسم بڑی طرح لرز رہا تھا۔

پھر جیسے جذباتوں کے آتش لٹاں کو دھیرے دھیرے قرار آئے گا۔ اس کی سسکیاں مدھم مدھم گئیں اور ان کے درمیان اس نے نیم روٹھے ہوئے بچوں کی طرح اٹک اٹک کر کہا۔ "اس بار ہاتھوں کو تھما ہے تو پہلے کی طرح چھوڑ کر۔۔۔ زمانے کی بھیڑ میں، نہ کھو جانا۔۔۔ میں تمہاری خاطر لٹ گئی ہوں۔۔۔ برباد ہو گئی ہوں۔۔۔ میرے پاس کچھ باقی نہیں بچا۔۔۔ مجھ ساتھی

نگ جائے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں تمہیں بھولنے والوں تمہارے قیام اور واپس آنے کے حمایت قسبی بخش انتظامات کروں گا نہیں بس آنکھیں بند کر کے ہدایات پر عمل کرنا ہوگا اور کچھ نہیں۔"

پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آؤ اب گھر چلیں۔" نیچے آکر میں نے پارکنگ لائٹ سے گاڑی نکال لی اور ماہتاب کو ساتھ بٹھا کر روانہ ہو گیا۔

میں نے گھر میں نوکروں کی بھیڑ بھاڑ نہیں رکھی تھی۔ محض اس مصلحت کے تحت کہ میں اپنی نجی زندگی کو کم سے کم افراد تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ گھر میں صرف دو نوکر تھے۔ میاں بیوی، دونوں اس قدر معتمد تھے کہ آج تک مجھے کسی تیسرے ملازم کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ان میں عام نوکروں والے خصائل نہیں پائے جاتے تھے اور میں انہیں تنخواہ بھی عام گھریلو ملازموں کے مقابلے میں چار گنا دیتا تھا۔ میاں کا نام کرمو تھا اور بیوی کا بشیراں۔ کرمو چھ فٹ سے بھی لگتا ہوا ایک کزیل فوجوان تھا اور بشیراں بھی خوبصورتی کے اعتبار سے کچھ کم نہ تھی۔

میں اور ماہتاب ہال میں پہنچے تو بشیراں کچن سے اور کرمو ڈرائنگ روم سے آتا دکھائی دیا۔

"میں بہت جلدی میں ہوں۔" میں نے دونوں میاں بیوی کو مخاطب کیا۔ "تم اپنا اپنا کام کرتے رہو۔ مجھے تمہیں صرف یہ بتانا تھا کہ آج سے یہ بی بی اس گھر میں رہیں گی اور تم نے بالکل اسی طرح ان کے آرام کا خیال رکھنا ہے اور حکم ماننا ہے جس طرح میرا۔۔۔"

انہوں نے اہت میں سر ہلایا اور واپس چلے گئے۔ میں نے چلی منزل کے تمام کمرے ماہتاب کو دکھا دیے جن میں دو خوابگاہیں تھیں۔ "جہاں تمہارا دل چاہے ڈیرہ ڈال دو۔ جب نی چاہے سو جایا کرو۔ جب جی چاہے اٹھ جایا کرو۔ کسی بھی سلسلے میں وفا شعار بیویوں کی طرح میرا انتقاد کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ کیونکہ ابھی تم صرف وفا شعار ہو بیوی نہیں۔"

میں شرارتاً مسکرایا۔۔۔ "اور میں بھی چونکہ صرف وفا شناس ہوں، شوہر نہیں، اس لیے میرا کوئی معمول نہیں۔۔۔ اکثر میں راتوں کو بہت دیر سے گھر آتا ہوں اور کبھی کبھی تو کئی کئی رات آتا ہی نہیں۔"

"کہاں رہتے ہو؟" اس نے فوراً بے ساختہ پوچھا۔

"دیکھا۔۔۔ بیویوں کی طرح سوال شروع کر دیئے ناں۔۔۔ ادھر آپ نے کسی لڑکی کو گھر سوپنا اور ادھر اس نے سوال شروع کیے۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"بہت بد معاش ہو گئے ہو۔" وہ کچھ ہینپ سی گئی۔ "کیا دولت آنے سے بد معاشی بھی آجاتی ہے؟" اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، اسے یک یک جیسے کوئی خیال لو اس کر گیا۔ نقاب میں چھپے ہوئے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اس صورت

دامن خدا کسی کو نہ کرے۔۔۔"

میں اٹھا اور سیز کے گرد چکر کاٹ کر اس کے قریب پہنچا۔ ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے میں دیر تک اس کے بالوں میں کنگھی سی کرتا رہا۔ جب وہ بالکل پرسکون ہو چکی تو میں نے اس کا چہرہ اوپر کیا اور اپنے دل میں موجزن محبت کے سمندر کی تمام تر شہتوں کو سینے ہی میں غرق رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ "اب سب کچھ بھول جاؤ، سارے غم سارے نظرات، میرے لیے چھوڑ دو۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور آنسوؤں سے پورا چہرہ بھیگا ہوا تھا لیکن اب وہ مسکراتے پر قادر ہو چکی تھی۔ کیا یہ مسخ شدہ چہرہ بھی ٹھیک ہو جائے گا؟ اس نے انگلی سے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور نیم طنزیہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ یہ مسخ شدہ چہرہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے وثوق سے کہا۔

"غالبا تم پلاسٹک سرجری کی بات کر رہے ہو؟" اس نے گویا میری کوئی غلط فہمی دور کرتے ہوئے۔۔۔ "لیکن جن ڈاکٹروں نے میرا علاج کیا تھا، انہوں نے باتوں باتوں میں مجھے بتا دیا تھا کہ اسٹنڈ بگڑے ہوئے چہرے کی درست پلاسٹک سرجری کے ذریعے بھی ممکن نہیں۔"

"شاید انہوں نے تمہاری مفلسی کو دیکھتے ہوئے تمہیں مزید معلومات بہم پہنچانا غیر ضروری سمجھا ہو۔" میں نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اس کے دیکر سے آج بھی وہی پراسرار سی خوشبو پھوٹ رہی تھی جو کبھی مجھے دور ہی سے اس کی آمد کا پتا دیا کرتی تھی۔

"پلاسٹک سرجری کی ترقی یافتہ شکل کا سینگ سرجری ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں وقت اور پیسہ تو بہت لگتا ہے لیکن یوں سمجھو کہ ناممکنات کو ممکن بنا دیا جاتا ہے۔ ہر طرح کئے چھنے چہرے درست ہو جاتے ہیں، تجھوں کے سر پر ہال آتے ہیں اور پوزموں کی تھریاں دور ہو جاتی ہیں۔"

"ہندوستان میں تو میں نے اس قسم کی سرجری کا کہیں تذکرہ نہیں سنا۔" ماہتاب نے کہا۔

"میں ہندوستان کی نہیں، انگلینڈ اور امریکہ کی بات کر رہا ہوں۔ انتظامات مکمل ہوتے ہی تمہیں لندن یا نیو یارک کی طرف پرواز کرنی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"تم ساتھ نہیں چلو گے کیا؟" اس نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی سے دلچسپی لوٹ آئی تھی۔

"نہیں۔۔۔ میرا اندازہ ہے کہ تمہارے علاج میں شاید چھ ماہ یا اس سے بھی زیادہ عرصہ

کے ساتھ کیا میں تمہاری بیوی ہونے کا تصور کر سکتی ہوں؟“
 ”کیوں کیا ہوا تمہارے چہرے کو؟“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”مجھے تو تمہارا صرف وہی
 چہرہ نظر آتا ہے جو شروع سے میرے ذہن پر نقش ہے۔ اس چہرے پر اگر تم نے کوئی اور
 چہرہ سجالیا ہے تو وہ یقینی غار میں ہوگا۔“

”تو رکھتے میں تمہارا کوئی جواب نہیں۔“ وہ مفہوم سے انداز میں مسکرائی۔
 ”میرا کسی بھی معاملے میں کوئی جواب نہیں۔“ میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔
 ”تم دیکھتی جاؤ۔“

دوسرے روز میں دفتر میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ ایک اشتہار دیکھ کر یک لخت نہ جانے
 کیوں چوکتا ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ اشتہار مالی مند پر پرنس شومبی کے پبلش کی فروخت سے
 متعلق تھا۔ پرنس کے اسٹیٹ منیجر نے لکھا تھا کہ محل کو خریدنے کی خواہشمند پارٹیاں چاہیں
 تو پانچ تاریخ تک اس سلسلے میں پرنس شومبی سے ملاقات کر سکتی ہیں۔ مذکورہ تاریخ تک وہ
 تاج محل ہوٹل کے وی آئی پی سوئٹ میں مقیم ہوں گے۔

اس کا مطلب تھا پرنس شومبی زندہ تھا۔ چھتا کے ہاتھوں مرا نہیں تھا لیکن اس کے
 زخمی ہونے یا کہیں زیر علاج رہنے کی کہانی کسی اخبار میں نہیں آئی تھی۔ اس نے یقیناً اپنی
 رسوائی کے ڈر سے سارے قصے کو دبا دیا تھا۔

میرے ذہن میں جیسے کچھ چھیاں سی تیزی سے گھومتی گئی تھیں۔ میں نے انٹرکام کی
 طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر رک گیا۔ کچھ دیر مزید سوچنے کے بعد میں نے ڈائریکٹ لائن
 والے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تاج محل کا ڈائریکٹ نمبر ڈالتا گیا۔ میں نے پرنس
 شومبی کے سوئٹ سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا تو آپریٹر نے سوہانہ لہجے میں پوچھا۔
 ”آپ کی تعریف؟“

”ان سے بس اتنا کہ دو کہ بیس کی خریداری کے سلسلے میں ایک پارٹی بات کرنا چاہتی
 ہے۔“ میں نے اپنی آواز بالکل بدلی ہوئی تھی۔

”بہت بہتر۔۔۔“ آپریٹر نے کہا اور فوراً ہی سلسلہ ملا دیا۔ شاید اس معاملے میں اسے
 خصوصی ہدایات تھیں۔

فون پر پرنس شومبی نے خود رہیو کیا اور پہلے میرا تعارف چاہا۔

”آپ کا یہ خادم بہت گمنام سا آدمی ہے۔“ میں نے بدستور بدلی ہوئی آواز اور مدہم
 سے لہجے میں کہا۔ ”حالانکہ بہت سے ناموروں کے نام بتانے یا یاد دہانے کی طاقت رکھتا ہے
 مگر خود آپ کے اس خادم کو اس کے پاس پڑوس میں بھی کوئی اچھی طرح نہیں جانتا۔“

”میدھے سادے الفاظ میں اپنا تعارف کراؤ اور اختصار سے اپنا مقصد بیان کرو۔“
 دوسری طرف سے پرنس شومبی نے قدرے بیزار اور نخوت سے کہا۔

”میدھے سادے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ آپ کے اس خادم کا تعلق انڈیا کی
 ایک بہت بڑی نیوز ایجنسی سے ہے جس کا الحاق فرانس پریس اور ویرٹن ورلڈ نیوز سے بھی
 ہے۔ مزید میڈھے سادے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا یہ خادم بسب کوئی
 خاص اور چٹ پٹی خبر اپنی ایجنسی کو فراہم کرتا ہے تو ہندوستان کے علاوہ دیگر کئی ممالک کے
 بڑے بڑے اخبارات بھی اسے نمایاں انداز میں شائع کرتے ہیں۔“

”گویا تم انڈیو لینا چاہتے ہو؟“ پرنس شومبی نے اب قدرے غلیظ لہجے میں کہا۔
 ”لیکن آپریٹر نے تو بتایا تھا کہ تم بیس کی خریداری کے سلسلے میں۔۔۔“

”آپریٹر نے ٹھیک ہی بتایا تھا پور ہائی لس! میں نے قدرے استعزائیہ لہجے میں
 کہا۔۔۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے آپ سے میرا مفصل تعارف ہو
 جائے۔۔۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ رپورٹر بڑی عجیب سی مخلوق ہوتے ہیں۔ ہوا میں ان کے
 کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہیں اور دور دراز کی خبریں لے سکتی ہیں۔ کسی ضرورت کے تحت
 بعض اوقات بڑے بڑے بد معاش بعض قیمتی راز ان کے کانوں میں ڈال جاتے ہیں اور
 بعض اوقات یہ خود بھی بڑی عجیب عجیب اور ناقابل یقین باتوں کا کھوج نکال لیتے ہیں۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھتا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“ پرنس نے ابھٹن زدہ سے لہجے میں
 کہا۔

”آپ کیسے سمجھ سکتے ہیں جبکہ میں ابھی اصل موضوع پر آیا ہی نہیں۔“ میں نے بیٹھی
 بیٹھی آواز میں بڑے قتل سے کہا۔ ”میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ کافی عرصہ پہلے وہ
 بد معاشوں نے مجھے ایک بڑی دلچسپ کہانی سنائی تھی۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک عیاش شہزادہ
 تھا جو ایک پرانے ملک میں جا کر دولت یا طاقت کے نل پر اپنی من پسند عورتوں اور لڑکیوں
 کو اپنی ہوس کی تسکین کے لیے حاصل کیا کرتا تھا۔ اس شہزادے کا ایک دلال اتفاق سے
 ان بد معاشوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ بد معاشوں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا سو کیا لیکن
 انہیں جانے کیا سوچیں کہ انہوں نے اپنی سوچ کے مطابق ایک نیک کام کی بھی ٹھان لی۔“
 میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ دوسری طرف یوں سکوت طاری تھا جیسے پرنس نے
 سانس بھی روک رکھی ہو۔

”وہ دونوں بد معاش رات کے اندھیرے میں ماتی مندر پہنچے۔۔۔“ میں نے بات جاری
 رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ شہزادہ جو اپنے دلال کے انتظار میں تھا ان بد معاشوں کو اپنے دلال ہی
 کے لمبے سمجھ کر ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چل دیا اور ان بد معاشوں نے ایک جگہ
 جھاڑیوں میں لے جا کر شہزادے کے پہلو میں چاقو گھونپ دیا۔ اپنی دانست میں انہوں نے
 شہزادے کو سزا دی تھی۔ اب یہ شہزادے کی خوش قسمتی تھی کہ وہ زندہ بچ گیا۔ سنا ہے اس
 کے بعد سے شہزادے کے خاص خاص آدمی جن کو وہ اکثر دعوت شہزادہ دیا کرتا تھا بڑے

پریشان ہیں کہ اب شہزادہ نہ تو دلالوں کے ذریعے کسی حینہ کو بلواتا ہے اور نہ ہی خوشنوار قسم کے کرائے کے بد معاشوں کے ذریعے کسی شریف زادی کو اٹھواتا ہے۔ وہ حیران ہیں کہ شہزادے کو ہوا کیا ہے۔ کیا خیال ہے۔۔۔ کیوں نہ اخبارات میں یہ دلچسپ قصہ چھاپ کر ان کی الجھن دور کر دی جائے؟ صرف اسی کا نہیں اس کے پڑھنے سے اور بھی بہتوں کا بھلا ہو گا۔ بہت سوں کے لیے اس میں عبرت کا سامان ہو گا اور بہت سوں کے لیے تفریح طبع کا۔ کچھ لوگوں کو یہ جان کر بھی بڑی حیرت ہوگی کہ شہزادے کی دیو زادی بیوی جس کی وجہ سے شہزادے کی شہزادگی قائم ہے اب شہزادے کو گھوموں اور لاتوں سے بھتی ہے جبکہ پہلے وہ صرف تھپڑوں پر استغنا کرتی تھی۔

دوسری طرف چند لمحے کے لیے خاموشی رہی۔۔۔ پھر شہزادے کی سامنوں کی آواز سنائی دی اور خود نکالی کے لیے میں بڑبڑایا۔۔۔۔۔ "بلک میٹنگ۔۔۔۔۔" پھر قدرے بلند آواز میں بولا۔

"کیا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ روپیہ؟"

"جیس۔۔۔۔۔ روپے پیسے کی ضرورت ہوتی تو بہت پہلے تم سے رابطہ قائم کیا ہوتا۔" میں نے قدرے حقارت سے کہا۔ "مجھے خود تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ میرا ایک محسن ہے جسے شاید اب میرا نام بھی یاد نہ ہو اب جبکہ تم نے پلس فروخت کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اسے میرے محسن کے ہاتھ بیچ دو۔" میں نے کہا لیکن اپنی مطلوبہ قیمت پر نہیں بلکہ جتنی بھی رقم وہ تمہیں فوری طور پر آسانی کے ساتھ ادا کر سکے گا۔ تم اسے ہی کافی سمجھ کر رکھ لو گے خواہ دوسری پارٹنروں کی طرف سے تمہیں کتنی ہی رقم کی پیشکش ہو چکی ہو۔۔۔۔۔ سمجھ گئے؟"

وہ چند لمحے خاموش رہا۔۔۔ پھر بدستور ہموار لہجے میں بولا۔ "سمجھ گیا۔۔۔۔۔ کون ہے تمہارا وہ محسن؟ اور اس سلسلے میں تمہارا اس سے کتنا کمیشن ملے گا؟"

"غیر ضروری باتوں سے اجتناب برتو تو بہتر ہے۔" میں نے اپنی بدلی ہوئی آواز میں غراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنے محسن کا احسان اتارنے کا ارادہ فی الحال ملتی کر دوں اور اس کہانی کو ٹائپ کرنے بیٹھ جاؤں جس کے اہم نکات پر مشتمل چند کاغذ کتب سے میری میز کی ورازمیں وہ پڑے ہیں۔"

"اوکے۔۔۔۔۔ اوکے۔۔۔۔۔" پرئس نے قدرے ہنسی اور غلٹ سے کہا۔ "تم اپنے ان محسن صاحب کو میرے پاس بھیج دو۔۔۔۔۔"

"وہ اتنا گرا پڑا آدمی نہیں ہے کہ تم اس لیے میں اس کا ذکر کرو۔" میں نے گویا برا مناتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ "اور نہ ہی وہ تم سے ملنے آئے گا تم خود اس کے پاس جاؤ گے۔۔۔۔۔ فون نمبر میں دے رہا ہوں۔۔۔۔۔ پہلے تم اس سے ملاقات کا وقت طے کرو گے۔" میں نے اسے اپنا ہی فون نمبر دیا۔ نام بتایا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں اطمینان سے فائلیں وغیرہ دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد ہی میرے عام نیلی فون سیٹ کی گھنٹی بجی جس کا نمبر بورڈ کے توسط سے ملتا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا، کرشنا کہہ رہی تھی۔۔۔ "سر!۔۔۔۔۔ پرئس شوہری آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

پرئس کے لیے میں میری توقع کے عین مطابق نخوت و احساس کی برتری کی جھلک نہیں تھی بلکہ وہ حتی الامکان دوستانہ انداز میں بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا حتیٰ کہ اس نے اپنا تعارف بھی کرائے کی کوشش کی۔

میں نے خالص ناجیروں والی خوش خلقی سے کہا۔ "ہندوستان میں آپ آجئے بھی گمنام نہیں پرئس! فرمائیے اس خادم گمنام سے آپ نے کیونکر رابطہ قائم کیا؟ کیا ضرورت آن پڑی؟"

"یہ تو ملنے پر ہی بتا سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "بہر حال آپ چونکہ کاروباری آدمی ہیں اس لیے اطمینان کی خاطر یہ بتا دوں کہ میں آپ کو کچھ دینے ہی آؤں گا لینے نہیں۔" اب ایسا بھی نہیں تھا کہ کاروباری ذہنیت پر اس کے طنز کو میں سمجھ نہ پاتا۔ میں نے ہکا بکا قصہ لگایا۔ "کچھ لینا دراصل ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی مسٹر پرئس!" میں نے کہا۔

"درست کہا آپ نے۔" اس نے فوراً تسلیم کر لیا۔ "تو میں کب آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکتا ہوں۔"

"کھانے کے وقت تک اب میں فارغ ہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ چاہیں تو کھانا میرے ساتھ ہی کھائیں۔"

"کھانا پھر کبھی سہی۔" پرئس نے کہا۔ "فی الحال صرف کاروباری بات ہوگی۔ میں آدھے گھنٹے بعد حاضر ہو جاؤں؟"

"بہت شوق۔" میں نے کہا۔ پرئس نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد میں محض دستخط وغیرہ کرنے اور نئی اسٹیپ کے ٹائپ کردہ خطوط پڑھنے کا کام کرنا رہا۔ تقریباً پینتیس منٹ بعد کرشنا اندر آئی۔ پرئس شوہری کو اندر بھیجنے کی میں نے اسے پہلے ہی ہدایت دے رکھی تھی۔

"سر! پرئس شوہری کو تو میں اندر بھیجے گی تھی لیکن وہ کہنے لگے کہ ان کے دونوں باؤں گارڈ بھی اندر آئیں گے۔" کرشنا نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "اس سلسلے میں کیا حکم ہے؟"

"پرئس سے کہو کہ باؤں گارڈ کو باہر ہی چھوڑ دیں۔ ہمارے دفتر میں ان کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "دوسرے میں نئی گفتگو کے دوران باؤں گارڈ وغیرہ کی موجودگی کو پسند نہیں کرتا۔"

”اس رپورٹر کا پتا چلانے کے سلسلے میں۔ جس کے ساتھ ملی بھگت کے ذریعے تم مجھے بیک میل کر کے میرا پیسے سستے داموں مجھ سے بھتیانے کی کوشش کر رہے ہو۔“ وہ سانپ کی طرح پھٹکار اٹھا۔

”آپ تشریف لے جاسکتے ہیں مسٹر پرس!“ میں نے سکون سے کہا۔ ”پہلے آپ شوق سے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر آئیں“ اس کے بعد آکر مجھے بتا دیجئے گا کہ بات کیا ہے؟ مجھے ابھی تک یہی معلوم نہیں کہ آپ کس رپورٹر کس پیسے اور کس ملی بھگت کی بات کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں اس طرح توہین آمیز انداز میں گفتگو کرنے والوں کو اٹھوا کر دفتر سے باہر پھٹکوا دیتا ہوں اور یہ تحقیق بعد میں کرنا ہوں کہ وہ پرس ہیں یا شمنشا..... اور جہاں تک اثر و رسوخ کا تعلق ہے تو اس ملک میں چھوٹے موٹے شمنشاؤں کی مرل عزت ہوئی ہے، اثر و رسوخ نہیں۔ اثر و رسوخ یہاں صرف تاجر کا ہے جو سب سے زیادہ فیکس ادا کرتا ہے اور میں صرف تاجر ہی نہیں ایوان صنعت و تجارت کا جنرل سیکرٹری بھی ہوں جس کے ارکان کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زیادہ ہے جو صرف بھیجی نی کی نہیں ہندوستان کے اور بھی کئی علاقوں کی معیشت کو چلا رہے ہیں جو میرے ایک اشارے پر اپنی اپنی صنعتوں کا پیسہ جام کر کے تم جیسے شمنشاؤں کا منہ کالا کر کے..... جو اتفاق سے پہلے ہی کالا ہے، ملک بدر کروانے کا مطالبہ کر سکتے ہیں..... سمجھے؟ اس لیے بہتر ہے کہ جو بات کرنی ہے سیاق و سباق کے ساتھ کرو۔ دھمکیاں دنا تمہارے حق میں نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔“

چند لمبے بعد پرس شوہری اندر آیا۔ کافی عرصہ بیٹھنے میں نے باقی مندر پر اس رات اسے زیادہ غور سے نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اب دیکھ کر احساس ہوا جیسے اس کی عمر میں کئی برسوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں تھپتھپ اور ابھرائی تھیں اور آنکھوں کے گوشوں پر شکنیں سی نمودار ہو چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے صاف نظر آ رہے تھے۔ خود کار دروازہ اس کے عقب میں بند ہو گیا۔ وہ وہیں کھڑا ایک تنگ مجھے دیکھ رہا تھا لیکن میں سٹپٹ رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس وقت مجھے قطعاً نہیں پہچان سکتا تھا۔

میں نے اٹھ کر اسے خوش آمدید کہا اور مصافحہ کرنے کے بعد اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے اضمحلال نمایاں تھا اور لمبی لمبی انگلیوں میں ہکا سارا تعاش تھا۔ اس نے ایک لمبوڑے سے منقش اور پٹیلے سگار بکس سے ایک ٹوٹا سا سگار نکال کر بے رخصانہ سے انداز میں چوڑے چوڑے دانٹوں سے اس کا ایک سرا توڑ کر رومی کی نوکری میں تموکا۔ میں نے تین لائسنز اٹھا کر لمبی چوڑی میز پر کچھ آگے جھک کر اس کے سگار کو شعلہ دکھایا۔

شکریہ ادا کر کے اس نے طویل کش لیا اور دھوئیں کے مرغولوں کے عقب سے پر خیال نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے بھی بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی اصل آواز میں کہا۔ ”میرے لیے آپ کی آمد نہایت غیر متوقع ہے۔ کیا اب آپ میرا نجش دود کرنا پسند فرمائیں گے؟“

وہ اب بھی خاموش رہا جیسے گفتگو کے لیے موزوں الفاظ منتخب کر رہا ہو۔ پھر غالباً اپنی دانست میں اس نے نہایت موثر کن انداز میں گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”آج کا دور احسان فراموشی کا ہے لیکن آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ کے احسان کو کسی نے یاد رکھا ہے۔“ پھر اس نے ایک لمبو توڑ کر کے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔ ”کسی نواز ایجنسی میں آپ کا کوئی دوست رپورٹر ہے؟“

”مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میرا کوئی دوست اس قسم کے پیشے سے بھی تعلق رکھتا ہے۔“ میں نے بظاہر ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا حالانکہ اس وقت مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ ”دوست نہیں ملاقاتی ہی ہو گا جس پر آپ نے کبھی کوئی احسان کیا ہو گا۔“ اس نے کہا۔

”ملاقاتیوں کے نام تو مجھے یاد بھی نہیں رہتے اور نہ ہی میں کسی پر احسان کر کے یاد رکھتا ہوں۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ مجھے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا پڑے گا۔“ اچانک اس کے لمبے میں سختی در آئی۔

فصل آٹھ: گریٹ بریٹین میں رہاؤ اور ایک سٹر

تھوڑے پھر کے سب یقینوں

”مالٹی مندر میں تب پر یہ قاتلانہ حملہ اور دو لاکھ پاؤنڈ چھینے جانے کا واقعہ کب پیش آیا تھا پرس؟“ دفعتاً میں نے نری سے پوچھا۔

”سال ہو چلا ہے۔“ اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

”آپ نے اس کی رپورٹ تو درج کرائی ہوگی۔ پولیس نے کارروائی نہیں کی؟“ میں نے نہایت سادگی سے پوچھا۔

”رپورٹ؟“ وہ ایک بار پھر گڑبڑا کر لیکن نہایت شاطرانہ تھا اس لیے اس مرتبہ بھی سنہل گیا۔ اس قسم کی چھوٹی موٹی باتوں کو منظر عام پر لا کر میں سیکڑل ہونا پسند نہیں کرتا۔ مجھے امید تھی کہ ایک نہ ایک روز میں اپنے ان تحیر و شغوں کو خود ہی ڈھونڈ نکالوں گا۔ میرا اندازہ درست ہی تھا۔ بالآخر مجھے ان کا سراغ مل ہی گیا یعنی تم! اب تم مجھے بتاؤ گے سٹر منصور کہ وہ کون تھے؟ اگر تم نے میری بات کا جواب نہ دیا تو تمہیں سزا دینے کے لیے میں اب اپنے باڈی گارڈز کو بھی زحمت نہیں دوں گا کیونکہ وہ ویسے ہی ضرورت پڑنے پر ہر الزام سر لینے کو تیار رہتے ہیں۔ اب تم زبان کھول دو۔“ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا جہاں میں بغلی ہا لشر کی موہوگی کے آثار پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

میرے خیال میں خالص کاروباری آدمی ہی بنے رہنا اب کوئی زیادہ ضروری نہیں تھا کیونکہ اب وہ شہزادگی کو ہالائے طاق رکھ کر تیسرے درجے کا بد معاش نظر آنے لگا تھا۔

”سٹر پرس! میں نے یک لخت اپنا لہجہ بدلتے ہوئے انتہائی سرد اور سفاک آواز میں کہا۔“ ہولشر تک ہاتھ لے جانے سے پہلے ایک نظر میز کے نیچے دیکھ لیجئے۔ اس مشورے پر عمل نہ کرنے سے آپ کی زندگی ضائع بھی ہو سکتا ہے۔“

آخری لفظوں میں ایسا اثر تھا کہ نہ صرف ہولشر کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ مشینی انداز میں رک گیا بلکہ اضطراری طور پر اس نے کرسی بھی ہٹھکے کھسکا کی تاکہ آسانی سے ہٹھک کر میز کے نیچے دیکھ سکے۔ نیچے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور وہ یک لخت سیدھا ہو کر کرسی پر یوں ساکت بیٹھ گیا جیسے تصویر ٹھنچا رہا ہو۔ حالانکہ میز کے نیچے کوئی ایسی زیادہ ڈراؤنی چیز بھی نہیں تھی کہ اس کے اوسان یوں خطا ہو جاتے۔

میز کے تلخے کے چلی طرف صرف ایک ہلکی سب مشین گن ڈٹ تھی جو نیم دائرے میں اس طرح خاموشی، تسلسل اور قدرے تیز رفتاری سے حرکت کر رہی تھی جیسے کسی بہت بڑے ڈائل پر بہت بڑی سیکڑ کی سوئی حرکت کر رہی ہو۔ میرے سامنے آفس کا بیٹا بھی حصہ تھا وہ پورا کا پورا اس سب مشین کی زد پر آتا تھا۔ میرے مقابل چاروں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے افراد ڈگن کی تالی سے مچھ چند انچ کے فاصلے پر ہی ہوتے تھے۔

”اس سے فائرنگ شروع کرنے کے لیے صرف ایک منٹ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔“ میں نے حذر سوتی سے لہجے میں کہا۔ ”جس پر اس وقت میرا ہاتھ ہے لیکن اب ہم

پرس چند لمحے تک منہلیں پوشش والی کرسی کے ہتھوں پر تختی سے ہاتھ جمائے گھورتا رہا۔ اس کے ہتھوں تیزی سے پھول چک رہے تھے۔ میں بھی چپکے چپکے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ دفعتاً اس نے سگار الٹش کرے میں مسل دیا۔

”پرس شوہی نے بلیک میل ہونا نہیں سیکھا۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور اتفاق سے میری عادت بھی یہی ہے کہ میں طاقت پہلے استعمال کرتا ہوں“ نثار پر غور بعد میں۔ ”کرنے کو میں یہ بھی کر سکتا ہوں کہ اپنے باڈی گارڈز کو اندر بلاؤں اور انہیں محض ایک اشارہ کر دوں۔ وہ اسی کرسی پر تمہارا جسم چھتی کر کے رکھ دیں گے۔ کمانی ہم یہاں سے جانے کے بعد اطمینان سے گھر میں گے۔ زیادہ سے زیادہ اگر ہوا تو یہی ہو گا کہ میرے باڈی گارڈز کو چند ماہ کی سزا ہو جائے گی کیونکہ میرے لیے یہ ثابت کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہو گا کہ کاروباری گفتگو کے دوران مشتعل ہو کر تم نے غارتے کھولنے والی چھری سے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ چھری کا ذکر مجھے اس لیے کرنا پڑے گا کہ ریلوے اور تم جیسے سیکھ اپنے پاس رکھتے نہیں کیونکہ چلانے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

”اللہ رے خوش فہمی۔“ میں نے زیر سب اردو میں کہا۔ پھر قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس کمرے میں کہیں ایسے آلات چھپے ہوں جن سے تمہاری گفتگو کسی اور کمرے میں ریکارڈ ہو رہی ہو۔“

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں سراسیمگی کی سی ہٹھک آئی لیکن فوراً ہی وہ سنہل گیا۔ ”بلیک میلروں کے یہی تو انداز ہوتے ہیں۔ میں تم سے یہی پوچھنے آیا ہوں کہ مجھے اس رپورٹر کا نام و پتہ بتاؤ جس نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے۔..... بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ تمہارے ہی توسط سے میں ان دو بد معاشوں تک بھی پہنچ سکتا ہوں جنہوں نے مالٹی مندر میں میرے طیارے کے قریب مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور میرے دو لاکھ پاؤنڈ چھین کر بھاگ گئے تھے۔ مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ تم وہ بلیک میلر رپورٹر اور وہ دونوں بد معاش‘ تم سب ایک ہی تھیلی کے چنے بٹے ہو۔۔۔۔۔ یہ بزنس..... یہ آفس“ سب اصل میں آڑ ہیں جس کے چھپے تم لوگ مل جل کر بڑی بڑی وارداتیں کرتے ہو۔ بڑے بڑے ہاتھ مارتے ہو۔“

”اگر وہ“ پرنس نے ہونٹ سکڑے۔ ”تو پھر آپ مجھے اپنی آمد کا وقت بتا دیجئے میں بات دوس پر آپ کے استقبالیے کے لیے موجود ہوں گا۔“

”جھوٹا کریں۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں نے آپ کو وہ قیمت بتا دی جو میں فوراً ادا کر سکتا ہوں۔ آگے آپ کی مرضی..... اور ہاں۔ آپ کو ایک ضروری بات بتا دوں

میں نے چند لمحے غور کیا پھر اسے سات بجے کا وقت دے دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مصالحوں کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اتوار“ سات بجے ملاقات طے ہوئی۔ میں فروخت کے سلسلے میں تمام کانڈزات تیار رکھوں گا۔ اس شام خواہ کچھ بھی طے پائے بہر حال ہم سودا مکمل کر کے کانڈزات پر دستخط کر دیں گے۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے اٹھ کر اس سے مصالحوں کیا اور وہ رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد دیر تک میرے دل میں گندگدگی سی ہوتی رہی۔ ابھی تک قسمت ہر موڑ پر میری مدد کر رہی تھی۔ مجھے مستقبل کے مالتی مندر جیسے دور دراز جزیرے پر واقع پرس شومیں کے بیلے جیسی ایک عمارت کی سخت ضرورت تھی۔ قدر نے نہ صرف میری مرضی کے عین مطابق جگہ کا بندوبست کر دیا تھا بلکہ وہ مجھے کوڑیوں کے بھاؤ پر رہی تھی۔ میں نے تو ایسے ہی اندھیرے میں ایک خیر پیم کا ہاتھ گمراہ مجھے نکالنے پر بیٹھا نظر آ رہا تھا۔

دوسرے روز اس ملاقات کے لیے گھر سے نکلنے وقت میں نے گھڑی دیکھی اور نہایت کم رفتار سے ڈرائیو کرتے ہوئے میں ساحل کی طرف روانہ ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر میں دھیرے دھیرے سٹی بھی بجا رہا تھا۔ بظاہر جیسے میں کہیں تفریح پر جا رہا تھا لیکن اندر ہی اندر میرے اعصاب کسی انجانی مستحاث سے لحد بہ لحد چونکے ہوئے جا رہے تھے۔

فشننگ ہاربر پر پہنچ کر میں نے اس بوٹ بوت کی تلاش میں نظر دوڑائی جو ہماری کمپنی کے فشننگ کے شعبے کی ملکیت تھی۔ اس وقت ہماری فشننگ کمپنی کے پاس چار بوٹس تھیں۔ ان میں سے ایک وہی تھی جو کبھی چھٹا کی ذاتی ملکیت تھی۔ اس وقت مجھے اسی کی تلاش تھی۔

بہت دور ایک مقام پر سورج کا کنڈلی قہل گویا سمندر ہی میں اتر آ نظر آ رہا تھا۔ یاد برداری کی بیشتر کشتیاں واپس آچکی تھیں اور بہت سی گری تھیں۔ وہاںٹ شارک مجھے جلد ہی نظر آ گئی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ میرے پاس دس منٹ فاضل تھے۔ میں وقت سے پہلے مالتی مندر نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ دس منٹ میں نے ڈاک پر غصے گزار دیے اور ٹھیک سات بجے میں نے بیس منٹ پر وہاںٹ شارک کی بندش کھولی اور اس میں مالتی مندر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جزیرے کے آثار نظر آنے تک شام کا دھندلا گہرا ہو چکا تھا۔ تاہم ابھی روشنیوں کی اتنی ضرورت نہیں تھی لیکن پرس شومیں کے بوٹ ہاؤس پر مجھے دور سے ہی کئی بڑی بڑی لائٹس سن نظر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اہتمام اس لیے کیا گیا ہے کہ کہیں میں بھٹک کر کسی اور طرف نہ نکل جاؤں۔

میں بوٹ کو سیدھا بڑی سی سرنگ سے مشابہ بوٹ ہاؤس میں لے گیا۔ بوٹ ہاؤس کا

دروازہ کھلا تھا۔ پرس شومیں کو میں نے دور ہی سے ساحل پر کھڑے دیکھ لیا۔ اس کے دائیں بائیں دو اور اشخاص بھی مودیات انداز میں کھڑے تھے۔ دونوں ہی سوئوں میں تھے۔ پرس بھی سوٹ میں تھا لیکن اس کے ساتھ ہیٹ کے بجائے نہ جانے کیوں اس نے ترکی ٹوپی سر پر رکھی ہوئی تھی۔ مسلمان افریقی عموماً یہ انداز اختیار کرتے تھے کہ سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہن لیتے تھے مگر پرس شومیں کو چھین تھا۔

وہ تینوں مجھے ساحل پر اترتے دیکھ کر کچھ اس انداز سے آگے بڑھے جیسے پروڈکٹوں کے مطابق کسی ملک کے سرکاری مہمان کو ریلیو کرنے آئے ہوں۔ پرس نے نہایت باوقار انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر پیسے اپنے دائیں طرف کھڑے ہوئے شخص کا تعارف کرایا۔ ”مسٹر موگا ہے شولا۔ میرے پرستل سیکرٹری۔“

اس شخص نے ضرورت سے زیادہ منہ چوڑا کر کے مسکراتے ہوئے مجھ سے مصالحوں کیا۔ وہ درمیانے قد کا ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا، باریک فریم کی نظریں ٹینک لگائے ہوئے تھیں۔

”مسٹر طورے گا۔“ میرے اسٹیٹ منیجر۔ پرس نے بائیں طرف کھڑے ہوئے شخص کا تعارف کرایا۔ یہ گھٹے ہوئے جسم کا ایک دراز قد نوجوان تھا لیکن آنکھوں سے نہایت تجربہ کار اور شاطر معلوم ہوتا تھا۔

میں نے پرس کے پیچھے بھانڑیوں کے قریب دو اور سیاہ فام نوجوانوں کو کھڑے دیکھا۔ پرس نے ان کے تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ دونوں بھی سوئوں ہی میں لمبے تھے اور ہاتھ پشت پر کیے کھڑے تھے۔ مجھے ان کے بارے میں اندازہ لگانے میں وقت نہیں ہوئی کہ وہ پرس کے باڈی گارڈ تھے۔

پرس نے بوٹ ہاؤس کے اندر اور دور تک سمندر کی سطح پر نظر دوڑاتے ہوئے اپنے لیے کو سرسری بتانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ تھانی آئے ہیں؟“ اس کے لیے میں ابی دبی حیرت بھی تھی۔

”جی ہاں۔ کیوں؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔ ”کیا مجھے کسی کو ساتھ لانا چاہیے تھا؟“ ”نہیں۔ نہیں۔“ پرس نے جلدی سے کہا۔ ”میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ آہٹے تشریف لے آئے۔“ اس نے مجھے ساتھ ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ چند قدم دور نیم چلتے پکڑندے ہی ایک سیاہ مرینڈز اور اس کے پیچھے شیورلیٹ گھڑی تھی۔

میرا خیال تھا کہ بیلے پہنچ کر بھی مجھے پرس کے ملازم خاصہ خداو میں نظر آئیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

ہر دن سن کر لوبے کا اونچا سا میٹ جس سیاہ فارم شخص نے کھوا، اس کا قد کانٹھ اور جسم کی ساخت غیر معمولی تھی۔ وہ سپر شمار سلوٹوں والی مصری غلاموں کی سی شلووار اور انہی کے طرز کی مختصر سی واسکت پہنے ہوئے تھا جو آگے سے کھلی تھی۔ کعبخت کا جسم گویا آدھوس

"غالباً ہم اپنے اصل مقصد کی طرف تو توجہ ہی نہیں دے رہے۔" شہزادے نے ملامت سے کہا۔ "یعنی نہ میں آپ کو جیلس دکھا رہا ہوں اور نہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ ہم دونوں ہی تاک کی سیڑھ میں چلے جا رہے ہیں۔ ارا پیچھے آئیے، وہ کمرے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"

اہم چند قدم پیچھے آئے۔ لابی کے اختتام پر دونوں گوشوں میں دو کمروں کے دروازے آسنے سامنے نظر آ رہے تھے۔ دونوں کی بیرونی دیوار گولاکی میں تھی۔ یہ نچی منزل کا ڈرائنگ روم ہے۔ شہزادے نے دائیں ہاتھ والا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے دروازے پر ہی کھڑے ہو کر اندر کا جائزہ لیا۔ کمرہ آرامت و پیراست تھا۔ اس میں اعلیٰ درجے کے ڈرائنگ روم کے تمام لوازمات موجود تھے۔

"چلی منزل مرکزی طور پر ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ سردیوں میں گرم رکھنے کا بھی بندہ دست ہے۔" پرنس نے بتایا۔ اس کا لہجہ اب واقعی اس شخص کا سا ہو گیا تھا جو اپنی کوئی چیز فروخت کرنے لگا ہو اور اس کی خوبیاں گنوا رہا ہو۔

اس سنہ دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہ اسٹڈی ہے۔ اس میں بھی تمام فرنیچر وغیرہ موجود تھا۔ اس کا جائزہ لینے کے بعد ہم دائیں ہاتھ پر راہداری میں مڑے جہاں فرش پر دھڑکاہٹیں پھیلا ہوا تھا۔

اس راہداری میں آسنے سامنے دو بہت وسیع بیڈ روم تھے جو لوازمات سے ہی نہیں، تعیشات سے بھی بھرے ہوئے تھے۔ ہر ایک کی چھت اور دیواروں میں بیسیوں پہلو دار آئینے لگے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں بار بھی موجود تھا۔ پرنس نے کمرے کے وسط میں موجود بہت بڑے گول بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ بیڈ اتنا بڑا تھا اور اس کے دھڑکدے پر کھیل ہوئی بے شک اور بے داغ چمکی، جھاندار چادر اس طرح روشنی میں جھللا رہی تھی کہ اس پر بیڈ کے بجائے مغربی پہلو انوں کے رنگ کا گمان گزرتا تھا۔ صرف اس کے گرد سے تان دیے جاتے تو اس پر روشنی لڑی جاسکتی تھی۔ اس کے تین اوپر چھت میں ایک چھتری سی لٹکی ہوئی تھی۔ یہ دوسرا بیڈ روم تھا جو ہم دیکھ رہے تھے۔

"ان بیڈ رومز کی تمام روٹیاں ریوٹ کنٹرول سے جلتی بچتی ہیں۔ بستر پر لیٹے ہوئے کوئی سی بھی قی بجھا دیجئے، پرنس بتا رہا تھا۔ ریوٹ کنٹرول ہی سے چھت میں لٹکی ہوئی یہ چین سی چھتری ٹنگن کر آپ کے بیڈ کو ڈھانپ لیتی ہے اور آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ بادلوں کے دوش پر پرواز کر رہے ہیں۔ چھتری ہٹا دی جائے تو آپ تمام آئینوں میں اپنے آپ کو دیکھ سکتے ہیں۔ بیڈ رومز میں ریوٹ کنٹرول پر تمام انتظامات ابھی صرف فرانس کے کروڑ پتیوں تک ہی محدود ہیں۔ انڈیا میں بڑے سے بڑے سیٹھ کے گھر میں اس طرز کا بیڈ روم نہیں ہوگا۔"

پھر سے تراشامیا ایک شاہکار مجسمہ تھا۔ اس کا قد اتنا اونچا اور چھاتی اتنی چوڑی تھی کہ ہم قسم کے دروازے تو اس کے گزرنے کے لیے کافی نہیں رہتے تھے۔ ڈراسی حرکت کے ساتھ اس کے بازوؤں کی پھیلیا ہوں پھڑکی تھیں جیسے ابھی جلد چڑ کر باہر آجائیں گی۔

نماییت کشادہ ڈرائیو دے میں پرنس نے گاڑی روکی اور اتر کر مصری غلاموں جیسے چلے والے اس شخص سے اشاروں میں ہاتھ پوچھا۔ اس نے اشاروں میں چند بے سنی سی گولوں کے ساتھ کچھ جواب دیا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گولنگ تھا۔

اس سے بات فہم کر کے پرنس نے گویا مزید وضاحت کے لیے مجھے بتایا۔ گولنگا ہے بے چارہ..... لیکن خاتون اتنا ہے کہ میرے اور آپ جیسے آدمیوں کو صرف ایک گھونٹے میں ہلاک کر سکتا ہے۔" میں مسکرا دیا۔ پرنس نے مجھے بھی اپنے ہی جیسے آدمیوں میں شمار کر لیا تھا۔ "کلبھاری کے سوا یہ کوئی ہتھیار استعمال کرنا نہیں جانتا لیکن صرف کلبھاری ہی سے ایک ہاتھی کا سر تن سے جدا کر سکتا ہے اور شیر کو کٹڑوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔ دیکھتے ہیں یہ انسان ہے لیکن میری نظر میں ایک بڑا نایاب قسم کا حیوان ہے۔"

میں سناٹائی انداز میں مسکرا دیا۔

باڈی گارڈز اسپیٹ لیجر اور سیکرٹری بھی گاڑیوں سے اتر گئے تھے۔ میں نے سرسری نظر سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ کل دو منزلہ تھا اور مشرقی و مغربی طرز تعمیر کا ایک خوبصورت امتزاج تھا۔ اس کی بالائی منزل پر سامنے کی طرف مغلیہ طرز کی ایک لمبی سی ہالکونی تھی جس کی دیوار درحقیقت ماربل کے خوبصورت چھوٹے چھوٹے ستونوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ پرنس کی تعمیر میں بے حساب ماربل استعمال ہوا تھا۔ اونچی سی بیرونی چادر دیواری پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بڑی بڑی فنڈائنٹس نصب تھیں۔

چادر دیواری کے وسط میں اصل عمارت تھی اور اس کے تین اطراف میں سرسبز لان پھیلا ہوا تھا جس کے ایک حصے میں بیٹھوی سو رنگ پول نظر آ رہا تھا۔ لان پر مجھے دور ایک جگہ پھولدار پودوں کی کیاریوں پر دو مائی کام کرتے نظر آئے۔ انہوں نے کمن انگلیوں سے ہماری طرف دیکھا اور دوبارہ کام میں لگ گئے۔ مجھے ان کا کام کرنے کا انداز مصنوعی سا لگا۔ پرنس نے باڈی گارڈز سمیت اپنے چاروں ملازموں کو مخاطب کیا۔ "آپ لوگ اپنے اپنے کمروں میں جائیں، جس کی ضرورت ہوگی، میں اسے بلوالوں گا۔"

سب نے تعصبات سر ہٹا دیا اور مختلف سمتوں میں چلتے ہوئے عمارت کے پہلوؤں میں پہنچ کر غائب ہو گئے۔ اس طرف شاید بغلی دروازے تھے۔ باتیں کرتے کرتے ہم مرکزی دروازے سے بیس میں داخل ہو چکے تھے اور ایک طویل و عریض لابی سے گزر رہے تھے جس کا ماربل کا پالش شدہ فرش آئینے کی طرح چمک رہا تھا اور ہماری ایڑیوں کی بازگشت یہاں یوں گونج رہی تھی جیسے ہم کسی بڑے سے گنبد کے نیچے چل رہے ہوں۔

”خیر... میرے لیے ان آسانگوں میں کوئی خاص کشش نہیں ہے۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔ ”اگر مجھے یہاں رہنا ہوتا تو بہت سی چیزیں مجھے یہاں سے ہٹائی پڑتیں۔“

”تو کیا آپ رہنے کے لیے تیل نہیں خرید رہے؟“ پرنس نے حیرت سے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میرا بزنس شہر میں ہے اور روزانہ مجھے شہر کے مرکز سے یہاں تک آنے کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ اور پھر جانے کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ درکار ہوگا۔ کبھی سمندر کا مزاج اچھ ہو، ہے اور کبھی غیر متوقع طور پر برہم ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ جگہ یا تو ریٹائرمنٹ کے بعد رہنے کے لیے مناسب ہے یا پھر آپ جیسے شہزادوں کے لیے موزوں ہے۔“

”تو پھر اسے کس لیے خریدنا چاہتے ہیں؟“ پرنس نے پوچھا۔

”ابھی تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کاروباری لوگوں کی ویسے ہی عادت ہوتی ہے کہ سستے داموں کوئی چیز ملتی ہو تو اسے کڑا ل دیتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی کام آجاتی ہے یا پھر اچھا منافع دے جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ میں ریٹائرمنٹ کے بعد یہاں رہنا پسند کروں۔“

پرنس نے صرف ہنکارا بھرنے پر اتفاق کیا۔ اب ہم بیاس کے عقب میں آہنچے تھے۔ یہاں بھی الٹی سی کی طرز کا ایک بال تھا جس کے وسط میں ایک بہت موٹے ستون کے گرد گولڈی میں تھیں قسم کی تھیں گدوں والے کاؤچ لگے ہوئے تھے۔ ہمارے اس بال کا کوئی مصروف نظر نہیں آتا تھا۔ یہ ایک طرح کی انتظار گھاسی معلوم ہوتی تھی۔

”بالائی منزل بھی بالکل ایسی ہے۔“ پرنس نے بتایا۔ اسے دیکھنے سے بستر ہوگا کہ پہلے آپ تہ خانہ دیکھ لیں۔“

تہ خانے میں داخل ہو کر ہم ایک قدم آگے بڑھے۔ پرنس نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا اور ایک لائٹ بھی آن کی تھی۔ اس کے باوجود یہاں روشنی ناکافی تھی۔ اندر قدم رکھتے ہی خنکی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ یہاں بھی اس قدر تھی کہ دیواروں پر بوندیں سی چمکتی نظر آرہی تھیں جیسے انہیں پیدہ آگیا ہو۔

”یہاں روشنی کا کوئی معقول انتظام کروانے کے سلسلے میں آج تک توجہ ہی نہیں دے سکا۔“ پرنس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”کیونکہ اسے بھی استعمال کرنے کی کبھی نوبت نہیں آئی، حالانکہ ہے بڑے کام کی جگہ۔“

”یہاں ہے ہی کیا جسے ہم دیکھنے آئے ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”ہاں یہ ایک سیدھا سادہ تہ خانہ ہے۔“

”اتنا سیدھا سادہ بھی نہیں ہے۔“ پرنس نے کہا۔ ”میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں۔“

دھنچکا... تہ خانے میں روشنی اچھ اور کم ہو گئی کیونکہ دروازہ ایک زوردار کھٹکے کے ساتھ بند

ہو گیا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی چند حلقوں بازوؤں نے میرے بازوؤں کو گرفت میں لے کر پشت کی طرف موڑ دیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ جس پوزیشن میں میرے بازو پہنچ چکے ہیں، میں پوری طاقت بھی صرف کروں تو انہیں چھڑا نہیں سکتا۔ ان پر کم از کم دو طاقتور آدمیوں کی مضبوط گرفت تھی۔ انہوں نے میرے لیے اتنی چھلانگ لگائے کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

میرا خیال تھا کہ اب پرنس فلمی دس کی طرح فاتحانہ قہقہہ بھی لگائے گا مگر وہ خاموش رہا، وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر روشنی کے قریب جا کھڑا ہوا تھا اور پر خیال نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے کوئی سائنس دان اس چوپے کا جائزہ لے رہا ہو جس پر وہ تجربہ کر چکا ہو یا تجربہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہو۔

سامنے اندھیرے گوشے سے دو اور آدمی نکل کر میری طرف بڑھے۔ یہ درمیونے قد کے عتھے ہوئے سیاہ فام نوجوان تھے، وہ خاموشی سے میرے قریب آئے اور مشاقات سے انداز میں میرے لباس پر ہاتھ بھیر کر انہوں نے غائبانہ اطمینان کیا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار موجود نہیں ہے اور غائبانہ بات انہوں نے اپنی زبان میں پرنس کو بتائی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ پرنس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص فرانسیسی لب و لہجے میں انگریزی میں پڑ دیا۔ ”تم یہاں آئے ہو اور بغیر ہتھیار کے آئے ہو۔ یہ ناممکن ہے۔“ پھر وہ قدرے غصیلے لہجے میں غالباً اپنی مادری زبان میں انہی دونوں نوجوانوں سے کچھ کہنے لگا۔ نوجوانوں نے اب باقاعدہ میری سلامتی لینا شروع کر دی۔ انہوں نے میری ہر جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا، بغلیں ٹٹولیں۔ ٹانگوں پر ہاتھ مار کر دیکھا، پھر پرنس کی طرف دیکھتے ہوئے بے بسی سے نفی میں سر ہلایا۔

اس دوران میری توجہ انہی کی طرف رہی اور میں اس وقت چونکا جب عقب سے ایک کھٹکے کے ساتھ میرے ہاتھوں میں جھکڑی ڈال دی گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھوں میں یوں جھکڑی لگ جاتا میرے حق میں مسلک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

وہ دونوں آدمی بھی میرے دائیں بائیں آکھڑے ہوئے جنہوں نے میرے بازو پشت پر جکڑ رکھے تھے۔ تہ خانے میں گہرا سکوت طاری تھا جیسے وہاں کوئی مقدس فریضہ انجام دیا جا رہا ہو۔ دھنچکا... میرے عقب میں بھاری قدموں کی دھپ دھپ سنائی دی۔ میں گردن ذرا سی کھمائی بغیر نہ رہ سکا۔ میرے پیچھے کسی آریک گوشے سے وہی قوی ہیکل گونگا نکل کر روشنی کی طرف آ رہا تھا۔ وہ کندھے پر بہت بڑے اور بھاری پھل کی کھال ڈھائی اٹھائے ہوئے تھا۔ اتنے چوڑے اور موٹے پھل کی کھال ڈھائی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

گوشت کے موٹے موٹے بھدے ہونٹوں پر احمقانہ مسکراہٹ تھی لیکن اس میں ایک عجیب سی سفاکی بھی شامل تھی۔ اس کی ہلی موٹی آنکھوں سے خون کی پیاس جھلک رہی

”ورنہ سیدھا طریقہ ہے۔۔۔ پر اسے زانوں سے استعمل ہوتا آ رہا ہے۔“ پرنس نے سبے نیڑی سے کہا۔ ”میں نے اس میں صرف تھوڑا سا اضافہ کیا ہے، وہ بھی لاش کو ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں۔ طریقہ یہ ہو گا کہ یہ چاروں آدمی تمہیں پکڑ کر نکڑی کے اس چبوترے پر جھکا دیں گے اور یہ گونگا جس کا نام مباحث ہے، کھانڈی کے ایک ہی وار سے تمہاری گردن اڑا دے گا۔ یہ اتنی طاقت سے وار کرتا ہے کہ یقیناً تمہیں ہے تمہاری گردن آست کر تمہ خانہ کی دیوار سے جا ٹکرائے۔“

”اس کے بعد یہ اسی چبوترے پر چند منٹ کے اندر اندر تمہارے اعضاء الگ الگ کر کے اس بڑے کموڈ میں ڈالے گا اور نینکی کی زنجیر پھینچے گا، دوسرے ہی لمحے تم فلش ہو جاؤ گے۔ جس طرح لوگ ہاتھ روم میں غلاہٹ فلش کر دیتے ہیں، اسی طرح یہ تمہارے اس تندرست و تروتا جسم کے ٹکڑوں کو فلش کر دے گا۔ قریش، کھانڈی اور چوٹی چبوترہ دھو ڈالے گا اور یہاں تمہارا نام و نشان تک نہیں رہے گا۔ اس کموڈ کی لکڑی کا بہت بڑا پائپ سمندر میں جا کر ٹھکتا ہے۔ تمہارے اعضاء سیدھے سمندر میں جا گئے گے۔ ان پر سے گوشت مچھلیاں نوج کر کے جانیں گی اور ہڈیاں ڈوب جائیں گی اور اگر تم اپنے آپ کو ان مراحل سے محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو صرف اتنا کرو کہ مجھے اس رپورٹر کے ہارے میں بتا دو تاکہ میں اسے صرف اتنا بتا دوں کہ بڑے لوگوں کو بلیک میل کرنے میں بے شک دولت بھی نہیں ہاتھ آتی ہے لیکن کبھی کبھی ایسی غلط جگہ ہاتھ پڑ جاتا ہے کہ زندگی بھر کی کئی کا حساب برابر ہو جاتا ہے۔“

خدا نہ کرے کہ مجھ پر کبھی ایسا وقت آئے کہ میں اپنے دوستوں کی زندگی کا سودا کر کے اپنی زندگی بچاؤں۔“ میں نے کہا۔ ”تم اپنا کام شروع کرو۔“

پرنس نے چاروں آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ میرے کندھوں اور بازوؤں پر گرفت مضبوط کر کے مجھے چوٹی چبوترے کی طرف لے چلے۔ اب مجھے اضطراب محسوس ہونے لگا تھا۔ مجھے اگر کوئی اطمینان تھا تو صرف یہ کہ میری ٹانگیں آزاد تھیں۔ جوڑوں کے استعمال کے سلسلے میں بعض اوقات ٹانگوں کا آزاد ہونا ہاتھوں کے آزاد ہونے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

مباحث کھانڈی کندھے پر رکھے میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ کھانڈی کا پھل تیز روشنی میں چمک رہا تھا۔ اونچے سے چوٹی چبوترے کے پاس پہنچ کر ان چاروں نے طاقت صرف کر کے مجھے چبوترے پر جھکا دیا۔ میں صرف دکھاوے کے لیے تھوڑی بہت مزاحمت کر رہا تھا۔ میں چاہتا تو ان چاروں کی گرفت سے نکل سکتا تھا لیکن میرا اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ میں ان کی گرفت سے نکل جاؤں بلکہ میری سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ کس طرح اس دیوار مباحث کے ہاتھوں سے کھانڈی نکل جائے۔ سب سے زیادہ خطرہ مجھے اس کی گرفت میں کھانڈی کی موجودگی سے ہی تھا۔

تھی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے کسی درندے کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پرنس نے ایک دیوار کے قریب جا کر کوئی سوکچ دیا اور پورے تھ خاٹے میں روشنی پھیل گئی۔ اب میں نے دیکھا کہ تھ خاٹے کا ایک حصہ عجیب و غریب کاٹھ کہاڑ سے بھرا ہوا تھا۔ رستے، ہتھوڑے، چھروں، چھوٹی بڑی کٹھڑیاں۔ نکڑی کا ایک بہت بڑا چوکور ٹھوس ٹکڑا۔ ایک کونے میں زمین میں کموڈ سے مشابہ ایک بہت بڑا پیالہ سا نصب تھا جس کے ساتھ فلش کی نینکی ہی کی طرح بڑی نینکی بھی منسلک تھی۔ نینکی کے ساتھ بڑے پینڈل والی زنجیر بھی لٹکی ہوئی تھی۔ یہ گوشہ کسی جنتی مخلوق کا ہاتھ روم معلوم ہوتا تھا جو انسان سے کم از کم دس گنا بڑی ہو سکتی تھی۔

”پرنس!“ میں نے مرنے کی جگہ سے کہا۔ ”میں ایک بار پھر تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ تم نقصان اٹھاؤ گے۔ ابھی وقت ہے کہ تم نکاری سے مجھ پر قابو پانے کا خیال ترک کر دو تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں پھر جا ہوں بھی تو تمہیں معاف نہ کر سکوں۔“

”کیا ابھی تمہیں کوئی خوش فہمی باقی ہے؟“ پرنس نے قدرے حیرت سے کہا۔ میں اس مروجہ کچا کام نہیں کر رہا۔ تم جزیروں پر تھما آئے ہو اور تمہارے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں، اس کے باوجود تم اتنے پر اعتماد کیوں ہو؟ میں یہ راز جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”اس میں راز کی کوئی بات نہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں چاہوں بھی تو خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔ موت میرے لیے ایک سادہ سی حقیقت ہے۔ اس کے تصور سے میں خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔ مرنا تو ہر حال سب ہی کو ہے۔ کسی کو گھر کے آرام و بہتر پر، کسی کو میدان جنگ میں اور کسی کو تم جیسے کیبنے، دشمنوں کے ہاتھوں سلین زدہ تھ خانوں میں۔ اس لیے یہ تو کوئی تشویش کی بات نہیں مگر تم سوچ دو کہ اگر اچانک موت تمہارے سامنے آنکڑی ہوئی تو تم کیا کرو گے؟“

فی الحال میں محض باتوں سے خوفزدہ ہونے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ پرنس نے لاپرواہی سے کہا۔ ”اور تم جتنی چاہے شنی بھگڑ لو۔۔۔ ابھی جب صحیح طور پر موت کو سامنے کھڑا دیکھو گے تو چچیں مارو گے۔ رگم کی بھیک مانگو گے۔ تم جوان ہو، خوب صورت ہو، صحت مند ہو، تم نیسے نوجوانوں سے مجھے نفرت ہے۔ تمہارے قتلے ہوتے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوگی۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ”ویسے اگر تم مجھے اپنے اس رپورٹر دوست کا نام دینا بتا دو جسے میرا ایک راز معلوم ہے اور جس نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ تمہارے بھے کی موت اس کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ اس کا مقدر بن جائے گی۔“

”ورنہ؟“ میں نے پوچھا۔

پھر کسی نے دروازے کو ٹھوکر ماری اور کہا۔ ”ہاں! ہوشیار۔۔۔“
 دوسرے ہی لمحے نہایت مضبوط اور موٹا چوہا دروازہ ایک زبردست دھماکے کے ساتھ
 ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر فرش پر آگرا اور تہہ خانے میں بارود کی بو پھیل گئی۔ دروازہ گریڈ
 سے اڑا دیا گیا تھا۔ اسی لمحے تہہ خانے کی بقیات روشن ہو گئیں اور میں نے چھٹا کو بلا خوف
 و خطر، آندھی طوفان کی طرح اندر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔ پرس
 کے دونوں گروے جنہیں میں نے ریوالور نکال کر دروازے کی طرف لپکتے دیکھا تھا، ابھی تک
 اپنا جگہ سلامت ہی کھڑے تھے لیکن اُن کی عقل گویا خطا ہو کر رہ گئی تھی۔
 پھر انہوں نے بے مقصد سے انداز میں ریوالور بلند کرنے کی کوشش کی لیکن چھٹا نے
 بلا توقف اسٹین گن سے برسٹ مارا۔ ان میں سے ایک کا جسم تو گویا دھڑپ سے دو حصوں
 میں تقسیم ہو گیا۔ دوسرا ہوا میں کئی فٹ اچھلا اور فرش پر گر کر ساکت ہو گیا۔ دوسرے ہو
 فرش پر ڈھیرے تھے، ان میں سے ایک ہٹا کی تلاش میں میرے قریب ہی آکھنچا۔ میں نے
 اس کی کھنٹی پر ٹھوکر رسید کی، وہ بلبلتا کر دور جاگرا۔ دوسرے ہی لمحے اسٹین گن کی گولیاں
 آستے اور اس کے ساتھی کے علاوہ حبابش کو بھی چاٹ گئیں۔



اس مقصد کے لیے میں جان پر کھیل کر ایک دائرہ آزمائے جا رہا تھا۔ خطرہ مول لینے بغیر
 تو ویسے بھی چارہ نہیں تھا۔ چاروں آدمی مجھے چبوترے پر اس عالم میں جھکا چکے تھے کہ میری
 ٹانگ اور پیشانی چوہا چبوترے کو چھو رہی تھی اور میں چبوترے میں رہتی ہوئی لو کی بو
 محسوس کر سکتا تھا۔ ویسے تو اسے نہ جانے کتنی مرتبہ کن کن طریقوں سے دھویا گیا ہوگا
 لیکن لو کی بو شاید کتنی بھی طریقے سے نہیں جاتی یا پھر میری قوت شامہ کو ہی اس کی کوئی
 خاص پہچان ہو گئی تھی حالانکہ ابھی میں نے اپنی زندگی میں زیادہ خونریزی نہیں دیکھی تھی۔
 حبابش نے پوزیشن تبدیل کی۔ ماحول پر بد کا سکوت جاری تھا۔ اس سکوت میں میں نے
 ”شائیں“ کی تیز آواز سنی اور پوری قوت صرف کرتے ہوئے کھلی کی سی تیزی سے اٹھا
 سر چبوترے پر سے ہٹا لیا۔ وہ چاروں آدمی بری طرح لاکھڑائے جنہوں نے مجھے قابو کیا ہوا
 تھا۔ کھڑائی ایک زوردار نواز کے ساتھ چوہا چبوترے میں اتنی گہری گڑ گئی کہ فوری طور پر
 اسے نکالنا حبابش کے لیے بھی ممکن نہ رہا۔ اگر کھڑائی کو میری گروں سے گزرنا پڑتا تو شاید
 اس کی رفتار میں اتنی تیزی نہ رہتی اور وہ چوہا چبوترے میں اتنی نہ دھنکتی البتہ میرا سر
 یقیناً ایک حقیر گاجر کے سرے کی طرح کٹ کر دور جا گرتا۔

حبابش قدرے جھک کر کھڑائی کو نکالنے کے لیے زور آزمائی کر رہا تھا۔ سب میں نے
 اس کی پسینوں پر لات رسید کی۔ جوڑو کی اصطلاح میں یہ ”چاب سوتی“ تھی۔ حبابش کی
 ایک دو پسلیاں ٹوٹی تھیں لیکن وہ نہ تو الٹ کر آ رہا اور نہ ہی زیادہ پیچھے ہٹا۔ محض ذرا سا
 لاکھڑا کر سنبھل گیا۔ اس کے حلق سے غصیلے سانس کی سی ڈکراہٹ خارج ہوئی اور وہ کھڑائی
 کا خیال ترک کر کے مجھ پر جھپٹا۔ میں جھپٹاؤ سے گریز کر درمیان سے لپٹی یا اور وہ بیک وقت
 ان چاروں آدمیوں کو ساتھ لیتے ہوئے فرش پر ڈھیر ہو گیا جنہوں نے چند لمحے پہلے تک مجھے
 گرفت میں لے رکھا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اٹھ سکتا، پیس میں کہیں گولیوں کے دھماکے گونجنے لگے۔ سب اپنی
 اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ دھنک ”پرس“ کے دو گروں نے ہوسٹروں سے پستول نکالے اور
 دروازے کی طرف لپکے۔ باقی دو گروں کو حبابش کے ہاتھوں نہ جانے کہاں ضرب پہنچ چکی
 تھی کہ وہ تقریباً دہرے ہو چکے تھے اور بری طرح کرا رہے تھے۔

”ٹھہرو۔“ پرس نے ان دونوں کو حکم دیا جو ریوالور لیے دروازے کی طرف بڑھ رہے
 تھے۔ پرس سخت تذبذب میں نظر آتا تھا۔ دونوں سیاہ فام گروے رک کر چلے لیکن اس سے
 پہلے کہ پرس اسٹین گن کو حکم دے پاتا، تہہ خانے کی بقیات بجھ گئیں اور ٹھپ اندھیرا چھا
 گیا۔ میں فوراً ہی رنگ کر چوہا چبوترے کی آڑ میں چلا گیا۔ تہہ خانے میں کراہت سکوت چھا
 گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سب نے سانسیں تک روک لی ہیں۔

اوپر فائرنگ بھی ختم ہو چکی تھی۔ دھنک ”تہہ خانے کی سیرھیوں پر دھڑ دھڑ کی آواز آئی۔“

نور اللہ انصاری کی زندگی کا رنگ ستر

نور اللہ انصاری کی زندگی کا رنگ ستر

چھٹا اٹھین گن کا کچھ زیادہ ہی آزادانہ استعمال کر رہا تھا۔ میں نے اسے اتنی خونریزی کی ہدایت نہیں کی تھی لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ پرنس میرا کیا حشر کرنے لگا تھا اور اس سے پہلے یہاں نہ جانے کتنے انسانوں کو زمانہ قدیم کے جادو صفت صحرائوں کے روایتی انداز میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ تب میں نے چھٹا کو اس سلسلے میں تنبیہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

میں نے چوتھے کی آڑ سے دیکھا۔ چھٹا اٹھین گن تھامے تھامے خائے کے وسط میں تھکا کر رہا تھا اور پرنس شومیں اس کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر فرش پر اوندھا لیٹا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ گدی پر رکھے ہوئے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی مزاحمت نہ کرنے کا اعلان کر رہا ہے۔ اس کے حلق سے عجیب گھبراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

"یاس! تم کہاں ہو؟" چھٹا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پکارا۔

میں چوتھے کی آڑ سے نکل آیا۔

"دلدار کہاں ہے چھٹا؟" میں نے پوچھا۔

"یاس! وہ پرنس کے محافظوں کی لاشیں کار میں ڈال کر سمندر میں پھینکے جا رہا ہے۔" چھٹا نے جواب دیا۔

دلدار یوں تو میری کہنی میں سہرا نڈر تھا لیکن درحقیقت میرے جانثار ساتھیوں کے اس دستے میں شامل تھا جو میں اور چھٹا مل کر تیار کر رہے تھے۔

ابھی تک میں اور چھٹا ایسے صرف دو ساتھی اچھوڑا پائے تھے۔ ایک کا نام دلدار اور دوسرے کا نام حسین تھا۔ دلدار تو چوڑا چکلا اور خوبصورت جوان تھا۔ اس کی مقبوضی اس کی جسمانی ساخت سے ہی نمایاں تھی لیکن حسین پتلا رستم تھا۔ بظاہر وہ قانون کا مارا کوئی منجھی سا شاعر نظر آتا تھا لیکن اس کے دبلے پتلے جسم میں قدرت سے حیرت انگیز خوبیاں بھر دی تھیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بنیادی طور پر وہ الیکٹریک انجینئر تھا مگر اب یہ بات شاید اسے خود بھی صرف ضرورت پڑنے پر ہی یاد آتی تھی۔ اس بنیادی حشر سے قطع نظر خیر زنی، چراکی، جمنسک، لٹنے بازی اور شکار میں استعمال ہونے والے مختلف قسم کے ہتھیار تیار کرنے میں اس کا فانی لانا مشکل تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس قدر دہلا پتلا ہونے کے باوجود ہا کا طاقتور اور سخت جان تھا۔ آنکھوں کی طرح اگر کسی کو گرفت میں لے لیتا تو وہ اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکتا تھا۔ اور سخت جان اتنا کہ تین چار دن مسلسل بھوکا رہنے کے باوجود اس کی جسمانی پھرتی اور صلاحیتوں میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔

"لاٹھیں سمندر میں بھجوانے کا تو تم نے باحق تردد کیا۔" میں نے چھٹا سے کہا اور جہازی ساز کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "لاٹھیں سمندر میں پھینانے کا تو یہاں نہایت اعلیٰ انتظام ہے۔" ایک لمبے کے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ "اور حسین کہاں ہے؟"

"وہ سوچ بورڈ میں تھپکا کر رہا تھا۔۔۔ آ رہا ہوگا۔" چھٹا نے جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔ پرنس کو تو میں منبھاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم ان چاروں سیاہ فاموں کی تلاش لو۔۔۔ اس میں سے کسی کی جیب میں اس ہتھکڑی کی چابی ہوگی جو میرے ہاتھوں کو لگی ہوئی ہے۔"

چھٹا کھانی کی تلاش میں۔ شوں کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ میں نے پرنس کی ٹھوڑی پر ہلکی سی ٹھوکر رسید کی۔ "کیا حاشی ہے پرنس؟" میں نے پوچھا۔ "تم نے واقعی یقین کر لیا تھا کہ میں تم جیسے کینے دشمن سے منے کے لیے بغیر کسی انتظام کے نکل کھڑا ہوں گا؟"

"مجھے مت مارنا۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔ پرنس نے میری بات پر دھیان دیئے بغیر کھینچتے ہوئے کہا۔

"تمہیں مارنا ہی تو میں نہیں چاہتا۔" میں نے مہربانی سے کہا۔ "ورنہ پہلی ملاقات پر ہی تمہارا قصہ پک کر رہتا۔"

چھٹا نے ہتھکڑی ایک طرف پھینک دی اور پر خیال نظروں سے پرنس کی طرف دیکھا۔ وہ بوکھلا کر بولا۔ "اب تم میرے ساتھ کیا ملوک کرو گے؟"

"ملوک؟" میں نے حاشیت سے کہا اور چھٹا کی طرف دیکھا۔ "پرنس کو بتاؤ کہ ہم انہیں ایک معمولی سی زحمت دینا چاہتے ہیں۔" چھٹا نے تھیلے سے ٹاپ شدہ عداوتی اور ساوا کاغذات کا ایک پلندا نکال کر پرنس کے سامنے رکھ دیا اور ایک قلم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ان سب پر دستخط کرو۔۔۔ باقی کارروائیاں ہمارے وکیل نمائندے کریں گے۔ ان کاغذات پر دستخط کے بعد یہ جیس ہمارے کہنی کے کنٹرولیشن ڈویژن کی ملکیت ہو جائے گا۔" اس نے فرش سے قلم اٹھایا اور جھک کر تیزی سے کاغذات پر دستخط کرنا شروع کر دیے۔ چھٹا اٹھین گن کی ٹالی سے اسے بتاتا جا رہا تھا کہ اس کاغذات پر دستخط کرنے ہیں۔

"اب۔۔۔۔۔" دستخطوں سے فارغ ہو کر اس نے تھوک نگتے ہوئے پوچھا۔

"اب تم اور چھٹا۔۔۔ اپنی ضرورت کی چیزیں ایک سوٹ کیس میں ڈالو گے۔۔۔۔۔ اس کے بعد ہم تمہیں تمہارے طیارے تک چھوڑنے چھیں گے۔" میں نے اس کے زوردار

تیا۔

اس کے ساتھ تیس پچیس سال کی ایک انتہائی حسین عورت تھی جس کے ماتھے پر ٹمک چمک رہ تھا۔ وہ کاسنی ساڑھی میں تھی اور اس کا جسم گویا سانپے میں ڈھلا ہوا تھا۔ بظاہر وہ سیدھی سادی اور شریک سی عورت نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میں نے سامنے سے آتے وقت ایک لمحے کے لیے ہی اس کی طرف دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی مکاری کا جائزہ لے لیا تھا۔ اب میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے اس پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تعاقب کا شبہ اگر ہوا بھی تو اس عورت ہی کو ہوگا، بدن موہن کو اس کا ہوش نہیں تھا۔ اس کے قدم گو کہ لڑکھائیں رہتے تھے مگر یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہ خاصی چمپے ہوئے ہے۔ اس نے عورت کا بازو تھامنے کے بدلے درحقیقت اس کا سارا لے رکھا تھا۔

پارکنگ لائٹ میں پہنچ کر وہ سبز رنگ کی ایک چھوٹی سی اسپورٹس کار میں بیٹھ گیا۔ اسٹیمپنگ عورت نے ہی سنبھالا تھا اور وہ اس کی گاڑی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے قدرے جارحانہ سے انداز میں لیکن نہایت مشاقی سے گاڑی دوسری گاڑیوں کے درمیان سے نکالی۔ اس وقت تک میں بھی اپنی روٹر رائس میں بیٹھ چکا تھا۔

سبز اسپورٹس کار سڑک پر پہنچ چکی تو میں نے بھی گاڑی پارکنگ لائٹ سے نکالی اور اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ درمیانی فاصلہ میں نے خامسا رکھا تھا کیونکہ ابھی شام کا دھندلا گہرا نہیں ہوا تھا اور روشنی میں روٹر رائس کچھ زیادہ ہی نظر میں آجاتی تھی۔

چند منٹ کے سفر کے بعد ہی سبز اسپورٹس کار ایک نئی فیشن ایبل سی کالونی میں داخل ہوئی اور چند گلیوں میں چکرانے کے بعد ایک چھوٹے سے خوبصورت بنگلے کے پورچ میں جا رکی۔ اس بنگلے کی دیواروں پر عشق وصال کی عظیم الشان انداز میں چڑھی ہوئی تھیں۔ گیٹ کے ستونوں پر صرف بنگلے کا نمبر نظر آتا تھا، کوئی نام نہیں تھا۔ میں آگے مڑتا چلا گیا۔

کلی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ بنگلے کے آس پاس کہیں رکنا مجھے موزوں نظر نہ آیا لیکن کھلی کے ٹکڑے پر ایک مناسب جگہ نظر آئی۔ یہاں درختوں کا ایک پھونکا سا جھنڈ بھی تھا جس کی وجہ سے تاریکی نہایت گہری تھی۔ قریب ہی ایک بنگلہ بھی زیر تعمیر تھا۔ میں نے گاڑی سڑک کی اور درختوں کے نیچے لے جا کر روکی۔

وہاں گاڑی میں بیٹھے مجھے کافی دیر مڑ مڑی لیکن بدن کی واپس کے کوئی آثار نظر نہ آئے بالآخر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ریسٹنگ کی سی رفتار سے اس بنگلے کے سامنے سے گزرا۔ بنگلہ یوں سکوت اور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا جیسے وہاں کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو۔ ہلکی منزل پر صرف ایک چھوٹی سی کھڑکی میں روشنی نظر آرہی تھی، وہ بھی شیشوں اور

سے اسے مطلع کیا۔ "ایئر پورٹ پر تم بیٹس سے ریڈیو کے ذریعے اپنا فلائٹ پلان دو گے اور اپنی ریاست کی طرف پرواز کر چو گے۔ اور اگر زندہ رہنا چاہو گے تو کبھی ہندوستان کا رخ نہیں کرو گے۔"

"میں... میں ابھی نہیں سوں گا۔۔۔۔۔ میرا تو پہلے ہی سے یہی ارادہ تھا۔۔۔۔۔" وہ جلدی سے بڑا۔

"اگر تم نے خواہنا چاہا کہ بننے کی کوشش نہ کی ہوتی تو تمہیں وہ لاکھ روپیہ بھی مل جاتا اور اتنے ساتھیوں سے ہاتھ بھی نہ دھونے پڑتے۔" میں نے کہا۔

"دراصل۔۔۔۔۔ مجھے اندازہ نہیں تھا۔۔۔۔۔ کہ یہاں اس پسے کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

میں میری مرضی کے مطابق سیٹ ہو چکا تھا اور ماہتاب، ایک گورنس اور ایک باڈی گارڈ کے ساتھ علاقے کے لیے ندن جا چکی تھی۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ کسی بھی روز ایک دن کے لیے پونا جاؤں۔ اپنے کالج فون کر کے میں نے بدن موہن کے گھر کا ایڈریس معلوم کر لیا تھا۔ میں چاہتا تو پھر "دلدار یا حسین" میں سے کسی کو بھیج کر بھی بدن موہن کو اسی طرح اٹھوا سکتا تھا جس طرح نوکر کے ہاتھ بازار سے کوئی سوا منگوا لیا جائے۔ لیکن پھر بھی جانے کیوں یہ کام میں خود کرنا چاہتا تھا۔

پھر ایک روز میں اپنی خوش قسمتی پر غور ہی رکھ کر بغیر نہ رہ سکا۔ میں جس کی تلاش میں اتنے دن سے پونا جانے کا پروگرام بنا رہا تھا، وہ مجھے بسکی میں ہی نظر آیا۔ جس طرح پونا سے آنے کے بعد سے اب تک میری اپنی شکل و شباہت اور رکھ رکھاؤ میں خاما فرق آگیا تھا، اسی طرح بدن موہن بھی ظاہری طور پر کافی بدن چکا تھا۔

وہ وقت سے پہلے ہی بڑا پکا سا نظر آنے لگا تھا۔ آنکھوں کے پونے اور جڑے غامض بھاری ہو گئے تھے۔ بال اس نے بہت بوجھ رکھے تھے۔ سٹریٹ کی جگہ سگار پینا شروع کر دیا تھا۔ بڑی نفیس تراش فراش کا سوٹ پہنے ہوئے تھا اور کوئی معزز کاروباری آدمی نظر رہا تھا۔ میں پہلی نظر میں شاید اسے نہ پہچانتا اور اس کے قریب سے گزرتا چلا جاتا۔ مجھے صرف اس کی آواز نے چونکا دیا حالانکہ وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا اور کچھ اس کی آواز پر غبار کا بھی غلبہ تھا مگر جانے کیوں اس کا سب دلچسپ میری سماعت پر گویا نقش لہ۔

وہ اس وقت شاہ ٹائٹ کلب کے ریجمنٹ ڈور کے ایک طرف سے نکل رہا تھا اور میں دوسری طرف سے اندر جانے لگا تھا۔ ایک امریکی فرم کے دو نمائندوں سے یہاں میری ملاقات طے تھی جس کا وقت ہو چکا تھا۔ میں گھومتے دروازے سے اندر تو چلا گیا لیکن اس وقت میں بدن موہن کو پہچان چکا تھا، اس لیے دوسری طرف سے اس کے پیچھے پیچھے نکل

پردوں کے پیچھے۔ بدن کے نکلنے کے ابھی کوئی آثار نہیں تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا رات میں بھر کرنے کا ارادہ ہو۔

میں نے دوبارہ گاڑی درختوں کے نیچے لاکھڑی کی۔ ایک ٹھیکے کے انتظار کے بعد جبکہ میں بائیں سو کر بیٹھے میں داخل ہو جانے کا ارادہ کر رہا تھا، مدت اچانک ہی مجھے باہر آتا دیکھا گیا۔ وہ عورت یا کوئی اور اسے گیت تک چھوڑنے بھی نہیں آیا تھا اور اس کے پاس کار ریفر بھی نہیں تھی۔ وہ جھوٹا جھامٹا پیدل ہی ایک طرف کو چل پڑا۔ اس کی چال میں اب باقاعدہ لڑکھائیت تھی۔ بیٹھے میں غالباً اس نے اور بھی پی نچی اور شاید اسی پتہ کار اور حسین ساتی کے ہاتھوں سے پیا تھی۔

جب وہ دوسری گلی میں مڑ چکا تو میں نے گاڑی کی سائیں آن کیں اور اس سے ایک قدم آگے پیچ کر بیک لگا دی۔

”ارے... بدن...! تم یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟“ تجھے اندھیرے میں میں نے کھڑکی سے سر نکال کر قدرے بدلی ہوئی آواز میں اسے پکارا۔ وہ ٹھٹھا اور پکڑے کی طرح گردن آگے کر کے مجھے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا، حالانکہ وہاں روشنی اس قدر کم تھی اور بدن پر شمار اتنا غالب تھا کہ اس کی یہ کوشش فضول ہی تھی۔

”ارے... بھئی... پہچانا نہیں... میں ٹوٹی ہوں۔“ میں نے مختلف لمبے میں کہا۔ کالج کے زمانے میں ٹوٹی بدن کا گھرا پیر ہوا کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کل وہاں وہ کہاں تھا، تاہم میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑ دیا تھا۔

”ارے... رستہ... ٹوٹی...! بدن نے لڑکھائی آواز میں صرف اتنا کہا اور اس سے کہیں زیادہ لڑکھائے قدموں سے میری طرف پکا۔ قریب آکر وہ کھڑکی کے راستے مجھ سے گلے ملنے کی کوشش کرنے لگا لیکن میں نے آہستگی سے اس کے بازو پیچھے کر دیئے۔

”کیا... یہاں کہاں... آتے مر... تو تو امریکہ گیا ہوا تھا۔“ اس نے ٹھوم کر دوسری طرف سے آگے بڑھے۔

”اس پر موی ہی کیا ہوں... تجھے اطلاع ہی نہیں رہے سکا۔“ میں نے اس کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ دروازہ کھلنے پر پھست کی مدھم سی جی روشنی ہوئی تو اس نے بیٹھے بیٹھے کھڑک سے میرے بچانے کار کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں یوں چندھیا رہی تھیں جیسے کار میں کوئی مودت کے پتے ہی روشنی پھیلی ہوئی ہو۔

”کار تو بڑی شاندار ہے پورے اکیس سال سے... کرنا یا ہے... امریکہ سے ہی ساتھ لیا ہے کیا؟“ اس نے جملوں کے درمیان پچھیاں لیتے ہوئے کہا اور میرے برابر سیٹ میں دھنسن گیا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر لیا اور کار میں ایک بار پھر اندھیرا پھیل گیا۔ صرف پیش بوز سے مختلف میٹروں کی شاییت ہی دھندلی مزی روشنی میرے

ہاتھوں اور اس کے ڈائمنڈ ہائی پن پر پڑ رہی تھی۔

”یہاں پیدل کہاں دھنسنے کا رہے تھے؟“ میں نے کار سے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”میری گاڑی کتب میں کھڑی ہے۔“ اس نے قدرے سنبھتے ہوئے مجھے میں بتایا۔ ”یہاں ایک اونچے درجے کی حرافہ کے ساتھ آیا تھا۔ پرانی واقف ہے لیکن تمہیں پتا ہی ہے... یہ کام نکلنے کے بعد نوکر کو بھیج کر کیسی تک دیکھ کر نہیں دیتیں۔ شکر ہے تم مل گئے... اس علاقے میں تو دور دور تک کیسی بھی نہیں ملتی۔“

میں اس وقت کشمی مینشن کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ یہ ایک چوڑی پتلی پر روشنی اور روشن سڑک تھی۔ بدن نے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے آنکھیں سکینز۔ ”تم نشاط کلب کی طرف نہیں جا رہے کیو؟ میں وہاں سے اپنی گاڑی لے لیتا۔“

”بعد میں کسی کو بھیج کر دیکھا میں گئے... نی اٹھا اس عشرت کدے کی طرف چل جو تیرے اس خادم نے دریافت کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں بھی اس قدر حسن و شباب کا ایک چھوٹا سا خزانہ ہمارا منتظر ہے۔“

میں نے جب گاڑی اپنی کونجی کے ڈرائیو سے میں موڑی تو روش کے دونوں طرف گلوب روشن تھے۔ میں گاڑی برستہ کے پیچھے کی طرف لے گیا جہاں روشنی کم تھی۔ بدن نے گاڑی سے اتر کر چند منی پند میں آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا اور محسوس کیے میں ہانا ”یہ تو اپنے اڈوں سے بھی کوئی اونچا ہی اڈا معلوم ہوتا ہے...! تو تو تھوڑے ہی عرصے میں بڑی اونچی چیز بن گیا ہے“ اس نے میری کمر پر دھپ رسید کی، پھر حیرت زدہ لمبے میں بولا۔ ”اور یہ تیرے جسم کو بھی تو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے... بالکل پتھر کا ہو گیا ہے... جدھر ہاتھ مارو ہاتھ ہی پھنکنا جاتا ہے... یار تجھے تو امریکہ کی ہوا بڑی راس آتی ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اس کا ہاتھ تمام کر بیرونی دروازہ کھول کر جلدی سے اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ رہبرداری میں کمرہ تیزی سے آتا دکھائی دیا تھا مگر میں نے دور ہی سے آواز دے کے اسے کہہ کر وہ اپنا سام کرے لائیں وغیرہ میں غور ہی جالوں گا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر میں نے بیک وقت ساری لائیں آن کر دیں۔ بدن جو نشے کی وجہ سے پہلے ہی ذرا سی روشنی میں بھی آنکھیں سکیڑ رہا تھا اب جیسے اندھا ہی ہو کر رہ گیا۔ ساؤنڈ پروف دروازے کو مقفل کر کے میں عین اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”ارے...“ چند لمبے بعد اس نے آنکھیں پت پٹاتے ہوئے کہا۔ ”تم ٹوٹی تو نہیں ہو...“ پھر جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ ”یہ آنکھیں... یہ اہو... یہ ناک... تمہارا چہرہ تو کافی حد تک جانا پہچانا لگ رہا ہے... صرف یہ بیزائٹس اجنبی لگ رہا ہے۔ ارے... تم تو منصور...“ باقی الفاظ اس کے حلق ہی میں دم توڑ گئے اور آنکھیں

رسید کرنے کی کوشش کی۔ یہ گھونسلہ کھائی پر دوکتے ہوئے میں نے اس کی کھینچ کر اسے ہارایت ہاکا سا ہاتھ رسید کیا کہ کہیں وہ مری نہ جائے۔ وہ ایک بار پھر قاتلین پر جاگڑا اور سر کو یوں دائیں یا میں بھٹکتے آگاہیے بیٹائی جاتی رہی ہو۔

چند لمحے بعد اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ سینے میں تر ہو چکا تھا۔ وہ مجھے انداز نہیں کوئی غلط حیوان معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے دیوار گیر الماری سے وہ خاص قسم کا چابک نکال لیا جو نہ جانے کب سے اسے ہی کسی موقع کے انتظار میں وہیں چلا تھا۔ اس کی رتی درحقیقت ہیزے کے ریشوں کو بل دے کر تیار کی گئی تھی اور اگر زیادہ دیر سے ماری جاتی تو گوشت میں از سکتی تھی۔

میں نے چابک گھمایا اور دوسرے ہی لمحے شائیں کی تراز کے ساتھ اس کی گردن پر رسید کیا۔ وہ یوں بلبل کر اٹھ کھڑا ہوا جیسے غلطی سے قالین پر نہیں گانٹوں کی بیج پر گر گیا تھا۔ دوسرا دار میں نے اس کی ناگوں پر کیا کہ وہ ناگوں کو پھڑکڑا رہا ہوتے ہوئے ایک بار پھر قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اس کے اوپری دھڑ پر چابک نہیں مار رہا تھا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ وہاں اس کے دھڑ کوٹ کی وجہ سے اسے زیادہ تکلیف ہو ضرب نہیں پہنچے گی۔

”پپو پچھاؤ.....“ دن اب باقاعدہ کسی ایسی عورت کی طرح بیچنے لگا تھا جس کی عزت پر حمہ کیو جا رہا ہو۔

”بیچنے کا شوق بھی پورا کر لو میری جان!“ میں نے چابک ہوا میں گھماتے ہوئے کہا۔ ”تم جیسے کمرہ انسانوں کی تراز کو انہی دیواروں تک محدود رکھنے کا میں نے خاص اہتمام کر رکھا ہے۔“

اس بار میں نے چابک اس کے سینے پر ماری جہاں کوٹ کے بنیں کھسے ہوئے تھے۔ وہ تڑپ کر اوندھا ہوا تو میں نے اس کی پٹٹیوں پر وار کیا۔ ”پپو پپو کی طرح چاروں ہاتھوں بیروں کے بل چلتے ہوئے اس کوٹے میں پھنچو دن!“ میں نے کمرے کے اس گوشے کی طرف اشارہ کیا جہاں کوئی قرینچر وغیرہ نہیں تھا۔

وہ اب ابلانیاں ہی لے رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کی گردن پر چابک رسید کیا۔ وہ تقریباً سجدے کی حالت میں چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر اپنا کھم دہرایا۔ وہ اس کی قہقہہ کرتے ہوئے چاروں ہاتھوں بیروں کے بل چلا ہوا کمرے کے گوشے میں پہنچا تو میں نے اسے قالین اٹھانے کا حکم دیا۔ قالین اٹھ کر وہ پیچھے ہٹ چکا تو میں نے سوچا کہ وہ ایک سوچا دہایا جو بجلی کے ڈبیر سوچوں سے ہی مشابہ تھا گراستے دبانے کا طریقہ مختلف تھا۔

جہاں سے قالین ہٹا تھا وہاں قرش میں ایک چوکور گڑا نمودار ہو گیا جس میں بیڑھیاں بیچے جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے ایک اور سوچا دہایا بیڑھیوں سے نیچے تک ردش کر رکھی گئی۔

یہ بچیں نہیں جیسے اس نے اپنے سامنے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو جس کے بارے میں اس نے صرف تھے کمانوں میں پڑھا ہو اور جس کے وجود پر اسے کبھی یقین نہ رہا ہو۔

اس کا اثر یوں ایک سخت ہرن ہو گیا تھا جیسے اسے بجلی سے شاک لگا دیا گیا ہو۔ پھر اس نے پھرتی ست کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاس بجلی ہو ستر میں رہا اور موجود ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے نکال پاتا میں نے اس کے منہ پر اسلئے ہاتھ کا پھیر رسید کیا۔ وہ بجلی کی بیج کے ساتھ دور جاگڑا۔ اس کا ہاتھ ایک بار پھر بعض کی طرف بڑھتا ہی لگا تھا کہ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی۔ بجلی کی طرف بڑھتا ہوا اس کا ہاتھ یوں سختی سے پسلیوں پر جم گیا جیسے وہاں پتھر گھونپ دیا گیا ہو۔

میں نے اس کا ہاتھ پسلیوں سے ہٹ کر جوتے تلے دیا اور جھک کر اس کے ہولسٹر سے دیوانہ نکال لیا۔ دیوانہ اپنی جیب میں رکھ کر میں دن کو پھوڑ کر ایک طرف چٹ گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی اور میں پڑا زخمی کتے کی طرح ہنپتا رہا۔

”انھو میری جان..... مجھ پر حملہ کرف..... بڑی دغاوت کے بعد تو تم سے ملاقات ہوئی ہے اور تم یوں تھکے ہوئے سو رکی طرح لیٹ گئے ہو۔“ میں نے ملا مت سے کہا۔

”میں تم سے معافی مانگتا ہوں منصور۔“ اچانک اس نے لیٹے ہی لیٹے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ مجھے خوف کر دو۔“

”کس بات کی معافی دن پیارے؟“ میں نے پہلے سے بھی زیادہ ملا مت سے پوچھا۔ ”میں نے تمہارے ساتھ جو بھی زیادتیوں کی ہیں ان سب کی“ اس نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”صرف میرے ساتھ؟“ میں نے ہلکی سی حیرت سے پوچھا۔ اس کے چہرے کی زردی کچھ بڑھ گئی۔ ”تو کیا، کتاب سے تمہاری ملاقات ہو چکی.....“ سرسراہٹ سی آواز میں وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا، ”بندہ مکمل نہ کر سکا۔“

”ہاں..... ماہتاب سے میری ملاقات ہو چکی۔ میں اس کا مسخ شدہ چہرہ دیکھ چکا۔ اس پر جو کچھ جیتی وہ بھی سن چکا۔ میری ماں بھی مجھ سے اچانک ملاقات کے صدمے کی تاب نہ لا کر سر نیچی۔ صرف ایک تمہاری ذات نے صرف تمہاری دنیاؤں نے کتنے انسانوں کو کیسی کمی قاتل سزا دی تھیوں سے دوچار کیا ہے..... کیا تمہارے خیال میں محض تمہارے معافی مانگنے سے سب اٹھ بھر جائیں گے دن!“

اس نے محسوس کر لیا کہ معافی مانگنے سے کچھ نہیں بہنے گا۔ موت کے جاں میں بچنے ہوئے دہرے کی طرح باجوسی اور دل ہونا نہیں کیا، انتہا پر آخری اور بھرپور کوشش سے یہ وہ ماری توانائی جمع کر کے اٹھ اور مجھ پر چھڑا۔ اس نے میری پسلیوں پر گھونسلہ

"جلو..." میں نے چابک اڑاتے ہوئے اس کو حکم دیا۔ "یونہی چوپایوں کی طرح ہی بیڑھیوں اتریں۔"

وہ کچھ جھنجھکیا تو میں نے اس کی پشت پر پوری قوت سے چابک رسید کیا۔ وہ ہلکا کر غلام کی طرف لڑکا اور سر کے بل بیڑھیوں پر لڑھکتے لڑکتے ہٹا۔ ہانپتے ہانپتے وہ چوپایوں کی طرح بیڑھیوں اترنے لگا۔ اب وہ شراب منشی نے بعد سوٹ میں لمبوس ہوتے ہوئے چوپایوں کی طرح بیڑھیوں اترتا ہوا صبر آزما کام تھا میں اس کے پیچھے تھا۔

تم خانے میں پہنچ کر وہ گردن بھکا کر آئی لمحے تک بری طرح ہانپتا رہا پھر اس نے خوفزدہ نظموں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا قلعہ خانہ تھا جس میں گھڑی کی کچھ سواریاں وار مشبوط بیٹیاں لمبے کی سلاخوں سے بٹے ہوئے چند چوکور بیڑیوں اور کچھ دوسرے ضروری سامان کے علاوہ دو دیوار گیر اماریاں بھی تھیں۔ یہ بھی میری ضرورت کی چیزوں سے بھری ہوئی تھیں۔

میں نے ایک بیڑی گھسیٹ کر تم خانے کے وسط میں رکھ دی اور چابک بھٹکتے ہوئے بدن کو حکم دیا۔ "اسی طرح چاروں ہاتھوں بیڑیوں کے بل رینگتے ہوئے اس میں داخل ہو جاؤ۔"

"نہیں... نہیں..." وہ دہشت سے بھئی بھئی آواز میں پوچھا۔ "تم کرنا کیا چاہتے ہو؟ مجھے بیڑیوں میں بند کر کے سمندر میں پھینک دو گے؟"

"نہیں میری جان! تمہیں ہلاک کرنا ہوتا تو میں اسی تاریک جگہ میں تمہاری گردن توڑ دیتا ہوتا۔ تمہارے بیٹے میں کوئی آثار کر سکتا تھا تمہیں غٹ دے کر یہاں تک نہ لانا۔" میں نے جواب دیا۔ "موت تو تمہارے گناہوں کی سزا نہیں، وہ تو تم پر ایک احسان عظیم ہو گا اور میں فی الحال تم پر احسان عظیم کرنے کے مواد میں قطعاً نہیں ہوں۔ تمہیں زندگی سے بڑا پیار ہے ناں...؟ میں تمہیں زندہ رکھوں گا... بے فکر رہو... چلو بیڑیوں میں بیٹو۔"

وہ پھر جھنجھکیا بیٹے اس کے چہرے سے فرش پر ٹپک رہا تھا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر چابک رسید کیا وہ تڑپا لیکن بیڑیوں کا رخ اس نے اب بھی نہیں کیا۔ کسی بے ہنگم چوپائے کی طرح اوپر اڑھوڑھوڑنے لگا۔ پوچھا میں نے وہ میرے قریب سے بھی گزرا۔ میں نے اس کے منہ پر ٹھوکر رسید کرنا چاہی لیکن وہ اس کی کٹھن پر پڑ گئی وہ دونوں بازو پھیلا کر ہوا میں اچھلا پھر اوندھے منہ کر کے رستہ ہٹ گیا۔

چوبیس بجی کا نہیں اتنے بیدار ختم ہو جانے پر مجھے افسوس بھی ہوا تاہم اب چونکہ اس کے جلد ویش میں نے کوئی امکان نہیں تھا اس لیے میں نے الماری سے ڈوری اور نیپ ڈال لی اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے بیڑیوں پر چوڑی نیپ پکائی اور اسے تقریباً دوہرا کرتے ہوئے چوکور بیڑیوں میں داخل کیا اور اس کا سلاخوں والا دروازہ بند کر دیا۔

یہ بیڑی اٹھا کر میں نے گھڑی کی ایک بیٹی میں رکھا جس میں وہ بالکل غٹ آتا تھا۔ بیٹی

میں ہوا کی آمد و رفت کے لیے ننھے ننھے سوراخ موندتے تھے بیٹی کو ٹانگے کے بعد میں نے اسے چند من سے گھسیٹ کر بیڑیوں کے قریب رکھا۔ الوداعی نظریہ خانے پر ڈالی اور اپنا چابک لیٹ کر کوٹ کی جیب میں پھنساتے ہوئے ہاتھ بھر کر واپس آکر بارانگ دم میں آگیا۔

چابک الماری میں رکھ کر میں فون کے قریب آئی اور چھانے کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف ریسپونڈ چھانے ہی اٹھایا۔

"ہیلو باس..." میری آواز سننے ہی اس نے پراسٹیاقی سجے میں کہا۔
"ایک پارسل میرے ہاں تیار پڑا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اسے پینس کے تم خانے میں پہنچانا ہے۔"
"ابھی...؟" اس نے پوچھا۔

"غفوری طور پر تو نہیں۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہر حال آج رات کسی بھی وقت پہنچ جانا چاہیے۔ میں تو اب ٹھنڈا کھا کر سو جاؤں گا، تم کسی بھی وقت آکر لے جانا۔ کرمو دروازہ کھول دے گا اور ڈیوری روم میں جانے کا طریقہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔"
"آپ فکر نہ کریں باس۔" چھانے نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ٹھیکان سے سو جائیں اور سمجھ لیں پارسل پہنچ گیا۔" میں نے فون بند کر دیا۔

دوسرے دن میں شام کو آفس سے فارغ ہو کر باقی مندر پہنچا اور سیدھا بیس کے تم خانے میں چلا گیا۔ وہ بیٹی ایک طرف کونے میں رکھی تھی جس میں کل میں نے دن موہن کو بند کیا تھا۔ میں نے بیٹی کا تالا کھولا اور لمبے کا بیڑی کھینچ کر نکال لیا۔ دن موہن کسی خوفزدہ انگور کی طرح دونوں ہاتھوں سے سنا نہیں مضبوطی سے پکڑے بیڑیوں میں انہوں بیٹھا تھا۔

اڑوں بیٹھنے کے علاوہ اس بیڑی میں وہ صرف یہ کر سکتا تھا کہ چوپایوں کی طرح چاروں ہاتھوں بیڑیوں کے بل کھڑا ہو جاتا۔ بیڑیوں کا سائز ایسا نہیں تھا کہ کوئی آرام وہ پوزیشن اختیار کر سکتا۔ اس کی ہڈیوں کو مستقل طور پر پھین کر رہ گئی تھیں۔ چہرے پر دہشت تھی، ہونٹوں پر پھپھیاں آتی ہوئی تھیں۔ اس کا سوٹ کئی جگہ سے مسک چکا تھا۔ ٹائی ڈھیل ہو کر مردہ کتے کی دم کی طرح اٹکی ہوئی تھی، بھرے بالوں نے پیشانی ڈھانپ رکھی تھی۔

ایک ہی رات میں وہ کسی تباہ حالی سیارے کی مخلوق بن کر رہ گیا تھا۔ اس دن موہن کا تو جیسے کہیں نام و نشان نہیں رہا تھا جسے میں جانتا تھا۔ کئی لمحے تک تو وہ ایک تک مجھے دیکھتا رہا جیسے بچہ نئے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر آنکھیں ہی اس نے غائب غیر ارادی طور پر اچھل کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن ٹھک سے اس کا سر بیڑیوں کی سلاخوں سے ٹکرایا

بات ہے، وہ تمہارا گھرا دوست رہا ہوگا۔“

”وہ اب ترقی پا کر ڈی ایس پی ہو گیا ہے۔“ من نے بدلتی نظر سے اس کا نام سے اس کا۔۔۔ اب وہ ماہتاب کے علاقے کے تھانے میں نہیں ہوتا۔ کوٹوالی میں چبھتا ہے۔ بھاری بھر کم آئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کی ٹاک کی ٹوک پر موٹا مس ہے اور۔۔۔ دیکھئے بھی وہ خالص معرول آئی ہے۔۔۔ ذرا سا اتار چا کرو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔“

مدن موہن کے لیے سے میں بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا اور وہ دلی سے چاہتا تھا کہ میں نرمل داس پر ہاتھ ڈالوں۔ اس کے خیال میں ایک ڈی ایس پی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش میں میرے اپنے رگڑے جانے کے کافی امکانات تھے۔ سردست میں اس کی اس سوچ پر صرف مسکرا ہی سکتا تھا۔

تیسرا آئی جس نے ماہتاب کی بڑائی میں اہم کردار ادا کیا تھا، اس کی نگلی ہی کا پر اپنی ڈیڑھ تھا لیکن ماہتاب کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ مدن موہن کا ساتھی نہیں تھا۔ اس نے صرف استاء درجے کے ایک سکالر اور کینے دہل کی طرح موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ ایک مجبور لڑکی کی آخری پونجی لوٹی تھی، ہرجال سزا کا مستحق وہ بھی تھا۔۔۔ اہم فی الحال مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔

”مدن! مجھے اس آدمی کا نام و پتہ چاہیے جس نے ماہتاب کے چہرے پر حیراب پھینکا تھا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اس بار وہ کچھ ہچکچایا لیکن اس کے اندر کوئی ایسی روح نہیں تھی جو زیادہ مزاحمت کر سکتی، اس لیے جلد ہی اذ خود بول اٹھا۔ ”اس کا نام دشتو ہے، پونا کے چاندنی چوک کے قریب ہی ایک چھوٹی سی بار ہے۔۔۔ چار لینز۔۔۔ پاس پڑوس میں۔ چاندنی کا شراب خانہ کے نام سے مشہور ہے۔۔۔ دشتو ہر شام وہاں ہوتا ہے۔۔۔ کاؤنٹر پر کوئی بھی موجود ہو، تم اس سے پوچھ سکتے ہو۔“

”نہیں۔۔۔ مجھے اس کا حلیہ اچھی طرح بتاؤ تاکہ مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔“ میں نے کہا۔

”وہ تقریباً پینتیس کی عمر کا دہلا پتلا طویل القامت شخص ہے۔ رنگت گہری ساقولی ہے، چہرہ لمبوتر ہے۔۔۔ آنکھیں اکثر سرخ رہتی ہیں۔ اس کی ایک خاص عادت یہ ہے کہ سگریٹ کا گلی ایک انگلی سے بھاڑتا رہتا ہے۔“ مدن خاموش ہو گیا۔

میں نے انودانی انداز میں ہاتھ ہلایا اور ساتھ ہی اس کے منہ پر تھوک دیا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کا چہرہ انسان کا نہیں کسی غلیظ حیوان کا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی، بس ساکت بیٹھا ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا۔ میں واپسی کے لیے مڑ

گیا۔

”ایسا اب بھی پانی نہیں پلائے گئے۔۔۔۔۔؟“ اس نے کمزوری آواز میں عقب سے پکارا۔ ”تم نے جو کچھ پوچھا وہ میں نے تمہیں بتا دیا۔“

”پانی خدا کی ایک نعمت ہے۔“ میں نے مڑ کر دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”اور میرے خیال میں اس نعمت پر تم جیسے ظالموں، فرعونوں اور بے رحموں کا اتنا حق نہیں ہونا چاہیے کہ جب چاہو یوں تمہیں مل جائے۔“

اس کی بوڑھاہٹ اس وقت بھی جاری تھی جب میں دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ دروازہ بند کرتے ہی اس کی آواز اور میری سماعت کا ناٹھ ٹوٹ گیا۔

جزیرے سے جب میں واپس پہنچا تو میرے ذہن میں ان گنت خیالات ایک دوسرے میں گنڈھ ہو رہے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دشتو کو تلاش کرنے سے پہلے سینکڑوں سے مل لیا جائے۔

نہایت کم رفتار سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے میں آئندہ فکر پہنچا۔ یہ چھوٹے چھوٹے مکانات اور فلیٹوں پر مشتمل ایک دور افتادہ بستی تھی اور پچھلا متوسط طبقہ یہاں آباد تھا۔ یہاں کئی گلیاں ایسی بھی تھیں جن سے میری رولر رائس گزری تو ٹرکے پالے ہی نہیں، اچھے بھلے سیانے بھی رک کر دیکھتے گئے۔

گلیوں ہی گلیوں میں چند منٹ کی ڈرائیو کے بعد میں قد سے کشادہ سڑک پر پہنچا، پھر ایک جگہ ایک دستوران کے سامنے میں نے گاڑی روک دی۔ اس علاقے کی مناسبت سے یہ ایک خاصا عمدہ قسم کا دستوران تھا۔ اس کا دروازہ پیشے کا تھا، بورڈ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔

فولانہ لائبریری کی ڈیڑھ سو سالہ یادگار ڈیگ سٹر

شکوہ چھانسنے کا سہ ماہیہ میوان

مجھے وہ وقت یاد آئے جب یہ ریسٹوران بہت بری حالت میں تھا۔ یہاں کوئی گاہک نظر نہیں آتا تھا، صرف کھیں بھکتی تھیں۔ اس وقت کا تصور کرتے ہوئے محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ اب تو کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ باہر لوگوں کو سہو کرنے والا ایک ہیرا کچھ دیر تو دور سے میری طرف دیکھتا رہا، شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا میں بھی اس ریسٹوران کا گاہک ہو سکتا ہوں؟ پھر وہ بھٹکتے ہوئے انداز میں سڑک پار کر کے میری طرف بڑھا۔

"کیا کھانا چنا پسند فرمائیں گے سرکار؟" میرے نے قریب آکر کھڑکی پر بھٹکتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "توڑا اپنے صاحب کو بھیج دو۔"

کچھ دیر بعد ریسٹوران سے ایک ادھیر عمر شخص برآمد ہوا۔ اس کے لیے لیے پل بن میں سفیدی غالب تھی، نہایت سلیقے سے سنورے ہوئے تھے۔ اس کا جسم ذوال کی طرف مائل تھا لیکن چوڑا چکا ڈھانچہ خصوصاً کندھوں کی ساخت اور اڈھی تین کی شرت سے جھانکتے ہوئے باندوں کی اٹھکتی ہوئی پھلیاں بتاتی تھیں کہ یہ نہایت کبھی بہت شاندار تھی۔

اس نے سڑک پار کرتے ہی مجھے دیکھ لیا اور مستعدانہ انداز میں لیے لیے ڈاک بھرتا ہوا میری طرف بڑھا۔ گزرے ہوئے برسوں نے اس کی شخصیت پر بریاری کے خواہ کتنے ہی نقص چھوڑ دیئے تھے، پھر بھی اس کی حالت اس وقت سے کہیں بہتر تھی جب میں نے آخری بار اسے دیکھا تھا۔ اور یہ کوئی پرانی بات نہیں تھی۔

وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ حسب معمول رہرسوں کے ہوتے پنے ہوئے تھا مگر فرق یہ تھا کہ اب اس کے جوتے نئے اور چمکیلے تھے۔ میں اس کے استقبال کو گاڑی سے اتر آیا۔ وہ لپکتے ہوئے بولا "آپ بیٹھے رہیے مالک۔۔۔ میں وہیں آپ کے چرن پھولوں گا۔۔۔" وہ میرے چروں کی طرف بھٹکتے لگا۔

"خدا کے لیے۔۔۔" میں نے گھبراتے ہوئے سے انداز میں اسے بازو سے پکڑ کر فوراً سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تنگناں رہتے دو۔ یہ چرن ورن چھوئے والی حرکت میرے

ساتھ مت کیا کرو۔ مجھ سے برابری کی سطح پر آکر ملا کرو۔"

"یہ تنگناں نہیں سرکار!" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "میری آتما کی پکار ہے۔۔۔ اور میں بھنا آپ کے برابر کیسے آسکتا ہوں۔۔۔ میں گندی تالی کا کیرا ہوں اور آپ اوتار ہیں۔۔۔ دوتا ہیں۔۔۔"

"اور دیکھو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھ سے ان ہندی اصطلاحوں کے ساتھ بھی بات مت کیا کرو۔ مجھے یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے کوئی پجاری مندر میں اشلوک پڑھ رہا ہے۔ ویسے بھی تمہیں تو اچھی بھی اردو آتی ہے۔"

"کیوں نہیں سرکار؟" وہ شرمینے سے انداز میں ہنسنا۔ "اردو ہی نہیں آپ کی دعا سے انگریزی، فرانسیسی، پنجابی، 22 من اور ہونجڑی بھی آتی ہے۔"

"بلکہ تمہیں انسانوں کی زبانوں کے علاوہ جنگل کے تمام چرن پرند اور درندوں کی زبانیں بھی آتی ہیں۔" میں نے اس کا کندھا تھپک کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس جی۔۔۔ سب اوپر والے کا کرم ہے۔" وہ اٹھاری سے بولا۔

"آؤ۔۔۔ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اسی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

وہ گویا میرے برابر بیٹھنے کو گستاخی سمجھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن میں نے اسے سیٹ پر دھکیل دیا اور محسوس کر دوسری طرف سے اس کے برابر آ بیٹھا۔

"کچھ کھیں گے نہیں؟" اس نے پوچھا۔ "کھانے کے لیے تو آپ کے شایان شان کوئی چیز نہیں ہے؟ اس لیے میں نے نہیں پوچھ رہا۔"

"ارے نہیں۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔" میں نے اپروانی سے کہا۔ "کھانے کا ویسے بھی وقت نہیں ہے ورنہ جو بھی کالھ کھاؤ تمہارے ہاں میسر ہوتا، کھا بیٹا۔ تم صرف پینے کے لیے دو فریش جوس منگوانو۔ ویسے ریسٹورانٹ کو تم نے بڑا نھاٹ دار بنا لیا۔ میں تو پہچان تھا نہیں پایا تھا۔"

"بس جی۔۔۔ اچھی نیت سے شروع کیا تھا۔ شاید اس لیے اوپر والے نے نفرت کرم کر دی ورنہ لوگوں کا خیال یہی تھا کہ جس طرح پینے والا مالک کھیاں مارتا تھا، اسی طرح میں بھی مار کے رخصت ہو جاؤں گا۔ بس دو جوان بھانجیوں کی شادی کی نیت کی تھی، وہ بھگوان نے پوری کر دی۔ انہیں بیاہ دیا ہے۔ اب اپن کو کوئی فکر نہیں۔ اپنی تو نہ بدی ہے، نہ بھینس۔۔۔ نہ فکر نہ فائدہ۔ اب تو صرف فضل کے طور پر اسے چلا رہا ہوں۔ فضل ہی فضل میں پھینکا جا رہا ہے۔۔۔"

دھلتا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے شرمیلے بچے کی طرح جھنجھکے سے انداز میں مسکرایا اور سر جھکا کر بولا۔ "میں تو یونہی تو اس کیے جا رہا ہوں جیسے مجھ میں کوئی بر خوب

بالکل مشقی انداز میں، میں نے گاڑی ریورس کی اور واپس واپس... آپ نے میرے سر پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو قسمت بھی مجھے میرے پیروں پر کھڑا نہیں کر سکتی تھی۔ میں راکٹ کھائے اسی نالی میں اوندھا پڑا رہتا جہاں سے آپ نے مجھے اٹھایا تھا۔

اس کا لہجہ یوں بدھم ہو گیا جیسے اس کا تصور اسے ناگوار، ماضی کے خارزار میں کھینچ لے گیا ہو۔ میں بھی ان باتوں کو تقریباً بھول ہی گیا تھا مگر اس نے ذکر چھیڑا تو جیسے ایک بھولی بھری سی کھالی ذہن میں ابھر گئی۔

ان دنوں میں نے نیا ہی کاروبار کی دنیا میں قدم رکھا تھا اور میرے پاس وہی جھکونو ہوا کرتی تھی جو میں نے وکرم اور اس کے ساتھیوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد قبضے میں کر لی تھی۔ ایک روز میں شارٹ سٹ سے چھنے کی غرض سے ایک میدان کی طرف نکلا جہاں کچھ عرصے سے کوئی سروپ قسم کا بہت بڑا سرکس لگا ہوا تھا۔ میں میدان سے کترا کر نکلنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ سرکس وہاں سے رخصت ہو چکا تھا اور بے پندہ طویل و عریض میدان میں صرف اس کے پڑاؤ کے آثار باقی رہ گئے تھے۔

میدان کے گرد نیم دائرے میں گھوم کر میں جیسے ہی دائیں طرف مڑا تو پسماندہ سی بستی کی اس ٹکڑی میں دائیں طرف ہی ایک مکان کی دیوار کے قریب کوئی شخص یوں اوندھا پڑا دکھائی دیا کہ اس کا سر اور ایک ہاتھ نالی میں تھا۔ دونوں ٹانگیں بھی ہوئی تھیں جن پر ایک بوسیدہ سی میبل کچلی خاکی پتھوں منڈھی ہوئی تھی۔ پیروں میں در رسول کے شکستہ سے جوتے تھے اور در رسول میں دو سوراخ تھے۔ بادی النظر میں یہ دونوں سوراخ کسی لاوارث لاش کی نگہوں کی طرح رجم طلب انداز میں پھیلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

ٹکڑی سے میں نے در آدمیوں کو گزرتے بھی دیکھا لیکن کسی نے نالی میں اوندھے پڑے ہوئے اس شخص کے قریب رکے بلکہ صحیح طور پر اس کی طرف دیکھنے تک کی زحمت نہیں کی۔ میں بھی گاڑی جیڑی سے آگے نہ گیا لیکن اگلے موڑ پر پہنچنے سے پہلے ہی نہ جانے کیوں میرا پاؤں خود بخود بریک پر چڑھ گیا۔ کوئی چیز جیسے یکدم ہی میرے لاشعور میں ٹھنک کر طرح پیوست ہو کر رہ گئی تھی۔

دراصل مجھے یاد آیا تھا کہ کبھی میں بھی اسی طرح بے ہوش ہو کر بھی کی کسی ٹکڑی میں گر پڑا تھا۔ آٹھ ڈاکو میرے تعاقب میں تھے اور میں بالکل تھا اور بے یار و مددگار تھا۔ میری کھائی بری طرح زخمی تھی۔ تب مجھے بھی کوئی بصد وقت سمیٹ کر اپنے گھر لے گیا تھا اور اپنی آخری پونجی اس نے میری مرہم پٹی کراتے کے لیے ڈاکٹر کی نذر کر دی تھی۔

میں اب سوچ رہا تھا کہ اگر اس رات طلبہ مجھے نہ اٹھاتا اور اپنی کھوپڑی میں نہ لے گیا ہوتا تو آج میں کہاں ہوتا؟ میرا ذہن مجھے اس سوال کا کوئی واضح جواب نہ دے سکا، تاہم مجھے جھرجھری سی ضرور محسوس ہوئی۔ میری جلد کے نیچے جیسے سیسوں منہ لیے سرسرا رہے تھے۔

اس کی باپجوں سے کف بھی بہ رہا تھا جو غلیظ پانی میں مدغم ہو رہا تھا۔

”تم... نے... دریا سے کیوں... نکالا...“ وہ تقریباً ناقابل فہم سی آواز میں منہ بولا۔

”مجھے مر جانے... دیتے... بزدل کہیں کہے... تم کسی کو مرے بھی... نہیں... دیکھ سکتے۔“

اب مجھے معلوم ہوا کہ موصوف کوئی ذرہ بزرگ قسم کا نشہ کیے ہوئے تھے اور نالی کو دریا سمجھ کر ڈوبنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ اسے وہیں چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھوں اور اپنا دست لوں لیکن اس شخص کے خود غل اور چہرے پر جو ہریداری رقم تھی، اس کی تہ میں سے مجھے ایک شاندار انسان اور اس کا روشن ماضی جھلکتا نظر آ رہا تھا۔ دوسرے اس نے اس مدہوشی کے عالم میں بھی جس لمحے میں مرے کی حسرت کا اظہار کیا تھا، اس سے میرے دل میں بھی خرابی سی آگئی تھی۔ میرا اب جو بلاشبہ آتش فشاں تھا مگر جس پر میں نے غیر عذباتیت کی برفانی ٹہیں بھا رکھی تھیں۔

اس شخص کے ہاتھ پیروں پر رعشہ سا طاری تھا اور وقفے وقفے سے اس کے حلق سے ہلکی ہلکی اور بے معنی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکا۔ میں نے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور گھر لے گیا۔

لوکر کو میں نے ہدایت کی کہ جس حد تک ممکن ہو اس شخص کا علیہ درست کر کے میرے کپڑوں میں سے کوئی جوڑا پہنا کر اسے گیسٹ روم میں سٹا دیا جائے اور اگر وہ کچھ کھا سکے تو اسے کھلا بھی دیا جائے کیونکہ اس کا پیٹ مجھے کمر سے لگا ہوا نظر آ رہا تھا۔

دوسری صبح جب میں گیسٹ روم میں اسے دیکھنے گیا تو وہ بالکل ہی چڑا ہوا انسان نظر آیا۔ غالباً آج وہ فرمایا تھا اور اس نے شیو بھی بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے جسم پر میرا ایک پرانا لیکن صاف ستھرا اور بیش قیمت سیدنگ سوٹ تھا۔ اسے درجہ دوم کے میزبے سے تخلیق کیا تھا۔

میں زمین آسمان کا فرق پڑ چکا تھا اور قدرے حیرت کی بنا کا ہاتھ بچاؤ کے نئے مار پر چڑھ گیا ہو۔ پھر ایک کافٹر پر کچھ لکھ رہا تھا۔

مجھے کمرے میں آتے دیکھ کر اس نے کافٹر کی طرف دیکھا جیسے اپنا مطلب مجھے سمجھانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا جیسے رخصت طلب کرنے کے لیے میرا نام۔

”چند سے بعد اس نے ماتمی سے لیے“

کا پر لگا ہوا تھا جو قسم۔ اس نے بیٹھے ہوئے جواب دیا۔ لہجہ ہر نام نہان سے عادی تھا۔ میرے سر پر ہاتھ چھوا یہ تم بھی کانڈ پر کیا لکھ رہے تھے؟ میں نے بھی ایک کرس پر بیٹھے تھی۔

”وہ لوگ جنہیں مرگ کے دورے پڑتے ہیں یا جو اس قسم کے نقشے کرتے ہیں کہ چلے چلے کر پڑتے ہیں، اپنی جیب میں عموماً اس قسم کا رقعہ لکھ کر رکھتے ہیں کہ کوئی صاحب اگر انہیں کہیں پڑا ہوا پائیں تو فلاں ایڈریس پر پہنچا دیں۔۔۔۔۔“ اس نے روانی سے کہا۔

”اچھا۔۔۔ میں نے سربلایا۔“ تو اس قسم کا رقعہ لکھنے کا تمہیں بھی خیال آگیا۔
”نہیں۔“ اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہٹائی۔ ”میں تو یہ لکھ رہا تھا کہ جو شخص مجھے جہاں کہیں بھی پڑا پائے وہیں پڑا رہنے دے، کہیں لے جانے کی زحمت نہ کرے اور اپنے کام سے کام رکھے۔“

”زندگی سے بہت بزار ہو؟“ میں نے اسے گھورا۔

”زندگی۔۔۔۔۔؟“ دفعتاً اس نے عجیب سے انداز میں قسم لگایا جیسے کسی کھنڈر میں کوئی بدروح کھکھلا رہی ہو۔ ساتھ ہی اسے کھانسی آگئی۔ اس کے ہونٹوں پر بہت کمزور معلوم ہوتے تھے یا پھر ان پر کسی بیماری اور حالات کی ناہمواریوں کا اثر تھا۔

”خدا کے لیے اب کوئی فلمی قسم کا گالیلاگ نہ ہوتا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔
”سیدھی طرح بتاؤ تمہیں تکلیف کیا ہے بلکہ مجھے اپنے متعلق سب کچھ ہی بتا دو۔ تمہارے سینے پر بہت بوجھ معلوم ہوتا ہے۔“

پہلی بار اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی۔ ”اس نوجوانی میں ان بڑی مردم شناس نظریوں ہے آپ نے۔“ اس کے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رشتی نمودار ہوئی۔
”لیکن کیا آپ کے پاس اتنا وقت ہے؟ آپ بڑے آدمی معلوم ہوتے ہیں اور بڑے آدمیوں کا وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ چھوٹے آدمیوں کی زندگی سے بھی زیادہ قیمتی۔“

”زیادہ فلسفہ بگھارنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ہاتھ اٹھ کر کہا۔ ”اور میں اس قسم کا بڑا آدمی نہیں ہوں جس قسم کا تم سمجھ رہے ہو۔ تمہید اور ادھر ادھر کی باتوں کو چھوڑو۔ دراصل مجھے یاد آ رہا ہے۔۔۔۔۔ سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم کرتے کیا ہو یا

مگر پڑا تھا۔ آٹھ ڈاکو میرے حاقب تھے۔ میری کھال ہر طرح زخمی تھی۔ تب مجھے آج رہا ہے۔ فرض کیجئے میں کچھ بھی بتانا پسند نہ کروں اور اپنی آخری پونجی اس نے میری مرہم پی۔

میں اب سوچ رہا تھا کہ اگر اس رات طہا۔۔۔ میں نے پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتے ہوئے ہوتا تو آج میں کہاں ہوتا؟ میرا ذہن مجھے اس سرنے کی کوشش کر رہے ہو، لیکن ہے کہ میں مجھے جسر تھری سی ضرورت تھی۔ میری جلد کے بہت ہی زندگی کا قرض تمہارے سر سے اتار دوں۔“

”آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہو۔۔۔ وہ مسکرایا۔ ”میرے ہاتھ میں اگر صرف ایک ہنر دے دیا جائے تو شیر بھی میرے آگے دم ہلانے لگتا ہے۔“
”مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں شیر نہیں ہوں اور اتفاق سے میرے دم بھی نہیں ہے جسے میں تمہاری آگے ہلا سکوں۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اب شروع ہو جاؤ۔“

”اس کے کندھے گویا سکر گئے اور سر جھک گیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں گویا صدیوں کی تھکن تھی۔

”میں ریزہ ہوں۔“ بالآخر اس نے مدھم سے لہجے میں کہا۔ ”ہر طرح کے خطرناک جانوروں کو سدھاتا ہوں یا بقول آپ کے یوں کہنا چاہیے کہ سدھایا کرتا تھا کیا تک اب میرا اس پتے کو جاری رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ جوانی میں بڑی تیار و گروہی کی تقریباً ساری دنیا دیکھی۔ لیکن پچھلے چند سال سے سپر سیون سرکس سے وابستہ ہو گیا تھا اور چند دن پہلے تک اس سے وابستہ تھا۔

”یہ وہی سرکس ہے ناں جو حال ہی میں بمبئی سے رخصت ہوا ہے اور اس کے اشتیارات اخباروں میں آیا کرتے تھے۔“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اور آپ کو شاید اس قسم کی تقریبات سے دلچسپی نہیں ورنہ بمبئی کی تقریباً ساری آبادی ہی یہ سرکس دیکھ چکی ہے۔ بڑی پختہ قسم کی لڑکیاں کام کرتی ہیں اس میں۔ آمارا بھی انہی میں سے ایک تھی۔۔۔“

”اوہ۔۔۔ تو تم اب عشق کی المناک کہانی سناؤ گے؟“ میں نے قدرے ہنسنے سے کہا۔
”آپ نے آمارا کو نہیں دیکھا۔“ اس نے ایک طویل سانس لی۔ ”ورنہ اس کے ذکر پر آپ اتنی تھرت کا اظہار نہ کرتے۔“

”خیر۔۔۔ تم اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنی بات جاری رکھو۔“ میں نے کہا۔
”وہ جتنا تک کے کرب و کھاتی ہے۔“ شکھو نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔

”یوں تو تقریباً ہر جتنا سٹ کا جسم ہی بے حد سڈول ہوتا ہے مگر آمارا کو تو قدرت نے عجیب ہی چیز بنا دیا ہے۔ اسے دیکھ کر اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جاتی ہے وہ لڑکی نہیں صاحب۔۔۔ خوبصورتی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ریز اور مہر کے آمیزے سے تخلیق کیا گیا ایک عجوبہ تھا جس میں رنج کی جگہ آسانی بھی بھری گئی تھی۔“

اس نے یوں جسر تھری سی لہجے سے واقعی اس کا ہاتھ جھلکائے تھے تو رہ پڑ گیا ہو۔ پھر اس نے عجیب رحم طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے اپنا مطلب مجھے سمجھا نہ سکے پر معذرت خواہ ہو۔

”لڑکیاں تو سرکس میں بہت ہوتی ہیں صاحب۔“ چند لمحوں کے بعد اس نے ماتمی سے لہجے

کے شرمیں قوم کی مدت ختم ہو رہی تھی۔

بالآخر چند روز پہلے سارا سامان رزکوں میں لادوا گیا اور سرسرسی کسی اور شرم کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے یہیں چھوڑ کر میں نے بھی ایک ٹرک میں چڑھنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے دھکے دے دے کر مجھے نیچے اتار دیا۔ میں نے اپنی زندگی کے سات طویل برس اس سرسرسی کے ساتھ گزارے تھے جن میں سے تین برس تو بہت ہی قیمتی تھے کہ ان میں مجھے تارا حاصل تھی۔

"اب کئی دن سے یہی معمول تھا کہ میں ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا تھا لیکن ٹھوم پھر کر اسی میدان کی طرف جا لکھا تھا جہاں سرسرسی کے پڑاؤ کے نشانات باقی تھے۔ میں راکٹ کھا کر میدان کے کنارے بیٹھ جاتا، پھر میری آنکھیں مجھے بڑے عجیب عجیب منظر دکھاتیں۔ مجھے سرسرسی جوں کا توں پڑاؤ ڈالے نظر آتا۔ اپنا ٹیمہ بھی دکھائی دیتا اور پہلو میں تارا بھی، پھر دھیرے دھیرے یہ سب کچھ غائب ہو جاتا۔ کوئی ڈراؤنا منظر اس کی جگہ لے لیتا اور میرا پیٹ چاہتے لگتا کہ خود کشی کروں۔ پھر میں مرنے کے لیے کوئی موزوں جگہ ڈھونڈنے لگتا۔ بس یہی اپنا معمول ہے اور یہی زندگی کی کل مثال۔۔۔۔۔" شب بھر خاموش ہو کر میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں سکرایا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب اجازت ہے؟"

"اجازت کے سچے! بیٹھ جاؤ۔" میں نے اپنا پیٹ آئینہ تختی سے کہا۔ "میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" وہ بیٹھ چکا تو میں نے کہا۔ "کبھی تم نے سوچا ہے کہ اپنے ساتھ تم کو کچھ کر رہے ہو؟ اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"فائدے اور نقصان کا وقت تو اب گزر گیا ہے صاحب! وہ حقارت سے ہنس دیا۔ "یہ باتیں تو وہ سوچتے ہیں جنہیں زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ اپنی نے تو گزارنی، جتنی گزارنی تھی۔ اب تو سالوں کا کچھ فاضل سرمایہ بچ گیا ہے جسے بیدردی سے لٹا رہے ہیں۔"

"ہاتیں تو بڑی ٹھنڈی اور مشکروں والی کرتے ہو لیکن حرکتیں احمقوں والی ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے صرف یہ پتاؤ کہ اگر تم اسی طرح ذلت و خواری سے زندگی کے بچے کھجے دن گزارتے رہے، راکٹ کھا کھا کر ٹالیوں میں گرتے رہے تو کیا تمہیں تارا مل جائے گی یا اس کو تمہارے حلال کی خبر ملتی رہے گی اور اس کے دل میں تمہارے لیے ہمدردی پیدا ہو جائے گی؟"

"نہیں۔" اس نے تنہم کیا۔ "لیکن میں اس غرض سے تو یہ سب کچھ نہیں کرتا۔ مجھے تو بس اپنے آپ کو برباد کرنے میں مزا آنے لگا ہے۔"

"تجواں۔" میں نے کہا۔ "اپنے آپ کو برباد کرنے میں کسی کو مزا نہیں آتا۔ یہ فلسفہ صرف اس وقت گھڑا جاتا ہے جب اپنے آپ کو سنوارنے کا کوئی ہتھیار نہ ہو۔ کوئی وسیلہ نہیں رہتا۔ تم ایک ہوش مند انسان ہو اور اس ملک نئے کا عادی ہوئے بھی تمہیں زیادہ عرصہ

"بیرو اور تارا شو پیش کرتے تو میں بھی تماشائیوں میں جا بیٹھتا اور پورے شو کے دوران پک جھپکائے بغیر ان دونوں کو ہی دیکھتا رہتا۔ اس کے علاوہ میں وحشت زدہ ہو کر کبھی کبھی سرسرسی کی حدود سے دور بھی چلا جاتا اور مدہوشی کے عالم میں رات رات بھر کہیں گلی کوچوں میں پڑا رہتا۔"

"ذرا پک سین اس روز ہوا جب میں میں ہوش و حواس کے عالم میں ہنزلے کر بیرو کے خیمے میں گھس گیا۔ بیرو خیمے میں اکیلا ہی تھا۔ میں نے بے دریغ اس پر ہنزلے برسائے شروع کر دیئے۔" وہ ٹوہنوں بھرتا اور مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ چاہتا تو میری ہڈی پل پلٹ کر دیتا مگر خاموشی سے کھڑا ہنر کھاتا رہا۔ وہت "تارا خیمے میں آئی اور اس نے مجھے کہہ سے پکڑ کر سر سے اونچا اٹھا کے زمین پر دے مارا۔ میں بے ہوش ہو گیا۔"

"وہ کسی تکلیف کا احساس تھا جس کی بدولت میں ہوش میں آیا۔ میں نے دیکھا میں خیموں کے درمیان کھلی جگہ پر اونچا پڑا تھا اور تارا مجھ پر ہنزلے برس رہی تھی۔ سرسرسی کے بست سے نکل کر ہمارے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ جیسے روز تماشائیوں کو کھیل کر تباہ دکھاتے دکھاتے خود آج کوئی دلچسپ تماشا دیکھنے لگے ہوں۔"

"مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر تارا نے گریبان سے پکڑ کے مجھے اٹھایا اور میرے منہ پر تھوکتے ہوئے بولی۔ "تین سال میں میں نے ان گنت سہریوں سے تیری جھولی بھر دی۔ تو ان پر اسٹن نہیں کر سکتا بدھ؟ مجھے اپنی زر خرید واپسی سمجھتا ہے؟ زندگی میری ہے۔۔۔۔۔ میں اسے جس طرح چاہوں گی گزاروں گی۔ جس کے ساتھ چاہوں گی گزاروں گی۔ اگر آئندہ تو نے میری زندگی میں مداخلت کی تو آج کر کے میرے ہی سدھائے ہوئے شیروں کے سامنے ڈال دیوں گی۔" پھر اس نے مجھے زمین پر پٹخ دیا اور بیرو کے خیمے کی طرف چل دی۔

"بیرو اس کے پیچھے پیچھے سر جھکائے سعادت مند بچے کی طرح چل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے جیسے اسے اس سارے مسئلے میں سخت تکلیف پہنچی ہو۔ اس نے پکڑ کر مجھے دیکھا۔ "تارا، میں نے کہا کہ تارا کے جسم میں بڑی عجیب تو نویب قوتیں پوشیدہ تھیں لیکن میں چاہتا تو اسے زیر بھی کر سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں ایسا چاہ ہی نہیں سکتا تھا۔"

"مجھے تارا کی طلب نے اندر سے کندھ کر کے رکھ دیا تھا اور راکٹ کے استعمال سے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ ہوش و حواس میں رہتے ہوئے مجھے سخت تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ اب میں اتنی دیر سے محض دس کا بوجھ ہلکا کرنے کے اشتیاق میں آپ سے یہ قاتلی ہوش و حواس باتیں کیے جا رہا ہوں ورنہ اتنی دیر ہوش میں رہنا مجھے کوارا نہیں ہوتا۔"

میرا دل تارا سے یہ میری پہلی اور آخری جھڑپ تھی۔ اس کے بعد سرسرسی والوں نے مجھے فوراً سے نکال دیا۔ تاہم مجھے سرسرسی کی حدود سے نہیں نکالا گیا۔ دیکھتے ہی سرسرسی

"یہ تو بہت عمدہ مقصد حیات ہے۔" میں نے دسپے دیے جوش سے کہا۔ سرگرمی سے صرف اتنا ہی تہیہ کر لو کہ میں اتنا بچیوں کی شادی کا بندہ دست کرنے تک سرگرم عمل رہوں گا۔ اس کے بعد جو بچی میں آئے گا، کروں گا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے تم کسی چیز کو ناکارہ سمجھ کر پھینکنے کا تہیہ کر چکے ہو لیکن پھر سوچتے ہو کہ اس سے ایک اچھا کام لے لوں، پھر پھینک دوں گا۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ایک ہی چیز اوری سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں صاحب! میں اب زندگی کے کھیلوں میں الجھنا نہیں چاہتا۔" اس نے ایک طویل جمانی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میرا نقشہ ٹوٹ رہا ہے، مجھے پندرہ روپے عنایت دیجئے اور جسے کی اجازت دیجئے۔ آپ کی ممانداری اور ہمدردی کا بہت بہت شکریہ۔"

میرے اٹھا سمجھانے کے باوجود کتے کی دم ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ واقعی اس کی گردن پر ہاتھ دسیہ کر کے ایسے ہٹ دھرم اور انتہاء سے زیادہ مایوسی پرست انسان کا قصہ پاک کر دوں لیکن پھر مجھے ترس آگیا۔ بد بخت کو اپنی زندگی کی اہیت کا اندازہ نہیں تھا۔ ایک متاع گراں مایہ کو لوگوں کے قدموں میں تھیر کر خالص کر رہا تھا۔

"تمہارا تو باپ بھی سید عا ہو جائے گا میری جان!" میں نے یلخت ہلے ہوئے لیے میں کہا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں خوف جھک آیا۔ میں نے اپنے ملازم کرمو کو آواز دی اور جب وہ آیا تو اسے حکم دیا۔ "موصوف کو لے جا کر تہ خانے میں بند کر دو۔" میں نے شکوہ کی طرف اشارہ کیا۔ "ان کو آٹھ گھنٹے سے اچھا کھانا کھانا پلانا اور ہر طرح سے ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا اور کوئی ذرا سی بھی خطرناک چیز ان صاحب کے پاس موجود نہ رہنے دینا جس سے یہ خود کشی کی کوشش فرما سکیں۔ دوسرے انہیں نشے کی کوئی چیز نہ پہنچنے پائے، نیند کی گولی تک نہیں، خواہ یہ کتنا ہی اچھلیں، کودیں، شور مچائیں۔ آواز تو تہ خانے سے باہر جائے گی ہی نہیں۔ ایک ماہ بعد مجھے یاد دلانا کہ میں نے انہیں تہ خانے میں بند کروایا تھا، پھر میں اتنا کا معاوضہ کروں گا اور دیکھوں گا کہ کیا حال ہے۔"

"نہیں..... نہیں....." شکوہ دیوانہ وار چلنے لگا۔ "رہنمائی کے بغیر میں مر جاؤں گا۔"

"نشانہ نہ ملنے سے شاید نادری کوئی مرتا ہے۔" میں نے لاپرواہی سے کہہ۔ "اور تمہیں تو نشانہ شروع کیے چھ ماہ بھی نہیں گزرے۔"

کرمو نے شکوہ کو بھول اور معمر روی سمجھ کر لاپرواہی سے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن شکوہ اس دیوانی کتے کی طرح مستعد ہو چکا تھا جو شہری کتوں کے زنگے میں تن پھنسا ہو، اس کی خفیہ صلاحیتیں بھی شاید بیدار ہو گئی تھیں۔ وہ پھلی کی طرح تڑپ کر کرمو

تھیں گزرا۔ تم نے اپنے آپ کو صرف اس لیے اس راہ پر ڈال لیا ہے کہ تمہارے سامنے کوئی اور راہ نہیں رہی یا یوں کہو کہ تمہیں بھلائی نہیں دے رہی۔"

وہ بغور میری بات سن رہا تھا۔ یہ ایک اچھی علامت تھی۔

"تمہارا کو بھول جاؤ۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ تمہیں بھول گئی۔ اسے اپنے ذہن سے اسی طرح نکال پھینکو جس طرح اس نے تمہیں اپنی زندگی سے نکال پھینکا ہے۔"

"یہ اب اپنے بس کی بات نہیں رہی صاحب!" اس نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔

"کیوں نہیں رہی؟" میں نے مدامت سے کہا۔ "ہو سکتا ہے تمہیں صرف کسی کی تھوڑی بہت مدد کی ضرورت ہو۔ وہ تمہیں میں فراہم کروں گا، تم نے سرے سے زندگی شروع کرو۔"

"اس عالم میں کہ جیب میں پھٹی کوڑی نہیں ہے اور تن پر کپڑے بھی پرانے ہیں۔" وہ اپنے سرپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے توجہ انداز میں ہنسا۔

"میں نے تمہاری مدد کا ارادہ ظاہر کیا ہے، اس سے میری مراد مالی مدد بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہاری اس حد تک مدد کر سکتا ہوں جس حد تک تم سوچ بھی نہیں سکتے لیکن شرط یہی ہے کہ تم چار دن افسانوں کی طرح گزار کر دوبارہ اس راہ پر نہیں پڑ جاؤ گے۔ نئے سرے سے پر عزم انسانوں کی طرح زندگی شروع کرو گے۔"

"آخر آپ میری مدد کرنے پر کیوں کمر بستہ ہو گئے؟" اس نے شکلی سے لہجے میں کہا۔

"صرف اس لیے کہ تم جیتے آدمیوں کو میں کام کے آدمیوں میں شمار کرتا ہوں اور انہیں یوں براہو ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے جواب دیا۔ "دوسرے عین ممکن ہے کہ کبھی مجھے بھی تمہاری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔ تمہارے لیے موجود روش کو ترک کرنا کچھ اتنے زیادہ مشکل نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو، صرف کسی تعمیری کام کو اپنا مقصد حیات اور اپنی منزل قرار دے لو۔ کیا تمہیں ایسا کوئی کام یاد نہیں جس کے بارے میں تم نے کبھی حسرت محسوس کی ہو کہ کاش میں ایسا کر سکتا؟"

اس کی پیشانی پر غلیں ابھر آئیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بولا۔ "میری ایک بہن ہے، مدراس میں رہتی ہے، جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی تب سے محنت مزدوری کر کے گزارا اوقات کرتی ہے۔ اس کی دو بیٹیاں سیانی ہو چکی ہیں اور ان کی شادی بیاہ کا کوئی وسیلہ نظر نہیں آتا۔ کبھی کبھی میں سوچا کرتا تھا کہ کاش میں ان بچیوں کی شادی کا بندوبست کر سکتا لیکن سرکس میں چوتھ مجھے تنخواہ صرف اتنی ہی ملتی تھی کہ تنہا اپنا ہی گزارہ سمجھتا ہوں کر ہوتا تھا، اس لیے میں اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر اپنے معمولات میں الجھ جاتا تھا، اب میں نے بہن کو خط لکھا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

کوئی غریبانہ سارستوران کھنڈا دیتے۔ مجھے امید ہے کہ اسے میں چلا لوں گا۔
میں نے کوئی نئی جگہ لینے اور نئے سرے سے کام شروع کروانے کے بجائے شیکھر کو
کاڑی میں ساتھ بٹھا کر دو نئیں بستیوں کا چکر لگایا۔ ایک دو جگہ بات کی اور بالآخر دس ہزار
پگڑی پر ایک رستوران من گیا۔ اس کی حالت بہتر بنانے کے لیے میں نے شیکھر کو دس
ہزار مزید دیے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد اس سے میری دو مزید طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ میں اس کی
طرف جا نکلا تھا جہاں وہ رہتا تھا اور ایک بار وہ میرے دفتر آیا تھا۔ فون وہ مجھے اکثر کرتے رہتا
تھا۔ حالات بتاتے تھے کہ وہ بالکل صحیح ڈگر پر جا رہا تھا۔ میرے تجویز کردہ راستے پر چل رہا
تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں نے نہ صرف ایک کارآمد زندگی ضائع ہونے سے بچا لی تھی بلکہ
ایک ایک کر کے نہایت منتخب قسم کے جو پودے میں لگا رہا تھا ان میں ایک کا اضافہ ہو گیا
تھا۔ ایک قیمتی جیج لوگوں کے پیروں سے کچلے جانے اور ضائع ہونے سے بچ گیا تھا۔

”آپ کتنے خیالوں میں کھو گئے؟“ شیکھر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ہوا بڑے ملتے
سے رُے میں اور جیج جوس کے دو گلاس اٹھائے لے آیا تھا اور کار کی کھڑکی کے قریب کھڑا
تھا۔ شیکھر نے انتہائی احترام سے ایک گلاس مجھے پیش کیا اور دوسرا خود تھام لیا۔

”شیکھر!“ میں نے چند لمحوں میں بھرنے کے بعد کہا۔ ”تمہیں یاد ہو گا کبھی ملاقات پر
ہم نے ایک موضوع پر بڑی دلچسپی اور تفصیلی گفتگو کی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ فطرت کے
اعتماد سے کچھ لوگ درحقیقت حیوان کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں لیکن قدرت نے لیاضی
سے کام لیتے ہوئے انہیں انسان بنا دیا ہے۔ تم نے حیوانوں کو سدھارنے میں زندگی
مزار دی ہے انہیں انسانوں کی سی حرکتیں کرنے کی تربیت دیتے رہتے ہو۔ مجھے یقین ہے
کہ تمہارے لیے اس تجربے کو اسے طریقے سے کام میں لانا زیادہ آسان ہو گا یعنی تم
انسانوں کو حیوان بننے کی تربیت دو گے۔ بنیادی طور پر تو انسان بھی حیوان ہے اور جن
انسانوں کا میں ذکر کر رہا ہوں ان میں چونکہ حیوانیت کا عنصر غالب ہے اس لیے تمہیں
کوئی زیادہ وقت پیش نہیں آئے گی۔ آزمائشی طور پر میں نے پہلا شکار ایک جزیرے پر پہنچا
دیا ہے۔“

پھر میں نے اسے ملحق مندر اور اپنے بلیس کے متعلق تفصیل سے بتایا اور کہا۔ ”وہ
جگہ تمہارے کام کے لیے موزوں ترین ہے۔ تمہارے جانے میں ابتدائی مراحل مکمل کرنے کے
بعد تمہیں بعد کے تجربات وغیرہ کے لیے وسیع و عریض جنگل بھی میسر ہو گا جہاں کوئی تمہیں
دیکھنے والا نہ ہو تمہارے کام میں مداخلت کرنے والا نہیں ہو گا۔ میرا پسنا شکار جو تمہارے جانے میں
ایک پیچھے میں بند ہے اس کے مظاہر کا میں تمہیں کچھ پس منظر بتا دوں تاکہ تمہارے دل
میں اس کے لیے کبھی رحم کی رشت نہ ابھرے۔“

کی گرفت سے نکلا اور دروازے کی طرف پڑا۔ کرمو نے اس کا بازو پکڑنے کی کوشش کی
لیکن اس نے بازو کو کچھ اس انداز سے جھٹکا دیا جیسے سانپ نے لہرا کھایا ہو اور کرمو
اوندھے منہ گر پڑا۔ اب یقیناً اسے غصہ آگیا تھا اور اس کی بھی معرکہ آرائی کی وہ صلاحیتیں
ابھر آئی تھیں جن سے میں بخوبی واقف تھا۔

اس نے فرش سے اٹھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ شیکھر اس وقت دروازہ پار کر
چکا تھا کرمو نے یوں اس پر چلائب لگائی جیسے کوئی عقاب فائنٹ پر جھپٹا ہو پھر اسی انداز میں
وہ چاروں ہاتھوں کی پیروں کی مدد سے شیکھر کو دیوچ کر فرش پر اوندھا کر گیا۔ شیکھر کے
سے اب چلنا تو درکنار جنبش کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

”صاحب جی! اس کی کوئی بڑی دھیر تو نہیں ڈرتی؟“ کرمو نے مڑون گھا کر بڑی
سنجیدگی سے پوچھا ”انداز ایسا ہی تھا جیسے پوچھ رہا ہو۔“ صاحب جی! آپ کی چائے میں چینی
زیادہ تو نہیں ڈالتی؟“

”نہیں... تعلق نہیں۔“ میں نے اپنی جگہ بیٹھ بیٹھ جواب دیا۔ ”اس جو کچھ میں نے
بتایا ہے وہی کرو۔“

کرمو نے شیکھر کو اس طرح اٹھایا کہ اس کے دونوں بازو پیچھے کو مڑے ہوئے تھے اور
کرمو کی اپنی گرفت میں تھے۔ وہ اسے دھکیلتے ہوا ڈرائنگ روم کی طرف لے گیا جہاں سے
تمہ خانے کو راستہ جاتا تھا۔ اس کے بعد میں نے واقعی شیکھر کا تصور بھی ذہن سے جھٹک
دیا۔

پورے ایک ماہ بعد کرمو نے حسب ہدایت مجھے شیکھر کی یاد دلائی۔ میں نے تمہ
خانے میں جا کر اسے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ قلعی طور پر بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا۔ صحت
مند اور چست و چالاک سالک ستھرے کپڑوں میں خوب کھرا کھرا دھنکی دے رہا تھا۔

”اب کیا حال ہے؟“ مبالغہ ٹھکانے پر آیا؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل آگیا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نشہ چھوڑنے اور تارا کے
سحر سے آزاد ہونے کو ناممکن سمجھتا تھا مگر یہ تو محض چند دن کی تکلیف ثابت ہوئی۔ مجھے
دوبارہ زندگی سے محبت ہو گئی ہے۔“

”اب کیا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں آپ کو زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا جتنا کچھ آپ نے کیا یہی مجھ پر اتنا بڑا احسان
ہے کہ میں اس کا صدمہ نہیں دے سکے۔“ اس نے شائستگی اور منہ پریت سے کہا۔

”تکلیف پہنچو تو... میں ابھی تم سے صلہ مانگ بھی نہیں رہا“ میں تمہیں کوئی چھوٹا
سونا کاروبار کرا کے دے سکتا ہوں اسے پھیلنے کی کوشش کرنا۔“ میں نے کہا۔

”اور تو مجھے کسی کام کا کوئی خاص تجربہ نہیں۔“ بالآخر اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”مجھے

میں دل ہی دل میں اس کی معلومات کی داو دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے بالکل موزوں آدمی کا انتخاب کیا تھا۔

"بالکل درست۔" میں نے سناٹائی لمحے میں کہا۔ "میں مانس کی کھال تمہیں جب ضرورت ہو ایک ہفتے پہلے مجھے مطلع کر دیتا۔ وہ تمہیں ایک خاص قسم کے بکس میں محفوظ کی ہوئی بالکل تازہ حالت میں مل جائے گی۔ اس سلسلے میں میرا وہ شکاریوں سے معاہدہ ہو چکا ہے جو زیادہ تر سندھ میں پڑاؤ ڈالے رہتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" شیکھر نے دلچسپی آمیز لہجے میں کہا۔ "تو پھر میں کب سے اپنا کام شروع کروں؟"

"پرسوں تک تم اپنے یہاں کے معاملات ٹھنڈا کر میرے آفس آجاؤ۔" میں نے کہا۔ "میرا ایک آدمی تمہیں بکس میں پھونک آئے گا۔ تمہاری ضرورت کی بیشتر چیزیں تو بکس میں موجود ہوں گی، پھر بھی اگر تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس ہو تو اسی کو بتا دیتا، وہ تمہیں پہنچا دے گا۔ اس کا نام چھتا ہے۔ میرے اس پہلے شکار کو بن مانس بنانے کا عمل جاری رکھنے کے دوران تم اس کے چہرے کی ساخت تبدیل کرنے کے لیے آلات جراثیمی تو استعمال کرو گے ہی لیکن ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر روزانہ ایک یا دو قطرے تیزاب ضرور ڈالتے رہنا۔ یہ ایک اضافی سزا ہے جو میں اسے دینا چاہتا ہوں۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" شیکھر نے معذرت مندی سے کہا۔ پھر وہ گاڑی سے اتر گیا۔ وہاں سے میں سیدھا گھر آیا اور چھتا کو فون کیا۔ اس سے میری گفتگو آدھے گھنٹے جاری رہی۔ اسے تمام ضروری ہدایات دینے اور بعض معلومات پر تاؤ ڈالنے کے بعد مطمئن ہو کر فون بند کر دیا۔

چھتا سے گفتگو سے فارغ ہو کر میں نے کھانا کھایا۔ کچھ دیر آرام کیا، پھر اٹھ کر اپنے محلے میں معمولی سی تبدیلیاں کیں۔ یہ معمولی سی تبدیلیاں بھی مجھے ناقابلِ شناخت بنا دیتی تھیں۔ آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کر میں نے اپنا خصوصی سفر میں استعمال ہونے والا بریف کیس اٹھایا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

کچھ دیر بعد میری کار پونا جانے والی سڑک پر رات کی تاریکی میں فراموشی سے پھری تھی۔

میں نے اسے مدن موہن اور اس کے کربوت کے بارے میں بتایا۔ ماہتاب کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا تھا وہ بھی بتا دیا لیکن یہ واضح نہیں کیا کہ ماہتاب سے میرا کیا تعلق تھا، پھر میں نے کہا۔ "اس شخص کو انسان سے بن مانس بنانا ہے۔ تمہیں افریقہ کے شیطانی جراحوں کے طریق کار کے متعلق تو مکمل معلومات حاصل ہیں ناں؟"

"جی ہاں۔" شیکھر نے جواب دیا۔ "بلکہ مجھے ان کے بیشتر فارمولوں کا بھی علم ہے۔ انسان کو بن مانس کے قالب میں ڈھالنے کے لیے وہ اس کی جلد پر تھوکے لگا کر ایک مخلوق بناتے ہیں جس سے کھال کچی پڑ جاتی ہے اور ایک خاص قسم کا لیس پھوڑنے لگتی ہے۔ اس کیفیت کے دوران اس کے جسم پر بن مانس کی کھال منڈھ کر جگہ جگہ سے ایک خاص قسم کے دھاگے سے سی دی جاتی ہے۔ یہ دھاگہ بھی رفتہ رفتہ بڑو بدن بن جاتا ہے اور کھال بھی اصل انسانی کھال ہی سے یک جان ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس دوران مختلف مرحلوں میں اس انسان کو ڈھاک کے اعتبار سے بھی بن مانس بنانے کا عمل جاری رہتا ہے۔ بالآخر رفتہ رفتہ وہ انسانوں کی طرح چلنا، کھانا، پینا حتیٰ کہ بوسا تک سمجھ جاتا ہے اور مکمل بن مانس بن جاتا ہے۔ بعض افریقی قبائل میں جس شخص کو سزا دینا مقصود ہوتا ہے اسے اس طرح بن مانس بنانے کے لیے شیطانی جراحوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔"



ہوتا کے راستے میں ہم گھر سے کچھ آگے ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔

میں نے اپنا اسی قبرستان کے قریب سے گزر رہا تھا جب ایک نہایت خوبصورت سریلا میری نگاہ کی بیڈلائٹس کی زد میں آیا۔ لمحہ بھر میں میں نے اس کا سر تپا جائزہ لے لیا۔

وہ تھی وہ لڑکی تھی مگر اس دس بھرے پھل سے مشابہ جو پک کر شاخ سے ٹپک چکا ہو۔ خاصی پختہ کار سی لگتی تھی۔ اگر پختہ کار نہ ہوتی تو راستے سے اس پہرہائی دے پر قبرستان کے نزدیک تنہا کیوں پائی جاتی؟ اس کا چہرہ بیضوی اور بال تراشیدہ تھے جو اس کے کندھوں کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ سر پر وہ ایک پھوٹی سی پی کیپ رکھے ہوئے تھی۔

وہ تنگ چٹلون اور جری میں ملبوس تھی۔ پیٹوں میں ہونے بھی مردانہ تھے اور اپنے لیے قد اور کسی یونانی دیوی کے مجسمے کی طرح ترسے ہوئے جسم کے ساتھ وہ خاصی پروکار نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا سفری بیگ تھا جس کا نہایت اس نے مٹھی کے گرد لپیٹ کر اسے اپنی ہانپ سے انداز میں شکایا ہوا تھا۔

اس نے بڑی ادا سے لفت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن میں گزرتے چلا گیا، تاہم غیر ارادی طور پر ایک سیلینر پر میرے پاؤں کا وہ ضرور کم ہو گیا تھا اور وہ اس لیے کہ اس لڑکی کی صورت مجھے کچھ شاسا محسوس ہوئی تھی۔ ذہن کے کسی گوشے میں کوئی گھنٹی سی بجی تھی۔

میں زیادہ دور نہیں جا سکا۔ رکتے رکتے بالآخر رُک ہی گیا، پھر میں نے گاڑی ریورس کی۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے بریک لگایا اور وہ دروازہ کھول کر بغیر کچھ کے بغیر کچھ پوچھے میرے قریب آئی تھی۔ دور سے وہ جتنی صاف ستھری اور تروتازہ نظر آ رہی تھی اتنی شاید تھی نہیں۔ مجھے اس کے جسم سے سینے کی ہلکی سی بو پھوٹی محسوس ہوئی۔ کار میں دروازہ بند کرتے وقت وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس کا چہرہ کچھ سستا ہوا سا تھا۔ آنکھوں کے گوشوں کے قریب ہلکی ہلکی شکنیں تھیں۔ ہونٹ بھی خشک تھے، تاہم مجموعی طور پر اس کی ذات زہد، شگن اور اس کی قربت راحت جہاں تھی۔

”شکر ہے میں نے پہلی کار کو ہاتھ دیا اور اس میں لفٹ مل گئی۔“ چند لمحے بعد وہ بولی۔ کچھ دیر پہلے دوڑنے کی وجہ سے ابھی تک اس کی سانسوں میں ارتعاش تھا۔ ”ورنہ مجھے تو یہی اندیشہ تھا کہ اس وقت دیرانے میں تنہا لڑکی کو دیکھ کر کوئی شریف آدمی گاڑی نہیں روکے گا۔“

”گویا بالواسطہ طور پر تم نے یہ فیصلہ دے دیا کہ میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں۔“ میں نے مدح آمیز انداز میں کہا۔

”ہو سکتے ہو لیکن کچھ زیادہ نہیں۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی شوخی تھی۔

”اور اگر شمسارے اندیشے کے مطابق کوئی شریف آدمی گاڑی نہ روکتا تب تم کیا

کر تیں؟“ میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”کسی ترک میں تو لفٹ مل ہی جاتی۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”ترک والوں سے تمہیں خوف نہ آتا؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔

”خوف؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا، پھر دھیرے سے ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں خمار کا بو جھل پنا تھا اور اس کی وجہ نمندگی کی نہیں تھی۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی نرہ بھی کیے ہوئے تھی۔

”مذاق مت کرو۔“ وہ تھک دار لہجے میں بولی۔ ”مجھے یہ تاثر دینے کی کوشش مت کرو کہ تم مجھے کوئی مصیبت ماری شریف زادی سمجھ رہے ہو۔ تمہیں بھی معلوم ہے کہ میں کوئی پاکیزہ بی بی نہیں اور مجھے بھی خاص حد تک اندازہ ہے کہ تم کتنے پانی میں ہو۔“

”میں دراصل پانی کا نہیں، خشکی کا جانور ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ میں ذہن پر مسلسل زور دے رہا تھا اور یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا میں نے زندگی میں کبھی اسے کہیں دیکھا ہے؟

چند لمحے خاموش رہی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر میں نے محسوس کیا کہ وہ تبھی سامنے اور کبھی عقب نما آئینے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دور دور تک کسی گاڑی کی بیڈلائٹس نظر نہیں آ رہی تھیں۔ تب لڑکی نے وہی زخمت کی جس کی مجھے کسی حد تک توقع تھی۔

اس نے نہایت غیر محسوس طور پر غالباً اپنے بیگ سے منجھڑ نکالا اور میری پٹیلیوں پر پھینکا دیا کہ اس کی ٹوک میرے کپڑوں سے گزر کر کھل میں پھینے لگی۔

”کوئی احتیاط حرکت نہ کرنا۔ منجھڑ میرے ہاتھ میں آکر بہت حساس ہو جاتا ہے۔ کسی کی ذرا سی بے احتیاطی برداشت نہیں کرتا۔“ اس نے میرے قریب یوں سرگوشی کی گویا کوئی غصی ہیروئن محبت اور جذبات سے جو جھل کوئی مکالمہ بول رہی ہو۔

میں اسی لمحے میرے ذہن میں جیسے چھٹکا سا ہوا اور اچانک ہی مجھے یاد آیا کہ وہ کون تھی۔

کئی برس پہلے میں نے نوعمری میں ہی ایک خونخوار مقابلے کے بعد اپنے استاد شمالی تن سے بخود اور کرائے میں بلیک بیلٹ حاصل کی تھی اور تقریب ختم ہونے پر اپنے گھر جا رہا تھا تو احسان مرزا کے جن تین گرتوں نے مجھے اس کے سامنے پیش کرنے کے لیے انخوا کرنے کی کوشش کی تھی، ان میں سے ایک یہی لڑکی تھی۔ اس کے بارے میں اس کے ساتھیوں نے کہا تھا کہ منجھڑ استعمال کرنے میں اس کا بیانی ملنا مشکل ہے۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ انہوں نے اس کا نام شکستہ بتایا تھا۔

”ہات دراصل یہ ہے کہ مجھے اس وقت ایک کار کی سخت ضرورت ہے کیونکہ آوارہ گردی میری زندگی کی واحد مصروفیت ہے۔“ اس نے بدستور سرگوشی کرنا لہجے میں کہا۔ ”اور

ظاہر ہے روٹر رائس میں بیچ کر انسان ہوٹلوں سے مفت کھانا وغیرہ کھانا نہیں پھر سکتا اس لیے مجھے پیسوں کی بھی ضرورت ہوگی۔ تم ایسا کرو کہ گاڑی ایک طرف روک کر بریف کیس اندر ہی چھوڑ کر اتر جاؤ۔

”جان من! ادا سوچو تو اس دیرانے میں خالی ہاتھ گاڑی سے اتر کر میرا کیا بنے گا؟“ میں نے ممتنعی لجاجت سے کہا..... ”تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ گاڑی بھی لے دے یہی بھی لے دے لیکن مجھے پوتا تک چھوڑ دو۔“

”یہ تو اسی صورت میں ممکن تھا جب میں پرلے درجے کی احمق ہوتی اور فرض کر لیتی کہ میں پوتا تک گاڑی ڈرائیو کروں گی اور اس دوران تم نہایت سعادت مندی سے گردن جھکائے میرے پاس بیٹھے رہو گے۔ پوتا بیچ کر میرا شکریہ ادا کر کے اتر کے اور اپنا راستہ لو گے۔“ اس نے مخمخ پر دباؤ بڑھا دیا۔ ”بس اب روک و اور شکاری مزدوں کی طرح مزید تنگنہ کرنا۔ مجھے شکاری قسم کے مزدوں سے سخت نفرت ہے۔ سیدھے سادھے اور معصوم مرد مجھے بہت اچھے لگتے ہیں شہر بد قسمتی سے ایسا کوئی مجھے مشکل ہی سے نظر آتا ہے اور نظر آتا ہے تو میرے قریب پھٹتے ہوئے بھی ڈرتا ہے۔“

”تم اپنی نظر خاص سے نہیں دیکھ رہیں ورنہ آدمی تو میں بھی خانہ سیدھا سادہ اور معصوم ہوں شکستہ لاوی! میں نے قدرے شوخی سے کہا۔

وہ بڑی محنت تھی۔ حیرت سے اچھی نہیں تاہم اس کے ہاتھ میں دیا ہوا منجر کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ چند لمحوں تک وہ خانہ پوش رہی۔ گویا فیصلہ نہ کر پڑی ہو کہ کیا کہے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور موٹر دبا کر بہت سی جی جلا دی۔ کار میں دو دھپا سی روشنی پھیل گئی۔ میں نے گردن جھک کر دیکھا وہ لمبنا ہوٹل وائنٹن میں دبائے مجھے گھور رہی تھی۔

”تم کوئی پرانے شناسا معلوم ہوتے ہو۔“ بالآخر وہ بیزاری..... ”شکستہ لاوی میرا اس دور کا نام ہے جب میں احسان مرزا کے پاس ہوا کرتی تھی۔ اب تو میرا نام کافی عرصے سے کیٹی چلا آ رہا ہے۔“

”گویا اب تم احسان مرزا کے پاس نہیں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے اختصار سے جواب دیا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ میری شناخت کے موضوع پر آتے ہوئے بولی۔ ”مجھے زندگی میں اتنے مردوں سے واسطہ پڑا ہے کہ میں ان سب کے نام اور صورتیں یادداشت کے خانے میں محفوظ نہیں رکھ سکتی اس لیے تم خود ہی بتا دو کہ تم کون ہو!“

میں نے اسے بتایا تو یکدم وہ اچھل پڑی..... ”..... ہاں..... ہاں..... مجھے یاد آیا۔“ وہ پر جوش لہجے میں بولی۔ ”اس وقت تم بہت پیارے لوجیز سے کیوٹ سے لڑتے تھے۔ عمر کے ساتھ پختگی تو تم میں آتی تھی لیکن تم کچھ زیادہ ہی برسے بد سے لگ رہے ہو ورنہ

میں مردوں کے بارے میں یادداشت بے حد کمزور ہونے کے باوجود شاید تمہیں پہچن لیتی کیونکہ پہلی بار جب میں نے تمہیں اسٹیج پر شائی تن سے مقابلہ کرتے دیکھا تھا تو میرے دل میں کب کر وہ گئے تھے۔ تمہارے بارے میں میں نے جانے کیا کیا خواب دیکھے تھے۔ ایک لمحے کے اندر اندر تصور ہی تصور میں تمہیں اپنی ذات میں مدغم کر کے جانے کن فضاؤں کی طرف پرواز کر گئی تھی۔“

”ان خوابوں میں سے کوئی ایک آدھ ٹوٹا پھوٹا خواب بھی اب اسٹاک میں باقی نہیں رہا کیا؟“ میں نے کن آنکھیں سے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھ کر شریر لہجے میں پوچھا۔

اس نے اب اپنی طرف کے دروازے سے ٹیک لگا کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور منجر ڈش بورڈ پر رکھ دیا۔ پھر اس نے اپنی ہاکیپ اتار کر تدریسے میلے مینے لیکن ملائم بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں کہا..... ”نہیں..... اب کوئی خواب باقی نہیں۔“ میرے لہجے کی شرارت کے برعکس اس کے لہجے میں خمار میں لپٹی ہوئی ایک عجیب سی یاسیت شامل تھی۔ ”وقت نے سارے خواب چھین لیے۔ ویسے بھی ہم جیسے لوگوں کو خوابوں کی نہیں، کمزور خالق کی دنیا میں رہنا ہوتا ہے۔ وہ تو میں ویسے ہی ذرا دل ہلانے کو خواب دیکھ لیا کرتی تھی۔ اب ان کی بھی عادت نہیں رہی۔“

گرد و پیش پر نہایت بوجھل سا سناٹا پھایا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ رات کے ستائے میں صرف روٹر رائس کے انجن کی آواز سوتی ہوئی بی کی خرخرابت کی طرح ابھر رہی تھی یا پھر کبھی کبھار گونجنے والی کسی جیگر یا گیدڑ کی آواز اس سکوت کو بھروسہ کر رہی تھی۔

”ویسے تم اتنے زیادہ کیوں بدل گئے ہو؟“ اس نے کھڑکی کے شیشے پر سرکا پھیلا حصہ دکھا کر نیم والے آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا..... ”مجھے کچھ زیادہ ہی اجنبی اجنبی لگ رہے ہو۔ نہ جانے میری کوئی حس کہہ رہی ہے کہ تمہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا؟“

”بس..... تعذرات ہیں زمانے کے..... میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں نے اسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ میں نے اپنے حلقے میں معمولی سی تہذیبیاں بھی کر رکھی ہیں۔“

میں نے ایک لمحے توقف کے بعد پوچھا..... ”احسان مرزا کا ساتھ چھوڑنے کے بعد کیا کرتی رہی ہو؟“

”بس میں عجیب و غریب زندگی گزارتی رہی۔ نئی پینگ کی طرح ادھر سے ادھر دوڑتی رہی۔ آوارہ گردی کرتی رہی۔“ اس نے ٹھکی ٹھکی سی طویل سلسلی۔ ”کبھی میں کہیں ملازمت حاصل کر لیتی اور شریفانہ انداز میں شب و روز گزارنے لگتی۔ اس سے دل بھر جاتا تو پیسوں کے کسی گروہ میں شامل ہو جاتی۔ اس سے بھی دل آرتا جاتا تو کسی سیٹھ کی دہ

ہن جاتی لیکن سینہ لوگوں سے میری زیادہ نہیں بنتی تھی کیونکہ وہ جلد ہی محسوس کر لیتے تھے کہ میں کوئی خطرناک چیز ہوں اور شرفاء قسم کے سینٹھ پڑی ہے ضرر قسم کی لڑکیوں کو دوست بناتے ہیں۔

”بھئی میں غامضی کسی آسودہ حال قسم کے بابوں سے دوستی پیدا لیتی اور اس سے اپنا خرچہ بندھا لیتی۔ اگر یہ سلسلہ بھی ٹوٹ جاتا اور روپے پیسے کی طرف سے میرا ہاتھ بہت ہی تنگ ہو جاتا تو میں ظلم کا آخری شوقیہ کر آنے والوں میں سے کسی کو کسی تاریک گلی میں روک کر اس کی گردن پر خنجر رکھ کر اس کی جیب میں جو کچھ ہوتا نکھول لیتی۔ کبھی میں لے لے سفر پر ہوتی اور مجھے کار وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی میں اسی طرح لٹ لے کر کسی سے چھین لیتی اور جب میری ضرورت پوری ہو جاتی تو کہیں چھوڑ دیتی۔“

دلہنا وہ عجیب سے انداز میں ہنسی اور خاموش ہو گئی۔ ”خاموش کیوں ہو گئی؟“ میں نے ایک لمحے کے انتظار کے بعد کہا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میرے لیے سے خاص تفتیش کا اظہار نہ ہو۔

”پھر یہ کہ مجھے عشق ہو گیا اور وہ بھی ایک شکاری ہے۔“ اس نے پہلو ہل کر ایک بار پھر بالوں میں انگلیاں بھیرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو آدمی تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر مجھے زندگی کا آمد محسوس ہونے لگی۔ ہم اکٹھے شکار پر جاتے۔ کھینک کرتے۔ میں گویا بغیر شادی کے اس کی بیوی، بغیر کسی غرض کے اس کی دوست اور بغیر کسی معاوضے کے اس کی اسٹنٹ بن گئی تھی۔ ایک مدت بعد مجھے کوئی شخص اچھا لگا تھا اور مجھے کئی بار گمان گزرا تھا کہ اب زندگی بس اسی دھب سے گزر جائے گی۔ عادت میری یہی ہے کہ جو ہستی ابھی لگتی ہے اس سے زندگی کا کوئی پہلو خفیہ نہیں رکھتی، اس لیے بھگت سنگھ سے بھی میری کوئی بات پوشیدہ نہیں تھی۔ بھگت سنگھ اسی شکاری کا نام تھا جس کا میں ذکر کر رہی ہوں۔ اس کی نظر میں گویا کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اہمیت تھی تو صرف میری۔“

”ابھی چند دن پہلے ہم نے وہاں قریب ہی ریٹم نگر کے نواح میں کیمپ لگایا جہاں سے تم نے مجھے لٹ دی ہے۔ وہاں بھگت سنگھ کے بچپن کے دو اور شکاری دوست بھی مل گئے۔ انہوں نے بھی ہمارے قریب ہی خیمہ لگا دیا۔ رات کو انہوں نے ملاقات کا جشن منایا۔ خوب شراب پیا۔ بہت سے بھنے ہوئے تیر کھائے۔ میں اور بھگت سنگھ اپنے خیمے میں بچے گئے۔ دو گھنٹے بعد اچانک بھگت سنگھ نے مجھے کالکی سے پکڑا اور اپنے دوستوں کے خیمے میں لے جا کر بولا۔۔۔۔۔ ”سیاں! ہم تو جب بھی شکار پر نکلتے ہیں اپنا سامان پورا رکھتے ہیں بلکہ خاطر داری کے لیے رات دو رات کی خاطر دوستوں کو اوجھار بھی دے دیتے ہیں۔ لو موج کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے ان کی طرف دھکیل دیا۔

”میں بھگت جیسے تھان سے دشمن پر آمری تھی۔ میں تو بھگت سنگھ کو دیتا تھا کر پوجنے

کی تیاریاں کر رہی تھی وہ تو دلوں سے بھی بدترین بن گیا تھا۔ میں نگر نگر اس کی طرف دیکھنے لگی تو بولا۔۔۔۔۔ ”اتنی حیران کیوں ہو رہی ہے؟ میرے لیے کوئی مشکل کام ہے کیا؟ یا کوئی نئی بات ہے؟“

”سوال تو اس کا برحق تھا لیکن اس گینڈے کے بچے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ عورت کا مان بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ اس نے یہ مان توڑ دیا۔ میں صرف اسی کی ہو کر رہنے کا خواب دیکھنے لگی تھی مگر اس نے میرا یہ خواب توڑ دیا تھا۔ میرے ماضی کی وجہ سے مجھے محض ایک بھری سمجھا تھا کہ ٹھوکر ماری تو اوھر لڑھکا دیا اور ٹھوکر ماری تو اوھر اچھال دیا۔“

”بھگت سنگھ نے مجھے دھکا کیا دیا، میرے سینے میں جیسے کوئی چیز چھن سے ٹوٹ کر رہ گئی۔ میں نے اس سے کہا۔۔۔۔۔ ”میں تمہاری باندی ہوں، تمہاری خوشی میری خوشی ہے لیکن پہلے اپنے خیمے میں چل کر میری ایک بات من لو۔“ وہ میرے ساتھ خیمے میں پہنچا تو میں نے اڑھائی لگا کر اسے گراپا اور اس کے گلے پر خنجر پھیر دیا۔ پھر میں نے باری باری اس کے دونوں دوستوں کو بھی آواز دے کر بلایا اور انہیں بھی قریانی کے کمروں کی طرح ڈنچ کر دیا۔۔۔۔۔“

”تم نے ان تینوں کو قتل کر دیا؟“ میں نے ہلکی سی حیرت سے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ فوری طور پر میرا کی جی چاہا تھا۔۔۔۔۔“ اس نے سکون سے جواب دیا۔

”ایک بات بتاؤ شکستہ۔۔۔۔۔“

”مجھے اب شکستہ ست کہو۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”یہ نام مجھے اب اجنبی اجنبی سا لگتا ہے اور جب احساس ہوتا ہے کہ مجھے ہی مخاطب کیا جا رہا ہے تو لاکھ بے حس ہو جانے کے باوجود کئی پرانے زخموں کی لذت جاگ اٹھتی ہے۔“

اب میں کینی کسلانے کی عادی ہو چکی ہوں۔ اب پوچھو کیا پوچھنے لگے تھے؟

”میں یہ پوچھنے لگا تھا کیسے کہ اگر میں تمہیں اپنی دوست اپنا ساتھی شمار کرنے لگوں تو تم کس حد تک مجھ سے وفادار ثابت ہو سکتی ہو؟“

”میں اب زندگی میں کسی بھی مرد سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔“ اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ”لیکن اپنے بارے میں ایک بات میں ضرور جانتی ہوں۔ کچھ عورتیں شہرت کی بھوکی ہوتی ہیں، کچھ محبت کی اور کچھ دولت کی لیکن میں صرف تھوڑی سی عزت کی بھوکی ہوں۔ میں نے دنیا میں سب کچھ دیکھ لیا، ہر چیز سے میرا دل بھر چکا ہے۔ میں نے جو کچھ گنوا یا اس پر مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں۔ حالات کی مجھے کوئی شکایت نہیں۔ تقدیر سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔ کچھ پانے کی کوئی تمنا نہیں۔ شاید میرے اندر دفن عورت کی کسی رگ میں اتنی کوئی رشت باقی ہے جو مجھے تمام تر لالچاں پن کے باوجود بے چین رکھتی ہے۔ بس اب مجھے تھوڑی سی عزت، تھوڑا سا احترام چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ میں اب کتوں کے

خول میں پڑی ہوئی ہڈی بن کر نہ رہوں..... کوئی ہو جو بے شک میرے وجود سے اپنا تن من پر جائے لیکن اس کے بدلے میں مجھے صرف عزت دیے رکھے۔ میری کچلی ہوئی عزت نفس کو مزید نہ کچلے۔ میری ہی نفروں میں مجھے گرائے نہ رکھے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا.....؟ اس کے لیے میں ابھی بھی تھی اور ایک سوہوم سی امید بھی۔

"خوب سمجھ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ میرے ذہن کے کل پرانے تیزی سے حرکت کر رہے تھے..... "اور تم مجھے ملی بھی بڑے صبح وقت پر ہو۔ ایسا وقت جو ہم دونوں ہی کے لیے بہت مناسب ہے۔ میں عام طور پر کسی پر اندھا اعتماد نہیں کیا کرتا لیکن تمہارے معاملے میں میں جوا کھیل رہا ہوں۔ آج سے تم میرے رفیقوں میں ہو..... اور اپنے رفیقوں کو میں اپنے دست و بازو سمجھتا ہوں۔ میں صرف انہی سے جاٹاری کی توقع نہیں رکھتا خود کو بھی ضرورت پڑنے پر ان پر قربان ہو جانے کے لئے تیار رکھتا ہوں۔"

"مجھے تمہاری بات پر یقین ہے اور میں نے فرض کر لیا ہے کہ مجھے ہر سوال کا جواب مل گیا ہے۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور سیٹ کے خاص ساخت کے پٹے سے سر نکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ "میں اب سونے لگی ہوں۔ سفر ختم ہو جائے تو مجھے جگا دینا۔"

"سفر اب ختم ہونے ہی والا ہے اب سونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں پوتا آرہا تھا اور اب ہم پوتا کے مصافقات میں داخل ہو چکے ہیں۔"

"لو....." اس نے تھکے تھکے انداز میں آنکھیں کھول دیں اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ زندگی بھر کی جہاں گردی کے باوجود اس کیجنت کا چہرہ کسی لئے بے مسافر کا چہرہ نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے ندیدے لیروں نے اس خزانہ حسن و کشش کو لوٹا تھا مگر اب بھی اتنا کچھ باقی تھا کہ ایک نظر ڈالنے سے ہوش و خروش پاؤں ڈمگاتے تھے۔ نہ جانے اس گم کردہ راہ لڑکی نے اپنا آپ کیسی بیدردی سے لٹایا تھا مگر خیر میں دست قدرت نے جو ملاحظت جو مباحثہ گوندھ دی تھی اسے ہدا کرتا شاید کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

"تمہارا ٹھکانہ آج کل بھی میں ہے؟" اس نے پوچھا۔ میں نے سڑک کی طرف دیکھ کر ہونے اثبات میں سر ہایا۔

"ہوا زمین شہر ہے۔" اس نے بلا تامل کہا۔ "لیکن کیجنت کی مٹی میں نہ جانے کونسا مقاطع چھپا ہوا ہے کہ وہاں کا رہنے والا کہیں بھی چلا جائے، وہاں اسی کی طرف کھینچا آتا ہے۔ میں سارا ہندوستان گھومی، مشرقی بنگال بھی چھان مارا۔ نیپال اور تبت تک چلی گئی لیکن گھوم بھر کر وہیں واپس آجاتی تھی۔ اب بھی میرا ارادہ کسی سے کار چھیننے کے بعد پہلے بھی ہی کی طرف جانے کا تھا۔ حالانکہ سرپرست وہاں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔"

"اور میرا حالانکہ سب کچھ ہی بھی میں ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی جاسے کیوں مجھے اپنا آپ وہاں مسافر مسافر گھومتا ہے۔ یہی جیسے میرے لیے محض ایک پڑاؤ ہے۔ میری منزل

کوئی اور ہے جس کی طرف جلد یا بدیر مجھے جانا ہے۔"

"تم دراصل کوئی اونچی چیز ہو اور کسی لمحے ہی پھر میں ہو۔" وہ تانٹیں پھیلاتے ہوئے

بولی۔ "تمہاری روح ہم جیہوں سے ہمیں زیادہ طاقتور ہے اور اتنی ہی مضطرب بھی۔"

میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ جتنی بھی شاطر اور گڑب گڑ باراں دیدہ قسم کی غصصیتوں سے میرا واسطہ پڑا تھا، جھوٹے ہی ان سب نے میرے بارے میں کم و بیش یہی تبصرہ کیا اور یہ وہ سب لوگ تھے جنہیں کسی کو کھن گانے کی حاجت یا عادت نہیں تھی۔

اس کے بعد سفر خاموشی سے طے ہوا۔ چند منٹ بعد ہم پونا میں داخل ہوئے اور میں نے ہوش شامریس کا رخ کیا۔ شامریس پہنچ کر میں نے ایک ڈی کس سوٹ کی فرمائش کی جو ریزرویشن نہ ہونے کے باوجود خوش قسمتی سے مجھے مل گیا۔ کینٹین نے تو سوٹ کے بیڈ روم میں پہنچتے ہی روم سروس سے اسٹالج و سکی کی ایک بوتل منگوائی اور بے صبری سے دو پیک تیار کر کے پیئے اور دھم سے بستر پر جاگری۔ میں ابھی جوتے بھی نہیں اتار پایا تھا کہ دو گھری نیند سو گئی۔ اس کے ہونٹ نیم داٹھے اور ٹاک سے ہلکی خرخرابٹ کی آواز خارج ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مدت بعد اسے اطمینان اور آرام کی نیند نصیب ہوئی ہے۔

اسے سوتی چھوڑ کر میں کمرہ فشت میں آیا اور لیلی فون اسٹینڈ کے قریب رکھی ہوئی ڈائریکٹری اٹھا کر اس کی ورنی گروائی کرنے لگا۔ ڈی الیس ہا زمل داس کے آفس اور گھر کا فون نمبر اور ایڈریس مجھے بغیر کسی دقت کے مل گیا۔ اس کے گھر کے ایڈریس سے مجھے اندازہ ہوا کہ جو صوف کو سول لائنز میں بنگلا ملا ہوا تھا۔ سول لائنز زمانہ طالب علمی میں میرا دیکھا بھالا علاقہ تھا۔

اس کے گھر کا نمبر وغیرہ نرٹ کرنے کے بعد میں کپڑے بدل کر بستر پر جا لیٹا اور کچھ دیر سوچ بچار کرنے کے بعد میں سو گیا۔ صبح دن چڑھے میری آنکھ کھلی۔ کینٹین بدستور ہے سدھ سو رہی تھی۔ میں تیار ہو گیا، تب بھی وہ سوتی رہی۔ میں نے اسے جگا ضروری نہیں سمجھا اور اس کے لیے ایک رقعہ لکھ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا کہ جب وہ اٹھے تو ناشتہ وغیرہ منگوا لے، میرا انتظار نہ کرے، تاہم کمرے ہی میں موجود رہے۔

میں نے ناشتہ نیچے ڈاکٹنگ ہال میں کر لیا اور پھر بازار روانہ ہو گیا۔ میں ہمیشہ سے کچھ اور سوچ کر چلا تھا لیکن اب نئے حالات کی حاجت سے میں نے اپنے لائحہ عمل میں کچھ تبدیلیاں کی تھیں اور اس تبدیلی کی وجہ سے میں نے بازار سے کچھ چیزیں خریدیں جن میں ایک فینسی برقع بھی شامل تھا۔

میں ہوٹل واپس آیا تو کینٹین ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر بیڈ پر سڑی تھی لیلی اخبار

بڑھ رہی تھی۔ اس کا لباس مگر وہی تھا لیکن صرف غسل کرنے سے ہی گویا اس کی شخصیت بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ اس قدر نکھری نکھری تازہ دم اور پرکشش لگ رہی تھی کہ میں ایک لمحے کے لئے اسے سر نہا دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ گویا لڑکی نہیں چاندی کا ایک مجسمہ تھی جو کل تک سیل پیکل میں ٹھہرا ہوا تھا مگر آج کسی ماہر ہاتھ نے جیسے اسے کسی طلسمی ٹکڑوں سے دھو دھا کر چمکا دیا تھا۔ "صحن! صحن! اور گزرے ہوئے ظالم لمحوں کے نقش قدم بھی جیسے اس کی شخصیت پر سے ہمہ معدوم ہو گئے تھے۔

میں اس کے لیے اندازاً سائز کا تعین کر کے ایک شلوار قمیص اور ایک جینز جیکٹ لے آیا تھا۔ سروسٹ میں نے اسے شلوار قمیص پہننے کے لیے دی۔ پھر میں نے کیٹی کو اس کے جیسے کا کام سمجھایا کہ اسے کیا کچھ کرنا ہے۔ اس نے صرف اسے ہی ذہن نشین کیا اور مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کیا کروں گا؟ یہ کہ اس سسلے کا سیاق و سباق کیا ہے یا اس کے بعد کیا ہوگا۔ ہر معاملے میں منجھی ہوئی لڑکی تھی۔ فالو سوالات نہیں کرتی تھی۔

میری ہدایت کے مطابق پہلے اس نے نرمل داس کے گھر کے نمبر پر فون کیا۔ میں کمرہ نشست کی ایکسٹینشن پر جھنگو سننے کے لیے موجود تھا۔ دوسری طرف سے ریمپور اٹھانے والی غالباً نرمل داس کی ملازمہ تھی۔ اس نے نہایت کوفت اور اچڑ سے کہنے میں "ہیلو" کہا۔ کیٹی نے انگریزی بولنی شروع کر دی۔ "نرمل داس صاحب کب گھر آئیں گے؟" اس نے شیریں لہجے میں پوچھا۔

"ہندی میں بات کر لی جا۔" دوسری طرف سے عورت نے بدستور اکڑے اکڑے لہجے میں کہا۔ "مجھے انگریزی دیکھنی نہیں آتی۔"

"تم کون ہو؟ ملازمہ؟" کیٹی نے ہندی میں پوچھا۔

"ہاں نہیں کیوں ہر ایک میری آواز سن کر مجھے ملازمہ ہی سمجھتا ہے۔" دوسری طرف سے عورت غالباً اپنی دانست میں بیڑوائی لیکن یہ بیڑواہٹ بھی کچھ کم بند نہیں تھی۔ "ارے بابا میں نرمل داس کی بھتیجی ہوں۔۔۔ گھر والی۔۔۔ جو رہ۔۔۔ پڑی۔۔۔ سمجھیں؟"

"خام طور پر وہ کس وقت گھر آتے ہیں؟" کیٹی نے پوچھا۔

"اس کا گھر آئے یا گھر سے جانے کا کوئی وقت متقرر نہیں، ویسے رات دی بجے سے پہلے بہر حال وہ زندگی میں کبھی گھر نہیں آیا۔۔۔" نرمل داس کی بیوی نے کہا۔ پھر اس کے لہجے میں ہلکا سا شک، تمیز، تجسس در آیا۔ "کیا کام تھا تمہیں اس سے؟"

"او جی بس۔۔۔ چاندی کا ایک جھڑا ہے۔" کیٹی نے گویا جھکتے ہوئے کہا۔ "میں رات نرمل صاحب سے آکر ملوں گی۔ مجھے ان کے ایک دوست نے ان سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ نرمل صاحب چنگی بجاتے ہی میرا مسئلہ حلے کروا دیں گے۔۔۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔۔۔" نرمل کی بیوی نے جھپٹتے ہوئے لہجے میں کہا۔۔۔ "اسے اس کا حصہ مل جائے تو وہ واقعی چنگی بجاتے ہی کام کر دیتا ہے۔۔۔ خاص کر جوان اور خوبصورت مصیبت زدہ عورتوں کے کام آنے کا تو اسے زبردست شوق ہے۔" آدمی آدمی رات کو اٹھ کر ان کے ساتھ چل دیتا ہے۔" نرمل کی بیوی نے گویا مزید جھنگو کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے ریمپور رکھ دیا۔

پھر میں نے بیڈ روم میں بھی ریمپور کے رکھے جانے کی آواز سنی۔ ساتھ ہی کیٹی کا قہقہہ سنائی دیا۔ "بچاری بہت سی دکھیا معلوم ہوتی ہے۔" وہ وہیں سے با آواز بلند ہوئی۔

میں ایکسٹینشن کا ریمپور رکھ کر بیڈ روم میں اس کے پاس پہنچا۔ رات ہونے کو ہے۔ میں ایک جھوٹا سا کام کر آؤں، تم تیار رہنا۔ میرے واپس آتے ہی ہمیں نرمل داس سے ملاقات ملے گی۔

"میں تمہیں تیار ملوں گی۔" اس نے اودھ کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میرا دل پھر بے ایمان ہونے لگا تھا لیکن سر کو جھٹک کر میں سنگھار میز کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے آئینے میں اپنے چہرہ لیا۔ میرا معمولی سا تبدیل شدہ صنف بدستور برقرار تھا۔ میں نے ابھی تک کیٹی کو احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ میں نے اپنے چہرے میں کچھ تبدیلیاں کر رکھی ہیں۔ مطمئن ہو کر میں سوٹ سے نکل آیا۔

گاڑی میں چھ کر میں چاندی چوک کی طرف چل دی۔ دل کے چاندی چوک کی طرح پونا کا چاندی چوک کوئی بارودق یا مصروف جگہ نہیں تھی۔ یہ ایک متوسط سی کالونی کا چوراہا تھا۔ پونا میں رہنے کے دوران وہاں سے آتے جاتے میں نے کبھی دھیان نہیں دیا تھا کہ وہاں کوئی شراب خانہ موجود ہے یا نہیں لیکن آج میں نے وہاں پہنچ کر ابھی چورنگی کے گرد پتھر بھی کھس نہیں کیا تھا کہ ایک گلی کے کونے پر مجھے "چارلیز" کا نئون سائن نظر آیا۔

چاندی کے بار کی بنگلی دیوار کے ساتھ پارکنگ کے لیے خاصی جگہ موجود تھی۔ گاڑی پارک کر کے میں بار میں داخل ہوا تو میرا خیال ہی تھا کہ وہ کوئی معمولی درجہ کا شراب خانہ ہو گا لیکن اندر پہنچ کر میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ شراب خانے کی آرائش میں نہایت پیش قسمت سامان استعمال کیا گیا تھا۔

ہال کے آخر میں ایک گوشے میں مجھے ایک میز پر ایک سگریٹ کا سلکتا ہوا سرا نظر آیا جسے ایک انگلی بار بار مضطرب انداز میں چھو رہی تھی۔ دنا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ شو بے خیالی کے سے عالم میں بار بار انگلی سے سگریٹ کا گل جھارتا رہتا ہے۔ میں بروہا اس میز کی طرف بڑھ گیا۔

اب میری آنکھیں مدھم مدھم روشنی سے مانوس ہو چکی تھیں اور جب میں گری پہنچ کر اس

اس بدبخت کو گھڑی کی طرح درمیان سے توڑ دوں لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔
”جذباتیت تمہارے لیے ممنوع ہے برخودار! مہر سکون سے چلتے رہو۔“

کچھ دیر بعد ہم سر کے کنارے پہنچ گئے۔ سڑک سر کے کنارے تین چار فٹ کی بلندی پر تھی جس پر اس وقت آمد و رفت نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ یہ سڑک محض دیہات کو آپس میں ملائی تھی۔ ایک طرف درختوں کی قطار اور دوسری طرف سر کی موجودگی نے اس ٹکڑی سڑک کو بے حد خوبصورت بنا دیا تھا لیکن دو میل آگے جا کر یہ سڑک پگھلائی میں تبدیل ہو گئی تھی اور اس کے ایک کنارے پر جا بجا گھنے درختوں کے بڑے بڑے جھنڈ موجود تھے۔ اس علاقے سے بھی کبھار کسی لرزہ خیز جرم کی بازگشت سنائی دے جاتی تھی۔ اس ویرانے میں درختوں کے ان بڑے بڑے جھنڈوں میں جرائم پیشہ لوگ ایسا ڈرامہ کھیل جاتے تھے جو عرصے تک زبان زد عام رہتا تھا۔ اسی لیے شرفاء سیر یا چل قدم کی غرض سے بھی اس سڑک کا رخ نہیں کرتے تھے۔

ایسے ہی ایک جھنڈ کے قریب میں نے گاڑی روکی اور دشت کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور خود اپنا بریلیف ٹیس اٹھائے ہوئے جھنڈ کی طرف چل دیا۔

ہم آنے والے دو پتھروں پر بیٹھ چکے تو میں نے بریلیف ٹیس ایک طرف رکھتے ہوئے دشت کی سرخ سرخ آنکھوں میں بھانک اور یکلفت گویا کوئی غیر مرئی فرد جرم پڑھتے ہوئے کہا۔
”دشت! اس وقت تم میرے ذاتی حیات انصاف میں موجود ہو اور میں تمہیں محض تھوڑی سی دولت کی خاطر ایک بے گنہ لڑکی کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرنے کے جرم میں موت کی سزا سناتا ہوں۔ میں تمہیں موت سے زیادہ اذیت ناک سزا دے سکتا تھا لیکن میں صرف اس لیے یہ سزا تجویز کر رہا ہوں کہ اس لڑکی کا چہرہ درست ہونا ممکن ہو گیا ہے۔ اگر یہ کام ناممکن ہوتا تو تمہاری سزا موت سے بھی زیادہ اذیت ناک ہو جاتی۔“

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا اور میرے الفاظ گویا اس کی سماعت سے بالا ہی بالا گزر رہے تھے۔ اس نے فوری طور پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا تاہم اس کی آنکھوں میں چمکے سے تسخیر کی چمک جھٹک آئی تھی۔

”یہ کس قسم کا مذاق ہے یا کسی فلسفی خداداد کے مکالمے؟“ اس نے پلٹیں ہچکائے بغیر سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں نے تمہارے لیے موت کا یہ طریقہ تجویز کیا ہے کہ“ میں نے گویا اس کے سوال پر دھیان دیے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں لیج کر کے تمہاری لاش کے کلوے کر کے سر میں بٹا دیئے جائیں۔ اب تم آرام سے ٹکر اور گھاس پر لیٹ جاؤ اور زیادہ اچھل کود مت چنانچہ میرے کہنے وغیرہ خراب نہ ہوں۔“

میں نے یازد کو ہکا سا جھٹکا دیا اور میرا خنجر آستین سے پھسل کر میرے ہاتھ میں آ گیا۔

فحش کے سامنے بیٹھ چکا تھا تو مجھے اس کی صورت بھی کافی حد تک صاف نظر آئی۔ بدن کی بتائی ہوئی دیگر نشانیاں بھی اس میں موجود تھیں۔ وہ دبلا پکا طویل القامت اور سانوا تھا۔ ہال کی مدھم روشنی میں سیاہ قدم ہی نظر آ رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بھی گہری لگ رہی تھی۔

”مجھے دن نے بھیجا ہے۔“ میں نے سرگوشی کر لیا۔

”اوہ!“ اس کے ہونٹوں سے اتنی ہلکی آواز نکلی جو ہر شکل سنی جاسکتی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے جسم پر چھایا ہوا تناؤ دور ہو گیا ہے۔

”کیا بیٹھے گئے؟“ اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

”ٹھنڈا پانی“ میں نے جواب دیا۔

”اس میں کچھ ملاؤ گے نہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں... میں ہر چیز خالص پینا پسند کرتا ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”کیا کام ہے... یو لو؟“ اس نے مدھم اور سپاٹ لہجے میں کہا اور کچھ آگے کو جھک آیا۔

”سیال نہیں...“ میں نے غماز انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہا ہر چلتے ہیں۔ گاڑی میں بیٹھ کر توارہ گردی کریں گے اور ساتھ ساتھ بات بھی طے کر لیں گے۔“
”یہاں یہ ختم کر لوں۔“ اس نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس نے گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور ہم اٹھ کر باہر آ گئے۔

”دن آج کل غائب کہاں ہے؟“ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اس وقت بھئی کے ایک عالی شان بیٹے میں ایک لوہڑا کے ساتھ بیٹھا ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ جیسے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں مجھ سے کس نوعیت کا کام ہے؟ گولی کا، خنجر کا، تیزاب کا یا آتشنی کا؟“

”بتاتا ہوں! اس جلدی بھی کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ذرا شر کی بھیڑ بھڑکے تو نہیں دور نکل چھیں...“ پھر جیسے مجھے کچھ یاد آ گیا۔ ”ویسے تم نے اس لڑکی کے بارے میں بڑی صفائی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہی بس پر ریلوے اسٹیشن پر تیزاب پھینکا تھا۔“

”وہ... ہاں...“ اس نے مدھم مگر سفاکانہ سا قہقہہ لگایا۔ ”اس کام میں لطف بھی کچھ زیادہ ہی آیا تھا۔ لڑکی بہت زیادہ خوبصورت تھی نا... اور جتنی جتنی زیادہ حسین ہو، اسے لگاتار نے یا سناٹے میں اتار ہی زیادہ مزا آتا ہے مجھے...“ وہ اپنے پتلے پتلے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بظاہر سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا مگر چشمہ تصور سے اسی منظر سے محفوظ ہو رہا تھا۔ اس لمحے میرا جی چاہا کہ وہیں گاڑی روک کر

اب انھی تھی۔ اس کا منہ بند کرنے کے بعد میں نے اس کے سینے پر ٹھٹھا رکھ کر اس کے ہونٹوں پر اچھی طرح ٹیپ چپکانی اور اسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔
وہ زخمی سانپ کی طرح جسم کو بیل دینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شاید کمر اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اس کی پیشانی اور گردن پر کئی رگیں مسلسل پھول چک رہی تھیں۔
”تم نے اپنی موت کو مزید تکلیف دے بنا لیا وشنو!“ میں نے ہاتھ بھاڑتے ہوئے کہا۔
”ابھی ابھی جبکہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ رہا تھا تو تمہاری سزا پر غم و رنج کا ایک اور طریقہ اچانک میرے ذہن میں آگیا۔ اب میں تمہیں ایک اور جگہ لے چلتا ہوں۔ اگر اس طریقے پر غم و رنج نہ ہو سکا تو پھر تمہیں واپس لا کر ذبح کر دوں گا۔“
اس نے بے بسی سے سر کو دائیں بائیں جھٹکتے دیکھے لیکن میں نے مزید کچھ کئے بغیر اسے گود میں اٹھایا اور گاڑی میں جھپی سیٹ پر ڈال دیا۔ میں دروازہ بند کرنے لگا تو اس نے بندھی ہوئی ٹانگیں دروازے میں پھنسانے کی کوشش کی۔
”اب اتنا کس لئے چل رہے ہو۔ اگر اب جسم کے کسی حصے کو جنبش دی تو میں اسے توڑ دوں گا۔“ میں نے اسے سنبھلے کی۔
میں نے جھٹکے سے دروازہ بند کیا۔ واپس بھنڈ میں آکر اپنا بریف کیس اور خنجر اٹھایا۔
کپڑے جھارے اور گاڑی میں بیٹھ کر بیٹن کا طرف روانہ ہو گیا۔



دشمن نے اب بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ بدستور چمکیں جھپکاتے بغیر میری طرف دیکھ رہا تھا، تاہم میں اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں تشویش کی ہلکی سی لہر نمودار ہوتے دیکھ رہا تھا۔

”تم پاگل تو نہیں ہو؟“ اس نے پسے سے زبان سجدگی سے کہا۔

”ہاں... اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں میری سجدگی میرے شکار کو پاگل بن ہی محسوس ہوتی ہے لیکن صرف چند لمحوں کے لیے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر میں اٹھا اور خنجر ہاتھ میں تھامے اس کے قریب پہنچا۔ اس کا بدستور ساکت بیٹھے رہتا مجھے کچھ عجیب لگ رہا تھا۔

دفعتاً اس نے دونوں پاؤں جوڑ کر اتنی بھرتی سے میرے پیٹ پر مارنے کی کوشش کی جس کی میں اس سے توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں کی یہ حرکت ایسی ہی تھی جیسے وہ سے زیادہ کھنچے ہو اور یہ کافیہ اچانک ہی اپنی بندش سے نکل گیا ہو۔

میں نے اپنے آپ کو بچا تو لیا لیکن میری کلائی پر دشمن کے جوتے کے تلے سے خاصی زوردار چوٹ لگی اور خنجر پر میری گرفت اتنی ہلکی پڑ گئی کہ میں نے اسے چھوڑنا ہی بہتر سمجھا۔ وہ اس وقت تک اچھل کر سیدھا ہونے کے بعد مجھ پر چھلانگ بھی لگا چکا تھا۔ شراب کا فائدہ اس پر اتنا مناسب نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا اور اس کا بھول جسم بھی چلک، طاقت اور پھرتی سے اتنا نہ رہی نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔

اس کے گھٹنے میرے پیٹ سے ٹکرائے اور ساتھ ہی ایک بازو آنکلوں کے بازو کی طرح میری گردن کے گرد لپٹ گیا۔ اسے اتنا موقع محض میرے اندازوں کی غلطی کی بنا پر ملا تھا۔ پیٹ پر اس کے گھٹنوں کی ضرب نے مجھے زیادہ تکلیف نہیں پہنچائی تھی البتہ گردن کے گرد لپٹے ہوئے بازو کا کھینچ جھرت انگیز طور پر سخت تھا اور سانس روکنے کے ساتھ ساتھ گویا میری گردن بھی توڑنے ہی والا تھا۔

غالباً ایک سیکنڈ کے لیے میں نے اپنے آپ کو بدحواس بھی محسوس کیا۔ ایک شخص جسے انسان نے چوہے سے زیادہ حقیر سمجھا ہو، ایک سخت عفریت کی طرح جان کو آجائے تو ایسا محسوس ہونا فطری بات تھی۔ تب میں نے جھرجھری سی سی۔ اسر نو اپنی توانائی مجتمع کی اور اس سانپ کی طرح جسم کو جھٹکا دیا جس کی گردن سے سٹاپٹ گیا ہو۔ دشمن دور جاگرا۔ میں نے گردن کو ہٹا سا جھٹکا دے کر کھنچاؤ دور کیا اور میں اس وقت جبکہ دشمن زمین سے اٹھ کر دوبارہ مجھ پر چھلانگ لگانے کے لیے پاؤں زمین سے اٹھ چکا تھا، میں نے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ کچھ اپنے زور میں اور کچھ میری ٹھوکر کی وجہ سے ہوا میں خاصا اونچا اچھلا اور چاروں شانے چت زمین پر گرا۔

پھر یلکھت وہ ذبح کیے ہوئے کمرے کی طرح بیٹھنے لگا، شاید ریزہ کی ہڈی میں درد کی لہر

باہر آگیا۔ گاڑی سے دشمن کو نکال کر میں نے برف کیس سے اپنے ہنگامی سامان سے ایک لائٹر نکال اور دشمن کو گود میں اٹھ کر شمشان میں لے آیا۔

اب وہ یقیناً میرا مقصد سمجھ چکا تھا۔ پہلے اس نے میری حرکت میں پھنسنے کی کوشش کی مگر پھر شاید اس کی کمر کی تکلیف حد سے بڑھ گئی یا دہشت کی زیادتی نے اسے مفلوج سا کر دیا کہ وہ بالکل بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں بے جان سے انداز میں جھول رہی تھیں۔

لکڑیوں کا جو انبار میں نے منتخب کیا تھا، اس کے قریب لا کر میں نے بیٹوں کے بل کھڑے ہو کر دشمن کو ہاتھوں پر اٹھا کر اوپر سٹاپا تب اس کے جسم میں گویا زندگی عود کر آئی اور اس نے زور لگا کر اوپر سے لڑھکنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کے منہ پر نقرت بھرا ٹھونسا رسید کر کے اسے دوبارہ چپوڑا لیا انبار کے وسط میں پہنچا دیا۔ پھر میں نے انبار پر سے ایک بڑی سی لکڑی اٹھائی اور لاٹھر سے آگ دکھا کر کچھ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ لکڑی میں نے اسی خیال سے پکڑ رکھی تھی کہ اگر دشمن نے دوبارہ لڑھکنے کی کوشش کی تو اسے دور ہی سے واپس دھکیل دیا گا مگر اس میں شاید شک نہیں رہی تھی یا وہ سبے ہوش ہو گیا تھا۔ میری خواہش یہی تھی کہ وہ ہوش میں ہو، اور شعلوں کو اپنا جسم چاٹنے کچھ دیر کے لیے ہی کسی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔

شعلے بلند ہوتے گئے۔ لیل لود خشک لکڑیوں نے اتنی تیزی سے آگ پکڑی کہ میں زہن زد گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دشمن کا جسم سرخ اور تاریخی شعلوں میں چھپ گیا۔ میں نے مزید وہاں رکتا ضروری نہ سمجھا۔

ہوا میں گوشت جھنے کی بو پھیل پھیل گئی جو مجھے بے حد فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔

گاڑی میں بیٹھے وقت میں نے گھڑی دیکھی، گیارہ بج رہے تھے۔ مجھے بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ میں کتنی کوس بجے کا وقت دے کر آیا تھا، میں تیز رفتار سے ہوش کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہوش کے کمرے میں پہنچ کر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کیٹی سر کے بل بیڈ پر دیوار کے سارے گھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”گورڈش.....“ اس نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔

”یہ کونسا وقت ہے ورڈش کا؟“ میں نے کہا۔

”میں چونکہ وقت کی پابندی نہیں کر سکتی۔“ وہ سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔ ”اس لیے جب بھی وقت ملتا ہے، کر لیتی ہوں۔ ویسے بھی تمہارا انتظار کرتے کرتے تین دن آنے لگی

نذر آتش کی آتشیں
نذر آتش کی آتشیں

بل کے پار ایک بہت بڑا شمشان تھا جہاں ہندو اپنی ارحیوں کو نذر آتش کیا کرتے تھے۔ شمشان کا گھراں بھی اندر ہی ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔

میں جب شمشان پر پہنچا تو گیت میری توقع کے مطابق کھلا ہی تھا۔ میں نے گاڑی باہر ہی ایک طرف درختوں کی لوث میں جھونڈ دی اور دروازے مقفل کر کے اتر آیا۔ شمشان کے اندر مجھے گھراں کی جھونپڑی کی تلاش میں کافی دور تک چلنا پڑا۔ جا بجا لکڑیوں کے ٹوٹے چھوڑے انبار دیو پیکر بیونولہ کی طرح راستہ روکنے کھڑے تھے اور ان کے درمیان ہوا یوں سرسرا رہی تھی جیسے نذر آتش ہو جانے والے جسموں کی روحیں کسی جاسے پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی ہوں۔

بعض انبار جن پر ارحیاں جلائی جا چکی تھیں اور مرنے کی رائے گھنگھل میں جانے کے لیے لے جانی جا چکی تھی، ان کے مرنے والے کونوں کے ڈھیر ابھی تک بکھرے پڑے تھے۔ کبھی کبھار کوئی کونکہ میرے پاؤں تلے آکر چبچب جاتا تھا تو رات کے گھرے سکوت میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی غریبیت نے کوئی بڑی چبا ڈالی ہو۔

جھونپڑی کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ دروازہ بند تھا البتہ بغی دیوار میں موکھلا نما ایک گھڑی کھلی تھی۔ میں نے احتیاط سے اس کے اندر جھانکا۔ میرے سامنے چارپائی پر ایک قوی دھول دھوئی پوش جوان نہایت بے ہودہ طریقے سے جھنگا سی چارپائی پر اونٹن چلایا تھا۔ اس کے منہ سے رال بہہ بہہ کر نیچے میں جذب ہو رہی تھی۔ چارپائی کے قریب ہی ایک کونڈی، سوتا اور مٹی کا بڑا سا پالہ بڑا ہوا تھا۔ کونڈی میں یقیناً بھنگ گھونٹی گئی تھی جو ابھی کافی مقدار میں باقی تھی۔ چارپائی پر گھراں موصوف بھنگ پی کر دنیا و مائیا سے بے خبر لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ کچھ کیے بغیر ہی مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

جھونپڑی کے قریب ہی مٹی کے ٹیل کا ایک ڈرم رکھا تھا جس میں ہتھ کی ٹونٹی لگی ہوئی تھی اور ٹیل نکالنے کے لیے ایک ڈبا بھی پاس ہی پڑا تھا۔ میں نے اطمینان سے ڈبا ٹیل سے بھرا اور جھونپڑی سے دور نکل آیا۔ میں نے لکڑیوں کا ایک انبار تلاش کیا جو میرے مقصد کے لیے موزوں تھا۔ یہ انبار نہ تو جھونپڑی سے زیادہ قریب تھا اور نہ چار دیواری سے۔ میں نے اس کے نیچے جیسے پر اچھی طرح تیس چھڑکا اور ڈبا وہیں پھینک کر شمشان سے

تھی۔ میں نے سوچا سو ہی نہ جاؤں۔

”چلو.... اب فوراً نکل چلو۔“ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے چند سیکنڈ میں وال برش کیے اور پنڈلیگ اٹھا کر میرے پیچھے چل دی۔ سول لائنز جاتے ہوئے راستے میں کئی نے برقع پہن لیا اور چہرہ اس طرح غائب میں چھپا لیا کہ صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ سول لائنز میں مطلوبہ نمبر کی کوئی تلاش کرنے میں ہمیں قدرے وقت پیش کی کیونکہ درختوں سے گھرے ہوئے محل کھاتے راستوں پر روشنی نہیں تھی اور بیشتر کوئٹیاں بھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

مطلوبہ کو بھی تلاش کرنے کے بعد میں نے گاڑی اس سے کچھ فاصلے پر گھڑی کی اور ایک گھڑی کے قریب پودوں کے درمیان پوزیشن سنبھالی تھی کہ اندر سے ایک بھاری اور گھوڑی مروانہ آواز سنائی دی۔ ”آج تو دن صدراہم بنگلوان! صرف اڑھائی ہزار روپے کی اور کی آمدنی ہوئی ہے۔۔۔ ایک۔۔۔ تو آج کل مرے پھٹے بہت کم ہیں“ اوپر سے جیسے بخرے زیادہ نکلتے گئے ہیں۔۔۔

میں نے گھڑی کے پنوں کے درمیان معمولی سی بھری سے جھانک کر دیکھا۔ ایک بھاری بھر کم شخص ہو یقیناً نرمل داس تھا، پولیس کی وردی اتار رہا تھا۔ چوڑے سے سپاٹ چہرے اور بھری ہوئی ناک والی ایک اوجیز عمر عورت جس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی یاسیت تھی اسے وردی اتارنے میں مدد دے رہی تھی وہ یقیناً اس کی بیوی تھی۔ وہ قد میں میان سے بھی نکلتی ہوئی تھی اور سبے حد چوڑے چٹکے جسم کی مالک تھی۔

کئی نے میرا سٹیل پا کر کال ٹیل بجا دی۔ نرمل داس چونک اٹھا اس کی آنکھوں میں اس درد سے کی سی چٹک اُبھر آئی جس نے شکار کی بو سونگھ لی ہو۔ اس کی بیوی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور نرمل داس اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

میں اندھیرے میں دیوار کے ساتھ چپک کر چننا ہوا اس کو نے تنگ پہنچا تاکہ سر ڈرا آگے کو اٹال کر دروازے کو دیکھ سکوں۔ کئی سر جھکائے دروازے پر گھڑی تھی۔ دفعتاً دروازہ کھلا، نرمل داس نے محتاط انداز میں پہلے سر نکال کر باہر جھانکا۔ پھر ایک تنہا برقع پوش لڑکی کو دیکھ کر جلدی سے باہر آیا۔

”کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟“ اس نے ہارعب لمبے میں پوچھا۔

”میرا نام رشیدہ ہے۔“ کئی نے روہاں آنکھوں پر پٹیٹے اور تھولتے ہوئے اور یوں اضطراب کی نہایت کامیاب اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے مدن نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔۔۔ اس نے کہا تھا کہ جس قسم کے جھگڑے میں میں پھنس گئی ہوں اس میں صرف آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں کیونکہ آپ بڑے دھڑلے کے آدمی ہیں۔۔۔“

”کیا معاملہ ہے؟“ نرمل داس کے لمبے کی حق برقرار تھی۔

”تفصیل تو میں دوسرے فرق کے سامنے چل کر ہی بتاؤں گی کیونکہ وقت بہت قیمتی ہے۔ اگر آپ نے اس شخص کو نہ روکا جس سے میرا جھگڑا ہے تو آج رات چند گھنٹے بعد وہ یہاں سے ہمیں اور وہاں سے علی الصبح بذریعہ جہز لندن روانہ ہو جائے گا اور پھر یہ معاملہ میٹوں آگے جا پڑے گا۔ لاکھوں کی جائیداد کا مسئلہ ہے اور کرنا صرف اتنا ہے کہ اس شخص سے ایک دستاویز واپس لینی ہے جس پر اس نے دھوکے سے میرے دستخط کروا لیے تھے۔“

”کون ہے وہ شخص؟“ نرمل داس نے اب قدرے نرمی سے پوچھا۔

”میں نے فون پر آپ کی ٹیکم کو بھی بتایا تھا۔ شاید انہوں نے آپ کو نہیں بتایا۔“ کئی نے نہایت مضطرب لمبے میں کہا۔ ”ریٹائرڈ اسٹیٹ انجنی کے نام سے کاروبار کرتا ہے۔ امیر شاہ نام ہے اس کو۔۔۔“

”او۔۔۔“ نرمل داس نے معنی فیز لمبے میں کہا۔

”آپ جانتے ہیں اسے؟“ کئی نے نہایت کامیابی سے اپنے لمبے میں امید کا تاثر پیدا کیا۔

”کسی حد تک۔۔۔“ نرمل داس نے جواب دیا اور ایک مونچھ کو پوچھیاں انداز میں مل دیتے ہوئے کئی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”تمہیں مدن نے بھیجا ہے۔۔۔ دوست ہو اس کی؟“

”میں سمجھ لیجے۔۔۔“ کئی نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

”تم اگر ذرا پہلے آجاتی تو بڑی آسانی رہتی۔“ نرمل داس نے لگاں کھاتے ہوئے کہا

”میں اب سرکاری گاڑی بھی کوٹوالی واپس بھیج چکا ہوں اور وردی بھی اتار چکا ہوں۔“

”گاڑی تو میرے پاس ہے۔“ کئی نے اس سمت میں اشارہ کیا جہاں گاڑی اندھیرے میں کھڑی تھی۔ ”میں گاڑی سے اتر کر آپ کا گھر تلاش کر رہی تھی۔ باقی رہی وردی کی بات تو میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وردی کے بغیر بھی آخر آپ ڈی ایس پی رہیں گے۔۔۔ اور پھر آپ امیر شاہ کو ہانتے ہیں تو یقیناً وہ بھی آپ کو جانتا ہی ہوگا۔“

”اں میری جان!“ دفعتاً نرمل داس نے ٹھنڈی سانس لے کر بدلے بدلے لمبے میں کہا۔ ”امیر شاہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔۔۔ بلکہ آدھا شہر مجھے اچھی طرح جانتا ہے لیکن شاید تم مجھے بالکل نہیں جانتیں ورنہ اتنی پکوانہ کمائی لے کر کبھی میرے پاس نہ آتیں۔ میری بد قسمتی یا شاید خوش قسمتی یہ ہے کہ میں شغل سے بڑا سب سے وقف لگاتا ہوں لیکن ایسا ہے نہیں۔ میں نے پولیس کے محکمے میں چودہ سال بھڑ بھڑکتے نہیں گزارے۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ خستہ بھرے انداز میں مسکرایا اور نہایت ہی غیر متوقع طور پر اس نے اپنے بھاری بھر کم کٹے کی مناسبت سے قلعی ناقابل یقین پھرتی کے ساتھ کئی کو کمانی سے پکڑ کر اندر کھینچ

لیا۔

دروازہ ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔ کینٹی کی بظہاری سی چیچ بچھے اور پوری ہی سنگلی دی کیونکہ اس دوران دروازہ بند ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آواز معدوم ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں جیسے خالی انداز میں سا ہو گیا۔ مجھے یوں یانزی پلٹنے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اپنی دانست میں میں نے بڑا مضبوط جال پھیندایا تھا۔ مجھے مسلسل چند ایسی کامیابیاں نصیب ہوئی تھیں کہ شاید میں تصویر کا دوسرا رخ دیکھنا بھول گیا تھا۔

ایک نکتہ گویا ہوش میں آکر میں دروازے کی طرف لپکا اور پینڈل گھمایا لیکن میرے اندیشے کے عین مطابق دروازہ مقفل ہو چکا تھا۔ میں دیوانوں کی طرح تلا نہیں بھرتا اس کمرے کی طرف واپس آؤ جس سے میں اندر جھانک رہا تھا کہ شاید نرمل داس کینٹی کو وہیں لائے گا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کمرے کی بھی جی بجھ چکی تھی اور اندر نرمل داس کی بیوی کی موجودگی کے بھی آثار محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

پوری کو بھی یہ اندھیرا اور سکوت چھایا ہوا تھا۔ صورتحال بالکل ایسا ہی تھی جیسے سمندر سے سرنگاں کر کے خونخوار ٹکڑھنے نے اچانک ہی اپنے شکار کو دیوچا ہو اور آن واحد میں دوبارہ سمندر کی تہ میں اتر گیا ہو اور سمندر کی سطح بالکل پہلے ہی کی طرح پرسکون ہو گئی ہو۔ میرے جسم میں سردی مریں دوڑنے لگیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

کمرے میں چونکہ سلاخیں لگی ہوئی تھیں اس لیے میں ایک بار پھر دروازے کی طرف دوڑا۔ میں نے دروازے پر ہی طاقت آزمائی کا فیصلہ کیا۔

کمرے کے بولر کی طرح میں نے برآمدے کے کنارے پر پہنچ کر اسٹارٹ لیا اور پھرے ہوئے سانڈ کی طرح اپنا ہایان کندھا پوری قوت سے دروازے سے ٹکرایا۔ ایک بار تو گویا سانڈ کی دیوار ہی لرز کر رہ گئی۔ دروازے کے قبضے بھی شاید ذرہ برابر ڈھیلے ہوئے تھے لیکن اس عمل میں ”ٹوہم“ کی خاصی زوردار آواز پیدا ہوئی تھی۔

میں اس وقت چونکی بار دروازے کو ٹکر لگانے کے لیے اسٹارٹ لے رہا تھا جب میں نے محسوس کیا کہ اندر بتیاں روشن ہونے لگی ہیں۔ میں نے چونکی ٹکر تو ہر حال رسید کر ہی دی اور ساتھ ہی ریمالور جیکٹ کی جیب سے نکال کر دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

”دھیرن... دھیرن جان دھیرن!“ میں نے دروازے کے عقب سے کینٹی کی سرگوشی سنی۔ ”پوری کالونی کو جگاؤ مے کیا؟“

دروازہ اب کھڑکھڑانے لگا تھا اور مجھے پوری امید تھی کہ چھٹی ساتویں کمرے پر تانا اپنے فریم سے ہی نکل جائے گا۔ کینٹی کی سرگوشی من کر میری جان میں جان آئی۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا اور باہر تک مددنی پھیل گئی۔ کینٹی میرے سامنے کمری اطمینان سے

سٹرا رہی تھی۔ حالانکہ میرے خیال میں اسے اپنی حالت کے پیش نظر تو سٹرا نہیں چاہیے تھا۔

اس کے برقعے کا بالائی حصہ غائب تھا اور نچلے حصے کے بھی تمام بن ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ کئی جگہ سے پٹا ہوا تھا۔ کینٹی کے چہرے پر خون کے چھینٹے تھے اور وہ اپنا خون آلود خنجر پھینے ہوئے برقعے سے صاف کر کے اپنی شلوار کا پانچپنٹہ اٹھ کر ٹانگ پر بندھے ہوئے پھوٹے سے چڑی تیار میں رکھنے لگی تھی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”آکر خود دیکھ لو...“ وہ سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے بولی اور میرا ہاتھ تھام کر ایک چھوٹے سے ڈرب نما کمرے میں لے گئی جہاں کئی کمری، روشندان حتیٰ کہ کوئی روزن تک نہیں تھا۔ اس کمرے میں ایک طرف بستر لگا ہوا تھا اور دوسری طرف میز پر کچھ عجیب و غریب چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں مڑی مڑی ہوئی تاریں، ایک پلاسٹک ایک موٹا سا ڈنڈا، چمڑے کا ایک پھتر اور ایک بیڑ شامل تھا۔ بیڑ پر کمری کے دسے والی دو توکیلی سلاخیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کی چھت میں ایک کندھے سے بندھی ہوئی سی ری بھی جھول رہی تھی۔

اسی سی کے عین نیچے نرمل داس اور اس کی بیوی کی لاشیں آؤمھی تر چھی پڑی تھیں۔ دونوں کی آؤمھی سے زیادہ گردن عجیب انداز میں کٹی ہوئی تھی۔ کینٹی کو غالباً اس مخصوص انداز میں بڑی مہارت حاصل تھی کہ وہ خنجر گردن کے پار کر کے اسے آگے کو جھٹکا دیتی تھی اور شہ رگ زخروں سمیت کٹ جاتی تھی۔ اس نے نرمل داس اور اس کی بیوی کا کام تمام کرنے میں غالباً چند سیکنڈ بھی نہیں لگائے تھے۔ ان کی گردنوں سے خون ابھی تک تھوڑا تھوڑا بہہ رہا تھا۔

میں نے سولہ نظروں سے کینٹی کی طرف دیکھا تو وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر مہذرت خواہانہ سے لہجے میں بولی۔ ”میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ نرمل داس مجھے سیدھا اس کمرے میں لاتے ہی بھونکے بھیڑیے کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑا بلاوجہ نوبت کھسوت رہا تھا اور ان فن بک رہا تھا لیکن ساتھ ہی چی بھی بول رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں اکثر جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو یہیں لائے قہقیش کرتا ہوں۔ پھر ان چیزوں کی باری آتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے نرمل داس نے چھت میں لگی ہوئی سی اور میز پر رکھی ہوئی ان چیزوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔“

میں نے کینٹی کو ساتھ لے کر اشارہ کیا اور کمرے سے نکل آیا۔ کار میں بیٹھ کر ہم ہوش واپس آ گئے۔ اہتیا فاما ہم عقبی راستے سے اندر پہنچے اور بیڑ حیاں چڑھ کر اپنے سوئٹ میں چلے گئے۔

اگلے روز ہم بیدار ہونے کے بہت دیر بعد بستر سے اٹکے۔ غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ ڈریسنگ روم کے سامنے جا بیٹھی اور بالوں میں برش کرتے گئی، پھر اس نے نہایت غصت سے باقی کی لپ اسٹک لگائی۔ پھر اس نے سینے سے پرغوم لگائی اور کمرے میں دھیمی اور خوابناک سی مٹک بچھل گئی۔

پھر وہ دونوں باتھ کمر پر رکھ کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی اور ایک اوائے دلیری سے بولی۔ "میں اچھی لگی رہی ہوں ناں؟"

میں نے سر ہٹا اس کا جائزہ لیا۔ ہری وہ مجھے اس وقت بھی نہیں لگی تھی جب میں نے اسے پہلے کیا تھا لیکن اس وقت وہ مضحک، تھکی تھکی اور کچھ میلی میلی تھی۔ اب وہ تازہ دم تھی۔ اور سب حد تک تھری لگ رہی تھی۔ چھینل فائیو کی خوشبو سے قطع نظر وہ دن میں اس کا اپنا وجود بھی خوشبو دینے لگا تھا اور یہ خوشبو جیسے میرے ہر مسام جاں میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ اس لڑکی کی قربت میں مجھے جانے کیوں یاد ہوا یاد آئے لگی تھی۔

"تم نہ صرف اچھی لگ رہی ہو بلکہ اچھی ہو بھی۔۔۔" میں نے اس کے ہاں غصوں میں جکڑ کر دوبارہ خراب کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ بڑی محنت سے اسیں سنوار کر آئی تھی۔ "تمہارا المیہ صرف یہ ہے کہ تمہیں تمہاری اچھائیوں کی قدر کرنے والا کوئی نہیں ملتا۔ جو تمہاری اچھائیوں، برائیوں، جسم و ذہن، حسن و خرمیہ سے ہی کھیلنے رہے۔"

"جو گزر گئی، سو گزر گئی۔" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے میرا اپنی مت یاد دلاؤ، میں اپنا ہر گزرا ہوا کل ساتھ کے ساتھ دفن کر دیتی ہوں۔ میرے گزرے ہوئے روز و شب کی قبریں مت کریدو۔ صرف وہی گھڑی میری ہے جو گزر رہی ہے۔ میں دنیا میں جی دست آئی تھی، جی دست چلی جاؤں گی لیکن مجھے اب کسی بھی بات کا کوئی دکھ نہیں البتہ خوشی ضرور ہے کہ کچھ نہ کچھ دیر کے لیے تو ہمارے راستے ایک ہوئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تقدیر کی پٹاری میں میرے لیے کیا ہے لیکن مجھے پہلے بھی اس کی پروا نہیں تھی اور اب تو بالکل ہی نہیں رہی۔"

وہ جیسے عالم خواب میں بول رہی تھی۔ بہت سی چلتے وقت میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اتنی چکی اور کھڑی لڑکی مجھے اس سفر کے دوران مل جائے گی۔

"منصور! دھنسا" اس نے خوابناک سے لہجے میں سرگوشی کی۔

"ہوں۔" میں نے قدرے چپکے ہوئے ہنکارا بھرا۔

"تو مجھے اپنا وجود بے حد بلا بھکا رہا ہے۔" وہ گویا گنگنائے ہوئے بولی۔ "میں جیسے آسمانوں کے قریب قریب میں پرواز کر رہی ہوں۔ میرا تکی چاہ رہا ہے کہ تم مجھے کہیں سیر کرانے سے چلو۔۔۔ میری اس معصوم سی خواہش پر ہنسا نہیں۔ رائدہ درگاہ قسم کی لڑکیاں اندر سے اتنی ہی معصوم اور شفاف ہوتی ہیں۔"

"کس جگہ چلنے پسند کر دگی؟" میں نے مانت سے پوچھا۔

"کسی ایسی جگہ جہاں سبک خرازی سے ندی بہہ رہی ہو۔۔۔ ڈھلوان کنارے پر سرسبز گھاس ہو۔ ہمیں ہمیں درخت بھی ملانے کیے کھڑے ہوں اور ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ جھک جھک کر گویا ندی سے سرگوشیاں کر رہے ہوں۔۔۔ نہیں نہیں زرد اور نیم زرد پتے کھڑے پڑے ہوں۔۔۔ یوں لگے چلو گئے؟" وہ آنکھیں کھول کر مستراقی۔

"کیوں نہیں۔" میں نے اس کے رخسار دیکھا۔ پھر اس کا ہاتھ تھما اور پیچھے آکر ہم کرائے کی اوڑن میں بیٹھ کر سر کی طرف روانہ ہو گئے۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ سردیوں کی مدھم سی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا میں زیادہ خشکی نہیں تھی۔ میں نے کھڑکیوں کے شیشے اتارے ہوئے تھے اور پٹنی کار میں ہوا سے تینوں کے کھلے ہاں ادھر ادھر لہرا رہے تھے۔ ہمیں کبھی کوئی مٹ میرے رخسار پر بھی لگدندگی سی کر جاتی تھی۔

سفر کے کنارے پہنچ کر میں ہنستہ سڑک پر نہایت کم رفتار سے ڈرائیو کرنے لگا۔ پیچھے کے لیے مجھے کوئی موزوں جگہ نظر نہیں آ رہی تھی حتیٰ کہ ہم اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں سڑک ایک کشادہ سی پتہ ندی میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ یہاں بالا خر مجھے ایک ایسی جگہ نظر آئی جی جی جیسا کہ میں نے تصور ہاندھا تھا۔ کار کو فلیپ میں روک کر ہم اتر آئے۔

کچھ دیر تک ہم ڈھلوان اور سرسبز کنارے پر درختوں اور پھولدار پودوں کے درمیان بچوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے حتیٰ کہ کتنی ہنستے ہنستے بے ہم ہو کر گھاس پر لیٹ گئی۔ ہنسی جیسے جھرنے کی طرح خود بخود اس کے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔ میں بھی کتنی کے مل اس کے قریب بہہ دراز ہو گیا۔

دھنسا آسمان کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کی ہنسی ختم ہو گئی۔ وہ یقیناً ہی یوں خاموش ہو گئی جیسے آسمان پر اس نے کوئی ذراؤنا مقرر ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "منصور! اگر بنگال کے لفظ میں میرے ماں باپ نے پارہ روپے میں مجھے فروخت نہ کر دیا ہوتا تو آج شاید میں ایک سیدھی سادھی معصوم، سہیلی لڑکی ہی ہوتی۔" وہ کھونٹے کھونٹے لہجے میں بولی۔ "شاید اس طرح سر کا کوئی کنارہ ننھے ننھے سے کون پتے اور قم سا کوئی ہم سفر میرا مقدر ہوتا لیکن آج میں کتنی تنہا ہوں۔"

"میری نظر میں تو تم آج بھی سیدھی سادھی اور معصوم ہی ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں سے رخساروں پر دھنک آنے والے دو شفاف آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔ "ہاتی دہی یہ بات کہہ کر کچھ تمہارا مقدر ہوتا۔۔۔ تو انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ اکثر یہی سوچتا رہتا ہے کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا اور یوں نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ یہ بھی تو ممکن ہوتا کہ اگر قطعاً نہ پاتا اور تمہارے ماں باپ نے ہمیں نہ بچا ہوتا تو دیوان ہوتے ہی کسی بد قوق اور بھسوں سے ایذا نوحوان سے تمہارا بیاہ ہو جاتا۔ وہ روز نمازی پڑھ کر تمہیں دھم دھم دیتا کرتا۔ تمہارے بچے

دینے نہ ہوتے جیسے تم چشم تصور سے دیکھتی ہو۔ غزبت و افلاس کی وجہ سے وہ محض مسخ شدہ تصویروں کی طرح ہوتے۔ بھوک سے پسیناں ٹپکی ہوئی، ناک بہتی ہوئی، جسم میل اور چمک سے اسے ہونے اور آنکھیں مجسم ہوال۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ شمارا بد قوق اور مجمل شوہر جسیں طلاق تھا سر واپس بھیج دیتا۔ پھر تو تم اس سے بھی زیادہ تقا ہوتیں۔ اس لیے اسکی باتیں سوچ کر دل دکھی مت کیا کرو اور پھر تم تو کہہ رہی تھیں کہ جو گزر گئی سو گزر گئی۔ میں اپنی ہرگز دی ہوئی کل کو دفن کر دیتی ہوں۔ بھول گئیں کیا؟

"ہاں۔۔۔ میں کتنی قویکی ہوں۔" وہ غم آلود آنکھیں بند کر کے پیشانی مسلتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ "لیکن کبھی کبھی خود فریبی کے لبادے کا کوئی نہ کوئی تار تیس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ کئی زخم ہیں جن سے خون رسنا تو کب کا بند ہو چکا ہے مگر کسک نہیں گئی۔ میرے ماں باپ نے جس وقت مجھے بچاؤ میں چار پانچ سال کی تھی۔ مجھے اچھا خاصا شعور تھا۔۔۔ مجھے یاد ہے جب میری ماں مجھے اس بڑے سے مکان میں چھوڑ کر جانے لگی تو میں وہشت زدہ ہو کر رونے لگی تھی۔ میری ماں نے اپنی پٹنی ہوئی سلی کیل ساڑھی کے پلو سے اپنے اور میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ "مہینا میں ذرا کام سے جا رہی ہوں۔۔۔ تو ذرا دیر کو یہاں بیٹھ۔۔۔ میں ابھی تجھے لینے آ جاؤں گی۔" پھر وہ پو میں منہ چھپا کر یوں بھاٹک کی طرف دوڑتی چلی گئی تھی جیسے اس کے قدموں تلے کسی نے انگارے بچھا دیئے ہوں۔ اس بات کو کم از کم پچیس برس بیت گئے ہیں۔ مجھے کبھی دوبارہ اپنی ماں یا باپ کی شکل نظر نہیں آئی۔ میری ماں کی "ذرا دیر" ابھی ختم نہیں ہوئی۔ منصور! کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنا دو دھاری خنجر نکال کر ایک مہرے سے اس دنیا کے سارے انسانوں کو قتل کرنا شروع کر دوں جہاں بارہ روپے کے لیے ماں باپ اپنی اولاد کو بیچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جہاں ملکوں کا بؤارہ شروع ہوتا ہے تو انسان انسان کو گاجر، مولیٰ کی طرح کاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ ماں باپ کے سامنے بچوں کو ذبح کر دیتا ہے۔۔۔ باپ کے سامنے بیٹی کی عزت لوٹتا ہے۔ کیا رونے زمین پر انسان سے بدتر بھی کوئی درد ہے؟

"کیٹی ڈیڑا" میں نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا۔ "تم ابھی بھلے سوڈ میں انسان کو افسردہ کر رہی ہو" میں اٹھا اور جا کر منہ کے کنارے پر بیٹھ کر چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ پانی زیادہ سرد۔ میں تھا البتہ ٹھنڈا خوب تھا اور اس لیے مجھے بھلا لگ رہا تھا۔ میرا دوران ٹوٹ جیسے ایک خست تن بہت تیز ہو گیا تھا اور آنکھیں جھٹنے لگی تھیں۔ ان پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے سے مجھے سکون مل رہا تھا۔ کیٹی بھی اٹھ کر میرے قریب آ بیٹھی اور وہ بھی چہرے پر چھینٹے مارنے لگی۔

"مسوری منصور ڈیڑا" وہ قبض کے دامن سے منہ پر چھتے ہوئے گویا سب کچھ ذہن سے جھٹک کر تازہ رہ رہتے۔ "در اصل میری نس نس زخمی ہے اور ہر زخم

میں بے پناہ زہر بھرا ہوا ہے۔۔۔ تم جیسا دوست زندگی میں پہلی بار ملا ہے اس لیے ایک تودہ زخم چھیز بیٹھی تھی۔۔۔ اب ہم ابھی ابھی باتیں کریں گے۔۔۔ ارد گرد کھلے ہوئے رنگارنگ پھولوں کی۔۔۔ بہک خرابی سے بھٹی ہوئی اس ندی کی۔۔۔ خوشگوار ہوا سے جھوٹے ہوئے پودوں اور درختوں کی۔۔۔ اور مدت کے بعد سیراب محسوس کرنے والی پانیسی روح کی۔"

"کیٹی! میں نے واپس گھاس پر آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اس لائن پر نہ پڑتیں جس میں پڑ چکی ہو تو یقیناً تم افسانہ نگار ہوتیں۔"

"نہیں۔۔۔ اگر میں اس لائن پر نہ ہوتی تو شاید میں کچھ بھی نہ ہوتی۔" وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی۔ "باتیں تو مجھے اسی لائن کے تجربات نے سکھائی ہیں۔"

مزید کچھ وقت منہ کے کنارے گزارنے کے بعد واپس روانہ ہونے کے لیے ہم گاڑی میں بیٹھیں۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر میں نے بیٹک انداز کر پھیٹک دی اور بستر پر لیجھ کر ہو گیا۔

دوسرے روز بیدار ہونے کے بعد کیٹی نے پوچھا۔ "اب کیا پروگرام ہے؟"

"واپس بہی چلیں گے۔ یہاں ہمارا کام ختم ہو گیا۔ ایک مشن مکمل ہو گیا۔" میں نے جواب دیا۔

بہی پہنچ کر میں کیٹی کو پیسے اپنے دفتر لے جانا چاہتا تھا لیکن گاڑی پارکنگ لائٹ میں کھڑی کر کے ہم اوپر جانے ہی گئے تھے کہ نسواری سوٹ والا ایک دروازہ قد اور پختہ عمر شخص اچانک اندر سے سامنے آ گیا۔ وہ نکمیں شید تھا اور بظاہر اس کا حلیہ کسی معزز اور امن پسند تاجر کا ساتھ لیکن اس کی آنکھیں چغنی کھارہ تھیں کہ وہ کسی اور طرح کا آدمی تھا۔

"ارے۔۔۔ شکستلا۔۔۔! تم کہاں؟" وہ مگر بھوشی سے بولا۔

کیٹی نے سرد نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میں اب شکستلا نہیں کیٹی بول۔۔۔"

"شکستلا ہو یا کیٹی۔۔۔ نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم تو اب بھی تمہارے خادم ہیں۔ پہلے بھی تم ہماری پاس تھیں، آج بھی ہمیں اپنے غم کا غلام سمجھو۔" وہ چپے پر ہاتھ رکھ کر بھلا۔

"احسان مرزا نے من لیا تو تمہاری گردن کٹ کر تمہاری نکھڑی چڑیا گھر کے بندروں کو کھیلنے کے لیے بھجوا دے گا۔" کیٹی بولی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" وہ شخص ہنس۔۔۔ "وہ اب تم سے خفا نہیں ہے۔ حالات بہت بدل گئے ہیں۔ باتیں بھی بدل گیا ہے۔ اندر سے وہ بہت پریشان ہے بلکہ اگر تم میری ایک درخواست مانو۔۔۔ اور چل کر اسے سو تو چاہے وہ ظاہر نہ کرے مگر میں بہت خوش ہو گا۔۔۔"

"آپ کی تعریف؟" میں نے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے کہتی سے پوچھا۔
 "یہ بگا ہے...! احسان مرزا کے خاص آدمیوں میں سے ایک ہے۔" کہتی نے بے
 حتمائی سے بتایا۔

میرے ذہن میں یہ دونوں کی ایک تیز رفتار سی فلم چل پڑی۔ اس دوران کہتی اس شخص
 سے مخاطب ہوئی۔ "مجھے احسان مرزا سے ملنے کا کوئی شوق نہیں لیکن میرے ساتھ یہ جو
 منصور مغل صاحب ہیں... اگر یہ مجھے اجازت دیں گے اور تم انہیں ساتھ لے کر چلنے کی
 ہائی بھرو گے تو ہم چلیں گے۔"

کہتی نے سالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے رضا ہمدی کے سے اظہار کے
 لیے کندھے اچکا دیئے۔ میں اس وقت اس سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھ رہا تھا۔
 اس ویسے ہی ذرا اس شخص کو دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا کہ اتنے برسوں میں اس میں کیا
 تبدیلیاں آئی ہوں گی۔

"کیوں نہیں... کیوں نہیں..." بگا خوشی سے ہونا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں
 گویا مجھے تول لیا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ میں بھی کام کا آدمی تھا۔

پھر وہ بولے۔ "مگر تم دونوں کو میرے ساتھ میری گاڑی میں چلنا پڑے گا۔"
 میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ ہم اس کے پیچھے چل دیئے۔ سڑک کے پرلی طرف سیاہ
 رنگ کی ایک کینڈلک کھڑی تھی۔

میں اور کہتی ہچکچے درد زے کھن کر عقی سیٹ پر پاس پس بیٹھ گئے۔ بگا نے گاڑی
 اسٹارٹ کی اور چند لمحوں بعد گاڑی سڑک پر فرار نے کرنے لگی۔

بگا نہایت مشتاق ذرا نوجوان تھا اور گاڑی بھی بہت عمدہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم میلوں
 کا فاصلہ طے کر گئے۔ چند منٹ کے لیے ہم شہر کی نواحی سڑکوں سے پر شور ٹریفک کے
 اربابان سے بھی گزرے لیکن ایک بار پھر سڑکی علاقے میں آ گئے۔ کئی چھوٹی چھوٹی پرچی
 اور ویران سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد گاڑی ایک قدرے کشادہ اور ہموار سڑک پر منزل
 جس کے آغاز پر ہی "پرائیویٹ" کا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس سڑک کے دونوں طرف
 کھجور کے درختوں کی قطاریں تھیں۔

چند لمحوں بعد ہی مجھے ایک نہیں دکھائی دے گیا۔ وہ عرب، مغل اور مغربی طرز تعمیر کا
 ایک عجیب و غریب امتزاج تھا۔ اس کی تعمیر میں ماربل بے تحاشا استعمال کیا گیا تھا۔ پلیس دو
 منزلہ تھا۔ اصل عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن پر شکوہ تھی البتہ اس کے ارد گرد چار
 دیواری کے اندر بہت وسیع رقبہ چھوڑا گیا تھا۔

عظیم الشان آبپاشی گیت کھلا ہی تھا۔ گاڑی ڈرائیو دے میں داخل ہو گئی لیکن فوراً ہی
 رگٹ مین۔ ایک ایسی آہنی رکاوٹ سامنے آگئی تھی جیسی عموماً ریلوے کراسنگ پر ہوتی

ہے۔ سیٹ کے قریب واقع ایک کینبن سے جو ایک غیر رسمی سا داچ ہاؤس ہی معلوم ہوتا تھا
 ایک شخص نکل کر گاڑی کی طرف لپکا۔ اس کا علیہ چوکیہ اردو یا اس قبیل کے دیگر ملازمین
 جیسا نہیں تھا۔

وہ نہایت عمدہ تراش کے سوٹ میں تھا۔ ٹائی کی جگہ اس نے بولگا رکھی تھی اور یوں
 معلوم ہوتا تھا جیسے چند منٹ بعد ہی وہ کسی ڈنر میں شرکت کرنے والا ہے۔ ہاں حلیے سے
 بے ہوش تھے، سانولا چہرہ دھوپ میں چمک رہا تھا اور بالکل اسی طرح اس کے بوت بھی
 چمک رہے تھے۔

تاہم تمام تر مہذب و وضع قطع اور اچلے پن کے باوجود اس کے چہرے سے اس کی
 اصلیت کا اندازہ کرنے مشکل نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک نہایت سفاک اور شقی القلب
 انسان چھپا ہوا تھا۔ قریب آکر اس نے ذرا جھک کر بگا کی طرف تھلک دیکھی، سترایا اور
 ایک لفظ کے بغیر واپس کینبن میں چلا گیا۔ آہنی رکاوٹ مٹ گئی اور گاڑی آگے بڑھتی گئی۔

اصل عمارت کے قریب فرنٹ پورچ میں گاڑی سے اتر کر ہم ماربل کی چند سیڑھیاں
 چڑھ کر بحرانی دروازوں سے گزر کر دروازے تک پہنچے۔ ایک باوردی ملازم نے بگا کو دیکھ کر
 جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ یہ دروازہ ایک ایسے طویل و عریض ہال کا تھا جس میں ایک
 طرف باقاعدہ دسپین بن ہوا تھا۔ ایک طرف لؤنگ تھا۔ ہال کے وسط میں ایک بیڑوی
 قالین بچھا ہوا تھا، دور سے محض سفید بھاگ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ پھت میں ہلے
 خوبصورت فانوس آویزاں تھے۔ فرش کا جو تھوڑا بہت حصہ قالین سے ڈھکا ہوا نہیں تھا
 پالش شدہ تھا اور مدھم روشنی میں بھی چمک رہا تھا۔

لاؤنج میں سینٹر ٹیبل پر اخبارات، رسالے حتیٰ کہ شیشوں میں ستائیں تک موجود تھیں۔
 اس جگہ کی ترتیب و آرائش نہایت عمدہ تھی۔ دسپین پر ایک خوبصورت اور مستعد سی
 لڑکی بھی موجود تھی جس کے ارد گرد اور سامنے کاؤنٹر پر وہ تمام امانات موجود تھے جو ایک
 دسپین کے پاس ہونے چاہیں۔ وہ بگا کی طرف اکیڑ کر سترائی فیلن اس نے انٹرکام یا
 سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بگا کو غالباً رسمیات کی ضرورت نہیں تھی۔

تاہم لڑکی نے پائل اٹھ کر ایک رجسٹر میں کچھ لکھ لکھا۔ بگا اس کے قریب سے گزرا تو
 اس نے سرگوشی نما لہجے میں بتایا۔ "ہاں تو سوئمنگ پول ہے۔ تم باہر سے ہی گھوم کر
 چلے جاتے۔"

"اب تو اندر آگیا ہوں، اندر ہی سے جاؤں گا۔" بگا نے بھی مدھم لہجے میں جواب دیا
 اور ہمیں ساتھ لیے بڑھتا چلا گیا۔ اس ہال سے گزر کر ہم ایک راہداری میں پہنچے۔ بگا نے
 کسی اور کمرے کا رخ نہیں کیا، میدھا چلا رہا۔ راہداری کے اختتام پر ہمیں ایک بلرملہ بگا
 کو دیکھ کر وہ بھی مسکرایا۔

"انہیں اپنی اہم داری پر لے جا رہے ہوں؟" بھڑکنے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بگا سے پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے تاباس کن کن مقامات پر نئے آدمیوں کی آمد کو پسند نہیں کرتا۔"

"یہ نئے آدمی نہیں ہیں گدھے!" بگا نے اسے ایک طرف ہٹایا اور بڑھتا چلا گیا۔ پچھلے دروازے سے نکل کر ماربل کی چند سیڑھیاں اتر کر ہم کھلے لان میں پہنچ گئے۔ سامنے ہی نہایت خوبصورت بیٹھوی سو منگ پون تھا جس کے کناروں پر دو طرف ڈائیونگ بورڈ اور رنگین چھتریاں نصب تھیں۔ ایک طرف کئی دیہ بنے اور آرام وہ کرسیاں بکھری ہوئی تھیں۔ سو منگ پون کے پرلے کنارے پر ایک ریز بیڈ پر احسان مرزا نیم دراز تھا۔ وہ ذرا بھی تو نہیں بدلا تھا۔ گزرے برسوں نے اس کے سراپا پر اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑا تھا۔ وہ مختصر سا جسم، وہی بندر کی شکل اور وہی چھوٹے چھوٹے چھدرے بال جو پانی میں بھیگے ہونے کے باوجود سیدھے کھڑے تھے۔

چار نہایت کم عمر اور نوخیز لڑکیاں تیراکی کے لباس میں اس کے گرد موجود تھیں۔ ان میں سے دو کسی لوشن سے اس کی مالش اور مساج کر رہی تھیں۔ ایسے مناظر دیکھ کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کرتا تھا۔ کیا عورت اتنی ہی سستی تھی کہ صرف دولت سے خریدی جاسکے؟

بگا نے ہمیں دیر رکنے کا اشارہ کیا اور خود پون کے گرد گھوم کر دوسری طرف چلا گیا۔ احسان مرزا نے ہماری طرف آنکھ اٹھ کر بھی نہ دیکھا وہ صرف بگا کو دیکھ رہا تھا۔ ہم بھی وہاں موجود ہی نہیں تھے۔

"سور کا بچا...!" کہنی اس کی طرف دیکھتے ہوئے غیر محسوس طور پر بڑبڑائی۔ "میں نے اپنی زندگی کے ستر سال اس شخص کی جینٹ چڑھا دیئے۔ نہ چنے کتنی مرتبہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اسے کروڑوں کا فائدہ پہنچایا اور آج یہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا۔" میں خاموشی سے کھڑا یوں میں انگلیاں پھیلاتا رہا اور گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا۔ بگا کئی منٹ تک احسان مرزا سے مصروف گفتگو رہا پھر اس نے ہماری طرف بھی اشارہ کیا۔ احسان مرزا نے صرف ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور دوبارہ بگا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر بگا نے ایک چنڈ بیگ اس کے حواسے کیا۔ وہ غائبانہی صم سے کامیاب واپس آیا تھا اور اس کی تفصیل احسان مرزا کے گوش گزار رہا تھا۔ احسان مرزا نے بیگ کھول کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک پتلی لیکن جیکھی اور تیز مجنونانہ سی آواز نکل۔

نہایت ہی غیر متوقع طور پر وہ بیٹھے بیٹھے ہلکتی ہوئی اس کی ڈٹ اونچا اچھلا اور غریب سے سو منگ پول میں جاگرا۔ وہ پچھلی کی سی تیزی و مشاقی سے سو منگ پول میں چکر کاٹ رہا تھا اور ہاتھ پیروں کو برائے نام جہنم دے کر نہایت تیزی سے تیر رہا تھا۔ کئی بار اس

نے پانی سے سر نکلا اور نیم حیوانی سا تھکے لگایا۔

خوشی کے اظہار کا یہ عجیب ہی طریقہ تھا۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بگا بھی اپنی جگہ کھڑا مسکرا رہا تھا اور چاروں لڑکیاں قابل آمیز سی نظروں سے سو منگ پول کی طرف دیکھ رہی تھیں جیسے ان کا ہم۔ چلے تو وہیں لیٹ کر سو جائیں، ہمارا احسان مرزا سو منگ پول سے نکل آیا۔

لڑکیوں نے اس کا اشارہ پا کر اسے گلاؤں اور سلیر پہنائے۔ وہ بگا کے ساتھ ہماری طرف آیا۔ جب وہ میرے سامنے کھڑا ہوا تو بالکل ہونا معلوم ہو رہا تھا۔ میری طرف اس نے اب بھی نہ دیکھا اور کہنی کو سر پٹا گھورنے کے بعد سوں سوں کرتے ہوئے ہولا۔ "تمہاری صورت دیکھ میں صرف اس بے گوارا کر رہا ہوں کہ تم اس رقت ایک خوشخبری کے ساتھ آئی ہو....."

"اور ہم دونوں تمہاری صورت دیکھنا اس لیے گوارا کر رہے ہیں کہ بگا ہمیں بعد اصرار ساتھ لے گیا ہے۔" میں نے گویا کہنی کی طرف سے جواب دیا۔ "ورنہ ہم میں سے کسی کو تمہارا یہ حسین چہرہ دیکھنے کا اشتیاق نہیں تھا۔"

بگا کا رنگ فق ہو گیا اور ایک لمحے کے لیے تو کہنی کی رنگت بھی متغیر ہو گئی۔ احسان مرزا بندر کی طرح خوشیاں۔ پھر اس نے براہ راست میری طرف دیکھا۔ اس کے پتے پتے ہونٹ نیم واتھے اور ان پر ایک نیم حیوانی سا کھچاؤ تھا۔ ان کے عقب سے اس کے چھوٹے چھوٹے چھدرے لیکن نوکیلے سے دانت یوں جھانک رہے تھے جیسے کسی بھڑپنے نے شکار کی بو سونگھ لی ہو۔

اس نے مجھے یوں سر پٹا دیکھا جیسے فیصلہ کر رہا ہو کہ میرے پارچے بنوانے کے لیے کونسا طریقہ موزوں رہے گا۔

"مرزا جی!" کہنی جلدی سے بول اٹھی۔ "شاید آپ کو یہ جان کر خوشی ہو کہ یہ نوجوان کون ہے... یہ وہی ہے جس کا آپ نے اسٹیج پر جوڑو کرائے کا مقابلہ دیکھا تھا اور اسے تنظیم میں شامل ہونے کی دعوت بھی دی تھی، آج کل یہ بہت بڑا برس میں ہے۔"

"منصور مغل...؟" احسان مرزا اپنی پلکوں سے محروم آنکھیں پھپکاتے بغیر ایک تک میری طرف دیکھتے ہوئے خودکامی کے سے لمحے میں بڑبڑایا اور میں اس کی یادداشت پر دنگ رہ گیا پھر اس نے یہ کہتے ہوئے اور بھی حیران کر دیا۔ "لیکن مجھے اس میں کچھ ایسی تبدیلیاں نظر آرہی ہیں جو نہیں ہونی چاہیے تھیں۔ بے شک یہ اس وقت کس تھا مگر اب جوان ہو گیا ہے لیکن اب ایسی بھی کیا تبدیلی۔ اس وقت اس کے بال بھورے تھے اب سیاہ نظر آ رہے ہیں۔ اس وقت اس کی ناک کے قریب مس نہیں تھا۔"

"بال میں نے ڈال کیے ہیں۔ مس مصنوعی ہے۔" میں نے اپنے لیے میں قدرے

”شکریہ...! میں جیتا نہیں ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہمت خوب!“ وہ بولا۔ ”تم میں وہ تمام خوبیوں موجود ہیں جو میں اپنے کسی پسندیدہ ترین آدمی میں دیکھنا چاہتا ہوں اور جو مجھے ابھی تک نہیں ملا۔“

جام بولیں، آؤںس ٹرنے، سوڑا اور ساقین وغیرہ نرائی پر سجائے وہ میرے مقابل آئیٹھا۔ چند گھنٹ بھرنے کے بعد وہ بولا۔ ”تمہیں اندازہ ہوگا میرے پاس بے پناہ ہمارے تجربے کار اور وقار ساتھیوں کی کی نہیں لیکن ایک ایسے ساتھی کی کی مجھے ہمیشہ محسوس ہوتی رہی ہے جو محض اسلحے اور مردی طاقت کے بل پر ہی نہ چلتا رہے، وہ خود بھی اپنی ذات میں ایک متعظیم، ایک گروہ ہو۔ اس کے پاس بے پناہ ذہانت بھی ہو اور ایک ایسا ہمہ صفت انسان ہو جو وقت پڑنے پر کسی بحران سے نکل سکے۔ کسی پلغار کا مقابلہ کر سکے۔ ایسے ساتھی کی مجھے عارضی ضرورت نہیں۔ میرے بعد شاید میرا جانشین بھی وہی ہو کیونکہ میری کوئی اولاد تو ہے نہیں اور میں صاحب اولاد بننے کا کوئی ارادہ بھی نہیں رکھتا۔ یہ ضرورت مجھے ہمت عرصے سے ہے لیکن کچھ عرصے سے تو یہ ضرورت ہمت شدید ہو گئی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی جوں بہ لب مریض کو خون کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”اگر تمہاری نگاہ انتخاب مجھ پر ہے تو مجھے افسوس ہے کہ تمہیں مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔

بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اود... تو گویا تم واقعی منصور مغل ہو۔“ احسان مرزا مسرت سے چلایا۔ وہ اپنی توہین کو کبدم بھولی گئی۔ ”میں تو میں سوچ رہا تھا کہ احسان مرزا سے اس لمحے میں گفتگو کرنے کی جرات کون کر سکتا ہے! ہمت خوب... ہمت خوب... میں بتا نہیں سکتا کہ تمہیں دوبارہ دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہو رہی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی دیہاتی باپ کا بیٹا واپس پائ کر آئے ہو۔ معصوم نہیں کیوں مجھے تم سے لیکن انیت کی کیوں ہوتی ہے۔ افسوس! اپنے لیے تمہاری سفارش لے کر آئے تو میں اسے تعظیم میں نہایت عزت سے دوبارہ رکھنے کو تیار ہوں۔“

”نہیں... اسے رکھنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اسے میں نے رکھ لیا ہے۔“

”اود...“ احسان مرزا نے شریر نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”تم نے اس جوانی ہی میں عورتیں رکھنی شروع کر دیں؟ پھر تم نے بھی کوئی تنظیم بنائی ہے؟“

”نہیں۔“ مجھے نہ تو عورتیں رکھنے کا شوق ابھی پیدا ہوا ہے اور نہ ہی میں گروہ بازی میں پڑا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں ایک شریف اور جائز کاروبار میں یقین رکھنے والا برٹس مین ہوں۔“

”لیکن یہ لڑکی جائز اور شریفانہ کام تو کوئی نہیں کر سکتی۔“ احسان نے ہونٹ سیڑ کر مسنوی جمید سے کبھی کی طرف دیکھا۔ کبھی کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے غیالت کے آثار ابھرنے لگے لیکن فوراً ہی اس کا چہرہ آثار سے عاری ہو گیا تھا۔

”یہ تو اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔“ میں نے مٹکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا... چلو... چلو اندر چلو۔“ احسان مرزا نے میری کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ بگائی طرف مرزا ”اس کو ٹیکائے پر پہنچا دو۔“ تمہیں معصوم ہے میں اپنی رہائش گاہ پر اس قسم کی چیزوں کی چند منٹ سے زیادہ موجودگی پسند نہیں کرتا۔ شکستہ کو گیسٹ ہاؤس میں لے جاؤ اور اس کے آرام و تسکین کے لیے خوبصورت ہدایات دے دو۔ یہ دونوں کم از کم آج تو یہیں رہیں گے۔ اور منصور! تم میرے ساتھ اندر چلو۔ میں تم سے تعالیٰ میں بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

بگائی کو ساتھ لے کر ایک طرف چل گیا اور میں احسان مرزا کے ہمراہ اندر چلیا۔ راہداری میں چند قدم چل کر اس نے بائیں ہاتھ پر نیک دروازہ کھولا۔ یہ ایک طویل و عریض آرام دہ پیراستہ کمرہ تھا۔

میں ایک نرم صوفے میں دھنس چلا تو احسان مرزا دیوار گیر پار کی طرف بڑھ گیا اور اپنے لیے جام تیار کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے لیے کیا بناؤں؟“

میرا خیال تھا کہ میرا کورا سا جواب سن کر احسان مرزا کی خوش مزاجی جواب دے جائے گی لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے تاثرات بدلے نہیں تھے۔

”آخر کیوں؟ تمہیں اعتراض کیا ہے؟“ وہ تھل سے بولا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے مزید کہا۔ ”کبھی کی ذہانی میں نے سن لیا ہے کہ تم بہت بڑے بزنس مین بن گئے ہو لیکن میں تمہیں ماضی کی طرح کسی نوکری وغیرہ کی پیشکش نہیں کر رہا۔ میں تو تمہیں اپنا ساتھی بنانا چاہتا ہوں اور وہ بھی اس طرح نہیں کہ تم اپنا کاروبار چھوڑ کر مجھ سے آن ملو۔ نہیں... تم اپنا کاروبار حسب معمول چلاؤ رہو گے، زندگی حسب معمول گزارتے رہو گے۔ مجھ سے تمہارا صرف خفیہ رابطہ ہوگا۔ ضرورت پڑنے پر تم مجھے مشورہ دو گے۔ کبھی کبھی میری کسی خاص الخاص مہم کی قیادت کرو گے۔ کبھی صرف مہم کے انتظامات تمہاری زیر ہدایت ہوں گے۔ بس یہ سلسلہ ہوگا۔ اسے بڑا ہوں نہ سمجھتا اور نہ میں تمہیں متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ تم متاثر ہونے والی چیز نہیں ہو۔ محض تمہاری معلومات کے لیے بنا رہا ہوں کہ ہمیں کتنے بڑے بڑے بزنس مین احسان مرزا کی مدد سے اور تعاون حاصل کرنے کے لیے اس کے پاؤں چاٹنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔“

”منصور! تمام تر ذہانت و چالاک کی کے باوجود دراصل تم اپنی کم عمری کی وجہ سے بعض معاملوں میں غیر ضروری حد تک بے نیاز ہو۔“ احسان مرزا نے اپنا جام دوبارہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں صحیح طور پر اندازہ نہیں کہ احسان مرزا کی رفاقت کا مطلب کیا ہے یہ اس کی جانشینی کی جگہ پر رکھتی ہے۔ جب میں کسی کو جانشین بنانے کی بات کرتا ہوں تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی بادشاہ ایک بہت بڑی سلطنت کسی کے سپرد کرنے کی بات کر رہا ہو۔ میری رفاقت کا مطلب کئی صوبوں کا غیر رسمی اقتدار حاصل ہو جانا ہے۔“

”مجھے بخوبی اندازہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ دراصل میں بالکل صاف ستھری لائن پر چل رہا ہوں۔ میرا جتنا بھی بزنس ہے، قانونی اور جواز ہے۔ مجھے بے شک تمہارے مقابلے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ محض چند ایک حکام سے میری

تسامی ہے لیکن وہ سب میری عزت کرتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا نام ایک اسمگلر کے نام سے منسوب ہونے کی افواہیں کسی کے کانوں تک پہنچیں، خواہ یہ افواہیں زیر زمین حلقوں تک ہی محدود ہوں۔ برا مت مانا۔۔۔ تمہیں خواہ کتنی ہی طاقت حاصل ہے لیکن تمہاری شہرت تو ایک بہت بڑے اسمگلر کی ہے نا۔۔۔“

میری بات اس نے نہایت تھل سے سنی اور مسکرایا۔ ”بات تمہاری درست ہے لیکن تمہاری معلومات میں اضافے کے لیے بتانا چلوں کہ مجھ پر آج تک نہ اسمگلنگ کے الزام میں کیس چلا ہے اور نہ ہی مجھے کبھی گرفتار کیا گیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”البتہ میرے خلاف دو بہترے کیس چلے ہیں۔ میرے جائز کاروباروں میں ٹیکس کے معاملات میں مجھ سے اختلافات ہوئے اور کیس بنے۔ جائیداد اور لین دین کے معاملوں میں کبھی کبھار براہ راست میرے خلاف مقدمہ بنا۔ تیر گرفتاری سے کار چلانے میں میرا چالان ہوا۔ اس طرح کے بیسیوں معاملات میں مجھے قانونی کارروائیوں سے واسطہ پڑا لیکن مجھ پر اسمگلنگ کے الزام میں کبھی مقدمہ قائم نہیں ہوا۔ اس معاملے میں کبھی میرے خلاف ذرہ برابر ثبوت حاصل نہیں کیا جاسکا اور اگر کسی بہت ہی پیٹلے افسر نے بغیر ٹھوس بنیادوں کے میرے پیچھے پڑنے کی کوشش کی تو قانونی یا غیر قانونی کسی نہ کسی طریقے سے اس کا پتا صاف ہو گیا۔“

وہ ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر یوں مسکرایا گویا اپنی گفتگو سے خود ہی لطف اندوز ہو رہا ہو۔ پھر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ایک بار مجھے پتا چلا کہ میرے خلاف وفاقی سطح پر تحقیقات ہو رہی ہے اور مجھے کسی نہ کسی طرح گھیرنے کا پروگرام بنایا جا رہا ہے۔ وہ کپاس کی چٹائی کا سیزن تھا۔ میں نے کئی صوبوں کی منڈیوں میں اپنے آدمی پھیلا دیے۔ کپاس منڈیوں سے نکلنے ہی نہیں پائی۔ وہیں چند روپے زیادہ کے ریٹ پر خرید لی گئی اور کرائے کے گوداموں میں پھنچا کر مقفل کر دی گئی۔ ٹیکسٹائل کی صنعت سے وابستہ افراد نے جب منڈیوں کا رخ کیا تو روٹی کا پھایا تک کیس موجود نہیں تھا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ کیا طوفان مچا تھا۔ ٹیکسٹائل کی صنعت خراب ہو گئی۔ ملوں کو نالے لگ گئے۔ مزدوروں کی ہڑتالوں سے بنکاموں کا سیلاب اٹھ آیا۔ صوبائی سیکرٹری بھاگے بھاگے میرے پاس آئے۔ میں نے بڑے تھل سے ان کی تقریریں سنیں اور صرف اتنا کہا کہ وفاقی سیکرٹریٹ میں میرے متعلق ایک فائل پڑی ہے۔ وہ لا دیجئے، اس سے اگلے دن کپاس منڈیوں میں آجائے گی۔ صوبائی سیکرٹریوں نے مرکز میں جا کر رونا بیٹنا چلایا کہ صوبوں کی معیشت کا معاملہ ہے اور صرف معیشت ہی نہیں امن و امان بھی تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ قصہ مختصر یہ کہ فائل مجھے مل گئی اور تحقیقات وہیں کی وہیں رو گئیں۔ مجھے صرف ایک ڈیرہ کروڑ کا خسارہ اٹھانا پڑا تھا لیکن اس کے بعد سے ابھی تک تو کسی کو کچھ کرنے کی جرات نہیں ہوئی البتہ ذخیرہ اندوزی کے خلاف پارلیمنٹ میں ایک نیا بل ضرور پاس ہوا جس کے بعد ذخیرہ اندوزی کے خلاف

تو انہیں مزید سخت کیے گئے لیکن میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اب بھی چاہوں تو ایک اشارے سے معیشت اور امن و امان و درہم برہم کر سکتا ہوں۔ مثلاً ملک ایک ایسی چیز ہے جسے اگر میں کچھ نقصان برداشت کرتے ہوئے صرف ایک صوبے کی منڈیوں سے بھی اٹھا کر سمندر میں پھینکوا دوں تو میرے یا میرے ایجنٹوں کے خلاف ذخیرہ اندوزی کا کوئی ثبوت نہیں ہوگا اور ہانکار بج جائے گی۔۔۔ تو میری جان۔۔۔ یہ بادشاہت یونہی نہیں چل رہی۔“

”مجھے یہ سب کچھ سن کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔“ میں نے قدرے مبالغے سے کام لیا البتہ اپنی معنومات میں مزید اضافے کے لیے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اپنی اس بے پناہ طاقت اور جاہ و جلال کے باوجود تمہیں اپنی بادشاہت میں مجھ جیسے ایک حقیر آدمی کی ضرورت کیوں ہے؟“

”ہاں۔۔۔ میں تمہیں یہی بتانے چ رہا تھا۔“ وہ جام ہاتھ میں اٹھائے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ”مسائل بہت بڑے ہیں۔ بادشاہت جتنی وسیع ہو چکی ہے، مسائل بھی اتنے ہی وسیع ہیں۔ کچھ عرصے سے صورتحال کچھ ایسی ہے کہ فیصلوں اور انتظامات کے معاملے میں تمہاری ذات کو ناکافی محسوس کر رہا ہوں اور پھر یہ لائن کچھ ایسی ہے کہ ادھر آپ سے ذرا سی چوک ہوئی، کسی ساتھی یا کسی عہدیدار کے انتخاب میں ذرا سی غلطی ہوئی اور آپ کے۔۔۔“ اس نے ہاتھ سے گردن کٹنے کا اشارہ کیا۔ ”بہر حال یہ معاملات تو جوں توں کر کے چلتے ہی رہتے ہیں لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ میری بادشاہت کو خفہ لاحق ہو گیا ہے۔ میری سلطنت کی دیواریں لرز رہی ہیں۔“

اس کے چہرے پر فکر مندی جھلک آئی تھی اور وہ کھڑکی کے قریب کھڑا جام کو دھیرے دھیرے اٹھکوں میں گھما رہا تھا۔

”کیا کوئی دوسرا گروہ تمہارے مال پر ہاتھ ڈالنے لگا ہے؟“ میں نے کہا۔

”جی تو اصل مسئلہ ہے۔“ وہ میری طرف دیکھ کر مزید انداز میں مسکرایا۔ ”اگر وہ شخص ایک گروہ ہوتا تو احسان مرزا کب سے اس کا شیرازہ بکھیر چکا ہوتا۔ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔۔۔ تم نے بھی مانیا کہ بارے میں کچھ سنا ہے؟“

”سنا تو نہیں۔۔۔ میں نے اس کے بارے میں پڑھا بہت ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہت خوب۔۔۔“ اس نے ایک گھونٹ بھر کر کہا۔ ”تو پھر تمہیں اس تنظیم کی طاقت، بہت اور دست کا بھی اندازہ ہوگا لیکن وہ شخص اندازہ ہی ہوگا، حقیقت سے آگاہی نہیں۔ اعلیٰ سے یہ تنظیم اچھی تھی اور جس طرح اس نے امریکہ، انگلینڈ، فرانس اور چند ایک یورپی ممالک میں پینے گاڑے ہیں، اس کا کچھ کچھ تمہیں علم ہی ہوگا اور یہ بھی تم پڑھ چکے ہو گے کہ ترقی یافتہ ممالک اس نظام کے سامنے کس طرح بے بس ہو چکے ہیں۔ تمہیں معلوم ہی

ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں قانون کی بالادستی کا نظام ہی اس تنظیم کے لیے امرت بن گیا۔ ترقی یافتہ ممالک میں کسی جرم کے ثبوت کے بغیر تو بڑے سے بڑا لٹ صاحب بھی کسی غریب سے غریب آدمی کو نہیں پکڑ سکتا۔ اپنے ہندوستان والا حساب تو ہے نہیں کہ غریب آدمی دیکھا تو سپاہی نے بھی چار بھانپڑ رسید کر دیئے یا تفتیش کی زد میں آیا تو تھانے سے ہاتھ پاؤں تڑوا کر نکلا۔ وہاں تو پولیس ریڈ کے پاسپ سے کسی بہت ہی خطرناک اور سخت جان مجرم سے کچھ اگلاوٹے کے لیے دو چار ضررین لگا دیتی تھی تو اب اسے بھی وحشیانہ اور غیر انسانی تشدد قرار دے کر ختم کروا دیا گیا ہے۔ قانون کی اس بالادستی سے جہاں ان ملکوں نے بے پناہ ترقی کی ہے وہیں اس قسم کی لچک کی آڑ میں ہی درحقیقت مانیا پروان چڑھی ہے۔“ وہ جام سے گھونٹ بھرنے کے لیے خاموش ہو گیا۔

”یہ سب کچھ تو مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں شخص یاد دہانی کے طور پر بتا رہا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”دور ابتداء سے اصل موضوع پر آ رہا ہوں۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس تنظیم کا نظام بالکل اسی طرح چلتا ہے جس طرح حکومت برعالمیہ کا نظام اس وقت چلتا تھا جب اس کی سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا یعنی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہ جانے کتنے ملکوں پر اس کی عملداری تھی۔ مانیا کی بھی جہاں جہاں عملداری ہے، وہاں اس کے ہاتھوں کچے ہوئے پولیس افسروں، ججوں، سیاستدانوں اور انتظامیہ کے عہدیداروں کا تو کچھ شمار ہی نہیں ہے۔ باقاعدہ کارکنوں کے علاوہ ہر علاقے کا انتظام چلانے کے لیے ایک بہت ہی سرور آورہ قسم کا خاندان مقرر ہوتا ہے جس کا کوئی خاص نام نہیں ہوتا۔ اسے بس ”فیملی“ کہا جاتا ہے۔ فیملی اس میں سے ایک شخص مانیا کو علاقائی طور پر قانونی حکمت عملی کے مطابق چلاتا ہے۔ اس شخص کا بھی بظاہر کوئی خاص عہدہ نہیں ہوتا۔ اسے بس ”کنٹرولر“ کہا جاتا ہے۔ بظاہر فیملی بڑی عزت و آبرو کی زندگی بسر کرتی ہے اور ان سے زیادہ حلیم الطبع اور پابند قانون شہری بڑی مشکل سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔“

”یہ بھی مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔

”نئی بات میں تمہیں اب بتانے لگا ہوں۔“ احسان مرزا نے کہا اور تپائی کے قریب آکر اپنے لیے نیا جام تیار کرنے لگا۔ ”نئی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں بھی ”فیملی“ کا تقرر ہو گیا ہے۔“

”نہیں۔۔۔“ میں اچھل پڑا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔ بہت سمندر پار۔۔۔“

”برطانوی سرکار بھی سات سمندر پار اور نہ جانے کن کن صحراؤں کے پار اور نامریک براعظم افریقہ کے بھی نہ جانے کن کن دور افتادہ گوشوں میں اپنے زیر نگیں ملکوں کا نظام چلا رہی تھی۔“ احسان مرزا نے میری بات کاٹ کر کہا اور جام تیار کر کے ایک بار پھر ٹھٹھٹے

لگا۔ اس لیے مافیا جیسی تنظیم کے لیے بھی یہاں فیملی کا تقرر کر دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ جس طرح انگریز ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھ کر وہ ڈا کیا تھا، اسی طرح مافیا کو بھی اپنے نقطہ نظر سے یہ ملک سونے کی چڑیا ہی لگا ہوگا اور اس نے دیکھا ہوگا کہ جرم کے فروغ کے لیے یہاں کی فضا بڑی سازگار اور زمین بڑی زرخیز ہے اس لیے اس کے بچے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ فیملی کا سب سے پہلا کام ہوتا ہے کہ سب سے پہلے وہ ان لوگوں کو ہتھ کر کے رکھ دے جو جرائم کی دنیا میں اس کی ہر ہماری کر سکتے ہوں یا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے ہو سکتے ہوں۔ قانونی اداروں کو ہموار کرنے کی طرف وہ بعد میں توجہ دیتی ہے۔۔۔۔۔

”اس حکمت عملی کے مطابق فیملی کی نظر سب سے پہلے تم پر پڑی ہے۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”تم بالکل صحیح سمجھتے۔“ احسان مرزا بولا۔ ”میری سلطنت پر بڑے بھرپور انداز میں چاروں طرف سے حملے کیے جا رہے ہیں۔ میرے بہترین آدمیوں کو چن چن کر مارا جا رہا ہے۔ میرا مال لوٹا جا رہا ہے۔ میری بولس ڈیوٹی جا رہی ہیں۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو مافیا کی دہشت سے ہی ملک چھوڑ کر بھاگ چکا ہوتا لیکن میں ڈٹا ہوا ہوں اور آخری دم تک ڈٹا رہوں گا۔ اس شخصیت کے سلسلے میں تصادم کے جو واقعات قانونی اداروں کے علم میں ہیں ان میں ان کا کردار کسی قدر لاشعری کا سا ہے۔ حکومت کو یہ تو معلوم نہیں کہ دوسری قوت کو درحقیقت مافیا کی پشت پناہی حاصل ہے۔ وہ اسے محض کوئی دوسرا گروہ سمجھتی ہے اور اندر ہی اندر خوش ہے کہ چلو اس طرح دو بڑے گروہ آپس میں ٹکرا کر ختم ہو جائیں گے۔ میرے مسائل بہت بری طرح الجھ گئے ہیں۔۔۔۔۔ ماں اور جانی نقصان تو جو ہو رہا ہے، ہو رہا ہے لیکن اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کارکنوں میں خوف و ہراس اور بددلی پھیل رہی ہے۔“

”لیکن تم اپنی جس طاقت و دہشت کا نقشہ کھینچ رہے تھے اس کی مناسبت سے تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم فیملی پر براہ راست چڑھ دو۔ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ مروا دو سب کو۔۔۔۔۔“

”یہاں آکر تو مسئلے کی تان ٹوٹتی ہے۔“ احسان مرزا نے ایک طویل آہ بھر کر کہا۔ ”ایک تو مافیا نے فیملی کا تقرر اتنا صحیح سمجھ کر کیا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے بلکہ ایسا معنوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اس فیملی کو پیدا ہی شاید اس مقصد کے لیے کیا تھا۔ کسی زمانے میں وہ سبے پناہ طاقتور و مضبوط فیملی رہی ہے۔ پوری ایک ریاست کا نظام اس کے سربراہ کے ہاتھ میں رہا ہے اور کردار کے اعتبار سے وہ پوری طرح مافیا کے مطلب کا آدمی تھا۔ میں بھی بہت برا آدمی ہوں لیکن اس کی تو شاید کچھ سات پشتوں میں بھی کوئی اچھالی

کسی کو چھو کر نہیں گزری۔ بہر حال۔۔۔۔۔ میرے لیے یہ بھی کوئی اتنا اہم مسئلہ نہیں تھا کہ فیملی بہت طاقتور ہے اور اس کے پیچھے مافیا ہے۔ میں اس کے باوجود چڑ کر شاید کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا لیکن فیملی صرف طاقتور ہی نہیں جا کی۔ کار بھی ہے۔ اسے میری قوت کا اندازہ تھا۔ لہذا عملی طور پر میدان جنگ گرم کرنے سے پہلے اس نے بعض ضروری انتظامات مکمل کیے اور نئی یافتہ ملکوں میں سرگرم عمل مافیا کی ٹیموں کے برعکس یہ فیملی ایک طرح سے اندر گراؤ پٹی چلی گئی۔ کھانے کو تو یہ فیملی ہی کھلاتی ہے لیکن درحقیقت یہ صرف دو باپ بیٹا ہیں۔ میں ان دونوں کو اس دلت سے اچھی طرح جانتا ہوں جب انہیں فیملی کا ”عزازت“ نہیں ملا تھا لیکن کچھ عرصہ پہلے یہ دونوں میری نظروں سے ہوں اور پھل ہو گئے ہیں گویا کبھی دنیا میں تھے ہی نہیں۔ اب مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے کہ مافیا کی فیملی کو کسی ہے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ان کا جو آدمی بھی ہمارے ہاتھ لگا ہے اس پر تشدد کر کے کچھ معلوم کرنے کی کوششیں اب تک بے سود رہی ہیں۔ مافیا کے نظام میں اس قسم کے سقم کی گنجائش نہیں ہوتی البتہ مافیا کی طرف سے مجھے پیغام مل چکا ہے کہ مجھے تیار رہنا ہے۔ ایک روز سینٹ کے باپ میں لٹا کر دونوں طرف کنکریٹ بھر کے سمندر میں پھینک دی جائے گا۔ اگر میں امریکہ میں ہوتا تو اب تک ایسا کیا بھی جا چکا ہوتا۔ بہرحال مجھے اپنے انجام کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میری سلطنت بکھرنے اور میرے ٹھکانے لگ جانے کے بعد فیملی منظر عام پر آجائے گی، اطمینان سے حکومت کرے گی اور مافیا کے پاؤں ہندوستان میں بھی خوب مضبوط کر لے گی۔“

”آخر وہ فیملی ہے کون سی؟“ میں نے پوچھا۔

”نواب شرافت علی خان اور اس کا سب سے بڑا بیٹا۔“ احسان مرزا نے ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

”نواب شرافت علی خان۔۔۔۔۔!“ میرے طلق سے سرسراہٹ ہوئی سی آواز اٹھی اور میں نے اختیار الجھ کر لیا۔

مجھے احساس ہوا کہ احسان مرزا مجھے جیب ہی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے اسے مجھ سے اس قسم کے رد عمل کی توقع نہیں تھی کیونکہ اس کے خیال میں میں کسی بھی بات پر حیران یا خوفزدہ ہونے والا انسان نہیں تھا اور پھر اس کی توقع کے مطابق تو نواب شرافت علی کا نام میرے لیے اجنبی ہی ہونا چاہیے تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ یہ نام میرے لیے کیا معنی رکھتا ہے۔

”تاہم میں نے حتی الامکان پھرتی سے دوبارہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا نام بتایا تم نے؟“

”نواب شرافت علی۔۔۔۔۔“ احسان مرزا نے جواب دیا۔

”بعد۔۔۔۔۔“ میں نے مصنوعی اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ایک مگرمی سانس لی۔ ”میں

سمجھا تھا کہ تم نے نواب سلامت علی کا کہا ہے، اس لیے مجھے حیرت ہوئی تھی کیونکہ نواب سلامت علی میرے ایک دوست کے والد تھے لیکن وہ تو بے حد شریف آدمی تھے اور ویسے بھی وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

”اوہ۔۔۔۔۔“ احسان مرزا خوشدلی سے مسکرایا۔ میں نے اپنے تاثرات پر بہت جلد قابو پایا تھا ورنہ وہ ہنسنے لگا ہوتا تھا۔ جب سے میں نے اپنے جذبات و احساسات پر قابو رکھنے کی مشق شروع کی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ میرا رد عمل اتنا واضح ہو گیا تھا۔ بہر حال بات بن ہی گئی تھی۔

میں نے ذہن پر زور دینے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے میں غائبانہ طور پر نواب شرافت علی کو بھی جانتا ہوں۔ لیکن میری معلومات کے مطابق تو وہ بہت بڑا نواب ہے۔ بہت بڑی جائیداد مالک ہے۔۔۔۔۔ بے پناہ دولت ہے اس کے پاس۔ اسے بھلا مافیا کا آڑ کار بننے کی کیا ضرورت تھی؟“

”تمہارا یہ سوال بڑا اہم ہے اور مجھے قدرے تفصیل سے اس کا جواب دینا ہو گا تاکہ میں منظر شمارے ذہن میں محفوظ رہے۔“ احسان مرزا نے جام سے ایک بڑا سا گھونٹ بھرنے کے بعد گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ ”سب سے پہلی بات تو یہ کہ نواب شرافت علی جتنا بڑا زمیندار ہے یا یوں کہو کہ جتنا بڑا زمیندار تھا، اتنی ہی بڑا اس کا خاندان ہے۔ اس کی غیر شرعی بیویوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا، تاہم اس کی شرعی بیویوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی جن میں سے بہت سی بیویوں کو وہ بقیں روپے آٹھ آنے حق مردے کے طلاق بھی دے چکا تھا لیکن بہت سی عورتیں نمایاں یا بڑے خاندانوں سے بھی تھیں یا بعض ویسے ہی اچھی شرائط پر نواب سے بیاہی گئی تھیں۔ غرضیکہ اس طرح نواب کی اولاد کا سلسلہ بھی گویا لامحدود سہا ہے۔“

”ادھر سرکار نے جب زرعی اصلاحات کا غوغا مچایا اور بڑی جاگیریں ضبط ہونے کی افواہ گرم ہوئی تو نواب نے جاگیریں اور جائیداد تقسیم کر کے بقدر حصہ اپنی اولادوں کے نام کرنی شروع کر دی۔ اس سلسلے میں اس کے بعض سرکش بیٹوں اور بیگمات کا دباؤ بھی اس پر کافی عرصے سے بڑھ رہا تھا۔ جائیداد غیر تقسیم ہونے کے بعد نواب کی حالت کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی جیسے باقی سکر کر چھوٹا بن گیا ہو۔ حالانکہ روپے پیسے کی اب بھی اس کے پاس کوئی کمی نہیں آئی تھی لیکن وہ جو ایک ہوس ہوتی ہے نا۔۔۔۔۔ بڑے بڑے خطوں پر حکومت کرنے کا بڑے بڑے علاقوں کا حاکم کھانسنے کی۔۔۔۔۔ یہ انسان کو قناعت نہیں کرنے دیتی۔ یہی ہوس قتل از تارخ کے دور سے بادشاہوں کو دوسرے ملکوں پر چڑھائی کرنے پر اکساتی رہی ہے اور یہی ہوس درجہ بدرجہ چٹلی سے چٹلی تک کسی نہ کسی روپ میں موجود رہتی ہے۔ ایک تو اس ہوس نے نواب شرافت علی کو بے چین رکھا ہو گا اور مافیا کی ”فیملی“ کے طور پر

تقرر کی پیشکش سن کر اس کی رال ٹپک پڑی ہوگی کیونکہ فیملی بننے کا مطلب بھی ایک الگ ہی انداز سے اقتدار حاصل ہونا ہے اور اس کے ساتھ ہی بے اندازہ دولت کا دریا بھی بہتا چلا آتا ہے۔ فیملی کے اشارات پر بڑے بڑے کام ہونے لگتے ہیں۔ وہ سیاست پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اور یہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ شرافت علی مزاجاً مافی کا آدمی ہے۔

اس سے شاید زندگی میں کبھی بھول کر بھی کوئی اچھا کام سرزد نہیں ہوا۔ مثلاً اس کے مقابلے میں خود میں بھی بہت برا آدمی ہوں۔ میں جو کچھ بھی بنا ہوں، بہت برسے پیٹھے سے بنا ہوں لیکن کبھی کبھی جیسے خود بخود ہی اندر سے کوئی نیکی پھوٹ پڑتی ہے۔ خود شناسی سے قطع نظر بتا رہا ہوں کہ میرا ہر بڑے شہر میں کسی نہ کسی نام سے کوئی ٹرسٹ قائم ہے جس کی آمدنی سے یتیموں کو وظیفے ملتے ہیں۔ غریب طالب علموں کی لیسس ادا ہوتی ہیں۔

ایسے ہی ایک ٹرسٹ کی ”آؤ“ میں نے بھی میں نے بمبئی میں کئی سال پہلے آٹھ سو نہایت سیٹے فلیٹس ان لوگوں کے لیے بنوائے تھے جو فٹ پاتھوں پر رہائش پذیر تھے۔ یہ خیال شاید مجھے اس لیے آیا تھا کہ میں بھی فٹ پاتھ پر پیدا ہوا تھا۔ بہر حال حکومت نے سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اس پروجیکٹ کے رفاہی پہلو کی طرف دھیان دیے بغیر اس پر تمام مروجہ ٹیکس لگا دیئے تھے۔ بہر حال میں یہ مثال اس لیے دے رہا ہوں کہ مجھ جیسے گناہگاروں سے بھی کوئی نہ کوئی اچھا کام سرزد ہو ہی جاتا ہے لیکن میں نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نواب شرافت علی سے کوئی اچھا نیکی غلطی کے طور پر بھی سرزد نہیں ہو سکتی۔

نواب کی شریف اولادیں اپنے اپنے حصے لے کر ادھر ادھر بکھر چکی ہیں۔ اس کے کچھ بیٹے بیٹیاں دوسرے ملکوں میں رہائش اختیار کر چکے ہیں۔ بہر حال ہمیں شریف اولادوں سے کوئی غرض نہیں، قضاوتی بڑ نواب اور اس کا پیدا ہونا ہے۔

وہ تمام دھندے جو مافیا میں کرتی ہیں، ان کی سربراہی میں ہو رہے ہیں۔ ان کے بہت سے آدمی میرے آدمیوں کے ہاتھوں اور ہارے بہت سے آدمی ان کے آدمیوں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ گینگ وار چلتی رہتی ہے۔

”ہندوستان میں اب زیر زمین دنیا میں ہم دو حق بڑی طاقتیں ہیں اور ہم میں چونکہ اتحاد نہیں ہو سکتا، اس لیے ہم میں سے کوئی ایک ہی ہتی رہے گا۔ میرا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ میرے پاس لڑاکے تو بہت اونچے درجے کے موجود ہیں لیکن انہیں آدمیوں کی میرے پاس سخت کمی ہے۔ ایسے لوگ جو سربراہی کر سکیں، سربراہی صرف مجھے ہی کرنا پڑتی ہے۔ شروع ہی سے میں نے اپنا نظام کچھ ایسا بنایا تھا کہ چھوٹے سے چھوٹا معاملہ بھی میری نظر سے گزرے بغیر سرانجام نہ پائے۔“

یہی نظام اب میرے لیے تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے۔ تھا میری ذات اب تمام محاذوں

پر لڑنے کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر اسی رفتار سے میرے آدمی مرتے رہے تو میرے پاس نوکام کے آدمی ہیں، وہ بھی رفتہ رفتہ میرا ساتھ چھوڑ کر فرار ہونے لگیں گے۔ ان مسائل میں گھرا ہوا ہوں میں....“ وہ میری طرف دیکھ کر عجیب، مجبور سے انداز میں مسکرایا۔ ”اس لیے مجھے تم جیسے ایک ساتھی کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔“

وہ خاموش ہو گیا اور اپنے لیے نیا جام تیار کرنے لگا۔ ”یا تمہارے خیال میں مجھ میرا ساتھ مل جانے کے بعد تمہارے حالات میں انقلاب آجائے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں اتنا مجھے یقین ہے۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میرے وجدان نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔“

میں ہنس دیا لیکن وہ بدستور سنجیدہ رہا۔ پھر اس نے جام اٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ”کیا کہتے ہو؟“ وہ اپنی آنکھوں کو ہر جذبے سے عاری رکھنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا لیکن آنکھیں بڑی چغل شور ہوتی ہیں، اس کی آنکھیں بھی چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا ہے۔

”چاہو تو چند دن غور و خوض کر کے جواب دے دو۔“ اس نے کہا۔

”میں دنوں کے حساب سے غور و خوض نہیں کرتا، منٹوں کے حساب سے کرتا ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بلکہ بعض اوقات تو فیصلے پر پہنچنے میں چند سیکنڈ ہی لگتا ہوں۔ احسان مرزا! تم نے دوسری مرتبہ اتنے خلوص سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے کہ اسے قبول نہ کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ آج سے تم مجھے اپنے دوستوں میں شمار کر سکتے ہو۔“

”یا واقعی؟“ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اس نے جام پیٹے کی تپائی پر تقریباً بیچ دیا۔

میں نے انہماک میں سر ہلایا تو وہ بیچ مار کر اچھڑا اور کمرے کے وسط میں جا کودا۔ انداز دینا ہی تھا جیسا میں نے سو منٹ پہلے پر دیکھا تھا۔ اس کی بیچ قلعی غیر انسانی گتھی تھی اور پھلانگ وہ بندر ہی کی سی پھرتی سے اگاتا تھا۔ پھر وہ محو رونا نہیں، حقیقتاً ٹاپنے لگا۔ یہ عجیب سا رقص تھا۔ افریقی قبائلیوں جیسے۔ سختی سے مٹھیاں بچھنے، وہ بازوؤں کو مجھوتانہ انداز میں جھٹکے دے رہا تھا اور اچھل اچھل کر دونوں پاؤں زور زور سے زمین پر مار کر شہم دائرے میں گھوم رہا تھا۔

بالشہر وہ ایک عجیب آدمی تھا۔ جذبات کا اظہار یا تو سرے سے کرتا ہی نہیں تھا اور کرتا تھا تو اتنا بے ساختہ اور بھرپور کہ دیکھنے والے کا خون بھی گرنا جاتا تھا۔ پھر وہ ہنستے ہنستے بے جاں ہو گیا اور قاتلین پر ہنستے لگا۔ اس کے مختصر سے چہرے پر نیس یوں ابھرنے لگی تھیں۔

بالآخر میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا، میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا، اسے کمرے پر کمر کسی گندے کی طرح اٹھایا، ہوا میں دو چار چکر دیے اور ایک جھٹکے سے فرش پر کھڑا کر دیا۔ اس کی ہنسی ختم ہو چکی تھی۔

”شکریہ۔“ اس نے ناک رگڑ کر سون سون کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا اور کاؤچ پر آ بیٹھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے کمرندانہ لہجے میں بولا۔ ”مگر اپنی زندگی کے اس نہایت پر مسرت موقع پر کس قسم کے جشن کا اہتمام کروں؟ تم ہی کچھ بتاؤ۔ کسی قسم کی فرمائش کرو، سمجھ تو کرو۔“

”کسی جشن وغیرہ کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر حتمی لہجے میں کہا۔ ”یہ کوئی قلمی پوائینٹ نہیں ہے۔ ہمیں صرف کام کی بات کرنی چاہیے۔ یہ بتاؤ کیا تمہارے پاس دشتوں کا کوئی بھی سراغ نہیں؟“

”ایک سراغ ہے تو سہی۔“ وہ گھاؤں کی جھبوں میں ہاتھ ٹھونکتے ہوئے بولا۔ ”لیکن پوری طرح یقین نہیں کہ وہ کوئی سراغ ہے بھی یا نہیں۔“

”پھر بھی... بتاؤ تو سہی۔“ میں نے کہا۔

”جانتے سے پہلے تمہیں کچھ دکھانا پڑے گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

اس کمرے سے نکل کر اس کی رہنمائی میں، میں ایک اور کمرے تک پہنچا۔ کمرے میں داخل ہو کر احسان مرزا نے دروازہ بند کر دیا۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا اور ایک الکی سی خاص بو بتا رہی تھی کہ یہ کمرہ یا تو سرے سے استعمال ہی نہیں ہوتا یا پھر کبھی کبھار کھولا جاتا ہے۔

احسان مرزا نے نہایت مدھم سے کھٹکے سے کوئی سوکچ دیا اور کمرے میں روشنی بجھیں گئی۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ مستطیل کمرہ ایک باقاعدہ پروجیکشن روم تھا۔ اس کی ایک دیوار کے آگے بلندی پر ایک کاؤنٹر سا لگا ہوا تھا جس پر تین مختلف سائزوں کے پروجیکٹور نصب تھے۔ دائیں بائیں دونوں دیواروں پر نیچے سے چھت تک شیٹ بنے ہوئے تھے جن میں غالباً ترتیب سے چھوٹے بڑے اسپور اور فلموں کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔

اس کاؤنٹر سے آگے چار قطاروں میں کچھ آرام دہ کرسیاں بھی نصب تھیں اور فرش بتدریج نیچے ہوتا جا رہا تھا۔ سامنے والی دیوار پر ایک باقاعدہ اسٹیج سا تھا جس پر اسکرین تھی۔ اسکرین کے گرد ایک خاص قسم کا سیاہ فریم نظر آ رہا تھا۔ یہ ایڈجسٹ ایبل فریم تھا۔ غالباً اس کے ذریعے خود کار نظام کے تحت اسکرین چھوٹی یا بڑی کی جا سکتی تھی۔

وہ مجھے ساتھ لیے کاؤنٹر کے پیچھے ہی جا کھڑا ہوا۔ کاؤنٹر کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس نے

اس نوجوان کی صورت ذہن نشین ہو گئی ہے ناں؟" احسان مرزا نے پوچھا۔
"ہیشہ کے لیے۔" میں نے جواب دیا۔

"اب ذرا یہ دوسری فلم دیکھو۔" اس نے ہروجیکٹور کے باب کی مدہم روشنی میں ہی فلم تبدیل کی۔

اس بار آٹھ ایم ایم کی چھوٹی سی اسکرین پر جو فلم شروع ہوئی، وہ بلیک اینڈ وائٹ تھی۔ پہلے چند لمبے منٹ درخت دکھائی دیے جن پر رقبہ بھی ہوئی تھی۔ پھر اچانک ہی کیمرو کسی لیے اور نیم تاریک سے ہال میں پہنچ گیا۔ یہ ہال کسی خاتہ سے مشابہ تھا۔ اس کی دیواروں پر مشعلیں روشن تھیں۔

یہ ہال لوگوں سے کچھ بچھا ہوا تھا۔ کچھ دو زانوں بیٹھے تھے اور کچھ لڑکوں۔ ان کے سروں پر مختلف ہواٹ کی اوٹی یا فرنی ٹوپیاں تھیں۔ ان کے لباسوں کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ مجموعی طور پر وہ طے سے پٹھان معلوم ہوتے تھے لیکن پٹھان نہیں تھے۔ ان میں سے جتنی بھی شکلیں واضح نظر آئیں، وہ نیچرل صورتیں معلوم ہوتی تھیں۔ کیمرو ان پر سے ہوتا ہوا ایک بہت بڑے اسٹیج فرامیٹ پر چلا تھا۔

اسٹیج پر دو بڑی بڑی انکشافات روشن تھیں جن سے کثیف سادہ سادہ رہا تھا۔ ان کے درمیان دو پست قد لیکن تناسب اور خوبصورتی کے سانچے میں اعلیٰ ہوئی دو لڑکیاں ہاتھوں میں تھال اٹھائے سر جھکائے کھڑی تھیں۔ ان کے جسموں پر مٹی اسکرٹ سے مشابہ سفید لبادے تھے جو ہلکا ہر بغیر سے ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے تھے ہال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

ان کے درمیان ایک شخص زمانہ غار کے سے انسانوں کا ریمپ کی کھان کا مختصر سا لباس پہنے آتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کا سر اور شاید بھتوں بھی منڈی ہوئی تھیں اور اس کے گول متول چہرے پر بڑی بڑی سرخ آنکھیں کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ بالوں سے بے نیاز اس کا بڑا سا گھٹا ہوا سر اور سفید سفید سا چہرہ کسی بہت بڑے انداز سے مشابہ نظر آ رہا تھا۔

اس کا جسم کسرتی اور چوڑا پٹکا تھا۔ وہ ہاتھ گود میں تھکائے بیٹھا تھا اور اس کے بازوؤں کی پھیلیں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے منکوں والی نئی مالا تھیں تھیں۔ اس کے ہونٹ مل رہے تھے۔ دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں کی حرکت میں تیزی آتی گئی اور ان کے گوشوں سے کف سا پھٹنے لگا۔ پھر اس نے بڑے جوشیلے انداز میں بازو ہر کر سوالیہ نظروں سے حاضرین کے ہجوم کی طرف دیکھا۔

کیمرو ہجوم کی طرف مڑا۔ لوگ جوش و خروش سے بازو ہر کر کچھ کہہ رہے تھے۔ انداز کسی کی ٹانہ میں نعرے لگانے کا سا تھا۔ ان میں سے کچھ اٹھ بھی کھڑے ہوئے تھے۔ کیمرو

کوئی خاص دراز کھولی اور اس میں سے ایک ڈبہ نکلا۔ ڈبے میں دو چھوٹی پھولی فلمیں تھیں۔ اس نے ایک فلم آٹھ ایم ایم کے ہروجیکٹور میں لگائی۔ ہروجیکٹور کا سوئچ آن کر کے اس نے کمرے کی لائٹ بجھ دی۔

چند لمبے بعد بالکی سی سرسراہٹ کے ساتھ پروڈیوٹر چلنے لگا اور اسکرین روشن ہو گئی۔ چند سیکنڈ اسکرین ساں رہی، پھر اچانک ہی اس پر ایک منظر ابھر آیا۔ فلم رٹکین تھی اور یہ منظر کسی کلب کا بھی ہو سکتا تھا اور کسی گھر میں منعقد ہونے والی رقص و سرود کی محفل کا بھی۔ اس میں صرف چند جوڑے پر جوش انداز میں رقص کرتے نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے تنہا رہے تھے۔ فلم کے ساتھ ساؤنڈ نہیں تھی، تاہم صرف نظر آ رہا تھا کہ رقص مغربی موسیقی کی دھن پر تھا گو کہ بیشتر جوڑے ہندوستانی تھے، دو تین سفید فلم لڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

کیمرو ہجوم پر چند لمبے اوجھر اوجھر چکراتا رہا، پھر جیسے خاص طور پر چند جوڑوں پر ساکت ہو گیا۔ پھر میرے قریب ہی احسان مرزا کی آواز ابھری۔ یہ ہمیشگی ہی کے واک ان کلب کا منظر ہے۔ ان جوڑوں کے وسط میں ٹیلے سوٹ میں جو نوجوان پہلے اسکرٹ والی ایک مٹی لڑکی کے ساتھ رقص کر رہا ہے، اسے غور سے دیکھتا۔

اس نوجوان کا چہرہ بھی کھار ہی کیمرو کی طرف ہو رہا تھا۔ پھر جیسے کیمرو اس کے کچھ قریب پہنچ گیا اور دیگر دو ایک جوڑوں کے ساتھ وہ مجھے واضح نظر آنے لگا۔ وہ نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والا ایک دراز قد اور دھیرے نوجوان تھا۔ لڑکیاں بلاشبہ اس پر مرقی ہوں گی۔ اس کی ہم رقص قد میں اس سے نہیں چھوٹی تھی لیکن شاید اس کا پس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے گلے میں جھلک رہی جائے۔ وہ پارے کی طرح تھرک رہی تھی۔

سب جوڑے رقص اور اپنے ہم رقص میں مگن تھے۔ دلچسپ اس نوجوان نے دزدیدہ سی نظروں سے اوجھر اوجھر دیکھا۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی ہم رقص کو کوئی اشارہ کیا۔ وہ محوور سے انداز میں مسکرائی۔ پھر وہ دونوں رقص کرتے ہوئے جوڑوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے غیر محسوس طور پر بھیڑ سے نکل گئے۔

وہ میزبانی کی طرف جا رہے تھے اور کیمرو ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ پھر فلم میں چند سیکنڈ کا وقفہ آیا۔ پھر جیسے کیمرو کے سامنے کئی چلی سی آئی جو جلد ہی ہٹ گئی۔ وہ دونوں ایک بار پھر کیمرو کے سامنے تھے اور دونوں کی پر گویا شیطان سوار تھا، پھر وہ ایک طرف کو مڑے اور کیمرو کی زد سے نکل گئے۔ کیمرو نے اوجھر اوجھر تھوڑی سی حرکت کی۔ چند چیزیں اس کی ذمہ داری جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کیسے بند رہے کسی کمرے کا منظر لائٹ میں لینے کی کوشش کر رہا تھا مگر کوئی رکاوٹ درمیان میں حائل تھی، بالآخر اسکرین تاریک ہو گئی۔

ایک بار بھرا نیچ کی طرف مڑ گیا۔ وہ شخص مشفقانہ انداز میں دونوں بازو ہٹا کر انہیں بیٹھ جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔

پھر غالباً اس علاقہ نماہل میں سکوت چھا گیا اور وہ سر منڈا ہٹکھیں بند کر کے یوں دائیں بائیں سر ہلانے لگا جیسے وجد میں آ رہا ہو۔ اس کے دائیں بائیں دونوں لڑکیاں جو بتوں کی طرح ساکت کھڑی تھیں دھیرے دھیرے جیسے ان میں جان پڑنے لگی۔

پہلے انہوں نے تھرکنا شروع کیا، پھر وہ باقاعدہ رقص کرنے لگیں۔ اس دھندل سی بلیک اینڈ وائٹ فلم کی صورت میں بھی یہ رقص دیکھ کر میرے جسم میں چونچیاں سی دوڑنے لگیں تھیں۔ حال اب بھی لڑکیوں کے ہاتھ میں تھے۔ کبھی وہ اسے دائیں ہاتھ پر نکالیتی تھیں اور کبھی بائیں ہاتھ پر۔ ان میں سے بار بار کسی چیز کی بھی بھر بھر کر وہ حاضرین کی طرف اچھاتی جا رہی تھیں۔ نہ جانے کیا چیز تھی۔ اسکرین پر جنوں سے مشابہ نظر آرہی تھی۔ فلم یکھت ختم ہو گئی۔

احسان مرزا نے پروڈیگر بند کیا۔ نائٹ آن کی اور میرا ہاتھ تمام کر کاؤنٹر کے عقب سے نکل آیا۔ چند لمحوں بعد ہم دوبارہ اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھ تھے۔ احسان مرزا نے اپنا وہی جام اٹھایا جو اس نے خوشی میں میز پر بیچ دیا تھا اور جو آرمے سے زیادہ چمک چکا تھا۔ میں بیٹھ چکا تو اس نے ایک گھونٹ حلق سے اترتے ہوئے پوچھا۔ ”ان دونوں فلموں میں تمہیں سب سے خاص بات کیا نظر آئی؟“

”یہی کہ ہمیں کے ایک ماڈرن کلب میں تھری ہیں سوٹ پہن کر رقص کرنے والا اور زمانہ غار کے انسانوں کی طرح کھال لپیٹ کر اسٹیج پر بیٹھا ہوا وہ شخص ایک ہی ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہت خوب۔“ وہ اپنی ران پر ہاتھ مار کر تقریباً چلا اٹھا۔ ”تر بلاشبہ ایک بے مثال انسان ہو۔ اس حقیقت کو شاید ہی کوئی محسوس کر پاتا۔ رقصین فلم تقریباً چار سال پہلے کی ہے اور بلیک اینڈ وائٹ فلم ایک سال سے زیادہ پرانی نہیں۔ صحیح عرصے کا ہمیں بہر حال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ فلمیں مجھ تک کیسے پہنچیں یا کیوں اور کیسے بنائی گئی تھیں؟ یہ ایک علیحدہ اور طویل کہانی ہے جسے ہم فی الحال نہیں چھیڑیں گے۔“

رقصین فلم میں تم نے جس سوئڈ بوئڈ نوجوان کو دیکھا ہے، اس کا نام حشمت علی خان ہے۔ یہ نواب شرافت علی کی سب سے بڑی بیوی کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ میں بھی تقریباً پچیس ہیں کہ دوسری فلم میں نظر آنے والا شخص بے پناہ مختلف نظر آنے کے باوجود درحقیقت یہی ہے لیکن جب میں یہ غور کرتا ہوں کہ تین سال یا اس سے بھی کم عرصے میں یہ کیا کیسے بچتی وہ اس مقام پر کیسے پہنچ جہاں کی وہ قصور ہے اور وہاں اس نے اتنے عمدے بچے کیونکر کاڑھے تو پھر میرا یقین متزلزل ہونے لگتا ہے کہ وہ نواب زادہ حشمت علی

ہی ہے۔

دوسری فلم میں تم نے جو ہال سا دیکھا ہے، وہ ایک عبادت گاہ ہے۔ اتنے تو تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔ یہ عبادت گاہ ایک ایسی چھوٹی سی وادی میں واقع ہے جسے آباد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ نیپال کی سرحد کے قریب واقع یہ وادی ایک پرالے کی سی شکل کی ہے۔ اس کے تین اطراف میں بلند و بالا پہاڑوں کی دیواریں ہیں۔

اندھ جانے اور باہر آنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ پتھروں کو تراش کر بنائی گئی یہ سڑک صرف چودہ پندرہ میل لمبی ہے اور دیرانوں اور دشوار گزار راستوں سے گزر کر اس تک پہنچا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی نقشے کے مطابق تو یہ علاقہ ہندوستان ہی کی ملکیت ہے لیکن درحقیقت یہ تبت، نیپال اور ہندوستان کے درمیان پھیلی ہوئی اس کٹی پھٹی سی پٹی میں ہی شامل ہے جہاں ان تینوں علاقوں کے محبوب بلکہ کبھی کبھی ریڈ چائنا کے باغی بھی آگھستے ہیں اور برسوں یہاں کے پرچہ پہاڑوں یا داولوں میں روپوش رہتے ہیں۔

عملاً یہ علاقہ آزاد ہی ہے۔ اب اس پٹی پر کئی بشتیاں تو مستلاً آباد ہو چکی ہیں اور ان کا اپنا اپنا ہی نظام ہے۔ یہ وادی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، انہی بستیوں میں سے ایک ہے۔ اس کی آبادی تقریباً پانچ ہزار ہے۔ اس کے باشندے فطری طور پر قبیلے ہیں لیکن سب کے سب نہیں۔۔۔۔۔ ان میں دو غلے نیپالی بھی شامل ہیں۔ ان کے مذہبی نظریات اور معاشرتی نظام بھی نہ تو نیپالیوں سے ملتا ہے اور نہ بشتیوں سے۔

نیپال کے بیشتر قبیلوں میں سانپ کی پوجا کی جاتی ہے۔ یہ لوگ سانپ کے تخت دشمن ہیں۔ تبت داول کا مذہبی پیشوا لامہ اور سب سے بڑا پیشوا دلائی لامہ ہوتا ہے لیکن یہ لوگ اپنے مذہبی پیشوا کو منوجی کہتے ہیں۔ اس کا مضمون دہی ہے جو ہمارے ہاں بیر مائیں کا ہوتا ہے۔

ان کا ایک حکمران بھی ہوتا ہے جو صرف ایک سال کے لیے منتخب ہوتا ہے۔ وہ انہی میں سے کوئی معتبر اور عمر رسیدہ شخص ہوتا ہے۔ اسے ”پائی“ کہا جاتا ہے اور اسے ہمارے قبائلی جرموں سے مشابہ ایک کونسل منتخب کرتی ہے لیکن وہ برطانیہ کی ملکہ کی طرح محض حکماوے کا سردار ہوتا ہے۔ اصل اقتدار جرگے اور منوجی کے پاس ہی ہوتا ہے۔ خاص خاص فیصلے انہی کے اشاروں پر ہوتے ہیں۔

”یہ تو تم سمجھ ہی چکے ہو گے کہ حشمت علی ان کا ”منوجی“ بنا بیٹھا ہے اور اسکا باپ نواب شرافت علی ان لوگوں کا ”پائی“ بنا بیٹھا ہے۔ انہوں نے یہ مقام کیسے حاصل کیا اور زبان پر عبور کیسے حاصل کیا؟ یہ سوچ کر مجھے حیرانی ہوتی ہے۔ بے شک وہ لوگ یہ قوتی کی حد تک سادہ لوح اور بھٹہ جہاں کے عادی ہیں، پھر بھی اجتماعی طور پر ان کی لگام ہاتھ میں لینا بہت ہی چالاک کی بات ہے۔“

شہرِ لاہور کی وادیوں کی ایک نظر

محمد رفیع صاحب

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ خود ہی اصل موضوع پر آگیا۔ گہری سانس لے کر بولا۔
”اب میں اس علاقے کے دوسرے اور اصل پہلو کی طرف آتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ اس خبیثیت نے خوب تاثر کر دیا۔ جگہ منتخب کی ہے۔ تم ذرا چشمِ تصور سے اس پھوٹی سی وادی کی بناوٹ ذہن میں لاؤ۔ تقریباً چاروں ہی طرف بند و بال پھاڑوں کی دیواریں ہیں۔ صرف ایک ہی راستے سے وادی میں داخل ہونا ممکن ہے اور وہ بھی گاڑیوں پر ٹیکنیکی برے جھوم کی صورت میں نہیں یعنی اس وادی میں رہتے ہوئے اگر صرف سو دو سو مسلح اور جانہاز اس علاقے کے پسیدی اور آپ کے اشارے پر سرکٹانے والے آپ کے ساتھ ہوں تو آپ اچھی بجلی فوج کو بھی اندر آنے سے نہ صرف روک سکتے ہیں بلکہ اگر وہ زیادہ ہی جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیش قدمی جاری رکھیں تو قسطوں میں انہیں بھونک بھی سکتے ہیں۔“

”یہ تو ہوئی دفاعی نقطہ نظر سے اس کی اہمیت۔۔۔۔۔ اب تو دوسرے پہلو کی طرف۔ ان لوگوں کا کوئی خاص ذریعہ معاش نہیں ہے۔ جہاں تک میں معلومات جمع کر سکا ہوں یہاں لوگ کچھ ہرفانی لومڑیوں اور ریمپوں کا شکار کرتے ہیں اور ان کی چربی اور کھالیں وغیرہ نیپال یا کسی قریبی علاقے کی طرف بھجوا دیتے ہیں مگر یہ کام ایک طرح سے ہیزن ہی کا ہے۔“

”اصل معاملہ یہ ہے کہ وادی کے پچھلے حصے میں خبیث ہیں اور خارجی راستے کے دائیں بائیں ڈھلانوں میں جو نرم اور بھرپوری زمین ہے وہ سب کی سب قدرتی طور پر ہی جنگل، فیون اور ان تمام چیزوں کے پودوں سے آبی پڑی ہے جن سے منشیات تیار ہو سکتی ہیں۔“

حشمت علی یعنی منوچی صاحب نے یہ کیا ہوا ہے کہ بیشتر باشندوں کو باقاعدہ کھیتی باڑی میں لگا کر روزگار فراہم کیا ہے اور کھیتی باڑی انہی منشیات کے پودوں کی ہوتی ہے۔ سادہ لوح باشندوں کو اس سے غرض نہیں کہ منوچی صاحب قصوں کا کیا کرتے ہیں۔ انہیں تو اس بات سے مطلب ہے کہ انہیں ضروریات زندگی اور رانظیلیں ملی ہوئی ہیں۔

”دیکھیں بھی ان علاقوں میں منشیات کوئی اتنی معیوب چیزیں نہیں ہیں۔ گو کہ وہ لوگ

اس کا ایک جواز تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وادی ایک طرح سے بسائی ہوئی حشمت علی نے تھی۔ دو تین سال پہلے تک یہاں صرف پانچ سات سو افراد تھے۔ دوسری بات یہ کہ اس نے تمام مذاہب کے پیروں، فقیروں کے برعکس شروع شروع میں لوگوں سے نذرانے وغیرہ لینے کے بجائے ان میں اشیائے ضرورت تقسیم کیں۔ انہیں مختلف کاموں کا ہنر سکھایا۔“

”اس کے وہاں جاننے کی وجوہات سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ یہ حکمت عملی خود ان لوگوں کی اپنی تھی یا مافی کی تجویز کردہ لیکن بہر حال تم بہت خوب۔ میں اب بھی اس پر غور کرتا ہوں تو عیش عیش کر بیٹھتا ہوں۔ اتنی لمبی پلاننگ ہم شہری قسم کے مجرم کبھی نہیں کر سکتے اور نہ ہی تمدن زندگی سے دور ہونے کا تصور کر سکتے ہیں۔“

”میں اس طرح کے دور دراز علاقے میں ایسی وحشیانہ زندگی گزارنا شاید بہت تکلیف دہ معلوم ہو، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسے علاقوں میں انسان کو پانچ سات ہزار انسانوں پر بھی اقتدار حاصل ہو جائے تو کہیں زیادہ تعیشات اور فطرت کی نہ جانے کتنی خوبصورتیاں اس کی غلام ہوتی ہیں۔“

اب تو اس حشمت علی کو ہی دیکھ لو۔ تم نے اس کی تین چار سال پہلے کی شہری زندگی کی فلم بھی دیکھی ہے۔ ٹھیک ہے کہ اس وقت بھی وہ صحت مند اور وجیمہ تھا لیکن اسے دیکھ کر پھر بھی پیچھے ہٹنے اور نزاکت کا احساس ما ہوتا تھا۔ پھر تم نے دوسری فلم میں اسے دیکھا۔ فلم بہت ناقص سی تھی لیکن تم نے دیکھا وہ کتنا تنومند کراہل اور سخت جان نظر آ رہا تھا؟ نازن کی اوداؤ بن گیا ہے۔“

”سب سے وہاں کی کس چیز کی ہے؟ فطرت کے تمام مظاہر اور تمام تعیشات اپنے اصل روپ میں اسے الفاظ سے میسر ہیں۔ بہترین جانوروں کا گوشت وہ کھاتا ہے۔ بہترین شرابی وہ پیتا ہے۔ شہر کی گھاگ لڑکیوں کی جگہ ابھوتی، کسن اور حقیقی معنوں میں حسین لڑکیاں اس کے ایک اشارے پر قربان ہونے کے لیے دست بستہ کھڑی رہتی ہیں۔ ہزاروں بیوقوف اس کے لیے سرکٹانے کو تیار رہتے ہیں۔ آلائشوں سے پاک، مصفا اور فولاد کی آمیزش والا پہاڑی پانی اسے پینے کے لیے میسر ہے۔ گرد اور دھوئیں سے پاک تازہ ہوا میں وہ سانس لیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہم سے کہیں بہتر زندگی گزار رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ لوٹ کر ہمیں آئے تو چار دن میں بیمار پڑ جائے۔“

اس کے لہجے میں رشک نہیں، قہر اور دلی دلی جھنجھلاہٹ تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اصل موضوع سے ہٹ رہا تھا، تاہم میں خاموش رہا۔



ان کے بال اور داڑھیں جھاڑ جھکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی تھیں۔ جسموں پر میل کی تھیں اور جگہ جگہ جو کیں قطار در قطار چل رہی تھیں۔ ان کے وجود سے پدرو کے پھسکے اٹھ رہے تھے۔ پہاڑوں پر انہوں نے اس عالم میں دن گزارے کہ جو بھی جانور یا پرندہ ہاتھ لگتا تھا اسے کات کر کچا کھا جاتے تھے۔ تقریباً سب کے سب لی لی کا شکار تھے اور خون تھوک رہے تھے مگر انہیں جیسے کسی بھی بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔

ان کی رائیں اور مشینیں گھسیں گوکہ خالی ہو چکی تھیں مگر وہ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے سے جدا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور بار بار متوقع نظروں سے اپنے سردار کی طرف دیکھتے تھے کہ اگر وہ اب بھی لڑنے کا حکم دے تو وہ خالی بندوقوں سے ہی لڑنا شروع کر دیں۔ میرے ایک دوست سرکاری افسر نے بہت سے اس قسم کے واقعات مجھے سناے تھے۔

یہ مثال میں اس لیے تمہارے گوش گزار کر رہا ہوں کہ تمہیں صحیح طور پر اندازہ ہو سکے کہ حشمت علی اور شرافت علی اپنی عملداری میں کتنے محفوظ ہیں۔ میرے پاس "مانیا فیلی" کا بھی ایک سراغ ہے اور اس کے پیچھے بھی کئی جانیں ضائع کر چکا ہوں۔ میں نے موت کے کئی ہرکارے اس وادی کی طرف بھیجے لیکن کوئی زندہ واپس نہیں آسکا حتیٰ کہ کوئی وادی میں داخل تک نہیں ہو سکا۔

مجھے صحیح طور پر علم تو نہیں لیکن میرا اندازہ یہی ہے کہ حشمت علی نے لوگوں کی شناخت اور داخلے کا کوئی ایسا نظام ضرور وضع کر رکھا ہے جس سے گزر کر کسی مشکوک اجنبی کا وادی میں داخل ہونا ممکن نہیں اور اس قسم کا انتظام کرنا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی کیونکہ وادی میں داخل ہونے کا تو ایک ہی راستہ ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ شاید تقدیر بھی اس کے ساتھ ہے۔ اپنی ایک اور کمزوری بھی میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میرے پاس ایسے ذہین آدمیوں کی سخت کمی ہے جو تنہا اپنی ذات میں ایک گروہ ہوں۔ کسی قسم کو اپنے طور پر سر کر سکتے ہوں۔ ضروری نہیں کہ تم وہاں پہنچنے کے بعد بھی انہیں ختم کر سکو۔

"اس لحاظ سے یہ ایک طرح کا جوا بھی ہے۔۔۔۔۔ لیکن ایک بات تو بحال ملے ہے کہ اگر میرا یہ اندازہ جس کے درست ہونے کا قوی امکان ہے، درست ہی ہوا تو اس ایک سراغ سے سراغ ملتا چلا جائے گا اور ہم اس پوری سلطنت کی بساط لپیٹ دیں گے جو دن بدن بچھتی اور مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ اب بولو۔۔۔ کیا تم یہ جوا کھیلنے کے لیے تیار ہو؟"

احسان مرزا خاموش ہو گیا لیکن ساتھ ہی مضطربانہ انداز میں اوپر اوپر اٹھنے لگا۔ اس کی نظر مجھ پر ہی جمی ہوئی تھی۔ میں نے نہایت توجہ اور خاموشی سے اس کی طویل گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا تھا اور میرا ذہن اس وقت اتنا مستعد تھا کہ نیپ ریکارڈ کی طرح ہر لفظ کو

خود منشیات برائے نام ہی استعمال کرتے ہیں لیکن ان کو دیگر عام چیزوں ہی کی طرح سمجھتے ہیں۔ اوپر نیپال قریب ہی ہے جہاں سے منشیات کی نقل و حرکت یا مقامی طور پر فروخت قطعاً دشوار نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اسی وادی سے منشیات کچی شکل میں کھنڈرو کی ایک بہت بڑی لیبارٹری میں جاتی ہیں جو معتول معاوضے پر ان سے بیرونی تیار کر کے رہتی ہے۔

"لیبارٹری ویسے تو وہاں تیار کرتی ہے اور اس کا جائزہ اور قانونی پرنس بہت بڑا ہے لیکن یہ کام گویا وہ "اور ٹائم" کے طور پر کرتی ہے۔ لیبارٹری والوں کو یہ نہیں معلوم ہونے پاتا کہ کھپ کماں سے آتی ہے اور کہاں جاتی ہے۔۔۔۔۔ ممکن ہے اس کے مالکان میں سے کسی کو معلوم ہو لیکن میرے لوگوں کو اس کا پتا نہیں چل سکا۔

بظاہر یہ بڑا حقیر اور زیادہ درجہ سہی کے مقابلے میں کم آمدنی کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے لیکن تمہیں سن کر حیرت ہوگی کہ معاملہ کھنڈروں کی سالانہ آمدنی تک پہنچا ہوا ہے اور دن بدن پھل پھول رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حشمت علی اور شرافت علی کے دائرہ اقتدار اور قوت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دیں بیٹھ کر یہ دوسرے جرائم کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی زیر زمین دنیا کے بہت بڑے حصے کا کنٹرول ان کے پاس ہے۔ میں پادر بھی ان کے پاس موجود ہے۔ کھنڈرو کے راستے ان کا رابطہ بمبئی دہلیہ سے قائم ہے۔ دونوں باپ بیٹا ایک محفوظ جگہ بیٹھ کر وہاں بھی اور یہاں بھی حکومت کر رہے ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ نیپال یا ہندوستان دونوں میں سے کوئی بھی حکومت اس طرف متوجہ نہیں ہو رہی ہے۔ میں نے اوپر توجہ دلانے کے لیے دو ایک ڈوریاں بلائیں مگر ایک تو ہر حکومت کو اس سے کہیں زیادہ بڑے اور اہم مسئلے درپیش ہیں جن میں وہ ہمہ وقت الجھی رہتی ہے، دوسری بات یہ کہ نازک سرحدی علاقوں اور خوشنواہ مسلح قبائلیوں کو کوئی بھی حکومت نہیں چھیڑتی۔

کوئی پتا نہیں ہوتا کہ یہ قبائلی جب پہنچے گلیں تو نس ملک کے ملہ کار بن جائیں۔ جس دو غلے قبیلے کا میں نے تمہیں بتایا ہے وہ بھی بظاہر پرامن ساہو لوح اور بے ضرر ہے لیکن اس کے باوجود اڑنے اور لڑنے کے معاملے میں وہ کچھ کم خطرناک نہیں۔ اگر کوئی حکومت اس قسم کے قبیلوں سے کرائے بھی تو خونریزی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی نتیجہ تو کبھی نکل سکتا ہے کہ ہندوستان بھی کوئی بڑی حکومت یہ تیسہ ہی کر لے کہ اسے اس بٹی پر اپنی نگرانی ہر حال میں قائم کرنی ہے۔

"عالم یہ ہے کہ ایک بار حکومت نے کچھ قبائلیوں پر سختی کی تو وہ ایک آتش فشاں پہاڑ پر چڑھ کر اس کے دبانے کے اندر کھس کر بیٹھ گئے۔ کئی ماہ کی کوششوں کے بعد ہالہ خراب فوج انہیں نکالنے میں کامیاب ہوئی اور انہیں نیچے لایا گیا تو وہ زمانہ غار کے انسانوں سے بھی بدتر نظر آ رہے تھے۔"

گوینا ریکارڈ کرتا جا رہا تھا۔

میں نے مہرے سانس 'یا' بالوں میں انگلیاں پھیریں اور سر جھٹک کر بغور اس کی طرف دیکھا۔ معلوم نہیں کیوں بے پناہ طاقت کا مانگ یہ مختصر ماحضت مجھے بھی اسی طرح اچھا لگنے لگا تھا جس طرح بقول اس کے 'میں اسے اچھا لگتا تھا۔ مجھے بھی اس سے انسیت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی بٹری برائیاں اپنی جگہ سہی لیکن مجھے اس کی سچائی اور کھرا پن بہت پسند آیا تھا۔ کم از کم مجھے جب سے اس نے دوست کہا تھا تب سے میں محسوس کر رہا تھا کہ میں اس پر انحصار کر سکتا ہوں۔ میرے لیے وہ دنیا کا ہر وہ کام کر سکتا ہے جو اس کے بس میں تھا۔ اس کے انداز میں کچھ کچھ شفقت اور بزرگی سی بھی تھی۔ وہ میری طرف دیکھتا تھا تو اس کی نظروں میں کچھ ایسا نفاخ اور مان نظر آتا تھا جیسے واقعی بقول اس کے کسی دیہاتی کا بیٹا ولایت پس کر کے آگیا ہو۔ ایسے سا بھی 'دوست اور... بہشت پناہی کرنے والے کی مجھے ضرورت تھی۔

"احسان مرزا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارا دوستی کا ہاتھ تھام کر بھی تو میں نے جواب ہی دیا ہے" اب مزید خطرات کی کیا پروا کرنا۔ وہ جو ایک محاورہ ہے تاکہ اوتھوں والوں سے دوستی ہو تو گھر کے دروازے اونچے رکھے پڑتے ہیں 'لہذا بتایا۔ جب دوستی احسان مرزا سے ہو تو پھر خطرات سے کیا گھبرانا۔ اگر یہ جواب ہے تو جواب ہی سہی 'تمہاری خاطر کھیلیں گے ضرور۔"

"جیو پیارے!" اس نے جام رکھ کر قریب آکر دونوں ہاتھوں سے میرے کندھے زور زور سے تھپتھپائے۔ "ایک طویل عرصے بعد کسی طرف سے قلب کو اطمینان دینے والی ہوا کا جھکا آیا ہے۔"

مجھے اپنے آپ پر قدرے حیرت بھی ہوئی۔ حالات نے مجھے ڈیڑھ سو سکا دی تھی۔ جو مجھے اس کی خاطر نہیں 'اپنی خاطر اپنی مان اور اپنے کم شدہ وقار کی خاطر کہیں تھ لیکن احسان مرزا اسے اپنی گردن پر احسان شمار کر رہا تھا۔

"تو پھر کتنے عرصے تک جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟" چند لمحوں بعد اس نے پوچھا۔

"عرصے کا کیا سوال ہے۔" جتنی جلدی بھی ممکن ہو 'میں چلا چلاؤں گا۔ اس نوعیت کے کاموں میں تاخیر قطعی مناسب نہیں ہوتی۔ میں پرسوں یا زیادہ سے زیادہ اس سے اگلے روز روانہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"بہت خوب۔۔۔۔۔" اس کی آنکھوں میں دنیا جہاں کی ستائش سمٹ آئی۔ "تمہاری تیاریاں کیا کیا ہوں گی؟"

"کچھ نہیں۔۔۔۔۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے صرف ایک چھوٹی سی چیز کی ضرورت ہوگی۔ اس کی تمہیں زحمت دوں گا۔ وہ بھی اس لیے کہ وہ چیز مجھے جلدی چاہیے اور اس

دن میں میری کوئی خاص واقفیت نہیں۔"

میں نے اپنے گلے سے اپنا طلائی لاکٹ نکالا اور احسان مرزا کی طرف پڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں مجھے مختصر ترین حجم کی کوئی ایسی ڈیوائس فٹ کروا دو کہ اس لاکٹ کے ارد گرد چند سوئز کے دائرے میں ہونے والی محنگلوں میں کسی ریپیوٹنگ سیٹ پر سن سکوں۔ ریپیوٹر کا دائرہ عمل جتنا زیادہ ہو اتنا ہی بہتر ہے۔"

لاکٹ اس نے میرے ہاتھ سے لے لیا اور سرسری نظروں سے دیکھ کر مسکرایا۔ "بس تمہیں صرف اسی چیز کی ضرورت ہوگی؟"

"بس۔۔۔۔۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "اور کسی چیز کی ضرورت ہوگی بھی تو اس کام میں خود ہی انتظام کروں گا۔"

"یہ تو خیر کوئی مشکل کام نہیں۔۔۔۔۔ یہ تمہیں صبح تک مل جائے گا۔ کیا ایسے ہی جاؤ گے؟"

"نہیں۔ شکستہ عرف کیٹی میرے ساتھ ہوگی۔" میں نے جواب دیا اور آکر ضروری ہوا تو میرے ساتھ کچھ سا بھی بھی ہوں گے۔"

میں دراصل یہ بتا رہا تھا کہ اصل مرحلہ وادی میں داخل ہونے وقت ہی شروع نہیں ہوتا۔ وہ اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ پھر وہ بچوں کی طرح شرے انداز میں مسکرایا۔ "اس سے پہلے ہی راہ وفا میں امتحان شروع ہو جاتے ہیں۔" انداز ایسا تھا جیسے کوئی نوآموز اپنا پہلا شعر موزوں کر کے خوش ہو رہا ہو۔

"کچھ پتا نہیں چلتا کہ جہاں کہاں تک پہنچا ہوا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے سلسلہ کلام جوڑا۔ "مانیا" کا ہاتھ کہاں تک ہے اور "لیلیا" کے اپنے وسائل کہاں تک کام کر رہے ہیں۔ میرے وہ موت کے ہر کارت جن کے ریکارڈ پر مجھے فخر تھا 'جو جہاں بھی گئے 'اپنے شکار کو پیغام اجڑ پٹا کر ہی گئے 'ہمیشہ کامیاب اور کامران ہی لوٹے۔ ان میں سے کوئی تو ہوتاں تک بھی قہقہے نہیں پایا۔ کوئی وادی کے نواح میں ہی مارا گیا۔ کوئی کسی پہاڑ پر پہنچ کر لڑھک گیا۔ صرف ایک تھا جو وادی میں داخل ہونے میں کامیاب ہوا لیکن رات وہاں نہیں گزار سکا۔ رات اس کی عالم ہلا میں ہی گزری 'اس لیے میں کہتا ہوں کہ تم اپنی طرف سے آنا۔ کھنڈ میں ہر رنگ و نسل کے لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ مجھے اس امر کا امکان بہت کم نظر آتا ہے کہ موت وہاں سے تمہارا تاقب شروع کر دے گی۔۔۔۔۔ بہر حال فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔ رات کو ہم نقشے سامنے رکھ کر تفصیل سے پروگرام طے کریں گے۔۔۔۔۔ فی الحال تم آرام کرو۔"

اس کے ٹھیک چار دن بعد میں اور کبھی جاپان ایئر لائنز کے ایک طیارے میں نیپال کی طرف نحو پرواز تھے لیکن ہم دونوں ساتھ نہیں تھے اور نہ ہی ہم میں کوئی تعلق نظر آتا

تھا۔ وہ مجھ سے کئی نشستیں آگے گزر گاہ کے قریب تھی۔ اس کے قریب ایک انگریز جڑوا اور ایک جاپانی نوجوان بیٹھا تھا۔ میں فرسٹ کلاس کی نشستوں کی آخری قطار میں کھڑکی کے قریب تھا جہاں دو جڑواں نشستیں ہوتی ہیں۔ میرے قریب ایک اوجیز عمر مارواڑی سیٹھ فولڈنگ ٹیبل کھولے حساب کتاب میں مصروف تھا۔

کئی اس وقت کوئی تسودہ حال اور لا ایلانی یوریشن لڑکی دکھائی دے رہی تھی اور میں ایک نو دولتیا نوجوان..... سامان ہمارے پاس برائے نام تھا۔ محض ایک ایک بیگ اور وہ بھی اتنا چھوٹا کہ اسے لیمچ میں بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

میں نے احسان مرزا کی ہدایات سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لیا تھا اور سفر کا آغاز ہی ایک غیر ضروری اور طویل چکر سے کیا تھا۔ پہلے ہم انڈین ایئر لائنز کی ایک پرواز سے بمبئی سے دہلی آئے تھے اور وہاں سے کھنڈو جانے کے لیے جاپان ایئر لائن کی یہ پرواز پکڑی تھی جو ایمسٹرڈیم سے آتی تھی۔ یہ پرواز کانس اور راولپنڈی سے ہوتی ہوئی کھنڈو جاتی تھی۔

پورے سفر کے دوران میں نے ایک لاپرواہ میرزاوے کا رویہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ کئی لڑکیوں کو ندی سے پین سے گھورا بھی تھا لیکن پھر گویا ان سے متعارف ہونے کی جرات محسوس نہ کرتے ہوئے ہونٹوں پر نہات پھیر کر رہ گیا۔ بظاہر گویا مجھے گرد و پیش کا کوئی ہوش نہیں تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں نے اس امر کا پورا پورا خیال رکھا تھا کہ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا لیکن ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

کئی نے نیلم اور سنگ مرمر سے بنی ہوئی آنکھ والہ لاکٹ پہن رکھا تھا۔ اس میں ڈیوائس فٹ تھی۔ میرے کوٹ کی بریسٹ پاکٹ میں ماچس کی ویبا کے برابر ایک آلہ تھا جو بظاہر آلہ سماعت معلوم ہوتا تھا اور اس کا انحصار ایئر فون بھی میرے کان میں لگا ہوا تھا۔ درحقیقت یہ صرف اس ڈیوائس کا ریلیور تھا جو کئی کے لاکٹ میں فٹ تھی۔ کئی کے اس پاس ہونے والے ٹنگو میں بہ آسانی من رہا تھا۔ لاکٹ کئی نے اس طرح پینا ہوا تھا کہ آسانی سے نظر آتا رہے۔

وہ لاکٹ میرا ہی تھا لیکن اسے اس شکل میں احسان مرزا نے ہی ڈھلویا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مافیا کے کارندے یہ نشان اپنی شناخت آپس میں واضح کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اسے امید تھی کہ یہ نشان دیکھ کر مافیا کا کوئی آدمی کئی کی طرف متوجہ ہوگا اور وہاں سے سرا میرے ہاتھ آجائے گا۔

کھنڈو کے ایئر پورٹ پر اترتے ہی مجھے سردی کا احساس ہوا۔ طیارے کی حرارت آمیز فضا سے نکل کر دھوک ٹپک آتے آتے ہر حال میں جسم اس ٹنگی سے قدرے مانوس ہو گیا۔ مسافروں میں صرف میں اور کئی ہی ایسے تھے جن کے پاس صرف ایک ایک بیگ تھا اور ہمیں متحرک بیٹ کے قریب کھڑے ہو کر سامان کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

چنانچہ ہم دونوں سیدھے باہر آگئے لیکن پہلے ہی کی طرح ایک دوسرے سے لا تعلق انداز میں۔

اگ ایک ٹیکسیوں میں بیٹھ کر ہم ٹیکس ہونٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ احسان مرزا کے ایک ایجنٹ نے ہمارے لیے ایک ٹی فلور پر دو کمرے ریزرو کروا رکھے تھے لیکن یہ کمرے ساتھ ساتھ نہیں تھے۔ ان کے درمیان اور بھی کئی کمرے تھے۔ یہ ہدایت میں نے ہی کر دی تھی کہ کمرے ساتھ ساتھ نہیں ہونے چاہئیں۔

میں اپنی ٹیکسی کو دارا فاضل چکر سے کر ایک دکان سے کوئی چیز خریدنے کے بہانے قدرے تاخیر سے ہوٹل تک لاؤ تاکہ اس دوران کئی اپنے کمرے میں جا سکے۔ میں جب ہوٹل میں پہنچا تو کاؤنٹر کلرک نے میرا نام سننے ہی ایک چابی میرے حوالے کر دی اور دستخط کرنے کے لیے اندراجات کا کارڈ میری طرف کھینکا دیا۔

دستخط کر کے میں سڑا تو پورٹ کی دروی میں ایک نو عمر نیپالی لڑکا دیوار سے ٹک لگائے کھڑا میرے بیگ کو بغور دیکھ رہا تھا جو فرش پر رکھا تھا۔ اس کی نظر درحقیقت بیگ پر چسپاں ایک اسٹیکر پر تھی۔ مجھے مڑتے دیکھ کر وہ مسکرایا اور بیگ اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ بیگ اٹھا کر وہ لکٹ کی طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ بیگ رکھ چکا تو میں نے اسے ٹپ دی۔ وہ سلام کر کے جانے کے لیے مڑا لیکن جاتے جاتے اپنے ہٹ کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا سفید کارڈ نکال کر مجھے تنہا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کارڈ پر نظر دوڑائی۔ اس پر انگریزی میں مختصر سا ٹائپ شدہ مضمون تھا۔

”دیکھیں ریستوران..... آمن ٹول..... شام چار بجے..... تپ کی جیب میں سفید رومال نظر آتا ہے۔“

پچھنے والے کی ذات کی طرف کوئی اشارہ موجود نہیں تھا، تاہم مجھے معلوم تھا کہ یہ پیغام دوستوں کی طرف سے تھا۔ احسان مرزا نے مجھ سے کہا تھا کہ کھنڈو پہنچ کر جو ابتدائی مسائل مجھے پیش آسکتے ہیں انہیں حل کرنے کا انتظام خود بخود ہی ہونا چاہئے گا، مجھے اس سلسلے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

میرا سب سے پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ میں ہندوستان سے آتے وقت کم از کم دو ہیوی تحفے ساتھ لانا چاہتا تھا مگر میں ایک بھی نہیں لا سکتا تھا کیونکہ سکیورٹی چینگ بہت سخت تھی۔ سامان میں ساتھ لانا نہیں چاہتا تھا ورنہ تھیں سوٹ کیسوں میں جوڑیٹھ کر کے بھی رکھی جا سکتی تھی۔ سوٹ کیس تو سیدھے لیجج میں چلے جاتے لیکن پھر بھی خطرہ موجود تھا کہ ان کے غیر معمولی وزن پر کوئی شبہ نہ کر بیٹھے۔

ہیوی تحفے میری نذر میں ویسے بھی کوئی خاص کام کی چیز نہیں تھیں لیکن محض اس

لئے ساتھ رکھنا چاہتا تھا کہ اگر سب تیسریں ناکام ہو جائیں تو آسنے سامنے باقاعدہ میدان جنگ کی سی کیفیت پیدا کر کے دہشت پھیلائی جاسکے۔ بہر حال احسان مرزا نے اس سلسلے میں میری تشویش دور کر دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ گھنٹہ دو یا تینپال کے کسی اور مقام پر بھی مجھے جس قسم کے اسلحے کی بھی ضرورت ہوں مل جائے گا اور اس کے آری مختلف مراحل پر خود ہی مجھ سے رابطہ قائم کرتے رہیں گے۔ اسی طرح مجھے کسی بھی ملک کی کرنسی اور سواری کے لیے کار یا جیپ بھی مل سکتی تھی۔

اس طرح میرے کافی تفکرات کم ہو گئے تھے۔

دروازہ منتقل کرنے کے بعد میں نے کپڑے بھی نہیں بدلے اور سب کچھ ذہن سے جنگ کر سونپا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کیونکہ کھڑکیوں کے بلاکڈز کھلے ہونے کے باوجود کمرے میں اندھیرا سا پھیلا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن گھڑی دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ ابھی تین ہی بجے تھے البتہ آسمان پر بادلوں نے سورج کو یوں ڈھانپ لیا تھا جیسے زمانہ دولت مندوں کے گنہوں کو چھپا لیتا ہے۔ اسی لیے کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

تیار ہو کر میں نے ایک بار پھر وہ کارا دیکھا۔ اس کے مطابق مجھے کہیں رستوران میں پہنچنا تھا جو آسن ہل کے علاقے میں واقع تھا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے کارڈ پڑے پڑے کر کے فلش کر دیا۔

کچن کے کمرے کے سامنے سے گزرتے وقت میں نے دروازے کی طرف نظر اٹھ کر بھی نہیں دیکھا اور لٹ سے نیچے گیا۔ بونٹ کے صدر دروازے کے قریب ہی کئی فٹسیاں کھڑی تھیں لیکن میں پیدل ہی ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ بونٹ سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر انومان دیو کا ایک بہت بڑا بت نصب تھا۔ اس کے عقب میں بھادائی کا مندر سر اٹھائے کھڑا تھا۔ یہاں سڑک کافی چوڑی تھی اور خوب چل پھل پس نظر آ رہی تھی۔

چلتے چلتے میں نے اٹانک ہی ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور اس میں بیٹھنے ہی ڈرائیور کو ایک بظنی مٹی کی طرف مرنے کا حکم دیا۔ کئی لمحوں میں چکرانے کے بعد میں نے اسے آسن ہل کی طرف چلنے کو کہا۔ مجھے تقریباً یقین تھا کہ کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا تھا لیکن میں حتی الامکان احتیاط برت رہا تھا۔

ٹیکسی جب کہیں رستوران کے سامنے رکی تو ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ کیا واقعی مجھے اسی جگہ پہنچنے کے لیے کہا گیا ہے؟ کہیں رستوران میری توقعات سے بہت ہی مختلف تھا۔

دراصل یہ ایک پانچ منزلہ عمارت کا تہ خانہ تھا لیکن اس کی حالت ایک بڑے چھپر سے مشابہ تھی جس کی دیواریں ستون اور چھت میل کیل اور داغ دھبوں کے علاوہ

دھوئیں کی سیاہی سے بھی اٹی ہوئی تھی۔ بے ہنگم میز اور کرسیاں بے ترتیبی سے ابھر ادھر بکھری ہوئی تھیں اور صرف یہی نہیں دیواروں کے چاروں طرف ہتھی بھی لگی ہوئی تھیں۔

رستوران کی پیشانی پر بہت لمبا چوڑا رنگ برنگ بورڈ آویزاں تھا۔ رستوران کا مینو بھی اسی بورڈ پر درج تھا اور اس مینو میں بھنگ کے پکوڑوں سے لے کر حبش کے بھرے ہوئے سریت اور المون والا سالن تک شامل تھا۔

اندر نیم تاریک چھپر نما ہال میں ہر رنگ و نسل کے افراد موجود تھے جن میں مرد اور عورتیں ہی نہیں تیسری جنس کے نمائندے بھی شامل تھے۔ دیواروں پر جانتا بولتی پھولی انگریزی میں درج نوٹوں میں آوارہ مردوں کو نوید سنائی گئی تھی کہ وہ بے شک دن بھر یہاں بیٹھے رہیں گے۔ کھڑے رہیں اور دل چاہے تو لیٹے رہیں اور جو جی چاہے کریں لیکن رات گزارنے کے لیے کوئی اور ٹھکانہ تلاش کر لیں۔

ہال میں حبش کا دھواں پھرا رہا تھا۔ اس جگہ کی ایک ٹوٹی میں نے جلد ہی محسوس کر لی کہ ہر گاہک خواہ وہ مرد تھا یا عورت اگر وہ ٹٹا تھا تب بھی اپنے آپ میں گمن تھا اور اگر کسی کا ساتھی موجود تھا تو وہ ایک دوسرے ہی میں گم تھے کسی اور کی طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔

ایک چھوٹی سی میز خالی پا کر میں ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا اور کھڑی دیکھی چار بج کر چند منٹ ہو چکے تھے۔ ذرا ہی دور ایک میز پر مجھے کئی بھی نظر آئی اسے بھی یقیناً میرے ہی جیسا پیغام ملا تھا۔ وہ بالکل صبح وقت پر یا چند منٹ پہلے ہی یہاں پہنچ گئی تھی۔ اس کی انگلیوں میں ایک سگریٹ سلگ رہا تھا وہ دھیرے دھیرے اس کے کش لے رہی تھی اور اس کی نیم دا آنکھوں میں تیرتی ہوئی مٹی کا بتا رہی تھی کہ سگریٹ میں حبش بھری ہوئی تھی۔

ابھی میں نے اسے کچھ خاص ہدایات دینی شروع نہیں کی تھیں شاید اس لیے کام کو عجیبگی سے بھانے کے ساتھ ساتھ اپنی طبیعت کی آوارگی کی تسکین کا بھی ہکا بھکا سامان کر رہی تھی۔

ایک ویٹر مین کی ایک خالی بیٹھوی زبے جھٹنے پر بجاتا میرے قریب آیا وہ ویٹر کم اور بن مانس زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ ایسا بن مانس جس کی صحت معمول سے کچھ کمزور ہو گئی ہو اس نے جھک کر اپنے چوڑے چوڑے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے مجھ سے ہتھ پوچھا۔

میں نے ایک کان پر ہاتھ رکھ کر آگے کو ہوتے ہوئے کچھ یوں ظاہر کیا کہ جیسے مجھے اونچا سنائی دیتا ہے۔ اس نے دوبارہ ٹوٹی پھولی انگریزی میں پوچھا کہ میں کیا کھانا پسند کروں گا۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ میں اس کی بات نہیں سن سکا ہوں پھر میں نے اپنا ہتھ سا آگے

سماعت جیلٹ کی اندرونی جیب سے نکال کر سامنے دانی بیسب میں رکھا اور ایفون لگاتے ہوئے مسکرا کر ویٹر سے انگریزی میں کہہ کر اب وہ بات کرے۔

اس نے تیسری مرتبہ پھر وہی سوال کیا تو میں نے کہا۔ "اگر ہو سکے تو ایک ایسا سینڈ ویج لے لو جس میں کوئی نشہ توڑ چیز شامل نہ ہو اور گوشت بھی اگر ہو تو بکری، مرغی یا گائے کے سوا کسی اور جانور کا نہ ہو اور اس کے ساتھ اورنگ بٹوس کا ایک ڈپ لے آؤ۔"

ویٹر نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا، تاہم اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا۔ مجھے احساس تھا کہ اگر میں ایسی جگہ ہی آگیا ہوں تو مجھے اپنے آپ کو اس ماحول کا عادی ظاہر کرنا چاہیے لیکن میں اپنے آپ کو اس پر آمادہ نہیں کر سکا تھا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہوتا۔

معلوم نہیں یہ رستوران کی انتظامیہ کی نوازش تھی یا ویٹر کی ذاتی کوشش کا نتیجہ کہ جلد ہی میرے شریفانہ آرڈر کی تعمیل ہو گئی۔ میں نے اورنگ بٹوس کے ڈبے کی سیل کھولی اور جوس کے ایک ایک گھونٹ کے ساتھ نیم دلی سے سینڈ ویج چبانا شروع کیا جو خاصہ بد ذائقہ تھا مگر جوس کے ساتھ آمیزی سے لگ جا رہا تھا۔

ابھی میں نے چند ہی تھے حلق سے اٹارتے تھے کہ وہ آدمیوں کو کینی کی میز کی طرف بڑھتے دیکھا، وہ اس وقت تک سگریٹ ختم کر چکی تھی اور ایک بیڑ کے بوتل سے گلاس سے پھوٹے پھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی۔

ان میں سے ایک دراز قد سفید فام تھا جو ڈھیلے ڈھالی سیاہ چٹون اور ڈھیلا سا چیک کا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی تائی ڈھیلے ڈھالے انداز میں گردن میں جھول رہی تھی۔ دونوں ہاتھ کوٹ کی پٹوں میں تھے اور ایک جیب کا ابھڑا معمون سے زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سولے سولے ہونٹ بھی لٹکے ہوئے تھے اور واسٹا میں سگار دبا ہوا تھا۔ اس کے پوٹے بھاری تھے اور یہ شکل ہی سے بد طبیعت اور جرائم پیشہ نظر آتا تھا۔

دوسرا ہندوستانی معلوم ہوتا تھا۔ وہ درمیانی قد اور کسرتی جسم کا نوجوان تھا۔ اس کا رنگ سانوا اور پٹیلے سیاہ بال تیل میں چڑھے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ کے جوڑے پر پیشہ ور پہلوانوں کی طرح چڑے کی چوڑی سی پی پی لپٹی ہوئی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ احسان مرزا کے آدمیوں کا طبع ظاہری طور پر ہی اتنے ستے پن کا مظہر ہوگا۔

میں ایک لمحے ہی میں ان کا سر تپو جان بولے چکا تھا اور یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ وہ بے تکلفی سے کرسیاں مچھٹ کر کینی کے سامنے بیٹھ رہے تھے اور کینی نے پیشانی پر ہل ڈالتے ہوئے تیکھی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

".....ہاں تو..... اور ستاؤ جالت من! کیا حال چال ہے؟" کسرتی جسم والے نوجوان نے اردو نے کہا۔ میرا اندازہ غالباً درست ہی تھا..... وہ ہندوستانی ہی معلوم ہوتے تھے۔ اس نے مہنگو ہوس شروع کی تھی جیتے وہ کافی دیر سے کینی کے پاس ہی بیٹھا تھا اور اس دوران ذرا

دیر کے لیے کسی اور طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے اتنے فاصلے پر تھے کہ عام لب و لہجے میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو میں نہیں سن سکتا تھا لیکن کینی کے لاکٹ اور اپنے آلہ سماعت کی وجہ سے میں ان کی آوازیں سناٹے طور پر سن رہا تھا، تاہم بظاہر میں اشیامک سے اپنا سینڈ ویج کھانے میں مصروف تھا۔

"کیا تم ابھی عورتوں کے سامنے یونٹی اچانک یو اس شروع کر دینے کے عادی ہو؟" کینی نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"لو! خواہ یوریشین بننے کی کوشش نہ کرو....." ہندوستانی بولا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ تم خالصتاً انڈین ہو۔"

"اگر میں انڈین بھی ہوں تو اس سے تمہیں کیوں پریشانی ہو گئی ہے جو بلہاتے ہوئے یہاں آئے جیسے ہو؟" کینی نے بدستور سخت لہجے میں اور انگریزی ہی میں کہا۔

"لیکن نہیں! بادل گرہتے ہیں، بھلی کڑکاتی ہے اور بارش ہوتی ہے اور مینڈک اور مینڈکی کی شادی ہو جاتی ہے....." ہندوستانی نوجوان کا بعد معنی خیز معلوم ہوتا تھا جواباً خاموشی رہی، میں نے غیر محسوس طور پر کین انگلیوں سے ان کی طرف دیکھا۔

کینی ایک تک سانولے نوجوان کو گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نشے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ معلوم نہیں کیوں نوجوان کا بے شکا اور بے مروت سا جملہ مجھے کھڑکا تھا..... اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ کوڑ دروز میں بات کر رہے تھے۔ کینی کوڑا ورد سجھ نہیں پاتی تھی جس سے وہ شک میں پڑ گئے تھے۔

"میرے خیال میں تو اس وقت مینڈکی کو زکام ہو رہا ہے اور اس کا علاج میں جانتی ہوں....." بالآخر کینی نے پرہیزی سے کہا۔ "اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ میں کسی پوسٹن والے کو بلاؤں ہوں اور اگر اس کا موقع نہ ملا تو پھر مجھ کو تمہاری آنتیں نکالنی پڑیں گی۔"

"بھل! تم بلاؤج وقت ضائع کر رہے ہو....." یہ سفید فام کی بھری آواز تھی اور وہ اپنے ساتھی سے مخاطب تھا..... "نشانہ غلط ہے..... آؤ گولی کو اٹھا کر گھر لے چلتے ہیں....." یہ جملہ بھی معنی خیز انداز میں کہا گیا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو گورے!" سانولا نوجوان جھنجھل کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا، شہدوں والے انداز میں بولا۔ مجھے اب یقین ہو چکا تھا کہ وہ احسان مرزا کے آدمی نہیں تھے، گویا جس امید پر میں نے کینی کو بلو آئی وال لاکٹ ٹماؤں طور پر پسینے کی ہدایت کی تھی، اس کے نتائج ظاہر ہونے لگے تھے مگر اتنی جلدی یہ نتائج ظاہر ہونے کی مجھے امید نہیں تھی۔ ابھی تو ہم کھنڈ میں آکر سنبھلنے بھی نہ پائے تھے اور پھر یہ نتائج بھی کچھ ہمارے حق میں نظر نہیں آ رہے تھے۔

سفید فام شخص اب براہ راست کینی سے مخاطب ہوا..... "میری جیب میں جو روٹا لور

بچی غنیمت میری خوش قسمتی یہ رہی کہ فوراً ہی مجھے ٹیکسی مل گئی۔
فاصلہ تو اتنا ہی رہے دو ٹیکس و دو کالی دوڑ کریم کھر کی ایک فوراً جا رہی ہے اس کا
توقب کرو۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت کی۔ "ٹیکس دو شیارہ سے میں تمہیں سب
دیں گا۔"

"وہ سب میرے کفن دفن پر تو استعمال نہیں ہو گی نا؟"
اکمیشن میں کالی گھماتے ہوئے اس ڈرائیور نے خوشامی سے پوچھا۔
"نہیں، معاملہ اتنا بھی خطرناک نہیں۔" میں نے بھی نیم سنجیدگی سے حق اسے تسلی
دی۔ وہ باریک باریک کی بھوری موٹھوں والی ایک خوش شکل نوجوان تھا اور خاصا خوش
مزاج بھی معلوم ہوتا تھا۔ جس مین روڈ پر اس نے فوراً کا تعاقب شروع کیا تھا وہ خاصی
طویل تھی اور اس پر ٹریفک بھی بہت تھا اس لیے ان لوگوں کو یہ شب نہیں ہو سکتا تھا کہ
ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

البتہ کچھ دیر بعد فوراً ایک سڑک پر مڑی جو آگے چل کر ایک ایسی سڑک پر گئی جس
پر اکادکانی گاڑیوں یا سائیکل رکشا رواں تھے۔ میرے آلہ سماعت نے ایک بار پھر میری مدد
کی۔ میں نے سفید فام کی آواز سنی۔ "ایک بار پھر دیکھ لو۔ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا
ہے؟"

چند لمحوں بعد ایک آواز ابھری۔ "ایک ٹیکسی کالی فاصلے پر آ رہی ہے، ٹیکس لپٹیں سے
نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ اس میں کوئی نظر بھی نہیں آ رہا۔"
میں نے فوراً ڈرائیور سے کہا "بغیر محسوس طور پر رفتار بڑھاتے ہوئے اس گاڑی سے
آگے نکل لے جاؤ۔" ساتھ ہی میں سیٹ پر کچھ اور سیہ حیا ہو کر لیٹ سا گیا تاکہ فوراً
باول کو نظر نہ آسکوں۔ ڈرائیور میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نہایت عمدگی سے انہیں
ادور ٹیک کرتا ہوا گزر گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے سفید فام کی اطمینان بھری آواز سنی۔ "اوہ، یہ تو خالی تھی۔
ڈرائیور اپنی راہ جا رہا ہے۔"

وہ لوگ غالباً ایک بار پھر کینی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ کالی دیر کی خاموشی
کے بعد میں نے کینی کی آواز سنی۔ وہ غصیلے لہجے میں کسی سے کہہ رہی تھی "اگر تم نے
بات نہ بتایا تو میں جان کی پدا کیے بغیر چلن شروع کر دوں گی۔" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ
بات وہ متعلقہ شخص کے بجائے درحقیقت مجھے سنارہی تھی۔

"اب تم بڑے شوق سے چیخو میری جان!" اس کے قریب ہی سے کسی نے کہا۔
"تسہری چیخوں میں تمہارے بازوؤں کی ہڈیاں ٹوٹنے کی صدا بھی شامل ہو گی"
کینی کراہ کر خاموش ہو گئی۔

فصلہ لا سیر کی آوازوں کی ایک سنتر
توں پختہ سہیلوں

میرے پاس بھی اس وقت ہتھیار صرف اپنا وفادار منجری تھا اور ابھی میں نے اسے
بھی نہیں نکالا تھا۔ اس وقت مجھے ہتھیار سے زیادہ گاڑی کی ضرورت تھی جو مجھے میرے نہیں
تھی اور چند لمحوں کے لیے تو میں پریشان ہو گیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ابھی کار روانہ
نہیں ہوئی تھی۔ میں چاہتا تو ان سے الجھ سکتا تھا مگر اس طرح شاید میں ان کا ٹھکانا دیکھنے
اور جڑیں تلاش کرنے سے محروم رہ جاتا۔ وہ بدستور کینی کو قابو کیے ہوئے تھے۔

ساقوں نوجوان جسے سفید فام نے حمل کے نام سے مخاطب کیا تھا آگے اسی کے برابر
بیٹھ گیا تھا اور وہ دونوں نے حملہ آور بدستور کینی کو قابو میں رکھتے ہوئے بڑی مشاقی سے
ایک ہی دروازے سے کار کے پچھلے حصے میں آ پہنچے تھے۔

"اس کے صبر چرے پر خلاف چڑھاؤ۔" میں نے سفید فام کی آواز سنی۔ "کبھی یہ
راستے میں اپنے حسن کی بجلیوں گراتی چلے اور یہ بھی خیال رکھنا کہ کوئی اسحق ہمارے
تعاقب میں نہ چل پڑے۔"

"تم فکر نہ کرو شوار" یہ غالباً ان میں سے ایک کی آواز تھی جنہوں نے کینی کو قابو
میں کیا ہوا تھا۔ "اسا تم ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ کر بھول جاؤ۔"

"تمہیں معلوم ہے میں بھولنے بھلانے کا قائل نہیں۔" سفید فام نے ہلکے سے قہقہے
کے ساتھ کہا۔ "اور جلد بازی کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ جب کام مہرہ سکون سے
صحیح طریقے سے ہو رہا ہو تو بھگہ ڈ اور افراط قری سے کیا لاکھ؟ سوائے اپنے آپ کو تھکانے
کے۔"

کار اب پل پڑی تھی۔ تاہم میں نے عقبی شیشے سے اتنا ضرور دیکھ لیا تھا کہ کینی کو
ایک لمبا سو لوپ پسایا جا رہا تھا جس میں چہرہ بھی چھپ جاتا ہے پھر اس کا سریوں پیچ کر
دیا گیا کہ عقبی شیشے سے اسے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

کار نے جیسے ہی موڑ کاٹا اور میری نظر سے اوچھل ہوئی۔ میں دیوار کی اوٹ سے نکل
کر دوڑا۔ مگی کے سرے کی طرف جاتے وقت مجھے کینی کا بخیر و بے نظر آنا جہاں گرا
تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھنے کی جیب میں ڈال لیا۔

میں مگی کے سرے پر پہنچا تو گاڑی "سری گئی" کو بھی غور کر کے میں روڈ کی طرف مز

چند لمبے بعد ایک دورا ہوا آیا۔ میں نے ڈرائیور کو بائیں طرف مڑنے کی ہدایت کی، لیکن چند لمبے بعد میں نے مڑ کر دیکھا، فوراً دائیں طرف مڑ چکی تھی۔ ہم مخالف سمتوں میں بڑھتے چلے گئے۔ اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور ہیڈ لائٹس روشن کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ ایئر فون سے مجھے سفید فام کی آواز سنائی دے رہی تھی جو دھیرے دھیرے ناقابل فہم سی سمجھنا ہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

پھر یہ سمجھنا ہٹ بھی معدوم ہو گئی۔ گویا وہ میرے ٹرانسمیٹر کی رسائی سے نکل چکے تھے۔ میں نے ڈرائیور کو یو ٹرن لینے کی ہدایت کی۔ چند لمبے بعد ٹیکسی اس سمت میں قرائے بھر نے گئی، بعد میں فوراً ٹھکی تھی۔ اب ٹیکسی کی ہیڈ لائٹس روشن ہو چکی تھیں اور نون ساکن نما وہ لائٹ بند تھی جس پر ٹیکسی لفظ دور ہی سے چمکتا نظر آتا ہے۔ اس لیے اگر فوراً والے عقب نما آئینے میں دیکھتے بھی تو انہیں محض وہ ہیڈ لائٹس ہی نظر آتیں جو کسی بھی کار کی ہو سکتی تھیں۔

فوراً کی ٹیل لائٹس بہت دور نظر رہی تھیں ٹرانسمیٹر پر مجھے پہلے سمجھنا ہٹ اور پھر سفید فام کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ وہ بڑے شکفتے لمبے میں غالباً کئی ہی سے کہہ رہا تھا "نیا واقعی کھنڈہ میں تمہارا کوئی ساتھی موجود نہیں؟"

"نہی تو الموم ہے۔" کہنی نے ہلے کئے انداز میں کہا۔ "میرا ساتھی یہاں موجود ہوتا تو وہ تم سب کو درمیان سے چیر دیتا۔"

سفید فام نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا جس کے دوران اسے کھانسی آئی۔ "ایک تو تم ہندوستانیوں کو یہ درمیان سے چیرنے کی بات کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ گویا انسان نہ ہوا چیز کا درخت ہو گیا۔"

اس کے بعد کوئی کچھ نہ بولا۔ ٹیل لائٹس مجھے بائیں طرف میدان سے حصے کی طرف مڑتی دکھائی دی تھیں۔ یہ علاقہ غائبانہ نیا آہوا رہا تھا۔ کہیں کہیں مکمل اور کہیں ناقص مکانات پھیلے ہوئے تھے۔ بیشتر پلاٹ خالی تھے اور ان کے درمیان کہیں کہیں پلے گراؤنڈ بھی تھے۔ فوراً ایسے ہی ایک گراؤنڈ کے کنارے کمرے تھے جن کی سڑک پر جا رہی تھی۔ وہاں روشنی بہت کم تھی اور اونچے نیچے مکانات محض دیو لوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

میری ٹیکسی جب اس پکڑنڈی نما سڑک پر گھومی اس وقت تک فوراً بہت آگے ایک گلی میں مڑ چکی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کوڑی کو سیدھا لے آیا۔ میں نے دیکھ لیا کہ بائیں ہاتھ کی گلی میں فوراً ایک بنگلے کے سامنے رک چکی تھی۔ ٹیکسی نے مزید کچھ فاصلہ طے کیا تو سامنے پھر ایک پلے گراؤنڈ آگیا۔ میں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر ٹیکسی رکوائی اور ڈرائیور سے پوچھا کہ کیا وہ میرا انتظار کر سکتا ہے۔ اس نے بڑا غصہ مندا جواب دیا کہ اسے اگر خطرے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے تو وہ انتظار کرنے کی ٹیکس اگر ذرا بھی گڑبڑ دھکی دی تو بھاگ

لے گا میں نے اسے چند نوت دیے اور واپس اس گلی کی طرف چل دیا، یہاں میں نے فوراً کو رکتے دیکھا تھا۔

ٹرانسمیٹر پر میں نے کہنی کی آواز سنی۔ "آخر تم لوگ چاہتے کیوں ہو، کیوں لے آئے ہو مجھے یہاں؟"

"ابھی معلوم ہو جائے گا جان من۔" یہ سانو نے نوجوان کی آواز تھی۔ میں جب مکانوں کی دیواروں سے پچکا گلی میں داخل ہوا تو وہ لوگ گلی میں نظر نہیں آ رہے تھے۔ بنگلے میں داخل ہو چکے تھے۔ گاڑی بھی بنگلے کے پورچ میں داخل ہو چکی تھی لیکن پورچ میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

میں اس وقت محتاط انداز میں اندر کا جائزہ لینے کے بعد کپاونڈ وال سے کود رہا تھا۔ جب میں نے سانو نے نوجوان کی آواز سنی معلوم نہیں وہ کس سے کہہ رہا تھا "باس! ہمیں غلط شب نہیں ملی تھی لیکن میں اس مڑی کے گلیے میں لاکٹ دیکھ کر مڑ بڑا گیا تھا" پھر میں نے کوڈ دروازہ ہولا لیکن اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ تب ہم نے اس پر ہاتھ ڈال دیا۔

"ہوں" میں نے ایک بو جھل پٹکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی کہنی کی آواز سنائی دی۔ "اگر تم لوگ اس لاکٹ کی وجہ سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو تو میں بتا دوں کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی مجھے اس کے بارے میں کچھ علم ہے۔ مجھے یہ تو پتا میں ایک سر کے کنارے پڑا ملا تھا۔ مجھے اچھے گا میں نے اٹھا کر پس لیا۔"

کئی افراد کا ہم آہنگ سا تقصد گویا ہٹے میں ٹرانسمیٹر کی مدد کے بغیر بھی سن سکتا تھا۔ اسی آواز نے میری رہنمائی کی اور میں اس کمرے کی کدائی تک جا پہنچا جہاں وہ لوگ موجود تھے۔ اسی دوران میں نے سانو نے نوجوان بھل کی آواز سنی۔ "اب اتنی بھولی نہ ہو۔ ابھی میں وہ گھونسا نہیں بھولا جو تم نے میری ٹھوڑی پر رسید کیا تھا اور تمہارا لہجہ غصہ منا تو کسی ماہر فن ہی کی تربیت کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔"

"میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ میں کوئی شریف زادی ہوں۔" کہنی نے بد مزگی سے کہا۔ "میں تو صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ تم لوگ مجھے نہ جانے کس معاملے سے متعلق سمجھ رہے ہو، جب کہ میں بس ایک عام سی آوارہ گرد ہوں۔"

میں جس کھڑکی پر پہنچا وہ بند تھی۔ اس کے پٹ شیشے کے تھے لیکن ان کے عقب میں وجہ کی گرن تھی، تاہم اس میں اتنی درز موجود تھیں کہ میں اندر کا منظر کھڑکی کو چھیڑے بغیر دیکھ سکتا تھا۔ نو تعمیر شدہ اس بنگلے کے اس طویل و عریض کمرے میں برائے نام فرنیچر تھا۔ دیواروں پر رنگ و روغن، فرش پر قالین یا کھڑکیوں پر پردے نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بنگلے میں ابھی فنشنگ کا کام باقی تھا۔

وہ لوگ جس شخص کے سامنے پیش ہوئے تھے وہ ایک پھولے پھولے سے صوفے پر

دینا تھا۔ وہ مضبوط جسم کا ایک ٹانا لیکن چوڑا چٹکا جوان تھا۔ اس کی ناک نیپالیوں کی طرح قدرے بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن اس ناک کے نیچے موٹی موٹی سیاہ مونچھیں عجیب لگ رہی تھیں۔ اس کی ٹانگ کے قریب ہی ایک ٹالی گن صوفے کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ وہ سفاک اور پھر تڑا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے نہایت ادنیٰ ایڑھی کے فن بوب پہنے ہوئے تھے۔ سفید قام قدرے ہٹ کر کھڑا تھا اور لاپرواہی سے سٹار کے سٹن لے رہا تھا۔ باقی تینوں مونچھوں والے کے سامنے مودب نظر آرہے تھے۔ مونچھوں والا سرخ سرخ آنکھوں سے کینٹی کو گھور رہا تھا۔ کینٹی کے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور اس مقصد کے لیے ٹالہ سفید قام کی ٹوٹی استعمال کی گئی تھی۔

”لڑکی! دھننا“ مونچھوں والا انگریزی میں دھاڑا۔ اس نے کینٹی کے لیے ایک قلعہ لفظ استعمال کیا تھا۔ ”سچ بتاؤ تمہیں یہ لاکٹ دے کر بھیجے جانے کا مقصد کیا ہے؟ یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ تمہیں بھیجے والا احسان مرزا ہے، لیکن اس نے تمہیں یہ بیو آئی لاکٹ کیوں دیا تھا؟ یہ تمہیں بتاؤ گی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک نوجوان بھی تمہارے ساتھ آیا تھا۔ ہمارے ایک آدمی کی ذرا سی سستی سے وہ بوری خھرے او جھل ہو گیا ہے۔ خیر پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ جلد ہی وہ بھی ہمارے سامنے پہنچ جائے گا۔ تم اس کے بھروسے پر زیادہ اگڑنوں نہ دکھاؤ۔ وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ اس لیے ابھی سے زبان کھول دو تو بہتر ہوگا۔ جتنی تاخیر کرو گی اتنی ہی زیادہ تکلیفیں اٹھو گی۔“

میں کھڑکی کے قریب کھڑے کھڑے گویا سن ہو گیا۔ ان کی بات نے مجھے شدید کر کے رکھ دیا تھا۔ میں تو اپنی دانست میں بڑا ترسین لوہن بنا ہوا تھا اور بڑی بین الاقوامی جاسوسوں والی ٹیکنیک استعمال کر رہا تھا۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ سر احتیاطوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جنہیں میرے خیال میں جو انہیں معلوم نہیں ہوتا چاہیے تھا وہ سب کچھ معلوم تھا اور مجھے صحیح طور پر یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ تھے کون؟ وہ مالیا کے اصل آدمی تھے؟ فیملی سے ان کا تعلق تھا یا یہ کوئی تیسری ہی پڑی تھی؟ میں انہیں سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے بھی قاصر تھا کہ ان کی معلومات کے ذرائع کیا ہو سکتے تھے؟

ایک لمحے کے لیے تو مجھے محسوس ہوا جیسے مونچھوں والے کو یہ بھی علم ہے کہ میں اس وقت کھڑکی میں کھڑا کھوتا ہوں اور کسی بھی لمحے وہ تھمسن رائے انداز میں کھڑکی کی طرف رخ کر کے کہے گا ”اندرو آ جاؤ بر خود دار! وہاں کھڑے کھڑے کون سا تیر مار نو گے۔“

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کی شعاع بار لگائیں بدستور کینٹی پر مرکوز رہیں۔ ”ہاں ہی کیوں نہیں؟“ وہ اسے خاموش پا کر پسے سے زیادہ برہنہ سے دھاڑا۔ وہ بہت جلد اور خطرناک حد تک اشتعال میں آجائے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

”میں کہہ تو چکی ہوں کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

کینٹی نے بیزارگی سے کہا ”اب تم اپنی ہی باتیں جاؤ تو میں کیا کر سکتی ہوں۔“ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکا دیئے۔ اور اس کے اس انداز نے گویا مونچھوں والے کے رہے اسے صبر و ضبط کے لہجے میں آگ لگا دی۔ وہ بھڑک کر اٹھا اور شکاری کتے کی طرح کینٹی پر چھپتا۔ اس کا ہاتھ درندے کی طرح کینٹی کے گریبان پر پڑا تھا اور کینٹی کا اسکرٹ نیچے تک جاک ہو گیا تھا۔

کینٹی اس دوران اپنی جگہ سے ہل تک نہیں تھی، لیکن پھر اس مونچھوں والے شیطان نے نہ جانے کیا کیا کہ وہ یوں ہل کر چلیں کہ میرے روٹھے کھڑے ہو گئے میرے خیال میں اب مصلحت کی حدود ختم ہو چکی تھیں اور تانچ کی پروا کیے بغیر میرا میدان عمل میں کود پڑنا ضروری ہو گیا تھا۔

ابھی میں کھڑکی سے ہٹنے بھی نہیں پایا تھا کہ مونچھوں والے نے ایک جھٹکے سے کینٹی کو نیچے گرا دیا اور بے رحمانہ انداز میں اس کے گلے پر پاؤں رکھ دیا۔ اور شاید وہ سانس بھی نہیں لے پا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ابل ابل تھیں۔

میرے سینے میں وہی آتش فشاں پھٹ پڑا جو کبھی کبھار ہی مجھے مغلوب الغضب ہو کر اور قرشتہ اجل بن کر مخالفین کی تعداد کی پروا کیے بغیر ان پر ٹوٹ پڑنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ شاید میرے پلٹنے کی رفتار بہت تیز تھی جو میں اس منہر سے بچ گیا جو عقاب سے میرے پہلو میں گھونپنے کے لیے گھبرا گیا تھا۔

وہ شخص نہ جانے کب اور کس طرح میرے پیچھے آن پہنچا تھا کہ میری چھٹی حس نے مجھے ذرا بھی چونک نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اب شاید ہی سمجھی ہوا ہو۔ انشراوقات تو میری چھٹی حس یوں کام کرتی تھی جیسے میری گدی پر بھی آنکھیں ہوں۔

گویا میرا وہ اندیشہ کسی حد تک درست ہی تھا کہ وہ لوگ شاید کھڑکی پر میری موجودگی سے بھی باخبر ہوں۔ اگر وہ نہیں تو ان کا یہ ساتھی بہرحال ضرور باخبر ہو چکا تھا۔ وہ میرا تعاقب کرتے ہوئے ہی وہاں تک پہنچا ہو۔

میں تعاقب میں اتنا محو تھا کہ اپنے تعاقب کا مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔

منہر میرے پہلو میں گھسنے کے بجائے دیوار سے ٹکرایا تھا۔ سب سے پہلا خیال تو اس وقت مجھے یہ آیا تھا کہ اب کوئی آواز اندر نہیں گونجی چاہیے کیونکہ اگر اندر والے پانچوں کے پانچ ایک وقت باہر کو پک پک پڑتے تو میں مصیبت میں پھنس جاتا، بلکہ شاید میری مصیبتوں اور مسرتوں سب ہی کا خاتمہ ہو جاتا کیونکہ مونچھوں والے کے پاس ٹالی گن بھی موجود تھی۔

میری خوابیدہ قوتیں تو بیدار ہو ہی چکی تھیں، جسم بھی بجلی بن گیا تھا۔ میں نے حملہ آور کے بازو پر کرائے کا وار کیا۔ منہر اس کے ہاتھ سے ٹرگے اور بازو کی ہڈی ٹوٹنے کی وجہ

سے اس کا بازو دھیلے ڈھالے انداز میں جھول گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے کوئی آواز نکل پاتی، میرا ایک ہاتھ تختی سے اس کے منہ پر جم چکا تھا اور چشم زدن میں دوسرے ہاتھ میں اس کی پیشانی دبا کر میں نے مخصوص جھکا دیا اور اسے آرام سے فرش پر لٹا دیا۔ وہ مرچکا تھا۔ گردن ٹوٹنے کی وجہ سے۔

میں کمرے کے دروازے کی طرف دوڑا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ میں نے ٹھوکر سے اسے کھولا۔ میرا خنجر اس وقت نوک کی طرف سے میرے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان دبا ہوا تھا۔ مونچھوں والے کے چاروں ساتھی بڑبڑا کر چلے۔ ٹوڈ مونچھوں والے کا سرخ تو دروازے ہی کی طرف تھا اور اس وقت بھی اس کا پاؤں تختی کے گلے ہی پر تھا اور دباؤ غالباً کچھ اور بڑھ چکا تھا۔ کیونکہ کبھی برقی طرح پاؤں بچ رہی تھی۔

مونچھوں والا میرے اندازے کے مطابق واقعی بے حد پھرتا تھا اور صرف پھرتا ہی نہیں دھین بھی۔ اس نے پٹ کر صوفے کے سمارے کھڑی ہوئی ٹائی گن اٹھانے کے بجائے پلٹ میں اڑسا ہوا رہا اور اتنی پھرتی سے نکلا کہ مجھے اس پر انسان کے بجائے کسی مشین کا ٹکڑا لگا۔ لیکن خنجر ایک بار آپ کی دو انگلیوں کے درمیان سے ایک خاص انداز میں نکل جائے تو پھر انسان خواہ کتنا ہی پھرتا ہو اس کی رفتار کو مات نہیں دے سکتا۔

مونچھوں والے کو غالباً یقین ہی نہیں آیا تھا کہ خنجر اس کے حلقوم میں دسے تک پیوست ہو چکا ہے اور فرش پر گرنے تک تو وہ یقین اور بے یقینی محسوس کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو بیٹھا تھا۔ وہ چپٹ گرا تھا اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

میرے پاس کبھی کا خنجر بھی موجود تھا اور وہ میرے ہاتھ میں بھی مشعل ہو چکا تھا۔ لیکن اسے استعمال کرنے کی مجھے صلت نہیں مل سکی۔ کیونکہ سفید غام اور ایک دوسرے بد معاش کا ریلوور نکل آیا تھا۔ جب تک انہوں نے غار کیا تب تک میں ٹپونے کی طرح ان کے درمیان سے گزر کر صوفے کے سمارے کھڑی ٹائی گن اٹھا چکا تھا۔ کبھی کا خنجر میں نے صوفے پر پھینک دیا تھا۔

اس سے پہلے کے فائر کرنے والے میری طرف گھوم سکتے ہیں نے انہیں ہی نہیں ان کے ہاتھی دو ساتھیوں کو بھی چھٹی کر دیا تھا۔ جو ابھی تک سمجھ ہی نہیں پاسے تھے کہ ہوا کیا ہے۔ یہ سب کچھ شاید تین یا چار سیکنڈ میں ہو گیا تھا۔ پانچ اٹھیں میرے سامنے پڑی تھیں اور فرش پر خون یوں پھیلے ہوا تھا جیسے فرش ہی سے ابل رہا ہو۔

ٹائی گن بغل میں دبا کر میں نے صوفے سے کبھی کا خنجر اٹھا دیا اور اس سے کبھی کے ہاتھوں کی بندشیں کاٹیں۔

وہ برقی طرح اپنا سینہ اور گھاٹا مسلنے لگی پھر اس نے نفرت سے مونچھوں والے کی لاش کو ٹھوکر ماری اور پھنسی پھنسی قی آواز میں بولی۔ "یہ دو دنگے کے بد معاش کسی کو مجبور پا

کر فوراً ہی قزو غلب کے دیوتا بن جاتے ہیں۔"

میں اس کے حلقوم سے اپنا خنجر نکال کر اسے صوفے کی پوشش سے صاف کرنے لگا۔ کبھی کا خنجر میں نے اس کو تھما دیا تھا۔ "نہتا" دروازے کی طرف سے ایک آواز من کر میں تیزی سے گھوما۔

"سراپ وقت ضائع نہ کیجئے اور جلد از جلد یہاں سے نکل چلئے۔" بڑے مودیانہ لیکن پروقار لہجے میں کہا گیا تھا۔

میں نے دیکھا وہ بے دارغ سفید سوٹ میں ملبوس ایک بٹل عمر شخص تھا۔ وہ کھین شیو تھا اور ہال سینے سے سنورے ہوئے تھے جوتے تک یوں چمک رہے تھے جیسے وہ برابر والے گھر سے یہاں کسی قریب میں آیا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی اور ہاتھ میں کوئی ہتھیار بھی نظر نہیں آ رہا تھا تاہم میں نے فوراً ٹائی گن بغل سے ہاتھ میں مشعل کرلی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر مسکراتے ہوئے بولا "دیکھئے مجھے بھی چھٹی مست کر دیجئے گا، جتنی فائرنگ ہو چکی ہے اتنی ہی کافی ہے۔ یہ علاقہ نیم ویران ضرور ہے مگر پولیس پادریاں عموماً یہاں مشت کرتی رہتی ہیں کیونکہ یہاں مار دھاڑ اور دیگر دھندے کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی پادری اس طرف آنکے یا کوئی اسے یہاں تک لے آئے، آپ میرے ساتھ چلیے۔"

"تمہاری تعریف۔" میں نے سخت لگا ہوں سے اسے گھورا۔

"میں رہی ہوں جسے کبھی رستوران میں آپ سے ملنا تھا۔" وہ مہیاانہ انداز میں مسکرایا۔ "لیکن الموس کہ میں حادثاتی طور پر کچھ لیٹ ہو گیا اور آپ کو یہ ساری تکلیف اٹھانی پڑی۔ میں نے آپ کو اس وقت دیکھا اور سفید رومال کی وجہ سے پہچنا، جب آپ ٹیکسی میں سوار ہو رہے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں گاڑی موڑ کر دن دسے کی پیمندی کرتے ہوئے آپ کے پیچھے لانا، آپ بہت دور جا چکے تھے۔ بہر حال میں آپ کا تعاقب کرتا رہا لیکن اس علاقے میں پہنچ کر ایک مگلی کے قریب میں نے آپ کا سراغ نکھو دیا۔ اب فائرنگ کی آواز سے متوجہ ہو کر یہاں پہنچا ہوں۔ آئیے اب وقت ضائع نہ کیجئے۔"

وہ چلنے کے لئے مڑ گیا۔ میں نے کبھی کی طرف دیکھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کندھے اچکائے اور سفید پوش اجنبی کے پیچھے چل پڑا۔ کبھی میرے ساتھ ہوئی۔ وہ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے اپنی جاک گریہانی کا مداوا کر رہی تھی۔

چلتے وقت اجنبی کے کندھے عجیب سے انداز میں اٹھے ہوئے تھے۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ اس کی دونوں بظلوں میں ہولسٹر اور ان میں ریلوور موجود تھے۔ وہ کہاؤندہ والے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہمیں بچنے کے مقصد سے کسی طرف لے جا رہا تھا۔ "تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟" میں نے مدھم توار میں کہا۔

قرانی کروالیں۔

وہ دھڑکتے سے اٹھی اور اس کے پڑھنے پر زندگی کے کچھ آثار لوٹ آئے۔ میں نے رام پر شاد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "کون تھے یہ لوگ؟"

"وہ دشمن ہی رہے ہوں گے۔" اس نے محتاط لہجے میں کہا۔
"واہ بڑا عمدہ انکشاف کیا ہے تم نے۔" میں نے جیتنے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تو انہیں اپنا جاں نثار دوست ہی سمجھ رہا تھا اور کبھی بھی یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اسے گمراہی کر کے ہمارے لیے کوشش کر رہے ہیں۔"

"آپ تو برا مان گئے؟" رام پر شاد جلدی سے بولا۔
"میرا مطلب تھا کہ میں ان کے بارے میں صحیح طور پر کچھ نہیں جانتا۔ میں تو خود آج انہی لوگوں کی کارروائی کا شکار ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے آپ تک پہنچنے میں تاخیر ہوئی۔" اس نے نہ جانے کب میری گاڑی کے ایک وکیل کے ساتھ ڈھیلے کر دیے تھے۔ میں نے جانے کس خیال میں تھا کہ ڈرائیونگ کے دوران میں نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ پتا تو اس وقت چلا جب وہ پیسہ عین ایک چوراہے پر نکل کر لڑھکتا ہوا سیدھا ٹریفک سارجنٹ سے جا کرایا۔

اس نے قہقہہ لگایا لیکن میں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔
"بھگہ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے" میں نے کہا "اس کی مدد سے کوئی سراغ نہیں لگ سکتا۔"

"بھگہ" اس بار اس نے گویا میرے پچکانہ پن پر قہقہہ لگایا۔ "ارے صاحب بھگہ تو کسی شریف آدمی کا ہوگا" اسے تو علم بھی نہیں ہو گا کہ جو بھگہ وہ چاقو سے بنوا رہا ہے اس میں آج رات کیا ہوا ہے۔ اسے تو اب پولیس ہی جا کر سب کچھ بتائے گی اور اسے بھی شامل تفتیش کر لے گی۔ ان کے بارے میں کچھ جاننا آسان نہیں۔ میں بہت کوشش کر چکا ہوں۔ مزید چند منٹ کے سفر کے بعد ہم ایک کشادہ نگلی میں داخل ہوئے اور ایک ہندو بدھ اپارٹمنٹ ہاؤس کے قریب رام پر شاد نے گاڑی روک لی۔ گلی میں سناٹا تھا۔ میں اسٹین گن لے کر اترنے لگا تو رام پر شاد جلدی سے بولا "اوہ براؤ کرم اسے گاڑی ہی میں رہنے دیجئے اس عمارت میں بڑے ہی نرم ہنس قسم کے شرفاء رہتے ہیں۔ کوئی راستے میں ٹکرا کر تو ہلاک نہیں دیکھ کر ہی بے ہوش نہ ہو جائے۔"

میں نے گن سیٹ ہی کے نیچے چھوڑ دی۔
رام پر شاد کی رہنمائی میں ہم لکھ کے ذریعے پانچویں منزل پر ایک اپارٹمنٹ میں پہنچے۔ یہ ایک نگراہی اپارٹمنٹ تھا اور اس کی آرائش شاپانہ اور متحرک تھی۔ قرائن بتاتے تھے کہ یہاں وہ تنہا ہی رہتا تھا۔ اس نے ہمیں ڈرائنگ میں بٹھایا اور ہر ٹکلف میزبانوں کی طرح

"رام پر شاد" اس نے مڑ کر دیکھے بغیر غلط لہجے میں جواب دیا۔

عقبی کھلی میں کچھ دور رام پر شاد کی کار دیوار کے قریب ہی کھڑی تھی اور کبھی عقبی نشست پر بیٹھ چکے تو اس نے اسٹیمرنگ وکیل سنبھالتے ہوئے کہا "ٹائی گن سیٹ کے نیچے ڈال دیجئے۔ ہمیں جہاں سے گزرتا ہے وہاں کافی ٹریفک ہوگا۔ اور ابھی حقیقتاً رات بھی نہیں ہوئی۔"

میں نے گھڑی دیکھی جسے میں نیپال کے وقت سے ملا چکا تھا۔ ابھی صرف ساڑھے چھ بجے تھے لیکن گھر سے سیاہ بادلوں اور سردی کی وجہ سے یوں لگ رہا تھا جیسے رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔

میں نے ٹائی گن سیٹ کے نیچے ٹھیس دی لیکن بال ہاتھ ہی میں تھمتے رکھی۔ رام پر شاد گاڑی دیوار سے لگا تو مجھے یاد آیا "لوہر میدان کے قریب ایک ٹیسی والا میرے انتظار میں کھڑا ہوگا۔ میں اسے رخصت کر دیتا تو بہتر تھا۔"

"وہ کب کا رخصت ہو چکا ہے۔" رام پر شاد نے بتایا "میں نے اتفاق سے اس کی ٹیسی درخت کی ٹوٹ میں گرنے دیکھ لی تھی اور اس سے آپ کے متعلق پوچھا تھا۔ لیکن اس نے لٹی میں گردن ہلا دی تھی اور اس سے پہلے کہ میں اس کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اس کی گردن پکڑتا وہ گاڑی اسٹارت کر کے پھل دیا تھا۔ اُتر رہا بھی رہتا تو فائرنگ کی آواز سن کر تو سیر حال رفو پتھر ہو ہی جاتا۔"

"بے شک" میں نے اس سے اتفاق کیا اور سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگا لی۔ کبھی دونوں ہاتھ بدستور بغلوں میں دیے دروازے کے قریب سگری سٹی ٹیسی تھی۔ یہ خاصی معطل نظر آ رہی تھی۔

"اتنی چپ چاپ کیوں ہو؟" میں نے پوچھا۔
"اس موچھوں والے مردود نے گویا گردن ہی توڑ کر رکھ دی ہے۔" وہ بیٹھی بیٹھی ہی آواز میں بولی۔

"میں نے اسے اس کے کیے کی سزا بھی تو دے دی" میں نے کہا۔
"ہاں جی تو دل کچھ ٹھنڈا ہوا ہے" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "ویسے میں اسے اتنی جلدی اور اتنی کم تکلیف کے ساتھ مرتے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔"

"معاف کرنا اس وقت جلدی میں کی کچھ بن پڑا" میں نے یوں کہا گویا کوئی میزبان بے وقت آنے والے مہمان سے معذرت کر رہا ہو کہ معاف کیجئے گا اس وقت آئیے ہی پیش کر سکتا ہوں۔ گھر میں پکانے کے سے کچھ ہے نہیں اور بازار بند ہو چکا ہے۔

"بہر حال" میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا "ان کے مزید ساتھی ہاتھ لگے تو انہیں تمہاری مرضی کے عین مطابق کیڑا کردار تک پہنچاؤں گا۔ خواہ قتل ہوانا خواہ سالم ہی

پوچھنے لگا کہ ہم کیا چنا پڑ کر رہے ہیں۔

میں نے کافی اور کتنی بے پرواہی طلب کی جو اس نے چند منٹ میں حاضر کر دی۔ اپنے لیے وہ برہن کا ایک گلاس تیار کر لے گا۔ جام تیار کر کے وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ اب میں نے پہلی بار اسے گہری نظروں سے دیکھنے کا جائزہ لیتے دیکھا۔ لیکن اس کی نظروں میں لڑکچاہن نہیں تھا۔ وہ مکمل طور پر ایک مذہب اور شائستگی تو ملی معلوم ہوتا تھا۔ اسے اور اس کے انداز و اطوار کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جرم کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق ہوگا۔

"میں اب تک نہیں سمجھ سکتا۔" میں نے کافی کی چشماں لیتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ دستوران میں ہماری جو ملاقات ہوئی تھی، اس کا مقصد کیا تھا؟"

"مقصد تو آپ سے رابطہ پیدا کرنا اور آپ کی ضروریات سے آگاہی حاصل کرنا ہی تھا۔" اس نے گلاس کو پر خیر انداز میں انگلیوں میں تھماتے ہوئے کہا "مجھے یہ احکامات ملے ہیں کہ میں آپ کی ضرورت کی ہر چیز سنبھالوں۔ لیکن تمام تر احتیاط صرف آپ کی آمد کو خفیہ رکھنے کے لیے کی جا رہی تھی۔ بد قسمتی سے یہ احتیاط کچھ زیادہ کارآمد نہیں رہی۔ آثار بتاتے ہیں کہ دشمنوں کو نہ صرف آپ کی آمد کا علم ہے بلکہ شاید وہ آپ کے مشن سے بھی آگاہ ہیں حالانکہ میں اس سے بے خبر ہوں۔"

وہ مسکرایا اور گلاس خالی کر کے کھڑکی ہی میں رکھ کر ٹھیلنے لگا۔ ایک سائیڈ ٹیبل پر ایک ہارےب اور شاندار جرمن ریو اور یوں رکھا تھا جیسے وہ بھی سجاوٹ کی کوئی چیز ہو۔ اس کا چیمبر مجھے خالی ہی معلوم ہوتا تھا۔ رام پرشاد نے ٹھیلے ٹھیلے بے توجہی کے عالم میں اسے اٹھا لیا اور ہتھیلی پر رکھ کر اس کی چوٹی کو تھماتے ہوئے بولا "آپ دونوں چاہیں تو ہوٹل سے اب یہیں اٹھ آئیں۔ آج رات ساڑھے سات اور آٹھ کے درمیان احسان مرزا صاحب کی کال آنے کی توقع ہے۔ میری براہ راست انہی سے بات ہوگی۔ میں انہیں حالات سے مطلع کروں گا۔"

"اس سلسلے میں میں صبح کوئی جواب دوں گا۔" میں نے کہا "میرے خیال میں اب زیادہ احتیاط کی بھی ایسی ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے اگر تم برا محسوس نہ کرو تو مرزا صاحب سے میں بھی بات کر لوں۔"

"میں تو خود آپ سے یہی درخواست کرتے والا تھا۔"

رام پرشاد جلدی سے بولا۔ "بہر حال اب آپ یہ بتا دیجئے کہ آپ کو کس کس چیز کی ضرورت ہے؟"

"نہ جانے کیوں اب میں کسی بھی چیز کی کوئی خاص ضرورت نہیں محسوس کر رہا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کافی کا کپ پیانی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اور اگر کسی چیز کی ضرورت پڑی

بھی تو شاید میں اپنے ہی طور پر حاصل کر لوں، البتہ ایک سوال کا جواب سبب حاصل کرنے میں سخت ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔"

"وہ کیا سر؟" اس نے ٹھیلے ٹھیلے رک کر پوچھا۔

"وہ سوال یہ ہے کہ دشمنوں کے ہاتھ تم کتنی قیمت میں بکے ہوئے۔ ہو؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا؟" اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ ریو اور اس کے ہاتھ میں سسپاکت تھوکر اس کی چوٹی اب بھی گھوم رہی تھی۔

"میں نے ایک سیدھا سا سوال کیا ہے رام پرشاد۔" میں نے کہا "اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنا۔" میں کم عمر بھی ہوں اور بعض معاملات میں اتنا بڑبی بھی۔ لیکن میں احسن ہرگز نہیں ہوں۔ تم نے ہمیں مروانے کا بڑا عمدہ بندوبست کیا تھا۔ لیکن جب بازی پلٹنے دیکھی تو معصوم بن کر سامنے آ گئے۔ پرانے کھلاڑی ہو نا۔"

"تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ سنبھل کر بولا۔ "تمہیں مروانے کر مجھے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

"یہ تو تم ہی بہتر بتا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تاہم تھوڑا بہت اندازہ مجھے ضرور ہے۔ ہماری آمد سے تمہارے کچھ مذاقات متاثر ہونے کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے سو گا۔ احسان مرزا کی نظروں سے دور بیٹھ کر یقیناً تمہاری پانچوں ٹھیں میں ہوں گی اور پھر ہمارا سودا تو تم نے دیسے بھی سنے داموں نہیں کیا ہوگا۔"

"تم دیکھتے میں ہی اپنے نہیں تمہاری باتیں بھی بچکانہ ہیں۔" وہ کھسکے انداز میں ہنسا۔ "میں بارہ سال سے احسان مرزا کے ساتھ ہوں۔"

"پہلے تم یقیناً اس سے قطع رہے ہو گے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "اس سادھ کی وجہ سے وہ تم پر ٹیپ نہیں کر سکا ہوگا۔ بہر حال اب تم جلدی سے بتا دو کہ تمہیں ہمارے متعلق کیا کچھ معلوم ہے؟ تم نے ان لوگوں کو کس حد تک بتایا تھا۔ تو میرے ہم تنہوں مارے جا چکے ہیں؟ اور یہ کہ تمہاری منبری کی وجہ سے ہمیں مزہ کیا خطرات درپیش ہو سکتے ہیں۔"

"تم نے تو میرے سامنے پورا ایک امتحانی پرچہ رکھ دیا ہے۔" وہ مسکرایا۔ "آخر تمہیں کیا فکر یقین ہوگا۔"

"فنگلو کو طول مت دو رام پرشاد۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں اس وقت تک فیصلے کرنے کے معاملے میں سخت غلط پسند ہو چکا ہوں۔ تم یہ مست سمجھنا کہ میں کوئی انسانی قدم اٹھانے کے لیے احسان مرزا سے اپزیت یا مشورہ طلب کر رہا ہوں۔"

رام پرشاد بدستور مسکرا رہا تھا۔ اور اس طرح مسکراتے مسکراتے اچانک اس نے خاں ریو اور مجھ پر کھینچ مارا۔ مجھے اس کی طرف سے حملے کی توقع تو تھی مگر میرا خیال تھا کہ وہ

"اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ پروگرام کس حد تک خراب ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"رام پر شاد کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اتفاق کے پار۔" میں نے جواب دیا "وہ ایک چکا تھا بلکہ نہ جانے کب سے بکا ہوا تھا۔ اسے طویل سفر پر بھیجا بہت ضروری ہو گیا تھا۔"

"اور!" احسان مرزا نے بولے سے کہا اور چند لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

"تاسف کا شکار ہو گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں نہیں" وہ جلدی سے بولا۔ "میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے بڑی تاخیر سے پتا چلا۔ اور اب اپنی ناکامیوں کی وجہ بھی سمجھ میں آئی۔ پھر قدرے توفیق سے بولا۔ "بہر حال تمہیں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس کے لیے ایک ایڈریس اور نوٹ کرلو۔" اس نے مجھے ایک شخص کا نام دیتا نوٹ کرایا۔

"اور کچھ۔" آخر میں اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا "ذہانی ہی باتیں ہوں گی۔ بشرط زندگی۔"

"بھگدک۔" اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کرایا۔ میں نے مڑ کر دیکھا کتنی اپنے گلاس میں کچھ نور برآمدی انداز میں رہی تھی۔

"فی الحال تم اس کا پیچھا چھوڑ دو۔" میں نے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جتنی جلد ہم یہاں سے نکل چلیں اتنا ہی بہتر ہے۔ ہم اب ہوش واپس چلتے ہیں۔ راستے میں ابتداً اس شخص سے ملنے چلیں گے جس کا ایڈریس احسان مرزا نے نوٹ کرایا ہے۔ یہ ایک دکان کا پتا ہے کہیں بند ہی نہ ہو چکی ہو۔"

کتنی گلاس چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے پائی پر سے رام پر شاد کی گاڑی کی چابی اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ کتنی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"اس کا کیا بنے گا؟"

"اسے پولیس کے لیے چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "پولیس اُمر لاشیں بھی ٹھکانے نہیں لگائے گی تو خریدا کرے گی؟"

"یہ بھی درست ہے۔" کتنی مسکراتے ہوئے بولی اور میرے ساتھ چل دی۔

مجھے آخر رام پر شاد کی شاندار گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی۔ پونچتے پاپتے ہمارے علاقے میں پہنچے اس کا نام چائنا ٹاؤن تھا۔ یہاں کی گلیاں تنگ و تاریک اور اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں۔ ایک مقام پر پہنچ کر ہمیں کار چھوڑ دی دینی پڑی کیونکہ پر تپ گلیوں سے اس کا گزرتا ممکن نہیں رہا تھا۔ ان گلیوں میں کوئی شخص آتا جاتا نظر نہیں آ رہا تھا جس سے ہم مزید آگے راستہ دریافت کر سکتے۔ اس لیے ہم محض اندازے سے ہی آگے بڑھتے جا

بغلی ہو سفر سے ریو اور نکالنے کی کوشش کرے گا اور اس کے لیے میں تیار تھا لیکن مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ خلی ریو اور مجھ پر کھینچ مارے گا۔ تاہم اضطراری طور پر میں ایک طرف ہو گیا تھا اور اس جہلی سے رد عمل نے مجھے بچا لیا۔

کاؤنچ جس ریو اور کے ساتھ تھی ہوئی تھی۔ ریو اور اس سے ہوں گرایا جیسے کوئی وزنی ہتھوڑا اس پر مارا گیا ہو۔ اگر ریو اور میرے چہرے پر پڑا ہوتا تو یقیناً عمر بھر کے لیے میرے آنکھ میں ہی تہیں ہو جاتے۔

رام پر شاد کا ہاتھ بغلی ہو لہر تک پہنچ چکا تھا لیکن اس وقت تک میں اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ ہاتھ پائی کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میں نے اس کی گردن پر سراسے کا پہلا ہی ہاتھ فیصلہ کن رسید کیا۔ اس نے ایک ہنگامی لی اور قلعین پر چپ کر کر سکت ہو گیا۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

"تم تو واقعی بہت غلٹ پسند نظر آ رہے ہو۔" کتنی نے براہمزی کا چھوٹا سا گلاس تپائی پر رکھ کر سرسری سے سنے میں کہا اور ہزاری سے رام پر شاد کی لاش کی طرف دیکھ جیسے وہ شخص کاٹھ کباز کا ایک ڈھیر ہو۔

"میں جنگل کے درندوں کو تو کچھ پھوٹ دے سکتا ہوں۔ آستین کے سانپوں کو نہیں۔" میں نے ٹپکتے ہوئے کہا "ایک بار اُمر معصوم ہو جائے کہ آستین میں سانپ موجود ہے تو پھر اس کو مارنے میں تاخیر کرنا خود کشی کے مترادف ہے اور فی الحال میں خود کشی کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

دھنسا "فون کی کھنٹی بج رہی تھی۔"

چند لمحے کے لئے میں ابھن میں رہا لیکن جب کھنٹی دوبارہ بجی تو میں نے آگے پیٹ کر رہیور اٹھا لیا۔

"ٹو تھری ٹائن ٹو سکس" ایک مترنم نسوانی آواز نے پوچھا۔ میں نے ٹیلی فون پر نمبر دیکھتے ہوئے کہا "ہیس"

"ہوؤ کجئے۔" سبکی سے آپ ٹی کل ہے "آپ نے کہا اور دوسرے ہی لمحے خک کلک شروع ہو گئی۔ میں نے گہری سانس لی۔ چند سیکنڈ بعد ہی جس آواز نے پہلو کہا اسے میں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ "کیا خبر ہے؟" اس نے پوچھا۔

"خبر کچھ اچھی نہیں۔" میں نے دھیر سے کہا۔

"وہ تو تم یہاں موجود ہو۔" احسان مرزا نے بھی گہری سانس سے کر کہا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جس طرح میں اس کی آواز ہزاروں میں پہچان سکتا ہوں اس طرح وہ بھی میری آواز سے دھننی شناس ہو چکا ہے۔

"پروگرام کے مطابق تو اس وقت تمہیں یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔" اس نے کہا۔

رہے تھے۔

گھیاں بے شک تھیں وہ ایک تھیں لیکن مکانات کئی کئی منزلہ تھے اور اوپر کی منزلیں آٹے سامنے گویا ایک دوسرے سے بغلیں ہو رہی تھیں۔ کہیں کہیں کسی کونے پر کڑور سی روشنی کا کوئی گرد آلود بلب توڑا تھا وہ نہ کئی سال دیواریں ملتی تھیں نہ کسی کا لہارہ اور نہ کھڑی تھیں۔ کھلی ٹائیوں کی بدولت کے علاوہ دروازوں سے بھی سلیں کی بو پھونک رہی تھی۔ قدم قدم پر ایک عجیب سی وحشت کا احساس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی کہیں تاریکی سے کوئی ہاتھ برآمد ہو گا اور پہلو میں فحش گھونپ دے گا۔

ہم شاید کسی کی مدد کے بغیر مطلوبہ ایڈریس پر نہ پہنچ پاتے لیکن یہ اتفاق ہی تھا کہ سطح زمین سے کافی نشیب میں ایک مکان کے تہ خانہ نما حصے کے دروازے پر ہمیں ایک چوڑی لائین نظر آئی۔ یہ لائین دراصل ایک سائن بورڈ پر آویزاں تھی۔

مگر آلود سائن بورڈ پر اوپر سے نیچے کئی سطروں میں چینی میں نہ جانے کیا تحریر تھا۔ لیکن ایک طرف انگریزی میں میٹرے میٹرے حروف میں لیوٹنگ کی نوادرات کی دکان بھی لکھا ہوا نظر رہا تھا۔ میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی، مجھے اسی جگہ کی تلاش تھی۔ تین میٹرے میں تر کر ہم دروازے تک پہنچے۔ دروازہ خود نوادرات میں شمار ہو سکتا تھا۔ یوں تو اس میں شیشہ بھی لگا ہوا تھا مگر گرد اور میل کی مٹی کی تہ کے باعث اس کے پار دیکھنا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی اس پر کوئی ایسی تختی آویزاں تھی جس سے علم ہو سکتا کہ دکان بند ہے یا کھلی۔ تاہم جب میں نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ مسلسل چرچاہٹ کے ساتھ یوں کھٹا چلا گیا جیسے اندر موجود کسی شخص کو خبردار کر رہا ہو۔

باہر سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ دکان اتنی طویل و عریض ہوگی۔ چست کوئی بھدے سے ستون سارا دیے کھڑے تھے۔ ہر مدھم سی روشنی میں جتنا بیولے معلوم ہو رہے تھے۔ دیواروں کے ساتھ کہیں کہیں گرد آلود شوکیش اور چند ایک شیشے بھی موجود تھے جن میں مختلف بناوٹ کی کچھ رنگ آمیزیاں، مٹی کے کچھ ٹوٹے پھوٹے کھلونے اور فن آرائش کا مذاق اڑانے والی کچھ آرائشی شیاؤں اور پتلی ہوئی سالنور، کتب اور کنڈرات موجود تھے۔ کچھ نوادرات اس اعتبار سے واقعی نادر تھے کہ ان کے بارے میں یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ وہ کیا چیز تھیں۔ دکان میں تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی لیکن اس کا مخرج کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

ٹھنکنے کے سے انداز میں ہم نے تقریباً پوری دکان کا پھر لگا لگا۔ کہیں کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔ میں نے ہانک لگائی۔ "کوئی ہے؟" میں نے سوال انگریزی میں کیا تھا۔

"میں یہاں ہوں۔" ایک شوکیش کے عقب سے منمناتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

ہم وہاں پہنچے تو سچ پر ایک عجیب انگشت مر انسان گاڑتے کے سہارے لینا نظر آیا۔ وہ

ایک سوکھا سوا سا چٹنی تھا مگر پیٹ یوں پھوٹا ہوا تھا جیسے سانپ نے اندھا لگھ رکھا ہو۔

اس ٹھنڈے دینے والی سردی میں وہ صرف ایک تھوڑے سیٹھے کی تہ میں دبائے لینا تھا۔ اس کے پیٹ کی بلند چلی چلی سی تھی اور اس پر نیلی رنگیں پھیلی نظر آ رہی تھیں اور صرف اسی کی وجہ سے وہ چپت پڑے ہوئے کسی پر سے سے سینڈک سے مشابہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی لمبی سی نوکیل اور پھوڑی دار مٹی ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک طرف کوڑھلی ہوئی تھی اور گدلی گدلی سی نکلیں گویا بیٹائی سے خروم تھیں۔ میں اندازہ نہیں کر سکا کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا یا نہیں، بہر حال اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"مجھے احسان مرزا نے بھیجا ہے۔" میں نے کسی قسم کے کوڑور کا ٹکف کیے بغیر براہ راست کہا۔ وہ ایک تخت یوں اٹھ بیٹھ جیسے کسی طاقتور اسپرنگ نے اسے اچھل دیا ہو۔ "کیا تھم ہے میرے؟" اس نے چراغ الہ دین کے جن والے سائیں میں پوچھا۔ چلنے کے اعتبار سے بھی وہ چراغ الہ دین کے جن کا چھوٹا ماڈل معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اسی آتے آتے رہ گئی۔

مکتبہ اسلامیہ
کتاب پر مشتمل
مکتبہ اسلامیہ

قرآن الہامی اور دیگر کتب

تعمیل چھتہ تہ

میں وہ بھی اس کے بے پناہ حسن سے متاثر تھی یا مجھے متاثر دیکھ کر رشک و حسد کے لئے جسے جذبات کا شکار تھی۔ میں تو بہر حال اس افسانہ پر بھی حیران تھا کہ چھپکی نما ایک شخص کی بی بی اس قدر حسین کیونکر تھی۔

لیو ٹانگ نے چینی میں لڑکی سے کچھ کہا اور وہ اثبات میں سر ہل کر کمرے سے نکل گئی۔ لیو ٹانگ ہمارے سامنے ایک نشست پر موبیہ انداز میں یوں بھٹک گیا گویا مراقبے میں چھا گیا ہو۔ کبھی اور میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔

چند لمحے بعد بی چن ایک نہایت خوبصورت ترقی کرنے پر تراشیدہ ہیرے کی طرز پر بنے ہوئے تین بلوری گلاس رکھے واپس آئی۔ جن میں اور غوانی رنگ کا کوئی مشروب موجود تھا۔ قریب آکر وہ گلاس تپائی بے رکھنے کے لئے جھکی تو اس کے وجود سے انہی ہوئی مہک نے مجھے مسحور سا کر دیا۔

لیو ٹانگ نے مراقبے سے سر اٹھا کر ہمیں گلاس اٹھانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں، تکلف پیجئے۔ یہ شراب نہیں ہے، تاہم اگر کسی بھی قسم کی شراب یا دھنکی وغیرہ کی ضرورت ہو تو بلا جھجک حکم دیجئے گا، حاضر کر دی جائے گی۔"

"شکریہ! بس جو کچھ ہے، یہی ٹھیک ہے۔" میں نے مسکرا کر گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ قدیم چین کے امراء کا مشروب خاص ہے۔" اس نے ایک گلاس خود اٹھاتے ہوئے کہا۔

مجھے نہیں معلوم کہ مشروب پیتے کے بعد کبھی کی کیا حالت ہوئی تھی، تاہم میری اپنی تو چند لمحے بعد یہ حالت تھی کہ رگوں میں دوڑتا ہوا خون جیسے آتش سیال بن گیا تھا۔ کانوں کی لوتیرا بری طرح تپنے لگی تھیں اور پی چاہنے لگا تھا کہ میں اپنے جسم پر کوئی گرم کپڑا باقی نہ رہنے دوں۔

"کھانے میں تب کیا پسند فرمائیں گے؟" لیو ٹانگ نے پوچھا۔ "ان تکلفات کی ضرورت نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "بس ہمیں دو ٹائی گنیں غیر اسمبل شدہ حالت میں اور ایک موبرگ ریو اور اسمبل شدہ حالت میں عطایت کر دیجئے۔" لیو ٹانگ نے چینی زبان میں بی چن سے کچھ کہا اور وہ ایک بار پھر متصل کمرے کے دروازے میں لہراتا ہوا پردہ اٹھا کر اس کے پیچھے غائب ہو گئی۔ چند لمحے بعد وہ کئی ڈبے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے واپس آئی۔ ان ڈبوں پر مختلف شکلوں کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ بی چن نے ڈبے تپائی پر رکھ دیئے۔

لیو ٹانگ نے ان میں سے دو ڈبے منتخب کر کے کھولے۔ ان میں دو ٹائی گنیں غیر اسمبل شدہ حالت میں رکھی تھیں۔ ایک ڈبے سے اس نے تمام پارٹس نکال دیئے اور پیچھے ہی رکھتے ہوئے ایک چھوٹے سے ڈبے سے دو مختلف سائزوں کے اسکرینڈ ڈرائیور نکالتے ہوئے

کتاب پر لکھنے والے دستخطوں کی جگہ

میں ایک لمحے خاموش رہا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ مجھے جو کچھ درکار تھا، وہ اس سے مل بھی سکتا ہے یا نہیں؟ پھر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مقصد بیان تو کر دینا چاہیے۔ "مجھے دو تین خاص اہتیار چاہئیں۔" میں نے دھم لہجے میں کہا۔

اس نے سچ سے پاؤں لٹکا کر تجھے پیتے سے سیڑیوں میں بٹھائے اور اٹھ کر ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے دکان کی حقیقی دیوار کی طرف چل پڑا۔ دیوار کے عین قریب پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اس میں ایک دروازہ موجود تھا۔ بوزھ نے جس کا نام غالباً لیو ٹانگ تھا، تب دیا کہ دروازہ کھولا اور ہم اوپنی چھت والے ٹیم تاریک ہال میں داخل ہوئے۔ دائیں طرف ایک راہداری میں کچھ دور چلنے کے بعد ہم جس کمرے میں پہنچے، وہ قدیم لیکن شاہانہ طرز کی ایک نشست گاہ تھی۔ اس کمرے کا قالین اور فالوس بلاشبہ بے حد بیش قیمت تھے۔

قالین کے ساتھ ہی گویا لیو ٹانگ بھی ہمارے قدموں میں بچھا رہا تھا۔ کاؤچنگ فر ایک منٹیں نشست پر ہمیں بٹھانے کے بعد اس نے خالص شاہانہ انداز میں تان بھائی۔ چند لمحے بعد متصل کمرے کا دروازہ کھلا اور ہوٹل اندر آئی، اسے دیکھ کر میں چند لمحے کے لیے آٹھ بھینٹا ہی بھول گیا۔ اسے بلا جھجک چین کی ملکہ حسن قرار دیا جاسکتا تھا۔

وہ سا قد، پھوس سے ریشمار، ریشم سے ہار اور سانچے میں ڈھلا ہوا جسم، جس کے نشیب و فراز سادہ سے چینی لباس میں بھی قیامت ڈھا رہے تھے۔ آنکھیں پھول اور ناک قدرے چھنی ہوئے کے باوجود ہندوستانی معیار سے بھی اس کے حسن بلا فخر اور کشش میں کوئی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرائی تو گویا کمرے میں آویزاں فالوسوں کی جگہ قابض کچھ اور بڑھ گئی۔

"یہ میری بیٹا بی چن ہے۔" لیو ٹانگ نے سر خم کرتے ہوئے بتایا۔ پھر بی چن کی طرف مڑ کر بولا۔ "اور یہ ہمارے آقا کے پیچھے ہوئے مہمان ہیں۔" اس نے ہمارے نام جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"خوش آمدید۔۔۔" لڑکی نے بھی قدرت خم ہو کر ایک بار پھر اپنی مسکراہٹ سے کمرے کو مزید منور کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کئی بھی اسے ایک تک محسوس رہی تھی۔ معلوم

لگانے کے سلسلے میں مزید ضروری ہدایات دینے لگا۔

مزید چند ضروری معاملات پر گفتگو کرنے کے بعد ہم نے اس سے اجازت طلب کی۔ یونٹ اور اس کی بیڈ۔ ہمیں برداشت تک چھوڑنے آئے۔ رخصت ہوتے وقت میری نظریں ایک بار پھر لی جن سے میں اور میں نے اس کی آنکھوں میں ایک سوال کا ستارہ جھلکتے دیکھا۔ میں کوئی فلمی یا اندلی ہیر نہیں تھا جو یقین کر لیتا کہ اس مختصر سی پہلی ملاقات میں وہ مجھ پر عاشق ہو چکی ہے لیکن اس سوال کے مفہوم میں بہر حال کوئی شبہ نہیں تھا۔ ”کیا پھر بھی کہیں آؤ گے اجنبی؟“

میں نے اس خاموش سوال کی چھین محسوس کی، لیکن جبراً اسے اپنا وہم اور خوش قسمتی قرار دے کر منہ پھیر لیا اور پاپ بینی کو الوداع کہہ کر کھینٹی کا ہاتھ تھام کر چل دیا۔ میرا خیال تھا کہ راستے میں کھینٹی لی جن پر کوئی تبصرہ کرے گی، اس کے بارے میں میرے محسوسات جاننے کی کوشش کرے گی، لیکن اس کے بجائے کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔ ”اور اس نامی شخص کا کیا کرو گے جو رام پرشاد کی گاڑی میں موجود ہے؟“

”میں اسے گاڑی تن میں چھوڑ کر گاڑی رام پرشاد کے اپارٹمنٹ باؤس کے قریب ہی چھوڑ دوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

دوسرے روز ہم براچ لائن کی ایک ٹرین کے ذریعے تھمناؤ سے ایک سرحدی گاؤں موہلا کی طرف روانہ ہوئے۔ اب ہم دونوں ہی جلنے کے اعتبار سے اینگو انڈین مہاجر معلوم ہو رہے تھے۔ ہم دونوں ہی کی کمر پر کپڑوں کے تھیلے بندھے ہوئے تھے۔

موہلا پہنچتے پہنچتے ہمیں شام ہو گئی۔ وہ رات ہمیں گاؤں ہی میں ایک ٹھکانے کے گھر گزار دی پڑی۔ یہ بھی احسان مرزا کا ایکٹ تھا۔ دوسری صبح اس نے آٹھ سو سی سی کی ایک طاقتور اور مضبوط موٹر سائیکل ہمارے حوالے کی جس کے ساتھ فاضل پرزوں کا ایک بڑا ڈبہ بھی منسلک تھا۔

پروگرام اور روٹ تو پہلے ہی سے طے تھا لیکن میں نے ایک بار پھر نقشہ کھول کر شخص سے تفصیلی طور پر تبادلہ خیال کر لیا۔ ٹھکانے کے واضح نشانوں کے ساتھ اس پٹی کے بارے میں بتایا جس پر سفر کرتے وقت سرحد عبور کرنا بھول اس کے ایسا ہی تھا جیسے آری اپنے گھر کا صحن عبور کر کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلا جائے۔

ابتداء میں چالیس پچاس میل کے سفر میں ہمیں کچھ دشواری پیش آئی کیونکہ کافی راستہ ہمیں پہاڑی علاقوں میں طے کرنا پڑا، جہاں کہیں کہیں برف جمی ہوئی تھی اور بعض مقامات پر تو راستے کی چوڑائی ایک گز سے بھی کم تھی۔ ان راستوں پر واقعی طاقتور موٹر سائیکل کے علاوہ کسی سواری کا چلنا ناممکن ہی تھا۔

ہوا۔ ”یہ نامی شخص جرمی کی بیٹی ہوئی جس اور بدید ترین مراثی کی ہیں۔ شاید آپ کو اسمبل کرنے میں کوئی دشواری پیش آئے۔ ایک گمن میں اسمبل کر کے دکھا دیتا ہوں۔ اس کے بعد آپ کو کوئی وقت پیش نہیں آئے گا۔“

اس کی انگلیاں گمن کے پارٹس سے اس مشاقی سے کھینٹنے میں مصروف تھیں گویا کوئی ماہر فن استاد ستار کے تاروں پر کوئی نقشہ چھڑ رہا ہو۔ دیکھتے دیکھتے ہی اس نے دو اسکریو ڈرائیورز کی مدد سے ان پارٹس کو جوڑ کر گمن تیار کر دی جو ایک چھوٹے سے ڈبے میں سائے ہوئے تھے۔ طریقہ ذہن نشین کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی، تاہم اطینان کی خاطر لیونٹنگ نے دوسری گمن مجھ سے اسمبل کروا کے دیکھی۔ مطمئن ہو کر اس نے مجھے چند سیکنڈ میں دونوں گمنیں کھول کر پارٹس کی صورت میں ڈبوں میں بند کر دیں۔ پھر ایک ڈبے سے سوپرگ نکال کر مجھے دکھایا۔

یہ لمبی ٹان والا اور نوگوٹیوں والا ایک تباہ رکبن ریو اور تھا۔ اس کا دست نہایت چھوٹا اور پٹپٹا تھا اور اسے نہایت آسانی سے گاڑی یا ٹانگ کے ساتھ فیتے کی مدد سے باندھ کر چھپایا جاسکتا تھا۔

”اگر آپ ضرورت محسوس کریں تو میں ایک اور نسخا سا لیکن نہایت کارآمد ہتھیار آپ کی خدمت میں پیش کروں۔“ لیونٹنگ نے موبیڈک انداز میں کہا۔ ”ایک قدیم فارمولے کو جدید ہتھیار کی شکل دی گئی ہے۔ نازک اور خاص حالات میں نہایت کام کی پڑے۔“

”ضرور دکھائیے۔“ میں نے اشتیاق سے کہا۔

اس نے ایک چھوٹا سا ڈبہ کھول کر کھلونا نما ایک چمکینا پستول نکالا۔ سائز میں یہ ایک عام سمریت لائٹر کے برابر تھا اور اس کی ٹل لہانی اور موٹائی میں سگریٹ سے بھی کہیں بھولی تھی اور تقریباً ٹھوس ہی تھی۔ اس کے درمیان صرف اتنا ہی سوراخ تھا کہ قدرے پرانی ساخت کے گراسفون کی سوئی بنا اس سے گزر سکتی تھی، جو اب بھی کہیں کہیں مستعمل تھے۔

”یہ نہایت جدید ڈارٹ گن ہے۔“ لیونٹنگ نے بتایا۔ ”اس کی مار میں گز ہے اور ایک وقت میں اس میں زہر ہیں بھی ہوئی ہیں سوئیاں لیو ہوتی ہیں اور سوئی کسی بھی جندار کی حال میں اتر جائے تو اس کی موت یقینی ہے“ اور پھر آواز بھی قطعاً پیدا نہیں ہوتی۔“

”واقعی بڑے کام کی چیز ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بھی میرے لیے رکھ دیجئے۔“

اس نے ایک اور چھوٹی سی ڈبیا کھولی۔ یہ گراسفون ہی کی سوئیاں تھیں چھوٹی چھوٹی سوئیوں سے بھری ہوئی تھی، لیکن یہ سوئیاں چمکیلی سیاہ تھیں۔ ”یہ پانچ سو سوئیوں کی ڈبیا ہے۔“ لیونٹنگ نے بتایا۔ پھر وہ ڈارٹ گمن کو لوڈ اور ان ڈا کرنے کے علاوہ بے خطا نشانہ

مزید پچاس میل کے سفر میں ہم پہاڑوں کی بلندیوں سے نشیب میں آ گئے۔ کہیں چٹیل میدان، کہیں جنگل اور کہیں وادی علاقہ بھی آیا۔ ایک جگہ تو ہماری موٹر سائیکل دھل میں اترتے اترتے ہی پٹی۔ چند میل ہموار راستے پر کبھی نے بھی موٹر سائیکل چلائی، لیکن دشوار گزار راستوں پر چلانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس وقت دھوپ دھنسنے لگی تھی، سب ہم ایک ایسے ناہموار میدان سے علاقے میں پہنچے جہاں چاہا چھوٹے بڑے ٹیلے سر اٹھائے کھڑے تھے اور مٹی مارٹی سے رنگ کی تھی۔ یہاں ایک ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھ کر ہم نے ایوں میں بند خوراک سے بیٹ کی آگ بجھائی۔ پانی پیا اور کچھ دیر سستائے اور سب شپ کرنے کے بعد ہم نے ایک بار پھر سلسلہ سفر جوڑا۔

ہم بمشکل تین چار میل ہی فاصلہ طے کر پائے تھے کہ ایک ٹیلے کی اوٹ سے نکلتے ہی اچانک ایک درزی پوش دور سے سامنے آ گیا۔ میں شاید موٹر سائیکل کو لہرا کر اس سے بچتا ہوا نکل جاتا لیکن میں نے اس کے ہاتھ میں دو مار رائل دی تھی۔ یوں تو میرے پیچھے بیٹھی ہوئی کسی کی ٹلٹ میں سویرگ اڑا ہوا تھا جو جینٹ کی سڑ میں تھا لیکن فوری طور پر نکلا جاسکتا تھا، مگر میں نے کبھی کو ٹھوکا دے کر رہا اور نکالنے اور درزی پوش کو گولی مارنے سے باز رکھا۔ کیونکہ میں نے کچھ ہی دور ایک نیم پتہ کو ٹھڑی اور ایک خیمے پر مشتمل سرحدی چوکی کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔

یہ گھٹانے ایسا کوئی امکان ظاہر نہیں کیا تھا کہ راستے پر میرا سامنا سرحدی فوجیوں سے بھی ہو سکتا ہے اور میں راستے سے ہٹا بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر پیٹ ہی پڑاؤ کے دوران بھی میں نے نقشہ کھول کر قطب نما کی مدد سے بھی دیکھا تھا کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے تھے۔ ہر حال میں نے اسے بچاتے ہوئے موٹر سائیکل روکی اور ہر ہنگامی قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا۔

سرحدی فوجی جس کے جسم پر بھارتی وردی اور کتہے پر دو ستارے بھی سجے ہوئے تھے، دور مار رائفل کو لا پر لوٹی سے بلاتا اور میرے بجائے کبھی کو پر جنس نظروں سے دیکھتا قریب آ گیا۔ اس کی سونچیں گھڑی کی دم کی طرح پھولی پھولی اور اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ "یہ کس قسم کا مار لے جا رہے ہو؟" اس نے رائفل کی ٹال سے کبھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استہزائیہ سے لہجے میں پوچھا۔ کبھی گو کہ جیتزر جینٹ میں تھی بال کٹے ہوئے تھے، سر پر شکاریوں والی ٹوپی تھی لیکن یہ دیکھتا ہر حال زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہ لڑکی تھی۔

"بڑا عمدہ قسم کا مال ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہاتھ لگا کر دیکھو کرنٹ مارے گا۔"

اس نے مکمل کر تقبہ لگایا۔ گویا میں نے اسے لطیفہ سنا دیا ہو اور وہ اس سے خوب متغیر ہوا ہو۔ پھر اس نے چاروں طرف گھوم کر ہوا اور موٹر سائیکل کا اوپر نیچے سے اچھی طرح جائزہ لیا اور سامنے آ کر قدرے حیرت زدہ سے لہجے میں ہوا۔ "تمہارے پاس تو واقعی کوئی ماں نظر نہیں آ رہا۔۔۔ پھر سرحد پار کیا کرتے جا رہے ہو؟ یا منٹھ اس موٹیا ہی کو ایکسپورٹ کرتے جا رہے ہو؟"

"ماں تو واقعی میرے پاس کوئی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ماں لے کر جاؤ یا بغیر ماں کے جاؤ، ہمارا خرچہ تو دے کر ہی جانا پڑے گا۔ اگر ماں لے کر نہیں جا رہے تو یہ تمہاری بے وقوفی ہے، ہماری نہیں۔"

"کون سی کرنسی میں خرچہ چاہیے اور کتنا؟" میں نے اوجھڑا ہر کی باتوں میں مزید وقت ضائع کیے بغیر فوراً پوچھا۔ "تمہارے پاس امریکی ڈالر بھی ہیں اور بھارتی روپیہ بھی۔"

"انڈین کرنسی میں ہی دسے دو۔۔۔ پانچ سو روپے۔"

اس نے موج کر جواب دیا۔ "تمہاری ہاتھ جا رہے ہو اس لیے تم سے خاص رعایت ہے۔"

میں نے کبھی کو اشارہ کیا۔ اس نے کندھے سے آگے ہوئے چھوٹے سے بیگ سے سو کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے، وہ اس نے لے کر اطمینان سے اپنی جیب میں رکھ لیے اور چوکی کی طرف چل دیا، جس کے دروازے پر ایک اور درزی پوش کھڑا تھا۔ میرے سامنے ہی انہوں نے ہمارے نوٹوں کو بات لیا اور ہاتھ ہلا کر ہمیں الوداع کہا۔

میں نے موٹر سائیکل کو میسر لگایا۔ راستہ ایسا زیادہ دشوار گزار نہیں تھا، اس لیے ہم خاصی تیز رفتاری سے فاصلہ طے کرنے لگے۔ تیز ہوا اور موٹر سائیکل کے شور کی وجہ سے ہمیں جو بھی بات کرنی ہوتی تھی چلا کر کرنی پڑتی تھی۔ کبھی میرے کان میں چلائی۔ "اب تمہاری سمجھ میں آگیا ہو گا کہ اسے گنگ اتنی پھولتی پھلتی کیوں جا رہی ہے"

"میری سمجھ میں بہت عرصہ پہلے ہی آ چکا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک ایسے راستے پر پہنچے جو بڑے بڑے تودوں کو تراش کر اس طرح بنایا گیا تھا کہ بارود دھڑکت چوڑی اور اونچی دیوار سے مشابہ نظر آتا تھا۔ اس کے دونوں طرف نشیب میں کوئی زہ زہن تھی اور کہیں کہیں خود رد جھاڑیوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ جن کے درمیان کوئی کوئی جنگلی خرگوش پھدکتا نظر آ رہا تھا۔ یہ دیوار نما سڑک اس بات کی بھی نشانی تھی کہ وہ دایمی اب زیادہ دور نہیں تو ہماری منزل تھی اور جس کو نام احسن مرزا نے جو بتایا تھا اس کا اردو میں مطلبہ "تاریک وادی" بنتا تھا، حالانکہ بقول اس کے وہاں روشنی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دیوار نما سڑک بڑے عجیب و غریب طریقے سے آگے بڑھ رہی تھی۔ کبھی اس میں کوئی ایسا موٹر آ جاتا جسوں دونوں طرف

چٹائیں وغیرہ یوں اس پر تھکی نظر آئیں کہ راستہ مسدود معلوم ہوتا تھا لیکن قریب پہنچنے پر پتا چلتا کہ وہاں سے سڑک شیب میں چلی گئی ہے اور کہیں کسی چٹائی سطح سے گرد چکر کاٹنے کے بعد احساس ہوتا کہ ہم دیدار دہریں پہنچ گئے ہیں جہاں کچھ دیر بیٹے تھے لیکن بغور جاننے پر احساس ہوتا کہ ایسی بات نہیں ہے۔

اس سطح اور کچھ سڑک پر نہ جانے کیوں بھی سی ٹی موبیل تھی۔ جس کی وجہ سے اس پر بظاہر معمولی اور درحقیقت بے حد خوفناک پھسپھس تھی۔ گویا اس سڑک پر موٹر سائیکل چلانا درحقیقت موت کے گولے کے کرتب دکھانے ہی کے مترادف تھا۔

تقریباً چار میل کے سفر کے بعد یہ سڑک بتدریج تنگ ہونے لگی اور ایک مقام ایسا بھی آیا جہاں سڑک ایک فٹ سے بھی کم چوڑی رہ گئی۔ اس پر موٹر سائیکل چلانا تو درکنار پیس بھی ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا اور وہ بھی محتاط ہو کر۔ ایک سے زیادہ آدمی اس پر نظر ہی بنا کر چل سکتے تھے۔ ہم اس مقام سے کچھ پیچھے ہی رُک چکے تھے۔ مجبوراً میں نے موٹر سائیکل کا انجن بند کیا اور اسے تنگ ہی سڑک پر یوں ترجیح کر کے کھڑا کر دیا کہ راستہ ہی بند ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے اپنے چھوٹے چھوٹے بیگ کمر سے باندھے اور پیڈل آگے چل دیئے۔ ہمارے ارد گرد شیب میں اب بہت ہی چھوٹے چھوٹے نیلے نظر آ رہے تھے اور زمین بھر بھری اور سیاہی مائل ہو چلی تھی۔ سرسری نظر میں یہ صحرائی علاقہ معلوم ہوتا تھا لیکن ہوا بلند ترین پڑوسی مقامات ہی کی طرح میوہ کر دینے والی تھی۔

تنگ راستہ پر میرے پیچھے آتے آتے کہتی ہوئی۔ "منصور! ام! ہم اس سہم میں دوسرے گئے تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ ہمارا کیا بنایا یہ کہ ہم کہاں مارے گئے تھے؟"

"ایسی بات نہیں ہے۔" میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ "میں ایسے انتظامات کر آیا ہوں کہ میرے متعلق میرے پیچھے والوں کو کچھ ایسی بے خبری بھی نہیں رہے گی بلکہ اس کام کی ذمہ داری بھی ہمارے ہاتھ سے چھوٹے کی وہاں سے کوئی اور اس کو تمام لے گا۔" پھر میں نے اسے چیخنے کی خاطر کہا۔ "اب تو تمہارا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تمہارا پہلے بھی دن والی وارث نہیں تھا۔ اب بھی کسی کو تشویش نہیں ہو گی کہ تم کہاں جیتے۔"

"تم بھی اگر ساتھ ہی مر گئے پھر تو مجھے اپنے یوں گناہم بلکہ یوں کہو کہ بے تنگ و نام مرجانے پر کوئی پروا نہیں ہو گی۔" اس نے ترقی۔ ترقی جواب دیا۔ "ہمارا انداز ایسا ہی تھا جیسے خوش گھروں کا کوئی جوڑا بینک پر نہیں جا رہا ہو۔ حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ انہماق کا میدان زیادہ دور نہیں ہے۔ کہیں جب سے مجھے سی ٹی موبیل اس منہتر سے دور میں ہی ہم پر بہت بہت برے آچکے تھے لیکن اس نے بھی تنگ کسی بھی مرحلے پر تھکن، بیزار، خوف،

ہیپانیا یا عدم دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا اور نہ ہی شکوک کا کوئی لفظ اس کی زبان پر آیا تھا۔ میرا یہ یقین بچتا ہوتا رہا تھا کہ وہ صحیح معنوں میں ایک اچھی ساتھی تھی۔

تقریباً ایک میل کا راستہ طے کرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ دیوار نما سڑک کی بلندی اب بہت کم رہ گئی تھی۔ انحراف میں فٹ کے قریب مختار اور مخصوص انداز میں چھلانگ لگائی جاتی تو کوئی بدی وغیرہ ٹوٹنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس مقام پر رُک کر میں نے اندرونی شیب سے ہاتھ کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا نقشہ نکال کر دیکھا اور اس فیصلے پر پہنچا کہ اب مزید دیوار پر ہی چلتے رہنا زیادہ تیزی سے موت کے قریب جانے کے مترادف تھا۔ اب مجھے آگے بڑھنے کے لیے دوسرا انداز اختیار کرنا تھا۔

نقشہ شیب میں رکھنے کے بعد میں نے پہلے کہیں کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس طرح نیچے لٹکایا کہ اسے کم سے کم اونچائی سے چھلانگ لگانی پڑے۔ پھر میں نے دیوار سے پاؤں لٹکا کر ٹپوں کے بل چھلانگ لگائی۔ اب ہمارے سامنے اونچے نیچے نیلے، ہالے، کھنکھیاں اور جھاڑیاں تھیں اور سطح زمین بتدریج بلند ہو رہی تھی۔ ہم انہی پٹائیوں کے گرد چکر کاٹتے ہوئے بلندی کی طرف آگے بڑھنے لگے۔ نیچے چنے کے لیے بندروں کی طرح کرتب دکھانا ضروری تھا۔ کہیں کوئی تالہ چھلکتا پڑتا تھا، کہیں کسی کئی زرد تودے سے پھسل کر گرے سے اپنے آپ کو بچاتا ہوتا تھا۔ کہیں جھاڑیوں سے بچنے کے لیے کافی طویں پھر کاٹ پڑتا تھا۔

اور تو اور کئی مرتبہ تین تین چار چار بھیلوں کی نولیاں بھی تجسس نظروں سے ہمیں دیکھتی ہوئی گزریں لیکن انہوں نے ہم پر حملہ آور ہونے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ بھیڑیا درندگی میں بھٹا آگے ہے اتنا ہی اپنی جان کو محفوظ رکھنے کے معاملے میں چالاک بھی ہوتا ہے۔ ہتھیار کی بوجھ اور سی سے سوچ لیتا ہے۔ مسلح آدمی پر شاذ و نادر ہی حملہ آور ہوتا ہے۔ رستے پر بھی بھیڑیے عموماً اسی دقت بے خوف ہو کر حملہ کرتے ہیں جب تعداد میں کم از کم دس ہارہ ہوں۔

دیوار پر چھنے کا بھی فائدہ نظر آتا تھا کہ قہادتوں سے گزرنے سے انسان منظوم رہتا تھا لیکن اس آسانی سے صرف وہی استفادہ کر سکتے تھے جو تاریک وادی میں رہتے تھے۔ سورج غروب ہونے میں زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔ ہم نے تھکن کے باوجود کچھ اور تیز چلنا شروع کر دیا۔ ہوا میں اب بدل زمین کی بو رہی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

ہم اس مقام تک جا پہنچے جہاں سے ڈھلان شروع ہو رہی تھی۔ ڈھلان کے انتہام پر نیچے طویل و عریض میدان پھیلا ہوا تھا لیکن یہ میدان چٹیل نہیں تھا۔ اس پر تاحد تقریباً ہی مہرہ پھیلا ہوا تھا اور حد بندوں کے ذریعے بیسیوں حصوں میں تقسیم تھا۔ یہ مہرہ درحقیقت دو ڈھانکی فٹ کے پودے تھے جو سیاسی مائل پانی میں کھڑے تھے۔ تین چار سو انچ اس طویل و عریض میدان میں بھیجے ہوئے تھے اور یہاں ہا قاعدہ ایسی طرح کام ہو رہا تھا

جس طرح بڑے بڑے کھیتوں پر ہوتا ہے۔

پتہ پانی گزارنے کے لیے ہالا کھودا جا رہا تھا، کس موڈ کی جا رہی تھی اور نہیں تیار فصلوں سے ڈوڈی اتاری جا رہی تھی۔ کس پودوں کو سنوارا جا رہا تھا۔ کس کچھ بچ تھا چیزوں یا ڈوڈیوں کے ڈکڑے بھر بھر کر کچھ لوگوں کے سروں پر لادے جا رہے تھے جو انہیں دور ایک بڑی نیم پختہ سی غارت کی طرف لے جا رہے تھے۔ دور سے وہ غارت فلور ملز یا پھر کولڈ اسٹوریج سے مشابہ نظر آتی تھی، جی کہ یہاں کچھ ایسی جہ پیم کی مشینری بھی نظر آ رہی تھی جو باقاعدہ جائز قسم کی کھیتی باڑی کرنے والوں کو بھی میسر نہیں تھی۔

ایک جگہ ایک ٹیوب ویل اور ایک جگہ نشیب میں اس سے جتنی بلندی کوئی اور مشین بھی نظر آ رہی تھی۔ ٹیوب ویل غالباً ڈیزل سے چلتا تھا یا پھر اس کے لیے کس کوئی طاقتور جنریٹر موجود تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ سب مشینری یہاں تک پہنچی کس طرح تھی؟ میری معلومات کے مطابق اسی اور مشابہت و اندازے کے مطابق بھی یہاں تک پہنچنے کا راستہ تو وہی ایک نظر آتا تھا جس سے ہم آئے تھے اور وہ مشینری یا کسی بھی قسم کی وزنی اشیاء کی نقل و حمل کے لیے قابل استعمال نہیں تھی۔ گویا یہ تاریک وادی تو نہیں ابنتہ وادی عجائبات ضرور تھی۔ ابھی میری آنکھوں کو اور نہ جانے کیا نیا دیکھنا تھا۔

میں اور کبھی ایک بڑے سے ڈوڈے کے پیچھے چھپے ہوئے تھے اور اس قسم کے ڈوڈے ڈھلان پر جگہ جگہ موجود تھے، لیکن ان کے درمیان عموماً حد سے فاصلہ تھا۔ اگر ہم ڈھلان کی طرف سفر کرتے وقت ایک ڈوڈے سے دوسرے ڈوڈے کی طرف بڑھتے اور اس دوران منشیات کے کھیتوں میں کام کرنے والوں میں سے کسی کی نظر بلندی کی طرف اٹھ جاتی تو ہمیں نہایت آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔

کھیتوں میں صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی مصروف کار تھیں۔ ان سب کے لباس ڈھیلے ڈھالے، موسم کی مناسبت سے بیماری بھر کم اور گہرے رنگوں کے تھے۔ ان کی تراش خراش پٹھانوں کے ملبوسات سے بہت ملتی جلتی تھی۔ میں نے ایک مرد اور ایک عورت کو پاؤں۔ گو کہ ان دونوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا اور وہ ایک دوسرے سے لا تعلق نظر آ رہے تھے تاہم وہ ایک دورانہ سے کوٹے میں پودوں پر جھکے جھکے کچھ کر رہے تھے۔ میں نے کبھی کی توجہ بھی ان کی طرف دلائی پھر کہا۔ ”ہمارے شکار کے حور پر مجھے بھی موزوں ترین نظر آ رہے ہیں۔ یہ دونوں باقی لوگوں سے کافی فاصلے پر ہیں۔ ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہے اور ان سے چند گز کے فاصلے پر ہی چند درختوں کی اوٹ بھی میسر ہے۔“

”بے شک!“ کتنی نے ان کا جائزہ دیتے ہوئے تائید کی۔

”میرا خیال ہے امر الگ الگ اور اپنا اپنا طریق کار اختیار کرتے ہوئے نیچے پہنچے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مرد عورت کو قابو میں کرنا میں اس مرد کو قابو میں کروں گا۔ ہمارا

متعدد صرف انہیں بے ہوش کر کے ان کا لباس وغیرہ حاصل کرنا ہے تاکہ ہم ان کا روپ دھار کر انہیں لوگوں میں گھل مل سکیں۔ بہر حال اگر تنجر وغیرہ کے استعمال کی ضرورت پڑ جائے تو ہچکچانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ کوئی اتنی معصوم رو نہیں تو ہیں نہیں۔“

کبھی نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھ سے کئی دور چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ میری نظر سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے اور کس کس پتھروں کی طرف چلتے ہوئے نشیب میں اترنا شروع کیا۔

میں نشیب میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ نیچے پہنچی کر میرے دیکھ لے جانے کا خطرہ بے حد کم ہو گیا لیکن سیدھا کھڑا ہونا اب بھی خطرے سے خالی نہیں تھا، کیونکہ پودے زیادہ اونچے نہیں تھے۔ البتہ کہیں کہیں بعض چیزوں کے انبار وغیرہ موجود تھے۔ ان کے پاس درختوں کے عقب میں پہنچ کر سیدھا کھڑا ہوا جا سکتا تھا۔ تاہم اپنے مطلوبہ شخص کے عقب میں مجھے چاروں ہاتھوں چیزوں کے نیں ہی پہنچنا پڑا اور عین اس وقت جبکہ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ جھکنے لگا ہے اور میں اس کی کھٹی پر وار کر سکوں گا اس لمحے اچانک ہی وہ نہ جانے کیوں گھوم گیا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ یوں دم بخود رہ گیا جیسے کسی بھرے پرے شہر کے بظوں بیچ رہنے والے سبب و شائستہ انسان نے اپنے آرام سے و پیراستہ ڈرائنگ روم میں کسی برقیاتی درجے کو داخل ہوتے دیکھ لیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے تو میں بھی گھڑیا کر رہ گیا تھا اور چاروں ہاتھ چیزوں کے نیں یوں کھڑا رہ گیا تھا جیسے کوئی پہاڑی بکرا سوائے نظروں سے کسی انہیں کی طرف دیکھ رہا ہو۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس شخص کے ہونٹ حرکت میں آتے ہیں نے بجلی کی سی تیزی سے اس کی ٹانگ ٹھیسنی اور جیسے ہی وہ گرا اس کی کھیتی پر ”چھاپ“ رسید کر دی۔ اسی لمحے وہ سائلٹ ہو گیا۔

اس غریب کو شاید یہ سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا اور اس پر حملہ آور ہونے والا ”جانور“ کون سا تھا؟ میں اسے تیزی سے گھسیٹ کر درختوں کے ہنڈ میں لے گیا۔ وہ کچھ کھڑی اکھڑی سی سانپیں لے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جلدی میں شاید اس کی کھٹی پر چپ کچھ زور دہی زوردار پڑ گئی تھی۔ بہر حال میں نے اپنی کمر پر بندھا ہوا چھوٹا سا بیگ اتارا اور اس کے کپڑوں وغیرہ سے اپنا لباس کا بدلہ لے لیا۔

مجھے اس کام میں اور اپنے سینے کو کھلے طور پر شک و شبہ سے باخبر بنانے میں خاصی دیر لگ گئی۔

جب میں اپنے تنہیدی جوتے سے اطمینان ہو کر جھنڈ سے نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا تو

اپنے عقب میں ایک نسوانی آواز سن کر مجھے تیزی سے گھومنا پڑا۔ اس نے کسی ناقابل فہم زبان میں کچھ کہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ کوشکار عورتوں میں سے کوئی ایک تھی۔ شاید میرے

شکار کی بجائی ہی رہی ہو۔ وہ چادر میں تقریباً پورا چھپ چھپائے کھڑی تھی۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ میں ایک "چاہ" اسے بھی رمیدہ کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ وہ غائب میرا ارادہ بھانپتے ہوئے میرا ہاتھ حرمت میں آنے سے پہلے ہی اچھل کر دور ہٹ گئی۔ اس کی آنکھیں اصلی حالت پر آنکھیں اور تب ان آنکھوں کو میں نے پہچان لیا۔ ساتھ ہی اس نے پھر سے چادر ہٹا دی اور بے گناہ طریقے سے ہنسنے لگی۔

میں بھی دھڑکتے ہوئے ہنس دیا۔ وہ کہتی تھی۔ جو مجھ سے پہلے ہی اور مجھ سے کچھ بہتر صورت پر حلیہ تبدیل کر کے آنا چاہتی تھی۔

"اس صورت کا تم نے کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو تم نے اپنے شکار کا کیا۔" اس نے جواب دیا۔

سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا اور کام کرنے والے مرد اور عورتیں بڑی بڑی ٹولیوں کی صورت میں ایک طرف کو چلنے پڑے تھے۔ ہم بھی ایک ٹولی کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ ہم نے اپنے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کوئی شخص ہم دونوں میں سے کسی کو مخاطب نہ کرے۔ لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا امکان سب حد تک تھا۔ ایک تو وہ سب تھکے ہارے نظر آ رہے تھے۔ اس عالم میں ویسے ہی انسان ایک دوسرے سے بات کرنے سے بیزار ہوتا ہے۔ بس جلد از جلد گھر پہنچ کر جھٹکن اٹارنے اور حسب ذہنیت آسائشوں سے محظوظ ہونے کا خیال ذہن میں جاگزیں ہوتا ہے۔ کچھ ویسے بھی یہ لوگ تدریس فلسفہ اور پاس زور سے انداز میں خاموش رہنے کے عادی معلوم ہوتے تھے لیکن اپنی زندگی سے عدم دلچسپی یا اپنے معمولات سے بیزاری بھی ان کے چہروں سے عیاں نہیں تھی۔

وہ مطمئن، مسرور اور آسودہ حال بھی نظر آتے تھے۔ ان میں سے بہت کم لوگ آئیں میں باتیں کر رہے تھے۔ ہم ایک نہایت طویل و عریض سبز زار سے گزرے جو خانہ مویشیوں کے لیے چراگاہ کا کام دیتا تھا۔ اس کے ایک حصے میں بہت بڑا بارہ بھی نظر آ رہا تھا جہاں کئی آدمی مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ یہ لوگ غائب رکھوالے اور گولے تھے۔

سبز زار سے گزرنے کے بعد ایک مختصر سا چھیل میدان آیا پھر تھوڑی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد لوگ ایک فٹ سے بھی کم چوڑی اسی سڑک پر پہنچ گئے جس پر میں اور کسی سفر کرتے رہے تھے اور پھر نصیب میں اتر گئے تھے۔ اس سڑک پر لوگوں نے چڑھنا شروع کر دیا تو خود بخود ہی قطار بنتی چلی گئی۔ کافی عرصہ تھی۔ میں میرے آگے تھی اور ہم اس قطار کے تقریباً وسط میں تھے۔

سڑک آگے چل کر تقریباً تھوڑی سی پٹلوں کے ایک دائرے میں گویا غائب ہو رہی تھی۔ تھرا کا گلا میرا اس موڑ پر پٹیا تو تھا کہ آگے بڑھنے کی رفتار کچھ کم پڑ گئی، لیکن

مجھے چونکہ موڑ سے آگے کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میں اس کی وہ جانتے سے قاصر تھی۔ شام کے سائے بھی گہرے ہو چکے تھے۔

سب کچھ اور میں موڑ سے اتر آگے پہنچے تو سائے کا منظر دیکھ کر میں ایک لمحے کے لیے تسکین سمائی۔ چند گز آگے وہ سڑک سی سڑک پٹلوں کے درمیان تراشے گئے ایک بہت بڑے سطح چھوڑے سے مل گئی تھی اور اس چھوڑے پر نہایت بندوبست آئی تھی چھانک نصب تھی۔

اس قسم کے چھانک عموماً زمانہ قدیم کی یادگاروں اور قلعوں وغیرہ میں نصب نظر آتے تھے۔ دائیں بائیں دونوں طرف سے یہ چھانک گویا پٹلوں ہی میں نصب تھا اور دوسری طرف پہنچنے کے لیے اسی میں سے گزرنا ضروری تھا۔

چھانک اس وقت کھلا ہی تھا اور اس کے پار نصیب میں اونچے نیچے بھونپڑی نما اور ہلچل جاپانی طرز کے مکانوں کے پورے نظر آ رہے تھے۔ چھانک پر دونوں طرف دو محافظ اسٹین گن لے کھڑے تھے۔

ایک محافظ کے قریب ہی بجلی کے دائرہ کور سے مشابہ ایک مشین پھر پیل فرش پر کھڑی تھی۔ دراصل اس مشین ہی کا استعمال دیکھ کر میرے جسم میں سسٹنی سی دوڑ گئی تھی اور ایک لمحے کے لیے میں پریشان سا ہو گیا تھا۔

صورت حال یہ تھی کہ قطار میں موجود ہر شخص اس مشین کے قریب سے گزرتے وقت اس پر بٹے ہوئے ایک خانے پر انگوٹھا رکھتا تھا اور آگے بڑھ جاتا تھا۔ اس کے انگوٹھے رکھتے ہی مشین کی پیشانی پر سبز روشنی جھلک اٹھتی تھی انگوٹھا ہٹنے ہی یہ روشنی غائب ہو جاتی تھی پھر دوسرا شخص انگوٹھا رکھتا تو دوبارہ جھلک اٹھتی تھی۔

ظاہر ہے یہ روز کا معمول تھا اور اس وقت بھی یہ عمل اتنے تسلسل سے جاری تھا کہ مسح محافظ بھی تدریس سبہ نیازی کے عالم میں ہی کن آنکھوں سے ایک نظر سبز روشنی کی جھلک دیکھتے تھے اور دوسرے ہی لمحے وہ شخص جس نے مشین پر انگوٹھا رکھا ہوتا تھا اس کے درمیان سے گزرتا چلا جاتا تھا۔ اس کے چہرے کی طرف محافظ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ بجلی کے دائرہ کور سے مشابہ وہ مشین دراصل کمپیوٹر تھا جس میں ان تمام لوگوں کے انگوٹھوں کے نشانات محفوظ تھے جو کھیتوں پر کام کرنے جاتے تھے کمپیوٹر اس وقت ان میں سے ہر ایک انگوٹھے کے نشانات کی تصدیق کر رہا تھا۔

خطرے کے احساس سے تو میرے جسم میں سسٹنی دوڑ رہی تھی لیکن ساتھ ہی شدید حیرت کا حملہ بھی ہوا تھا۔ کمپیوٹر کا استعمال تو ابھی صحیح طور پر ہمیں بھی شروع نہیں ہوا تھا جبکہ یہ تو ایک اور انقلاب گوشت کو آستان تھا جس شہید کوئی شہید نہ تھی لیکن اس کا

بھی کمان نہ کر سکتا۔ چہ جائیکہ کمپیوٹر کی موجودگی۔ یہ سب کچھ اس قدر بعید از قیاس تھا کہ تقریباً مستحکم خیر ملک تھا۔

ببینی نے مرکز میری طرف دیکھا اور غیر محسوس انداز میں مسکرائی۔ صورت حال کو یقیناً وہ بھی سمجھ چکی تھی لیکن اس لڑکی کی دیگر خوبیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ غیر ضروری طور پر غور و خوض نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ چکی تھی کہ خوفزدہ ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو سمجھتے تو دیر سے بہت سے لوگ ہیں لیکن اس فطری رد عمل پر قابو پانا کسی کسی کے ہی بس کی بات ہوتی ہے۔

وہ دوبارہ سانسے دیکھتے ہوئے سست روی سے آگے بڑھنے لگی۔ اس سے آگے اب صرف تین آدمی رہ گئے تھے۔ وہ بھی بے بعد دیگرے اطمینان سے کمپیوٹر پر اگڑھا لگاتے ہوئے کیٹ عبور کر گئے۔ بینی نے بھی اپنی واری آگے پر بلاتے ہوئے اگڑھا کمپیوٹر کی مخصوص پلیٹ پر رکھ دیا۔ پلیٹ کھٹ سے آتش کے سپتے کی طرح اندر پلا جاتی اور دوسرے ہی لمحے گویا ماسول پر چھائی تمام غنودگی ایک دھماکے سے فضا میں پھیلنے ہو گئی۔

کمپیوٹر کی چھوٹی سی سکرین پر بزرگ کے بجائے سرخ روشنی جھلکنا ابھی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساعت کو بے حد کرسہ محسوس ہونے والا ایک سائزن بھی چچا اٹھا۔ محسوس کیا ہوا ہے تھا جیسے کمپیوٹر کا ایک آدھ تار ان کے جسموں سے بھی منسلک تھا۔

انہوں نے اسٹین گنیں مشینی انداز میں سیدھی کر کے پوری قطر کو گور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے بھی زیادہ تشویشناک بات یہ تھی کہ بوسے کا وہ عظیم الشان گیسٹ بلیک سی گز گز اہٹ سر اہارت تیز رفتار سے بند ہونے لگا تھا۔

میں نے دیگر تمام عزائم ادا کر کے اور تدبیر بنانے حلق رکھ دیں اور پہلا کام یہ کیا کہ کبھی کو ایک طرف دھکیل کر اپنی تمام تر صلاحیتوں کو مجتمع کرتے ہوئے اس شیر کی طرح پھلانگ لگائی جس کی زندگی کا دارومدار ہی ایک چھلانگ پر رہ گیا ہو۔

میں کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح آہنی گیٹ کے دونوں پہلوں کے درمیان سے گزرا اور اس حقیقت سے روشناس ہوا کہ اگر مجھے چھلانگ لگانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو پھر یہ کام ناممکن ہی تھا کیونکہ میرے گزرتے ہی دونوں پٹ تنہا میں مل گئے تھے اور دوسرے ہی لمحے وہ گولیوں کی بوچھاڑ سے جھنجھان اٹھے تھے۔ محافظوں کو برست مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی تھی۔

میں نے اپنے آپ کو ایک تہموار پہاڑی راستے پر پایا جو بدلتا قشيب میں جا رہا تھا۔ شام کے دھندلے میں وہ چار گز کے لمبے کی چیزیں بھی محض سیلوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ راستہ صرف وہی نہیں تھا جس پر میں دوڑ رہا تھا کچھ اور یگزنڈیاں بھی مختلف ستوں میں باہمی ہوئی تھیں اور کچھ آگے چل کر ان کے دونوں طرف نیم پختہ اور جھوپڑی نما مکانات بے ترتیبی سے بکھیرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بو وگب مجھ سے پہلے پہاڑ سے

گزرے تھے ان میں سے کچھ تو انہی پتہ بندوں پر پہنچ چکے تھے اور کچھ مجھ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ کچھ یقیناً اپنے گھروں میں بھی پہنچ چکے ہوں گے۔

جو لوگ سائزن اور مشینی گیٹ پر گولیوں کی بھنکار سن چکے تھے وہ محسوس کرتے تھے لیکن غالباً وہ نہ تو یہ سمجھ پائے تھے کہ جن کی وجہ سے سائزن بجا ہے ان میں سے ایک پھانک کے پار پہنچ چکا ہے اور نہ ہی غالباً انہیں معلوم تھا کہ ان حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ بے چارے محض مزدور یا دوسرے لنگھوں میں "عوام" دکھائی دیتے تھے جن کا کام جس مددگارے ہوئے مویشیوں کی طرح محنت کرنا اور اپنے "آقاؤں" کے لیے دولت پیدا کرنا تھا۔

سائزن صرف چند سیکنڈ اور سنائی دینا پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے دوڑنے دوڑتے پست کر دیکھا۔ گیٹ کھل چکا تھا اور کچھ متحرک روٹھیاں اور انسانی بوسے اندر چھل نکلیں لگاتے اور میری سمت میں دوڑتے نظر آ رہے تھے۔ بس سڑک پر میں دوڑ رہا تھا یہ گویا ایک قسم کی "سرنگر روڈ" تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ اپنی کے گرد احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اس کے دونوں طرف درختوں کا کھنا سلسلہ تھا۔

میں نے اندر آنے کے لیے ایک کمرے سے کبھی کو چارے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ تمام اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مجھے اس کی زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرے کان بوفر کی ٹوپی سے ڈھکے ہوئے تھے ان میں سے ایک میں جو "آواز سماعت" لگا ہوا تھا اس پر مجھے کبھی کی خیریت کی اطلاع مل رہی تھی۔ مختلف آوازوں کے بے منتظم شور کے درمیان اس کی تیز چیز آواز مجھے سنائی دے رہی تھی جیسے وہ خاص طور پر مجھے ہی سنائے کے لیے کہہ رہی ہو۔ "میں کہہ تو رہی ہوں..... مجھے کچھ نہیں معلوم..... اس نے مجھے کتنے در میں اپنے جل میں بھنسا دیا تھا..... کہہ رہا تھا کہ ایک بہت بڑا خزانہ حاصر کرنے کا پتہ ہے اور اگر میں اس کا ساتھ دوں تو ہم دونوں کروڑ پتی ہو جائیں گے..... سنو..... دیکھو..... تو....."

وہ انگریزی میں بات کر رہی تھی اور غالباً کسی نے تھپڑ مار کر اسے چپ کرایا تھا۔ پھر انگریزی میں ہی اسے ڈانٹا گیا۔ "دب تمہیں کہ جائے تب صفائی پیش کرنا۔ یہ فیصلہ تمہیں منوطی صاحب کے حضور پیش کرنے کے بعد ہی ہو گا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو یا سچ....." مجھے اطمینان ہو گیا کہ ابھی خاصی دیر تک کبھی کی جان کو ہرجاں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ میں اس وقت جس رفتار سے دوڑ رہا تھا اس سے میں دنیا کے کسی بھی حصے میں منعقد ہونے والا دوڑ کا مقابلہ یقینی طور پر جیت سکتا تھا۔ اپنی کے مکانات وغیرہ غالباً مربع صورت میں پھیلے ہوئے تھے کیونکہ میں اچانک ہی ایک موڑ پر جا پہنچا تھا اور ابھی میں اپنی بھونک میں اپنے آپ کو درختوں میں جا بھونے سے بچانے کے لیے ہی کوشاں تھا کہ میری نظر کوٹنے پر کھڑی ہوئی ایک مینار نما عمارت پر پڑی۔

"دیکھتی جاؤ تمہارا کیا کچھ ہوئے گا..... ذرا اس بندر کے بچے کو ہاتھ آ لیتے دو جو تمہارے ساتھ تھا۔" کسی نے غرا کر کہا۔ "جائے گا کہاں؟" اس واوی میں تو ہم کھوئی ہوئی بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔"

"اتنی اسحق کو معلوم نہیں کس نے خزانے کی پٹی پھا دی تھی۔" کبھی نے جھلکی ہوئی آواز میں کہا۔ "درمیں بھی اس کی باتوں میں آکر اس کے ساتھ ماری جوں کی..... حالانکہ اب مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اگر یہاں کوئی خزانہ موجود بھی ہے تو ہمیں کم از کم دو تین سو ساتھیوں کے ہمراہ اس واوی پر باقاعدہ حملہ کرنا چاہیے تھا۔"

"اس صورت میں بھی تمہارا زیادہ سے زیادہ ایک ہی آدمی اندر پہنچ پاتا۔ بشرطیکہ وہ بھی اتنا ہی پھر پھرتا ہوتا جتنا یہ تھا۔" مردانہ آواز نے جواب دیا۔ "باقی سب کے سب گولیوں سے چھنی ہوئے۔ حتیٰ کہ تم نے بھی اگر فوری طور پر ہاتھ نہ اٹھا دیے ہوتے تو موت تمہارا بھی مقدر تھی۔"

"کبھی ہالے سے کرا دی۔ اسی لمحے بہت سی ملی جلی ناقابل فہم آوازیں کی جھنناہٹ سنائی دینے لگی۔ گویا ابھی میں کبھی کے سگلے میں موجود ناکٹ میں چھپے ہوئے ٹرانسیر کے حلقہ عمل سے نکلا نہیں تھا۔ ایک اندازہ مجھے یہ بھی ہوا کہ جس وقت میں نے ٹیٹ سے اندر چھلانگ لگائی تھی اس وقت وہاں صرف وہی دو محافظ موجود نہیں تھے جو مجھے نظر آئے تھے۔ کہیں نہ کہیں کچھ اور گرے بھی موجود تھے کیونکہ کچھ محافظ میرے تعاقب میں دوڑتے تھے اور کچھ وہیں کبھی کے پاس موجود تھے۔ یہ محافظ بھی یقیناً عام سے آدمی نہیں تھے جو انگریزی بولتے تھے۔ وہ یقیناً مشیت علی خان کے خاص آدمیوں میں سے تھے۔ جن لوگوں کو میں نے کھیتوں سے آتے دیکھا تھا۔ وہ انگریزی سے ذہد ہی نظر آتے تھے۔

جب آوازیں تقریباً معدوم ہو چکیں تو میں نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کی بہت سی جیبوں میں سے ایک جیب کو ٹٹوڑا۔ اس سے ایک مخصوص ساخت کی چھوٹی سی فیڈل لائٹ نکال کر میں نے روشن کر کے ایک مخصوص جگہ پر رکھی۔ اس کی روشنی دائرے کی صورت میں ایک محدود سی جگہ پر پڑ رہی تھی۔ میں نے اپنے لباس کے نیچے سینے پر بندھا ہوا ایک چمپا سا ڈبا نکال کر روشنی کے اس دائرے میں لا کر رکھا.....

مردانہ آواز نے کہا: "میرے ہاتھ پاؤں توڑنے میں کیا ضرورت ہے..... میرے ہاتھ پاؤں توڑنے میں کیا ضرورت ہے..... میرے ہاتھ پاؤں توڑنے میں کیا ضرورت ہے....."

ابھی میں نے سوچا ہی تھا کہ شاید یہ غارت وایج ٹاور کا کام دیتی ہوگی کہ اسی لمحے اس کے بالائی حصے سے جیسے روشنی کا آبشار پھوٹ پڑا۔ سستی پر چھلکی ہوئی تاریکی اور کسی کسی مکان کی کھڑکی و روشن دان میں ٹھکانا لی ہوئی مدھم سی روشنی بتاتی تھی کہ بہت سی بجلی نہیں ہے اور وہاں پر غلوں یا لالٹینوں وغیرہ سے ہی کام چلایا جاتا ہے۔ لیکن اس وایج ٹاور کی بلندی پر نذر انش روشنی ہوئی تھی۔

یقیناً اس مینار نما عمارت میں طاقتور بزنیز اور وایج ٹاور کے دیگر وایجانات بھی موجود تھے۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ میں نذر انش کی رسائی سے چند گز آگے نکل آیا تھا۔ لائٹس آن ہونے وقت ان کا رخ کچھ اس طرح تھا کہ انہوں نے اس راستے کا بیشتر حصہ منور کر دیا تھا جن پر میں دوڑتا ہوا آیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے موڑ سے آگے سڑک کا وہ حصہ بھی روشنی میں نہا گیا جس پر میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ صرف موڑ پر چند گز کا کھڑا روشنی سے محروم رہ گیا تھا جس میں دونوں دائیوں پر روشن ہونے والی نذر لائٹس سہکتی نہیں، متحرک تھیں اور وہ اس انداز میں حرکت شروع کر چکی تھیں کہ یہ حصہ بھی کسی بھی لمحے روشنی میں نہانے والا تھا۔

میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ میں درختوں کے جھنڈ میں جاگھسوں۔ میں نے یہی کیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جنگل میں زمین نہ ہوا ہوگی۔ ایک جگہ میں..... ٹھوکر کھا کر گرا چوٹ تو مجھے کم ہی لگی لیکن ایک بار گویا دماغ مل کر رہ گیا، تاہم میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور زیادہ گتے درختوں کی طرف دوڑ پڑا۔

ایک جگہ تک میں نے سڑک کی جھلک دیکھنے کی کوشش کی، لیکن درخت بہت گتے تھے اور میں جنگل میں اتنا اندر آ گیا تھا کہ سڑک کی جھلک دیکھنا بھی ممکن نہیں تھا، تاہم نذر انش کی حرکت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ پھر کچھ آوازوں سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ جو بگ ٹیٹ کی طرف سے میرے تعاقب میں دوڑتے تھے وہ موڑ تک آ پہنچے تھے۔ وہ تعداد میں زیادہ معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن مجھے تو یقین تھی کہ جلد ہی ان کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا۔

میرا خیال تھا کہ وہ پہلے "سرکڑ روڈ" کا پتہ لگائیں گے یا اس پر کافی آگے تک ضرور جائیں گے اس کے بعد مختلف سمتوں میں پھرتے ہوئے کسی باقاعدہ حکمت عملی کے تحت تلاش شروع کریں گے۔ اسی لمحے گویوں کی تڑتڑ سنائی دی۔ غالباً کسی غلط فہمی کی بنا پر وایج ٹاور سے بجلی مشینوں کے اریٹے بازہ ماری گئی تھی۔ پھر کچھ ٹوکوں نے چلا کر ایک دوسرے سے ہاتھ کہا۔ تبم میں چونکہ کالی دور نکل آیا تھا اس لیے مجھے یہ آوازیں مدھم سی سنائی دین اور چند لمحے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ لوگ غالباً آگے نکل گئے تھے۔

اسی دوران ایک بار پھر ایئر فون پر مجھے کئی کی آواز سنائی دی۔ "او خبیث! رہیاں تو آہستہ باندھ..... نور یہ اتنی سخت کریں لگانے کی کیا ضرورت ہے..... میرے ہاتھ پاؤں توڑنے میں کیا ضرورت ہے....."

مجھے مزید کئی فرلائف کا فاصلہ طے کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ صرف ایک جگہ مجھے کچھ فاصلے پر ایک کوئی آنی دیکھائی دی۔ ان کے ہاتھوں میں رائیسی تھیں اور وہ تلاشی نظروں سے اوجھل رہ گئے۔ کبھی کبھی وہ گپ شپ کے سے انداز میں باتیں بھی کرتے تھے۔ ان میں سے چند کو میں نے قلعہ بھی لگاتے سنا۔ میرے لیے باعث حیرت یہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی جنگ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا جو چھپنے کے لیے بہترین جگہ تھی۔

پھر میں نے ان میں سے چند ایک کو بھرتے دیکھا۔ وہ لوگ مختلف مکانوں کے دروازوں پر دستکھیں اپنے گمے تھے۔ باقی آگے بڑھ گئے تھے میں جنگل میں کچھ اندر چلا گیا اور اندر سڑک کے متوازی چلنے لگا۔ میں جب دوبارہ سڑک کے قریب نکلا تو مجھے ان میں سے کوئی نظر نہ آیا۔ البتہ کچھ فاصلے پر مجھے ایک مکان نظر آیا جو اپنے متعدد کے لیے مجھے بہ حد درجوں معلوم ہوا۔

یہ مکان دیگر عام مکانوں کی قطاروں سے کچھ ہٹ کر تھا اور صرف پختہ ہی نہیں خاصا غریب و عریض بھی تھا۔ ابھی تک پوری بہت سی میں مجھے یہی مکان متاثر نظر آیا تھا۔ صرف اس لیے نہیں کہ وسعت یا طرز تعمیر کے لحاظ سے اس کے مکینوں کی مسودہ عالی عیوں تھی بلکہ کئی اور پہلوؤں سے بھی اس کی اہمیت میرے پیش نظر تھی۔

اس مکان کی چار دیواری زیادہ اونچی نہ تھی مگر اس پر قاردار تریں لگا کر اسے اونچا کیا گیا تھا۔ چار دیواری کے اندر خاصا وسیع چاروں طرف لان تھا جسے اصل عمارت اس کے وسط میں تھی جو زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اگر اس کے گرد پیش سے قطع نظر اسے دیکھا جاتا تو یہ اوسط درجے کا ایک بھولا سا دو منزلہ مکان تھا۔ طرز تعمیر کچھ چینی سا تھا۔ اصل عمارت تو اندھیرے میں ہی ڈوبی نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس کے ارد گرد ان ترچے پر خوب روشنی پھیلی ہوئی تھی اور یہ روشنی برقی کھمبوں کی پیداوار تھی یہاں تو میں نے رات کے سکوت میں نہایت مدہم سی گھر جڑا ہٹ بھی سنی جو عالیا سی بیس میں بند جزیرہ کی تھی۔

سب سے خاص بات یہ تھی کہ اس مکان کے گیٹ پر دو مسلح محافظ موجود تھے۔ جہاں میں موجود تھا وہاں سے مجھے لان کے پیشتر حصے اور اندر والی دروازہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر بھی دو محافظ موجود تھے۔ میں چند منٹ وہاں کھڑا صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔ مکان کے عقب سے مجھے دو اور محافظ بھی آتے دکھائی دیے۔ ان کے انداز سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ اصل عمارت کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔

اندرونی دروازے پر تعینات محافظوں کے قریب رک کر انہوں نے رازدارانہ انداز میں کچھ باتیں کیں پھر آگے بڑھے۔ سب سے پہلا مسلح گیٹ پر موجود محافظوں کا صفایا تھا۔ پھر حال اس فیصلے پر تو میں پہنچ ہی چکا تھا کہ میری مہم کا پسند مرطلہ اسی مکان میں داخل ہونا

قرآنہ العبرم

محمول چھپنے والا

اس ڈیسے میں اسٹین گن کے پارٹس اور ایک مخصوص سازت کا اسکرپو ڈرائیور موجود تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ جیسے ہی میں اس گن اسمبل کرنے شروع کی اپنے ایئر فون پر بھی مجھے گن کا ہی تذکرہ سنائی دیا۔ کوئی دو یا تین منٹ کے بعد کہہ رہا تھا..... "بڑی ذبردست گن سینے سے لگا رکھی ہے اور وہ بھی پارٹس کی صورت میں۔ ویسے تو بڑی معصوم بن رہی تھیں....."

"میں نے کب معصومیت کا دعویٰ کیا ہے۔" کہنی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میں یہاں خزانے کی تلاش میں آئی تھی، کسی کی سامگرہ کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں بھولوں کے بارے میں کچھ نہ جانتی۔"

میں نے اس گفتگو سے دھیان ہٹا دیا اور گن اسمبل کرنا شروع کر دی۔ گن اسمبل کرنے میں مجھے صرف ایک منٹ اور لگا۔ اسے فیس کے نیچے نیچے میں اس کر میں نے اپنے دیگر ہتھیار چیک کیے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے۔ فیش لائٹ بجھا کر میں نے جیب میں ڈالی اور فیکس سٹ کا تھیں کر کے دوڑ پڑا۔ جنگل کی تاریکی میں یوں بھاگتے ہوئے میں اپنے آپ کو زمانہ مار کا کوئی وحشی محسوس کر رہا تھا۔

داؤنی کی طرف سے وقفے وقفے اور مختلف فاصلوں سے سنائی دینے والی کچھ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ سکوت اب درہم برہم ہو چکا ہے اور میری تلاش کی مہم دور پکڑتی جا رہی ہے۔ دوڑتے دوڑتے میں داؤنی جنگل کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں سے سڑک اور سڑک کے پری طرف بکھرے ہوئے مکانات سے قریب تر رہ سکتا تھا کہ اوجھل رہا ہے۔

میرا اندازہ درست ہی تھا۔ بہت سی کے چاروں کولوں پر ہی داؤنی ٹاور موجود تھے اور ان سب سے جس طرح روشنی پھیلنے جا رہی تھی اس سے گویا بہت سی کے گرد روشنی کا ایک مخرک ہالہ سا قائم تھا۔ میں ایک درخت کے عقب سے کچھ دیر سڑک کا جائزہ لیتا رہا۔ اندر بہت سی میں یقیناً پہلے شروع ہو چکی تھی۔ میں سڑک کے متوازی کچھ اور آگے چلا گیا۔ مجھے ایک ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں داخل ہونا ہے مد دشوار نظر آئے تاکہ وہاں میری موجودگی کا شبہ نہ کیا جاسکے اور اس جگہ کا تعلق اسی شخصیت سے ہوتا جس کے بارے میں میں سوچ رہا تھا تو پھر سونے پر سہاگے والی بات ہوئی۔

کسی خوابیدہ بلی کی طرح خرخر کی سی آوازیں نکالتے ہوئے ڈھیر ہو رہے تھے مکان کے کونے پر وہ دو محافظ بھی نمودار ہو گئے جو گشت پر تھے اور انہوں نے ان کو گرتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہیں فوراً کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا لیکن اضطراری کیفیت کا شکار ہونے کی وجہ سے وہ کوئی صحیح قدم نہیں اٹھا سکے۔

انہیں سب سے پہلے پوزیشن سمجھانی چاہیے تھی۔ اس کے بجائے وہ راتھیں سیدھی کر کے محافظوں کی طرف دوڑ پڑے جو دروازے کے آگے پختہ روش پر ڈھیر ہو چکے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ اسحق شور بھی چھٹا شروع کر دیتے۔ میں نے ان کی پشت اور گمبویوں پر کئی کئی سوئیاں داغ دیں۔ وہ اپنے ساتھیوں تک پہنچ تو گئے لیکن ان کی کوئی مدد کرنے یا حقیقت کا سراغ لگانے کے بجائے خود بھی ان پر ڈھیر ہو گئے۔ میں بے حد مسکرایا۔

اب میں گیٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس پر باہر کی طرف سے ٹالا پڑا ہوا ہے۔ اس کی چابی مجھے قریب ہی پڑے محافظوں میں سے ایک کی جیب سے مل گئی اور میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ٹالا کھسک کر اندر پہنچ گیا۔ محافظوں کی لاشیں بھی اندر گھسیت کر میں نے گیٹ بند کر دیا۔ گیٹ کو بے آواز طریقے سے کھولنے اور بند کرنے میں ہی مجھے زیادہ وقت لگا۔ اس دوران میں مکان کی طرف بھی متوجہ رہا لیکن اس پر سکوت ہی طاری تھا۔

ایک لمحے کے لیے تو میں الجھ گیا۔ کہیں میں ایک خالی مکان پر ہی تو وقت ضائع نہیں کر رہا لیکن پھر میں نے یہ سوچ کر اس کو تسلی دی کہ محافظ خواہ کتنے ہی فرض شناس کیوں نہ ہوں لیکن جس وقت مکان خالی ہوتا ہے اس وقت وہ اتنی باقاعدگی سے پہرہ نہیں دیتے اور نہ ہی اتنے مستعد نظر آتے ہیں جتنے یہ بے چارے نظر آ رہے تھے۔

ان چھ لاشوں کو ایک جگہ دیوار کے ساتھ لگا کر میں دیوار کی وجہ سے پیدا ہونے والی اندھیرے کی پی پی پر چلتا مکان کے عتبہ میں پہنچا۔ ادھر میری توقع کے مطابق حقیقی دروازہ تو موجود تھا لیکن میری توقع کے برعکس وہاں دو مزید محافظ بھی موجود تھے۔ میں شاید اچانک ہی ان کے سامنے جا پہنچتا کیونکہ وہ دروازے کے قریب ہی بیٹھ ہوئی ایک محراب کی شکل میں کھڑے تھے۔

دقت "ان میں سے ایک محراب نما حصے سے نکل آیا۔ دوسرا کچھ کہتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا اور میں بروقت دیوار سے چپک گیا۔ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ اگر میں دیوار سے مزید ایک انچ بھی آگے کھسکا تو وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ وہ میری ہی طرف آ رہے تھے۔ اس لیے مجھے ایک بار پھر اپنی ڈارٹ گن کو زحمت دینا پڑی۔ درخت میں عین دیوار کے زیر سایہ کھڑے ہو کر ذرا سی بھی آواز پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ان میں سے ایک نے کچھ اس قسم کی آواز نکالی جیسے اپنے ساتھی سے کہنا چاہتا ہو۔

تھا۔ غالباً یہی وہ کان تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ کئی کی آواز وقفے وقفے سے مجھے اب بھی ایئر فون پر سنائی دے جاتی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اس طرح مکالمہ کرتی تھی کہ مجھے صورت حال کا کوئی حد تک اندازہ ہوتا رہے۔ اس وقت تک مجھے یہی اندازہ ہو پایا تھا کہ اسے کس سے جانے کے لیے فی الحال ہاتھ کر کسی کیبن نما کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا۔

میں نے گیٹ پر موجود محافظوں اور اپنے درمیان ہر کل فاصلے کا جائزہ لیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اتنے فاصلے پر میری ڈارٹ گن کی سوئیاں انہیں ہلاک کر نہیں گی۔ البتہ اگر میں اس درخت کے عتبہ میں پہنچ جاتا جو عین سڑک کے درمیان ہی موجود تھا تو سوئیاں کا موثر طاقت کے ساتھ ان تک پہنچنا اور جسم میں پیوست ہونا ممکن تھا۔

میں چونکہ سڑک سے قدرے ملندی پر تھا اور محافظ اس طرف نہیں دیکھ رہے تھے اس لیے مجھے مذکورہ درخت تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سینے کے بل لیٹ کر میں نے ڈارٹ گن سے پہلے ایک محافظ کے رخسار کا نشانہ لیا۔ اس کے گل ذہب پھولے پھولے نخر رہے تھے۔

ڈارٹ گن فار کرتے وقت بلی کی "ٹھک" کی آواز پیدا کرتی تھی کیونکہ اس میں ہر بار ٹریگر دھانے پر ایک چھوٹے ہسٹن میں ہوا بھرتی تھی اور اسی کے دھات سے سوئی نشانے پر جا کر گتی تھی۔ معلوم نہیں یہ اس آواز کا اثر تھا یا رخسار میں سوئی پیوست ہونے کا کہ وہ محافظ بری طرح اچھل پڑا اور اس کا ہاتھ رخسار پر تن ہوا۔ دوسرا محافظ چونکہ کر اس کی طرف متوجہ ہوا مگر اس سے پہلے کہ وہ حرکت میں آتا خود اس کا اپنا ہاتھ بھی رخسار پر پہنچ گیا۔

رخسار مٹے ملتے ہی وہ دونوں ڈھیر ہو گئے۔ بمشکل تین یا چار سیکنڈ بعد وہ ساکت ہو چکے تھے۔ میں نے چند سیکنڈ مزید انتظار کیا۔ پھر ادھر ادھر کا جائزہ لے کر سڑک عبور کر کے گیٹ کے قریب چار دیواری تک پہنچا۔ گیٹ کے قبضوں اور دیوار کے درمیان اتنا اند موجود تھا کہ میں اس سے نہ صرف اندرونی دروازے کا جائزہ لے سکتا تھا بلکہ ڈارٹ گن کی مالی بھی اس میں داخل کر سکتا تھا۔

وہ دونوں محافظ اس وقت سرگوشیوں میں آؤں میں باتیں کر رہے تھے اور بار بار گیٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید انہوں نے باہر والے محافظوں کے گرنے کی آواز سن لی تھی یا ان کی چھٹی حس انہیں کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ میں نے انہیں بھی ٹھکانے لگانے میں تاخیر مناسب نہ سمجھی اور موت کا پیغام لے کر چلنے والی دو سوئیاں ان پر بھی بھیجتے رہا۔

میں اس وقت جبکہ وہ اپنے اپنے گلے سے سوئیاں اکٹھے کی کوشش کرتے ہوئے اور

"دیکھ..... میں نہ کہتا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔" اس نے اپنے کندھے سے رائفل بھی اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا یہ عمل ادھورا رہ گیا۔ موبیاں واقعی اتنی سریع انماڑ تھیں جیسے ساکنائیہ کسی چیز میں ملے بغیر برو راست زبان پر رکھ لیا گیا ہو۔

میں دل ہی دل میں ڈارت مگن کے موجد کو یاد دہانے بغیر نہ رہ سکا۔ تقریباً تین منٹ میں اس مکان کی حدود میں آٹھ لاشیں گر چکی تھیں مگر سکون ذرا بھی متاثر نہ ہوا تھا۔ اس لحاظ سے یہ جڑ بھٹے اس لاشیں مگن سے بھی زیادہ فائدہ مند محسوس ہوئی تھی جو میں نے شلوار میں اتار رکھی تھی اور جو جھٹکتے وقت مجھے خاصی تکلیف دہ حد تک چبھ رہی تھی۔ ہر حال اسٹین مگن کا یہ فائدہ ضرور تھا کہ وہ مارنی بھی تھی اور دہشت زدہ بھی کرتی تھی۔

ڈارت مگن کا استعمال ہر حال محدود تھا۔ ہر جگہ وہ کام نہیں دے سکتی تھی۔ ان دونوں لاشوں کو بھی دیوار کے ساتھ لگانے کے بعد میں عقبی دروازے پر پہنچا۔ اب میں نے ڈارت مگن جیب میں رکھ لی اور اس ہاتھ میں سوپرگ نکال کر تھام لیا تھا۔ یوں اب تک میری پتلی سے بندھا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں میں نے اپنا وفادار مخفی ہتھیار نبھال لیا۔ اس کے بعد میں نے تمام اندازے میں ایک طرف کو رہتے ہوئے جوتے کی نوک سے دروازے پر ہکا سادباؤ ڈالا۔

دروازہ کھلا تھا۔ اندر بلا کا اندھیرا تھا، جیسے موت منہ کھولے کھڑی ہو۔ دروازہ کافی حد تک وا کرنے کے بعد بھی میں دیوار سے پکا کھڑا رہا، لیکن کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔ تب میں نے اندر قدم رکھ دیا اور دروازے کے قریب ہی دروازے سے چپ چاپ آیا۔ مزید چند لمحوں انتظار کے بعد میں نے دروازہ آہستگی سے بند کر دیا۔

میری حسیات مجھے بتا رہی تھیں کہ اس کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ فرنیچر نام کی بھی کوئی چیز وہاں نہیں تھی۔ میں دیوار ہی کے ساتھ رگڑ کھاتا ایک اور دروازے تک پہنچا یہ بھی مجھے حلائی ملا لیکن جیسے ہی میں اس کمرے میں داخل ہوا..... اسٹن آن ہو گئی۔

مجھے کمرے میں قدم رکھتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ یہاں کچھ ہو گا لیکن اس وقت تک ہر حال میں قدم رکھ چکا تھا۔ فوری طور پر میں گھٹنوں کے بل گر گیا لیکن اسی لمحے ایک بدمعاش آواز سنائی دی جسے سرگوشی بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اسے میرے علاوہ کوئی سن بھی نہیں سکتا تھا۔

آواز تضادات کا مجموعہ تھی۔ اس میں موسیقیت بھی تھی اور کچھ کھردرا پن بھی، الجھا بھی تھی اور اندیشہ بھی۔ نہایت شدت، نگہ پڑی میں کہا گیا تھا۔ "جلد بازی میں کچھ مت کر بیٹھنا۔"

مجھے ہتھیار پھینکنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اس لیے میں نے اندھا دھند کچھ نہ کرنے کے بجائے ذرا بہتر طور پر اس شخصیت کا جائزہ لینے کو ترجیح دی جس کی زبان سے یہ الفاظ

نکلے تھے۔ وہ ایک عجیب و غریب عورت تھی۔

عجیب و غریب اس لحاظ سے کہ آواز کی طرح اس کی شخصیت بھی تضادات کا مجموعہ تھی کہنے کو تو وہ عورت تھی مگر اس کا قد شاید چھ فٹ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں سے ایک وقت مضبوطی بھی عیاں تھی اور نزاکت بھی۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں شفقت اور مہربانی کے سائے بھی تھے اور سندی و نامربانی کی کرنچیں بھی۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مجموعی طور پر وہ ایک بے پڑہ خوبصورت عورت تھی۔ طبع رنگت کتالی چہرہ روبرو کی بڑیاں کچھ ابھری ہوئی تھیں، لیکن ایسی چٹکوں سے مزین بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی وجہ سے ہڈیوں کا ابھار بے حد خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔

اس کے ترشے ہوئے رسیلے ہونٹوں کے گوشوں پر خفیف سا تھپاؤ تھا جو اس کی طبیعت میں چھپی ہوئی سفاکی کی نشاندہی کرتا تھا۔ اس کے بال کتے ہوئے تھے..... اور بے ترتیبی سے اس کی پیشانی پر جگے ہوئے تھے، لیکن اس بے ترتیبی نے اس کے حسن اور دلکشی میں اضافہ کیا ہوا تھا۔

وہ تقریباً پوری جتنے موٹے کپڑے کی ایک ڈھیلی ڈھان شرٹ اور اس سے ملنے چلتے لیکن مختلف رنگ کے کپڑے کی پٹھوں پہنے ہوئے تھی۔ پٹھوں کے پٹھے اور شرٹ کی آستین چڑھی ہوئی تھی اور اس کی مضبوط اور پرکشش کھدیاں اس بھاری بھرکم وکٹورین اسٹائل کی کرسی کے ہتھول پر رکھی ہوئی تھیں، جس پر اس وقت وہ نیم دراز تھی..... اس کے ایک پاؤں میں سمور کا جوتا تھا۔ دوسرا جوتا کرسی سے کچھ دور پڑا تھا۔

اس کی عمر پینتیس سال سے کم تو نہیں رہی ہوگی لیکن اس کے خدوخال پر فوجی و کم عمری کی قیاسی تھی۔ صرف اس کی آنکھوں کی چٹائی اور جسمانی اتھان اس قیاسی کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ درنہ وہ سب حد کم عمر لڑکی معلوم ہوئی، لیکن خصوصیات کا تضاداتی ملاپ بھی بے حد خوبصورت اور حیران کن تھا۔ اس سے مجھے کوئی تشبیہ نہیں ہو بھی سوائے اس کے کہ وہ اس لڑکی کی طرح تھی جو خود ہی اپنی ماں بھی معلوم ہوتی ہو۔

"دروازہ بند کرو اور اطمینان سے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔" اس کا سرگوشی نما مکالمہ سن کر ایک بار پھر جھٹ جانے کیوں میرا دل اور محاسن کچھ اٹھ چکے تھے۔ بے ہوش ہوئے گئے۔

میں نے اسے مار کر دروازہ تو بند کر دیا لیکن اٹھ کھڑے ہونے والی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ اس کے بجائے میں دیوار سے ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھ گیا۔ پتھر اور دیوار بدستور میرے ہاتھ ہی میں تھے۔ گو کہ میں یہ دیکھ چکا تھا کہ عورت کے پاس نہ تو کوئی ہتھیار وغیرہ نثر آ رہا تھا اور نہ ہی عجیب وغیرہ میں موجودگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

وہ کمرہ جس میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا کچھ عجیب سے انداز میں سجا ہوا تھا۔

اس نے ایک طویل سانس لیا اور مہر کی نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس نظر میں میرے لیے ایک خاص دلچسپی کی جھلک موجود تھی اور اس بات کو محسوس کرتے ہوئے نہ جانے کیوں میری ہرگز ہرگز مہر کی نظر سے دل کی یہ خفیف سی اٹھل پٹھل میرے لیے باعث حیرت تھی۔

"یہ ٹھیک ہے کہ مجھے ایک طویل عرصے سے اپنی بستی میں آزادانہ پھرنے کا موقع نہیں ملا۔" وہ بولی۔ "اور مجھے بہت سی ہر فرد کی صورت بھی یاد نہیں رہ سکتی، لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ صورتیں اگر یہ نہیں ہیں تو ان کا تعلق کس جگہ سے ہے تو کم از کم یہ ضرور بتا سکتی ہیں کہ ان کا تعلق اس جگہ سے نہیں ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب اتنا سمجھ بھی نہیں ہوں۔"

"ہاں..... اس پر میں تم سے متفق ہوں۔" وہ ایک بار پھر مسکرائی۔ "کم عمر ضرور ہوں لیکن نا سمجھ نہیں۔ تجربے بڑی حفاظت سے میرا سوال گول کر دیا ہے۔ بہر حال....."

اس نے نہایت ہی خوبصورت انداز میں کندھوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ۔ لیکن میں تمہیں اس سرزمین پر خوش آمدید کہتی ہوں۔ تم تازہ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آئے ہو۔ اب تو میرا بہت ہی دم چھٹے لگا تھا اور میں اس زندگی پر موت کو ترجیح دینے کے بارے میں سوچنے لگی تھی..... زندگی بہت ہی گراں گزرنے لگی تھی۔ حالانکہ ظاہر کوئی تکلیف بھی نہیں....."

میر کی دلچسپی دو چند ہو گئی۔ وہ مجھے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ ویسے تو خیر یہ کچھ ایسا بعید از امکان بھی نہیں تھا۔ شوہر کی اپنی ایک شخصیت ہوئی ہے اور بیوی کی اپنی۔ بعض اوقات بیوی شوہر کی بد اعمالیوں اور مجربانہ سرکاریوں میں ایک عرصے تک شریک رہتی ہے، مگر زندگی کے کسی موڑ پر اس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے اسی طرح یہ عورت بھی خواہ کواہ اپنی مرضی سے شہت علی خان کا ساتھ دیتی رہی ہو، لیکن اب یہ سوال کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا ہو۔

"..... لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ عورت مجھے جال میں پھاس رہی ہو؟" میں نے سوچا۔ وہ تھی بھی ایسی چیز۔ بڑے بڑے پتھر کے عہنم بھی اس کی ایک جنبش ابرو سے موسم کی طرح پھل سکتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ میرے جیسے انسان کے لیے بھی اس کی تسد میں اتنا مشکل تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اندر سے وہ کبھی کبھی کیا سوچ رہی تھی اور کیا کرنا چاہتی تھی۔

میں نے محتاطانہ لہجے میں کہا۔ "تم بہت ذہین نظر آتی ہو لیکن کیا شہت علی خان سے شہرہ کرتے وقت تمہاری اہانت نے تمہیں خبردار نہیں کیا تھا کہ تمہاری زندگی میں کبھی ایسا

جیسے کسی دولت مند نے دنیا کے کسی دور دراز گوشے میں گھر بنوایا ہو اور وہیں جو کچھ بھی اچھن سے اچھی چیز دستیاب ہو سکتی ہو اس سے گھر کو تراست کر لیا ہو۔ قانون نہایت دھیر اور کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردے مولے مولے اور کچھ شاہانہ قسم کے تھے لیکن قرعہ پر کچھ ایسا تھا جیسے نہایت پرانی اشیاء فروخت کرنے والی کسی دکان سے خرید لیا گیا ہو۔ ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ پردے وغیرہ کھڑکیوں پر اس انداز سے کھینچے تھے اور روشنی دانوں کو اس انداز میں بنایا گیا تھا کہ روشنی باہر نہ جانے پائے۔

مجھے کمرے کا جائزہ لیتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی محض ایک دھڑکی ابھری۔ سرگوشی نما مکالمے نے ایک بار پھر میری سماعت کو نوازا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم نہیں آؤ گے..... میں اس وقت ایک کھڑکی کی درز سے تمہیں دیکھ رہی تھی جب تم محافضوں کی لاشیں ٹھکانے لگا رہے تھے۔ اس وقت میں چاہتی تو ان لاشوں میں تمہاری لاش بھی شامل ہو سکتی تھی، لیکن مجھے فوراً ہی احساس ہوا کہ یہ تو میری بہت بڑی غلطی ہوگی....."

اس نے مکالمے کو تھنہ چھوڑ کر شرٹ کی سائے والی جیب میں ایک ہاتھ ڈالا اور دوسرا ہاتھ اٹھا کر گویا مجھے خبردار کرتے ہوئے بولی۔ "میں وغیرہ مت چلاؤ۔ میں جیب سے ہر کوئی ہتھیار نہیں، سگار نکالنے لگی ہوں۔"

اس نے ایک چھوٹا لیکن موٹا سا سگار نکالا۔ اس کا سرا دانٹوں سے توڑ کر قالین پر پھینکا اور دوسری جیب سے لائٹر نکال کر اسے سلگایا۔ اس نے اتنا طویل کش لے کر دھواں اٹھا کہ ایک لمحے کے لیے تو مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ پورا کمرہ ہی دھوئیں سے بھر جائے گا۔ کسی عورت کو سگار پیتے میں نے پہلے بار دیکھا تھا اور وہ بھی اتنی لگن سے گویا ایک ہی کش میں سگار ختم کر دینا مقصود ہو۔

اس کی باتیں ابھی ابھی ہی تھیں۔ میں نے بولنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ وہ دوبارہ خبردار کرنے کے لیے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "میری ہی طرح پینی آواز میں بولنا۔ برابر کے کمرے میں میرا شوہر موجود ہے گو کہ وہ کچھ سننے یا سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہے لیکن احتیاط بہر حال اچھی چیز ہے۔"

میں نے سرزدست کچھ کہنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور متوقع نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"خلیہ تو تم نے کیوں والوں جیسا بنا رکھا ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن آئے بہر حال کہیں اور سے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"دنیا میری صورت پر نکلا ہے کہ میں نہیں اور سے کیا ہوں؟" میں نے پہلی بار زبان کھولی۔

موز بھی آگیا ہے؟

”حشمت علی خان سے شادی؟“ اس کی روشن پیشانی پر ہلکی سی شکنیں ابھر گئیں۔ پھر وہ دھیرے سے نفس دی اور میرے اعصاب میں جیسے گدگدی سی ہونے لگی۔

”شاید تم مجھے حشمت علی خان کی بیوی سمجھ رہے ہو؟“ وہ بولی۔ ”اس خبیث کی بیوی نہیں ہوں۔ دیئے بھی کسی ایک مضابطہ اور باقاعدہ بیوی کی کیا ضرورت ہے۔“

مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ وہ حشمت کی بیوی نہیں تھی تو کون تھی؟ لیکن اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔ ”تم اس گھر کو حشمت علی خان کی رہائش گاہ سمجھ کر گھسے تھے؟“

میں نے اثبات میں سر ہل دیا۔ وہ جیسے کسی بچے کی معصومانہ شرارت پر مسکرا دی اور بولی۔ ”ترامت قدم اٹھانے کے کچھ زیادہ ہی عاوی معلوم ہوتے ہو۔ حیرت ہے کہ اس قدم کم معلومات کے باوجود تم یوں اس داوی میں گھس پڑے۔ تمہاری اس جرات پر تمہیں سلام کرنے کو بھی جی چاہتا ہے اور اس امر پر دیوتاؤں کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی غلط جگہ نہیں گھس گئے۔ تمہاری اطلاع کے لیے بنائے دیئے ہوں کہ حشمت علی خان کے گھر میں گھنٹہ اس سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ اس کے تمام محفوظات کو ہواک کرنے کے بعد بھی تم اندر نہیں جاسکتے۔ جب تک وہ خود تمہیں اندر نہ بلانا چاہے اور پھر وہ اپنے مکان کی اصل غارت میں بھی نہیں رہتا۔ تم خانے میں رہتا ہے۔“

میرنی انجمن بڑھ رہی تھی۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”خیر..... اب حشمت علی خان کو تو تمہوں مارو۔ یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟“

”حشمت علی خان اس بستی کا مولیٰ ہے۔ شاید تمہیں علم نہ ہو کہ منوچی.....“

”مجھے معلوم ہے کہ منوچی کیا ہوتا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”تو پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا۔ پائی کیا ہوتا ہے۔“ وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ ”مٹھکو

میں وقفہ پاتے ہی وہ سگار کا کش لینا نہیں بھولتی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہل دیا تو وہ بولی۔

”میں اس بستی کے سابق پائی کی بیوی ہوں۔ سینڈریلا میرا نام ہے۔ میں یوریشین ہوں۔“

وہ مسکرائی۔ لیکن اس بار اس کی مسکراہٹ میں حزن دیاں کا پرتہ تھا۔ ”ایک تو وہ بچوں کا

کہنیوں والی سینڈریلا تھی جس کی بولی کھینچی تھی۔ میں وہ سینڈریلا ہوں جس کا سب کچھ

یہ کھو گیا ہے۔“

”اور.....“ میں نے ایک طویل سانس لیا۔ اب بات صاف ہو گئی تھی۔ وہ سابق پائی

کی بیوی تھی۔ جسے غالباً زبردستی ”سابق“ بنا دیا گیا تھا۔ ”میرے خیال میں تو پائی کی بیوی کو

ایک سیدھی سادی ان پڑھ پہاڑی خوبرو مونا چاہیے تھا۔“ میں نے خیالی طہ ہر کیا۔ ”تم تو

بست ہی اونچی مخلوق ہو۔ انگریزی بھی نہایت عمدہ بولتی ہو۔“

”میں آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی ہوں۔“ یہ باتوں میں اٹھایاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ”میں

تی نہیں پائی بھی۔ مسطورا کا پڑھا ہوا ہے۔ وہ کوئی معقول آدمی نہیں۔ اس کا خاندان

صدیوں سے اس قبیلے کا سردار چلا آ رہا تھا۔ بس کا بہت گلیں سامعہ اس داوی میں آکر

آباد ہوا تھا۔ بعد میں معلوم نہیں یہاں کون کون آکر گھس گیا۔ بہت گند پڑ گیا یہاں۔

ہمارے پرسکون زندگی میں زہر گھسا گیا۔“

”کچھ تفصیل سے بتاؤ۔“ میں نے فرمائش کی۔

”تفصیل میں کیا رکھا ہے۔“ وہ سر کو خفیف سا جھکا دے کر بولی۔ ”انقصار میں بھی

بات وہی ہے۔ تین سال پہلے تک پائی ہی بستی کا سردار تھا۔ منوچی کی حیثیت دہی سی ہوئی

تھی۔ وہ ایک طرح کا مذہبی رہنما ہوتا تھا۔ پائی اگر ضروری سمجھتا تھا تو کسی معاملے میں اس

سے مشورہ کر لیتا تھا۔ لیکن اس کے مشوروں پر عمل کرنے کا پابند نہیں ہوتا تھا۔ تاہم وہ

اپنی ہر دھڑکی اور مقبولیت بہت کرنے کے لیے سال میں ایک مرتبہ رائے شماری کروالیتا

تھا۔ تاہم وہ رائے شماری کے نتائج کو بھی تسلیم کرنے کا پابند نہیں ہوتا تھا۔ اس سے اسے

صرف اپنی مقبولیت کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی تھی۔ اگر وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی

مقبولیت کم ہو رہی ہے تو وہ اپنی اصلاح کے لیے ضروری اقدامات کرتا تھا۔ مشیروں کی

خدمات حاصل کرتا تھا لیکن.....“

اس نے شکرانہ سی نظروں سے اپنے نگار کو دیکھا جو کافی مختصر ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی وہ

اس کا پیچھا چھوڑنے پر قطعی تیار نظر نہیں آتی تھی۔ حسب عادت ایک طویل کش لے کر

اس نے سلسلہ کام جوڑا۔ ”لیکن پھر نہ جانے کس طرح حشمت علی خان یہاں آیا اور

منوچی بن بیٹھا اور پھر ہر چیز الٹ ہو گئی۔ داوی کی آبادی بہت بڑھ گئی۔“

پھر یہاں حشمت علی کا باپ شرافت علی بھی آگیا۔ انہوں نے طاقت کے اریحے پائی

کو ایک طرف بٹھا دیا۔ صرف طاقت ہی نہیں انہوں نے کچھ اور حربے بھی استعمال کیے۔

پائی کے اصل اختیارات شرافت علی کے پاس چھ گئے۔ یہاں عجیب عجیب رجحانات ہونے

لگے۔ عجیب عجیب سازو سامان آنے لگا۔ اقتدار اعلیٰ منوچی کے پاس چلا گیا اور پائی کی حیثیت

دہی سی ہو کر رہ گئی۔ رائے شماری کی رسم بھی ختم ہو گئی۔ پائی کا وجود بھی شاید محض اس

لیے باقی رہ گیا کہ وہ محض بھر لوگ ہو قدامت پسند سمجھتے جاتے ہیں۔ روایت پرست ہیں

اور قدیم اقدار کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ کوئی شورش برپا نہ کریں۔ انہوں نے خواہ مخواہ

سے ہی آدمی کریں۔ بہرحال خطرناک ہوتی ہے۔“

وہ کش لینے کے لیے خاموش ہو گئی تو میں نے کہا۔ ”پائی کو اپنی ذات اور اپنے قبیلے کو

اس شر سے بچانے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے تھی۔“

”جدوجہد؟“ وہ ایک بار پھر قدرے مفہوم سے انداز میں مسکرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب اس کا حسن اور دلکشی کچھ اور نمایاں ہو گئی۔ اس کا لباس عمدہ نہیں تھا مگر اس کا جسم دلکشی کے لیے کویا کسی بھی لباس کو محتاج نہیں تھا۔ اس کے نقوش کا اثر الگ الگ جائزہ لیا جاتا تو شاید وہ کوئی ایسے بے مثال محسوس نہ ہوتے لیکن انہوں نے مل جل کر کویا اسے لاکھوں میں ایک بنا دیا تھا۔ اس کا چہرہ سب سے سبب نیاز تھا، لیکن اس کی رنگت کی ملاحظہ ہو، ہونٹوں کا رسیدار لہجہ اور آنکھوں کے قدرتی ڈورے ہزار آرائشوں پر بھاری تھے۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ وہ سنگار کے لہجے کو انگلی اور انگلیٹھے کے درمیان اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”لیکن تم دروازے کے پیچھے ہی رہنا اور ذرا دور سے ہی پتہ لگا کر رہنا۔“

اس نے کچھلی دیوار میں موجود ایک دروازہ کھولا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس کے تراشیدہ بالوں یا پھر شاید اس کے جسم سے ایک عجیب سی ملک اٹھ رہی تھی۔ اس نے مجھے دروازے ہی پر رکنے کا اشارہ کیا اور اسے تھوڑا سا کھل چھوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔ اس کمرے میں مدھم اور خوبصورت سی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو جلد ہی تیز روشنی میں تبدیل ہو گئی اور تب میں نے دیکھا کہ وہ بیڈ روم تھا جس میں سینڈریلا داخل ہوئی تھی۔

اس کمرے میں آرائش بھی کچھ جدید تھی اور کچھ قدیم۔ کسی چیز کو دیکھ کر امارت اور خوشحالی کا اور کسی چیز کو دکھ کر غربت و افلاس کا احساس ہوتا تھا۔ کچھ عجیب اندازات کا سا مجموعہ تھا وہ کمرہ۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ پانی طرز کا ایک ڈبل بیڈ لگا ہوا تھا جس پر شب خوابی کے لباس میں گاؤں کے سارے ایک شخص دراز تھا۔

اس نے غالباً تیز روشنی محسوس کرتے ہوئے آنکھیں کھولی تھیں یا یوں کہنا چاہیے کہ کھولنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ عجیب گولائی لیے ہوئی سی آنکھیں تھیں اس کی۔ ان میں کچھ زیادہ سی نمی تیر رہی تھی

وہ شخص کویا ایک عیاشان عمارت کا ڈھنچہ تھا۔ اس کا روناں روناں بتا رہا تھا کہ کبھی وہ قاتل رشک شخصیت کا مالک رہا ہوگا۔

اس کے دیکھنے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے سینڈریلا کی صورت صاف نظر نہیں آ رہی، تاہم اس نے ایک مجبوری کی سی مسکراہٹ کے ساتھ کچھ کہنے کی کوشش کی تھی، لیکن ناقابل فہم انداز میں سننا کر رہ گیا۔ سینڈریلا نے اسے سینے تک کھیل سے دھانپ دیا اور ہتھیلی سے یوں اس کی آنکھیں بند کر دیں جیسے اس کی روح نفس غصہ سے پردہ کر چکی ہو۔ اس شخص نے دوبارہ آنکھیں کھولنے کی کوشش نہیں کی۔

اور سینڈریلا واپس اس کمرے میں آگئی جہاں کچھ دیر پہلے تک ہم ہاتھیں کر رہے تھے۔

اس نے درمیانی دروازہ بند کر دیا اور مجھے ایک دیوار پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے لہجے میں اڑی ہوئی اسٹین گن کچھ اور اوپر کو کھسکائی اور بیٹھ گیا۔ فخر اور اذیت گت میں نے پہلے ہی اپنے ہڈیوں پر رتہ لیے تھے۔

سینڈریلا دوبارہ اپنی تیرسی پر جا بیٹھی۔ سنگار کا ایک آخری اور نہایت طویل کش لینے کے بعد جب اس کی انگلیاں جلنے کو ہوئیں تو اس نے ٹوٹا دور کونے میں رکھے ہوئے ایک انعامدان کی طرف اس مہارت سے پھینکا کہ وہ سیدھا اندر جاگرا۔ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا کر اس نے دھیرے دھیرے دھواں اٹھ اور میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں بے بسی بھی تھی اور اس شیر کی سی متانت بھی جو مذاق سے پشیمے میں بند ہو مگر اس کی روح خلعت قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو سکی ہو۔ اس مسکراہٹ میں اتنا بھی شہی اور زخمی اتنا کا کھنچاؤ بھی۔ دوستی بھی تھی اور تکلف بھی طلب بھی تھی اور گریز بھی۔ احتیاط بھی تھی اور اعتماد بھی۔

”تم بدوحد کی بات کر رہے تھے۔“ وہ دھن سے نیچے میں بولی۔ ”اب تم نے دیکھ ہی لیا ہو گا۔ زندہ لاشیں بھلا کیا جدوجہد کر سکتی ہیں۔“

میرے دل میں تاسف کی ایک سرسری ابھری، لیکن میں نے کوشش کی کہ میں جذباتیت کی کسی لہری زد میں نہ آنے پاؤں۔ کمرے میں چند لمبے بو جھل سا بڑا تاری رہا۔

”حشمت بھی جب یہاں آ کر سابق منوی کی رضامندی سے اسے سہل دوش کر کے خود منوچی بنا تو ظاہر ہے اس کا میرے شوہر سے بہت زیادہ رابطہ رہا۔ پانی اور منوچی کا ہمیشہ ہی رابطہ رہتا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم کہ سب اور کس طرح پانی بیرونی کے انجکشن کا عادی ہوا۔ مجھے جب علم ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ ایک انجکشن کے لیے وہ گڑگڑاتا تھا، بلبلاتا تھا اور ترپتا تھا۔ میں نے ذہنی یہ خوفناک لت چھڑانے کی کوشش کی تو اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ مرنے نہ جائے۔ یہ نشہ جب ایک خاص سطح پر پہنچ جائے تو اس سے کچھ پھرنے کے لیے ایک خاص ماحول اور کچھ دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے جو مجھے یہاں میسر نہیں تھیں۔ اس لیے میں مجبور ہو گئی۔ خاموش تماشائی بن گئی۔“

اس نے ہاتھ اٹھوں سے نکال کر کرسی کے ہتھوں پر رکھے لیے اور ایک لمبے کے توقف سے بولی۔ ”میں سمجھتی تھی کہ چوہہ زندہ تو ہے۔ شاید کبھی رہائی اور چھٹکارے کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس وقت تک صورت حال یہی ہو چکی تھی۔ جو قمر نے کچھ دیر پہلے دیکھی تھی کہ ہماری حیثیت قیدیوں کی سی ہو چکی تھی۔ میں چونکہ چالاک تھی اس لیے مجھ پر خاص نظر رکھی گئی اور مجھے اس طرح ٹھیکہ گھار کر گھر میں مجبوس کر دیا کہ میں کسی سے رابطہ قائم نہ کر سکیں۔ کسی کو معلوم نہ ہوئے پاسے کہ ہم پر کیا لڑ رہی ہے اور خود اہم کے لوگوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ انہیں کس طرح آلہ کار بنایا جا رہا ہے۔ اس لیے ہم ان مسلح محافظوں کے زرخ میں ایک طرح سے قید تھے۔ یہ محافظ ہماری حفاظت کے لیے نہیں، ہمیں یہاں قید رکھنے کے لیے تھے۔“

اس عجیب حشمت کو مطلوب تھا کہ مجھے اگر ایک بار بھی کسی اجتماع سے خطاب کرنے

میری نظر گو کہ بدستور اسی پر تھی لیکن ان گزشتہ چند لمحوں میں جیسے اس کا وجود میری نظر سے اوجھل ہی ہو رہا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ یہ بھی کرسی سے اٹھ کھڑی تھی اور اس کی پیشانی پر غلٹیں تھیں۔ وہ بھی جیسے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے اس حد تک حقیقت سے آگاہ کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا کہ کس طرح میں وادی میں داخل ہوا تھا اور کس طرح کینٹی ٹیٹ پر پہنچی تھی اور یہ کہ کس طرح میں ابھی تک اس کی آواز سن رہا تھا۔

”وہ تو قید خانے میں پہنچ چکی ہوگی۔“ سینڈریلا بولی۔

”قید خانے کا صحیح علم تو مجھے بھی نہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ حشمت علی کی رہائش گاہ کے قریب خاندان میں ہی نہیں واقع ہے۔ تم نے اپنا مقصد ابھی تک نہیں بتاؤ۔“ وہ اپنی مسکراہٹ کو سمیٹتے ہوئے بولی۔ ”ظاہر ہے تم بچہ نہیں اٹھا کر تو یہاں نہیں چلے آئے ہو گے۔ کسی بڑے مقصد کے لیے ہی جان کی بازی لگائی جاتی ہے۔“

”بے شک!“ میں نے تاکید کی۔ ”میرا مقصد چند ذاتی اور چند انسانی وجوہات کی بناء پر صرف حشمت علی شرافت علی اور ان کے ہاں شادوں کو قتل کرنا تھا لیکن اب یہ بات بھی میرے مقاصد میں شامل ہو گئی ہے کہ صرف انہیں قتل کرنا ہی کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اس انداز میں ان کا اور ان کے ساتھیوں کا معایا کیا جائے کہ سمجھ کوئی اس کی جگہ نہ لے سکے اور نہ ہی کوئی دوسرا حشمت اس طرح بچے جاسکے۔ یہ وادی اس کے پانچوں سے نکل آئے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس کے اپنے آدمیوں کے علاوہ بہتی کے عام آدمیوں کا اس کے بارے میں کیا رویہ ہے؟ کیا عام لوگ اس کی آواز پر لپک کھینچتے ہیں؟ اس کے سننے پر عمل کرتے ہیں؟“

”سرورست تو یہی صورت ہے۔ اس نے انہیں ایسی عیاری اور مکاری سے شیشے میں اٹھرا ہوا ہے کہ وہ اس کے احکامات پر عمل درآمد کرنا عبادت سمجھتے ہیں لیکن اگر مجھے اتنا موقع مل سکے کہ میں لوگوں کا ایک بڑا اجتماع بلا سکوں، اپنے شوہر کو لے کر ان کے سامنے جاسکوں اور اس کی حالت دکھا کر ایک دو لاکھ انگیز تقریر میں سارے حقائق بیان کر سکوں اور بہتی والوں کو احساس دل سکوں کہ وہ کس طرح بے وقوف بن رہے ہیں تب بازی پٹ سکتی ہے لیکن ظاہر ہے یہ ممکن نہیں۔ یہ طویل عمل بغیر کسی مداخلت کے تو انجام نہیں پاسکتا۔ فی الوقت اگر میں باہر پہنچ بھی جاؤں اور لوگوں کو جمع کرنا شروع کر دوں تو چار ہفتے بولنے سے پہلے ہی حشمت تمام تر خطرہ مول لیتے ہوئے مجھے گول مروا دے گا۔ بعد میں وہ کسی نہ کسی طرح تادیلوں سے بہتی والوں کو مطمئن کرنے لگا۔“

”اگر تمہیں کوئی ایسا موقع مل جائے.....“ میں نے کہہ دیا کہ بہت دیر کے لیے حشمت اور اس کے ساتھی اپنی ہی مصیبت میں بھنس جائیں اور تمہیں بھی باہر جانے سے روکنے

کا موقع مل گیا تو میں اگر ہڈی اٹھانے کا بھی سکتی تب بھی ایک پھل ضرور پیدا کر دوں گی، جو پھل سکتی ہے۔ اس کے لیے اہمیت ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کے اپنے خاصے آدمی موجود ہیں وہ شاید تادم آخر اس کا ساتھ دیں اور جن کے پاس یہ کثرت اسلحہ موجود ہے لیکن اگر ایک بار بہتی کے حامی ہو اس کے خلاف ہو جائیں، ان کے غیظ و غضب کا رخ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی طرف مڑ جائے تو وہ خاصی خونریزی کے بعد ہی کسی لیکن ہیرن مارے جائیں گے۔ اس لیے مجھے بے دست و پا کرنے پر پوری کوشش صرف کی گئی۔

”مجھے قتل کرنے یا علی لائنوں پر لانے کی کوشش اس لیے نہیں کی گئی کہ ہم میاں بادی کا بحال ہوتی کے لوگوں میں کچھ نہ کچھ احترام باقی ہے۔ ہم میں سے کسی ایک کے اچانک اور اعلانیہ قتل سے ششوک و شبہات اور لوگوں میں بغاوت پیدا ہو سکتی تھی۔ تاہم میں ایک عرصے سے موت کا انتظار کر رہی ہوں جو شاید بظاہر معلوم ہوگی۔ ہو سکتا ہے کسی روز اس مکان کے کسی کمرے کی چھت گر پڑے۔ ممکن ہے کسی روز چھن میں آگ لگ جائے۔ میری احتیاط کا یہ عالم ہے کہ میں نے حشمت کی طرف سے مہر کیے گئے ہر ملازم اور ملازمہ کو اکال دیا ہے۔ مطمئن نہیں ان میں سے کون کب مجھے زہر دے دے گا۔ میں اپنا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں۔“

”لہذا“ میں اضطراری طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنے ایرفون پر کینٹی کی چی سی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی چی تھی۔ میرے اعصاب میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں کوئی انتہائی قدم اٹھانے کے ارادے سے دروازے کی طرف پکا ہی تھا کہ میں نے ایرفون پر ایک مردانہ آواز سنی جو اس سے پہلے مجھے سنائی نہیں دی تھی۔ ”نہیں..... نہیں.....“ ٹرکی پر تھوڑے دم کو..... ہاں نے کہا تھا کہ اسے کوئی گزند پہنچانے کی ضرورت نہیں..... وہ خود ہی واپس آ کر اس بارے میں جو مناسب سمجھیں گے کریں گے..... وہ فتنہ اسکاوا کے ساتھ اس شخص کی تلاش میں بہتیں نہیں گئے ہوئے ہیں..... وہ راکام تو صرف اتنا ہے کہ اسے قید خانے میں پہنچا دیں.....“

اس دوران میں حشمت میں نہیں سمجھتی کے ہونے والے کراہنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر اس نے با آواز بندہ ان سب کو چند گندہ گندہ کی گولیاں دیں جس سے مجھے یہ اطمینان ہوا کہ ابھی وہ خطرے کی حالت میں نہیں تھی اور اس کا حوصلہ بھی بدستور بلند تھا۔ میں اس وقت تک اس کی طرف سے بے فکر رہ سکتا تھا جب تک اس کا حوصلہ برقرار رہے۔

”کیا ہوا؟“ تم اتنی محبت سے کیا سننے لگے۔ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔“ سینڈریلا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”کیا اس آلہ سماعت کی وجہ سے تمہیں مجھ سے زیادہ سنائی دے رہا ہے؟“

لوگتے والا کوئی نہ ہو تب تو تم اپنا کام دکھا سکتی ہو؟“
 ”یقیناً..... میں کوشش تو کر ہی سکتی ہوں جس میں کامیابی کی مجھے زیادہ توقع ہے۔“
 اس نے جواب دیا۔

”شمت اور اس کے ساتھیوں سے تو میں ہر طریقے سے نمٹ لوں گا۔“ میں نے کہا۔
 ”میں کی چاہتا تھا کہ عام لوگوں کا ریلا میری طرف نہ بہنے پڑے۔ خوفزدہ تو میں ان سے بھی
 نہیں ہوں لیکن میں نہیں چاہتا کہ بے گناہوں اور سیدھے سادے لوگوں کا خون بہے۔“
 وہ مسکرائی۔ ”بات تو اس طرح کر رہا ہو تو ہوتا تھا نہیں بلکہ پوری رجنٹ لے کر
 آئے ہو اور کوئی تو پختہ بھی ساتھ ہے۔“

”اس وادی جیسی جگہ پر اگر اوسان بحال رکھے جائیں تو تھا آدمی رجنٹ کے برابر
 ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور چند دور مار رائفلیں۔ توپ خانے کا کام دے سکتی ہیں۔“
 وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ دور سے کچھ شور مٹا دیا۔



وہ ایک لمحے کے لیے کان لگا کر سننے کے بعد بولی۔ ”کچھ لوگ یقیناً اس طرف آرہے
 ہیں۔۔۔۔۔۔ بات طے ہے کہ تمہیں میرے شرمش ضرور تلاش کیا جائے گا۔۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تم
 سانس کتنی دیر کے لیے روک سکتے ہو؟“

”تمہارے اندازوں سے کہیں زیادہ دیر کے لیے۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”میرے اندازوں کو حقیقت سے اتنے دور بھی مت سمجھو۔“ وہ معمولی سی گھبراہٹ اور
 بہت زیادہ جھلک کے وجود مسکرائی۔ ”مجھے پہلے ہی اندازہ ہو چکا ہے کہ تم نے یہ گامی بہت
 محنت کر رکھی ہے۔“ اس دوران اس نے قدم قدم کی نگرانی کی ایک وارڈ روب میں سے
 ایک پرانا سا تالا بھونڈ کر نکال لیا تھا اور وارڈ روب ہی کو لگا دیا تھا۔

”نفسیاتی چال چلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“ اس نے خود ہی وضاحت کی۔ ”ہر دیکھنے
 والے کا خیال سب سے پہلے اسی الماری کی طرف جائے گا، خصوصاً اسے تالا دیکھ کر خشک
 قوی تر ہو گا جبکہ میں تمہیں جس چھپاؤں گی، وہ بالکل کھلی ہوئی۔۔۔۔۔۔“

اس نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اس دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بتی بجھا
 دی جس سے میں اندر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دائیں ہاتھ پر ایک اور دروازہ تھا۔ دروازہ
 کیا میں سوچے کی ایک چھوٹی سی گرس تھی جو کھل ہوئی تھی۔ اندر پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ
 ایک طویل و عریض کچن تھا جس کی دو دیواریں ان دونوں کمروں سے ملتی تھیں جو میں اب
 تک دیکھ چکا تھا۔ اس کچن کے ایک کونے میں مٹی کے تیل سے چلنے والے چولہوں پر
 مشعل وہ نظام موجود تھا جس سے برآمدی کے دونوں میں مکان کو گرم رکھا جاسکتا تھا۔

کچن میں ایک دیوار کے ساتھ جست کی چادر کی ایک بہت بڑی تابوت نما بیٹی رکھی تھی
 جس کا ڈھکن اس وقت اٹھا ہوا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ بیٹی آدمی سے زیادہ
 گندم سے بھری ہوئی تھی۔ میں سینڈریلا کا مقصد سمجھ گیا اور جب وہ جھک کر دونوں ہاتھوں
 سے بیٹی کے درمیان سے گندم کناروں کی طرف ہٹانے لگی تو میں بھی اس کا ہاتھ ہٹانے
 لگا۔

چند سینکڑوں ہی گندم کی قبر تیار ہو گئی تو سینڈریلا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور
 میں بیٹی میں داخل ہو کر اس قبر میں لیٹ گیا۔ اس نے جلدی میں ہاتھ آئے دالا پتلا سا

تیک سانی نما کپڑے پہرے پر بالوں دیا اور گندم کی سطح برابر کرنے لگی۔ اس دوران باہر سے گیت: 'ہڑ دھڑائے جانے کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ جلد ہی گندم نے مجھے دعائے لیا تو آواز خاصی مدھم ہو گئی 'آہم گندم کی قبر سے باہر کی دنیا سے میرا سلامت کا رشتہ یکسر نہیں ٹوٹا حتیٰ کہ میں نے سینڈ ریل کے ووڑ کرچن سے باہر چلنے تک کی آواز سنی۔

چند لمحے بعد مجھے کیسی قریب ہی سے کچھ افراد سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ یقیناً کافی فاصلہ پر تھے۔ آوازوں میں باتیں کر رہے تھے مگر مجھے مدھم مدھم سنائی دے رہی تھیں۔ پھر ان میں ایک واضح حکمران اور گرجدار آواز سنائی دی۔ ”اگر وہاں ہاتھ کی ضرورت نہیں.... ہم نے جتنی کے تقریباً ہر گھر سے پتہ کر دیا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے اس بستی میں سب میرے ماتھے پر چاہتے والے ہیں۔ میری اجازت کے بغیر کوئی کسی اجنبی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ صرف تم ہی ہو، ہو کسی اجنبی کو خوش آمدید کہہ سکتی ہو اور یہاں اس کی آمد کا ثبوت بھی موجود ہے۔ تمام محافظ مرے پڑے ہیں۔“

”میں نے کب کہا ہے کہ وہ یہاں نہیں گیا۔“ سینٹ میل کی جارحانہ آواز سنائی دی۔
”تم کسی اور کی بات تو سنتے ہی نہیں ہو۔۔۔ اپنی ہی گواہی شروع کر دیجیے ہو۔“

”میں نے بات کرو سینڈریلا!“ گرجدار آواز نے اس کی ہات کٹ دی۔ ”یہاں تو صرف میرے خاص آدمی ہی موجود ہیں جو میرے اشارے کے بغیر حرکت نہیں کرتے لیکن اگر تم باہر ہستی کے عام لوگوں میں میرے عقیدت مندوں میں کھڑے ہو کر اس طرح مجھ سے بات کرو تو وہ تمہاری ہڈیاں ٹوچ ڈالیں گے۔“

”حشمت خان!“ سیڑھا کی آواز میں بھی بل کی ہندی آئی۔ ”اگر تمہیں ایسی ہی ذمہ ہے تو مجھے باہر کیوں نہیں نکلتے دیتے۔۔۔؟ ایک بار عام لوگوں میں جانے دو، پھر دیکھو وہ تمہاری بیویاں نوچتے ہیں یا میری۔“

”رسیا جس نے کمر بل نہیں کیا۔“ وہی آواز جو یقیناً مشمت خان کی تھی، جھگڑا نہ ہر میں
 بچھ کر نکلی تھی۔ ”اب یہ خیال دل سے نکال دو کہ یا ہر کے لوگوں کے دنوں میں تمہارے
 لیے کچھ عقیدت ہوتی رہے گی ہے، لوگ تو تمہارا نام بھی بھول گئے ہیں۔“
 ”جیسی تم نے اتنے محافل کے گھیرے ہیں اتنے عرصے سے مجھے محبوس کر رکھا
 ہے۔“ سینڈریلا مگر کہی۔

”ابھیا اس بکواس کو چھوڑو۔ میں تمہارا باہر آنے کا ارمان بھی پورا کر دوں گا۔“
 شمت خان غرایا۔ ”فی الحال صرف اس اجنبی کی بابت بتاؤ، کہاں چھپا ہوا ہے اسے تم نے؟“
 ”مگر تمہارے سامنے ہے، تلاش کیے ہو۔“ سیکنڈ ریٹ نے ہاتھوں سے کہا۔ ”میں نے
 اسے پناہ دینے اور چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن اس پر سختی نے مجھ پر بھروسہ نہیں کیا۔
 اپنے سامنے سے بھی محظوظ تھا۔ چھلاوے کی طرح آئے، مافوق کو مارا، مجھ سے چند سیکنڈز بات

کی اور کچھ سی دیوار پھلانگ کر نکل گیا۔ میری جان بھی اس لیے بخش گیا کہ میں نے اسے ہر طرح کے تعاون کی پیشکش کر دی تھی جو اس نے احتیاطاً قبول نہیں کی۔ بہرحال وہ قائل ضرور ہو گیا تھا کہ میں تمہارے ہی خواہوں میں سے نہیں ہوں۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ اس گھر کو تمہارا گھر سمجھ کر ٹھکرا تھا۔"

ایک لمحے کے نیچے سکوت چھا گیا۔ سینڈریلا انسانی انفصیات کے چچہ و ثمر سے بخوبی واقف تھی اور محفلگو سے دوسروں کو قائل کرنے کا فن بھی جانتی تھی۔

”ہاتھوں سے ستارہ کرنے کی تمہاری صلاحیت سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔“
شہت خان کی آواز نے سکوت توڑا۔ ”لیکن میں خود چونکا۔ اس فن میں تمہارا حریف ہوں۔“
اس لیے آنکھیں بند کر کے لیٹنے کرنے سے تو رہا۔“

”تو پھر باتوں میں اپنا اور میرا وقت کیوں ضائع کیے جا رہے ہو۔“ سینڈریلا نے غصے اور
خیزاری سے کہا۔ ”میں سوئے جا رہی ہوں۔ تمہارا جو جی چاہے کرو۔ جس جی چاہے اسے
عطا کیا کرو۔“ میں نے محسوس کیا کہ وہ شاید سونے کے لیے سچے خواب گاہ کی طرف چلی
گئی تھی۔

دلچسپا ایک دھماکے نے مجھے جہز جہزی سی لینے پر مجبور کر دیا۔ دھماکہ گواکہ مجھے نیاں ذروار محسوس نہیں ہوا تھا لیکن دھماکہ سے گویا زمین بھی ہل کر رہ گئی تھی لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ یہ دھماکہ بریا بدوقت کا نہیں تھا۔

”اب اسے الٹ کر رکھو۔۔۔۔۔ اُتر دہ مردود اندر ہے تو سبے ہوش ہو چکا ہو گا وگرنہ تم دروازہ کھلتے ہی اسے چھانی کر دیتا۔“ یہ حشمت خان بی کی گواہ تھی اور تب ہی میں سمجھ گیا تھا کہ دھماکہ کس چیز کا تھا۔ دراصل ان لوگوں نے دیوار کے ساتھ کھڑی بھاری بھر کم اماری کو فرش پر گرا دیا تھا۔ اُتر اس کے اندر کوئی موجود ہوتا تو یقیناً ایک بار تو اس کا بیچھا مل جاتا۔ گویا سینڈویچ کا نفسیاتی حربہ کامیاب رہا تھا۔ سب سے پہلے اس کی توجہ اماری ہی کی طرف مئی تھی۔

کچھ کی کچھ اور آوازیں سنائی دیں، پھر کسی نے کہا۔ ”اس میں تو بیکہر کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔“

”بہر حال مکان کی تلاشی لو۔ کوئی گوشہ نظیر انداز نہ کیا جائے۔“ شہست خان نے حکم دیا۔ اس کے بعد وقفہ وقفہ سے کوئی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ لوگ کچن میں بھی آئے، کسی نے چینی پر زور سے کوئی چیز بھی ماری جو غالباً ہندو کا کندہ تھا۔ اس کی یہ حرکت مجھے تلاش کرنے کی خواہش سے زیادہ جھنجھلاہٹ کی آئینہ دار معلوم ہوتی تھی۔

”اس میں تو گندم بھری ہوئی ہے۔“ ایک آواز آئی۔
 ”گندم میں بھی پھری وغیرہ مار کر دیکھ لو۔“ دوسری آواز نے مشورہ دیا۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے راج!" یہی آواز میں بیزاری در آئی۔ "ہم کسی لاش کو نہیں زندہ انسان کو تلاش کر رہے ہیں۔ جب سے ہم آئے ہیں تب سے کیا کوئی شخص گندم میں دب کر زندہ رہ سکتا تھا؟"

اس کے بعد کوئی آواز سنائی نہ دی، سوائے دھب دھب کے۔ یہ ان کے بھاری جوتوں کی آواز تھی جو دور ہوتی چلی گئی۔ میں نے آواز معدوم ہونے کے بعد بھی تقریباً ایک منٹ انتظار کیا اور اس دوران میں نے یوگا کی مشق سے بھی مکمل طور پر کام نہیں لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ گندم میں جتنی گہرائی میں دیا ہوا تھا وہاں سانس تو باقاعدہ طور پر نہیں لی جاسکتی تھی لیکن کوئی ایئر ٹائٹ ایسے کی سی کیفیت نہیں تھی۔ عام آدمی بھی چارپانچ منٹ تو گزار ہی سکتا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو مزید زیر مشق نہ رکھا اور سرگندم کی قبر سے نکال لیا۔ کچن میں بدستور مدھم مدھم روٹنی پھیلی ہوئی تھی اور کوئی شخص موجود نہ تھا۔ تاہم میں نے باہر آنے کی کوشش نہیں کی۔ گندم سے سرنگھلے دیں لینا رہا۔

کچھ دیر بعد مجھے آوازوں سے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ ملحقہ کمرے میں ایک بار پھر جمع ہو چکے تھے۔ پھر کسی نے رپورٹ دی۔ "مکان میں پانی اور سینڈریلا کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔" ہم نے چپے چپے کلمہ.....

حشمت خان نے اس کی بات کٹ دی۔ "میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے مجھے میرے کمرے سے باہر کہیں بھی ہاس کمرہ کر مخاطب نہ کیا کرو۔ منوچی کہا کرو مگر تساری سمجھ میں بات ہی نہیں آتی۔"

"یہاں کونسا کوئی غیر موجود ہے ہاس کمرہ میرا مطلب ہے منوچی!" یہی آواز نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "سب اپنے ہی ہیں اور پھر ہم تو بات بھی انگریزی میں کر رہے ہیں۔ مقامیوں میں سے تو کوئی کوئی ہی تمہارا بہت انگریزی سمجھ سکتا ہے۔"

"تمہاری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ حکم بحال حکم ہی ہوتا ہے۔ میرے حکم کے سامنے منطق جھاڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" حشمت خان نے ناگواری سے کہا تاہم اس کی آواز میں پورا سادہ دہ اور طنز نہیں تھا۔ "اور اگر بات منطق اور جواز ہی کی ہے تب بھی تمہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس وقت ہم اپنے سب سے بڑے دشمن کے گھر میں کھڑے ہیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس سانپ کے جھنپ میں سے کس چالاک سے پاؤں رکھا ہوا ہے۔ ذرا دباؤ کم ہو تو ہمارا دانا اٹا نہیں ہی پڑ سکتا ہے۔"

"سانپ تو تر ہو حشمت خان!" کچھ فاصلے سے سینڈریلا کی فصیحی آواز سنائی دی۔ "جس نے اس راوی کے حقیقی وارثوں کو اس لیے ہے۔ کاش ہم نے اسی وقت تمہارا سر کچھ دبا ہوتا۔ جب تم تلخیر سے ہوئے اس تلخیر میں آیا کرتے تھے۔ ہم میں یہی راوی اس وقت

تم پر ترس کھایا کرتے تھے۔" اگر تم نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہوتی تو تم کبھی ایسی حماقت نہ کر سکتے۔ حشمت خان نے کھیانے کے بجائے استغرائیہ مانتقہ لگا کر کہا۔ "انگریزوں نے اسی طرح تو مغلوں سے پورا ہندوستان جھپا لیا تھا۔"

"تم بھی مجھے کسی انگریز ہی کا پا گنتے ہو اور وہ بھی کسی کہنے قسم کے انگریز کا۔" سینڈریلا نے جل کر کہا۔ حشمت خان حالات کی تماشہ نگاہی کے باوجود شاید فی الحال کوئی شدید رد عمل ظاہر کرنے کے موڈ میں نہیں تھا کیونکہ اس کی طرف سے کوئی سخت جواب سنائی نہیں دیا۔

"تمہارے اندازے کے مطابق وہ کہاں پھپھا ہو گا؟ کوئی غلط اندازہ ہی ظاہر کر دو" اس نے کہا۔

"جنگل میں؟" حشمت خان نے ایک بار پھر استغرائیہ مانتقہ لگایا۔ "تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ جنگل میں ہمارے سدھائے ہوئے چند درندے بالکل اسی طرح گھومتے رہتے ہیں جس طرح کسی علاقے کے چوکیدار گشت پر ہوتے ہیں۔ مفلوک انداز میں گھومتا ہوا کوئی بھی شخص ان کے عقب سے نہیں بچ سکتا۔"

حشمت تو شاید وہ اب تک اگلے جہان کو سدھار بھی چکا ہو۔ تم خواستواہ ہی پریشان ہوتے پھر رہے ہو۔" سینڈریلا نے کہا۔

"تمہارے گھر کی علاقائی لینے کے بعد میں بھی تقریباً اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔" حشمت خان بولا۔ اب اس کی طمانیت کی وجہ میری سمجھ میں آئی۔ وہ میرے مسئلے میں کافی حد تک سہمہ فکر ہو چکا تھا اور یہی میں چاہتا تھا۔ وہ مزید بولا۔ "لیکن اپنی تسلی کے لیے میں ایک بار پھر ہستی میں اعلان کروا دیتا ہوں کہ جو بھی اس اجنبی کو پتہ دے گا وہ دیوتاؤں کے رحم و کرم اور میری دعاؤں کے اثر سے محروم ہو جائے گا۔"

اس بار سینڈریلا نے کچھ نہیں کہا۔ صرف ایک قلم لکھایا جس میں دنیا بھر کی نفرت ظہور اور زہر بھرا ہوا تھا۔ حشمت خان کی جھجکتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ "کچھ عرصہ اور دن کھول کر قلم لکھا لو میری جان! تمہارا یہ انگور نما شوہر ملک بدم کو سدھار جائے گا اور میرا بھی شعلہ صفت جوان حسیناؤں سے رہ بھر جائے گا تو میں تمہیں بھی اٹھا کر اپنی کینڑوں کی ٹوٹی میں ڈال لوں گا۔ پتھاریت بڑی خوش ہوگی کہ میں نے پانی کی بیوہ کو سدھار دیا ہے۔"

"یہ امید پوری ہونے تک تمہاری اپنی ہڈیاں نہ گل سڑ چکی ہوں۔" سینڈریلا نے جواب دیا۔

حشمت خان نے غالباً اس کی طرف سے توجہ اب ہٹا لی تھی اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا تھا۔ ”تم چاروں اب اس مکان کے گرد گشت پر رہو گے اور بہت ہی سیاری سے نگرانی کے فرائض انجام دو گے۔ صبح تک میں کچھ اور آدمی بھیج دوں گا۔ ڈیوٹی بدلتے رہنا اور سنو۔۔۔“ اس کے بعد اس کی آواز بہت مدھم ہو گئی، غالباً وہ کچھ اور ضروری ہدایات دے رہا تھا۔

میں اب لیٹے لیٹے بے حد ہار ہو رہا تھا۔ دشمن برابر داسے کمرے میں موجود تھا۔ میرا جی ہوا رہا تھا کہ فٹنریا اسٹین گن لے کر ادھر کھس پڑوں اور لاشوں کے ڈھیر لگا دوں لیکن نہ جانے کیوں فی الحال ذہن اس پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایسا کرنا خلاف مصلحت سا لگ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کسی ایسی جگہ حشمت خان سے معرکہ آرائی ہو جہاں صرف اس سے اور اس کے ساتھیوں سے سامنا ہو دیگر لوگ نہ الجھنے پائیں۔

بالآخر کچھ دیر بعد مکمل سکوت چھ گیا لیکن میں گندم کی بیٹی سے نہیں نکلا۔ کچھ دیر بعد مجھے دروازے کی طرف سے پیڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی، پھر سینڈریڈ نے بیٹی میں جھانکا اور ہونٹوں پر الٹی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”مرگوشی میں ہی بات کرنا۔ وہ لوگ کمروں کی دیواروں کے پاس ہی ٹھل رہے ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے مرگوشی کی۔
”گویا تم کافی دیر سے پونہ می گرون نکالے پڑے ہو اور میں خواجہ تمہاری فکر میں مری جا رہی تھی۔“ میں نے مدھم روشنی میں بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ لی۔ وہ بن رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ فکر میں مرنے والی عورت نہیں تھی۔ اگر وہ فکر میں مر سکتی تو شاید کبھی کی مر چکی ہوتی۔ وہ تو پھر کے کوسے کی طرح تھی۔ جتنی زیادہ مہروائی میں جتنے زیادہ وزن تلے جتنے زیادہ عربے دبی رہی تھی اس کی سخت جالی میں اتنی ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ سٹلنے پر اب وہ اتنی ہی زیادہ تباہ و برباد ہو سکتی تھی۔

میں نے پہلے ایک بازو گندم سے نکالا جسے ختم کر سینڈریڈ نے مجھے سارا دیا کیونکہ کھڑا ہوتے وقت میں اپنے وزن سے بازو بار گندم میں دھنسا جا رہا تھا۔ باہر آکر میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا ہاتھ کسی ننگے تار سے پت گیا ہو جس میں خاصی طاقتور برقی رو دوڑ رہی تھی۔

میں نے اپنے کپڑے جھڑے۔ میرے ایک کان میں گندم کے کچھ دانے ٹھس گئے تھے وہ نکالے۔ پھر مرگوشی میں اس سے پوچھا۔ ”چار آدمی تو یہاں چھوڑ گیا ہے اس کے ساتھ مزید کتنے آدمی تھے؟“

”چودہ آدمی اور تھے۔“ سینڈریڈ نے جواب دیا۔ ”ویسے میری معلومات اور اندازے کے مطابق اس کے جانثاروں کی کل تعداد تیس تیس سے زیادہ نہیں مگر پھر بھی اس آدمی پر

اس کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ اس کی حکمت عملی نہ جانے کن کن چالاکیوں پر مبنی ہے کہ ان تیس بتیس آدمیوں سے وہ ایک بہت بڑی اور خوفناک تنظیم کا سا کام لیتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ان لوگوں کے پاس دولت اور اسلحہ بہت ہے۔“

”خیر۔۔۔ میں دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“ میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”کہاں چلے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں کو شیش کمرے کا کہ اس کے تعاقب میں جا سکوں۔“ میں نے کہا۔

”پاکل ہو گئے ہو؟“ وہ آگے بڑھ کر میرا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔ ”ابھی راستے میں جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں کھڑی ہوں گی۔ حشمت خان کے باقی ساتھی بھی ہستی میں نکھرتے ہوئے ہیں۔ ذرا صبر کرو۔ میں تمہیں اس کے گھر پہنچنے کا ایک محفوظ راستہ بتا دوں گی۔ اس کا گھر ایک چھوٹا سا قلعہ ہے۔ اگر تم اس کے محافظوں کو ہلکے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤ تو پھر اندر خواہ کچھ بھی ہو، رہے کسی کو علم نہیں ہوگا اور عام لوگ بداعطالت کے لیے نہیں پہنچ سکیں گے۔۔۔ اور یوں جنگل کا تو بھول کر بھی رخ نہ کرنا۔ تم نے سن ہی لیا ہوگا کہ وہاں درندے پھرتے رہتے ہیں۔“

اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک بار پھر اس کمرے میں آہٹھے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس بار کمرے میں روشنی نہیں تھی اور وہ میرے سامنے بیٹھنے کے بجائے میرے قریب ہی ایوان پر بیٹھی تھی۔ میں اس کے دندوں کی نوشبو محسوس کر سکتا تھا۔ پھر اس نوشبو پر ہلکار کی خوشبو غالب آئی۔ اس نے رکت کے شعلے کو ہاتھوں کے جھٹکے میں دیکھتے ہوئے سگار سلگا لیا تھا اور فوراً ہی نائٹر بکھ لیا تھا۔ میں نے تاریک پس منظر میں تاریکی روشنی میں اس کا چہرہ چند لمحے کے لیے دیکھا تو یہی محسوس ہوا جیسے وہ ایک حسین یاد تھی جو ذہن کے تاریک افق پر بنگلہ گالی تھی اور پھر معدوم ہو گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر فکر بندی کی لکیریں تھیں۔

”تمہارے شوہر کی کیا کیفیت ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس سارے بنگلے میں مجھے اس

کی ذرا سی بھی تواڑ سنائی نہیں دی۔“

”اس کی آواز تو شاید تم یہاں بمباری شروع ہونے کے بعد بھی نہ سن سکتے۔“ وہ مجھ سے کچھ میں بولی۔ ”کبھی کبھی تو میری قوت برداشت جواب دینے لگتی ہے۔۔۔ ایسے مرد کا ساتھ بھی کوئی ساتھ ہے کہ جس کی حفاظت عورت کو کرنی پڑے لیکن پس پھر یہی سوچ کر ترس آجاتا ہے کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔۔۔ برقی ریٹارڈوں کے ساتھ چلنے کا تمنا کی تو سارا زمانہ ہی ہوتا ہے لیکن سرے ہوئے کا ہاتھ تھمتھنے کی روایت بھی تو کسی کو قائم رکھنی چاہیے۔ وہ جو زندگی بھر کا ساتھ نبھانے کا وعدہ ہوتا ہے اسے اس سال میں بھی

اب بھی سرگوشی سے بند نہیں تھی مگر اب اس میں ایک عزم نو کی آمیزش تھی حتیٰ کہ اب تو میں اپنے اندر اتنی ہمت محسوس کر رہی ہوں کہ اگر تم مجھے کوئی جھپیر دے دو تو میں باہر نشت کرتے ہوئے چاروں آدمیوں کو ٹھکانے لگا کر بیڑے میدان میں پہنچ جاؤں جہاں عموماً نشت خان ہستی کے لوگوں کو خطاب کرتا ہے۔ میں اپنی کے لوگوں کو ایک آواز دوں گی تو یہ بند منٹوں کے اندر اندر ایک سرے سے دوسرے سرے تک خبر پہنچ جائے گی۔۔۔۔۔

”فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”سروسٹ، شاید میں اکیلا تمہاری حفاظت نہ کر سکوں اور کسی ہمت سے آنے والی گولی تمہیں خاموش کر جائے تو شاید میں پستی ہوئی بازی کو بھی نہ سنبھال سکوں۔ تم صرف صبح تک انتظار کر لو، صبح بہرحال تمہیں یہی کرنا ہوگا۔ آج رات کے اندر اندر میں اس نقشے کا سرچل دیں گا۔ اس کے بعد عام لوگوں کے میل رواں کے عتاب سے مجھے بچانا تمہارا کام ہوگا۔“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”فی الحال میں صرف ان چار بد بختوں کی فکر کرتا ہوں جو باہر نکل رہے ہیں۔“

ہم دونوں دوبارہ کمرے میں آئے جس کے راستے میں اندر آیا تھا۔ ایک کھڑکی سے ذرا ما پر وہ ہٹا کر اس نے ایک پٹ میں مجھے چھوٹا سا گول سورج دکھایا اور سرگوشی میں بولی۔

”یہاں سے میں تمہیں دیکھ رہی تھی۔“

کمرے میں چونکہ اندھیرا تھا اور باہر لانا پر تیز روشنی اس لیے میں نے کسی خاص احتیاط کی ضرورت محسوس کیے بغیر اس راز سے آنکھ لگا دی۔ لکن پر کئی قدم کے فاصلے پر اس وقت ایک محافظ دونوں ہاتھوں سے اسٹین گن سنبھالنے اس طرح گزر رہا تھا جیسے دشمن اس کے سامنے ہی ہے اور وہ اگلے قدم پر اس کا جسم چھلنی کرنے جا رہا ہے۔

مجھے اس کے انداز پر ہنسی آتے آتے وہ گنی لینن دوسرے ہی لمحے میں یہ دیکھ کر تشویش زدہ ہو گیا کہ آنکھوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی حصہ اس حالت میں نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس پر ڈارٹ گن کی سوئی اثر انداز ہو سکتی۔ اس کا لباس تو تھا ہی مہٹا اور دبیر لیکن اس نے چہرے پر بھی برفانی موسم میں پہنی جانے والی موٹی فرکی وہ نقاب نہ لپی پستی ہوئی تھی جو سر سے لے کر گردن تک آنکھوں کے سوا ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے، ہاتھوں پر چوٹی رشتانے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ انہوں نے محافظوں کی لاشوں کا اچھی طرح معائنہ کیا تھا اور وہ ان کی موت کے سبب سے آگاہ ہو چکے تھے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ان محافظوں کو ڈارٹ گن سے ہلاک کیا گیا تھا، اس لیے انہوں نے اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیا تھا اور اس قدر مستعد نظر آ رہے تھے۔

نبھایا جائے تب بات ہے۔۔۔۔۔ میں یوریشین ہوں اور میری تہذیبی سے زیادہ عمریورپ اور انگلینڈ میں گزرتی ہے مگر ٹھکانے والی روح شاید مشرق کی کسی ملک روایتی داستان سے نکل کر تھس گئی ہے مگر اب میرے اور شوہر کے درمیان صرف رواداری اور ترحم کا رشتہ رہ گیا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اچھی علامت نہیں ہے۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے اندھیرے میں اس کا کندھا تھپکا۔ ”حالات اتنے خراب بھی نہیں جتنے تم سمجھ رہی ہو۔ صرف احساسِ تنہائی نے تمہارے حوصلے کو کمزور کیا ہے اور کوئی بھی خاص بات نہیں۔ میں تو بہت زیادہ مشکلات اور خطرات کی توقع لے کر اس وادی میں داخل ہوا تھا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میرا مشن خواہواہ ہی میرے لیے ہوا رہا ہو تھا۔ تم سے ملنے کے بعد مجھے اپنا کام بہت آسان لگنے لگا ہے۔ شاید میری بدولت بھی تمہیں بہت سے کام آسان محسوس ہونے لگیں۔“

مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک مدت سے اس کے سینے میں عقید آسوں کا غبار بند ہی بھوٹ پڑے گا۔ اس نے ایک یاد میری گردن میں مٹائیں کر دیا اور میرے کندھے پر سر رکھ کر خاموش سکریں لینے لگی۔ رونا بھی اس کی مجبوری تھی اور کوا کو باہر جانے سے روکنا بھی۔

”تم سے مل کر میرے محسوسات عجیب سے ہو گئے ہیں۔“ اس نے آنسوؤں میں پھٹی سرگوشی میں کہا۔ ”میں بیک وقت تمہیں اپنا بھی محسوس کر رہی ہوں اور غیر بھی۔ تم مجھے دوست بھی لگ رہے ہو اور محبوب بھی۔ حالانکہ محبت میں نے زندگی میں اس شخص کے سوا کسی سے نہیں کی جو آج بھی میرا شوہر ہے۔ میرا تمہیں خوش آمدید کہنے کو جی بھی چاہتا تھا اور ساتھ ہی ہر معاملے میں اتنی سردہری بھی محسوس ہو رہی تھی کہ سوچ رہی تھی میں خاموش قماشائی بنی بیٹھی رہوں۔ صحیح طور پر میری اب بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟“

تم کچھ بھی مت کرو۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے۔ تم جیسی بند دہلا پنابوں کو یکایک ہی یوں چٹختے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اپنے شوہر کے سنبھالنے میں بھی تم ابتداء ہی سے غلطی کر گئیں۔ سال دو سال کی کسی بھی شے کی عادت ایسی نہیں ہوتی جو پھرنی نہ جاسکے۔ مجھے ایل ایس ڈی کا ایک رسیا یاد آ رہا تھا۔ ایک ماہ تمام خالے میں بند رکھا، معمولی سی تدابیر اختیار کیں، ٹھیک ہو گیا۔ آج بڑا کام کا کوئی بنا ہوا ہے۔ اس میں پچھ دن محنت کرنے کی ضرورت تھی۔ انیت اسے سب ٹھیک بہت اٹھانی پڑی لیکن بہرحال وہ مر نہیں سکتا تھا۔ اب بھی تمہیں یہی کرنا پڑے گا۔ ایک ماہ یا زیادہ سے زیادہ دو ماہ اس پر اور اس کے ساتھ ساتھ خود پر جبر کرنا پڑے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تمہاری باتوں نے مجھے ایک بار پھر دی پرانی سینڈریلا بنا دیا ہے۔ اس کی آواز گونگ

میرے خیال کی جلد ہی تصدیق ہو گئی جب باقی تین محافظ بھی میرے گزرنے سے گزرے۔ ان کے بھی چہروں پر فرکی نقاب اور ہاتھوں پر جڑی دستاں نظر آ رہے تھے بلکہ ایک محافظ کو غائب فرکی نیپل میسر نہیں تھی تو اس نے کمبل کا کوئی ٹکڑا چہرے گردن اور سر کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک تو نیپل تھری کی طرف دیکھتا ہوا گزرا جیسے اسے معلوم ہو کہ اس کے ایک دونوں سے کسی کی آنکھ اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ آگے بڑھ چکا تو میں ایک طویل سانس لے کر سینڈریلا کی طرف مڑا۔

”کیا حشمت اور اس کے ساتھی محافضوں کی لاشیں لے گئے؟“ میں نے پوچھا۔
”ہاں۔“ سینڈریلا نے جواب دیا۔ اس تبصرے میں وہ آگے تھے اس میں لاشیں ڈال کر لے گئے ہیں۔ حشمت خان اور اس کے دو خاص محافظوں کے سوا باقی سب پیدل گئے ہیں۔ ہرمال اب وہ سب حشمت کے ٹھکانے پر پہنچ گئے ہوں گے۔“

دلچسپی میں نے اپنے ایئر فون پر کینی کی سرگوشی سنی۔ ”منصور، منصور۔ اگر میری آواز تم تک پہنچ رہی ہے تو فوراً سنو۔ ابھی ابھی مسیح محافظ میری کوشنری کے دروازے سے بٹ کر کسی کام سے گیا ہے تو میں اپنی آواز تم تک پہنچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مجھے حشمت خان کے مکان کے قہ خانے میں پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ اس کا ذاتی حقبت خانہ معلوم ہوتا ہے۔ میرے ارد گرد کی کوشنریوں میں بہت سے مرد اور عورتیں ناگفتہ بہ حالت میں قید ہیں۔ مجھے جیسے ہی یہاں پہنچا گیا ویسے ہی حشمت خان اپنے ساتھیوں کو لے کر تہماری تلاش میں نکل گیا تھا اور میرے بارے میں کہہ گیا تھا کہ مجھ سے وہ دلہن سرخود ہی نکلے گا۔ مجھے لگتا ہے منصور کہ مجھ پر بہت زیادہ تشدد کیا جائے گا۔ اگر پہنچ سکتے ہو تو میری مدد کو پہنچو اور اگر اب اس دنیا میں ہماری ملاقات نہ ہو سکے تو میری کتابوں کے لیے مجھے معاف کر دینا اور اگر مجھ سے کچھ اچھائیاں سرزد ہوئی ہوں تو ان کے حوالے سے مجھے اچھے الفاظ سے پوچھنا۔“

یہ سب کچھ سننے کے دوران میرے اعصاب پر ہکا بکا سا فاری رہا۔ کینی اس قسم کی باتیں کرنے والی توکی نہیں تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مایوسی نے اس پر غلبہ پالیا تھا جبکہ میں پہلے کی نسبت زیادہ پر امید ہو چکا تھا۔ اپنا کام مجھے زیادہ آسان محسوس ہونے لگا تھا لیکن یہ بات میں اسے نہیں بتا سکتا تھا اسے قسطنطنیہ نہیں دے سکتا تھا کیونکہ میرے پاس ٹرانسمیٹر کا صرف ریسیوٹک میٹ تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ تلاش میں نے محض چند دنوں کا اضافہ کر کے اپنے میٹ کا پیغام پانچلے کے قابل بھی بنوا دیا ہوتا لیکن اس وقت میرا خیال تھا کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ صرف کینی کی آواز سننے رہنا ہی میرے لیے کافی ہوگا۔

دلچسپی میں نے دوبارہ کینی کی آواز سنی۔ ”یہ لو... وہ سمجھئے۔“

ساتھ ہی ایک کڑخت آواز سنائی دی۔ ”سے بڑی...! یہ تم لائٹ ہونٹوں سے لگائے کیا باتیں کر رہی تھیں؟ ادھر لاؤ... ذرا دکھاؤ مجھے۔“ یہ آواز حشمت خان کی ہرمال نہیں تھی۔

”نہیں... نہیں۔“ کینی کی طرف سے ہی آواز سنائی دی۔ ”یہ ہائٹ مجھ سے مت چھیٹو۔ یہ میرے ایک پیارے دوست کی لٹائی ہے۔“

”لیکن سچی کے گیٹ پر محافظوں کو تم نے بتایا تھا کہ یہ تمہیں کھنڈوں کی ایک گلی میں پڑا ملا تھا۔ تیسری بار پوچھا جائے تو شاید تم کچھ اور سناؤ گی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم اس لاکٹ کو پہچانتے ہیں۔“

اس پر ایک قہقہہ سنائی دیا جو یقیناً حشمت خان نے لگایا تھا۔ اس کے بعد کینی کی آواز سنائی نہیں دی البتہ کھٹ پٹ کی چند آوازوں کے بعد وہی کڑخت آواز ابھری۔ دیکھا یاں یہ اندازہ درست ہی تھا۔ اس میں ٹرانسمیٹر پوشیدہ ہے۔“

لاؤ ذرا اسے ہم بھی استعمال کر کے دیکھیں۔ حشمت خان نے اسٹرائپ لمبے میں کہا۔
”پیارے اپنی دانست میں بڑی جدید چیز لے کر آئے ہیں۔ پھر وہ کھنکار کر بولا۔ ”اس لڑکی کے ساتھ آنے والے ابھی! اگر تمہیں اس لڑکی سے ذرا بھی لگاؤ ہے یا اس کی جان کی پروا ہے تو دس منٹ کے اندر اندر اپنے آپ کو میرے حضور پیش کر دو ورنہ اس لڑکی کی شہ رگ کاٹ دی جائے گی۔ میرے ہاں پہنچنے کے لیے تم بہت سی میں نظر آنے والے کسی بھی فرد سے کہہ دینا کہ تمہیں منوچی کے گھر پہنچا دیا جائے۔ وہ تمہیں میرے دروازے تک چھوڑ جائے گا۔ یاد رکھنا۔“ ٹھیک دس منٹ۔“ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

”ایسا بات ہے تم یقیناً خاموش ہو گئے ہو؟“ سینڈریلا نے اندھیرے میں سرگوشی کی۔
”میں تمہاری صورت نہیں دیکھ پا رہی مگر محسوس کر رہی ہوں کہ تم یقیناً مضطرب ہو گئے ہو؟ کیا ٹرانسمیٹر پر کوئی بری خبر سنائی دی ہے؟“

”تمہارے خیال میں کیا ہم اس وقت اچھی خبریں سننے کی پوزیشن میں ہیں؟“
میں نے منکرانے کی کوشش کی۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری منکرانہٹ نہیں دیکھ سکے گی۔ پھر میں نے اسے تیزی سے بتایا کہ میں نے ٹرانسمیٹر پر کیا سنا ہے۔ اس کے بعد میں نے کہا اب شیر کو کچھارست ہر آواز پرے لگو۔ سینڈریلا میری ماں نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں بیک وقت شیر کی طرح بہادر بننے کی بھی کوشش کروں اور لومڑی کی طرح مکار بھی۔ میں اب ان دونوں خصوصیات کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن حشمت خان کا پیغام سننے کے بعد میرے اندر کی لومڑی کسی کھوہ میں جا سوتی ہے اور صرف شیر باہر رہ گیا ہے۔ حشمت خان کے چہرے ہوئے تسخیر نے جیسے میرے اندر سینے میں کسی آتش فشاں کا دبان بھول دیا ہے اس کے لکارنے کا انداز بتاتا ہے کہ وہ مجھے بہت ہی حقیر

زمین دوز قتل میں نہیں جتا افغانستان وغیرہ میں تو اسے کاریز کہتے ہیں، یہاں اسے ڈبل کی کہا جاتا ہے۔

میں نے لٹھے میں اڑی ہوئی اسٹین گن اٹال کر دیوان کے نیچے رکھی اور سینڈز کو ہدایت کی۔ ”اس کا استعمال مست شروع کرو۔ فی الحال غور شراب کی ضرورت نہیں۔“

گن رکھ دینے کے بعد میں نے اپنے آپ کو کافی ہلکا سا محسوس کیا۔ وہ اب تک میری آزادانہ نقل و حرکت میں رکاوٹ بن رہی تھیں۔ میں نے اپنا مخصوص سائنت کا فیلڈ نکالا اور ایک بار پھر کھڑکی کے روزن سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ ایک گارڈ مکان کے کونے تک بیچ چکا تھا اور دوسرا میرے اندازے کے مطابق دوسرے کونے سے نمودار ہونے والا تھا۔

میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور تاریکی کی پٹی ہی میں رہتے ہوئے کونے کے قریب دیوار سے چپک گیا۔ میں یہاں کچھ ایسی محفوظ پوزیشن میں نہیں تھا۔ مسلح محافظ اگر مبہر عبور کرنے کے بعد دیوار کی طرف دیکھا تو نہایت آسانی سے مجھے بھی دیکھ سکتا تھا اور میرے فیلڈ کی جھلک بٹ کو بھی لیکن دوسرا گران جیسے ہی مکان کے کونے سے ایک قدم آگے آیا، میں نے اسے دیوار کی طرف دیکھنے کی سمت دیے بغیر روشنی ہی میں اس پر جھپٹ کر بائیں ہاتھ سے تنجر اس کے دل میں اتارا اور ساتھ ہی دائیں ہاتھ سے اس کی گردن پر کرائے کا وار کیا۔ میرے خیال میں بہت وقت ان دونوں کارروائیوں کا نشانہ بننے والا نہ تو یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے اور نہ اسے یہ سوچنے کی صلت مل سکی کہ وہ مر رہا ہے۔ یہ عمل ہی ایسے ہی تھا جیسے آپ اچانک بھٹنے سے کوئی زوری توڑ دیں، زندگی کی زوری۔

اس سے پہلے کہ اس کا بے جان جسم لان کی گھاس کو چھوٹا میں نے اسے اندھیرے میں گھسیٹ لیا اور دیوار کے ساتھ لٹا دیا۔ اس دیوار کے سائے میں آج نہ جانے کتنے بے جان جسموں کو پناہ گزین ہونا تھا۔ اگر میں اسے فوراً نہ گھسیٹتا تو شاید پیچھے سے مکان کے دوسرے کونے سے نمودار ہونے والا گران اسے گرتے دیکھ لیتا۔ چند سیکنڈ بعد وہ میرے سامنے نمودار ہوا اور اس کا بھی چشم زدن میں ہی مشر ہوا۔

تین چار منٹ کے اندر اندر ہی وہ چاروں فیلڈ مریضوں کی طرح دیوار کے سائے میں پڑے تھے۔ میں نے ان کی صورتیں تک دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ میرے جسم میں دوڑتا دوا خون جیسے آتش سیال بن گیا تھا۔ اس نرس میں بیٹے بچیاں کوند رہی تھیں۔ میں نے ان میں سے دو کی اسٹین گنیں اٹھا کر کندھوں پر لٹکائیں۔ یہ جدید ساخت کی نہایت عمدہ جرمن اسٹین گنیں تھیں لیکن مجھے جو ممکن کھنڈوں میں لی جانے والی تھیں وہ ان سے بھی عمدہ تھیں۔ دو اتنی بھاری اور سارے میں چڑی نہیں تھی لیکن محض دیکھنے میں ہی ان سے کہیں بہتر لگتی تھیں۔ کچھ ایمونیشن بھی میں نے کمر سے باندھ لیا۔ لپک کر دائیں میں کمرے میں آیا۔

انسان سمجھ رہا ہے۔ وہ خود مافیا کا ایجنٹ ہے اور شاید اس نے مجھے بھی مافیا کے کسی ٹھکانے کی طرح کوئی موقع پرست، چپکا اور بد معاشر سمجھا ہے۔ میں اسے بتانے جا رہا ہوں کہ میں کون ہوں، کیا ہوں۔ بخدا میں اسے کتنی سے بدسلوکی کرنے، تمہارے شوہر کی زندگی سے کھیلنے اور اس بستی کے مسموم لوگوں کو آلودہ کرنے کی پوری بھیانک سزا دوں گا۔

”تم جذباتی ہو رہے ہو۔“ وہ مضطرب انداز میں میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی انگلیاں سختی سے میری بازوؤں پر جم گئیں۔ اس کی گرفت میں مردانہ سختی تھی۔ ”ایک عرصے بعد تو مجھ پر جذباتیت غالب ہو گئی ہے۔“ میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”اب شعل بھڑک ہی اٹھ ہے تو اس سے کوئی کام لینے دو۔“

”تمہیں شاید احساس نہیں کہ وہ تمہارے لیے چارہ پھینک رہا ہے۔ وہ لڑکی کو اتنی جلدی ہلاک نہیں کرے گا۔“ سینڈز نے گویا مجھے سمجھایا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”میں اس کے باوجود اس کے جال میں جا رہا ہوں۔ اسے یہ بتانے کے لیے کہ وہ میں خود تعداد میں نکلی ہی کیوں نہ ہوں، شیر کو قابو میں نہیں کر سکتیں۔“

”وہل جذباتی اور افسانوی باتیں۔۔۔“ سینڈز نے قدرے بیزارگی سے بولی۔ میں کہتی ہوں۔۔۔۔۔“

”تم کچھ بھی مت کہو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ مجھے صرف حسرت کے تھر تک فیلڈ کا محفوظ راستہ بتا دو، پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔“ وہ ایک لمحے تک خاموش رہی، پھر عمرانی سے اس سے کر بولی۔ ”ہمارے گیٹ کے عین سامنے پتھریلی سڑک کے وسط میں پتھر کا ایک بلاک تھیں، علیحدہ ہی رکھا نظر آئے گا۔ اس میں آہنی کنڈا بھی لگا نظر آئے گا۔ اس بلاک کو اٹھا کر اھیمنان سے نیچے اتر جانا۔ وہ کنڈا کن جیسے ایک پائپ ہو گا لیکن بالکل صاف ستھرا اور خشک اس میں تمہیں درا جھک کر چھاپڑے گا اور اترتے وقت ذرا سمت کا خیال رکھنا کہ ہمارے گیٹ کی عین مخالف سمت میں چہن۔ دائیں ہاتھ کی طرف نہیں۔ جہاں پہنچ کر پائپ لائن نما یہ چوکور سرنگ ختم ہو جائے وہیں تمہیں ایک اور بلاک بٹانا پڑے گا۔ تم جہاں لگے، وہاں تمہارے سامنے ہی حسرت خان کے مکان کی عقبی دیوار ہوگی۔ شرافت جی وہاں رہتا ہے۔“

”یہ سرنگ جس کے حقیقی نام بتا رہی ہو، درحقیقت ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”درحقیقت یہ پتھر کی سلوں سے بنی گئی ایک ٹنگی ہے جو کئی گیلیوں میں پھیلی ہوئی ہے۔“

سینڈز نے بتایا۔ ہر بھاری کے دونوں میں ان میں پانی ذخیرہ کیا جاتا ہے کیونکہ جب درجہ حرارت نقطہ انجمود سے بھی گر جاتا ہے تو پانی کہیں بھی رکھا جائے جم جاتا ہے اور اس

ابھی میں سمیٹنے بھی نہ پایا تھا کہ روشنی کا ایک سیلاب سا اٹھ پڑا جس نے اس سڑک اور اس کے دونوں اطراف کے نشیبی حصوں کو منور کر دیا جس پر میں نے دوڑ لگائی تھی۔ اسٹین مین اس وقت میرے ہاتھ میں تھی لیکن میں جوالی فاز کرنے سے پہلے اپنی جگہ سے ہٹ جانا بہتر سمجھا۔ نشیب میں کہے میں مجھے ایک تباہ درخت نظر آیا تھا۔ میں نے اسی کے عقب میں پناہ لینے کے لیے پھلانگ لگائی تھی اور اسی پھلانگ نے ایک بار پھر مجھے بچا لیا۔ میں نے وہ جگہ چھوڑی تھی، دوسرے ہی منٹ میں اس جگہ گولیوں نے زمین کے خاصے بڑے ٹکڑے کو اوپر کر رکھ دیا تھا۔ گولیاں صرف ایک ایک منٹ کی تاخیر سے میرا تعاقب کر رہی تھیں اور یہ ایک ایک ثانیه ہی میرے لیے زندگی کا پیغام بن رہا تھا۔

درخت کے تنے کی آڑ میں ہوتے میں نے سب سے پہلے روشنی سے ماخذ ختم کرنے کے لیے گولیاں برسائیں۔ وہ صرف تین نڈلائیں تھیں جو دیوار پر مجھے ڈوستے سورج کی طرح دھکی نظر آئی تھیں۔ میری پہلی کوشش میں تینوں نڈلائیں چکنا چور ہو گئیں اور ساتھ ہی دیوار سے جھانکنی ہوئی پرچھائیوں بھی کچھ کم ہو گئیں۔ اس سے پہلے کہ باقی لوگ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر پاتے یا کم از کم سر پیچ کر کے دیوار کے پیچھے پناہ..... ہی لے پاتے، میں نے ان کا بھی صفایا کر دیا۔

فائرنگ ختم ہوئی تو میں سہل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے درخت پر چڑھ گیا۔ اس کے سوا مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جس پر چڑھ کر میں چار دیواری کے اندر کا منظر دیکھ سکتا۔ فی الحال دیوار کے قریب جانے کا خطرہ میں سوال نہیں لیٹا جاتا تھا۔ درخت پر گویا میں بروقت ہی چڑھا تھا کیونکہ ابھی دو شاخوں پر پاؤں بند کر اور اسٹین مین صحیح طور پر تھام کر سنبھلا ہی تھا کہ چار دیواری کے اندر مجھے کئی افراد راغب تھیں وغیرہ اٹھائے اس عقبی دیوار کی طرف دوڑتے نظر آئے۔ یہ غالباً وہ محافظ تھے جو مکان کے سامنے والے حصے کی طرف حینات تھے۔ وہ اندھا دھند دوڑتے چلے آ رہے تھے۔

میں بے شک درندگی اور جوش سے تقریباً بے قابو ہو کر یہاں تک آیا تھا لیکن اس عالم میں بھی میری ایک حکمت عملی تھی اور وہ یہ کہ ان لوگوں میں بھگدڑ مچا دی جائے، انہیں اندھا دھند ہر قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا جائے اور خود حتی الامکان پر سکونا رہے ہوئے ان کی بد تقصیر اور افراتفری سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اس سے پہلے کہ وہ وہ دیوار تک پہنچ پاتے، میں نے انہیں چھلنی کرنا شروع کر دیا۔ مکمل لان نما حصے پر وہ صاف نظر آ رہے تھے لیکن وہ بوکھا ہٹ میں اندازہ نہیں دیکھ رہے تھے کہ گولیاں کدھر سے آ رہی ہیں اور غالباً وہ اس غلط فہمی میں بھی مبتلا ہو گئے تھے کہ ان پر فائرنگ کرنے سے ایک سے زیادہ ہیں کیونکہ انہوں نے جوالی فائرنگ کی کوشش کی تو ان میں سے ہر ایک کی فائرنگ کا رخ مختلف تھا۔

اس وقت تک سینڈریلا نے جی جانی تھی، وہ یقیناً دیکھ چکی تھی کہ چاروں مگرال مر چکے تھے۔ میں نے سینڈریلا کی طرف دیکھے بغیر دیوان کے پیچھے سے اپنا اسٹین مین نکالی، اسے دیوار سے لٹکے میں اڑا دیا اور ایک بار پھر دیوار سے کی طرف لپکا۔

”میری بات تو سنو.....“ سینڈریلا نے میرا بازو تھمے کی کوشش کی، میں نے رک کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے گویا جھرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔

میں دوبارہ دیوار سے کی طرف لپکا اور اس سے نکل کر اس درخت کی طرح مین کی طرف بھاگ جسے کئی دن بھونکا رہنے کے بعد ہٹکار نظر آیا ہو۔ کاریز کے دہانے پر رکھی ہوئی سونے کی پتھر کی سل مجھے فوراً ہی نظر آئی، میں نے اس کا آہنی کنڈا پکڑ کر اسے اٹھایا تو وہ مجھے بے حد ہلکی پھلکی معلوم ہوئی۔ میرے اندازے کے مطابق عام طور پر اسے کم از کم چار افراد مل کر اٹھاتے ہوں گے۔

میں کاریز میں اترا اور سینڈریلا کی ہتائی ہوئی سمت میں دوڑتا چلا گیا۔ کاریز میں پانی بے شک نہیں تھا لیکن نمی اور پھوسن نکالی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پتھر پڑا دیوار سے ٹکرانے کے بعد مجھے سنبھل کر چلنا پڑا۔

میری تاریکی میں مجھے زیادہ دیر نہیں چلنا پڑا۔ جلد ہی میرے سامنے دیوار آئی۔ اس مقام پر میں نے بازو بلند کر کے اوپر کو زور لگایا تو پتھر کا ایک مستطیل ٹکڑا اوپر کو اٹھتا چلا گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے دور پھال دیا۔ اس کے الٹ کر گرنے سے کافی آواز پیدا ہوئی لیکن اب میری زندگی میں احتیاط کا عمل دخل تو ختم ہی ہو گیا تھا۔

شاید اس آواز کا رد عمل تھا کہ میں جیسے ہی اچھل کر مستطیل دہانے سے باہر آیا، میرا استقبال گولیوں سے ہوا۔ یہ میری خوش قسمتی یا پھر شاید میرے اچھل کر نکلنے کا نتیجہ تھا کہ میں گولیوں کی بوچھاڑ سے بچ گیا تھا۔ اگر میں نے اطمینان سے نکلنے کی کوشش کی ہوتی تو شاید میری کمپوزی کے پرچے اڑ جاتے کیونکہ گولیوں کی باڑ میں کاریز کے دہانے پر پڑی تھی۔

میں زمین پر لوٹ ہوا کچھ دور چلا گیا، اتنا میں نے دیکھ لیا تھا کہ گولیوں کی یہ بازو سامنے ہی نظر آئے، ان ایک دیوار کی طرف سے کئی تھپی جو غالباً ایک قعد نما مکان کی عقبی دیوار تھی۔ اس پر باقاعدہ قعدے کی دیوار کی طرح کنوڑے بھی بنے ہوئے تھے۔ اس دیوار کے عقب میں ٹھوڑی سی روشنی تھی اور دیوار سے باہر کو بھانکتے ہوئے کچھ انسانوں کے اوپری ہٹارے ایک پرچھائیوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اس منظر سے قدیم زمانے کے انہی شاہی قلعوں کا تصور ذہن میں ابھرا تھا جن کے گرد دشمنوں کی فوجیں محاصرہ ڈال لیتی تھیں اور دروازے بند کر دیتے تھے۔

کیوں نہیں کی تھی؟ وہ مجھے اتنا کھل کھیلنے کی مہلت کیوں دے رہا تھا؟
ادھر میں اپنی کوششوں سے دراصل یہ تاثر دینے میں مصروف تھا کہ مملہ اور تھا
نہیں بلکہ عمارت کو کئی افراد نے گھیرے میں لے رکھا ہے لیکن مجھے خود بھی احساس تھا کہ
میں اپنی اس کوشش میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں تھا۔

اسی اثناء میں مجھے دور کہیں سے بہت سے آدمیوں کی ملی جلی توافیں سنائی دیں۔ ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ حشمت خان کے مکان پر فائرنگ کے ہنگامے کی وجہ سے اس سے لوگ
گھروں سے نکل آئے تھے یا ہو پہلے ہی نکلے ہوئے تھے وہ بھی اسی طرح متوجہ ہو گئے تھے
اور چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو اسی طرف چلنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ چیخ و پکار کے دوران
میں نے انہیں بار بار منوجی منوجی کہتے سنا۔

میں وہیں زمین سے چپک کر سہکت ہو گیا۔ کیا بہت
درخ کر رہا تھا؟ شاید اسی لیے مکان کے اندر حشمت
جو ابی کارروائی نہیں کر رہے تھے کہ بہت سی بات
چکا بولی کر الیں اور اس نگرانی میں بکر جانے
میرے سے یہ امر بڑی تشویش کا
تھے اور اپنی سادگی اور کم علمی کو
اور زیر اطاعت تھے۔ ان پر گہرا
دھنکا سینڈریلا کی

انہیں زیادہ غائر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ ایک دوسرے پر ہاتھ پوتے چلے گئے۔ ان
میں سے ایک بونستہ زرد چلاک اور ہوش مند معلوم ہوتا تھا، واپس بھاگنے لگا اور شاید وہ
بچنے میں کامیاب بھی ہو جاتا لیکن میں اس وقت میرے نشانے پر آیا جب وہ اصل عمارت
کے موڑ پر پہنچ کر میری نظر سے اوجھل ہوئے واپس تھا۔

اس کے بعد عمارت پر جیسے سکوت چھا گیا۔ مجھے حیرت سی ہونے لگی کہ کیا یہی وہ لوگ
تھے جن کے بل پر حشمت اور شرافت اتنے طاقتور بنے ہوئے تھے؟ ان کی طاقت کا راز
مجھ پر تھا کہ انہیں کسی نے چیلنج نہیں کیا تھا۔ کوئی ان کے مقابلے پر کھل نہیں سکا تھا؟
بعض استحصال صرف اس قوت تک بہت طاقتور نکلے ہیں جب تک کوئی ان کے مقابلے پر
نہیں اترتا۔

میں نے کوشش و پیکار یا انتظار میں مزید وقت ضائع نہیں کیا اور درخت سے اتر کر دیوار
کی طرف دوڑا۔ گن کندھے سے لٹکا کر میں نے ایک مخصوص حصہ تلاش کر کے اچھل کر
دیوار کا کنگرا پکڑا اور دوسری طرف کودتے ہوئے سینے کے بل زمین پر گر گیا۔ گن کندھے
سے اتارتے ہی سب سے پہلے میں نے ان پر گئے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھبوں پر سے دو
آرائشی گلوب گولیوں سے آزاد دینے جن کی وجہ سے اس حصے پر روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس
کے ساتھ ہی میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور چھپکلی کی طرح تیزی سے کچھ آگے بڑھ کر
تارکی میں اندازاً ان دو کھڑکیوں پر فائرنگ کی جو چند لمحوں پہلے مجھے نظر آئی تھیں۔

آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ گولیاں کسی ٹھوس شے سے ٹکرائی تھیں۔ کھڑکیوں کے
پچھے یا تو لوہے کے شیشے تھے یا پھر بہت نہایت موٹی اور ٹھوس لکڑی کے تھے، چند سیکنڈ تک
کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا تو میں پچھلیوں کی طرح دوڑتا ہوا اصل عمارت کے اس موڑ تک
پہنچا جہاں اس شخص کی لاش پڑی تھی جس نے اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر موت سے فرار
حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس موڑ سے آگے بھی روشنی تھی۔ میں نے اس حصے میں موجود آرائشی تسموں کا
بھی مطالعہ کر دیا۔ یہ سامنے کا حصہ تھا، ادھر کھڑکیوں کے وسط میں ایک دروازہ بھی موجود
تھا۔ میں نے ان کھڑکیوں اور دروازے پر بھی بے تحاشہ گولیاں برسائیں لیکن نہ تو ان پر
کوئی اثر ہوا اور نہ ہی کوئی جوابی کارروائی عمل میں آئی۔ اس وقت لان کے صرف ایک
گوشے کو چھوڑ کر تمام بیرونی حصہ تاریکی میں ڈوب چکا تھا اور اصل عمارت میں تو کوئی
رد زن، کوئی کھڑکی ایسی ظہری نہیں آ رہی تھی جس سے روشنی کا کوئی سراغ ملتا ہو۔

پوری عمارت میں ایک جذباتی نخل سہا کی طرح سر اٹھائے کھڑی تھی۔ میری نہ جانے
کونسی جس مجھے کچھ کچھ مضطرب تو کر رہی تھی کہ کوئی آنکھ ان ٹھوس دیواروں کے عقب
سے مجھ دیکھ رہی ہے لیکن اگر کوئی مجھے دیکھ رہا تھا تو اس نے مجھے ٹھکانے لگانے کی کوشش

شرفه التبريد في شهر رمضان

تاریخ: ۱۳۰۲/۱۲/۱۵

سینڈرلا کی آواز بھی جہوم کے قریب ہی نہیں سے آتی تھی اور یہ شاید میری کسی نامعلوم حس کا ہی کمال تھا کہ میں نے اس آواز کو پہچان لیا تھا ورنہ یہ اس آواز سے تو قطعی مختلف تھی۔ نو میں نے سینڈرلا کے گھر بس سنی تھی۔ جو آواز اب میں سن رہا تھا، گرجہ اور غلطیوں کا۔ انسانیت کے ہاؤس اور اس میں زبردست رعب اور دبہہ تھا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن انداز سے میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اس کی آواز بلند ہوتے ہی دیگر آوازوں کا شور یکاخت ختم ہو گیا تھا۔ سینڈرلا خاموش ہوئی تو ایک لمبا اور صاف آواز آئی۔

تھا، یہ آواز غالباً اس کا انگریزی میں ترجمہ کر رہی تھی۔ وہ یہ ترجمہ شاید کتنی کے چند افراد یا
”بہستی کے لوگو! تمہارا دل تو بڑا بڑا ہے۔ وہ شخص غلط کر رہا تھا۔“

آواز سے خوف یا پریشانی میں جھکا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں..... دراصل یہ ایک بہت بڑے قریب کا پروا چاک ہو رہا ہے۔ جمعیت اور دعوہ بازی کا ایک خوفناک وراور اپنے انتقام کو پہنچ رہا ہے..... یہ ساری حقیقت تر لوگوں کے سامنے مقدس پائی کی اہمیت بیان کر رہی ہے۔ سب لوگ فوراً میدان میں جمع ہو جائیں۔ کوئی شخص منوچی کے مکان کے قریب نہ جائے..... ورنہ آسمانی بلائیں اسے اپنی گرفت میں لے لیں گی..... کیونکہ اس وقت دیوتا منوچی سے ان تمام دھوکوں کا حساب لے رہے ہیں جو اس نے گزشتہ تین برسوں میں اس ہستی کے معصوم لوگوں کو دیئے ہیں۔ مقدس پائی کی المیہ اڑھائی سال کی قید شمالی سے سزا ہو کر بڑے میدان کی طرف جا رہی ہیں۔ وہاں تو وہ مقدس پائی کا دیدار بھی کر سکیں گے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے کہ گزشتہ اڑھائی برسوں میں تم نے ان کی خبر نہ لی تو اس دوران ان پر کیا ہوتا..... سب لوگ جلد از جلد بڑے میدان میں پہنچیں۔ جو شخص منوچی کے مکان کی طرف جائے گا اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جائے گی۔ آسمانی بلاؤں کے غیظ و غضب کا رخ اس کی طرف بھی بڑھ جائے گا۔“

میں نے یہ سب کچھ سن کر بے آواز طریقے سے اطمینان بھری سانس لی۔ حشمت خان اور شرافت خان نے تو اس وادی میں اٹھائی تین سال اپنا آرامہ بڑی کامیابی سے چلایا تھا۔

41

میر نے شخص دھنکی ہی دی تھر لیکن دوسری طرف سے آج کل ہی ہر پھینک دیا تھا۔

میں اٹھ کر جھکا جھکا اس طرف دوزخ دیکھنے کے لیے پر پڑتے وقت میں نے ارد گرد فائرنگ کر کے کچھ گولیاں ضائع کیں لیکن ان کا کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ مجھے کے دوسری طرف اتر کر میں نے دیکھا کہ وہ مردوں کی مسخ شدہ لاشیں تو آدھی آدھی جلتے جلتے نیلی پڑی تھیں اور وہ ان سے کچھ فاصلے پر پڑی تھیں جنہیں بظاہر کچھ زیادہ پوئیں وغیرہ تو نہیں آئی تھیں جتنی آئی تھیں وہ ان کی ہلاکت کے لیے کافی ثابت ہوئی تھیں۔

ان سے ذرا پیچھے نیم خشک کمرے کی چھٹی دیوار کے قریب ایک لڑکی برائے نام لباس میں پڑی زخمی حالت میں آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کی گردن میں بھانے کس چیز کا ٹکڑا پیوست تھا۔ اس کا جسم اندھیرے میں ہنی کی ڈال کی طرح پٹک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ جسم سرد ہونے والا تھا۔ اتنے مجھے اندازہ تھا کہ میں اس کے قریب رکھ نہیں سکتا، تاہم میں نے مردوں کی لاشوں کو ایک نظر دیکھا مگر ان میں کوئی بھی حشمت یا شرافت نہیں تھا۔ میں نیم خشک کمرے کے عقبی دروازے کی طرف دوڑا جو نیم وا نظر آ رہا تھا۔ کسی ممکنہ ٹکچے سے بچنے کے لیے میں نے دروازہ مات مار کر کھولا اور ساتھ ہی ایک طرف بچتے ہوئے اندھا دھند کمرے میں چاروں طرف گولیاں برساتیں۔ یہاں بھی کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہ آئے۔ میں اس کمرے میں تھیں پڑا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ فریج پر بھی جوں کا توں تھا۔

میں اس سے گزر کر ایک بال میں پہنچا۔ وہ بھی خالی تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عمارت سے زندگی کے سمار ہی محفوظ ہو چکے ہیں لیکن بال کے ایک کونے میں مجھے ہنگامی سڑھیاں پیچھے جاتی نظر آئیں۔ میں نے جھانک کر دیکھا، ان کے اختتام پر کلری کا ایک دروازہ تھا جو نہ صرف بند تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ وہ قفل بھی تھا۔ میں واپس واپس آیا جہاں میں نے لاشیں دیوار کے لیے تکیہ بنی دیکھی تھیں۔ میری توقع کے مطابق یہاں مجھے ایک ہینڈ گرنیڈ محفوظ حالت میں پڑا تھا۔ یہ گرنیڈ اٹھ کر میں واپس اس بال کی طرف دوڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا اصل دشمن ابھی تہ خانے میں محبوس ہے اور وہاں شاید کچھ دشواریاں بھی میری منتظر ہیں لیکن اب منزل مجھے سامنے ہی نظر آرہی تھی۔

راستہ وہی تھا۔ جس سے میں پہلے ہی گزر کر اندر آیا تھا اور دوبارہ منہدم شدہ دیواروں کی طرف گیا تھا لیکن اس بار جیسے ہی میں واپس بال میں پہنچا تو وہ قدم چلتے ہی یکفخت جیسے میرے پیروں کے نیچے سے فرش کا کچھ حصہ غائب ہو گیا۔ میں نے سمجھنے کی بہت کوشش کی لیکن جب انسان کے پیروں سے زمین ہی نہ رہے تو وہ کیسے سمجھ سکتا ہے؟

اسٹین گن، بم سب کچھ میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ غایت تھا کہ ابھی میں نے اس کی سیفٹی پن نہیں ہٹائی تھی ورنہ شاید میرے چھوٹے اسی کی بدولت اڑتے۔ میں ایک آریک خلا میں نیچے کی طرف جا رہا تھا اور سب سے زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ میں

میں نے اپنے حق میں اچھا کام یہ کیا تھا کہ ہاتھ خستہ کرتے ہی اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور کافی آگے کھٹک کر چیری کی ایک بارڈ کی اوٹ میں جا لینا تھا۔ اسی لمحے میں نے دروازے کے قریب ہی ایک کھڑکی کا شربے توڑ طریقے سے ذرا اوپر اٹھتے دیکھا۔ شربہ زیادہ نہیں کھلا اور میں نے قدرے لمبوتری ایک گیند سی ہوا میں اچھلتے دیکھی۔

یہ ایک چھوٹا ہینڈ گرنیڈ تھا جو میں اس جگہ پر جا کر گرا جوں کیلئے میں نے باپ بیٹے کو لگا دیا تھا۔ لان کی مٹی ڈھیلے اور نہ جانے کس کس چیز کے ٹکڑے اڑتے ہوئے میرے اوپر سے گزر کر خالص دور تک جا گئے۔ اگر میں نے اپنی موجودہ پوزیشن پر بیٹنے کے ش لینا ہونے کے بجائے کھڑا ہوتا تو یقیناً زخمی ہوتا اور اگر سابق پوزیشن پر رہتا تو یقیناً میرے اعضاء بکھر چکے ہوتے۔

بہر حال اس سے ایک بات ظاہر تھی کہ اندر موجود افراد اگر مجھے دیکھ نہیں پا رہے تھے تو میری آواز ان تک ضرور پہنچ رہی تھی اور آواز ہی سے انہوں نے میری پوزیشن کا اندازہ کیا تھا۔ اس دوران کھڑکی کا جو شربہ گر چکا تھا مجھے دوبارہ اٹھتے نظر آیا لیکن اس سے پہلے کہ کھڑکی سے کچھ باہر آتا میں نے اس مختصر سے فاصلے میں گولیاں کی بوچھاڑ کر دی۔ کھڑکی کا شربہ تو فوراً ہی گر گیا لیکن میں نے گولیاں کی تڑپا ہٹ سے ہم آہنگ ہو جانے والی ایک جگہ ضرور من لی تھی۔

معاملہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ کچھ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے بیٹے سے چپکا ہوا تھوکن بم سمجھ کر کیا اس پر لیٹا ہوا ایک خاص ٹیپ کھولا، سیفٹی پن ہٹائی اور اسے کھڑکی پر دے مارا۔

احسان مرزا نے جب یہ بم سنان کے چمکتے کی شکل میں میرے حوالے کیا تھا تو اس کی تباہ کاری کے متعلق اشارے بتا رہا تھا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ اتنا مختصر سا ساہو بم ایک بہت بڑی بکتر بند گاڑی سے مثلاً اس عمارت کو اتنا نقصان پہنچائے گا اور اس طرح اس علاقے میں چند لمحے کے لیے زلزلہ سا ہلچل کر دے گا۔

دھماکے سے ایک بار تو میں بھی سٹپٹ گیا اور فوراً سانپ کی طرح رخ بدل کر پیچھے کو ہٹا گا۔ محفوظ فاصلے پر رکت کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے والی دیوار جو بلاشبہ کچھ دیر پہلے تک میسہ پلائی ہوئی دیوار سے زیادہ مضبوط اور ٹھوس نظر آرہی تھی اس کا بیشتر حصہ اور اس کے ساتھ چھت کا بھی کچھ حصہ لمبے کا ڈھیر بن چکا تھا اور ایک طوفان و عریض بھیابک خلاء منہ کھول چکا تھا۔

میرے خیال میں یہ پیش قدمی کے لیے موزوں ترین وقت تھا۔ اس نل کے عقب سے کچھ کمروں کی نیم خشک دیواریں اور ایک آدھ دروازہ دھکی دے رہا تھا لیکن جہاں تک میری نظر کام کر رہی تھی کسی انسان کی موجودگی کے سمار نظر نہیں آ رہے تھے۔

ہاں کے فرش کی سج سے نیچے آتے ہی الٹا ہو گیا تھا یعنی اس میں سر کے بل بیچے جا رہا تھا اور کسی بھی لمحے میرا سر اس غلائی شدہ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو سکتا تھا۔ میں نے قذہاڑی لگا کر سیدھا ہونے کی کوشش کی لیکن مجھے اندر سے تاخیر ہو گئی۔ کافی حد تک بچاؤ ہو جانے کے باوجود میرا سر ٹھوس فرش سے ٹکرائی گیا اور میرے ہاتھ پاؤں ڈھینے پڑ گئے مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

مجھے ہوش از خود نہیں آیا۔ پہلے احساس مجھے ہی ہوا کہ کوئی مجھے ہاتھ پاؤں سے پکڑے میرے سر کو جھٹکے دے رہا تھا اور میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھلنے کی کوشش کی لیکن پونے چھ سیڑیاں وزنی ہو گئے تھے۔ پھر میں نے ہاتھوں کو حرکت دینے کی کوشش کی تو احساس ہوا کہ وہ میری پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

میں سر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ یوں جھکا جا رہا تھا جیسے گردن کا منکا ہی سلامت نہ رہا ہو۔ بمشکل نرم آنکھیں ذرا کھلیں اور گردن کچھ سیدھی ہوئی تو احساس ہوا کہ میں دو زانو بیٹھ ہوا تھا۔ جسم پر صرف ایک بنیان اور شلوار نما پاجامہ رہ گیا تھا شاید اسی لیے مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔

میرا اٹھائے جانے کا انداز ایسا تھا جیسے میں کسی رومن شمشاد کا قیدی ہوں اور شمشاد کے بار قربانے پر مجھے ٹھیسٹ کر دوبارہ بل لے لیا گیا ہو۔ میری گردن میں کئی من وزنی زنجیریں ہیں جن کے بوجھ سے گردن جھکی جا رہی ہے اور آداب شمشاد ہی کے مطابق مجھے دو زانو بٹھایا گیا ہے۔

حتیٰ کہ جب میری نظر کچھ بستر ہوئی تو مجھے اپنے سامنے ایک شمشاد بھی بیٹھا نظر آیا۔ پیسے تو یہ سب کچھ مجھے ایک وابستہ یا خواب محسوس ہوا لیکن میں نے سر کو جھٹکا دیا تو درد کی ایک شدید ہراسٹھنے اور معدوم ہونے کے بعد مجھے اس شمشاد کی صورت کچھ مانوس معلوم ہوئی۔

پھر اچانک ہی میرے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا۔ جیسے کسی برقی مشین کا سوئچ اتفاقاً آن ہو گیا ہو۔ میں نے اس شمشاد کو پہچان لیا۔ وہ حشمت خان تھا جو انتہائی رنجوت سے ایک جے سجائے در تخت غماز ان پر غصے لگاؤ تھے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا..... اس کے جسم پر ایک زرق برق شہادت لبادہ تھا۔ میں نے لہجہ کی صورت میں اس کے جو وہ روپ دیکھے تھے ان میں سے ایک میں اس کا سر صفا چٹ تھا اور دوسرے میں ہال تھے لیکن اس وقت اس کے سر پر ایک خوبصورت تاج تھا جس میں میرے جڑے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر صرف رنجوت ہی نہیں آنکھوں سے بھی گویا خون ٹپک رہا تھا۔ وہ بڑے غیظ و غضب میں نظر آ رہا تھا اور وجہ غضب غالباً میں ہی تھا کیونکہ اس کی نظر مجھ پر ہی جمی ہوئی تھی۔

وہ شخص جو میرے پاؤں کو پکڑ کر جھٹکے دیتے ہوئے ایک برتن پر رہا تھا اسی طرح اس کے پیچھے مارے جا رہا تھا مجھے سمجھتے دیکھ کر قدرت پیچھے ہٹا۔

میرے دائیں بائیں دو آؤٹی کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں ٹائی زونو گیا ہوں۔ میرے میری ہی طرف تھا۔ ان دونوں آدمیوں کے چہرے ہر قسم کے اثر سے بے سب سے بڑا وقت وہاں کئی ایک افراد موجود تھے اور ان میں سے صرف وہ دو ہی اسلحہ بردار تھے فرائم کر تھے۔ مجھے ہوش میں لانے والا اور حشمت خان نسبتاً ہی معلوم ہوا تھا۔

میں غالباً زیادہ دیر سبے ہوش نہیں رہا تھا اور اسی شدہ خانہ میں تھا جس میں داخل ہونے کی غرض سے میں اس کا دروازہ دھماکے سے اڑانے کے لیے گرنیڈ اٹھائے دوڑا آ رہا تھا۔ شدہ خانے کا دروازہ بھی شاید کھلا ہی تھا یا کسی اور راستے سے ہوا یہاں تک پہنچ رہی تھی کیونکہ فلماں میں ہارود کی ہلکی سی بو محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ حشمت خان مجھ سے بات کرنے کے لیے اپنے غیب و غضب پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بلاخر وہ سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں کوئی خوفناک مرزا اپنے سے قبل میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تم ہر کون اور تمہیں ایسا کیا درد بردار تھا کہ تم نے پاگوں کی طرح گھس کر میرا نہ بنایا کھیں بگاڑ دو؟“

میرا ذہن اس وقت کچھ زیادہ مستعد تو نہیں تھا لیکن رفتہ رفتہ کئی پہلوؤں پر بیک وقت سوچنے کی میری صلاحیت فعال ہو رہی تھی۔ سر میں اٹھتی ہوئی درد کی لہریں اسی بحالی کے راستے میں کسی حد تک رکاوٹ بن رہی تھیں ورنہ یہ عمل شاید اس مختصر سے وقفہ میں ہی مکمل ہو چکا ہوتا۔

”میرے خیال میں اب تمہارے سوال کا جواب دینے میں کوئی حرج نہیں۔“ میں نے لاپرواہی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے بتا دیتا ہوں کہ مجھے انسان مرزا نے تمہیں تمہارے ساتھیوں سمیت نیت و نابود کرنے کا کام سونپا تھا اور بہت بھاری معاوضہ دیا تھا۔“

”کیوں اس کرتے ہو تم۔“ وہ غرجا۔ ”معاوضہ خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو لیکن معاوضے پر کام کرنے والے اتنی بے جگر سے موت کے منہ میں نہیں کودتے۔ وہ صرف محفوظ کام کرتے ہیں۔ وہی باڑی کھیتے ہیں جس کے جیتنے کا یقین ہوتا ہے۔“

”کسی حد تک تمہارا نظریہ درست ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”میں نے اس کام کو صرف بھاری معاوضے کے لالچ میں ہی نہیں ایک چیلنج سمجھ کر ہی قبول کیا تھا کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم نوابزادہ شرافت علی خان کے بیٹے ہو۔“

میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر کسی قدر تڑپ اٹھ گیا تھا۔

”کس نے بتایا تمہیں؟“ وہ غرجا۔

ہاں کے فرش کی سطح سے تاکہ تم نوازاؤ، شرافت علی خان کے بیٹے ہو تو میں نے یہ چیلنج اور کسی بھی لمحے میرا جگا کر سیدھا سونے پوچھا۔

کے باوجود میرا باپ کی طرف میرے باپ کی زندگی کا قرض لگتا ہے۔ "میں نے اپنے سے سائنس نامکان کی سمجھ دی۔" میرے باپ نے تمہارے باپ کے ذاتی قید خانے میں اڑیوں، گڑ گڑ کر دم بڑا تھا اور میں نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ میں اپنے باپ کی اس ایک سائنس کا انتظام لوں گا جو اس نے تمہارے باپ کے قید خانے میں لی ہوگی۔ میں ایک مدت تک تمہارے باپ کو ڈھونڈتا رہا۔ اس کی شہرہ گنگے کے تے میں نے خاص طور پر ایک خبر رکھ رہی تھی جسے تمہارے باپ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ پھر اتفاقاً ہی احسان مرزا سے تمہارا صفایا کرنے کی بات پئی اور تمہاری اصلیت معلوم ہونے پر میں نے فیصلہ قبول کر لیا۔"

"لیکن تم ہو کون؟" حشمت خان کے سب سے پہلے میں اب وہ انھیں گرت نہیں رہی تھی۔ اس کی جگہ خفیف کی دلچسپی جھلک تھی۔

"کیا اب بھی بتانے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "نہ ہر ہے" "تھکدوار" ہوں۔ موت و حیات کی کشمکش کے ٹھیکے لیتا میرا پیشہ ہے..... لیکن میرا معاوضہ کوئی کوئی ہی ادا کر سکتا ہے اور میں ان کاموں میں ہاتھ ڈالتا ہوں جن سے میری لائیں کے ہر آدمی نے انکار کر دیا ہوتا ہے۔"

"تمہارا نام؟" اب تو اس کا لہجہ تقریباً نارمل ہی ہو چکا تھا البتہ لہجے سے رعب و دہش کا اظہار کرنا شاید اس کی عادت بن چکی تھی، یہ ہنوز برقرار تھی۔

"حاجر شاہ....." میں نے جواب دیا۔

"توجہ سے میری بات سنو حاجر شاہ!" وہ اب ابھی طرح سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "تم نے میرے ساتھ جو کچھ لیا ہے اور اپنی احمقانہ سوچ کی پٹری پر چلتے ہوئے مجھے بتا دیا نقصان پہنچا ہے، اس پر میرا ارادہ تو یہی تھا کہ تم سے کوئی بات کیے بغیر تمہارے لیے قسطوں میں موت کی سزا کا حکم صادر کر دوں۔ قسطوں میں موت کا مطلب میرے ہاں یہ ہوتا ہے کہ پہلے انسان کی انگی کٹائی جاتی ہے، پھر دوسری..... انگیوں کے بعد ناک، کان اور آنکھ وغیرہ کا نمبر آتا ہے..... ایک ایک کر کے تمام اعضاء کٹتے رہتے ہیں لیکن گردن کا نمبر مشکل ہی سے کپاتا ہے۔ تمہاری ٹوٹ جھٹکتی ہے کہ تمہارے لیے اس سزا کا حکم صادر کرنے سے پہلے میں نے تم سے دو بار باتیں کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یوں کئی پہلو سامنے آ گئے۔"

حشمت خان کے چہرے پر ایک ہکا بکا کی مسکراہٹ رنگ آئی تھی۔ میرے لیے یہ

اندازہ سنا مشکل نہیں تھا کہ جس طرح میرا ذہن مستعدی سے کام کر رہا تھا، اسی طرح اس کے شیطانی ذہن کے کل پرزے بھی تیزی سے عزت میں مصروف تھے

"میں اب صورتحال پر ایک نئے زاویے سے غور کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ میرے تقریباً تمام ساتھی مر چکے ہیں اور ان کے خلاف ہو چکی ہے۔ تم نے سب سے بڑا نقصان نقصان لگائی میں مجھے یہ پہنچایا ہے کہ اس سینڈرہ کی بیٹی کو باہر آنے کا موقع فراہم کر دیا۔ وہ گویا ایک مغربیت تھا جسے میں نے غار میں بند کیا ہوا تھا، جن تھا جسے یوتی میں قید کر رکھا تھا اور لوکانے لگانے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا لیکن اب میں پچھتا رہا ہوں کہ میں ہماری مصلحتوں کے واسطے طاق رکھ کر یہ کام کر ہی سکتا ہوتا تو بہتر تھا۔ بڑی جگہ ہوئی مجھ سے۔ بہر حال یہ وقت غلطیوں پر ہاتھ ملنے کو نہیں ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں غار نہیں تھا ایک ہے میں آدمی ہو۔ میں بس بحرین میں پھنس گیا ہوں، اس میں میرے لیے تمہاری قدر و قیمت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اب اگر تم عقل استعمال کرتے ہوئے میرے ساتھ مل جاتے ہو تو میں داری میں اپنی پوزیشن بحال کرنے کی از سر نو ہمدرد کر سکتا ہوں۔ سینڈرہ فقریب ہی جس سیل برائوں کو لے کر میری اس پڑھ گیارہ کا رخ کرنے والی ہے، اس کا سامنہ کرنے کی کوئی فوری حکمت عملی تیار کر سکتا ہوں اور پاری ہوئی بوزی کو جیتنے کی کوئی صورت نکال سکتا ہوں۔ ہم دوبارہ اپنے اپنے پاؤں مضبوط کر چکیں تو اس کے بعد تم چاہو تو اچھے دوستوں کی طرح یہاں سے رخصت ہو سکتے ہو اور اپنے انتقام کے اصل ہدف یعنی میرے ابا حضور کی تلاش کا کام از سر نو شروع کر سکتے ہو۔ میں اس معاملے میں قطعی غیر ہمدرد رہوں گا۔ اصولاً تو شہیں ان کی ذہنیوں کا حساب انہی سے طلب کرتا چاہیے۔ اگر تم ان کا سراغ لگانے میں ناکام رہتے ہو اور ان کے گمناموں کا پوچھ کسی اور طرف منتقل کر دیتے ہو تو یہ تمہارے ہمارے ہونے کی نہیں، گنہگار اور جن آسمان ہونے کی نشانی ہے..... یوں کہہ سکتے ہو؟"

میں نے نہایت ہی مختصر انداز میں یہ اثر دینے کی خفیف سی کوشش کی کہ میں انھیں میں پکڑ گیا ہوں۔

"جلدی بولو..... وقت بہت کم ہے۔" اس نے قدرے مضطرب سے سبے میں کہا۔

"میری یہ پناہ گاہ اب کچھ زیادہ محفوظ نہیں رہی۔"

"کیا میں زندگی کے توشے سے چند فیض سانسیں پرانے کے لیے واقعی تمہارے بھانپنے میں آ جاؤں؟" میں نے طنز سے سبے میں کہا۔ پھر پوچھا.....

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ بازاری چلنے کے بعد تم دھوکے سے مجھے راہ سے نہیں ہٹا دو گئے؟"

"میں نے جو کچھ بھی کہا ہے، وہ ایک ہمدرد آدمی کا دوسرے ہمدرد آدمی سے وعدہ

ہے۔" وہ مسکرایا۔ "اور پھر آزاد حالت میں تم اتنی آسانی سے مرنے والی چیز نہیں ہو..... میں نے تمہیں قتل لیا ہے۔"

میں نے ایک لمحے توقف کیا، پھر ہنچکھتے ہوئے کہا۔ "بالغرض میں تمہارے ساتھ مل جاتا ہوں اور بازی بھی پلٹ جاتی ہے تو مجھے جان بچ جانے کے زبانی وعدے کے علاوہ کیا حاصل ہو گا؟"

"بچنے پھینے میں کچھ ہو۔" وہ مسکرایا۔ "جان تو اتنی اہمیت نہیں دے رہے جتنی ماں کو دے رہے ہو۔ بہر حال..... مال کے سلسلے میں تو یہی کہہ سکتے ہوں کہ احسان مرزا سے بھی معاوضہ تم نے چھٹی ہی نے لیا ہو گا اور تمہاری ہی باتوں سے ظاہر ہے کہ وہ کچھ کم نہیں رہا ہو گا..... لیکن یہاں تم جتنی دولت لے جا سکتے ہو اتنی تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔ یہ خط نہ جانے کتنی شکلوں میں دولت اٹھتا ہے اور شکر ہے کہ مذہب دنیا کے قدم ابھی یہاں تک نہیں پہنچے..... میں کھلے دل کا آدمی ہوں۔ تمہیں جو کچھ اٹھا کر لے جانے کی اجازت دوں گا اسے دیکھ کر تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔"

"مجھے منظور ہے۔" بالاخر میں نے گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب....." اس نے جوشیلے سے انداز میں چٹکی بجا لی۔ "اب یہ بھی بتا دو کہ وہ لڑکی کون ہے جو وادی کے ریت پر کھڑی کھڑی تھی؟"

"اسے احسان مرزا ہی نے میرے ساتھ کیا تھا۔ اس کے خیال میں وہ بہت کام کی لڑکی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"معلوم نہیں اس کا اشارہ کس کام کی طرف تھا۔" حشمت خان اس سنگین صورتحال میں بھی خیانت بھرے انداز میں مسکرایا۔ "بہر حال تمہارا اس سے کوئی رلی تعلق تو نہیں ہے؟"

"رلی تعلق؟" میں استغناء سے انداز میں ہنس دیا۔ "کیا ہم لوگ رلی تعلق رکھنے کے مستحق ہو سکتے ہیں؟"

"بڑے کام کی بات کی ہے تم نے۔" وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔ "گویا میرا اندازہ درست ہی تھا۔ تمہارا اس سے ذرا سا بھی قلبی تعلق ہوتا تو تم کبھی بھی اسے احوال بنا کر ہستی میں داخل نہ ہوتے۔" پھر اس نے اس شخص کو اشارہ کیا جو مجھے ہوش میں لایا تھا۔

اس شخص نے دائیں ہاتھ کی دیوار میں موبوڈ ایک نفیس سا دروازہ کھولا اور میں نے چوکھٹ کے پار کئی وکھڑے دیکھا۔ وہ ایک ٹک مجھے گھور رہی تھی۔ اس نے اب تک کی گفتگو یقیناً لفظ بہ لفظ سنی تھی۔ اسکے ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ کپڑے نار نار تھے۔ ایک ٹکھ سوچ کر تقریباً بند ہو چکی تھی اور متورم حصہ نیلا پڑ چکا تھا۔ رہساروں کی بدولت والے اجماروں پر بھی نیل تھے۔ نیلا ہونٹ پھٹ چکا تھا اور اس سے خون کی ایک ٹکیر

نرخرے تک تر خشک ہو چکی تھی۔ پیشانی پر ایک گومڑ صاف نظر آ رہا تھا اور بال بھڑا جھکاؤ کی طرح الجھے ہوئے تھے۔

اسے یقیناً بری طرح مارا پیٹا گیا تھا اور اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کی جگہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو شاید اس وقت اس میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی سکت نہ ہوتی۔ میری رنگوں میں ست روئی سے گرش کرتا ہوا خون بغلت سناٹے لگا لیکن میرے ہاتھ جھڑے ہوئے تھے اور وہ بھی رسیوں سے نہیں زنجیروں سے۔ دو ٹامی کنوں کی ٹامیں میری جانب ساکت تھیں اور ان کے ٹریڈرز پر جی ہوئی انگلیاں گویا میری کسی خفیف سی غلط حرکت کی منتظر تھیں اور حشمت خان کی سانپ جیسی آنکھیں بھی ایک لمحے کے لیے میری طرف سے غافل نہیں ہو رہی تھیں۔

نیتے شخص کا اشارہ پا کر کئی مشینی سے انداز میں قدم اٹھاتی آئے آگئی اور مجھ سے کچھ فاصلے پر رہ گئی۔ وہ اب بھی ایک ٹک میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سوال کی جھجھکی، مایوسی کا اندھیرا اور شکوک کے سائے لرزاں تھے۔ اس کے متورم اور زخمی ہونٹ کپکپاتے جیسے اس نے ہتھ کھٹا چاہا ہو مگر اس کے صق سے کوئی آواز نہ نکلی۔

"ظاہر شاہ کے ہاتھ پاؤں کھول دو۔" حشمت خان نے نیتے شخص کو حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور میں نے میدھے کھڑے ہو کر ہاتھ پیروں کے جوزوں پر ذرا سی مائش کرنے کے بعد حشمت خان کی طرف دیکھ کر مسکراتے کی کوشش کی تاکہ میری اندرونی کیفیات کا کوئی سراغ نہ مل سکے۔ پوزیشن اب بھی ایسی نہیں تھی کہ میں حرکت میں آسکا۔ میں قطعی طور پر اسٹین گنوں کی زد پر تھا اور جن آدمیوں کے ہاتھوں میں یہ گتھیں تھیں، میرے انداز سے کے مطابق اس قسم کی صورتحال میں ان کی یکسوئی، مستعدی اور سردمیری کی نظیر ملنی مشکل تھی۔ وہ کبھت آنکھ تک نہیں جھپک رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ میری ادراہی بھی خلاف توقع حرکت پر وہ مشینی انداز میں فار گریں گے۔

"ظاہر شاہ!" حشمت خان نے نہایت ملاحت سے مجھے مخاطب کیا۔ "مزید گفتگو سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تم گولی مار کر اس لڑکی کا قصہ تو پاک کر دو۔"

کئی نے گردن کو جھکے جھکے سے انداز میں حرکت دیتے ہوئے ایک نظر حشمت خان کو پھر ایک نظر میری طرف دیکھا۔ انداز میں شکستگی تھی۔ اس کے وجود میں گویا زندگی کی انگٹ مر گئی تھی۔

حشمت خان نے اپنے دیوان کے موٹے گدے سے ایک ریو اور نکالا اور میری طرف اچھا لٹے سے پیسے کہا۔ "میں نے تم پر اعتماد شروع کر دیا ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ تم اس ریو اور کا غلط استعمال کر سکو۔ نہایت محتاط رہنا اور ریو اور کو غلط سمت میں ذرا بھی حرکت دینے کی کوشش مت کرنا ورنہ خواتواہ ہی تمہاری قیمتی زندگی تن کی تن میں ضائع

ہو چکے تھے۔ اس نے ریو اور میری طرف اچھال دوڑتے ہیں سے نہایت احتیاط سے بچ کر لیا۔

"لیکن کیا آپ کی کوئی مراد ضروری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالہائے... لیکن تو اس بات کا ثبوت ہے کہ تم نے دفاعی تہیاریں کر لی ہیں۔" شہرت خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اور یہ کہ تم میرے ساتھ معاہدے میں سنجیدہ ہو، ہر اہم معاہدے میں آخر دیکھنے کے لیے سچوۃ ہو جاؤ گے۔"

"نہیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی" میں نے لاپرواہی سے کہا اور ریو اور سے کہنی کے سینے کا نشان سے دیا۔ میرے خیال میں آخری بداندیشہ کا اور کوئی موقع مجھے میسر نہیں آ سکتا تھا۔ اس لیے میں نے بھگت بن گھنٹوں کے میں گرتے ہوئے ریو اور کو قوس کی شکل میں گھیر لیا اور نشانہ لینے کا پونہ کوئی موقع ہی نہیں تھا اس لیے اندازاً شہرت خان کی طرف رخ کرتے ہی میں نے ٹیکہ دیا۔

دھماکہ ضرور ہوا۔ لیکن وہ میری تھوپڑی کے کسی حصے میں ہوا تھا۔ ریو اور سے محض ایک لمبی سی "ٹھک" کی آواز سنائی دی تھی۔ ریو اور خان تھا۔ دوسری کی آواز جو میں نے سنی وہ شہرت خان کی تھوپڑی لمبی کی تھی۔ "..... میں کی دیکھتا چاہتا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم سرسخت ہو لیکن میرے ساتھ نہیں مل سکتے۔"

شہرت خان اور اس کے مخالفین کا خیال یہ تھا کہ حیرت کے اس ہتھیار سے میرے اعصاب چند سنے کے لیے ضرور مختل ہو جائیں گے لیکن میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور میرا رخ گو کہ شہرت خان کی طرف تھا لیکن میں نے نیم راز سے میں گھومتے ہوئے خان ریو اور ایک اسٹین گن والے کے منہ پر دے مارا۔

اعشار یہ چار پانچ کا ریو اور خوب دہائی تھا۔ یقیناً ایک بڑے ہتھیار سے کی طرح اس کے منہ پر پڑا ہو گا۔ ریو اور پھینکتے ہی میں ٹھک کر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ کچھ میری اس حکمت عملی سے اور کچھ امداد بھی سے میں موت کے لیے دینے میں کامیاب ہو گیا۔ ہوا یہ کہ جس کے منہ پر ریو اور پڑا تھا وہ اندھوں کی طرح فوہڑا ہوا اسٹین گن اس کے ہاتھوں سے تکی طرح رہا۔ ساتھ ہی غالباً غیر ارادی طور پر اس سے ٹیکہ دیا گیا۔ اس وقت گن کا رخ اس کے اپنے ہی سامنے کی طرف ہو چکا تھا۔

ایک ہی برص میں وہ تھپکی ہو کر گر پڑا لیکن اس سے پہلے وہ زمین پر اس جگہ برص مار چکا تھا جس میں ایک غالی سے پہلے تک موجود تھا۔ چنانچہ فرش سے سینٹ کی تہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ابھی چھو ٹکڑے شاید مجھے بھی لگے تھے لیکن مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ میں نے تو لڑھکتے وقت سب سے پہلے دیکھا تھا کہ جس کے منہ پر ریو اور پڑا تھا وہ فرش پر گر چکا تھا۔ اسٹین گن اس کے ہاتھوں سے ہتھوت پڑی تھی۔

میں نے شخص جو کہنی کو مضبوط خائے سے لے آ رہا تھا اسٹین گن پر جھپٹا جیسے پانی میں غوطہ کھانے لگا ہو لیکن میں نے کہنی کے ہلے قدرے اوپر کو ہوتے ہوئے اس کے منہ پر پوری قوت سے ایسی ٹھوکر رسید کی کہ وہ رہنے کے گڈے کی طرح ہوا میں کئی فٹ اٹھلا اور اوندھے منہ چھپکی کی طرح پٹ سے فرش پر گرا۔

جس شخص کے چہرے پر ریو اور پڑا تھا اس کا آدھے سے زیادہ چہرہ مسخ ہو چکا تھا اور وہ بری طرح تڑپ رہا تھا جس کی وجہ سے غالباً اس کی آنکھوں میں آنکھیں تھیں۔ اس کی ایک آنکھ تو حلقے سے باہر ہی لٹک آئی تھی۔

میں نے جھپٹ کر اسٹین گن اٹھائی۔ اس سارے عمل میں بمشکل چند سیکنڈ صرف ہوئے تھے لیکن سب میں نے اسٹین گن سیدھی کرتے ہوئے پٹ کر دیکھا تو شہرت خان تخت سے غائب تھا۔ اس بالی نما کمرے سے بے خبر دو ہی راستے تھے۔ ایک وہ دروازہ بدھ سے کہنی کو لایا گیا تھا اور دوسرا قہ خائے کا دروازہ بدھ سے بچھا۔ یہ گیا تھا۔

اندرونی دروازے کی طرف تو وہ یقیناً نہیں گیا تھا ابھی تہ خائے سے باہر جانے والے دروازے کی طرف مجھے ریشمی چمکیے لہو سے کی ایک جھٹک نظر آئی ہو دوسرے ہی لمحے کہی واسے کی طرح مسدود ہو گئی۔ میں نے اپنے عقب میں کہنی کی کراہ سنی لیکن اس طرف توجہ دینے بغیر میں دروازے کی طرف بھاگا۔

راہداری کے موڑ تک پہنچنے سے پہلے مجھے آگے دروازہ دھڑ سے بند ہونے کی آواز آئی اور جب میں راہداری کا موڑ عبور کر کے آندھی طوفان کی طرح دوڑا تو اپنے ہی زور میں بند دروازے سے ٹکراتے ٹکراتے بھاگا۔ دروازے کی تاب گھٹکی تو وہ حسب توقع منتقل ہو چکا تھا۔ میں نے اسٹین گن سے صرف تھوڑی سی فاصلے میں اس کے اوپر گرد کا کچھ حصہ بھی اڑا کر رکھ دیا اور دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر باہر کو لپکا ہی تھا کہ چھٹی جس کی مستعدی نے مجھے گھنٹوں کے بل جھٹکے پر مجبور کر دیا۔

اگر ایسا کرتے میں مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میری تھوپڑی میں سورج ہو چکا ہوتا۔ پچھلے چند سیکنڈ کی کشمکش شاید میری زندگی کی تیز ترین سرحد آرائی تھی جس میں موت کئی بار مجھے چھو کر گزر چکی تھی۔ وہ کم بخت شہرت خان بھی ڈائی کائی نہیں لائی تھی سرحد آرائی کا بھی باہر معبود ہوتا تھا۔

اس کے پاس ریو اور غالباً اس وقت موجود تھا جب میں اس کی طرف سے ہاتھوں تھا لیکن اس وقت یہ تو وہ ریو اور بروقت نکلا نہیں گیا تھا یا پھر اس نے خطرہ مول نہیں لیا تھا کہ اگر میں یہی کرتا تو اس سے بچ گیا اور اس دوران اسٹین گن میرے ہاتھ میں آتی تو اس کی موت یقینی ہوگی۔ اس نے پہلے محفوظ جگہ پر پہنچنا چاہی ہتھیار کھمبے کے عین اعلیٰ پہلے مورچہ بند ہونا ضروری سمجھا تھا اور بدشہ یہ ایک شاندار تعیناتی حال بھی تھی کہ جب میں

یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ جان بچنے کے لیے اندھا دھند بھاگا جا رہا ہے اور دروازہ قفل اس کے بعد جلد از جلد زیادہ سے زیادہ دور نکل جائے گی کہ شش کرے گا اس وقت وہ باہر سے اس کے بالائی کتب پر چھپ میرے نکلے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تو شاید اس کے ہاتھ کی خفیف سی حرکت ہی جس نے میری غیر معمولی چھٹی حس کو بروقت مرتعش کر دیا تھا۔

حشمت خان نے دوسرا کانز نہیں کیا اور میں نے اس کے قدموں کی دھمک دور تک بٹنے محسوس کی، تب میں اٹھا اور ایک بار پھر اس کے تعاقب میں دوڑا بیڑھیاں چڑھ کر اتر اوپر آیا تو میں نے اپنے تپ کو ایک عویں و عریض ہالی میں پانے کا فرش کسی چلتے پتھر کا بنا ہوا معبوم ہوتا تھا در طبعی روشنی میں جھلکا رہا تھا۔ اس ہالی میں قرینچر وغیرہ کچھ نہیں تھا لیکن چاروں طرف بھاری بھاری پردے لٹھے ہوئے تھے۔ طبیعت تھا کہ یہ پردے فرش سے کافی اونچے تھے اس لیے میں کسی ہی نظر میں یہ بانزدہ لینے میں کامیاب ہو گیا کہ ان کے پیچھے حشمت خان نے پناہ نہیں لی تھی۔

اس ہالی سے گزر کر میں دوسرے کمرے میں پہنچا تو یک لخت ہی جیسے کم کمرے تالاب میں کود گیا اور میرے چوتوں تلے کچھ نرم نرم چیزیں بچھ گئیں۔ غیر ارادی طور پر میں اچھل کر والیں دلیز پر چڑھ گیا اور غور سے لمبی روشنی میں دیکھنے لگا۔ اس کمرے اور طویل و عریض کمرے کے وسط میں گویا ایک اور ہی کمرہ کھڑا تھا جس کی دیواروں اور بھت کا بیشتر حصہ شیشے اور گزنی کے ٹکڑوں پر مشتمل تھا۔

اس حصے کے اندر کا منظر انسان کی جلد سے سرسراہٹ پیدا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ شیشے اور گزنی کے اس کمرے کا صندوق میں لاتعداد چھوٹے بڑے سانپ، بکھو اور دیگر زہریلے کیڑے مکوڑے ایک دوسرے کے اوپر بیٹھے رنگ رہے تھے۔ یہی نہیں ایک طرف کچھ انسانی کھڑکیاں اور بڑیاں بھی دی کی نظر آ رہی تھیں۔ کوئی ناش شاید ابھی کھٹے سرنے کے عمل سے گزر رہی تھی کیونکہ ٹھنڈے کا احساس ہو رہا تھا۔ حالانکہ صندوق نما حصے کا دروازہ کھلا نہیں تھا، صرف اس کا ایک کونا ٹوٹا ہوا نظر آ رہا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ بھت سے سینٹ کے کچھ بڑے بڑے ٹکڑے عرصہ ہو کر اس پر گر پڑے تھے۔

اس فلکست گوسٹے ہی سے کچھ سانپ وغیرہ نکل کر اور دروازے کے حصے میں بھی پھنس گئے۔ اور اسی دروازے کی طرف ان جمع ہوئے تھے جس سے میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ اونچی چڑھ کر ہل نما کمرے میں تنے کے بے کوشاں تھے مگر فی الحال انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

اس کمرے سے گرسے ہوئے سینٹ سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں مکان کے اس حصے کے قریب ہی تھا جس پر میں نے ہم پہنچا تھا۔ اس کمرے میں کوئی اور دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا تو پھر حشمت خان کدھ گیا تھا میں نے قدرے حیرت سے سوچا اور واپس ہالی میں آیا۔

میں نے تیزی سے پردے ہٹا ہٹا کر دیکھا۔ ایک پردے کے عقب میں بڑی سی کھڑکی کھلی تھی اور یہ کھڑکی ایک مدمر شدہ کمرے میں کھلی تھی جس کا بلے کا ڈھیر کچھ اگے تک پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اپنے جھانک لگائی اور بلے کے انہار پر پہنچ کر چاروں طرف دیکھا۔

دھندلی چاندنی میں بہت دور ایک بیڑھ بیٹھی تھی سے حرارت کرتا نظر آیا۔ ویسے تو اسے پہچانا شاید ممکن نہ ہو تا لیکن اس کا لمبا چوڑا لہاؤ جس طرح ہوا میں ہرا رہا تھا اس کی وجہ سے میں نے یہ آسانی پہچان لیا کہ وہ حشمت خان ہی تھا۔ اس کی رفتار حیران کن تھی

زمین پر تو اس کے قدم گویا پڑ ہی نہیں رہے تھے اور وہ چھ اوپر ہی اوپر اڑا جا رہا تھا اس کا سر جھگ کی طرف تھا جس کی لمبائی چوڑائی کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا اور اگر ایک بار حشمت خان جھگ میں داخل ہو جاتا تو پھر میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اکیلا اسے تلاشی کر لوں گا۔ سستی کی بہت میں کہیں دور سے ہوا کے دوش پر مجھے اجتماعی نعرے بازی کی آوازیں دھن دھن سے سنائی دے رہی تھیں۔ سینڈریلا اپنی حرکت عمل کے مطابق اپنی بگڑی ہوئی بازی سنوارنے میں مصروف تھی یا شاید وہ اپنا کام مکمل کر چکی تھی۔ حشمت خان کا معاملہ شاید اس نے کمزور طور پر مجھ پر بھروسہ کیا تھا۔ شاید اس کا خیال یہی رہا ہو کہ اس ضمن میں مجھے کسی کمک کی ضرورت نہیں تھی۔ کمک کی ضرورت تو واقعی مجھے نہیں تھی لیکن اس علاقے میں اجنبی ہوتا قدم قدم پر میرے اڑتے آ رہا تھا۔

میں نے اپنی توانائی مجتمع کی اور حشمت خان کے پیچھے دوڑا۔ جھگ میں پہنچ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ اس مقام پر جھگ اس سے بھی کم گھٹا تھا جہاں میں ایک مرتبہ داخل ہو چکا تھا تاہم حشمت خان نہ جانے کس طرف کو نکل چکا تھا اور مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ایک چیز میری رہنمائی کر رہی تھی اور وہ تھی پرندوں کی آواز۔

حشمت خان کو کہہ دینا نہیں تھا نہ ہی وہ کوئی آواز نکال رہا تھا اور نہ ہی درختوں پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پردے اپنے آرام کے وقت کسی کی بھی بھاگ دوڑ پسند نہیں کرتے اور فوراً ہی شور شرابا یا کم از کم پھل چاں ضرور شروع کر دیتے ہیں۔ یہی آوازیں مجھے بتا رہی تھیں کہ حشمت خان کدھ کر کدھ کر سے گزر رہا ہے اور میں اوھر ہی بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک عاود درخت کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک ہی میں کسی سے بغل گیر ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اگر اچانک ہی میں نے کسی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی مشینی انداز میں اپنے آپ کو نہ روک لیا ہوتا تو میں یقیناً میدان اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں پہنچ جاتا۔ وہ ایک نہایت جسیم رچھ تھا وہ موٹے تنے کے پیچھے نہایت مکارانہ انداز میں چھپا ہوا انجیل دونوں ٹانگوں پر کھڑا تھا۔

یہ یقیناً انہیں درندوں میں سے ایک تھا جن کا ذکر میں نے سینڈریلا کے مکان پر مشورہ

خان کی لڑائی سنا تھا اور جن میں سے ایک آدھ پکے ہی میرے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ رہنچہ یقیناً یہ بھی سدھایا ہوا ہی تھا ورنہ حشمت خان بھی ادھر سے گزرا تھا اسے بھی اس نے روکنے کی کوشش کی ہوتی۔

رہنچہ نے دیکھ کر میں اس کے بازوؤں کے حلقے میں پھنسنے سے بال بال بچ گیا ہوں تو فوراً مجھ پر جھپٹا لیکن اس کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے اسٹین گن کی گولیوں اس کے جسم سے پار ہو چکی تھیں آدھ چاروں شانے چپے گر پڑا۔ اس کے گرنے سے زمین میں خاصی دھجک پیدا ہوئی۔ اس کے چاروں ہاتھ پاؤں اتنی ہی کیفیت میں نیک دوسرے سے آں ملے اور وہ ٹھکری کی بن گیا لیکن دوسرے ہی لمحے ڈھیلا پڑ گیا۔

گوشت کے اس چھوٹے سے پوڑے کے یہ خون کا تالاب بہنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے اسے پھلانگا اور آگے بڑھا لیکن کھٹک مجھے رک جاتا پڑا۔ پرندوں کی آواز میں جو میری رہنمائی کر رہی تھیں، کھٹک ہی کھٹک چلی تھیں۔ پورے جنگل میں ایسا اعصاب شکن سکوت چھا گیا جیسے میلوں دور تک کوئی ذی روح موجود ہی نہیں ہے۔ دراصل رات کے وقت اسٹین گن کی توتڑاہٹ اس مقام پر کچھ زیادہ ہی خوفناک محسوس ہوئی تھی اور پرندوں نے دم سادھ لیا تھا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیے۔

حشمت خان نے خود ہی میری مشکل آسان کر دی۔ وہ کھنٹ کچھ ہی آگے کسی درخت کے عقب میں پھپھا ہوا تھا۔ اسے امید رہی ہوئی کہ میں رہنچہ کے قتلے میں ضرور آ جاؤں گا اور مجھے ہلاک کرنے میں رہنچہ کو اگر کوئی دقت پیش آئی تو وہ اس کا ہاتھ توڑنا سے کچھ نہیں مجھے موت سے بچتے رہے اس نے ایک اور گولی داؤ پر لگا دی تھی۔ یہ گولی شاید زمین کی سطح سے چھین کر لے گئی ہوتی لیکن ایک تو شاید روشنی کی کمی اور دوسرے راہ میں کسی نہ کسی زاویے سے کوئی نہ کوئی درخت حائل ہونے کی وجہ سے میں بچ گیا۔ یا پھر شاید یہ وجہ بھی نہیں تھی وجہ صرف اتنی ہی تھی کہ نیل چھتری والے نے ابھی میری زندگی اپنی امان میں رکھنے سے ہاتھ نہیں کھینچی تھی۔

شک جنوں اور ٹھنیوں کی چڑچڑاہٹ نے مجھے بتا دیا کہ حشمت خان ایک بار پھر دوڑ پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پاس ریواور کی فاضل گولیاں نہیں تھیں اس لیے وہ انہیں پانی اشیاء سے استعمال کر رہا تھا لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ چاہا کھانا چاہتا تھا وہ اتنا احمق تو نہیں ہو سکتا کہ مجھے تنہا مارنے کے ارادے سے دوڑتا رہتا۔ اگر وہ وادی سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتا تھا تو اسے گیٹ کی طرف جانا چاہیے تھا کیونکہ میری مصیبت کے مطابق وادی میں داخل ہونے پر نکلنے کا وہی ایک راستہ تھا یا پھر کوئی اور بھی خفیہ راستہ رہ ہوگا جس کا علم صرف حشمت خان کو ہی ہوگا۔

بہر حال اب میں اس کا سراغ پا چکا تھا۔ ایک جگہ رک کر میں نے اس پر فائرنگ بھی

کی لیکن درخت آگے آئے۔ قریب پہنچے بغیر فائرنگ کا گولی فائر نہیں تھا۔ پھر اچانک بن درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور چاندنی بلا رکاوٹ زمین تک پہنچی دکھائی دیتے تھے لیکن روشنی کا سلسلہ بند ہوتے ہی حشمت خان مجھے صرف ٹھہر جانے کے بجائے الٹا میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

میں جب اس مقام پر پہنچا جہاں وہ میری نظروں سے غائب ہوا تھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل تشیب میں اتر گیا تھا وہاں سے ایک ٹھک سا ٹھک مارا شریع ہو رہا تھا جو میں نے کھانا نہ جانے کہاں تک جا رہا تھا اور جس کی گہرائی شریع پرستی تھی۔ میں بھی اس ٹھکے میں اتر گیا اور چند ہی قدم میں اسے قد سے بھی زیادہ گہرائی میں چلا گیا تاہم میں ہر فنون تیز رفتاری سے دوڑنے کے باوجود کنبھے رہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک ہی کہیں کسی گڑھے یا کھائی میں نہ جا گروں۔

حشمت خان مجھے اب بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ خدق نما اس نے میں سے کچھ بہت زیادہ تھے اور وہ مجھ سے کافی آگے تھا۔ اس کے راستے میں نہ جانے کتنے موڑ حائل تھے۔ اس ٹھکے میں میرے اندازے کے مطابق میں کم از کم ایک مہینے کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اس کی گہرائی بتدریج کم ہونے لگی تھی اور پھر اچانک ہی میں ٹھکے سے نکل آیا۔



Scanned By:

Azam & Ali

میں نے اپنے آپ کو ایک اتنی ناموار چٹان پر پایا تو زیادہ بلند نہیں تھی اور کچھ آگے اس پر ایک افقی اور صحیح چٹان نے یوں سایہ نیا ہوا تھا جیسے قدرت نے کسی خاص مقصد سے وہاں چھپرے بن دیے ہو۔

اس قدرتی چھپرے کے نیچے بہت کی طرز کا ایک بڑا برا مکان سمجھائی جھانپوں میں گھرا کھڑا تھا۔ مکاری کے بڑے بڑے تختوں، بائیس اور گھاس پھوس سے بنا ہوا یہ مکان بظاہر متروک نظر آتا تھا لیکن اس کا دروازہ شاید کھلا ہی تھا کیونکہ میں نے اس وقت حشمت خان کو دروازے پر کھینچے دیکھا تھا۔ جب میں اسے سے نکلا اور دوسرے ہی لمحے وہ دروازے کو کھلیں ہوا غائب ہو چکا تھا۔ مکان کے اندر بھی ہوئی تاریکی نے جیسے اسے اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے مکان میں روشنی پھیلانی دیکھی۔

میں مکان تک پہنچا تو دروازہ چوڑھٹ کھلا تھا اور گویا میرا ہی انتظار کر رہا تھا لیکن میں اب اتنا بے سہرا نہیں تھا کہ میرا اندر گھسنا چلا جاتا۔ ایک طرف کو ہٹ کر میں نے من گھڑی اپنے کی ہوشیاری کی لکھن مکان پر یوں ملانا چھایا ہوا تھا جیسے اندر کوئی ڈی روم موجود نہ ہو۔

دروازے اس قسم کے تھے کہ اگر ان کی اوٹ میں کوئی چھپا ہوتا تو مجھے پتا چلتا۔ باہر میں سے پرچی دروازے کے پٹوں پر اور اندر لگا تار گولیاں برسائیں۔ ایک پٹ کے پشتر حصے کے قریب ہی اوڑھنے۔ قزلبک کا تسلسل روکے بغیر ہی میں نے اندر چھلانگ لگا دی اور پاؤں زمین پر گرتے ہی غم و غصے کی صورت میں ٹھوکتے ہوئے ایک پرست مارا حالانکہ مجھے انداز میں ہو گیا تھا کہ وہاں کوئی موجود نہیں ہے۔

ایک صبر ایک مستقبل کمرے سے مشابہ تھا لیکن اس میں شگ گھاس کے گھٹوں کے ساتھ نہیں تھا۔ ساتھ مکاری کے گھٹوں سے بنی ہوئی ایک دیوار میں ایک اور دروازہ نظر آیا۔ وہ بھی نیم وا تھا۔ میں نے غور سے اسے کھولا اور اندھا دھند اندر بھی گولیاں برسائیں۔ اندر میں ہوا نہ تھی۔ یہ پتہ کر کے ہی بہت بھونکا تھا لیکن راست اس کی بھی وہی گولی آوی گھاس پھوس کا گھر ہوا۔ اندر کی طرف ایک فرق تھا کہ یہاں ایک تخت موجود تھا۔ اس پر گلو علی لگا ہوا تھا۔ چند گولیوں اس کو قتلے میں بھی پرست ہوئی تھیں۔

اس کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا اس سے گزر کر میں چھوٹے سے صحن نما ایک حصے میں جا پہنچا جہاں ایک طرف دو کھین سے بنے ہوئے تھے جن سے غالباً کبھی کبھی کچن اور ہاتھ روم کا کام لیا جاتا تھا۔ اس حصے پر چھت نہیں تھی لیکن اس کی چوڑی دیواریں بھی باقی حصے کی دیواروں جتنی ہی بلند تھیں اور اتنی ہی تخت جگہ میں کسی شخص کا چھلانگ لگا کر ان میں سے کسی بھی طرف کی دیوار کو پار کر جانا ناممکن ہی تھا۔ ان دیواروں میں کئی دروازہ نہیں تھا۔

گویا مکان میں داخل ہونے اور نکلنے کا وہی ایک دروازہ تھا جس سے میں نے حشمت خان کو اندر آتے دیکھا تھا اور جس سے میں خود بھی اندر آیا تھا لیکن اب یہاں کیسے وہ نظر نہیں آ رہا تھا تو پھر آخر وہ کہاں گیا؟

اگر وہ گھاس پھوس کے گھٹوں یا کسی انبار تلے چھپا ہوتا تو اتنی دیر میں یقیناً اسے ایسے مواقع میسر آچکے تھے کہ وہ مجھے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ امکان تو یہی نظر آتا تھا کہ اس کے دیواروں میں گولیاں موجود تھیں، تاہم یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھ پر گولی چلانے کا موقع پانے سے پیشتر ہی اسٹین گن کی گولی کا نشانہ بن گیا ہو اور اس وقت مرہہ حالت میں گھاس پھوس کے ڈھیر تلے ہی کہیں پڑا ہو۔

یہی سوچ کر میں نے چھوٹے کمرے میں آکر گھاس پھوس اور کانٹھ کباڑ کے انبار اسٹین گن کی مال سے اٹھنے پھٹنے شروع کیے اور پھر میری آنکھیں چند لمحے کے لیے تو کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ گھاس پھوس تو کمرے ہی تھا، ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کی تین اونچی اونچی بیلیوں رکھی نظر آ رہی تھیں جن میں بھاری بھاری تانے جمول رہے تھے۔ بلاشبہ یہ اسٹین کی بیلیاں تھیں۔ ان پر ان ہتھیاروں کی مرادست وغیرہ کی تفصیل لکھی نظر آ رہی تھی۔

زیادہ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے دوسری دیوار کے ساتھ گئے ہوئے گھاس پھوس کے انباروں کو کریدا۔ ان کے نیچے مجھے کیوں کے تین خاتہ بڑے بڑے تھیلے نظر آئے جو بالکل اس انداز میں کھلے رکھے تھے جس طرح تانے والے بیچنے والے دکانداروں کی بوریاں تھڑوں پر رکھی ہوتی ہیں۔ فرق یہ تھا کہ ان میں آٹا، دال یا مرچیں وغیرہ نہیں تھیں۔

ان میں سے ایک تھیلے میں تو نوٹوں کی گڈیاں بھری نظر آ رہی تھیں۔ اوپر جو گڈیاں نظر آ رہی تھیں وہ سب کی سب سو سو کے امریکی ڈالروں کے نوٹوں کی تھیں، باقی بھی غالباً یہی تھیں۔ دوسرے تھیلے میں ہیرے بھرے ہوئے تھے۔ جی ہاں ہیرے، چھوٹے بڑے جھجک جھجک کرتے ہیرے جن کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں۔ تیسرے تھیلے میں سونے کے مختلف نئے اور پرانے زیورات کانٹھ کباڑ کی طرح بھرے ہوئے تھے۔

یہ نظارہ مجھ جیسے انسان کو بھی حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ ایسا بیش بہا خزانہ اس

خلاف توقع میں زیادہ گہرائی میں نہیں گرا۔ جلد ہی میرے پاؤں زمین سے ٹکے لیکن زمین نرم اور بھرپوری تھی۔ میں تقریباً تھنوں تک دھنسل گیا۔ اسٹین مین میرے ہاتھ سے جھوٹ گئی لیکن میں نے ہڑبڑا کر فوراً ہی اوپر اڑھرا ہاتھ مار کر اسے تلاش کر لیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہاں حشمت خان میری گھات میں نہ بیٹھ ہو لیکن کافی لمبے تک کسی بھی طرف سے کوئی مجھ پر حملہ آور نہ ہوا اور نہ ہی کوئی چلنے کا دھماکہ گونجا۔ تب میں نے قدرے دور آزمائی کے بعد پاؤں مٹی سے نکالے اور سمجھل کر کچھ آگے بڑھا۔

اب پاؤں مٹی میں نہیں دھنسل رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سرنگ نما ایک راستہ تھا لیکن وہاں اتنا گہرا اندھیرا بھی نہیں تھا جتنا مجھے محسوس ہوا تھا شاید اوپر کمرے کی طرف سے روشنی کا کچھ انعکاس ہو رہا تھا۔ آس پاس جب مجھے کسی کی موجودگی کے شمار نظر نہ آئے تو میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ آگے یہ سرنگ بالکل گہرا لائن سے مشابہ ہو چکی تھی اور میں ہاتھ بند کر کے اس کی چھت کو چھو سکتا تھا۔

شاید یہ کوئی طویل عمارت تھی جس کے سرے پر غائب کسی طرح نکاسی کا راستہ بنا دیا تھا اور شاید اس عمارت کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر اس کے دبانے پر جھوپڑی نما مکان بنائے گئے تھے۔ جوں جوں میں بڑھتا گیا اندھیرا گہرا ہوتا گیا حتیٰ کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی دینا ممکن نہ رہا۔ میں حیران تھا کہ حشمت خان نے اب تک قرشتہ اجڑ بن کر میرا استقبال کیوں نہیں کیا تھا۔ یہ تاریک سرنگ اس کی تو دیکھی ہو چکی تھی۔ یہاں پھسپ کر کسی اجنبی کو گولی کا نشانہ بنانا تو بے حد آسان تھا لیکن شاید اس وقت اس کے سر میں صرف فرار کا سودا سلا ہوا تھا اور شاید وہ مجھ سے اس حد تک خوفزدہ بھی ہو چکا تھا کہ اب مزید خطرہ منوں لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس سرنگ میں سفر دیر تک جاری رہا۔ سمت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بس سرنگ کی طوالت کا احساس تھا اور مجھے بلاسہلفہ یہ اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں اسی طرح چلتا رہا تو کسی دوسرے ہی ملک میں نہ جا سکوں۔

خدا خدا کر کے اس سرنگ کا دہانہ نظر آیا اور تب احساس ہوا کہ پیچیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ چاند نجانے کہاں جا چھپا تھا لیکن صبح کی روشنی دھیرے دھیرے کائنات کو آغوش میں لے رہی تھی۔ میں جب عین سرنگ کے دبانے کے قریب پہنچا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں صدیوں بحر طلمات کی تہ میں پڑا رہنے کے بعد اپنی دنیا کی طرف لوٹنے لگا ہوں۔

میں دبانے سے دو تین قدم ہی کے فاصلے پر تھا جب اچانک ہی میرے دائیں ہاتھ پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں اس وقت ہوش مسرت میں زمین کی طرف تو دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ میرے ہاتھ پر دونوں طرف سے بہت شدید چوٹ لگی تھی اور اگر میں اس وقت موٹے چمڑے اور فرکی پوشش والے گتھوں سے اوپچے ہوتے نہ پڑتا تو شاید میرا سترہ علیحدہ ہی

دور افتادہ مقام پر اس عالم میں کیوں رکھا ہوا تھا؟ کیا حشمت خان کو ان لوگوں، ان ہیروں اور ان پیش جست زیورات کے لیے ڈھنگ کے صنوبری وغیرہ بھی میسر نہیں تھے؟ آخر انہیں یوں آئے داس کی طرح رکھنے میں کیا مصلحت پوشیدہ تھی جبکہ یہ کسی قسم کی درویشی کا اظہار بھی نہیں تھا۔ حشمت خان کی یہ زندگی ہی حصولِ زر کے لیے وقف تھی۔ دولت ہی اس کی زندگی کا محور و مرکز تھی۔

ایک حیران کن مسئلہ یہ بھی تھا کہ کرنسی امریکی تھی اور اسلحہ چینی۔ ان دونوں ان دونوں طاقتوں میں جغرافیائی طور پر ہی نہیں تعلقات کے لحاظ سے بھی بعد المشرقین تھا۔

دفعاً میں نے ان سب سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور ایک بار حشمت خان کے حعلق سوچا۔ آخر وہ کہاں غائب ہو گیا تھا؟ اس کا یہاں آنے کا مقصد صرف اتنا ہی تو نہیں تھا کہ میں اس پیش ہما خزانے کو دیکھ کر ششدر رہ جاؤں، باقی ہر چیز کو بھول جاؤں اور وہ جس خفیہ راستے پر گامزن تھا اس پر زیادہ سے زیادہ دور نکل جائے؟

میں نے بڑے کمرے میں پہنچ کر تیزی سے وہاں موجود گھس پھوس کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے کچھ موجود نہیں تھا۔ میں متوجش و پریشان تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں رہا تھا کہ کیا کروں۔ وہ حشمت خان جس کے لیے ساری معوبتیں برداشت کی تھیں اور بیماری کیلئے کو اتنی لذتوں میں ڈالا تھا۔ جس بیماری کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا، وہی حشمت خان اب یوں آخری مرحلے میں تھیں مچھلی کی طرح میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

مجھ پر دیوانگی کی طاری ہونے لگی۔ میں ایک بار پھر صحن نما حصے میں جانے کے ارادے سے چھوٹے کمرے میں آیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں کی ہر چیز کو تھس تھس کر دوں مگر وہاں تھا ہی کیا؟ کڑی کا ایک تخت اور گردن کھدائی۔ میں نے لات مار کر گلاؤں کیے کو دور پھینک دیا اور تخت کے پیچھے ہوتے کی نوک لگا کر اسے بھی الٹ کر دور پھینک دیا۔

پھر میں بھونٹاتے سے انداز میں عقبی دروازے کی طرف بڑھا اور فرش کے اس حصے پر سے گزرا جس پر ایک لمبے پہلے تک تخت بچھا ہوا تھا اور جہاں فرش کے بیشتر حصے کی طرح خشک گھس کی تہ ہی چھپی ہوئی تھی۔ اس لمبے مجھے احساس ہوا کہ وہ تہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی نظر آ رہی تھی لیکن جب تک مجھے احساس ہوا تب تک تاخیر ہو چکی تھی۔ مجھ پر گویا پاتال کا دروازہ کھل چکا تھا اور میں تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔

گھس کی وہ تہ بٹا کر یقیناً مجھ سے پہلے بھی کوئی نیچے چھلانگ لگا چکا تھا جو یقیناً حشمت خان ہی تھا مگر وہ اس راستے کی حقیقت سے واقف تھا، دیکھ بھال کر سینٹے، طریقے سے کودا ہوگا۔ میں تو انجانے میں ہی گویا گڑھے میں آگرا تھا۔ بہر حال اب یہ سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

ہو جاتا یا پھر ہڈی ٹوٹ جاتی۔ ایک لمحے کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سرنگ کے دبانے سے جس چاند کی مجھے جھلک نظر آئی تھی وہ ان گنت نیلے پیلے اجڑوں میں تبدیل ہو گئی۔

عاقبت ہی رہی کہ دوسرے ہی لمحے میں منجھل گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرا پاؤں ایک نہایت مضبوط آہنی ٹکڑے میں پھنس چکا تھا۔ میں نے بہت زور لگایا لیکن سوائے ٹانگ کی ہڈی کو تکلیف پہنچانے کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ تب اچانک ہی حشمت خان کے زوردار قہقہے نے فضا کے سکوت کو مرتعش کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے قدموں ہی میں کھینچے ہوئے تھے۔ میں نے قدرے وحشت زدہ ہو کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ میں جوں پہنچ چکا تھا وہ اب اندھیرا اتار کر انیس تھا کہ میں نیچے کا منظر نہ دیکھ سکتا۔

میرے قدموں میں سوائے ٹکڑے کے کچھ نہیں تھا۔ ٹکڑے نہایت سادہ سا لیکن بے حد مضبوط اور سخت تھا۔ سرنگ کی زمین جو ابتدائے میں بالکل پتی تھی بتدریج سخت ہوتی گئی تھی اور یہاں پہنچنے تک تقریباً پتھری ہو چکی تھی۔ ٹکڑے دراصل اس زمین میں پیوست تھا۔

”اس ٹکڑے میں زور آزمائی بے کار ہے ظاہر شاہ!“ حشمت خان کی آواز آئی۔ ”یہ ایک شیر کو بھی قابو میں رکھنے کے لیے کافی ہے اور اس کی چالی صرف میرے پاس ہے۔ اب تم اسٹین گن سرنگ سے باہر پھینک دو کیونکہ اس وقت تم میرے دیوار کی زد پر ہو گے کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔“

جواباً میں نے سکوت اختیار کیے رکھا۔ ایک دھماکہ ہوا اور گولی میرے کندھے پر سے میری اس دبیز آبی جیکٹ کو چھوتی ہوئی گزر گئی جو میں نے ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص کے اوپر پہن رکھی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میں اب بھی دھماکے کی سمت متعین نہیں کر پایا تھا۔ سرنگ میں دھماکے سے پیدا ہونے والی گونج نے میرے لیے کوئی اندازہ قائم کرنا ناممکن بنا دیا تھا۔

”یہ گولی تمہاری گردن سے بھی گزر سکتی تھی۔“ حشمت خان کی آواز آئی۔ ”مگر میں تمہیں اتنی آسان موت مارنا نہیں چاہتا۔ ایسا میں صرف انتہائی مجبوری کی حالت میں کروں گا۔ اسٹین گن پھینک دو۔“

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور بالاخر اسٹین گن سرنگ سے باہر اپنی دسترس سے دور پھینک دی۔ میں نے روشنی میں اسے زمین پر گرتے اور پھر نشیب کی طرف پھسلتے ہوئے دیکھا جہاں آخر وہ میری نظر کی رسائی سے دور ہو گئی کیونکہ سرنگ کا یہ حصہ بتدریج اونچا ہو رہا تھا جبکہ دبانے سے آگے زمین غالباً نشیبی تھی۔ تاہم میں نے کسی کو اسٹین گن اٹھانے کے لیے بڑھتے نہیں دیکھا۔

”بہت خوب۔“ میں نے حشمت خان کی آواز سنی۔ ”مجھے تمہاری اسٹین گن کی

ضرورت نہیں تھی ظاہر شاہ..... اور ہاں..... فی الحال میں تمہیں ظاہر شاہ ہی کے نام سے مخاطب کر رہا ہوں گو کہ مجھے یقین ہے کہ یہ تمہارا اصل نام نہیں ہے..... اسٹین گن میں نے تم سے اس لیے پھینکا وہی ہے کہ میں پھنستے رہ کر جب تم دو تین دن تک بھوک پیاس میں بسر کرو گے تو تمہارا خود کشی کرنے کو جی چاہے گئے گا لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم اسٹین گن کی مدد سے اپنی موت کو آسان بنا دو۔ میری خواہش ہے کہ تم جتنا زیادہ طاقت کے زعم میں رہتا ہو اتنا ہی بے بسی سے سبک سبک کر دو اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو۔ طاقتور آدمی کو گولی مار دینا اس کے لیے بہت بڑی سزا نہیں ہے۔ کاش میں تمہیں چوبے دان میں پھنسنے ہوئے چوبے کی سی موت مرتے دیکھ سکتا لیکن المیوں کہ تم نے وادی میں میرا رہنا ممکن نہیں رہتے دیا..... میں اپنا خزانہ بھی جلد ہی اپنے اصل ٹھکانے پر منتقل کرنے والا تھا لیکن تم نے میرے تمام پروگرام تہہ و بالا کر دیئے۔ سرخاں..... وادی والوں کو تو وہ خزانہ نہیں مل سکتا۔ میں تین چار دن بعد پھر آؤں گا اور اسی خفیہ راستے سے گزر کر وادی کے حالات کا جائزہ لینے جاؤں گا۔ ممکن ہے میں وادی پر دوبارہ قبضہ کر لوں ورنہ واپسی پر اپنا خزانہ تو لیتا ہی جاؤں گا۔ اس وقت تک تو امید ہے کہ میں تمہاری لاش ہی پھونگ کر گزر دوں گا اور اگر اس وقت تک تم زندہ رہے تب بھی تمہاری حالت لاش سے بدتر ہی ہوگی اور تمہیں نہو کر مار کر گزر دینا پر لطف عمل ہو گا..... اچھا خدا حافظ!“

تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ کہاں چھپا ہوا تھا۔ مجھ سے چند ہی فٹ آگے سرنگ کی چھت میں غالباً کوئی کھوکھری موجود تھی جس میں وہ سٹایا ہوا تھا۔ وہاں سے اس نے چھلانگ لگائی تو میں سرنگ کے دبانے پر جا پہنچا۔ وہ میرے سامنے کھڑا تھا مگر میں اسے چھو نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک بار پھر استغاثہ سے انداز میں ہنسا اور مرکز اطمینان سے چل دیا۔ کچھ دیر تک وہ مجھے نظر آ رہا لیکن چونکہ وہ بتدریج نشیب کی طرف جا رہا تھا اس لیے رفتہ رفتہ غائب ہو گیا۔ میں سینے کے بل لیٹ گیا۔ اس طرح میرا سر دھانے کے لیے حد قریب پہنچ گیا اور میں باہر دور تک کا منظر دیکھنے کے قابل ہو گیا۔

نشیب میں ایک بڑھئی مسطح میدان نظر آ رہا تھا جس کے ارد گرد نہایت خوبصورت درخت گھیرا ڈالے کھڑے تھے اور جس چیز کو دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا وہ سرخ اور سفید بیجوں والا ایک نہایت خوبصورت ایسی کاہڑ تھا جو اس میدان میں کھڑا تھا۔ یہ مقام گویا ایک الگ ہی پھوٹی سی وادی سے مشابہ تھا۔ چاروں طرف چھوٹی چھوٹی چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور جلی کا پڑ گویا ایک پیاسے کے پینڈے میں کھڑا تھا۔

حشمت خان نہایت اطمینان سے اس جلی کا پڑ کی طرف جا رہا تھا اور اس قدر مطمئن اور بے فکر نظر آ رہا تھا کہ اس نے راستے میں رک کر اسٹین گن بھی اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میری کند گویا سب بام آکر ٹوٹ گئی تھی۔ شکار تقریباً ہاتھ میں آنے

سے اس پر برست مارا لیکن یہ اسٹین گن سے نکلنے والی گولیوں کی آخری بوچھاڑ تھی کیونکہ اس کا میگزین ختم ہو چکا تھا۔ میں نے کئی بار ٹریگر دبائے کے بعد جھنجھلا کر اسے ایک طرف پھینک دیا۔

پند گولیاں شاید پہلی کاپڑ کے پیچھے حصے پر لگی تھیں لیکن اسے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا۔ کاک پٹ میں بیٹھ ہوا حشمت خان مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے شیشے کے بلبہ نما حصے میں اس کا سر گھومتا نظر آیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے پہلی کاپڑ ہوا میں بلند ہو گیا۔

کچھ بلندی پر پہنچ کر اس نے پھولا سا لہجہ میں دھڑکتے ہوئے مزید بلندی پر پہنچ کر ایک طرف کو پرواز کرنے لگا۔ میں وہیں ہلکا سا ہاتھ مل رہا تھا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ گزراہٹ کی ایک اور آواز سے میں حشمت خان ہی کے پہلی کاپڑ کی آواز سمجھ رہا تھا۔ اب ایک ٹانگہ دینے لگی تھی اور قریب آتی جا رہی تھی۔

میں نے آواز کی سمت سر گھمایا۔ ایک اور پھوٹا سا سفید پہلی کاپڑ جس کے پہلو پر بڑا سا نیلا دائرہ چمک رہا تھا تیزی سے اسی طرف آ رہا تھا۔ میں تذبذب کے عالم میں اسے قریب آتے اور پھر میدان میں اترتے دیکھنے لگا۔ قسمت میرے ساتھ عجیب آنکھ بھونکی سی کر رہی تھی۔ ایک لمحے میرا ساتھ دینے لگی تھی تو دوسرے لمحے دغا دے جاتی تھی۔

اب یہ پہلی کاپڑ نہ جانے میرے کسی ہمدرد کا تھا یا دشمن کا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ شاید یہ پہلی کاپڑ ہستی میں موجود تھا اور سینڈ ریل سے اسے میری مدد کے لیے روانہ کیا تھا۔ اسی امید پر میں پہلی کاپڑ کی طرف دوڑا جو اب زمین پر نکلنے لگا تھا۔

اس پہلی کاپڑ کا شیشے کا بڑا اوپر کو نکلتا تھا۔ میں جب اس کے قریب پہنچا تو ہڈ کھل چکا تھا اور پائٹ اپنی سیٹ سے اٹھ کر نیچے جھانک رہا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ ہینڈل میں چھپا ہوا تھا۔ اس لیے میں اسے پہچاننے سے قاصر تھا۔ تاہم ہینڈل کے شفاف نیلے غلاب میں سے مجھے اس کی آنکھیں دھندلی دھندلی سی نظر آئی تھیں اور وہ نہ صرف ضمیمہ بلکہ کچھ شناسا بھی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ بھونکی پھول سی سیاہ جینٹ پتے ہوئے تھا، ہاتھوں پر بھی دستارے تھے۔ وہ ہاتھ ہلا کر مجھے بلا رہا تھا۔

میں پہلی کاپڑ کے پچھلے کی ہوا سے لڑتا لپک کر اس کے قریب پہنچا اور ہلا توقف پائیدان پر چڑھ گیا۔ تب اس نے ایک لمحے کے لیے ہینڈل کا بڑا اٹھایا اور شناسائی کی روشنی یوں میرے سامنے ابھری کہ ایک لمحے کے لیے تو میری آنکھیں خیر ہو گئیں۔ وہ لیو آؤٹ کی بجلی بی جن تھی جس سے میں ٹھنڈو میں صرف ایک بار ہلا تھا بلکہ بلا بھی نہ تھا۔ ہماری صرف نظریں ہی ملی تھیں اور ہمیں ایک دوسرے کا نام معلوم ہوا تھا۔ اس نے ہتھیاروں کے ڈبے میرے سامنے لا کر رکھے تھے۔

کے بعد نکلا جا رہا تھا اور میں زندہ سلامت لینا اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ یہ منزل کے سلسلے میں میری پسلی کا سیلابی ہو سکتی تھی مگر یہ کوشش ہی اوجھڑی رہ گئی تھی۔ منزل تو ابھی بہت دور تھی۔

یہ سوچتے رہے پہلے تو ناامیدی و مایوسی نے مجھے مغلوب کیا مگر پھر جیسے رگ و پے میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی جس نے مجھ اور خفیہ قوتوں کو بھی شعلوں میں بدل دیا۔ میری مٹھیاں پہنچ گئیں کہ ناخن گوشت میں اترنے لگے اور کپٹیاں پھٹنے لگیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اپنے اندر اہل پڑنے والی اس قوت کو نہیں استعمال نہ کیا تو میرا سارا جسم یا کم از کم کپٹیوں کی سیس ضرور پھٹ جائے گی۔

میں نے اس قوت کو ممیز دینے کے لیے یوگا کے ایک خاص انداز میں سانس کو بھی جسم میں مقید کر لیا اور پھر اٹھ کر خلیجے کو کھینچنا شروع کیا۔ وہ پھر ملی ہی زمین میں یقیناً کافی گہرائی میں پھوسٹ تھا۔ پہلی کوشش میں تو اس نے جہش نہ کی۔ تب میں نے جھک کر اس کی سناخوں میں ہاتھ پھنسائے اور سانس لیے بغیر اس مرحلے کو زندگی کا آخری مرحلہ سمجھتے ہوئے تمام تر قوت صرف کرنا شروع کر دی اور پھر پند سیکند کے اندر اندر وہ خلیج جو بقول حشمت خان کے ایک شیر کو بھی قابو میں رکھنے کے لیے کافی تھا زمین سے اٹھنا چلا گیا۔

خلیجے کا جو حصہ پٹرلی زمین میں پھوسٹ تھا وہ تقریباً چار فٹ لمبی موٹی سی پتھر اور سلاخ پر مشتمل تھا اور اسکرپ کی طرح زمین میں فٹ کیا گیا تھا۔ یہ اس قسم کا قبضہ نہیں تھا جو ویسے ہی زمین پر رکھ دیا جاتا بلکہ یہ انتہائی طاقتور جانوروں کو بے بس کرنے والا خلیجہ تھا۔ زمین میں ایک گڑھا سا پڑ گیا تھا اور بہت سے پٹرلی غلوں اور اوجھڑی بکھر گئے تھے۔ میرا پوٹ اب بھی خلیجے کی گہرائی میں تھا۔ تاہم میں خلیجے کو پاؤں کے ساتھ ساتھ گھسیٹتے ہوئے چل سکتا تھا گو کہ خلیجے کا وزن اتنے کم نہیں تھا۔ میرے دل میں مسرت سے گدگدائی سی ہونے لگی تھی۔ حشمت خان کے خیال میں جو کام ناممکن تھا اور جسے میں بھی تقریباً ناممکن ہی سمجھتا تھا وہ ہلا کر ہو گیا تھا مگر جب میں نے سرنگ کے دبائے پر پہنچ کر میدان کی طرف دیکھا تو میری خوشی ماند پڑ گئی۔

حشمت خان پہلی کاپڑ تک پہنچ چکا تھا اور اوپر پڑھ کر کاک پٹ کا دواڑھ کھول رہا تھا۔ میں خلیجے کو گھسیٹتا لٹکڑے انسانوں کے سے انداز میں حتی الامکان تیزی سے اس کے تعاقب میں بڑھا۔ راستے میں رک ٹر میں نے اسٹین گن اٹھائی۔ جب میں نے دوبارہ پہلی کاپڑ کی طرف دیکھا تو اس کے پر گھونسنے لگے تھے اور انجن کی گزراہٹ سے فضا میں ارتعاش پیدا ہو چکا تھا۔

پہلی کاپڑ کسی بھی لمحے فضا میں بلند ہونے والا تھا۔ میں نے اضطراری طور پر اسٹین گن

اس وقت اس کے حسن بلائیز نے مجھے مہسوت کر دیا تھا اور اب اس کی آمد مجھے ششدر کر دینے کے لیے کافی تھی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں جب اس کے ہاں سے رخصت ہوا تھا تو اس کی حسین آنکھوں میں یہ سیت میں لپٹا ہوا ایک مبہم سا سوال محسوس آیا تھا جیسے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے پوچھا ہو..... "پھر کب آؤ گے اجنبی؟" لیکن اس سوال کو میں نے اپنی لاشعوری خوش فہمی پر محمول کیا تھا۔ میں تو اس کے پاس نہیں جاسکا تھا لیکن وہ نبھانے کس طرح اس نازک گھڑی میں میرے پاس آتے ہوئے تھی۔

اس نے ہیڈرٹ کا ہڈ نیچے کر لی اور مجھے اوپر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ میں نے جلدی سے سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن میرے پاؤں کے ساتھ جو ٹھنڈی ہوا چکا تھا وہ اس موقع پر بھی آڑے آئی اور دروازے میں پھٹنے لگا لیکن میں نے جلدی سے کسی نہ کسی طرح پاؤں اوپر اٹھا کر اسے بھی اندر کر لیا کیونکہ میں سامنے بھی دیکھ رہا تھا حشمت خان کا بلی کاپڑ مجھ پر لمحہ دور ہوتا جا رہا تھا۔

میرے بیٹھتے ہی پی جین نے ہڈ گرا دی اور تھوڑی سی کھینچنے لگی۔ چند لمحوں بعد ہی ہمارا بلی کاپڑ بلندی پر پہنچ چکا تھا اور ہم حشمت خان کے تعاقب میں روانہ ہو چکے تھے۔ میں نے جب پی جین کو بلی یاد دیکھا تو مجھے گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ اس قسم کے معاملات میں اتنی مستعد اور بلی کاپڑ اڑانے میں اتنی مشاق ہو گی۔ حالانکہ میں خود بھی فلائنگ کلب میں مختلف قسم کے طیارے اڑانے کی تربیت کے دوران تین سواری ایوارڈ اور ایک سپر فلائنگ ایوارڈ جیت چکا تھا لیکن اس نرم و نازک لڑکی کی مشاق و مہارت دیکھ کر حیران تھا جو اس دقت بھاری بھر کم اور پھولے پھولے لباس میں قطعاً نرم و نازک نظر نہیں آ رہی تھی۔ بلی کاپڑ سدھائے ہوئے رندے کی طرح گویا اس کے اشاروں کا تابع تھا۔ اس کی آمد صحیح معنوں میں میرے لیے امداد بھی تھی۔

بلی کاپڑ چونکہ اوپر سے نکلا نہیں تھا اس لیے ہمیں محسوس کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ کشتگر کا آغاز پی جین نے کیا۔ "میں پہلے داوی میں آ رہی تھی۔" وہ بولی پھر بتانے لگی۔ "نوگ منوچی کے منہ م گھر کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ میں نے ان سے تمہارے بارے میں پوچھا تو پائی کی بیوی سیندریلا نے بتایا کہ وہ لوگ ٹوڈ تمہاری تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے اتفاقاً ادھر سے بلی کاپڑ ہوا میں بند ہوتے دیکھ لیا اور میں ادھر آ گئی۔"

"گویا تمہیں اس داوی اور یہاں کے لوگوں کے متعلق خاصی حد تک معلومات حاصل ہیں۔" میں نے کہا۔ "احسان مرزا نے تو ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔"

"احسان مرزا کو تو خود اچھی طرح معلوم نہیں کہ ہم کیا کچھ جانتے ہیں۔ اس سے ہمارا

صرف چند معاملات میں تعاون کا معاہدہ تھا۔ ہمارے اپنے بھی اس کے علاوہ بہت سے معاملات ہیں۔" وہ قدرے لاپرواہی سے بولی۔ "تمہارے جانے کے بعد میں نے فون پر اس سے رابطہ قائم کر کے پوچھا تھا کہ اس نے تمہیں کہاں بھیجا ہے اور جب ہمیں معلوم ہوا کہ تمہاری منزل تاریک داوی ہے تو کم از کم مجھے بے حد خوشی ہوئی کیونکہ مجھے بھی یہاں تقریباً وہی کام درپیش تھا جس کے لیے تم آئے ہو لیکن مجھے اس کے لیے مدد کی ضرورت تھی۔ مہربانہ کسی آدمی کی۔" وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر مسرور کن انداز میں مستطراکی میں دم بخود سا رہ گیا۔ "تمہیں کیاں توں پڑا یہ کام؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کس نے تمہارے سپرو کیا یہ کام؟" "میری قوم نے۔" وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ "حشمت خان کے ذمے میری قوم کا بہت سا ادھار لکھا ہے۔ اس نے چینی قوم کو بھی بہت سے نقصانات پہنچائے ہیں۔ اس کا باپ شرافت علی ہمارے خلاف ایجنٹ کے طور پر کام آتا رہا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس وقت بلی کاپڑ میں اس کا باپ بھی موجود ہے۔"

"اس بلی کاپڑ میں شرافت علی بھی موجود ہے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں....." اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر تو جلد از جلد اس تک پہنچنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔

پی جین نے بلی کاپڑ کی رفتار بڑھائی۔ درمیانی فاصلہ کم ہو گیا تو میں نے پی جین کے اشارے پر سیٹ کے بیچے سے ٹائی مین اٹھائی، ہڈ اوپر کیا اور دوسرے بلی کاپڑ پر برسٹ مارا۔ اس کے حکم سے دھواں خارج ہونے لگا۔ میں نے دوسرا برسٹ مارا۔ بلی کاپڑ فضا میں ڈولنے لگا۔ پھر وہ نیچے اترنے لگا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ گر نہیں رہا تھا۔ حشمت خان اسے خود نیچے اتار رہا تھا۔ شاید اس نے سوچا تھا بلی کاپڑ گرنے کی صورت میں تو پیش پاش ہو جاتا اور اس کا مطلب یقینی موت تھا۔ شاید نیچے اتر کر وہ اپنی قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ لگتا سی تھا کہ ان کے پاس اب کوئی نوڈیڈ ہتھیار نہیں تھا۔ اس لیے جو اب ادھر سے کوئی گولی نہیں آئی تھی۔

وہ بلی کاپڑ کو بجناعت اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے دروازہ کھلتے اور حشمت خان کو چلا گیا لگا کر اترتے دیکھا پھر میں نے دیکھا وہ ایک نہایت عمر رسیدہ آدمی کو سارا دے کر بلی کاپڑ سے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہاں ہدف کی طرح مقید عمر صورت اٹنے توے کی طرح سیاہ تھی۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔

حشمت خان کے ہمارے وہ بڑی مشکل سے بلی کاپڑ سے اترنے میں کامیاب ہوا اور وہ دونوں گرتے پڑتے پہاڑی ریلے پر بھاگنے لگے۔ نواب شرافت کی وجہ سے اس کے بیٹے کو بھاگنے میں دقت پیش آ رہی تھی کیونکہ نواب سے بھاگا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے پورے

مر جائے۔

کچھ ہی دیر میں وہ لو میں تھڑے ہوئے گوشت کی ٹھنڈیاں سی بن کر رہ گئے۔ اس دوران وہ تڑپتے رہے، سسکتے رہے، معافیاں مانگتے رہے مگر ان کے الفاظ میری سماعت کے گمبھوں سے ٹکرا کر لوٹنے رہے۔ آخر کار ان میں پیچھے چلنے کی بھی ہمت نہ رہی۔ وہ اب صرف ہچکیاں اور سسکیاں ہی لے رہے تھے۔ ان کے وجود کو پلٹے ہوئے چکے تھے اور تشعبی سے انداز میں جھٹکے کھا رہے تھے۔

میں نے شرافت علی کے خون میں تھڑے ہوئے سفید بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا اور اس پر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”نیچھے پچانے کی کوشش کرو اب شرافت علی خان! میں عزیزہ خانم کا بیٹا ہوں..... تمہیں یاد ہے عزیزہ خانم کون تھی اور تم نے اس کے ساتھ کیا کچھ کیا تھا؟“

اس کے خون آلود چہرے کے عضلات پھڑپھڑائے اور اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر خون اس کی آنکھوں میں پھسل آیا۔ میں چاہتا تھا وہ کچھ بولے کوئی جواب دے مگر وہ کچھ بھی نہیں بول رہا تھا۔

بی جن میرے قریب آئی، وہ گویا مقصد سمجھتے ہوئے بولی۔ ”تم انہیں کسی عبرت انگیز طریقے سے مارنا چاہتے ہو ناں؟“

میں سرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ شدت غیظ و غضب سے میرے حلق سے نواز نہیں نکلی رہی تھی۔ چہرے ان دونوں کے لولہمان تھے لیکن خون اور حقیقت مجھ پر سوار تھا۔ ”زرا نیچے دیکھو۔۔۔“ اس نے پناہ کی تکیب میں اشارہ کیا۔

میں نے جھک کر دیکھا، تکیب میں ایک گول نرسی بہ رقی تھی۔ پاٹ خلاصا چوڑا تھا۔ اسے چھوٹا موٹا دریا کما جا مکتا تھا۔ بی جن بولی۔ ”انہیں اس میں پھینک دو۔“

”اوب کر مرنا کوئی ایسی عبرت انگیز موت تو نہیں ہے۔“ میں نے کھلی کھلی آواز میں بڑی مشکل سے کہا۔

”ان کے اوب مرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔“ بی جن بولی۔ ”اس بڑی میں مگر مجھ پائے جاتے ہیں۔۔۔ اور تمہیں معلوم ہے مگر مجھ اپنے شکار کو کیسے کھاتا ہے؟“

”شاید وہ انہیں نکل جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔
بی جن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”انسان جتنے بڑے شکار کو وہ نہ تو نکل پاتا ہے اور نہ ہی اس کے دانت چبانے کے کام آتے ہیں۔ وہ انسان کو جڑے میں نوکیلے دانوں کی مدد سے پھنسا کر کسی درخت پر مارتا ہے اور اس وقت تک مارتا رہتا ہے جب تک اس کا جسم ملغوبہ نہیں بن جاتا۔ اس ملغوبے کو وہ نکلے ہے۔“

میں نے طمانیت سے سر ہلایا اور دونوں باپ بیٹوں کو گھسیٹ کر تکیب میں پھینک دیا۔

جسم میں طاقت ہی کہاں تھی۔

میں اس کھنڈر ہوتے انسان کو دیکھ کر دم بخود سا رہ گیا۔ میں اس سے انتقام لینے آیا تھا؟ وہ تو میرا ایک تھپڑ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے دہشت کے عالم میں لنگڑاچے اور تڑپتے پڑتے اپنے بیٹے کے ساتھ گھسیٹتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو مجھے ترس آیا مگر پھر مجھے اسی کی ڈانڑی کے مندرجات یاد آئے اور میرے جسم میں گویا انگارے بھر گئے۔ ہر سام جانا سے شے پھوٹنے لگے۔

اس وقت تک پی جن نے بھی نیلی کاہڑ نیچے اتار دیا تھا۔ اس نے اپنا ویلارڈ وغیرہ ہٹا دیا تھا۔ حشمت اور شرافت علی کے پاس یقیناً کوئی مؤید ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ رک کر ہم پر غارت کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔

بی جن تھڑے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم ان پر برسات مار کر ان کا قصہ ختم کیوں نہیں کر دیتے؟“

میں نے گویا کسی خواب سے جوتکتے ہوئے کہا۔ ”میں انہیں اتنی آسمان موت مارنا نہیں چاہتا۔“

تاہم میں نے اس طرح غارت کیا کہ حشمت خان کی صرف ایک ٹانگ میں گولی لگی وہ گر پڑا۔ اس کا باپ گولی کھائے بغیر ہی اس کے ساتھ گر پڑا۔ انہوں نے اٹھ کر دوبارہ ہلگنے کی کوشش کی مگر ان سے دو قدم بھی نہ چلا گئے۔

تب میں نیلی کاہڑ سے اتر کر ایک پاؤں گھسیٹا ان کے قریب پہنچا۔ مگر میں نے بی جن کو تھما دی تھی۔ میں خلی ہاتھ تھا۔ میں نے ایک ایک ہاتھ سے ان دونوں کو بالوں سے پکڑ کر اٹھوایا۔ نواب شرافت علی کی شکل واقعی اس کے اعمال کی طرح کریمہ تھی لیکن بیٹا دانا تھا۔ نہ جانے وہ اس کا بیٹا تھا بھی یا نہیں؟ لیکن اعمال تو یہی بتاتے تھے کہ اس کی رکوں میں ایسے ہی باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔

”بس۔۔۔ اتنی ہی طاقت تھی بھائے کی؟“ میں نے پوچھا، مجھے خود اپنی آواز سانپ کی پھنکار سے مشابہ محسوس ہوئی۔

نواب شرافت علی خوف، مشقت اور فقاہت کے باعث تھوڑے تھوڑے کانپ رہا تھا۔ کوئی وقت ہو گا کہ اسے دیکھ کر نہ بے بسے کتے لوگ کاہتے ہوں گے مگر آج اس کی کیفیت خزاں رسیدہ ہے کی سی تھی۔ میں نے ان دونوں کے منہ پر تھوک دیا۔

حشمت خان نے مجھے ہنسا دیکھ کر گھومنا رسید کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے ایک ہی بازو سے اسے پتھری زمین پر پڑا دیا۔ پھر میں نے انہیں ایک پاؤں نی ٹھوکوں پر رکھ لیا۔ میرے مضبوط جوتے ٹوٹ چکے تھے لیکن اب بھی ان کی ٹھوکریں ٹھیکٹ وہ تھیں۔ وہ اپنے اور بیٹے کے۔ شرافت علی کو میں تم ٹھوکریں رسید کر رہا تھا کہ وہ کسی جلدی نہ

ان میں بولنے اور حرکت کرنے کی سکت نہیں تھی مگر اس وقت ان کی چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ پانی میں ان کے گرنے کا زور دار پھپکا سنا کی دیا۔ میں نے ہلکا کر دیکھا۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں سچے آب پر نمودار ہوئے مگر اس طرح کہ حشمت خان کا سر اور کندھے ایک دوسرے کے جڑوں میں تھے اور نواب شرافت علی خان کی ٹانگیں۔

مگر مجھ اس طرح انہیں دوسرے بڑے ست اور کالی آمیز انداز میں کنارے پر آئے۔ درخت خامے دور تھے مگر وہ دھیرے دھیرے چلے ہوئے ان کے پھرتے جسموں کو منہ میں دبا لے ان تک پہنچ ہی گئے۔ پھر وہ انہیں اس طرح درختوں پر مارنے لگے جیسے دھوبی کپڑوں کو سل پر پختا ہے۔ وہ میری زندگی کا ایک ہیرت آمیز اور ناقابل فراموش منظر تھا۔ چند لمحوں کے پھینٹے اثرات کو دور تک جانے لگے۔ کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد مجھے ابلائی سیاہی اور میں پیچھے ہٹ آیا۔ میرے دہود میں ٹھنڈک کی اثر تھی مگر میرے اعصاب اب بھی مرتعش تھے۔

آخر کار نیچے سے دھمک کی سی آوازیں سنائی دینا بند ہو گئیں۔ اس کے چند لمحوں بعد ہی میں نے نیچے ہلکا کر دیکھا تو وہاں نہ حشمت خان تھا اور نہ ہی اس کا باپ شرافت خان۔ مگر مجھ بھی واپس پانی میں چلے گئے تھے۔ بس درختوں کے تنے گوشت اور خون کے ملغوبے سے اٹھنے لگے رہ گئے تھے۔

ایک طرف صرف ایک نوتا پڑا رہ گیا تھا اور اس میں چھڑکی کی ہڈی اٹکی رہ گئی تھی۔ اس ناک پر ذرا بھی گوشت نہیں تھا۔ جو تھے سے لگی ہوئی وہ لمبی سی ہڈی نہ جانے کہاں کچھ ڈروائی سی لگ رہی تھی۔ میں بھڑکھڑکی سی لے کر اور کراہیت سی محسوس کرتے ہوئے پیچھے ہٹ آیا۔

چند لمحوں تک میں وہیں کھڑا گری گھری سانسیں لیتا رہا۔ پیچھے نے بھی مجھ سے واپس چلنے کے لیے نہیں کہا۔ وہ بخور میری کیفیت کا جائزہ لے رہی تھی۔ میرے دل میں اس وقت ایک عجیب سا نا پھینا ہوا تھا جبکہ میرے ذہن میں خیالات کا ایک ہجوم تھا۔ اپنی ساری جدوجہد کی ایک قسم سی میری ٹکا ہوا میں گھوم رہی تھی۔ اک ٹکر کی تلاش اور ایک طویل ہاں کسر بدوجہد کے بعد اصل دشمن چند سینکڑوں میں ٹھکانے پر لگ گیا تھا۔ انتقام کی ایک طویل اور اذیت ناک کہانی کو چند لمحوں میں اختتام مل گیا تھا۔

جب یہ منظر میں سر نہیں ہوئی تھی تو میں ان کے بارے میں سوچتا تھا نہ جانے کیا تیاریاں کرتا تھا کیا کیا پروگرام بناتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ مجھے صدیوں کا سفر درپیش تھا لیکن اب جبکہ سفر طے ہو گیا تھا تو جیسے رگ و سپہ میں ایک بے بسی کی پھیل گئی تھی اور میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ "بس.....! اتنی سی بات تھی۔"

میں نے اس عسکریت کو نیست و نابود کر دیا تھا اور میں اب محسوس کر رہا تھا کہ یہ تو

مجھ ایک ہوا تھا جو وقت نے میرے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ ویسے بھی جب انتہائی دشوار تھا۔ بھی ٹھیک پا جاتے ہیں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو کچھ ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ تودہ پان کھنڈ پہلے تک مجھے اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں تھا۔ ہر قدم پر میں یہی محسوس کر رہا تھا کہ موت مجھے نکلنے لگی ہے..... لیکن میں موت سے بچتا چلا گیا تھا اور اس غیبت کے لیے موت بن گیا تھا جس کا ایک غیبت جانشین بھی اس سے زیادہ طاقت پزیر رہا تھا۔

آخر ہی جن میرا ہاتھ تھامتے ہوئے لمبا ست بولی۔ "چلو..... اب واپس چلتے ہیں۔"

میں اپنے پاؤں میں پسے ہوئے کھنڈ کو گھسیٹتا اس کے ساتھ واپس نیلی کاپڑ میں آ بیٹھا۔ اب وہاں رکنا فضول تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جذبات کی آمد میں تو نہ جانے کب تک میرے وجود میں چلتی رہیں گی لیکن مجھے کچھ ضروری کام نمانے تھے۔ نیلی کاپڑ فضا میں بند ہو چکا تو میں نے نیچے چٹانوں کے لامتناہی سلسلے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "اب تم واپس واہی کی طرف جا رہی ہو ناں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا۔ "پرواز ذرا لمبی ہی رکھو تو میں راستے میں وہ مقام بھی دیکھ لوں جہاں میں کچھ دیر کے لیے اترنا چاہتا ہوں۔"

"وہی جگہ تو نہیں جہاں سے تم میرے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔" اس نے نیلی کاپڑ کو بندریج نیچے لاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں..... میرا خیال ہے وہ جگہ اس سے کافی آگے ہوگی۔ صحیح محل وقوع کا مجھے انداز نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "بہرحال وہاں چربی تختوں اور گھاس پھوس سے بنا ہوا ایک مکان موجود ہے جو دور سے ہی نظر آجائے گا۔"

اب ہم چٹانوں کی چوٹیوں کو تقریباً چھوتے ہوئے گزر رہے تھے۔ وہ میدان ہمیں نظر آچکا تھا جہاں سے ہم حشمت خان کے تعاقب میں روانہ ہوئے تھے۔ اس کے بعد کا وہ راستہ جو میں نے سرنگ میں طے کیا تھا اور مجھے میلوں طویل محسوس ہوا تھا اب بے حد مختصر لگا۔ سرنگ تو نہ جانے کہاں تھی، وہ مکان البتہ مجھے جلد ہی نظر آیا۔

ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر پیچھے نے نیلی کاپڑ اتارا۔ میں نیلی کاپڑ سے اترنے لگا تو میرے پاؤں میں پھنسا ہوا تھنچہ ایک بار پھر روانہ سے میں پھنس گیا۔

"اوه..... اس کو تو میں بھول ہی گئی تھی۔" پیچھے نے چونک کر بولی۔ "پہلے تو اس کو علاج کرنا چاہیے۔ اس نے کھنڈوں پر رز کے نیچے بنا ہوا ایک خانہ کھولا۔ اس میں طرح طرح کے چھوٹے بڑے اوزار بھرے ہوئے تھے۔ اس نے دھات کا لکڑی والی ایک پتلی کی آری نکالی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہ مسماتی بھی کاپڑ ہے۔ اس میں بڑی بڑی عجیب چیزیں ہیں بلکہ یوں کہو کہ بے شمار ابھنوں کے حل موجود ہیں۔"

وہ آری سیدھی کر کے میرے پاؤں کی طرف جھکنے لگی لیکن میں نے تری اس کے ہاتھ

فردانہ لائبریری میں لکچر کا سلسلہ

مکمل چھپنے کے بعد شائع ہوا

اس بار پی جین نے پہلی کاپی جہاں اتارا اس ہموار قطع زمین سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک طویل و عریض میدان نظر آ رہا تھا جس کے گرد خاردار تاروں کی باقاعدہ حد بندی موجود تھی اور ایک سرے پر خوبصورت اسٹیج اور شامیانہ سا گاہک ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ غالباً وہی بڑا میدان تھا جس کا ذکر میں کی یاد سن چکا تھا۔ ہستی کے تمام اہم اجتماعات غالباً یہیں ہوتے تھے۔

اس وقت بھی وہاں انہیں بچی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ خالی اسٹیج کے گرد جمع تھے۔ کچھ کسی طرف جا رہے تھے۔ کچھ کسی طرف اور کسی کسی طرف سے مردوں اور عورتوں کی ٹولیاں واپس آ رہی تھیں۔ پہلی کاپی کی توازن کر سب ہماری طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ پھر میں نے ایک طرف سے ایک خوبصورت اور شاہانہ طرز کی ٹیمپلی آتے دیکھی۔ کچھ لوگ اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ اس وقت میں اور پی جین پہلی کاپی سے اتر چکے تھے اور میدان کی طرف بھاڑ رہے تھے۔ جب ٹیمپلی رکی اور اس کا پردہ اٹھتے ہی سینڈریلا نیچے کودی وہ اس وقت ایک لمبا سا سفید لہار پہنے ہوئے تھی۔ سر پر ایک انکارف سا باندھا ہوا تھا۔ پیرں میں فل بوٹ تھے۔ وہ دور سے شاید راہبہ نظر آئی لیکن اس کا چہرہ کسی راہبہ کا چہرہ ہرگز نہیں تھا۔ اس چہرے پر زندگی کی تپ و تاب اور حسن و دلکشی کا ہالہ دور سے ہی دیکھا جاسکتا تھا جو سراسر رہبانیت کی ضد تھا۔ اس وقت تو یہ چہرہ کچھ اور بھی دمک رہا تھا، تھم رہا تھا۔

اس نے سہارا دے کر ٹیمپلی سے ہٹے اتارا وہ کہتی تھی۔ اسی لمحے سینڈریلا نے مجھے اور پی جین کو دیکھ لیا اور کہتی کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے ہماری طرف چلی "تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ میں تو سو طرح کے دوسوں میں ہٹا ہو گئی تھی۔ مجھے اندیشہ ہو چلا تھا کہ شہت خان سے معرکے میں خدا انخواستہ..." اس نے جملہ اور حورا چھوڑ دیا۔

میں کچھ کے بغیر تیزی سے کہیں کی طرف بڑھا جو ٹیمپلی کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ اس پر جتنا تشدد ہو چکا تھا اس کے باعث اس کی حالت تو ابتر تھی لیکن اب میری طرف دیکھتے ہوئے اس کے زخمی چہرے اور ٹھکی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب سی باسیت سم آئی تھی جیسے اسے شک ہو کہ میں سینڈریلا اور پی جین جیسی حسناؤں کی مہبودگی میں اسے بھول

سے لی اور سیٹ پر بیٹھے ہی بیٹھے جھک کر کھینچے کا ایک نمونہ پڑا حصہ منتخب کر کے اس پر آری چلائی شروع کی۔ عمدہ آرمی نے چند منٹ میں ہی اس سلع کو کالت ڈالا اور میرا پاؤں اس عذاب سے آزاد ہو گیا۔ میں نے جوتا اور اپنی موزہ اتار کر دیکھا۔ اتنی دیر توں کے تحفظ کے باوجود میرے نچنے کی کھال پھٹ چکی تھی اور خاصا خون موزے میں جمع ہو چکا تھا۔ پی جین سے ایک کپڑا لے کر پاؤں صاف کر کے میں نے دوبارہ جوتا پہن لیا۔ کھنجر دروازے میں سے نکال کر ایک طرف پھینکا اور پی جین کو دیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے میں مکان کی طرف چلا گیا۔

مجھ دیر میں بیروں کا تھینا اٹھائے واپس آیا تو پی جین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "کیا یہ پورا کاپورا بیروں سے بھرا ہوا ہے؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔ "بے شک....." میں نے جواب دیا۔

"اور یہ اس جھوپڑی میں پڑا ہوا تھا؟" وہ حیرت سے بولی۔ "اگر ہم اسے لے کر بھیج دیتے جیسے تو بیروں کی مارکیٹ میں ہولی سیل ڈیٹر کے طور پر کاروبار کر سکتے ہیں۔"

"ابھی ذرا دیکھتی جاؤ۔" میں تھینا پھیل سیٹ پر رکھ کر اس کا منہ بند کر کے دوبارہ مکان کی طرف گیا۔ دوسرے چکر میں نوٹوں سے اور تیسرے چکر میں قیامت دیورات سے بھرا ہوا تھینا بھی اٹھا کر میں پہلی کاپی میں رکھ چکا تو پی جین انگشت بدندان رہ گئی۔

"دولت ہمیشہ ہمارے ہاتھ کا میل رہی ہے....." وہ بالاخر بولی۔ "اس کے باوجود مجھے یہ اعتراف کرنے میں غار نہیں کہ یکمشت اتنی دولت میں نے پہلی بار دیکھی ہے۔"

"یہ بات میں بھی کہہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا "حالانکہ کھانے میں کچھ کسر ہم نے بھی نہیں چھوڑی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ اس بدبخت کی زندگی کا ہر لمحہ دولت جمع کرنے میں صرف ہوتا تھا۔" وہ سیٹ پھینکتے پھینکتے میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "وہت میں تمہیں ایک عجیب بات بتاؤں..... اگر اتنی دولت میں تمہارے اور اپنے باپ کے سوا کسی اور کے پاس دیکھتی تو شاید اسے "وہ مار کر ساری کی ساری لے لیتی۔" پہلی کاپی ہوا میں بلند ہو چکا تھا تو اس نے پوچھا۔ "اب تم کیا کہو گے اس دولت کا؟ یہی لے جاؤ گے؟"

"نہیں....." میں نے جواب دیا۔ "دیکھتی جاؤ۔"



فردانہ لائبریری میں لکچر کا سلسلہ

مکمل چھپنے کے بعد شائع ہوا

سینا تھا حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنی اور جسمانی طور پر اپنی تکلیف اٹھائی تھی کہ اس کی آنکھوں میں یہ تاثر بھلے آیا تھا ورنہ وہ گھٹکھٹک کر کے والی عورت نہیں بنتی۔

میں نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔ اس کی متورم آنکھوں میں جھانکا اور صرف اتنا کہا۔ ”کیٹی! میں ہمیشہ تمہارا شہر گزار رہا ہوں گا کہ میری خاطر تم نے اپنی تکلیف برداشت کی۔“

وہ جیسے اپنی ساری تکلیف بھول کر میری باتوں میں سمٹ آئی اور سوچے ہوئے ہونٹوں کو بمشکل حرکت دے کر مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”بس مجھے صبر میں کی چند اگتہ درکار تھے۔“

مجھے اس وقت وہ دنیا کی حسین ترین عورت معلوم ہو رہی تھی۔ ”بس کچھ دیر اور بے زامی برداشت کر لو کیٹی! پھر ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے اور میں جلد از جلد تمہارے آرام و آسائش اور صحت کا انتظام کروں گا۔“

”تم میری فکر نہ کرو۔“ اس نے ایک بار پھر مسکراتے کی کوشش کی اور مجھ سے قدم ہٹا کر چلنے لگی۔ ”میں اپنی بری حالت میں نہیں ہوں، جتنی میں نظر آ رہی ہوں۔“

سینڈریلا اور لی جن ہم سے آن ملی تھیں۔ میں نے ان کا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سینڈریلا نے بھی لی جن کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔

”اب کیا پروگرام ہے؟ لی جن نے یوں پوچھا جیسے اسے واپس جانے کی جلدی ہو۔ ”کیا تم میرے ساتھ واپس کھنڈر چلنا پسند کرنا چاہتے ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن ذرا فکھ کر۔۔۔۔۔“

”کچھ دیر نہیں، تمہیں بہت دن یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔“ سینڈریلا جلدی سے بولی۔ ”میں بستی والوں سے خطاب کرتے وقت تمہارا تفصیلی ذکر کر چکی ہوں۔ تمہیں اپنا اور اس بستی کا نجات دہندہ قرار دے چکی ہوں۔ ابھی تو تمہیں بستی والوں سے خطاب بھی کرنا پڑے گا۔“

”مجھے بھئی دو سینڈریلا!“ میں نے جلدی سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”تقریر دہرے میرے ہاں کی بات نہیں۔ مستقبل میں بھی میرا ایڈر بننے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس لیے تمہیں بستی والوں سے جو کچھ کہنا ہے، خود ہی کہتی رہو۔ ویسے بھی مجھے ان کی زبان نہیں آتی اور انگریزی سب ہی تو نہیں سمجھتے ہوں گے۔“

”تمہاری تقریر کا ترجمہ ساتھ ساتھ منوایا جائے گا۔“ سینڈریلا بولی۔

”میں اس کے باوجود تیار نہیں۔“ میں نے دوبارہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”ابیتہ بستی

والوں کی ایک امانت میرے پاس ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تم بستی والوں میں فردا فردا تقسیم کر دو۔ یہ سب تمہارے عقیدت مند تو ہیں لیکن یوں وہ ہمیشہ کے لیے تمہارے بے دام غلام بن کر رہ جائیں گے کیونکہ میں جہاں تک سمجھ پایا ہوں، دنیا کے بیشتر انسانوں کی طرح ان کا مسئلہ بھی معاش ہے۔“

ہم اس وقت میدان سے تدرے فاصلے پر ایک چھپر کے نیچے قدرے کم روشنی میں کھڑے تھے۔ لوگ جو غالباً میدان ہی سے گئے ہوئے تھے، تیزی سے آ رہے تھے اور میدان بھرنا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں رہے گی۔ سینڈریلا کی سمجھ میں شاید میری بات نہیں آ سکتی تھی لیکن جب میں نے اسے ساتھ لے جا کر ہیلی کاپٹر سے بیرون، ٹوٹوں اور زیورات کے بڑے بڑے تھیلے اتار کر دکھائے تو وہ بھی لی جن کی طرح خاصی حیران نظر آئی لیکن اس کی حیرت اس وقت دبیچہ ہو گئی۔ جب میں نے کہا۔ ”دو تین آدمیوں کو بلا کر یہ تھیلے اسٹیج پر پہنچاؤ اور اپنی اس رعایا میں تقسیم کر دو۔“

”کس طرح تقسیم ہوگی؟ یہ مختلف ماییتوں کی چیزیں ہیں۔“ وہ قدرے پریشانی سے بولی۔ ”ڈنگر کی طرح۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم مالیت کی فکر میں نہ پڑو۔ بس یہ دیکھنا کہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ مل جائے۔ کسی کو ہیرا، کسی کو نقدی، کسی کو زیور اور کوئی محروم نہ رہ جائے۔“

پھر میں نے تھیلے ہیلی کاپٹر سے اتار کر زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور میری تعریف میں بستی والوں کے سامنے زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ایک بہت حقیر سا انسان ہوں اور پھر میں بستی والوں پر کوئی احسان کر کے نہیں جا رہا۔ میں یہاں اپنے ایک کام سے آیا تھا، وہ پورا کر کے جا رہا ہوں۔“

میں نے لی جن کو پائلٹ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کیٹی کو سارا وے کر اوپر چڑھایا۔ ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ہیلی کاپٹر میں پائلٹ سمیت چار افراد کی سہولت تھی۔ ہم بیٹھ چکے تھے تو میں نے ہٹ کر کہا۔ ”بس۔۔۔۔۔ ہم تو اب جا رہے ہیں، تم اپنا کام کرو۔“

سینڈریلا دم بخود سی کھڑی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ٹی کی جھلک دیکھتے ہی محسوس کی۔ اس جھلک دیکھنے کے ساتھ ساتھ ایک بے عنوان سی حیرت بھی اس کی آنکھوں میں جاگزیں تھی جیسے اسے یقین نہ رہا ہو کہ میں یہ سب کچھ کر کے اس طرح اچانک رخصت بھی ہو سکتا ہوں۔ ان سبب، ان کی باتیں گون گون کے ہونٹوں پر ہی دم توڑ کر رہ گئی تھیں۔ وہ نہ جانے کیا کچھ سوچ رہی تھی لیکن میں اب کئی وجوہات کی بنا پر یہاں ایک بات بھی فاضل گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ میرا مشن ختم ہو چکا تھا اور

فحش جذباتیت کے مظاہروں، فضول کاموں یا سستانے میں وقت ضائع کرنے کا میں خواہش مند نہیں تھا۔

دوسری بات جو زیادہ اہم تھی، وہ یہ کہ سینڈرلا انہی عورتوں میں سے تھی جنہیں میں اصطلاح میں ساحر عورتیں کہا کرتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں جتنا زیادہ وقت اس کے ساتھ گزاروں گا، اتنا ہی وہ مجھے مسحور کر لے گی، اپنی ذات کا اسیر بنا لے گی اور میری زندگی میں کسی کی بھی ذات کا اسیر بننے کی گنجائش نہیں تھی۔ مگر کہ مجھے اپنی ذات پر اعتماد بھی تھا کہ بسب تک میں خود نہ چاہوں، مجھ پر کسی کا سحر اثر انداز نہیں ہو سکتا لیکن میں پھر بھی ایسے معاملات میں فی الحال خود پر بھی بھروسہ نہیں کرتا تھا۔

پہلی کاپڑ کے پر تیزی سے گھومنے کے تو سینڈرلا دیر چلی تھی۔ اب دن کی روشنی پوری طرح اس پر پڑ رہی تھی۔ وہ اب بھی دم بخود سی نظر آ رہی تھی گویا جانتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہو جس نے اسے حیرتوں کے چنگل میں ڈھکیل دیا ہو۔ اب بھی ہماری طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ کچھ لوگ سینڈرلا کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ وہ بستی کے معززین معلوم ہوتے تھے جو یہی کاپڑ کی طرف اشارہ کر کے سینڈرلا سے غائبانہ ہمارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ کافی پر جوش نظر آ رہے تھے لیکن سینڈرلا جیسے ان کی آوازیں سن ہی نہیں رہی تھی۔ کچھ لوگ ٹکچا ہٹ میگزینز میں پہلی کاپڑ کی طرف بھی بڑھے لیکن پی جن نے اسی وقت تھوڑی سی تھپتھپ اور پہلی کاپڑ ہوا میں بند ہونے لگا۔

مجھ دیر بعد ادنیٰ اس کے کہیں سینڈرلا سب پیچھے رہ گئے۔ میں اپنی پر پہلی کھلتی دھوپ کو دیکھ رہا تھا اور اب مجھے بھی گزری ہوئی شب محض ایک خواب محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک پرہنگم خواب مگر جسم و جان میں اب جو تھکن اور سستی محسوس ہونے لگی، وہ گواہی دے رہی تھی کہ گزشتہ شب کے ہنگامے خواب نہیں حقیقت تھے۔

پی جن نے جب سے پرداز شریں کی تھی، وہ بالکل چپ چاپ اور لا تعلق سی نظر آ رہی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ میری آنکھیں غموگیاں میں بند نہ ہو جائیں۔ میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کئی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی خلاء میں نہ جانے کس چیز کو گھور رہی تھی، چونکہ کر میری طرف متوجہ ہوئی، پھر جھرجھری سی سے کر میرے کچھ اور قریب کھسک آئی جیسے اب بھی کچھ غیر معمولی عزیمت اسے ذرا رہے ہوں۔

تھمڈو پہنچ کر کئی کو ایک پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کرنا پڑا جہاں کے ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں کئی دن لگیں گے اور اگر اس کے علاج میں مزید ذرا بھی تاخیر کی گئی تو اس کی چونٹیں اور دھم وغیرہ بڑھتے چلے جائیں گے۔ پی جن اور اس کے باپ لیو ٹانگ نے اسے داخل کرانے کا بندوبست کیا تھا اور مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے۔ چائنا ٹاؤن میں واقع دتی پراسرار سا گھر جس کے حیرتوں جیسے میں نام نہاد

خوابات کی وہ عسرت زود سی دکان تھی۔

اندروں سے لیو ٹانگ کا گھر آرامت و پیراستہ نہایت شاندار اور پر آسائش تھا۔ پہلے دن تو میں لمبی تان کر سو گیا رہا۔ اپنی پیشانی اور خساروں پر گرم دگداز ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے میں بیدار ہوا۔ طویل و عریض اور اونچی چھت والی خوابگاہ جس کی کھڑکیاں اور دروازوں پر قدیم طرز کے روشنی پردے سرسرا رہے تھے، تلخ اندھیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خوابگاہ نینگوں روشنی والے ٹائٹ بسپ نے اندھیرا ہلکا کر رکھا تھا اور میں اپنے بید کے کنارے بیٹھی ہوئی پی جن کے دلکش سر یا کو خاصی حد تک صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ مجھے نہ بھی نظر آتی تب بھی میں اس کی موجودگی محسوس کر سکتا تھا۔ اب مجھے اس کے وجود کی خوشبو کی پہچان ہو چکی تھی۔

”رات کے نو بج رہے ہیں۔“ وہ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر سرگوشی میں بولی۔ ”اٹھ کر کم از کم کھانا ضرور کھا لو۔ اس کے بعد خواہ دوپارہ سوتے رہنا۔“

اس نے کھانے کا نام لیا تو جیسے میرے معدے میں ایک لخت نہیں سی اٹھی اور مجھے احساس ہوا کہ میں نے گزشتہ چھتیس گھنٹوں میں صرف آج دوپہر پی جن کے گھر بیٹھنے کے بعد سوپ کا ایک پیالہ پیا تھا۔

پی جن کی قہمت شاید میرے اعصاب میں اٹک اگا رہی، اس لیے میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ دھو کر کھانے کی میز پر پہنچا تو وہاں پی جن اور اس کے باپ لیو ٹانگ کے علاوہ ایک نوجوان بھی موجود تھا۔ اس کی عمر مانا انیس بیس سال سے زودہ نہیں تھی لیکن اس کا جسم ایک سادگی طرح مضبوط اور پھیلا پھیلا نظر آ رہا تھا۔ قد اس کا چھوٹا ہی تھا اس لیے جسم کا پھیلاؤ کچھ زیادہ ہی نمایاں معلوم ہوتا تھا۔

اس کا چہرہ خاصا چوڑا، رنگت سرخ اور تانک عام چینیوں کی طرح چمکی تھی لیکن اس کی آنکھیں عام چینیوں کی طرح زردی مائل یا دھندلی ہوئی سی نہیں تھیں بلکہ شعلوں کی طرح دھک رہی تھیں اور ان سے خونخواری عیاں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت ہی بیٹھا کسی نہ کسی بات پر غار کھاتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس نے میری تہمت سن کر میری طرف بھی دیکھا تو اس طرح دیکھا جیسے میں نے اس کا کچھ چرایا ہو۔

پی جن تو جیسے، حول سے لا تعلق بنی سر جھکائے مجھے رہی اذیت لیو ٹانگ نے اس نوجوان سے میرا تعارف کرایا۔ اس کا نام لی یین تھا اور یہ سن کر مجھے نہ جانے کیوں کچھ حیرت سی ہوئی کہ وہ پی جن کا منگپتر تھا۔ اس نے میز کے دوسری طرف سے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ نیچے کی طرح مضبوط تھا۔ میرے تعارف کے جواب میں اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں بھی خاموشی سے اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ لیو ٹانگ نے بتایا کہ لی یین اسی گھر میں اوپر کی منزل پر رہتا ہے۔

آنکھیں کھولے پڑا رہا اور اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک وہ میرے لئے قریب موجود تھی۔ کچھ دیر بعد بالآخر میں ایک بار پھر بے سوجھ سوچ گیا۔

دوسری صبح پی چین نے میری ہدایت کے مطابق مجھے علی الصبح ہی جگا دیا۔ میں جلد از جلد کئی کی خبر گیری کے لیے جانا چاہتا تھا اور میرا بت بھر اسپتال میں رہنے کا ارادہ تھا۔ پی چین اور لیو تاگ تو پہلے ہی صبح جلد اٹھنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ میں جب ناشتے کی میز پر پہنچا تو وہ دونوں ہی نہیں بلکہ لی یین بھی میز پر موجود تھا اور وہی گزشتہ رات کی ہی بو جھل خاموشی میری ہنکرتھی۔

ایک خاموش طبع ملازمہ نے ہم چاروں کو اپنی اپنی پسند کا پیشہ دیا۔ ہاشم کرکے میں نے لہوس تبدیل کیا۔ پی چین نے نجانے کہاں سے میرے لیے ایک معقول قسم کے سوٹ کا بندوبست کر دیا تھا جو میرے جسم پر خاصا بیچھا تھا۔ تیار ہو کر میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ چائنا ملاؤن کی نگلیاں اتنی تنگ تھیں کہ چھوٹی سے چھوٹی کار بھی ان میں آسانی سے نہیں گزر سکتی تھی۔ لیونٹک یا پی چین کو نہیں پورا تھا تو وہ میری تنگ پیدل جاتے تھے۔ گیریج میں دیکھ چکا تھا اور اس وقت ان کی کار کی چابی میرے ہاتھ پاس تھی۔

میں نے ہاتھ میں بلیک کافی بھی پی تھی۔ اس کے باوجود گھر سے نکلتے ہی مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مجھ پر کچھ سستی سی طاری ہے جو کم ہونے کے بجائے لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک گلی سے گزرنے کے بعد میں دوسری گلی میں داخل ہوا تو چند قدم چل کر میری پکلیں بوجھل ہوئے لگیں اور دل چاہنے لگا کہ میں وہیں لیٹ کر سو جاؤں۔ ٹھٹھکیوں اور اینٹوں کا ناموار فرش بھی اس وقت مجھے بھلا معلوم ہونے لگا تھا لیکن ان گلیوں میں دونوں طرف گندے پانی کے نکاس کی ٹالیاں تھیں۔ ایک بار تو مجھے اندیشہ ہوا کہ میں نالی ہی میں نہ گر پڑوں۔

میں نے ساتھ ساتھ اینٹوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ دوار کا سہارا لیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلنا چ رہا تھا۔ دو بار بار سر ہٹانے کے باوجود دور نہیں ہو رہا تھا۔ اس لمحے مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے کافی یا ناشتے کی کسی اور چیز میں کوئی خواب آور دوا دی گئی تھی اور چونکہ میں بی چن کے گھر میں اس قسم کا گمان بھی دل میں نہیں لے سکتا تھا اس لیے میرے نے کسی چیز کے ذائقے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ حالانکہ مجھے ڈور یقیناً خاصا طاہرہ دیا گیا تھا جو اتنی تیزی سے میرے اعصاب پر حملہ کرتے جا رہے تھے حتیٰ کہ وہاں ہی کی بجائے میں اپنے اندر ہمت نہیں پا رہا تھا۔

میرا آخری احساس یہ تھا کہ نکلی کا فرش جیسے تیزی سے میرے چہرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید میں نے دلوں ہاتھ آگے بڑھا کر فرش کو اپنے پیروں سے لکڑانے سے باز رکھنے

کھانا یوں خاموشی سے کھایا جیسے کوئی تفریق اجلاس منعقد ہو رہا ہو اور میرے خیال میں یہ لی بن کی موجودگی کا اثر تھا۔ مجھے کچھ بد مزگی تھی۔ مجھوں نے ہوتی اور میں کھانے سے فارغ ہوتے ہی دوبارہ اس خوابگوں میں آگیا جو میرے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ وہ اسپتال جس میں کیٹی کو داخل کرایا گیا تھا گو کہ پراسیوٹ تھا لیکن رات کے وقت ملاقاتیوں کی آمد پر وہاں بھی سخت پابندی تھی ورنہ شاید اس وقت میں ویسا چلا جاتا۔ بہر حال کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد میں سو گیا۔

رات کے نہ جانے کس پر ایک حسین خواب شروع ہوا جس کا محور و مرکز پی جن تھی اور جنب وہ طویل خواب اختتام پذیر ہوا ہونے لگا تو نہ جانے کیا فکر مجھے احساس ہوا کہ بر حقیقت وہ خواب نہیں تھا، پی جن کا کرم و عطا وجود حقیقتاً میرا گرفتار تھا۔ غاصے طویل وقفے کی خاموشی کے بعد میں نے اس کے مستحق رہنمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے مستقبل سے مل کر قطعاً خوشی نہیں ہوگی۔“

”میں بھی اس کی مستقبل کما کر قطعاً خوش نہیں ہوں۔“ اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

سے کہا۔ ”پھر کیا مجبوری ہے؟ تم کوئی دیست کی پروردگار پڑھ اور مجبور لڑیں؟ نہیں ہو۔“ میں

”بعض معلومات میں ہم لوگ ان پڑھ نہاتوں اور بلا کے برہمت پسندوں سے بھی بدتر ہیں۔“ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”جداوت نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ عہد نہیں توڑ سکتے۔“ اس کے لیے میں دکھ، تاسف اور محرومی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم محض ایک خواب ہی ہو۔ جسم عمری کا ایک جھوٹا ہو، آج یہاں ہو، کل نجائے کمال ہو گئے۔۔۔۔۔ اور میری طلب محض جسم کی طلب نہیں۔۔۔۔۔ سنا لینا بھی خاہر ہے ایک ہنسم ہی کا نام ہے۔۔۔۔۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی نجائے کیوں میں تمہارے پسند میں سٹ آئی ہوں۔۔۔۔۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا۔ شاید میری مثال تپتے صحرا میں سفر کرتے اس مسافر کی سی ہے جسے کوئی ٹھکانہ نہ ملے۔ دار فطر آجائے تو ہے اختیار اس کی چھاؤں میں جا بیٹھے، محض سستائے کے لیے۔۔۔۔۔ یہ تو اسے بھی معلوم ہوتا ہے کہ چھاؤں میں وہ سدا نہیں بیٹھ سکتا اور نہ ہی درخت کو یا چھاؤں کو ساتھ لے کر چل سکتا ہے۔ شاید تم یقین نہ کرو کہ میں اس قسم کی لڑکیوں میں نہیں ہوں جو ہر پیشہ سم مراد دیکھتے ہیں دل ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں لیکن ہمیں پسلی بار ہی دیکھ کر دل کو نجائے کی ہونے لگا تھا۔۔۔۔۔“

”میں اسے اپنی خوش قسمتی پر محزون کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔
کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے گلشن نے تمام پھولوں سے خوشبو چلی
جائے۔ میرے دل میں وہ ایک عجیب سی فضا چھوڑ گئی تھی۔ میں دیر تک فکری روشنی میں

کی بھی کوشش کی تھی، اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

آنکھ کھلی اور میرے حواس مکمل طور پر بحال ہوئے تو میں نے دیکھا کہ میرے ارد گرد بہت سے افراد موجود تھے۔ وہ دراصل ایک بہت بڑا مستطیل کمرہ تھا جو تہ خانہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چھت بہت نیچی تھی اور وہاں روشنی بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ کچھ تو ہال ویسے ہی سیلن زد تھا۔ کچھ میرے جسم پر کوئی گرم کپڑا بھی باقی نہیں رہا تھا حتیٰ کہ پیروں میں جوتے بھی نہیں تھے اور میں کمرے کے وسط میں فرش پر چپ پڑا تھا۔ یہ محسوس کر کے میں نے منہ کی سانس لی کہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے۔

میرے ارد گرد دیواروں کے ساتھ بالکل اسی طرح کڑی کے بچ لگے ہوئے تھے جس طرح ریلوے کی تھوڑے کاس کی انتظامیہ گاہوں میں لگے ہوتے ہیں۔ یہ رقبہ خالی نہیں تھے، ان پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بالکل اسی انداز میں دس بارہ اشخاص بیٹھے ہوئے تھے جیسے وہ زین کی آمد سے منتظر ہوں اور اس دوران غیر ہولی سے ایسے دیرانی کا تبادلہ دیکھنے لگے ہوں جو اس کے درمیان فرش پر صندوق سہانے رکھ کر سو گیا ہو۔

یہ بات میں نے پہلی ہی نظر میں محسوس کی کہ وہ سب کے سب چینی تھے۔ زرد چہرے، گول گول سی آنکھیں، چھٹی ناکیں، وہ مختلف عمروں اور مختلف جسامتوں کے لوگ تھے۔ ان میں سے کوئی نہایت ہی نجیب و زہاد نظر آ رہا تھا اور کوئی مجھے ہونے جسم کا مالک، لباس بھی کسی کا قدیم صنعت شہانہ سے مشابہ تھا تو کوئی صرف بنیان اور پانچست میں بنی تھا اور جیسے قبر سے اٹھ کر سیدھا ادھر ہی آ گیا تھا۔

پھر میں نے کمرے کے ایک حصے میں جیس کا ایک بہت بڑا چوہا بھی دیکھا جس سے گیس کا بڑا سا سلنڈر منسلک تھا۔ اس چوہے پر جہاز ساز کی آئینہ کڑائی رکھی تھی۔ میں چونکہ فرش پر بیٹھا تھا، اس لیے یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ کڑائی خالی تھی یا اس میں کچھ موجود تھا، تاہم چوہا بند ہی تھا۔

میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی لیکن میری ایک انگلی تک بھی حرکت میں نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے جو محلول پایا گیا تھا، وہ جسم اور ذہن کو شل کر دینے کے معاملے میں انتہائی سرچ الاثر اور طاقتور تھا۔ میرا ذہن تو کسی نہ کسی طرح دوبارہ کام کرنے کے قابل ہو گیا تھا لیکن جسم ابھی تک شل ہی تھا اور یہ بات ان سب کو معلوم تھی۔ اسی لئے وہ اتنے مطمئن بیٹھے تھے۔

وہ وقت "کمرے کا دروازہ کھلا اور دو اشخاص تیزی سے اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک پلی جن کا منگیتر ہی بن تھا۔ وہ صرف ایک سیاہ پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ تھمرا رہا تھا اور کسرتی جسم کے ٹھوس مضامات کسی سب عنوان سے چینی کی وجہ سے پھڑک رہے تھے۔ اس وقت وہ مجھے میں بھرا ہوا کینڈا، معلوم ہو رہا تھا۔

اس کے ساتھ آنے والے شخص ایک معمر اور پست قد چینی تھا۔ اس کے سر پر میلی سی ترکی ٹوپی تھی۔ وہ ٹھٹھل کا ایک لمبا سا سیاہ لہو پہنے ہوئے تھا جس کے بن کھلے ہوئے تھے۔ اس کے گلے میں نہایت خوبصورت اور پٹیلے موتیوں کی ایک مالا تھی۔ اس کی فرمانبرداری نہایت موٹھیں وسیلے ڈھالے انداز میں نیچے کو جھول رہی تھیں۔ اندر آتے وقت مجھے ہوش میں دیکھ کر لی بین نے اس سے فیصلے انداز میں چینی میں کچھ کہا۔ معمر شخص نے سر ہلانے انداز میں سر ہلائے اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کمرے کے وسط میں اکھڑا ہوا۔ لی بین اس کے ساتھ ساتھ تھا اور کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے جسم، خصوصاً سینے اور بازوؤں کے عضلات کچھ اور تیزی سے پھڑکنے لگے تھے جیسے وہ ہر چیز کو تھوڑا پھوڑا دیکھتا اور وہ دیوار کو منہدم کر دینے کے لیے تیار ہو۔

کمرے میں موجود افراد اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن رکوع کی سی حالت میں تھے، تاہم یہ تعظیم ترکی ٹوپی والے معمر چینی کے لیے تھی، لی بین کے لیے نہیں تھی۔ ترکی ٹوپی والے نے ہاتھ ہل کر انہیں ہنسنے کا حکم دیا اور وہ سب پہلے کی طرح خاموشی سے بیٹھ گئے۔

میرے کافی میں خواب آور دوا تم نے ڈالی تھی؟" میں نے انگریزی میں لی بین کو مخاطب کیا۔ میں نے حتیٰ الامکان خوشدلی سے بولنے کی کوشش کی تھی لیکن میرے حلق سے عجیب سنسنی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی۔

"ہاں۔" لی بین منہ کی طرح پھٹکارا۔ "اور اب زیادہ سال 1 خواب کی ضرورت نہیں۔ اس سے کوئی تمہاری موت آسان یا تھمرے گناہوں کا بوجھ کچھ کم نہیں ہو جائے گا۔"

"بریکل تذکرہ.... کیا آپ ان گناہوں پر کچھ روشن ڈالنا پسند فرمائیں گے جناب لی بین صاحب؟" میں نے کمزور مگر استہزائیہ لہجے میں کہا۔

میرے سوال کا جواب لی بین کی بجائے ترکی ٹوپی والے معمر چینی نے دیا۔ "تمہیں عبرت ک طریقے سے سزائے موت دینے کے لیے تو تمہارا ہی گناہ کافی ہے نونوان کہ تم نے لی بین کی محبوب اور منگیتر پر ڈاکہ ڈالا جبکہ تمہیں اس کے وجود سے کھیلنے کا تو کیا اس سے ربط و ضبط بڑھانے کا بھی کوئی اختیار یا حق حاصل نہیں تھا۔" معمر چینی سلجھے ہوئے اور باوقار لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔

"اور میرے اس جرم کا ثبوت کیا ہے؟" میں نے بدستور کمزور لہجے میں پوچھا۔

"میں نے خواب لی بین کو گزشتہ رات تمہارے کمرے سے نکلتے دیکھا ہے اور اس کی چال بتا دی تھی کہ....." لی بین نے اچانک اس طرح چلا کہ یہ الفاظ کے تھے جیسے اس کے سینے میں کوئی آتش افشاں پوٹ پڑا ہو، سرد بات مکمل نہیں کر سکا تھا اور اس کی آواز پتھر لگی تھی۔

ایک مشق شروع کر دی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے بہت دور ہی سے سوں سوں کی آواز بھی ابھری محسوس کی۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کڑائی میں کچھ اٹنے لگا تھا لیکن میں نے اب بھی ہنگامہ نہیں کھولی تھی کہ میری مشق مکمل ہو چکی تھی اور مجھے احساس ہو چکا تھا کہ میرا جسم حرکت کرنے کے قابل ہو چکا ہے لیکن میں نے مزید مشق جاری رکھی تاکہ اصل صلاحیتیں پوری طرح عود کر آئیں۔

میں نے اس وقت آنکھیں کھولی جب مجھے ہاتھ پیروں سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ اٹھایا جانے لگا۔ میں نے دیکھا کہ میرا ایک ایک پاؤں دو دو آویں نے پکڑا ہوا تھا لیکن دونوں ہاتھ آپسے لی پیٹنے پکڑنے ہوئے تھے اور میرے وزن سے اس کے طاقتور اور سرسری بازوؤں کی پھلیاں پوری طرح ابھری ہوئی تھیں۔

میں نے جنازی ساز کی کڑائی کے زیادہ قریب جانے کا غلطہ سول نہیں لیا اور انگوٹھوں سے پوری قوت سے جھٹکا دیا۔ چاروں آویں دور جا کرے۔ جھٹکے کا یہ انداز ایسا تھا کہ میرے پاؤں بھی لی پیٹنے کی گرفت سے چھوٹ جانے لگے لیکن ایسا نہیں ہوا وہ غالباً میری بے بسی کا یقین رکھنے کے باوجود غیر متوقع صورتحال کے لیے بھی تیار تھا۔ جیسے ہی میرے پاؤں زمین سے مس ہوئے اس نے میرے بازوؤں کو اس طرح جھٹکا دیا کہ اُس میں نے بروقت اپنے آپ کو سنبھال نہ لیا ہوتا تو میرے کندھے اتر چکے ہوتے۔

میں جیت زمین پر گرا۔ لی پیٹنے نے میرے بازو جھوڑے بغیر مجھ پر اوندھ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے دھرا ہوتے ہوئے اس کا سر دونوں پیروں میں پھنسا دیا اور دوسرے ہاتھ سے وہ میرے پیروں کی طرف آن گرا۔ اس کا سر بھی پتھر کے ٹھوس گولے کی طرح فرش سے ٹکرایا تھا لیکن اسے جیسے کوئی خاص اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ بازو اس کی گرفت سے چھوٹ پختہ تھے۔ وہ تیندوے کی طرح تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور میرے کندھے ہوتے ہوئے اس نے آویں پر گھوم کر اٹکے رخ مجھے چاہ سوئی رسید کرنے کی کوشش کی لیکن میں فک گیا اور یہ جان کر ضرورت سے زیادہ محتاط بھی ہو گیا کہ وہ نوجوان گینڈے کی طرح مضبوط ہی نہیں تھا بلکہ جوتا اور شاید کراٹے سے بھی واقف تھا۔

اس دوران باقی سب لوگ ہمارے گرد گھیرا ٹک کر چکے تھے اور غالباً مجھ پر جھپٹنے میں والے تھے۔ جب میں نے ترکی ٹوپی والے معمر چینی کی ٹائرس۔ اس نے چینی میں غالباً ان سب کو اس لڑائی میں غیر بہادر رہنے کا ٹھہر دیا تھا کیونکہ وہ سب پیچھے رہ گئے تھے اور واپس ہتھیوں پر جا بیٹھے تھے اور معمر چینی خود بھی انہیں میں شامل نہ کیا تھا۔ پھر اس نے جیسے مجھے سنانے کے لیے انگریزی میں کہا "اگر غائب میں مقابلے کی سکت ہے اور وہ مقابلہ کرنے کا خواہش مند بھی ہے تو لی پیٹنے کو اسے شکست دینا ہی پڑے گی ورنہ ہتھیار لڑائی

مجھے اس اوکے بننے پر بہت فائدہ آیا۔ اُس اس نے لی پیٹنے کو میرے کندھے سے ہٹاتے دیکھ کر لیا تھا اور اس معاملے میں اتنا ہی غیرت مند تھا تو اسے اسی وقت کچھ کرنا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس اس نے نہ صرف غصے سے دل سے صبح کا انتظار کیا بلکہ یہاں تک پہنچانے کے لیے باقاعدہ سازش سے بھی کام لیا تھا۔

"میرے لیے کیا سزا تجویز کی گئی ہے؟" میں نے اپنے لمبے ہاتھ میں ہاتھ اور غمازت سمیٹ کر جیسے میں بالکل ہی ہمت ہار چکا ہوں۔

میرے سوال کا جواب لی پیٹنے نے دیا۔ وہ غریب انداز میں کڑائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس کڑائی میں موجود محلوں میں تمہیں ایال کر ایک ایسا مرہم تیار کیا جائے گا جو دینی نوع انسان کے لیے بے شمار تکالیف کا علاج ہے۔ ایسی تکالیف جن میں سے بیشتر کو بعد دور کے ڈاکٹر اور سرجن ناقابل علاج سمجھتے ہیں۔"

لی پیٹنے کے چہرے پر خوشخوار سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی چٹون کی پھولی پھولی سی بیب سے آؤ کے برابر کوئی چیز نکالی اور میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ "اور تمہاری کھوپڑی اس طرح محفوظ کرنا جائے گی۔۔۔۔۔" وہ چیز اس نے میری آنکھوں کے سامنے کر دی اور قریب میں نے محسوس کیا کہ وہ آؤ جتنی چیز دراصل ایک مکمل انسانی کھوپڑی تھی جسے گویا جادو کے زور سے چھوٹا کر دیا گیا تھا لیکن فوراً ہی مجھے یاد آگیا کہ اس میں جادو والی کوئی بات نہیں تھی۔

کئی افریقی قبائل خصوصاً دریائے ایمپون کے کنارے بسنے والے وحشی قبائل اپنے دشمن کو ہلاک کرنے کے بعد اسی طرح ان کی کھوپڑیاں محفوظ کر لیا کرتے تھے اور انہیں قوتوں کی نشانیاں شمار کرتے تھے۔ دراصل یہ مکمل کھوپڑی نہیں ہوتی تھی۔ وہ دشمن کو ہلاک کرنے کے بعد اس کی کھوپڑی تن سے جدا کر کے کسی محلوں میں ڈال کر محلوں کو ابالتے تھے اور اس کے بعد کھوپڑی کی مکمل کھال اس طرح اتار لیتے تھے جیسے اسے بوسے پتے پر سے پھلکا۔ پھر اس خول کو کئی قسم کے مداخل سے گزارنے کے بعد پھونکا دیا جاتا تھا اور اس میں کوئی مادہ بھر کر اسے ٹھوس بنا دیا جاتا تھا۔ انسان کی شناخت ہون کی توں برقرار رہتی تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ دور افتادہ لوگوں میں جنرل لینے والی رسوم اور وحشیانہ طور طریقے کی جڑیں دہ میں نہ جانے کہاں کہاں سے پھیل ہوئی تھیں۔

اس دوران ترکی ٹوپی والے معمر چینی نے ایک شخص کو اشارہ کر دیا اور اس نے اٹھ کر چولہا روشن کر دیا تھا۔ کمرے میں قدرے حرارت کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے ایک بار پھر غیر محسوس طور پر جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی تھی اور اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ ابھی میری حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سب میں نے بظاہر اسی طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے مایوسی کی ابتداء نے مجھے موت سے پہلے ہی مار ڈالا تھا لیکن درحقیقت میں نے ہونیکا کی

شرم و غارتگی کی لڑکی پر اس کا بس نہیں چلتا کہ اسے اپنے سے افاداری پر مجبور کر سکے۔۔۔۔۔ اب آپ براہ کرم صرف اتنی تکلیف کریں کہ میرے باقی کپڑے اور اشیاء اگر یہاں موجود ہیں تو مجھے عنایت فرم دیں۔" سحر چینی چند لمحوں میں طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ترکی ٹوپی اتار کر چندیا کھجائی۔ اس کی چندیا کے وسط میں ہندوؤں کی طرح چوٹی تھی۔ ٹوپی دوبارہ سر پر رکھ کر اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے اور ایک بار پھر تہی بھائی۔ خادم کے آنے پر اس نے چینی میں اسے کوئی تھم دیا اور چند ہی لمحوں بعد میری تمام چیزیں میرے سامنے پیش کر دی گئیں۔

کچھ دیر بعد میں اس پر اسرار مکان سے ایک ایسی گلی میں نکلا جس میں دن چڑھے بھی شرم تاریکی چھپی ہوئی تھی۔ میرا طبع اب بالکل درست تھا۔ ہاتھوں پر اور ٹھوڈی کے نیچے چند معمولی خراشوں کے سوا بظاہر ایسی کوئی علامت دکھائی نہیں دے رہی تھی جس سے کوئی سمجھتا کہ میں کسی خوفناک معرکے سے گزر کر آرہا ہوں۔

معر چینی نے مجھے مین روڈ پر پہنچنے کے لیے راستہ سمجھا دیا تھا لیکن ان گلیوں میں کھڑے ہو کر پتا چلتا تھا کہ راستہ سمجھنے کا کوئی عملی فائدہ نہیں۔ میں ہر حال لیے لیے ڈنگ بھرنا ایک طرف سے آتی ہوئی لڑکی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ سنبھل کر میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا وہ پن پتی تھی۔

"شکر ہے....." اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں تو سخت پریشان تھی کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ گیا ہو۔ تم کسی مصیبت میں نہ پھنس گئے ہو۔ میں نے تقریباً تمہارے پیچھے پیچھے بی بی لی یں کو بھی گھر سے نکلتے دیکھا تو میرا دل تھا ٹھک گیا تھا کہ کوئی گزیر نہ وہ لیکن میں نے فیصلے پر پہنچنے اور گھر سے نکلنے میں دیر کر دی۔ باہر آئی تو مجھے ایک گلی میں تمہاری گھڑی پڑی ملی۔ میں پہلے لی یں کے دو ایک اور ٹھکانوں پر کچنی لیٹن اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں لی یں تمہیں مقدس پیشوا کے ہاں نہ لے گیا ہو..... کیا بات ہے تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو۔ تمہارا منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟" وہ قدرے شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ "لگتا ہے کسی ناخوشگوار تجربے سے گزر رہے ہو۔"

مجھے اس وقت معلوم نہیں کیوں دنیا کی ہر چیز پر غصہ آرہا تھا۔ میں نے سر دھبے میں کہا۔ "میرے تو تمہیں لی یں کی زیادہ بہتر طور پر بتائے گا۔ ویسے میرا دوستانہ مشورہ یہی ہے کہ چند ماہ اسپتال میں گزار کر اب جیتے بی بی یں نہیں آئے۔ اس سے شادی نہ کرو ورنہ وہ زنا بھینسا نہ جانے کس کا خون کرتا پھرے گا۔"

وہ چند لمحوں خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر سرسراہٹ ہوئی سی آواز میں بولی۔ "تو تم نے اسے کئی ماہ کے لیے اسپتال جانے کے قابل نہ کیا ہے؟ جان سے ہی مار دو ہوتا۔"

غاصب ہی کی ملکیت ہو جائے گی۔"

یوں اس نے گویا میرا کام آسان کر دیا۔ لی یں بے ٹھک سائیکل کی طرح مضبوط تھا لیکن اس سائیکل سے نمٹنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میں نے دروازہ اس کا بھر کس نکال دیا اور جب وہ فرش پر گر پڑا تو میں نے اسے تھم کر کول پر رکھ لیا۔ اس کی کئی پسٹیاں ٹوٹ گئیں حتیٰ کہ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ ٹوٹی ہوئی پسٹیاں اس کے پیچھلوں میں نہ جا گھسیں۔ دیکھتے ہی وہ گوشت کی ایک چھوٹی سی چٹان کی طرح بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

معر چینی نے دونوں ہاتھ اٹھ کر گویا مقابلہ ختم کرنے کا اعلان کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر برابر والے کمرے میں لے گیا۔ وہاں صاف ستھری چاندنی چھپی ہوئی تھی۔ ایک طرف گاؤں کی گلیں لگے ہوئے تھے اور ایک طرف پھوٹے چھوٹے پاؤں والی ایسی ہی تپائی رکھی تھی جس پر پرانے دور کے پناری، نیم یا آڑھتیں کے غشی ہی کھاتے کھیتے تھے۔

چینی نے مجھے ایک گاؤں کی گلی کے سارے پلٹنے کا اشارہ کیا۔ میں ڈنڈہ چکا تو چینی بھی تپائی کے قریب چلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور یوں مسترکرا کر میری طرف دیکھنے لگا جیسے چند لمحوں پہلے کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور میں تو درحقیقت اس کا مہمان ہوں جو ابھی ابھی پہنچا ہے۔

پھر اس نے بکس کر تپائی کا ڈھکن اٹھایا اور دروازے سے ایک سفید کافز اور قلم دو ات نکالی۔ دروازہ کا ڈھکن گرا کر وہ کافز اور دو ات اسی پر رکھ کر نہایت اطمینان سے کافز پر کچھ لکھنے لگا اور جب میں نے دیکھا کہ وہ جس چیز سے لکھ رہا تھا وہ دراصل قلم نہیں نہایت باریک سا برش تھا جس سے وہ اوپر سے پیچھے کے رخ لکھ رہا تھا۔ اسی طرح تین چار سطریں لکھ کر اس نے کافز میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سے جا کر لیوٹنگ کو دے دینا۔"

کافز پر چینی میں جلتے یا لکھا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "لیوٹنگ کے نام خط ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے اس کے ہم حکم لکھ دیا ہے کہ وہ متاثرہ لڑکی بی بی چن کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دے کیونکہ تم نے لی یں کو شکست دے دی ہے۔ لی یں نے بھی طاقت ہی کے ہاں پر لڑکی کو حاصل کیا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ جو بھی اس شکست دے دے گا وہ لڑکی کو بیت سے کا بشرطیکہ لڑکی بھی چاہے..... اور لڑکی بہت کمزور ہے۔ تمہارے گھر کے میں رات گزار کر نکلی تھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمہیں چاہتی ہے۔"

"لیکن مجھے نہیں چاہیے لڑکی!" میں نے اس کا حکم نامہ پڑھتے پڑھتے کر کے ایک طرف پھینک دیا۔ "لی یں کو ہوش آجائے تو اس سے کہہ دینا کہ لڑکی کو اپنی ملکیت میں رکھے۔ خواہ اس کا اچار یا کر کھائے یا مرے لیکن سکند و سروں کے لیے باوجود پریشانیوں پیدا نہ کرے۔ پھر وہ دوسروں سے تو زندگی اور موت کی بانٹا لگاتا پھرتا ہے لیکن اس

میرے اپنے ہاتھوں سے اسے دوا پائی، کھانا کھایا۔ پھل چھین کر دیئے۔ کافی پلائی اور اس سارے عمل میں مجھے ایک عجیب ناقابل بیان سی مسرت محسوس ہوئی۔ اس کی کیفیت بھی شاید یہی تھی۔ خواہ تک سے نیچے میں ہوئی۔

”میری تکلیف گویا آدھی رہ گئی ہے۔“

ہسپتال کو کہہ پرائیویٹ تھ مگر اس کا معیار نمائندہ بند اور ڈسپلن ہے حد تحت تھا۔ شام سات بجے کے بعد متعلقہ عرصے کے سوا مریض کے قریب کوئی نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے باہر نکلنا مجھے بھی وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔

اس شاندار ہسپتال میں ڈاکٹروں کی خصوصی توجہ اور نگہداشت سے کتنی جلد صحت یاب ہو گئی اور ہم بھی واپس آ گئے۔ واپس کے سفر میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا اور ہم بھی پہنچنے کے بعد کے واقعات میں بھی کوئی ایسا خاص شے نہیں خیر پہلو پہنا نہیں ہے۔

مختصراً بس اتنا جان لیجئے کہ دن موہن کو شیکھو نے ایک طویل عرصے تک ہاتھ مندر والے پیاس میں رکھ کر واقعی ایک بن مانس میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ انسانوں کی خصوصیات کھو بیٹھا تھا اور تقریباً حیوان نظر آنے لگا تھا۔ تب ایک رات ہم نے اسے چپکے سے بیٹھنی کی ایک سرک پر لا پھوڑا تھا۔

دن میں لوگوں نے دیکھا کہ ایک بن مانس لڑیکہ کے درمیان ’اوہر اوہر بھاگا پھر رہا تھا‘ تاہم اس میں کسی نہ کسی حد تک انسان کی بھٹک نظر آتی تھی اور کبھی کبھی وہ انسانوں جیسی آوازیں بھی نکالتا تھا۔ دو چار الفاظ بھی بولتا تھا لیکن وہ انسانوں کے سائے سے بھی بھڑکتا تھا۔

پولیس اور دوسرے دو تین محکموں کے لوگوں نے اسے پکڑنے اور قابو میں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ لایا اور اوہر اوہر بھاگتا پھر رہا۔ ان کی کوششوں کے دوران ہی ایک بس اسے کھینچ ہوئی گزر گئی۔ اخبارات نے اس پر سراسر واقعے پر کئی دن حاشیہ آرائی کی۔

احسان مرزا میری ناقابل یقین کامیابی سے بہت خوش تھا۔ وہ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکا۔ اس نے واقعی مجھے بیٹوں کی طرح سمجھا اور مرنے سے پہلے تمام دولت و جائیداد میرے نام کر دیا لیکن بہت سے سرکاری ادارے آدم مرگ اس کے پیچھے گئے ہوئے تھے۔ اس کی پیشتر دولت و جائیداد حکومت نے مختلف جیسے بدلوں سے قبضہ کر لیا اور طویل مقدمے بازمی سے بھی مجھے کوئی لائدہ نہیں ہوا۔ احسان مرزا خواہ کیسا بھی تھا لیکن حکومت اس کے ایک احسان سے آج تک لاعلم ہے کہ اس نے انڈیا میں مافیا کا راستہ روکا تھا۔

ماہتاب لندن سے اس دوران واپس آ چکی تھی لیکن اس کی کوسینک لمر جری کچھ زیادہ

”تمہاری وجہ سے چھوڑ دیا۔“ میں نے کہا۔ ”مگر وہ تمہیں اتنا ہی مایوس ہے تو خود ہی مار ڈالنا۔ اتنا مشکل نہیں اسے مارنا۔ نخل نام کی تو کوئی چیز ہے ہی نہیں اس میں۔“

میں اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھنے لگا تو وہ گویا ہکا بکا ہو کر ہوئی۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

”میرا انتظار مت کرنا۔ میں اب ہوٹل میں قیوم کروں گا۔“ میں نے سرد مری سے کہا اور لمبے لمبے ڈب بھرتا آگے چل دیا۔ آخری بار میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں تو ان میں حیرت کے سوا کچھ نہیں تھا لامتناہی حیرت۔

وہاں سے میں سیدھا سٹی اسپتال پہنچا جہاں کتنی داخل تھی۔ ڈاکٹر مجھے پرائیویٹ وارڈ کے دروازے پر لٹا گیا۔ اس نے بتایا کہ مکمل چیک اپ اور نہ جانے کتنے قسم کے ایکس رے اور ٹیسٹوں کے بعد کتنی ہی جسمانی حالت کی دو مفصل رپورٹ مرتب ہوئی، اسے پڑھ کر وہ خود بھی نرمز اٹھا تھا۔ حالانکہ اس کا کام ہی دن بھر اسی قسم کی یا اس سے بھی زیادہ خوفناک رپورٹیں پڑھنا تھا لیکن کتنی کے معاملے میں یہ احساس اس کے لیے لرزہ خیز تھا کہ اس کی یہ حالت کتنی حادہ یا لڑائی جھگڑے میں نہیں، تنہا برواشت کرتے ہوئے ہوئی تھی۔ اگر اسپتال سرکاری ہوتا تو اس محدود کی وضاحت ایک الگ مسئلہ ہوتی۔

اس رپورٹ کے مطابق کتنی کے ہاتھوں کی بیشتر انگلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کئی عازک مقامات پر گوشت کپڑا ہوا تھا۔ کئی جگہوں سے جسم داغ لیا تھا، بال بوسے گئے تھے۔ نوکری چیزیں چھوٹی تھیں۔ کئی جگہ سے جلد تیز دھار چاقو سے چربی گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اسپتال تک ہوش و حواس میں پہنچی تھی۔ اس پر ڈاکٹر کو بڑی حیرت تھی۔

شب وارڈ میں پہنچا تو کتنی کے چہرے اور جسم کے بیشتر حصوں پر پٹیاں لپٹا ہوئی تھیں، تاہم وہ جاگ رہی تھی اور بچیوں کے درمیان سے مجھے دیکھ سکتی تھی۔ میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن جب وہ بولی تو اس کی سرگوشی نما آواز سے بھی مجھے اس کے جذبات کا اندازہ کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

”میں تو بھوس ہی ہو چکی تھی منصور کہ شاید تم نہیں آؤ گے۔“ وہ صبری سانس لے کر بولی۔ ”زندگی میں پہلی بار میں اپنے آپ کو سب حد تھا اور غفلت غور و محسوس کر رہی تھی۔“

”میں بہت پہلے پہنچ جاتا لیکن نہیں....“ میں نے بچیوں میں اپنے ہوئے اس کے ہاتھ پر نہایت آہستگی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا لیکن جملہ اوہورا پھوڑ دیا۔

”کوئی نی اتنا پڑ گئی ہوگی۔“ اس نے جملہ سہل کر دیا۔ میں تمہاری ٹھوڑی کے نیچے خراشیں دیکھ رہی ہوں اور باایں رخصت بھی کچھ ابھرا بھرا سا ہے۔“

میں مسکرا رہا لیکن میں نے اس کی بات کی تائید و تردید نہیں کی۔ میں شام تک وہاں رہا۔ اس دوران ہم نے ان گنت باتیں کیں۔ اوہرا اوہری بے مقصد اور لاعینی سی باتیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش یہ ٹائمہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے ہم خاص کیوں ہیں :-

نامیاب نہیں ہا سکی تھی۔ اس کی صورت میں کچھ نقص برقرار رہے۔ اسے ہر حال
خوبصورت لڑکیوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا تھا اور اس نے اسی چیز کو آزاد بنا کر مجھ سے شادی
سے انکار کر دیا۔ میں کئی برس تک اس سے شادی کے لیے اصرار کرتا رہا لیکن اس کی یکن
ضد رہی کہ وہ اپنے آپ کو میرے قابل نہیں سمجھتی۔

شادی اس نے کسی اور سے بھی نہیں کی اور میں بھی اپنے آپ کو کسی اور سے شادی
کے لیے تیار نہیں کر سکا۔۔۔۔۔ اسی عالم میں مجھ پرانا چاکر کب بڑھاپے نے ہمارے وجود
میں پیشہ لگا لیا۔ اب ہم دونوں کے بال سفید ہیں۔ وہ اپنے گھر میں رہتی ہے۔ میں اپنے
گھر میں۔۔۔۔۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال شاید درست ہی ہے کہ آپ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں
دریاؤں کا رخ بدلتے ہیں، فضاؤں کو مسخر کر سکتے ہیں لیکن اگر عورت کسی بات پر اڑ
جائے تو پھر آپ اسے قائل نہیں کر سکتے۔

ختم شد

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریویو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور ایبک پرنٹ کے
- ☆ ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے
- ☆ کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف
- ☆ سائٹوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، ہارڈ کوالٹی، کمپریمڈ کوالٹی
- ☆ عمران میریز از مظہر کلیم اور
- ☆ ابن سنی کی مکمل ریٹ
- ☆ ایڈفرمی لنکس، لنکس کو نیسے کمانے
- ☆ کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب
ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کانٹیکٹ دیکر مستعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1